
بیسویں صدی
دہلی
اپریل
266
Rs. 1.25



اِک طرف یہ بلا یہ نازنیں ہے اے دل — اُفوہ، بہت سخت حسیں ہے اے دل
یہ سانس کے طوفان، یہ سینے کے بھنور — اُف، قابلِ برداشت نہیں ہے اے دل



دلی کے ایک مشاعرے میں پدم شری حضرتِ فراقؔ گورکھپوری اپنی یہ جمالیاتی رُباعیاں سُنا کر فضا میں حُسن و مستی کا جادُو جگا رہے ہیں ۔

ہر جلوے سے اِک درسِ نمُو لیتا ہوں — چھلکے ہوئے صد جام و سبُو لیتا ہوں
پڑتی ہے جب آنکھ تجھ پر اے جانِ بہار — سنگیت کی سرحدوں کو چھُو لیتا ہوں

○

شبنم سے یہ شعلوں کی جبیں دُھلتی ہے — کرنوں سے یہ کلیوں کی گرہ کھُلتی ہے
یہ رنگ، یہ رس، یہ مُسکراہٹ، یہ نکھار — یا نُور کی موجوں میں شفق گھُلتی ہے

○

راتوں کی جوانیاں نشیلی آنکھیں — خنجر کی روانیاں کٹیلی آنکھیں
سنگیت کی سرحدوں پہ کِھلنے والے — پھُولوں کی کہانیاں رسیلی آنکھیں

○

لہروں میں کِھلا کنول نہائے جیسے — دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ رُوپ، یہ لوچ، یہ ترنم، یہ نکھار — بچہ سوتے میں مُسکرائے جیسے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے اعزاز میں عصرانہ



"بیسویں صدی کا تازہ پرچہ ملتے ہی میری نظریں بے اختیار حامدی کاشمیری اور کوثر چاندپوری کو تلاش کرتی ہیں کیوں کہ اُن دونوں کے افسانے نظروں کو نہیں دل کو بھی منور کرتے ہیں۔"

([illegible])

"بیسویں صدی کے جس شمارے میں جناب کوثر چاندپوری اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے افسانے نہیں ہوتے قارئین بیسویں صدی سے جواب طلب کرتے ہیں اور بڑی بے چینی سے اُن کی خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں۔"

(خوشتر گرامی)

"اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ خوشتر صاحب فن کار سے زیادہ فن کو اہمیت دیتے ہیں۔ نہ جانے انھوں نے کتنے حامدیوں کو دنیائے ادب سے روشناس کیا ہے۔"

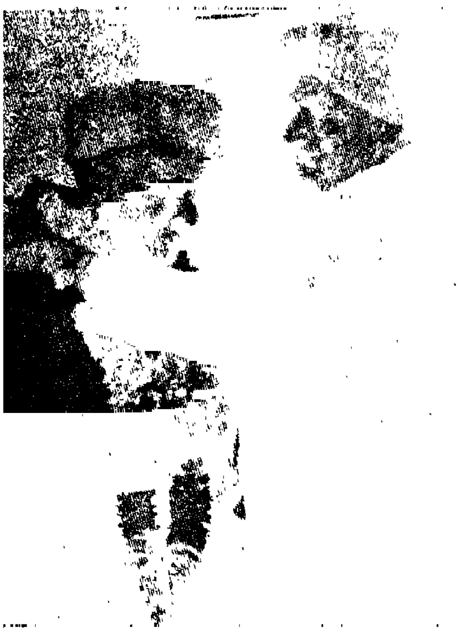
(حامدی کاشمیری)



نامور افسانہ نگار حامدی کاشمیری کے اعزاز میں ادارہ "بیسویں صدی" نے جو عصرانہ دیا اُس کا ایک منظر۔ دہلی کے برگزیدہ ادیبوں اور شاعروں کے اس جھرمٹ میں اُردو کے پختہ مشق اور بالغ نظر افسانہ نگار حضرت کوثر چاندپوری۔ نے فرمایا کہ "ڈاکٹر حامدی نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں اپنے فنی خلوص اور اپنی سلامت روی کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں"



بمبئی میں مراٹھی۔ گجراتی۔ سندھی۔ اُردو۔ ہندی اور انگریزی کے ادیبوں نے ایک مشترکہ انجمن "وچار بھارتی" کی تشکیل کی جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک مرکز پر جمع کر کے باہمی تبادلۂ خیال کا موقع دیا جائے اور لسانی ہم آہنگی کی تحریک کو اُستوار کیا جائے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں: ایس۔ ایں۔ نروانے (مراٹھی) ظ۔ انصاری (اُردو) کملیشور (ہندی) موہن لال مہتا سوپان (گجراتی) اور علی جواد زیدی (اُردو)





ایک دعوت میں ہندوستان کے نامور اور نڈر اخبار نویس رانا جنگ بہادر سنگھ
سابق ایڈیٹر "ٹریبون" "دی ٹائمز آف انڈیا" وزیر اعلیٰ پنجاب سردار لچھمن سنگھ گل
کا خیر مقدم کرتے ہوئے رانا صاحب نے گل صاحب کے گلے میں پھولوں کا
ہار ڈالتے ہوئے فرمایا: "گل صاحب کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے پیشِ نظر میں
انھیں مرحوم سردار پرتاپ سنگھ کیروں کا سچا جانشین خیال کرتا ہوں"

دہلی میں اُردو تحریک کی رُوح رواں اور دہلی کو گندی بستیوں سے نجات
والے باعمل سماجی رہنما عظیم عمرانی، خلوص و محبت کے پتلے اور بیار
مخلص یار شری جمنا داس اختر جب پنجاب میں "سب آرڈی نیٹ سروس
کے "چیرمین" مقرر ہوئے تو سردار لچھمن سنگھ گل وزیر اعلیٰ پنجاب نے بڑی گرم
سے اُن کا استقبال کیا اور اُن کی اس تقرری کو اہلِ پنجاب کی خوش نصیبی پر محمول



"سردار لچھمن سنگھ گل خویش پروری اور رشوت ستانی کے جانی دشمن ہیں۔ میں اپنی جنم بھومی پنجاب کی خدمت کا جذبہ لئے وہاں جا رہا ہوں۔ میں
دل و جان سے گل صاحب کی قیادت میں اپنے پنجاب کی خدمت کروں گا" ——— جمنا داس اختر

ایڈیٹر: خوشتر گرامی

ٹیلیفون دفتر ———

ٹیلیفون رہائش ———

سالانہ قیمت خاص نمبر بہ قیمت ہندوستانی و پاکستانی

سکوں میں ——— چھ روپے

ممالک غیر سے ——— پانچ شلنگ



"مردِ کھانا پکائیں گے اور عورتیں سیر و تفریح کریں گی۔" ایک عنوان ـــــــ نہیں بلکہ لیڈری کریں گی۔

° انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنائے رکھنا خودکشی" مرارجی ڈیسائی ـــــــ
نندہ آپ انگریزی میں تقریریں نہ کریں۔ ورنہ اقدامِ خودکشی کا مقدمہ بن

"غذائیت سے محروم قوم" ایک عنوان ـــــــ آج کل چھرے بازی
بھرتی ہے۔

"ہندوستان ایک بیمار دیش ہے" چرن سنگھ سابق وزیرِ اعلیٰ یو۔پی
ـــــ اور آپ اس کو لگی ہوئی بیماری۔

° موٹر کاروں کی تیاری کو معیاری بنانے پر زور" ایک عنوان ـــــــ
لیڈروں اور وزیروں کے بیٹھنے کے لئے۔

° پسماندہ طبقوں کے لئے بیس برس میں کچھ نہیں کیا گیا" ایک عنوان ـــــــ
جھوٹ۔ یہ وزارتیں اور ممبریاں پسماندگی دُور کرنے کے لئے ہی تو تقسیم
ہی ہیں۔

"جن سنگھی دودھ پینے والے مجنوں ہیں اور کانگرسی خون پینے والے" دِلی
کارپوریشن میں ایک کونسلر کی تقریر ـــــــ اور دودھ بھی ملاوٹ کا پیتے
اس لئے قول اور فعل میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے۔

"میرٹھ سے گوہاٹی تک" ایک عنوان ـــــــ ہر طرف مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ۔

° انتظامی کفایت شعاری کی بجائے ریل کا کرایہ اور بھاڑا بڑھا دیا" ـــــــ
کہتا ہے انتظام میں کفایت شعاری نہیں ہو رہی ہے۔ آج کل تو اتنی ہوتی ہے کہ سال
بھر میں ایک کام نہیں ہو پاتا۔



"ہندوستان ایک بیمار [illegible] ہے" چرن سنگھ [illegible] — [illegible] بیماری [illegible]

"[illegible] اقلیتوں [illegible] مفاد کے تحفظ کے لئے کمشنر مقرر کیا جائے" ایک — طالب — تاکہ وہ [illegible] کو بولنا سکھا سکے۔

"پارلیمنٹ کے [illegible]" [illegible] سہیں لگا دو۔

"کانگریس راج کی [illegible] ایک عنوان — [illegible] ادرے۔

[illegible] اساد ہوتے ہیں [illegible]

"غیر قانونی سرگرمیاں [illegible] کا ایک [illegible] ایک عنوان — المارى [illegible] رشتہ کام کرے گا۔

[illegible] وزیر اعلیٰ [illegible]

"ہندوستان [illegible] فرقہ وارانہ [illegible] کی جائے [illegible] — سب کو ایک ایک [illegible] اسپلائی [illegible]

"اکال تخت کا [illegible]" [illegible] عبادت گاہ ہے [illegible]

"شعرا [illegible] کے خلاف سیاہ جھنڈیوں کا مظاہرہ" — [illegible] ہوئے [illegible] استقبال کا طریقہ۔

[illegible] شکست [illegible] [illegible] بن جاؤ۔

بیسوں دی



"یو۔پی میں تمام پارٹیاں اور ممبران درمیانہ مُدت کے انتخابات کے
الف ہیں" سی۔بی گپتا کا بیان ——— اس لئے کہ ابھی پچھلے الیکشن کے قرضے ہی
ں اترے ہیں۔

"مرد کھانا پکائیں گے اور عورتیں سیر و تفریح کریں گی" ایک خبر ———
راتیرے راج میں۔

"آر۔ایس۔ایس اور فسادات" ایک عنوان ——— ایک عنوان نہیں۔
ہی چیز کے دو نام۔

[illegible] ہوائی جہاز کا کچھ پتہ نہیں لگا" ایک خبر ——— ہوائی جہاز

[illegible] ——— جانسن کے دل پر ہاتھ

[illegible] ——— [illegible] اگاندھی ———
[illegible] وہ وہاں رہے

[illegible] ایک خبر ——— ابھی تو بسم اللہ

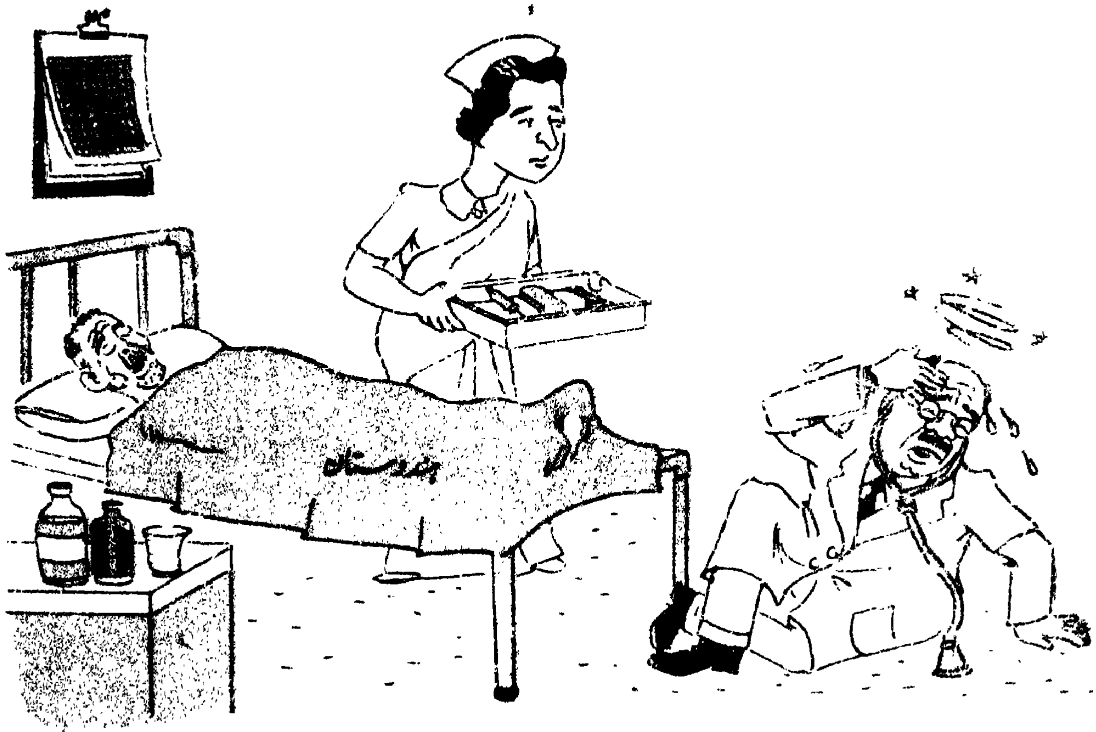
[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ایک خبر ——— ماسٹروں کے ساتھ ہڑتال پر۔



کرے کوئی بھرے کوئی۔ کچھ مرسوئل شاستری جی نے تجویز کیا اور نتائج اندرا گاندھی کو بھگتنے پڑے۔



"ہندوستان ایک بیمار دیش ہے" چرن سنگھ سابق وزیر اعلیٰ یو۔پی ——— اور یہ بیماری ڈاکٹر کے لئے بھی جان لیوا ثابت ہوئی۔

"لسانی اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے کمشنر مقرر کیا جائے" ایک طالب ——— تاکہ وہ سب کو بولنا سکھا سکے۔

"کانگری راج کی برکتیں" ایک عنوان ——— ہر شخص مادر پدر زاد ہے۔

"غیر قانونی سرگرمیاں روکنے کا ایکٹ" ایک عنوان ——— الماری میں رکھے رکھے کام کرے گا۔

"ہندوستان میں فرقہ وارانہ بے چینی کیسے ختم کی جائے" ایک مقالہ ——— سب کو ایک ایک چھرا سپلائی کر کے۔

"شمبھو انیم کے خلاف سیاہ جھنڈیوں کا مظاہرہ" ——— ہارے ہوئے وزیر کے استقبال کا طریقہ۔

"پارلیمنٹ کے ارد گرد دفعہ ۱۴۴" ——— غنیمت ہے کہ اندر نہیں لگا دی۔

"الجزائر میں یکجہتی کانفرنس" ایک خبر ——— تو کیا وہاں بھی ہندو مسلم فساد ہوتے ہیں کہ یکجہتی کی ضرورت پیش آ گئی۔

"پنجاب میں فولاد کا کارخانہ لگے گا" ایک خبر ——— پنجاب کے آہنی وزیر اعلیٰ سردار لچھمن سنگھ گل کا اعلان۔

"اکال تخت کا ناجائز استعمال نہ کرو" ایک عنوان ——— اس لئے کہ وہ مقدس عبادت گاہ ہے۔ اشتہاری مجرموں کی پناہ گاہ نہیں۔

"فرقہ واریت کو ملک سے دور کرنے کے لئے" ایک عنوان ——— سب جن سنگھی بن جاؤ۔

"یو پی میں تمام پارٹیاں اور ممبران درمیانہ مدت کے انتخابات کے مخالف ہیں" سی۔ بی۔ گپتا کا بیان ــــــ اس لئے کہ ابھی پچھلے الیکشن کے قرضے ہی نہیں اترے ہیں۔

"مرد کھانا پکائیں گے اور عورتیں سیر و تفریح کریں گی" ایک خبر ــــــ اندرا تیرے راج میں۔

"آر۔ ایس۔ ایس اور فسادات" ایک عنوان ــــــ ایک عنوان نہیں۔ ایک ہی چیز کے دو نام۔

"لاپتہ ہوائی جہاز کا کچھ پتہ نہیں لگا" ایک خبر ــــــ ہوائی جہاز ہوا ہو گیا۔

"ویتنام کی حالت" ایک عنوان ــــــ جانسن کے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھئے۔

"اردو نے جنگ آزادی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے" اندرا گاندھی ــــــ اس لئے آزادی ملنے پر اُسے ایک ہوم لینڈ (پاکستان) دے دیا ہے۔ اب وہ وہاں رہے۔ یہاں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

"بسم اللہ ہوٹل کے قریب ایک لاش" ایک خبر ــــــ ابھی تو بسم اللہ ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

"ایک مسافر گاڑی پر ڈاکہ" ــــــ احمق کہیں کے۔ مال گاڑی پر ڈاکہ ڈالتے تو مال بھی ہاتھ آتا۔

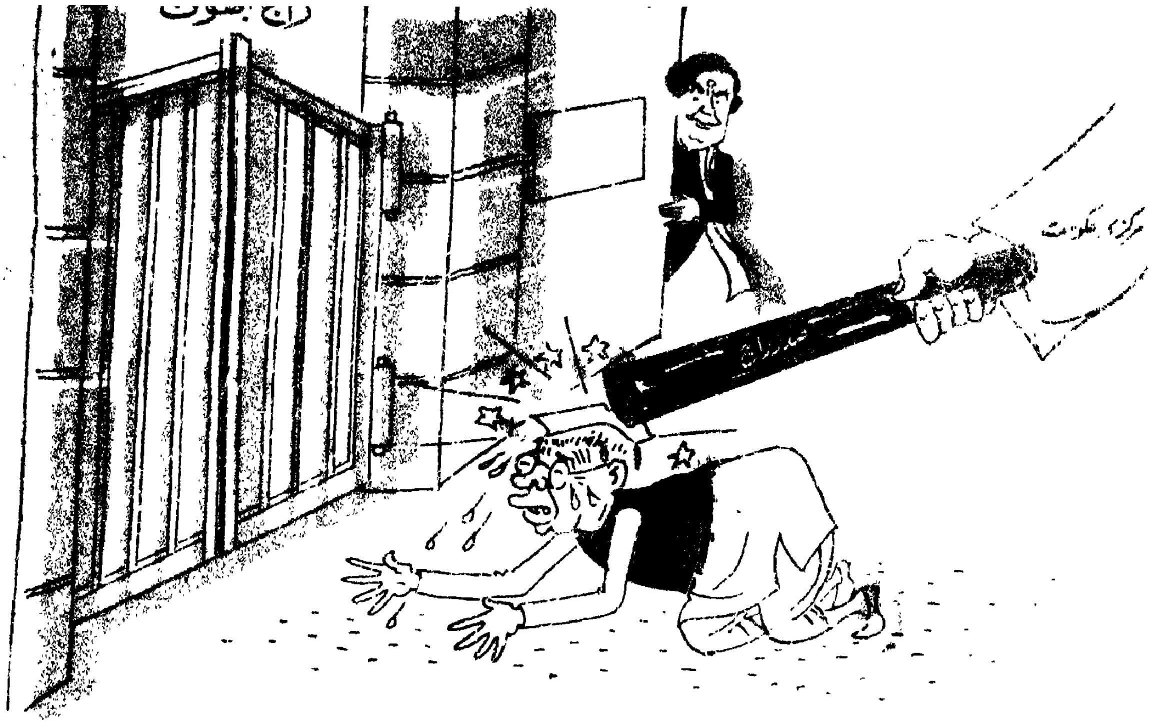
"مغربی بنگال میں صدر راج" ایک خبر ــــــ نہ رہا بانس نہ رہی بانسری۔

"کوئی طالب علم نہیں" ایک خبر ــــــ ماسٹروں کے ساتھ ہڑتال پر۔





کرے کوئی بھرے کوئی۔ کچھ ٹریبونل شاستری جی نے تجویز کیا اور نتائج اندرا گاندھی کو بھگتنے پڑے۔



میں بھی دھادر راج کا نفاذ

"... میں فسادات اور بڑھتی ہوئی لاقانونیت پر وزیر اعظم کا اظہار تشویش" ایک عنوان ——— اور باقی اہل ملک بے پروا۔ وزیر اعظم غم کھانے کو کافی ہیں۔

"پنجابیوں کی اوسط عمر باقی ہندوستانیوں سے زیادہ ہے" گورنر پنجاب کا انکشاف ——— پنجابیوں کے خوش باش رہنے کا نتیجہ۔

"ہندوستان میں امریکہ کے محکمہ جاسوسی کا جال" ایک عنوان ——— اگر واشنگٹن سے چشمہ منگا کر دیکھا جائے تو روس کے ایجنٹوں کے جال بھی نظر آنے لگیں۔

"مدراس میں پولیس غنڈہ راج" ایک عنوان ——— جی نہیں کا مراج ہے۔

"لاشوں اور کھنڈروں کا شہر سائیگاؤں" ایک عنوان ——— یوں کہئے امریکی بربریت کا عجائب گھر۔

"فرض سے لاپروائی پر دو مصری جرنیلوں کو قید کی سزا" ایک خ... ——— نہ ہوئے یہ جرنیل مصر کے دوست ہندوستان کے کہ ان سے نہ صرف ... بازپرس نہ ہوتی بلکہ اعزازات سے نوازا جاتا۔

"ویتنام کی جنگ کو کیسے روکا جائے" ایک عنوان ——— جنگ کر... امریکہ۔ اُسے روکنے کا طریقہ ہم بتائیں۔

"زبان کے مسئلے پر انتشار کا خطرہ" گورنر راجستھان ——— ... مدراس میں، میسور میں اور آندھرا میں جو کچھ زبان کے نام پر ہوا وہ ... بلکہ صرف خطرہ تھا انتشار کا۔

"کمیونسٹ ویت نام میں اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے ..." وزیر خارجہ کی تقریر ——— اپنے مقصد کی ناکامی میں کمیونسٹوں کی ... رہے ہیں جناب رسک۔

"آگرے میں سنگِ مرمر کے فن کی تربیت" ایک عنوان ——— تربیت
حل کرو اور تاج محل بناؤ اور منہ سے گنگناتے جاؤ ؎

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
مرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

"مسلمان درجہ دوم کے شہری ہیں" ایک خبر ——— درجہ دوم تو بڑی بات ہے۔ اِنٹر کلاس کے بھی نہیں۔

"قومی یکجہتی کا خواب" ایک عنوان ——— جسے بیس برس پہلے گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر ڈالا۔

"اخراجات میں کمی کرنے کی بجائے ریل کا کرایہ بڑھا دیا گیا ہے" ایک خبر ——— کرایہ گھٹا دیا جاتا تو فضول خرچی ہوتی۔

"غالب نے اندازِ فکر کے نئے زاویئے پیش کئے ہیں" وزیر اطلاعات کے۔ کے شاہ کی تقریر ——— شاہ نے غالب کا پتہ اُڑا لیا ہے۔ اُس نے خود کہا ہے ؎

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

"بنگال کے کانگرسی لیڈروں کی ڈھٹائی" ایک عنوان ——— کمیونسٹوں کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔

"ہندو راشٹر سینا" ایک عنوان ——— کوئی مضائقہ نہیں۔ جہاں شیو سینا، ناگ سینا، سُرخ سینا اور راجپوت سینا ہے، وہاں ایک اور سہی۔

"شیو سینا پر پابندی کی کوئی ضرورت نہیں" وزیرِ اعلیٰ مدراس کا بیان ——— اس لئے کہ اُس کا نام شیواجی کے نام پر ہے۔



"اُردو نے جنگِ آزادی میں بڑا اہم رول ادا کیا" اندرا گاندھی ——— اسی لئے آزادی ملنے پر اُسے دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔

باقدر، جو اِن کی زندگی پر ہمیشہ اثر انداز ہوا اور گزشتہ سال کانگرس سے نکل کر تحلِ طویلِ احمق کا پورا پورا ثبوت بہم پہنچایا۔ لمبا کتابی چہرہ جس میں لمبائی کی داستانیں نوشتہ ہیں۔ لمبی ناک جو کانگرس سے الگ ہو گئی تھی اور وزارتِ اعلیٰ سے مستعفی ہو کر بالکل صاف ہی ہو گئی۔ کھدر کا کرتہ دھوتی، جواہر کٹ اور گاندھی ٹوپی پہننا معمول ہے۔ یہ ہیں یو۔پی کے سابق وزیرِ اعلیٰ ——

قوم کے جاٹ ہیں۔ اسی لئے استعفیٰ کی تیرھویں بڑی مشکل سے ہوئی ہے۔ نظریات کے کچے ہیں، ہٹ کے پکے ہیں۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام کے مصداق گاندھی بھگت بنتے ہیں مگر مسلا گاندھی جی اور اُن کے نظریات کے قاتلوں کی پرورش اور اُن سے تعاون کرتے ہیں —— قول و فعل اور سیرت و کردار کے تضاد اور تن پر کھدر کی سفید دھوتی کُرتے کو دیکھ کر بگلا بھگت نظر آتے ہیں —— تن گورا، من کالا۔ وزیرِ اعلیٰ بننے کا خواب عرصے سے دیکھ رہے تھے۔ گزشتہ سال کانگرس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر وزیرِ اعلیٰ کی کرسی پر قابض ہو گئے اور جن سنگھیوں کے آلۂ کار بنے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ



سُکون

ڈاکٹر حامدی کاشمیری۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

۳۹۶۔ جواہر نگر، سری نگر

پیارے بھائی! آداب

اختر صاحب سابق مدیر "سویرا" دلی کی الوداعی پارٹی میں آپ کے بے پایاں خلوص اور محبت کا اور زیادہ گہرا احساس ہوا۔ اُف رے "کمرِ ل" کہ آپ بہت جذباتی ہو گئے اور آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ واقعی آپ اپنے دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں ——— دلی کے اس مختصر سے قیام کے دوران میں تین کہانیاں لکھ لی ہیں۔ وہ کہانیاں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے یہ کہانی۔ عنوان ہے "سکون"۔ . .

آپ کا ——— حامدی کاشمیری

وہ اتوار کی شام تھی۔ شکنتلا اور میں فلم کا دوسرا شو دیکھ کر لوٹے تھے اور آتے ہی شکنتلا کچن میں جا کر کھانا پکانے میں لگ گئی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ایک تازہ میگزین کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے مسز ساہنی کھڑی تھی۔

"آپ ——— آیئے ——— اندر آیئے۔"

وہ دھیرے سے مسکرا کر اندر آئی اور صوفے پر بیٹھی۔ اس کے بالوں اور ساڑی سے پھوٹتی ہوئی قیمتی سینٹ کا ایک ہلکا سا جھونکا کمرے کی فضا میں تیر گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس سے کس موضوع پر بات کروں اور بات کیسے شروع کروں۔ ہمیں اس محلے میں آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا اور اس دوران میں میں نے مسز ساہنی کی چند جھلکیاں ہی دیکھی تھیں ——— کبھی کبھی وہ کھڑکی پر اپنی ننگی شانوں پر گھنے بال کھلے چھوڑ کر برآمدے پر ایزی چیئر میں انگڑائی لیتے ہوئے، لان کے نزدیک بینچ پر بیٹھی کسی میگزین میں ڈوبی ہوئی، خانہ باغ میں پھول چنتی ہوئی، کسی سے لہک لہک کر آواز دیتی ہوئی ——— میں مسز ساہنی کو قریب سے دیکھنے کی شدید خواہش رکھتا تھا اور آج ———

"معاف کیجئے، میں نے آپ کو Disturb کیا ہے ———" وہ

"نہیں نہیں، ایسی بات نہیں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ ہمارے گھر آئیں۔ میں اور شکنتلا چاہتے ہی تھے کہ آپ سے ملاقات ———"

"آپ آتے ہی نہیں۔"

"معاف کیجئے، یہی شکایت آپ سے بھی ہو سکتی ہے۔"

"جی ہاں ———" وہ قدرے شرمائی۔ "اصل میں یہاں کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے ہی نہیں، سوشل کنٹیکٹس بڑھاتے نہیں۔"

"بات یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ مشین بنتا جا رہا ہے۔"

"آپ بیٹھئے تو سہی۔"

"میں ——— میں ٹھہرئے میں اندر سے شکنتلا کو بلاتا ہوں۔"

"لیکن میں اس وقت اجازت چاہوں گی۔ میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ لیٹ ——— دروازے کی چابی تو یہاں نہیں رکھی ہے۔ عجیب لڑکی ہے، دروازے پر تالا لگا کر گئی ہے۔ نوکر بھی نہ جانے کہاں مر گیا ہے اور نچلے سیٹ کا کرایہ دار تو ایک دم گھس آدمی ہے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے چابی یہاں ———"

"نہیں تو ——— شاید شکنتلا کو معلوم ہو۔" میں اندر گیا لیکن چابی ہمارے یہاں نہیں رکھی گئی تھی۔ میں کمرے میں آیا تو مسز ساہنی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں انگریزی کا تازہ میگزین تھا۔

"معاف کیجئے، میں نے آپ کی کتابوں کی تلاشی لی اور یہ میگزین ساتھ لے جارہی ہوں"

"ضرور لیجئے" مجھے اُس کی بے تکلفی پسند آئی۔

"شکریہ، میں رات کو دیر تک پڑھتی رہتی ہوں اور پڑھتے پڑھتے ہی مجھے نیند آتی ہے۔ یہ میری عادت ہے۔ میں تو کتابوں کے بغیر رہ نہیں سکتی"

وہ کہتی رہی اور میں اُس کے سراپا کو دیکھ رہا تھا۔ ایک دلکش عورت۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، کاجل سے بوجھل پلکیں، دمکتے ہوئے گال۔ پوڈر استعمال کرنے کا اسے کتنا سلیقہ ہے۔ چہرے کی سُرخی فطری معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے چہرے پر طمانیت اور آسودگی کی کیفیت تھی۔

مسز ساہنی شہر کے ایک خوبصورت بنگلے میں رہتی ہیں۔

"آپ جارہی ہیں کیا؟" شکنتلا آئی۔ بالوں کی ایک اُلجھی سی لٹ ماتھے پر بکھرائے، ہاتھ گیلے اور چہرے پر پسینے کے دھبے لئے "چائے تو پی لیجئے"

"نہیں، شکریہ، پھر کبھی اور وقت سہی"

وہ چلی گئی کمرے کو خوشبوؤں میں بسا کر۔ میں دیر تک اُس کے دلکش حسن کے بارے میں سوچتا رہا۔ شکنتلا عمر میں اُس کی لڑکی کے برابر ہی ہوگی، لیکن کتنی بوڑھی معلوم ہوتی ہے۔ دو بچوں کی پیدائش نے اُس کی صحت کو غارت کر دیا لیکن اس عورت کا جسمانی حسن کتنا دلکش ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، بڑھاپا کبھی اس کے پاس پھٹکے گا نہیں۔

میں اُس کی کوٹھی کے وسیع برآمدے میں کھڑا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے۔ درختوں کے زرد پتّے فضا میں بکھر رہے تھے۔ میں نے دوبارہ بٹن دبایا اور دوسرے لمحے دروازہ کھُلا۔ میرے سامنے ایک دراز قد والی لڑکی کھڑی تھی۔ سر پر ترشے ہوئے خشک اور اُلجھے ہوئے بالوں کا ایک ہجوم لئے جدید وضع کی سیاہ فریم والی دبیز عینک لگائے، چہرے پر خاموشی اور ویرانی۔ وہ ایک موٹے سوئٹر میں ملبوس تھی۔

"جی ۔۔۔؟ فرمایئے" وہ خشک لہجے میں بولی۔

"میں ۔۔۔ میں سامنے کے مکان میں رہتا ہوں۔ مسز ساہنی سے ملنا ہے"

اُس نے بڑی بے تعلقی سے مجھے دیکھا اور اندر چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد مسز ساہنی آئی اور مسکراتی ہوئی مجھے اندر لے گئی۔

یہ اُس کے سونے کا کمرہ تھا، بے حد خوبصورت۔ ہر چیز قرینے سے آراستہ تھی اور مسز ساہنی کی نفاست پسندی اور جمالیاتی ذوق کی مظہر۔

"معاف کیجئے ۔۔۔" وہ کمرے کے اندر آکر میرے سامنے کرسی پر بیٹھی۔

اُس کا سلیولیس بلاؤز اُس کے جسم پر بہت چُست تھا۔ اُس کے بازو بہت سڈول! کتنی صحت مند تھی وہ! ۔۔۔ "یہ کلپنا بھی عجیب لڑکی ہے ۔۔۔ پتہ نہیں کیوں مجھے پریشان کرتی رہی ہے۔ بچپن ہی سے بہت ضدی تھی اور مجھ سے ہر بات پر اختلاف کرتی۔ میں شام کو پڑھنے کو کہتی تو کتاب پھینک دیتی اور جب میں سو جاتی تو رات گئے تک پڑھتی رہتی۔ کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ اس کے ذہن پر ڈیڈی کی اچانک موت کا اثر موجود ہے۔ لیکن میں یہ نہیں مانتی۔ جب وہ ہوائی جہاز کے حادثے میں مر گئے تو کلپنا صرف ڈھائی برس کی تھی۔ اُسے ڈیڈی سے بہت لگاؤ تھا لیکن ۔۔۔ دیکھئے، میں پچھلے دو سال سے کہہ رہی ہوں یہاں گھر میں بیٹھے بیٹھے کیا کر رہی ہو ۔۔۔ سرکاری یا پرائیویٹ کالج میں نوکری کر لو۔ دو سال پہلے ایم۔اے کر چکی ہے، لیکن نہیں مانتی ۔۔۔ بس بیٹھی رہتی ہے۔ گھنٹوں تک لیٹی رہتی ہے۔ کبھی انگریزی میں نظمیں لکھتی ہے اور کبھی رنگوں سے کچھ اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچتی رہتی ہے"

"اچھا تو کلپنا آرٹسٹ ہے کیا؟"

"ہوگی، مجھے نہیں معلوم ۔۔۔ جب سے یہ نیا کرایہ دار آیا ہے، کلپنا کا دماغ چل گیا ہے۔ اُس کے ساتھ پہروں تک بحثیں کرتی رہتی ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو آرٹسٹ کہتا ہے، عجیب صورتیں بناتے رہتا ہے، پڑھا لکھا بہت ہے۔ انجینئر ہے لیکن دن رات پیتے رہتا ہے۔ اب دیکھئے، جو آدمی ہر وقت نشے میں ہو، کلپنا کو اُس کے ساتھ ۔۔۔ لیکن میں تو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی ۔۔۔ عجیب لڑکی ہے"

"آپ نے کلپنا سے ملایا ہی نہیں"

"ابھی میں اُسے بُلانے ہی گئی تھی۔ دیکھا وہ اپنے کمرے میں نہیں نیچے اُسی کے پاس بیٹھی ہے اور وہاں سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتی ۔۔۔ اب وہ کمرہ بھی دیکھئے۔ دُنیا بھر کا انتشار، وہسکی اور سگریٹ کے دھوئیں میں ڈوبا ہوا ۔۔۔ میں تو اسی ماہ اس آرٹسٹ کے بچے کو چھٹی کر دوں گی"

"واقعی ایسے انسان کو اپنے گھر میں جگہ دینا مناسب نہیں ۔۔۔" میں نے تائید کی۔

"جانے دیجئے، میں خود اُس سے نمٹ لوں گی۔ اچھا تو اب ذرا میں مطلب کی بات کروں" اچانک اُس کے لہجے کی جھلاہٹ کافور ہوگئی ۔۔۔ "میں کئی سال سے ایم۔اے انگلش کرنا چاہتی ہوں اور اسی لئے آج آپ کو تکلیف دی ہے"

"تکلیف کی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ جس سال کلپنا ایم۔اے کا امتحان دے چکی اُس سے ایک سال پہلے میں تیاری کر چکی تھی۔ لیکن عین وقت پر میں بیمار ہوگئی اور بس سوچتی ہی رہ گئی۔ اب چاہے کچھ بھی ہو، میں ایم۔اے کر لوں گی۔ مجھے گریجویشن ...

نوٹس چاہئیں اور پھر ——"

"آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو، کتابیں، نوٹس، میں حاضر ہوں۔"

"شکریہ —— اصل میں میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ مجھ سے بے کار نہیں بیٹھا جاتا۔"

مسز ساہنی کی شخصیت میں میری دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور مسز ساہنی کا بھرپور جسم میری نگاہوں کو بہکا رہا تھا۔

"آج پھر مسز ساہنی غصّے سے پاگل ہو گئی تھی۔" شکنتلا نے چائے کی پیالی میں چینی گھولتے ہوئے کہا۔

"ہوا کیا تھا، کچھ پتہ چلا؟"

"ہاں میں ابھی ابھی اُن کے یہاں سے لوٹی ہوں۔ وہ مجھے جانے ہی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے کہا آپ ڈیپارٹمنٹ سے آ رہے ہوں گے، تب کہیں میری گلو خلاصی ہوئی۔"

"تو پھر آج تم پوری ریسرچ کر کے آئی ہو۔"

"جی ہاں —— جھگڑا پھر ماں بیٹی کے بیچ میں تھا۔ کئی برسوں کے انتظار کے بعد کلپنا کے لئے جگدیش موٹر پارٹس، وہی چوک والی بڑی دکان، کی طرف سے رشتہ آیا تھا، لیکن بے چاری کو یہ رشتہ لوٹانا پڑا۔"

"کیوں؟"

"وہی کلپنا کی ضد اور کیا؟"

"آخر وہ چاہتی کیا ہے؟"

"ساری زندگی کنواری رہنا چاہتی ہے —— شادی کو خواہ مخواہ کی جھنجھٹ سمجھتی ہے، پگلی!"

"خوب! دونوں ماں بیٹی Psychic معلوم ہوتی ہیں۔" میں ہنس پڑا۔

"آج مسز ساہنی نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا۔ وہ چُپ چاپ سنتی رہی اور حیرت کی بات یہ ہے ——"

"کیا؟" میں نے چائے کا دوسرا کپ خالی کیا۔

"غصّے میں جب مسز ساہنی نے کرائے دار پر بھی وار کیا تو کلپنا سخت برہم ہوئی اور انگریزی میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے؟"

"ہاں یہ سب میرے سامنے ہوا۔ مسز ساہنی نے بعد میں خود کہا کہ جو بھی کرائے دار آتا ہے، کلپنا اُس سے بے تکلف ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نئے کرائے دار کو دو تین مہینوں سے زیادہ ٹکنے نہیں دیتی —— بے چاری بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔"

اُس کے سُرخ ہونٹ بھیگے ہوئے تھے اور چمکتی آنکھوں میں نشہ اُمڈ رہا تھا۔ لیکن باتوں سے معلوم ہوتا تھا وہ ہوش و حواس میں ہے۔ میں نے ارسطو کی 'پوئٹکس' کی ایک تازہ تشریح پیش کی تو اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ کر کہنے لگی —— "میں آج آرٹسٹ کے کمرے میں گئی تھی۔ دیر تک بیٹھی رہی۔ کلپنا کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ عجیب ہوتے ہیں یہ آرٹسٹ بھی۔ ایک نئی تصویر پر میری رائے پوچھ رہا تھا۔ تصویر کیا تھی، اوپر کا دھڑ پاگل کتّے کا معلوم ہوتا تھا اور نیچے کا دھڑ عورت کا۔ کیا جوڑ ہے دونوں کا بھلا؟ کیا کیا سوچتے رہتے ہیں یہ لوگ! اور کتنی پی گیا تھا وہ —— اب وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر گیا ہے۔ میرا خیال ہے کلپنا کو دیکھنے گیا ہے۔ کہتا تھا وہ آرٹ ایگزیبیشن دیکھنے گئی ہوگی —— کس قدر پی گیا وہ۔ لیکن بڑا انٹیلکچول ہے۔ ڈرنکس نے اُسے تباہ کیا ہے۔ میں شراب کو بُرا نہیں سمجھتی۔ لیکن اگر پینے میں توازن نہ رہے تو یہ واہیات چیز ہے۔ کلپنا کو میں بچپن ہی سے برانڈی پلاتی رہی ہوں" —— اُس کی بہکی ہوئی سانسوں میں وہسکی کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ اُس کے چمکتے ہوئے بھیگے بھیگے ہونٹ میری ساری توجہ کا مرکز تھے۔

"آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھتے ہیں؟" اچانک وہ بولی۔

"میں ——؟ نہیں تو ——"

"پروفیسر صاحب! سچ کہتی ہوں، میں بہت تھک گئی ہوں۔ زندگی کتنی بے معنی ہے، کتنی بورنگ، کتنی پھیکی سی۔ ایک سایہ ہے اور بس! میں بھی کتنی عجیب ہوں۔ سایوں کے پیچھے بھاگتی ہوں اور تھک ہار کر گر پڑتی ہوں۔ میرا جسم ٹوٹ جاتا ہے۔ دیکھئے میں بھی کیسی باتیں کرنے لگی۔ آج ہمیں ارسطو کے Conception [illegible] پر بات کرنا تھی، لیکن —— پھر کسی وقت سہی۔ آج میرے ذہن پر آرٹسٹ بُری طرح سوار ہو چکا ہے۔ میں اُس سے نفرت کرتی ہوں، اُس کے آرٹ سے نفرت کرتی ہوں۔ کسی وقت اپنے آپ سے بھی مجھے نفرت ہوتی ہے۔ نفرت کی آگ سے سلا ہم الاؤ بن جاتا ہے ——" وہ رُک رُک کر کہہ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک رقص کر رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں شکنتلا آئی۔

"کیا بات تھی؟"

"وہی کرائے دار سے جھگڑا۔"

"تم [illegible] کرا کے آئیں نا؟"

مسز ساہنی غصّے سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور زور زور سے چیخ رہی تھی

اُس نے کرائے دار کو کل صبح گھر چھوڑ دینے کو کہا ہے۔ وہ چپ تھا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کلپنا بھی چپ چاپ کھڑی تھی۔ مسز ساہنی مجھ سے بات کرنے لگی اور کلپنا اپنے کمرے میں گئی اور کرائے دار منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ پھر اوپر کے کمرے سامان وغیرہ سمیٹنے لگا ——— محلّے کے دو چار لوگ بھی آئے تھے۔ سخت جھگڑا ہوا تھا۔ مسز ساہنی نے تو یہ نہیں بتائی کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کرائے دار کلپنا پر ڈورے ڈال رہا ہے۔"

"اور یہ مسز ساہنی کی برداشت سے باہر ہے؟" میں ہنس پڑا۔

"ہاں، بڑی عجیب تعلق ہے۔"

"چلو یہ جھگڑا اب ختم ہوا۔ بچاری مسز ساہنی کو اب کچھ سکون ملے گا۔"

دوسرے دن میں اُس کے گھر گیا۔

مسز ساہنی مسکراتی ہوئی ملی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی نیند سے جاگی ہے۔ اُس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ زردی مائل اُلجھے اُلجھے بال کھلے تھے۔

"چلئے اچھا ہوا آپ نے کرائے دار کو چلتا کر دیا۔ خواہ مخواہ روز روز کا جھگڑا۔"

"ں ——— یہ کیا کہتے ہیں آپ؟" وہ چونکی۔ "عجیب لڑکی ہے یہ کلپنا بھی۔ آپ نہیں جانتے وہ ایک پرابلم چائلڈ رہی ہے میرے لئے۔"

"ہاں ہاں وہی تو کہہ رہی ہوں۔ میں نے ہی اسے ایسا نے سمجھ لیا اُس کی منّت کی تھینک گارڈ۔ اُس نے جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔"

"اچھا ——— ؟"

"ہاں ہاں ——— کل شام کو میں نے اُس کی خوب خبر لی اور پھر ——— میں نے دیکھا کلپنا کچھ کھائے پئے بغیر کمرے میں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ میں نے رات کو ایک بجے اُس کے کمرے میں جھانکا۔ میں دیر سے سوتی ہوں نا؟ ——— اور میں نے دیکھا کلپنا کی بند پلکوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ یہ دیکھ کر میں تڑپ اُٹھی۔ ساری بات سمجھیں میں عجیب انسان ہوں۔ بڑی [illegible] ہوں پروفیسر صاحب ——— آج شام کو وہ دونوں انگریزی فلم دیکھنے گئے ہیں۔ میں نے ہی جانے کو کہا ———"

مسز ساہنی رُک رُک کر بول رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں سکون تھا اور میں دیکھ رہا تھا میک اپ نہ کرنے کے باوجود وہ ایک خاص دلکشی رکھتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بھی سکون تھا اور اُس کے چہرے پر غم کا ایک انوکھا وقار ——— میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا !!

مدیرِ بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزلیں

محمد مشتاق الرحمٰن خاں منشار۔ ایم اے

ذکر اُن کا سحر و شام، یہ قصہ کیا ہے
تو ہی بتلا دلِ ناکام! یہ قصہ کیا ہے

ہم گنہگارِ محبت تو ہیں، لیکن ہم پر
ہر گھڑی نت نئے الزام، یہ قصہ کیا ہے

تم بصد ناز نگاہوں کو جھکا لیتے ہو
جب بھی سُنتے ہو مرا نام، یہ قصہ کیا ہے

اب نہ پہلی سی وہ راتیں ہیں نہ اگلے سے وہ دن
سچ بتا گردشِ ایام، یہ قصہ کیا ہے

سوچتے سوچتے انجامِ بہاراں منشار
تم ہوئے لرزہ بر اندام یہ قصہ کیا ہے

پروفیسر اختر نظمی ایم اے

اب تک جسے نغموں کا جہاں ڈھونڈ رہا ہے
شاید یہ مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے

افسانۂ غم کہیئے کہ رُودادِ تمنّا
ہے بات وہی بات کا انداز جُدا ہے

تنہا نہیں میں موردِ الزامِ تمنّا
تم کو بھی جہاں نے یہی الزام دیا ہے

یہ وہ تو نہیں خضر جسے کہتی ہے دُنیا
اک شخص مرے نقشِ قدم ڈھونڈ رہا ہے

اب رِندِ غمِ تشنہ لبی سہہ نہ سکیں گے
اِس بار تو ساقی کا کہا مان لیا ہے

افسانہ

چار آنسو

اظہر عباس زیدی۔ ایم۔ اے (علیگ)

روم نمبر ۸۸، عثمانیہ ہوسٹل، سرسید ہال، مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

محترم گرامی صاحب! آداب

"چار آنسو" لے کر آپ کی بزم میں شرکت کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اجنبی سمجھ لیں یا جانا پہچانا! ۔۔۔۔ افسانے کے متعلق صرف اتنا ہی کہنا ہے، یہ ایک نوجوان لڑکی کی Psycho analysis ہے اور ساتھ ہی ایک ایسے ماحول کی عکاسی بھی جس میں دَم گھٹتا ہے ۔۔۔۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہماری زندگی میں چند لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب جی چاہتا ہے کہ وقت کی رفتار رُک جائے یا پھر مرجانے کو جی چاہتا ہے

امید ہے کہ پسند سے نوازیں گے ۔۔۔۔ "بیسویں صدی" کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ . . .

آپ کا ۔۔۔۔ اظہر عباس زیدی

میں جس وقت وارڈ میں داخل ہوا، دن کی ڈیوٹی کے ڈاکٹر جاچکے تھے۔ رات کو وارڈ میں ڈیوٹی دینے والی نرس مریضوں کو کھانا کھلاکر دوائیں پلا رہی تھی۔ اُس لیڈیز وارڈ میں صرف چند کو چھوڑکر باقی کیس معمولی نوعیت کے تھے۔ میں بیڈ نمبر ۸ کے پاس جاکر رُک گیا۔ اُس پر ایک بُوڑھی عورت تھی۔ جس کے گُردے کا آپریشن ہوا تھا اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش سے گُزر رہی تھی۔ موت کتنی نزدیک تھی، زندگی کتنی دُور! میں نے اُس کی رپورٹ دیکھی، بخار تھا لیکن سو رہی تھی۔ اِس لئے میں آگے بڑھ گیا۔ نمبر ۹ پر ایک شادی شُدہ عورت تھی جسے پہلی ڈیلیوری کے وقت آپریشن کرانا پڑا تھا۔ اُس کی حالت نازک تھی۔ پاس ہی اُس کا نوزائیدہ بچہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک کو زندگی مِل رہی تھی، ایک کی ختم ہو رہی تھی۔ موت اور زندگی کو ہم آغوش دیکھتا ہوا میں نمبر ۱ کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اُس کی بیڈ کی مریضہ دو ہی دن پہلے وارڈ میں آئی تھی لیکن پُورے ہاسپٹل کی گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو اُس نے کسی مرد ڈاکٹر کو دکھانے سے ہی انکار کیا۔ بعد میں جب اُسے مجبور کیا گیا تو صرف اِس شرط پر راضی ہوئی کہ وہ اپنا چہرہ نہ دکھائے گی اور نہ نبض ہی دکھانے کے لئے ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہاتھ دے گی۔ اُس کی دونوں باتیں مان لی گئی تھیں۔ آج جب میں پہلی بار رات ڈیوٹی پر آیا تو ڈاکٹر ورما نے مجھے ڈیوٹی روم ہی میں اُس عجیب مریضہ کے بارے میں بتایا تھا۔ ورما نے کہا تھا کہ اگر میں اِس لڑکی کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ میرا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

نمبر ۱ کے پاس جاکر میں کھڑا ہوگیا۔ ہاسپٹل کی سفید چادر اوڑھے مریضہ لیٹی تھی۔ اُس نے اپنا چہرہ کالے دوپٹے میں اِس طرح چُھپا رکھا تھا کہ بال تک نظر نہیں آرہے تھے۔ دو منٹ تک خاموشی رہی۔ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ سو تو نہیں رہی ہے۔

"کہیئے! پھر کوئی دوا پلانی ہے کیا؟" تلخ و شیریں زبان سے نکلے ہوئے اِن الفاظ نے اُس کے جاگنے کی تصدیق کردی۔

"جی نہیں! میں تو آپ کا مزاج پوچھنے آیا تھا۔ کہیئے کیسی ہیں آپ؟" میں نے اپنے لہجے کی تمام شیرینی جمع کرکے یہ الفاظ ادا کیئے۔

"زندہ ہوں!" سرد لہجے میں جواب ملا۔

"کچھ مایوس معلوم ہوتی ہیں آپ!" میں نے نزدیک پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ کر اُس کی رپورٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو اِس سے کیا غرض؟ آپ ڈاکٹر ہیں صرف علاج کیجیئے"

"ڈاکٹر انسان بھی تو ہوتے ہیں۔ اُن کے دل میں بھی تو ہمدردی اور محبت کے

جذبات ہوتے ہیں۔ آپ یہ سب کیوں بھول رہی ہیں؟"
"سر میں ہلکی سی تپش ہے ... مجھے ... ہوا اور آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔"
"آپ ڈاکٹر بھی ... انسان ہیں؟ ڈاکٹر تو بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ زندگی
دینے کم ہیں، لیتے زیادہ ہیں۔"
"یہ آپ سے کس نے کہا؟ ہم تو ... زندگی بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ موت و
زندگی تو خدا کے ہاتھ ہے۔"
"تو پھر مجھے زندگی ... ڈاکٹر! ... زندگی کہ مجھے دوبارہ زندہ رہنے
کی خواہش نہ ہو۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی ڈاکٹر! مجھے موت دے دو۔ وہ اس زندگی
سے بہتر ہوگی ... موت! ... میرے لئے اب نئی زندگی!!"
"لیکن کیوں؟ آپ اتنی مایوس کیوں ہیں؟ آپ کی بیماری بھی تو اتنی خطرناک
نہیں ... بہت معمولی سا بخار وغیرہ ہے۔ کچھ دن میں اچھی ہو جائیں گی۔"
"آپ نہیں جانتے ڈاکٹر! ____ آپ نہیں جانتے!!" اُس نے گردن میری
طرف موڑ لی۔ چادر میں سے ایک ہاتھ باہر آ گیا۔ خوبصورت سی کلائی میں کالا دھاگا بندھا
ہوا تھا۔ میں نے ... نظریں جماتے ہوئے کہہ دیا۔
"کیا ... کو نظر ... بچانے کے لئے یہ دھاگا باندھا گیا ہے؟"
"نظر؟ ... مجھے کس کی نظر لگے گی؟ سات پردوں میں رہنے والی جو آج پہلی بار
مکان کی چہار دیواری سے باہر نکلی ہے اُسے کس کی نظر لگے گی؟ مجھے چوڑیاں پسند نہیں
اس لئے یہ دھاگا باندھ رکھا ہے۔"
"کیوں پسند نہیں چوڑیاں؟" میں نے آہستہ سے کہا۔
"ڈاکٹر! آپ نے کہا آپ انسان بھی ہیں۔ ہمدرد بھی ... اور ... صرف اس لئے
آپ کو بتاتی ہوں۔" دوسرا ہاتھ بھی باہر آ گیا۔
"آپ تھوڑا اور نزدیک آ جائیں۔ مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے۔ اس ساری دنیا
سے ... نہیں نہیں مجھے آپ کو نہیں بتانا چاہئے ____ میں کیوں بتاؤں؟ ____ آپ
نہ جانے کیا سوچیں گے؟ پھر بتاؤں بھی کیا؟ ____ بتاؤں بھی ... کیا؟ ____ آپ نہ جانے
میرے بارے میں کیا سوچیں ____ مجھے پاگل ... نہیں ڈاکٹر! مجھے تنہا چھوڑ دو۔"
"آپ ڈرئیے نہیں۔ مجھے اپنا ہی سمجھئے۔"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! بھلا اجنبی بھی کبھی اپنے ہوئے ہیں ...
اور پھر میرے اپنے بھی جب اپنے نہ بن سکے تو آپ؟"
"ایک ڈاکٹر اور مریض میں اس تجارتی رشتے کے علاوہ بھی ایک رشتہ ہوتا ہے
اور وہ رشتہ ہوتا ہے انسانیت کا! اگر آپ اس رشتے کی قائل ہیں تو مجھے غیر نہ سمجھئے ____
ورنہ مجھے ابھی اور مریض بھی دیکھنے ہیں۔"

لڑکی میری سمجھ میں بالکل نہیں آ سکی تھی۔ اُس کا چہرہ اب بھی کالے دوپٹے میں
لپٹا ہوا تھا۔ کوشش کے باوجود میں اُس کے خد و خال کا اندازہ نہ لگا سکا۔
بیڈ نمبر ۱۱ پر ایک اور نوجوان لڑکی تھی۔ اُس کے گلے میں کچھ تکلیف تھی۔ یہ
صاحبزادی ایک مقامی کالج کی طالبہ تھیں۔
"ہلو! کیسی ہیں آپ؟" میں نے رپورٹ چارٹ دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ کی عنایت ہے ڈاکٹر! ____ اب تو کافی آرام ہے۔"
خد و خال معمولی تھے لیکن فیشن کی دلدادہ معلوم ہوتی تھی۔ ہاسپٹل میں
بھی میک اپ کر رکھا تھا۔
"آپ اپنا بہت خیال رکھتی ہیں!"
"جب بھی تو آپ لوگ ..." وہ میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔
"ہم لوگ کیا ...؟" میں نے بھی اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے
سوال کیا۔
"جب بھی تو آپ کچھ نہیں سمجھتے۔"
"کیا سمجھنا چاہئے؟"
"جو آپ چاہیں۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔ مجھے نمبر ۱۰ یاد آیا اور جواب دئے
بغیر میں آگے بڑھ گیا۔ ہونٹ دانتوں میں دبا کر وہ چھت کو گھورنے لگی۔ میں نے دو تین
مریض اور دیکھے۔ نمبر ۱۰ اب بھی میرے ذہن میں تھا۔ عجیب قنوطی لڑکی تھی۔ میری سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کس طرح عام حالت میں لاؤں۔ وارڈ کا ایک چکر لگا کر میں پھر
اُس کے بیڈ کے پاس پہنچ گیا۔
"آپ پھر آ گئے ____ ایک خزاں ..."
"مجھے آپ کا ٹمپریچر دیکھنا ہے۔" میں نے اُس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔ "یہ
تھرمامیٹر منہ میں لگا لیں۔" میرا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔
دوپٹہ تھوڑا سا سرکا۔ میں سہم گیا۔ دو ویران سی آنکھیں میرے چہرے پر
جمی ہوئی تھیں۔
"آپ کا لہجہ بدل گیا ڈاکٹر! آپ بھی ناراض ہو گئے۔ مجھے افسوس ہے
ڈاکٹر! سخت افسوس! مجھے معاف کر دیجئے ____" ایک سرد سا ہاتھ میرے ہاتھ سے
تھرمامیٹر لینے کے لئے ٹکرایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی لاش کے پاس کھڑا ہوں۔
"معافی کیسی؟ آپ نے تو کوئی غلطی نہیں کی ہے۔" میں نے آہستہ سے اُس کا
ہاتھ چادر کے اندر کر دیا۔
"سردی زیادہ ہے ہاتھ اندر ہی رکھئے۔"
"نہیں ڈاکٹر! مجھے تو گرمی لگ رہی ہے۔ میں جل رہی ہوں۔ میرا سارا

وجود جل رہا ہے ــــ آپ نے مجھ سے جس لہجے میں گفتگو کی اُس کے لئے میں برسوں سے ترس رہی تھی۔ کرخت آواز میں باتیں سُننے والی آپ کے شیریں لہجے کی قدر نہ کر سکی۔ آپ بیٹھ جائیں ڈاکٹر!"

"مجھے ظفر کہتے ہیں۔ آپ مجھے اِس نام سے بھی مخاطب کر سکتی ہیں ــــ آپ تھرما میٹر مُنہ میں لگا لیجئے۔ میں نرس سے کافی کے لئے کہتا ہوں اور ــــ ہاں آپ کو دوپٹہ بھی تو ہٹانا ہے۔ میرے سامنے . . ."

"آپ باہر کی دُنیا کے لوگ ہیں۔ میں ایک چہار دیواری میں بسنے والی نہیں جانتی کہ آپ کو میرا چہرہ کیسا معلوم ہوگا اور پھر ہمت بھی تو نہیں پڑتی۔ یہ شرم بھی بہت بُری چیز ہوتی ہے۔ اب دیکھئے نا آپ کا اخلاق اور مجھے شرم . . . میں . ."

وہ بولتی رہی۔ میں نرس سے کافی کے لئے کہہ کر آیا تو سیاہ بادلوں میں چاند تھا۔ یا کائی مَتی والے تالاب میں کنول یا پھر نگاہ کا فریب!! دوپٹہ چہرے پر سے ہٹ چکا تھا۔ سیاہ بال بے ترتیبی سے جبیں پر بکھرے ہوئے تھے۔ بوجھل سی پلکیں نگاہوں کی بے چینی کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔ میں ڈوب سا گیا۔

"تھرمامیٹر تو دیکھا نہیں آپ نے ڈاکٹر!" اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں بے خیالی سے دبے ہوئے تھرمامیٹر سے ایک بار پھر ٹکرایا۔

"اوں۔ ہاں ــــ دیکھتا ہوں" میں نے تھرمامیٹر اوپر اُٹھایا لیکن پارا گر چکا تھا۔

"لیجئے پھر سے لگا دیجئے" اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں اُس نے میٹر مُنہ میں لگانے کا اشارہ کیا۔

میرا ہاتھ خود بخود اُس کے ہونٹوں کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے مُنہ کھولا موتی سے سفید دانت چمک گئے۔ ہاتھ کی اُنگلیاں ایک لمحہ کے لئے ہونٹوں سے ٹکرائیں۔ مجھے انگارے کی حدّت کا سا احساس ہوا۔

"یہ آپ کے ہونٹ ــــ یہ ؟"

آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ہوئی۔ لڑکیوں سے متاثر ہونے والا ڈاکٹر ظفر ایک مریضہ کے سامنے بے بس کھڑا تھا۔ اِتنی اپنائیت مجھے کبھی کسی آنکھ میں نظر نہ آئی تھی۔ آنکھیں دل و دماغ کی سفیر ہوتی ہیں۔ اِس کا ثبوت مجھے پہلی بار مل رہا تھا ــــ صرف پہلی بار!

چند لمحوں بعد میں نے تھرمامیٹر نکالنے کے لئے پھر ہاتھ بڑھایا۔ تبھی اُس کا ہاتھ بھی بڑھا۔ دونوں ہاتھ ٹکرا گئے۔ وہ لرز سی گئی ــــ بخار تھا۔

"کتنا ہے؟ ــــ دیکھوں!" اُس نے اُٹھنا چاہا لیکن میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سر پھر تکیہ پر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ رکھنے سے اُسے سکون سا محسوس ہوا۔ آنکھیں بند کرکے ایک طویل سانس لی۔

"کچھ زیادہ نہیں ہے۔ میں دوا دے دیتا ہوں۔ صبح تک اُتر جائے گا۔"

"کیا ٹائم ہوا ہے ؟"

"ایک بجا ہے ــــ نیند آ رہی ہوگی ــــ ؟ سو جاؤ۔"

"کیسے سوؤں ؟ لیکن نہیں! اب تو سونا ہی پڑے گا۔ آپ جا کر آرام کریں ڈاکٹر! بہت رات ہو گئی!"

"دوا نہیں پینی ہے کیا ؟"

ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ آئی۔ کاش وہ اِسی طرح مُسکراتی رہے!

چند منٹ بعد میں جب دوا لے کر لوٹا تو وہ پھر سنجیدہ ہو چکی تھی۔ دو ویران سی آنکھیں ایک بار پھر میری طرف اُٹھیں۔ بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر بکھر گئی تھی۔ میں نے ہاتھ سے ہٹا دیا۔ کچھ بولی نہیں، اُسی طرح دیکھتی رہی۔

دوا پلانے کے بعد میں نے اُسے ہلکا سا سہارا دیا۔ بغیر کسی تکلف کے پی گئی۔

"اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ صبح تک بخار اُتر جائے گا۔ خوب اطمینان سے سوؤ۔"

"اچھا ــــ ڈاکٹر۔ خدا حافظ!" آنکھوں میں دو آنسو چمک رہے تھے۔

"ارے یہ کیا ؟ یہ کیا بے وقوفی ہے ؟" کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر میں نے آنسو اُس میں جذب کر لئے۔

"کچھ نہیں ڈاکٹر! بس یوں ہی" اُس نے زبردستی مُسکرانے کی کوشش کی۔

"اچھا اب سو جاؤ ــــ شب بخیر!"

"شب بخیر!"

میں بہت رات گئے تک نہ سو سکا۔ ڈیوٹی روم کے صوفے پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ عجیب لڑکی تھی۔ کہاں تو اِتنا سخت پردہ اور کہاں اِتنی آسانی سے سامنے آ گئی۔ معلوم نہیں اپنے بارے میں کیا بتانے والی تھی پھر ٹال گئی۔ شاید پھر بتائے۔ مجھے اپنے اوپر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ صبح جب ورما کو معلوم ہوگا کہ میں اُس کی شکل ہی دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ . . . تو جل جائے گا بالکل ــــ اور ہاں اِتنی اُداس کیوں تھی ؟ . . . نہ جانے کیوں بہت اچھی معلوم ہوئی ــــ کتنی پاکیزگی تھی چہرے پر ــــ ایک عجیب سا نُور ــــ نہ جانے کون ہے ؟ کیا نام ہے ؟ خیر جب ایک ہی دن میں اِتنی بے تکلف ہو گئی تو کل تک سب معلوم ہو جائے گا ــــ سب ــــ تب ہو سکتا ہے میں اُس کے بارے میں سوچوں ــــ لیکن میں تو ابھی سے سوچ رہا ہوں ــــ حسین جذبے، حسین خواب لئے نہ جانے کب سو گیا۔

اچانک کئی آوازوں نے مجھے جگا دیا۔

"کیا بات ہے نرس ؟ ورما کیا ہوا ؟ تم لوگ اِتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو ؟

[illegible] سب مریض ہی ہیں نا؟
لیکن کسی نے میرے سوالات کا جواب نہ دیا۔ دراصل ایک خط میرے ہاتھ میں دیا۔ لکھا تھا ـــــــــ

ڈاکٹر! آداب، یاد ہیں

اندازِ تخاطب پر چونکیے نہیں!

آپ کو یاد ہوگا کل رات میں آپ سے ذکر کرنا چاہتی تھی کہ میں کون ہوں، لیکن پھر نہ جانے کیوں ہمت نہ پڑی۔ پھر آپ نے موقع بھی نہ دیا اور سونے کا حکم دے دیا۔ جب یہ خط آپ کو ملے گا میں نہایت آرام کی نیند سو رہی ہوں گی۔ بالکل ویسی ہی جس کے لئے آپ نے کل کہا تھا۔

ڈاکٹر! اگر تھوڑی دیر کے لئے "تم" کہنے کی اجازت دو تو ایک حسرت کی تکمیل ہو جائے گی ـــــــ اب نہ جانے تم کیا سوچ رہے ہوگے۔ میں کیسی لڑکی ہوں؟ بالکل پاگل ہوں ـــــ ہاں ضرور سوچو۔ ڈاکٹر ضرور سوچو ـــــ لیکن یہ سب سوچنے سے پہلے کچھ میری بھی تو سُن لو۔ زبان جو کچھ کہنے سے قاصر رہی، شاید قلم کے سہارے کہہ سکوں ـــــ دیکھو پورا نہ ہو۔

سارا بچپن حسبِ معمول محلّے کے بچے بچیوں کے ساتھ کھیلنے میں گذرا۔ بڑی ہونے لگی تو پردے میں بٹھا دی گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں جوان ہو رہی ہوں۔ میرے والدین سخت مذہبی ہیں اس لئے مجھے قریبی رشتے داروں کے سامنے آنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک اُستانی سے تھوڑی اُردو اور انگریزی پڑھ لی تھی۔ اِس لئے سارا دن اپنے کمرے میں پڑی ناول وغیرہ پڑھا کرتی اور خیالات کے تانے بانے بُنتی رہتی۔

میں اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا کا نقشہ بناتی، خوبصورت سا گھر، محبت کرنے والا ایک ہم سفر ـــــــ اور چھوٹے... لیکن ہوا کیا؟

ہم لڑکیاں والدین کے اوپر بوجھ ہوتی ہیں نا؟ میں بھی امّی اور ابّو کے لئے بوجھ بن گئی۔ رشتے آتے لیکن جہیز کا مسئلہ سامنے آجاتا۔ ابّو نے اتنا نہ کمایا تھا کہ مجھے دس بیس ہزار کا جہیز دے سکتے۔ کچھ رشتے ایسے بھی آتے جن میں جہیز کی شرط ذرا ہلکی ہوتی لیکن ابّو کو اُن کا خاندان پسند نہ آتا۔ اُنھیں اچھی ہڈّی کی تلاش تھی۔ سیّد زادی کے لئے صرف سیّد زادہ کا ہی انتخاب ہو سکتا تھا۔ رشتے آتے رہے مجبوری اور انکار کی کیفیات موجود رہیں۔

پیڑوں کی شاخیں بڑھتی رہیں، فصلیں کٹتی رہیں، شہنائیاں بجتی رہیں، ڈولیاں اٹھتی رہیں ـــــ لیکن ہمارے یہاں پیڑوں پر خزاں رہنے لگی۔ شہنائی کی آواز سُننے کے لئے کان ترستے رہے، ڈولی میں بیٹھنے کے ارمان سینے میں دَم توڑتے رہے ـــــــ پر جہیز کا انتظام نہ ہو سکا، ہڈّی کا انتخاب نہ ہو سکا۔ حسرتیں پامال ہوتی رہیں، جذبے دَم توڑتے رہے اور گھر ایک زنداں بن گیا۔

اِتنا سب کچھ تو لکھ گئی لیکن اب جو لکھنا ہے اُس کے لئے ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے نا؟ اور شرمیلی بھی! لیکن میں اب اِس بوجھ کو اپنے ذہن پر مزید نہیں رکھ سکتی ـــــ مجھے لکھنا ہی ہوگا۔ اِس لئے کہ یہ میرے ذہن ہی کا نہیں، سیکڑوں ہزاروں نوجوان لڑکیوں کے دل و دماغ کا بوجھ ہے۔

تم جانتے ہو ڈاکٹر! کہ ہر لڑکی کی چند خواہشیں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اُنھیں ظاہر نہیں کرتی۔ اِسی طرح میری بھی کچھ خواہشات تھیں۔ جو ایک شکل میں پوری ہو گئیں۔ ورنہ نہ جانے کتنی لڑکیوں کی یہ خواہشات صرف حسرتیں ہی بن کر رہ جاتی ہیں۔

ہاتھ کانپ رہا ہے لیکن... ڈاکٹر میں لکھوں گی ضرور ـــــ

ڈاکٹر! میں سوچتی تھی، کوئی ہاتھ میری مانگ سنوار دے، میرے تپتے ہوئے رخساروں کو کسی کے سرد رخسار کے سائے فرحت بخشیں، کوئی مضبوط ہاتھ مجھے سہارا دے۔

تمھاری اُنگلیاں میرے ہونٹوں سے ٹکرائیں۔ مجھے ناقابلِ بیان راحت مل گئی، تمھارے ہاتھ نے میرے بالوں کی لٹ ٹھیک کی، میری سیکڑوں مانگیں سنور گئیں۔ ایک لمحہ کو تمھارا ہاتھ میرے رخسار سے ٹکرایا، مجھے سارے جہان کی فرحت مل گئی۔ دوا پلانے کے لئے تم نے مجھے سہارا دیا اور مجھے سیکڑوں سہارے مل گئے۔ اُسی درمیان میرے سرد جسم کو حدت ملی جسے تم نے بخار کا نام دے دیا اور اِس سب کو شاید تم خود فریبی سمجھو۔

ڈاکٹر! تم جانتے ہو زندگی میں چند لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب مر جانے کو جی چاہتا ہے! اور ہم سوچتے ہیں کاش وقت کا دھارا رُک جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ میں اچھی ہو جاتی۔ پھر اُسی زنداں

میں قید کر دی جاتی ـــــ حسرتیں پھر پامال ہونے لگتیں، جذبے پھر دم توڑنے لگتے۔ اتنی فکریں اور اتنی کی نمازیں پھر پڑھ جاتیں ـــــ لیکن جہیز کا انتظام نہ ہوتا، قدر کا انتخاب نہ ہوتا۔

اچھے ڈاکٹر! مجھے بُرا نہ کہنا۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ بہت ہی بُرا ہے لیکن تم نے جو لمحاتی مسرتیں مجھے بخشیں میں اُن کا احترام کرنا چاہتی تھی ـــــ اُن حسین لمحوں کو جن سے تم نے مجھے نوازا میں ابدی بنا دینا چاہتی ہوں۔

میں جانتی ہوں ڈاکٹر! کہ میں تمھیں حاصل نہیں کر سکتی۔ لیکن مجھے تم سے وہ سب کچھ مل گیا جو آئندہ کسی اور سے ملتا لیکن میں تو صرف تمھاری رہنا چاہتی تھی۔ صرف ایک طرح کی آسودگی، ایک طرح کا سہارا چاہتی تھی۔ وہ مجھے مل گیا ـــــ خدا حافظ ڈاکٹر! تم نے جہاں میری اور مشکلیں آسان کیں وہاں آخری مشکل بھی حل کر دی۔ تم نیند لانے والی گولیوں کی شیشی میری میز پر بھول گئے۔ بغیر اجازت کے انھیں کھا رہی ہوں۔

اُمید ہے کہ معاف کر دو گے !!

تمھاری (صرف)
اجنبی

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پچھلی رات مجھے شاندار فتح ہوئی تھی اور آج عظیم شکست!

آنکھوں سے صرف دو آنسو نکلے اور اسی رومال میں جذب ہو گئے جس میں گزشتہ شب دو آنسو اور جذب ہوئے تھے ـــــ چار آنسو ـــــ جو اب میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ تھے !!

غزل

ـــــ نافع رضوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

. دورِ خزاں ہے نہ فصلِ بہاراں
لب حال میں ہے ہمارا گلستاں

شبِ غم دبے پاؤں کون آ رہا ہے
اندھیرے میں ہونے لگا ہے چراغاں

رے دل نشیں لب فقط تیرے لب ہیں
لعلِ درخشاں نہ شمعِ فروزاں

ترا ذکر ہوتا ہی رہتا ہے اکثر
خیاباں خیاباں گلستاں گلستاں

مِ زندگی کی پریشانیوں میں
بہت یاد آئی وہ زُلفِ پریشاں

سحر ہو رہی ہے چلے آؤ اب تو
ابھی داغ دل کے ہیں کچھ کچھ فروزاں

فا کر رہے ہیں دفا کر رہے ہیں
وہ ہیں پشیماں نہ ہم ہیں پشیماں

حسینوں سے نافع کو وہ غم ملے ہیں
نہ جن کا مداوا نہ جن کا ہے درماں

غزل

عزیز صہبائی ـــــ

نظر انداز کر دیتی ہیں وُہ غفلت شعار آنکھیں
بچھی جاتی ہیں پھر بھی راہ میں یہ خاکسار آنکھیں

رُلاتی ہیں لہو دل کو کسی کی سوگوار آنکھیں
گماں ہوتا ہے جیسے ہوں محبت کا مزار آنکھیں

اَدائے بے نیازی اُس بُتِ کافر کا شیوہ ہے
سرِ محفل مگر ٹکرا گئیں ہیں بار بار آنکھیں

نہ آیا ہے نہ آئے گا کبھی وُہ اپنے وعدے پر
نہ جانے کس توقع پر ہیں محوِ انتظار آنکھیں

ندامت کس قدر ہے جورِ پیہم کی شکایت پر
پشیماں کر گئیں مجھ کو کسی کی شرمسار آنکھیں

چھپائے سے نہ ہرگز چھپ سکے گا رازِ دل اُن سے
جو کیفیت ہے دل کی کہہ رہی ہیں بیقرار آنکھیں

کسی صحرا میں جیسے کوئی چشمہ پھوٹ پڑتا ہے
وُہ یاد آئے تو رو دیں اس طرح بے اختیار آنکھیں

بسا اوقات اشکوں سے ملی تسکین سی دِل کو
بسا اوقات ہلکا کر گئیں دل کا غبار آنکھیں

فرازِ عرش سے جیسے اُتر کر آ رہے ہو تم
خلا میں گھورتی رہتی ہیں یوں دیوانہ وار آنکھیں

[illegible] بسب مریض بخیر ہو گیا؟
لیکن کسی نے میرے سوالات کا جواب نہ دیا۔ درمیان ایک خط میرے ہاتھ میں [illegible] تھا ـــــــــ

ڈاکٹر! آداب۔ یاد ہیں

انداز تخاطب پر چونکئے نہیں!

آپ کو یاد ہو گا کل رات میں آپ سے ذکر کرنا چاہتی تھی کہ میں کون ہوں لیکن پھر نہ جانے کیوں ہمت نہ پڑی۔ پھر آپ نے موقع بھی نہ دیا اور سونے کا حکم دے دیا۔ جب یہ خط آپ کو ملے گا میں نہایت آرام کی نیند سو رہی ہوں گی۔ بالکل ویسی ہی جس کے لئے آپ نے کل کہا تھا۔

ڈاکٹر! اگر تھوڑی دیر کے لئے "تم" کہنے کی اجازت دو تو ایک حسرت کی تکمیل ہو جائے گی ـــــ اب نہ جانے تم کیا سوچ رہے ہو گے۔ میں کیسی لڑکی ہوں، بالکل پاگل ہوں ـــــ ہاں ضرور سوچو۔ ڈاکٹر ضرور سوچو ـــــ لیکن یہ سب سوچنے سے پہلے کچھ میری بھی تو سن لو۔ زبان سے جو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہو سکا شاید قلم کے سہارے کہہ سکوں ـــــ دیکھو خفا نہ ہونا۔

سارا بچپن حسب معمول محلے کے بچے بچیوں کے ساتھ کھیلنے میں گزرا۔ بڑی ہونے لگی، تو پردے میں بٹھا دی گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں جوان ہو رہی ہوں۔ میرے والدین سخت مذہبی ہیں اس لئے مجھے قریبی رشتے داروں کے سامنے آنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک استانی سے تھوڑی اردو اور انگریزی پڑھ لی تھی۔ اس لئے سارا دن اپنے کمرے میں پڑی ناول وغیرہ پڑھا کرتی اور خیالات کے تانے بانے بنتی رہتی۔

میں اپنی ایک چھوٹی سی دنیا کا نقشہ بناتی، خوبصورت سا گھر، محبت کرنے والا ایک ہم سفر ـــــ اور چھوٹے... لیکن ہوا کیا؟

ہم لڑکیاں والدین کے اوپر بوجھ ہوتی ہیں نا؟ میں بھی امی اور ابو کے لئے بوجھ بن گئی۔ رشتے آتے لیکن جہیز کا مسئلہ سامنے آ جاتا۔ ابو نے اتنا نہ کمایا تھا کہ مجھے دس بیس ہزار کا جہیز دے سکتے۔ کچھ رشتے ایسے بھی آتے جن میں جہیز کی شرط ذرا ہلکی ہوتی لیکن ابو کو ان کا خاندان پسند نہ آتا۔ انھیں اچھی ہڈی کی تلاش تھی۔ سید زادی کے لئے صرف سید زادہ کا ہی انتخاب ہو سکتا تھا۔ رشتے آتے رہے۔ مجبوری اور انکار کی کیفیات موجود رہیں۔

پیڑوں کی شاخیں بڑھتی رہیں، فصلیں کٹتی رہیں، شہنائیاں بجتی رہیں، ڈولیاں اٹھتی رہیں ـــــ لیکن ہمارے یہاں پیڑوں پر خزاں رہنے لگی۔ شہنائی کی آواز سننے کے لئے کان ترستے رہے، ڈولی میں بیٹھنے کے ارمان سینے میں دم توڑتے رہے ـــــ پر جہیز کا انتظام نہ ہو سکا، ہڈی کا انتخاب نہ ہو سکا۔ حسرتیں پامال ہوتی رہیں، جذبے دم توڑتے رہے اور گھر ایک زنداں بن گیا۔

اتنا سب کچھ تو لکھ گئی لیکن اب جو لکھنا ہے اس کے لئے ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے نا؟ اور شرمیلی بھی! لیکن میں اب اس بوجھ کو اپنے ذہن پر مزید نہیں رکھ سکتی ـــــ مجھے لکھنا ہی ہو گا۔ اس لئے کہ یہ میرے ذہن ہی کا نہیں سیکڑوں ہزاروں نوجوان لڑکیوں کے دل و دماغ کا بوجھ ہے۔

تم جانتے ہو ڈاکٹر! کہ ہر لڑکی کی چند خواہشیں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ انھیں ظاہر نہیں کرتی۔ اسی طرح میری بھی کچھ خواہشات تھیں۔ جو ایک شکل میں پوری ہو گئیں۔ ورنہ نہ جانے کتنی لڑکیوں کی یہ خواہشات صرف حسرتیں ہی بن کر رہ جاتی ہیں۔

ہاتھ کانپ رہا ہے لیکن... ڈاکٹر میں لکھوں گی ضرور ـــــ ڈاکٹر! میں سوچتی تھی، کوئی ہاتھ میری مانگ سنوار دے، میرے تپتے ہوئے رخساروں کو کسی کے سرد رخسار کے سائے فرحت بخشیں، کوئی مضبوط ہاتھ مجھے سہارا دے۔

تمھاری انگلیاں میرے ہونٹوں سے ٹکرائیں۔ مجھے ناقابل بیان راحت مل گئی، تمھارے ہاتھ نے میرے بالوں کی لٹ ٹھیک کی۔ میری سیکڑوں مانگیں سنور گئیں۔ ایک لمحہ کو تمھارا ہاتھ میرے رخسار سے ٹکرایا، مجھے سارے جہان کی فرحت مل گئی۔ دوا پلانے کے لئے تم نے مجھے سہارا دیا اور مجھے سیکڑوں سہارے مل گئے۔ اسی درمیان میرے سرد جسم کو حدت ملی جسے تم نے بخار کا نام دے دیا اور اس سب کو شاید تم خود فریبی سمجھو۔

ڈاکٹر! تم جانتے ہو زندگی میں چند لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب مر جانے کو جی چاہتا ہے! اور ہم سوچتے ہیں کاش وقت کا دھارا رک جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ میں اچھی ہو جاتی۔ پھر اسی زنداں

میں تبدیل کردی جاتی ــــــ حسرتیں پھر پامال ہونے لگتیں، جذبے پھر دم توڑنے لگتے۔ تنہائی کی فکریں اور راتوں کی نمازیں پھر بڑھ جاتیں ــــــ لیکن پھر کیا انتظام نہ ہوتا، تم کو کا انتخاب نہ ہوتا۔

اچھے ڈاکٹر! مجھے بُرا نہ کہنا۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ بہت ہی بُرا ہے لیکن تم نے جو لمحاتی مسرّتیں مجھے بخشیں میں اُن کا احترام کرنا چاہتی تھی ــــــ اُن حسین لمحوں کو جن سے تم نے مجھے نوازا میں ابدی بنا دینا چاہتی ہوں۔

میں جانتی ہوں ڈاکٹر! کہ میں تمھیں حاصل نہیں کر سکتی لیکن مجھے تم سے وہ سب کچھ مل گیا جو آئندہ کسی اور سے ملتا لیکن میں تو صرف تمھاری رہنا چاہتی تھی۔ صرف ایک طرح کی آسودگی، ایک طرح کا سہارا چاہتی تھی۔ وہ مجھے مل گیا ــــــ خدا حافظ ڈاکٹر! تم نے جہاں میری اور مشکلیں آسان کیں وہاں آخری مشکل بھی حل کر دی۔ تم نیند لانے والی گولیوں کی شیشی میری میز پہ بھول گئے۔ بغیر اجازت کے انھیں کھا رہی ہوں۔

اُمید ہے کہ معاف کر دو گے !!

تمھاری (صرف)
اجنبی

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پچھلی رات مجھے شاندار فتح ہوئی تھی اور آج عظیم شکست!

آنکھوں سے صرف دو آنسو نکلے اور اسی رومال میں جذب ہو گئے جس میں گزشتہ شب دو آنسو اور جذب ہوئے تھے ــــــ چار آنسو ــــــ جو اب میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ تھے !!

غزل

ناقع رضوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

نہ دورِ خزاں ہے نہ فصلِ بہاراں
عجب حال میں ہے ہمارا گلستاں

شبِ غم دبے پاؤں کون آ رہا ہے
اندھیرے میں ہونے لگا ہے چراغاں

ترے دل نشیں لب فقط تیرے لب ہیں
نہ لعلِ درخشاں نہ شمعِ فروزاں

ترا ذکر ہوتا ہی رہتا ہے اکثر
خیاباں خیاباں گلستاں گلستاں

غمِ زندگی کی پریشانیوں میں
بہت یاد آئی وہ زُلفِ پریشاں

سحر ہو رہی ہے چلے آؤ اب تو
ابھی داغ دل کے ہیں کچھ کچھ فروزاں

جفا کر رہے ہیں وفا کر رہے ہیں
نہ وہ ہیں پشیماں نہ ہم ہیں پشیماں

حسینوں سے ناقع کو وہ غم ملے ہیں
نہ جن کا مداوا نہ جن کا ہے درماں

غزل

عرش صہبائی

نظر انداز کر دیتی ہیں وُہ غفلت شعار آنکھیں
بچھی جاتی ہیں پھر بھی راہ میں یہ خاکسار آنکھیں

رُلاتی ہیں لہُو دل کو کسی کی سوگوار آنکھیں
گماں ہوتا ہے جیسے ہوں محبت کا مزار آنکھیں

اَدائے بے نیازی اُس بُتِ کافر کا شیوہ ہے
سرِ محفل مگر ٹکرا گئیں ہیں بار بار آنکھیں

نہ آیا ہے نہ آئے گا کبھی وُہ اپنے وعدے پر
نہ جانے کس توقع پر ہیں محوِ انتظار آنکھیں

ندامت کس قدر ہے جورِ پیہم کی شکایت پر
پشیماں کر گئیں مجھ کو کسی کی شرمسار آنکھیں

چھُپائے سے نہ ہرگز چھُپ سکے گا رازِ دل اُن سے
جو کیفیت ہے دل کی کہہ رہی ہیں بیقرار آنکھیں

کسی صحرا میں جیسے کوئی چشمہ پھُوٹ پڑتا ہے
وُہ یاد آئے تو روتیں اس طرح بے اختیار آنکھیں

بسا اوقات اشکوں سے ملی تسکین سی دِل کو
بسا اوقات ہلکا کر گئیں دل کا غبار آنکھیں

فرازِ عرش سے جیسے اُتر کر آ رہے ہو تم
خلا میں گھُورتی رہتی ہیں یوُں دیوانہ وار آنکھیں

... سب مرض بخیر ہی تھا؟
لیکن کسی نے میرے سوالات کا جواب نہ دیا۔ درملنے ایک خط میرے ہاتھ میں
[illegible] تھا۔ ———

ڈاکٹر! آداب، یاد ہیں
انداز تخاطب پر چونکئے نہیں!

آپ کو یاد ہوگا کل رات میں آپ سے ذکر کرنا چاہتی تھی کہ میں کون ہوں۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں ہمت نہ پڑی۔ پھر آپ نے موقع بھی نہ دیا اور سونے کا حکم دے دیا۔ جب یہ خط آپ کو ملے گا میں نہایت آرام کی نیند سو رہی ہوں گی۔ بالکل ویسی ہی جس کے لئے آپ نے کل کہا تھا۔

ڈاکٹر! اگر تھوڑی دیر کے لئے "تم" کہنے کی اجازت۔ دو تو ایک حسرت کی تکمیل ہو جائے گی ——— اب نہ جانے تم کیا سوچ رہے ہوگے۔ میں کیسی لڑکی ہوں؟ بالکل پاگل ہوں ——— ہاں ضرور سوچو۔ ڈاکٹر ضرور سوچو ——— لیکن یہ سب سوچنے سے پہلے کچھ میری بھی تو سن لو۔ زبان جو کچھ کہنے سے قاصر رہی شاید قلم کے سہارے کہہ سکوں ——— دیکھو بور نہ ہونا۔۔

سارا بچپن حسب معمول محلے کے بچے بچیوں کے ساتھ کھیلنے میں گزرا۔ بڑی ہونے لگی تو پردے میں بٹھا دی گئی تب مجھے احساس ہوا کہ میں جوان ہو رہی ہوں۔ میرے والدین سخت مذہبی ہیں اس لئے مجھے قریبی رشتے داروں کے سامنے آنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک اُستانی سے تھوڑی اُردو اور انگریزی پڑھ لی تھی۔ اس لئے سارا دن اپنے کمرے میں پڑی ناول وغیرہ پڑھا کرتی اور خیالات کے تانے بانے بُنتی رہتی۔

میں اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا کا نقشہ بناتی۔ خوبصورت سا گھر۔ محبت کرنے والا ایک، ہم سفر ——— اور چھوٹے۔۔۔ لیکن ہوا کیا؟

ہم لڑکیاں والدین کے اوپر بوجھ ہوتی ہیں نا؟ میں بھی امّی اور ابّو کے لئے بوجھ بن گئی۔ رشتے آتے لیکن جہیز کا مسئلہ سامنے آجاتا۔ ابّو نے اتنا نہ کمایا تھا کہ مجھے دس بیس ہزار کا جہیز دے سکتے۔ کچھ رشتے ایسے بھی آتے جن میں جہیز کی شرط ذرا ہلکی ہوتی لیکن ابّو کو اُن کا خاندان پسند نہ آتا۔ اُنھیں اچھی بڈی کی تلاش تھی۔ سیّد زادی کے لئے صرف سیّد زادہ کا ہی انتخاب ہو سکتا تھا۔ رشتے آتے رہے مجبوری اور انکار کی کیفیات موجود رہیں۔

پیڑوں کی شاخیں بڑھتی رہیں، فصلیں کٹتی رہیں شہنائیاں بجتی رہیں، ڈولیاں اُٹھتی رہیں ——— لیکن ہمارے یہاں پیڑوں پر خزاں رہنے لگی، شہنائی کی آواز سُننے کے لئے کان ترستے رہے ڈولی میں بیٹھنے کے ارمان سینے ہی میں دم توڑتے رہے ——— پر جہیز کا انتظام نہ ہو سکا، بڈی کا انتخاب نہ ہو سکا۔ حسرتیں پامال ہوتی رہیں یہ جذبے دم توڑتے رہے اور گھر ایک زنداں بن گیا۔

اتنا سب کچھ تو لکھ گئی لیکن اب جو لکھنا ہے اُس کے لئے ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے نا؟ اور شرمیلی بھی! لیکن میں اب اس بوجھ کو اپنے ذہن پر مزید نہیں رکھ سکتی ——— مجھے لکھنا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ یہ میرے ذہن ہی کا نہیں سیکڑوں ہزاروں نوجوان لڑکیوں کے دل و دماغ کا بوجھ ہے۔

تم جانتے ہو ڈاکٹر! کہ ہر لڑکی کی چند خواہشیں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اُنھیں ظاہر نہیں کرتی۔ اسی طرح میری بھی کچھ خواہشات تھیں۔ جو ایک شکل میں پوری ہو گئیں۔ ورنہ نہ جانے کتنی لڑکیوں کی یہ خواہشات صرف حسرتیں ہی بن کر رہ جاتی ہیں۔

ہاتھ کانپ رہا ہے لیکن۔۔۔ ڈاکٹر میں لکھوں گی ضرور ———

ڈاکٹر! میں سوچتی تھی، کوئی ہاتھ میری مانگ سنوارے، میرے تپتے ہوئے رخساروں کو کسی کے سرد رخسار کے سائے فرحت بخشیں، کوئی مضبوط ہاتھ مجھے سہارا دے۔

تمھاری اُنگلیاں میرے ہونٹوں سے ٹکرائیں۔ مجھے ناقابلِ بیان راحت مل گئی، تمھارے ہاتھ نے میرے بالوں کی لٹ ٹھیک کی۔ میری سیکڑوں مانگیں سنور گئیں۔ ایک لمحہ کو تمھارا ہاتھ میرے رخسار سے ٹکرایا، مجھے سارے جہان کی فرحت مل گئی۔ دوا پلانے کے لئے تم نے مجھے سہارا دیا اور مجھے سیکڑوں سہارے مل گئے۔ اسی درمیان میرے سرد جسم کو حدت ملی جسے تم نے بخار کا نام دے دیا اور اس سب کو شاید تم خود فریبی سمجھو۔

ڈاکٹر! تم جانتے ہو زندگی میں چند لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب مر جانے کو جی چاہتا ہے! اور ہم سوچتے ہیں کاش وقت کا دھارا رُک جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ میں اچھی ہو جاتی۔ پھر اُسی زنداں

میں قید کر دی جاتی ـــــ حسرتیں پھر پامال ہونے لگتیں، جذبے پھر دم توڑنے لگتے۔ الہڑ کی فکریں اور امی کی نمازیں پھر بڑھ جاتیں ـــــ لیکن جہیز کا انتظام نہ ہوتا، قسمت کا انتخاب نہ ہوتا۔

اچھے ڈاکٹر! مجھے بُرا نہ کہنا۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ بہت ہی بُرا ہے لیکن تم نے جو لمحاتی مسرتیں مجھے بخشیں میں اُن کا احترام کرنا چاہتی تھی ـــــ اُن حسین لمحوں کو جن سے تم نے مجھے نوازا میں ابدی بنا دینا چاہتی ہوں۔

میں جانتی ہوں ڈاکٹر! کہ میں تمہیں حاصل نہیں کر سکتی۔ لیکن مجھے تم سے وہ سب کچھ مل گیا جو آئندہ کسی اور سے ملتا لیکن میں تو صرف تمہاری رہنا چاہتی تھی۔ صرف ایک طرح کی آسودگی، ایک طرح کا سہارا چاہتی تھی۔ وہ مجھے مل گیا ـــــ خدا حافظ ڈاکٹر! تم نے جہاں میری اور مشکلیں آسان کیں وہاں آخری مشکل بھی حل کر دی۔ تم نیند لانے والی گولیوں کی شیشی میری میز پر بھول گئے۔ بغیر اجازت کے انھیں کھا رہی ہوں۔

اُمید ہے کہ معاف کر دو گے !!

تمہاری (صرف)
اجنبی

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پچھلی رات مجھے شاندار فتح ہوئی تھی اور آج عظیم شکست!

آنکھوں سے صرف دو آنسو نکلے اور اُسی رومال میں جذب ہو گئے جس میں گزشتہ شب دو آنسو اور جذب ہوئے تھے ـــــ چار آنسو ـــــ جو اب میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ تھے !!

غزل

نافع رضوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

دورِ خزاں ہے نہ فصلِ بہاراں
ب حال میں ہے ہمارا گلستاں

شبِ غم دبے پاؤں کون آ رہا ہے
اندھیرے میں ہونے لگا ہے چراغاں

ے دل نشیں لب فقط تیرے لب ہیں
لعلِ درخشاں نہ شمعِ فروزاں

ترا ذکر ہوتا ہی رہتا ہے اکثر
خیاباں خیاباں گلستاں گلستاں

م زندگی کی پریشانیوں میں
ہت یاد آئی وہ زُلفِ پریشاں

سحر ہو رہی ہے چلے آؤ اب تو
ابھی داغ دل کے ہیں کچھ کچھ فروزاں

جفا کر رہے ہیں وفا کر رہے ہیں
نہ وہ ہیں پشیماں نہ ہم ہیں پشیماں

حسینوں سے نافع کو وہ غم ملے ہیں
نہ جن کا مداوا نہ جن کا ہے درماں

غزل

عشرت صہبائی

نظر انداز کر دیتی ہیں وُہ غفلت شعار آنکھیں
بچھی جاتی ہیں پھر بھی راہ میں یہ خاکسار آنکھیں

رُلاتی ہیں لہو دل کو کسی کی سوگوار آنکھیں
گماں ہوتا ہے جیسے ہوں محبت کا مزار آنکھیں

اُدائے بے نیازی اُس بُتِ کافر کا شیوہ ہے
سرِ محفل مگر ٹکرا گئی ہیں بار بار آنکھیں

نہ آیا ہے نہ آئے گا کبھی وُہ اپنے وعدے پر
نہ جانے کس توقع پر ہیں محوِ انتظار آنکھیں

ندامت کس قدر ہے جورِ پیہم کی شکایت پر
پشیماں کر گئیں مجھ کو کسی کی شرمسار آنکھیں

چھپائے سے نہ ہرگز چھپ سکے گا رازِ دل اُن سے
جو کیفیت ہے دل کی کہہ رہی ہیں بیقرار آنکھیں

کسی صحرا میں جیسے کوئی چشمہ پھوٹ پڑتا ہے
وُہ یاد آئے تو روتیں اس طرح بے اختیار آنکھیں

بسا اوقات اشکوں سے ملی تسکین سی دل کو
بسا اوقات ہلکا کر گئیں دل کا غبار آنکھیں

فرازِ عرش سے جیسے اُتر کر آ رہے ہو تم
خلا میں گھورتی رہتی ہیں یوں دیوانہ وار آنکھیں

افسانہ

مس شیریں

پروفیسر عاصی کرنالی۔ ایم۔ اے

۲۶۰۔ ممتاز آباد۔ ملتان

برادرِ محترم! تسلیم

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ اِس کہانی کے سلسلے میں صرف اِتنا عرض کرنا ہے کہ کسی کا خط آئے یا نہ آئے۔ لیکن شکستہ دل مسز حبیب اللہ کے نام آپ کا تعریفی خط بحیثیت ایڈیٹر ضرور آنا چاہئے۔ والسّلام

آپ کا ـــــــ عاصی کرنالی

میں مس شیریں ہوں۔ یہ میرا اصلی نام بھی ہے، ادبی بھی۔ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق عرصے سے ہے لیکن چھپوانے کا نہیں۔ میں نے بہت سی کہانیاں لکھ ماری ہیں کئی اچھی بھی ہیں۔ لوگ مجھے نہیں جانتے تھے۔ لیکن ایک ایسا اتّفاق ہوا کہ ضرورت سے زیادہ جاننے لگے۔ اور چند دنوں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں مُلک کی سب سے بڑی افسانہ نگار ہوں اور جیسے اگر لکھنا جانتی ہوں تو صرف میں! اور نہ سارے لکھنے والے جھک مارتے ہیں۔ ہوا یوں کہ میں نے ایک کہانی مُلک کے سب سے بڑے رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج دی۔ عنوان تھا "تنہائیاں" کہانی کی ہیروئن ایک جوان، حسین اور دولت مند لڑکی تھی جو ابھی زندگی کا سفر تنہا طے کر رہی تھی۔ آخری فقرہ یوں تھا۔

"میری حسین آنکھوں کا کاجل آہستہ آہستہ پھیلتا اور مٹتا جا رہا ہے میں کب سے اُفق کے اُس پار تک رہی ہوں۔ بچپن میں نانی اماں نے کہانی سُناتے ہوئے جس شہزادے کا ذکر کیا تھا وہ کب اپنے سُنہری رتھ میں، بیٹھ کر چھم سے میرے اُداس آنگن میں اُترے گا اور مجھے ڈولی میں بٹھا کر اُفق کے اُس پار لے جائے گا۔ اُف میری ازلی اور ابدی تنہائی!"

میری کہانی چھپ گئی اور مجھے پورے مُلک سے ڈیڑھ ہزار تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ میری رائٹنگ ٹیبل، میرے بُک شیلف، میری کتابوں کی الماریاں خطوں اور لفافوں سے پٹ گئیں۔ رنگین لفافے، خوشبودار خط، معطّر اور منوّر کاغذ مجھے اپنے ڈرائنگ رُوم اور سنڈی پر عطّار کی دُکان کا گُمان ہونے لگا اور میں اپنی اِس اچانک شہرت اور عظمت پر مغرور سی ہوگئی۔

خطوں کی تحریریں بہت دلچسپ، رنگ برنگی اور معنی خیز ہوتی تھیں۔ اُن خطوں کے مطالعے کے وقت میں اہم سطروں پر نشان لگا دیتی تھی کہ سند رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔

پہلی قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ اُن تعریفی خطوں میں کسی خاتون کا خط نہ آیا۔ مجھے خیال گزرا کہ عورتیں حاسد ہوتی ہیں۔ اچھی کہانی سے جل گئیں۔ یا پھر اُن کا ذوق اِتنا سُتھرا نہیں ہوتا کہ کسی اچھی کہانی کو پرکھ سکیں۔ مرد بڑے فیّاض اور باذوق ہوتے ہیں۔ سچی تعریف کرتے ہیں اور دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ شروع کے خطوں سے مجھے یہی گمان ہوا لیکن بعد میں گمان کا نشہ کم ہوتا چلا گیا۔ اِس کی وجہ بیان کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ ضروری یہ ہے کہ خطوط کی خاص سطریں یہاں لکھ دی جائیں۔

ایک صاحب نے لکھا: "میں یہ خط اپنے لہو سے لکھ رہا ہوں۔ اسے خونِ دل سمجھو!"

ایک صاحب نے مطلع کیا: "یہ پرچہ کاتب سے لکھوا رہا ہوں۔ میں کچھ بدخط ہوں۔ پھر بھی میرا دل خوبصورت ہے"

ایک معطّر خط میں اطلاع دی گئی تھی کہ "میں نے اِس نامۂ شوق کو معطّر کرنے میں پندرہ ولایتی اور اٹھارہ دیسی عطریات استعمال کئے ہیں۔ ابھی اور کرتا لیکن پیسے ختم ہوگئے"

ایک صاحبزادے نے لکھا: "میری عمر بیس سال ہے۔ صحت مند ہوں۔ جسم سڈول، دل منچلا، ٹیڈی لباس پہنتا ہوں لیکن آپ پسند نہ کریں تو اِس لباس پر لعنت!"

اس کے بالکل متضاد ایک اور صاحبزادے نے تحریر کیا: "چہرے پہ ایک نقلی سی
ادا سی بہت جچتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس سے تعلق قائم رہے۔"

"ایک صاحب نے یہ اطلاع دینی ضروری سمجھی کہ ڈیڈی کی تازہ تازہ مرے ہیں۔
مجھے ورثے میں اتنی بڑی جاگیر ہاتھ لگی ہے کہ خود کو کسی ریاست کا راجکمار بلکہ راجہ سمجھنے
لگا ہوں۔ لیکن یہ راجہ [illegible] رانی سے محروم ہے۔"

ایک لفافے میں ایک کاغذ پہ دل بنا ہوا تھا اور اس میں تیر گڑا ہوا تھا۔

دوسرے لفافے میں دو آنکھیں بنائی گئی تھیں۔ نیچے لکھا تھا "حسرتِ دیدار!"

ایک دلچسپ رجسٹرڈ لفافے میں یہ الفاظ درج تھے: "میں اعلیٰ نسل سید ہوں۔
بناوٹی نہیں۔ عالی نسب ہونا خدا کی دین ہے۔ ممکن ہے آپ کو یقین نہ آئے اس لئے مصدقہ
شجرہ نسب بھی بھیج رہا ہوں۔

نوٹ: مکرر آنکہ اس شجرے پر مجسٹریٹ درجہ اوّل کی تصدیقی مہر لگی ہوئی ہے۔"

یہ تو اس طرح کے خطوں کا نمونہ تھا جن میں سلیقے کی کمی جھلکتی ہے۔ بعض خطوں میں
اشاریت، رمز اور ہوش مندی کا انداز غالب تھا۔ مثلاً ——

"مس شیریں! آپ نے کتنی اچھی کہانی لکھی ہے۔ میں بھی کہانی کار ہوں۔ اس
ناطے سے ہم دونوں ایک ہیں۔ خط کا جواب ضرور دیجئے۔"

کسی شاہد لطیف کا خط یوں تھا ——

"میری کوئی بہن نہیں ہے۔ اس پہلو سے بڑا بدنصیب ہوں۔ کیا آپ میری
طرف یعنی اپنے بھائی کی طرف خلوص کا ہاتھ بڑھائیں گی؟"

میں نے اس خط کا جواب دیا ——

"میرا بھی کوئی بھائی نہیں۔ میں خلوص کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔"

اس خط کا جواب آیا۔ پہلے لمبا چوڑا شکریہ لکھا تھا۔ پھر خواہش ظاہر کی گئی
تھی کہ براہ کرم بہن شیریں اپنا فوٹو بھیجئے۔ پلیز کوئی سویٹ پوز!"

افسوس میں اپنے اس بھائی کو کوئی سویٹ پوز نہ بھیج سکی۔

ایک خط میں میری کہانی پر پہلے تنقید کی گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا۔

"یہ افسانے کے پردے میں خود مس شیریں جلوہ گر معلوم ہوتی ہیں —— کیونکہ
داخلیت کے بغیر اتنی کامیاب کہانی لکھنا ممکن نہیں۔ لیکن مس شیریں! شہزادے اُفق پار
ہی نہیں رہتے، اس زمین پر بھی رہتے ہیں۔ صرف دیدۂ بینا درکار ہے اور وہ یقیناً آپ کے
پاس ہے۔"

اِس انداز کے بیسیوں خطوط تھے جن میں کہانی کی ہیروئن مجھی کو قرار دیا گیا تھا۔
اور آخری فقرے کو شادی کا اشتہار سمجھ کر بہت سے حضرات نے پردے پردے میں خود کو
آفر کر ڈالا تھا۔

دو خاص خطوں کا ذکر کئے بغیر یہ بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ ایک رجسٹرڈ لفافے
میں بے تکلف لکھ دیا گیا تھا ——

"میں بیچلر ہوں۔ آپ کی کہانی پسند آئی۔ میں اتوار کو آپ کے شہر آرہا ہوں۔
نٹراج سنیما میں شام کا شو دیکھوں گا۔ آپ ضرور پہنچ جائیے۔ میں بائیں گیٹ پر کھڑا ہوں گا۔
پہچان یہ ہے کہ میرے دائیں ہاتھ میں ایک قندھاری انار ہوگا۔ واقعی آپ نے بڑی ہارڈ سم
کہانی لکھی ہے۔ قندھاری انار کی پہچان نہ بھولئے اور یہ خط پڑھتے ہی جلا دیجئے گا۔"

دوسرا خط بہت عبرت انگیز ہے ——

"میں ایک دفتر میں کلرک ہوں لیکن ترقی کا بڑا چانس ہے۔ مجھے کہتے ہوئے
شرم آتی ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے اور یہ بھی شرم کی بات ہے کہ میرے پانچ بچے ہیں لیکن
میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری بیوی اور پانچوں بچے آپ کے غلام بن کر رہیں گے۔ ساری عمر
آپ کے پاؤں دھوئیں گے۔ کہئے کیا حکم ہے؟"

خطوں کے علاوہ تحفے بھی وصول ہوئے جو گویا اچھی کہانی لکھنے کا کریڈٹ تھا۔
ان تحفوں میں زیادہ تر رومال، سینٹ اور فاؤنٹن پن تھے۔ ہاں! ایک رسٹ واچ بھی
موصول ہوئی۔ شاید دوسرے افسانہ نگاروں کو بھی پہنچی ہوں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو
کرشن چندر کے پاس تو دو تین سو رسٹ واچ جمع ہو چکی ہوں گی۔

ان بے شمار خطوں نے مجھے کچھ صدمہ بھی پہنچایا لیکن اطمینان بھی دلایا کہ میری
کہانی میں کوئی بات تھی ضرور، جو اتنے سارے خطوں کی محرک بنی۔ کچھ بھی سہی، ان تمام
تحریروں میں پسندیدگی اور قدردانی کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔

میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے تین ماہ بعد ایک اور کہانی اسی رسالے میں اشاعت
کے لئے بھجوا دی۔ یہ کہانی پہلی کہانی سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ میں یقین بلکہ دعوے سے
کہتی ہوں کہ اسے میں نے خونِ جگر سے تخلیق کیا تھا۔ کہانی چھپی۔ میں پُرامید تھی کہ اب کے
تین ہزار خطوط آئیں گے۔ لیکن کہانی چھپے آج چھ مہینے ہو چکے ہیں، ایک خط بھی موصول
نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کیا سبب ہوا۔ میں نے ایڈیٹر کے خط میں (جو کہانی کے ساتھ شائع
ہوا) بس اتنا لکھ دیا تھا۔

"میں اب مس شیریں کی بجائے مسز حبیب اللہ ہو گئی ہوں۔"

اگر میری یہ کہانی ڈفر تھی تو کم از کم میری شادی ہی پر مجھے مبارکباد کے خط آتے۔
ڈیڑھ ہزار خطوط شاہد ہیں کہ میں ایک پسندیدہ کہانی کار ہوں!!

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔
بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور ہوں گے۔ ([illegible])

سفر کی ایک شام

مخمور سعیدی

ذہن میں ہے شفق فشاں کتنے دنوں سے ایک شام
جیسے شرابِ رنگ کے کوئی لنڈھا رہا ہو جام

چھپتی آفتاب تھا بامِ اُفق سے زرفشاں
رنگِ شفق کی ہر طرف کوندرہی تھیں بجلیاں

پرتوِ رنگ و نور سے رُوئے زمیں تھا تابناک
عالمِ خاک کے لئے چشمِ فلک میں تھا تپاک

چھاؤں سے یوں گلے ملی دن کی سلگتی تیز دھوپ
جیسے خنک خنک سی چھاؤں خود ہو اُسی کا ایک رُوپ

سایہ و نور میں بہم پا کے یہ جوشِ اختلاط
چھایا ہوا قریب و دُور ایک ہی عالمِ نشاط

ذرّوں کا رقص سرخوشی پیشِ نظر تھا ہر طرف
کرنوں کے ساتھ اک فسوں گرمِ سفر تھا ہر طرف

غرقِ نشاطِ رنگ و بو لالہ و یاسمن تمام
محوِ نظارۂ چمن، شعلہ رُخانِ خوش خرام

جُنبشِ ہر نگاہِ ناز جن کی ستارہ بار تھی
موجِ نفس نہ تھی کوئی نکہتِ بے قرار تھی

قید، حصارِ زلف میں جلوۂ عارضِ مُبیں
پیرہنوں میں مضطرب تابشِ جسمِ نازنیں

قدموں کی نرم آہٹیں، چہروں کی مسکراہٹیں
لاگ کے ساتھ ساتھ وہ سنبھلی ہوئی لگاوٹیں

رُوئے سخن ابھی اِدھر، ملتفت اب اُدھر کہیں
بے خودیِ نشاط میں دھیان کہیں، نظر کہیں

○

ایک غریبِ شہر بھی اپنا اکیلاپن لئے
بیٹھا تھا کنج یاس میں آرزوِ سخن لئے

کوئی نہ تھا جو پوچھے اُس کی اُداسیوں کا حال
جس کی نگاہ کر سکے زخمِ طلب کا اندمال

اتنے میں آئی دفعتہً ایک صدائے دل نواز
نرم، سبک، حسیں، جواں، سحراثر، فسوں طراز

پوچھا کہ: آپ کیا وہی شاعرِ خوش کلام ہیں
جن کے ہنر کے تذکرے اہلِ ادب میں عام ہیں

حُسن کے اِس سوال پر کچھ بھی نہ کہہ سکا کوئی
عشق کا کیا جواب ہے خود ہی سمجھ گیا کوئی

عارضِ زر نگار پر رنگِ حیا جو چھا گیا
عشق کو عرضِ حال کے رمز کئی سمجھا گیا

نغمے جو محوِ خواب تھے اُس کی نظر جگا گئی
دیدہ و دل کی خامشی گیت کئی سنا گئی

حُسن جو عشق سے رہا محوِ کلام دیر تک
روکشِ صبحِ گل رہی غم کی یہ شام دیر تک

○

رخصتِ حُسن کا سماں عشق کو جاں گداز تھا
دردِ جدائی کا مگر خود کوئی چارہ ساز تھا

اُس پہ سب آشکار ہے ہجر کا حال آج بھی
کرتا ہے دل نوازیاں اُس کا خیال آج بھی

آج بھی اُس سے گفتگو ہوتی ہے روز شام کو
کِھلتی ہے آج بھی شفق لے کے اُسی کے نام کو

اُس کے خیال سے یہ دل آئینۂ سکندری
اب بھی انیسِ شامِ غم اُس کا فسونِ دلبری

چھپی آفتاب وہ ڈوبا نہیں ہے آج تک
گزرے ہیں کتنے دن مگر وقت وہیں ہے آج تک



مفت
دلآویز تحفے
للت چائے
کے ساتھ
۵۰۰ گرام کے ہر پیک کے ساتھ
آپ کو اب بڑھیا چمچ ملتا ہے۔
۲۵۰ گرام کے ہر پیک کے ساتھ
آپکو ایک نفیس بال پوائنٹ پین ملتا ہے۔
آج ہی ایک پیکٹ خریدیئے
پیشکش صرف مال رہنے تک ہے
Lalit
TATA FINLAY
Lalit
للت اُمنگ پیدا کرنے والی مزیدار پتی کی چائے ہے۔ یہ فرحت بخش چائے آپکے لئے تیار کی گئی ہے۔ اسے ہرے اور پیلے ڈبوں میں ہمیشہ تازہ رکھنے کے لئے پیک کیا گیا ہے۔ آج ہی ایک پیکٹ آزمایئے۔ آج ہی ایک پیکٹ خریدیئے۔
للت - چائے جو واقعی تسکین بخش ہے
ٹاٹا فنلے چائے

عمل، ردِّ عمل

پُشکر ناتھ۔ بی۔ اے

مکان نمبر ۱۲/۴۸، ا۔گلی ادوریاں۔ چوک فرید۔ امرتسر (پنجاب)

برادرِ محترم! آداب و نیاز

سالنامہ سرینگر میں ملا تھا۔ اس کے بعد میں یہاں چلا آیا۔ صحت کی حالت تسلی بخش نہیں رہی تھی اور شدت کی سردی نے پریشان کر رکھا تھا۔ خیال ہے کہ دو تین مہینے میدانی علاقوں میں ہی کاٹوں گا۔ اس کے بعد دیکھی جائے گی ——— سالنامہ حسبِ معمول دلکش اور معیاری ہے۔ کئی افسانے تو نہایت اچھے ہیں۔ جوگندر پال، بلونت سنگھ، رام لعل اور جیلانی بانو کے افسانے خاص طور پر پسند آئے۔ ایک خوبصورت روایت جو بتیس برس پہلے آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے شروع ہوئی تھی، اُسے آپ نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں قائم رکھا ہے اور نبھا رہے ہیں۔ آپ کی ذات متبرک ہے اور ہم سب کو آپ کی ذات پر بجا طور پر فخر ہے ——— ورنہ اردو زبان کے اس کس مپرسی کے زمانے میں بھی، اردو کے ہی خواہ گروہ بندیوں اور باہمی چپقلش سے اردو کو مزید نقصان پہنچا رہے ہیں۔ "بیسویں صدی" کا کارنامہ یہ ہے کہ عرصہ بتیس سال سے یہ موقر جریدہ اس قسم کی تمام آلائشوں سے پاک رہا...

خیر اندیش ——— پُشکر ناتھ

میں آگیا ڈاکٹر!

تین سال پہلے جب میں نے باہر لگی ہوئی آپ کے نام کی تختی دیکھی تھی تو میں دل ہی دل میں مُسکرایا تھا۔

"ڈاکٹر وائی۔ کے۔ کوہلی، سائیکاٹرسٹ"

میں نے سوچا تھا آپ مہینے دو مہینے اپنی قسمت آزما کر چلتے بنیں گے۔ لیکن تب تو سائیکاٹرسٹ کا لفظ میرے لئے اتنا ہی کتابی تھا جتنا کسی وقت پلاسٹک سرجری یا مینٹل پیپر سرجری کا لفظ ہوا کرتا تھا۔ اب تو دُنیا میری آنکھوں کے سامنے کئی رنگ بدل چکی ہے۔ ورنہ اِس چھوٹے سے شہر میں سائیکاٹرسٹ کا دھندا اتنا کامیاب نہ رہتا۔

جی ہاں! میں نے باہر آپ کی فیس داخل کر دی ہے۔

جی نہیں! میں کسی ذہنی اُلجھن میں گرفتار نہیں ہوں۔ کبھی ہوا کرتا تھا۔ مگر تب میں اُس کہانی کی بھول بھلیوں اور غلام گردشوں میں کھو گیا تھا، جس کا خاتمہ میں ابھی ابھی کرکے آیا ہوں۔ اب کوئی اُلجھن نہیں ہے۔ صرف ایک عجیب طرح کا سکون ہے۔ میں اِس سکون سے ڈر گیا ہوں ڈاکٹر! ایک عجیب طرح کا خوف مجھ پر غالب آگیا ہے۔ اور ایسے میں میں چاہتا ہوں کوئی مجھے یہ بتا دے کہ میری وہ حرکت کسی ذہنی بیماری کا نتیجہ ہے یا فطری ردِّ عمل ہے۔

"جی ہاں! میں جانتا ہوں آپ کو ساری بات بتانی پڑے گی۔ آپ ذرا اطمینان سے بیٹھ کر سُنئے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ ہاں تو ڈاکٹر! اِس بات کا آغاز ایک لڑکی سے ہوا۔ توبہ! آپ بات تو پوری سُنئے ڈاکٹر! ایک سائیکاٹرسٹ کو اِس قدر بے صبر نہیں ہونا چاہئے۔

بڑی کومل سی، اُجلی اُجلی سی لڑکی تھی۔ مجھے اُس کے بال زیادہ پسند تھے۔ گھنے گھنے، لمبے لمبے، سیاہ ریشمی تاروں جیسے بال، جو بے حد نرم اور بے حد جاذبِ نظر تھے۔ ویسے اُس کا سارا سراپا بے حد خوبصورت تھا۔ اُس کی گردن کا خم، اُس کی کمر کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی وہ گہری لکیر، جس کی طرف دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ابھی ابھی یہاں

سے ایک ننھی سی ندی بہہ نکلے گی۔

بھنویں کمان جیسی کمان کی وہ شریر دسفید رنگت میں پراسرار گھنی پلکوں کے گھنیرے سائے دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتے رہتے تھے۔ ہر چیز قرینے سے کی سجائی گئی۔ مگر وہ بال! مجھے اُس کے ساتھ پیار ہو گیا ڈاکٹر!

بتاتا ہوں۔ میں نے اُسے پہلی بار کونوینٹ کی اُس سنسان سڑک پر دیکھا تھا جس کے دونوں طرف سفیدے کے بلند درخت دو لمبی اور عمودی لکیروں کی طرح دُور دُور تک کھڑے تھے۔ وہ ایک گلی سے نکل کر سڑک پر آگئی اور میرا اور اُس کا سامنا ہو گیا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا جیسے آسمان سے بجلی تڑپ کر میرے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ میں حواس باختہ سا کھڑا ہی رہ گیا۔ بس اُسی ایک لمحے میں ایک عجیب طرح کی روشنی سینہ پھاڑ کر اور پسلیاں توڑ کر میرے سینے میں اُتر گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اُس غیر مرئی روشنی نے میرے اندر کوئی چیز جلا ڈالی یا نہیں۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اُس ایک لمحے میں میرا سب کچھ بدل گیا۔

میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں ایک لمحے میں اِتنا سب کچھ کیسے اور کیوں بدل جاتا ہے ڈاکٹر؟

جی نہیں! یہ ایک فضول سوال ہے۔

اُس پہلی ملاقات میں میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا لیکن میں اُسی وقت جان گیا تھا کہ میرے دل میں ایک تلاش اُبھر آئی ہے۔ ہاں! مجھے اِس لڑکی کو تلاش کرنا تھا۔ مجھے اُسے حاصل کرنا تھا۔ دوسرا کوئی خیال میرے ذہن میں نہیں آیا۔ میں نے کبھی نہ سوچا کہ اِس لڑکی کو میں کھو بھی سکتا ہوں۔ اگر یہ خیال کہیں پیدا ہوا ہوتا تو اِس خیال کے پرتو ہی سے میں مر گیا ہوتا۔

اتفاق سے دوسری ملاقات پھر اُسی سڑک پر ہوئی۔ اُس دوسری ملاقات میں میں نے اپنی وہ کیفیت اُسے بتادی جو اُسے پہلی بار دیکھ کر طاری ہوئی تھی ـــــ وہ مسکرائی۔

وہ ناراض نہیں ہوئی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کتابیں زیادہ پڑھتے ہیں؟"

"جی نہیں! میں کتابیں پڑھتا ہی نہیں۔ کتابوں سے میں اُکتا جاتا ہوں۔"

"پھر آپ کے دماغ میں کوئی خرابی ہے۔"

"جی نہیں! اِس بات کو آپ دماغ کی خرابی کہہ کر نہیں ٹال سکتیں۔ اِس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔"

"میرے پاس اِتنا وقت نہیں کہ میں فضول باتوں میں ضائع کروں۔"

اُس نے یہ کہہ کر شانوں کو جنبش دی اور چلی گئی۔

لیکن حیرت تو یہ ہے ڈاکٹر کہ میں اُس سرد مہری سے بالکل پریشان نہ ہوا۔ میں اُس لڑکی کو پہلے ہی اپنا ایک حصّہ مان چکا تھا۔ اِس لئے یہ بے اعتنائی میرے لئے کسی رنج کا باعث نہ بن سکی۔

اُس کے بعد ہم کئی بار ملے۔ مگر ہر بار یہ ہوا کہ وہ مجھے جھڑک نہ سکی اور میں اُسے بھلا نہ سکا اور رفتہ رفتہ ہم دونوں ہی کو اِن ملاقاتوں کا انتظار رہنے لگا۔

اپنی اِس طرح کی ملاقاتوں میں میں اُس ملاقات کا ذکر خاص طور سے کرنا چاہتا ہوں جب اُس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

وہ ایک وکیل کی بیٹی تھی اور ماں کے پیار کی بھوکی تھی۔ اُس کی ماں اُس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ اُس کا باپ اُسے بہت لاڈ سے پالتا تھا۔ کیونکہ یہی تو ایک نشانی تھی جو مرنے والی نے آخر دم اُسے سونپی تھی۔ شاید اُسے اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی ـــــ ایسی محبت تو نہیں جیسی مجھے اُس لڑکی سے ہو گئی تھی۔ بلکہ ایک عام قسم کی محبت، جس میں جنون کو کم اور عقل کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔

میری محبت جنون کی حد تک خطرناک تھی۔ میں نے خطرناک کا لفظ کہا ہے ناڈاکٹر! یہ صحیح لفظ میں نے استعمال کیا ہے۔ آپ چونکئے نہیں۔ میں اِتنا گنوار تو نہیں ہوں اور نہ اِتنا جاہل ہوں کہ اِس لفظ کی اہمیت کو نہ سمجھ سکوں۔ مجھے دو سال کے بعد ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا فائنل امتحان دینا ہے۔ کبھی میں ڈاکٹر ہوں گا اور لوگ میرے پاس علاج کرانے آیا کریں گے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے جو میں آپ کو یہ باتیں بتا رہا ہوں۔ مرض کی صحیح تشخیص کے لئے ڈاکٹر کو ہر بات بتانی لازمی ہے۔

ایک عجیب تضحہ ہے ڈاکٹر! میں اپنے کلاس کے دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرح دل پھینک نہیں ہوں۔ میں نے تفریح کے لئے کبھی محبت نہیں کی ہے۔ جذبات نے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا ہے۔ یہ تو فرصت کے کام ہیں۔ فاضل وقت اور فاضل دولت کسی کے پاس ہو تو یہ کام کرتا ہے۔ میرے وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اِس لئے میں خود اپنے اِس نئے جذبے پر حیران تھا۔ کبھی کبھی پریشان بھی ہو جاتا تھا۔

نہ جانے اِس لڑکی نے مجھ پر کون سا جادو کیا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی طاقت جیسے کسی نے سلب کر لی تھی۔ میری تمام کائنات سمٹ کر صرف ایک نقطے میں مرکوز ہو گئی تھی۔ میرے لئے کوئی آسمان نہ تھا، کوئی زمین نہ تھی۔ صرف زرّین تھی!

اور ڈاکٹر! آپ یقین کیجئے ڈیڑھ برس تک میں نے زرّین کھایا، زرّین پہنا، زرّین پڑھا، زرّین دیکھا۔ ہر ذرّے میں زرّین تھی، ہر کپڑے میں زرّین تھی، ہر پتّے میں زرّین تھی اور دیکھنے والی صرف دو آنکھیں تھیں ـــــ میری آنکھیں!

"خالد! تم اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ تمھاری محبت مجھے ڈرا دیتی ہے۔"

ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں کہا "مگر میں سنگر کو بات ہنسی میں ٹال دی۔

"تم کیا مجھ سے اتنی ہی قسم کی محبت چاہتے ہو؟"

"لیکن یہ سب کہوں جبکہ تم مجھے پاگل سمجھنے [illegible] کر دو گے۔ سوچتی ہوں

اگر میں کسی رات کو مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟"

"یہ نہ کہو! ـــ یہ نہ کہو!" میں چیخ پڑا۔

"اگر موت آ گئی ـــ تو ـــ تو ـــ نہیں، نہیں! میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔ خدا کے لئے دوبارہ ایسی بات غلطی سے بھی نہ کہنا!"

اُس رات میں نیند میں چونک چونک اٹھا۔ ایک عجیب بے چینی کا سلسلہ بدن میں چلنے لگی۔ کئی بار خیال آیا اُٹھ کر کسی کا خون کر دوں۔ کئی بار سوچا جا کر زرین کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور وہیں چوکھٹ پر سر کو کے زار زار روتا رہوں۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی اور اس کے بعد ہر رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹنے لگی۔

تین مہینے میں بالکل بھی نہیں سویا ڈاکٹر! یہاں تک کہ اُس کا اثر میرے دل پر پڑنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میرا دل سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ خواب آور گولیوں کا سہارا لیا۔ دل کی حالت کو درست کرنے کے لئے سیڈیٹو دوائیں استعمال کیں۔ اپنی غذا کی طرف خاص دھیان دینے لگا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا ڈاکٹر! کیونکہ میں مر جاتا تو زرین کسی دوسرے کی ہو جاتی اور یہ میں کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا۔

زرین کو میری حالت کا علم تھا اور وہ بضد تھی کہ میں کچھ مدت کے لئے اُس سے ملنا جلنا بند کر دوں تاکہ میرے اندر کی آگ قدرے ماند پڑ جائے۔

"خالد! یہی ایک صورت ہے جس سے تم ٹھیک ہو سکتے ہو۔ تمہاری زندگی میرے لئے زیادہ اہم ہے۔"

"یہ ناممکن ہے زرین! میں مرنا پسند کر دوں گا لیکن تم سے دُور رہنا کسی حالت میں پسند نہ کروں گا۔"

اُس رات میرے دل میں ایک اور خیال اُبھر آیا۔

حسد!!

یہ ایک نئی جلن تھی۔ میں نے سوچا اگر زرین مجھ سے اُکتا جائے تو کیا ہوگا۔ ہاں! آخر وہ ایک نیم پاگل سے آدمی کے ساتھ منسوب رہ کر کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ اور بھی آدمی رہتے ہیں اِس دُنیا میں، اِس شہر میں۔ وہ بھی زرین کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کر سکتے ہیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے ہر آدمی زرین کے ساتھ محبت کرنے لگا ہے۔ جیسے ہر آدمی زرین کا پیار دل میں چھپائے گھوم رہا ہے۔ جیسے ہر شخص زرین کے اُن خوبصورت بالوں کا شیدائی ہے۔ وہ رات بھی شبِ ہجر کی طرح دراز ہو گئی۔ ایک لمبی بھیانک رات! اِس رات کی صبح کیوں نہیں ہوتی میرے مالک! سورج کی کرنیں کہاں چھپ گئی ہیں میرے خدا! اللہ صبح ہو جائے!!

اللہ صبح ہو جائے!!

اور اللہ نے میری سُنی اور صبح ہو گئی۔ میں جلدی جلدی نہایا اور کپڑے پہن کر باہر نکلا۔ میں جانتا تھا کہ زرین اُس سُنسان سڑک پر صبح سویرے سیر کو جاتی ہے جو کو نوینٹ کے آگے سے گزرتی ہے اور جس کے دونوں طرف سفیدے کے درخت دو متوازی قطاروں میں ایستادہ ہیں۔

یہ آج صبح کی بات ہے ڈاکٹر!

یہ آپ بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے ہیں؟ ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، میں پورے ڈیڑھ بجے یہاں آیا تھا۔ آدھا گھنٹہ! اِس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ ہاں تو ڈاکٹر! جب میں گھر سے باہر آیا تو سڑک تقریباً سُنسان ہی تھی۔ اخباروں کے ہاکر، دودھ والے اور سبزی فروش ہی نظر آتے تھے۔ اُن میں جیسے ہر آدمی زرین کا عاشق تھا۔ ہر آدمی زرین سے ملنے جا رہا تھا۔ ہر آدمی کے دل میں صرف ایک لگن تھی۔ ہر آدمی کے دماغ میں صرف ایک سودا تھا۔

اور اچانک مجھے اپنا وجود بہت حقیر نظر آیا۔ نالی میں رینگنے والے کیڑے سے بھی زیادہ حقیر! اور پہلی بار مجھے محسوس ہوا زرین بھی مجھے اتنا ہی حقیر سمجھ رہی ہو گی۔

وہ اس کی آنکھوں کی شریر چمک۔ وہ اُس کی باتوں میں دبی دبی سرزنش۔

وہ اُس کی ہنسی کا طنزیہ انداز۔ ہاں ہاں! وہ مجھے اپنے قابل کبھی نہیں سمجھتی۔

اور یکایک میرے چاروں طرف اندھیرے ہی اندھیرے ابھر آئے۔ یہ ـــ یہ صبح کہاں ہوئی تھی۔ یہ تو ابھی تک لمبی، کالی بھیانک رات ہی چل رہی تھی اور یہ اندھیرا مجھے اچھا لگنے لگا۔ میں نے سوچا اگر اُجالا ہو جائے گا تو میں اپنا مُنہ کسی کو نہ دکھا سکوں گا۔

ایک ہی صورت تھی ـــ موت!!

ہاں! میں مر جاؤں گا۔ میں مر جانا چاہتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اُن بہت ساری دواؤں کا نام دُہرایا جنہیں کھا کر میں پلک جھپکنے میں مر سکتا تھا۔

مگر ایک خیال بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ میرے دماغ میں گھُس آیا۔ میرے مرنے کے بعد زرین کسی اور کی ہو جائے گی!

نہیں نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا! میں نہیں مروں گا۔ زرین مر جائے گی۔

ہاں! زرین مر جائے گی۔

اِس خیال کے آتے ہی میں اُس سڑک کی طرف دَوڑ پڑا، جس پر زرین سیر کرنے جایا کرتی تھی۔

اب اصل بات شروع ہو جاتی ہے ڈاکٹر! اور اصل میں اِسی بات کے لئے اِتنی تفصیل بتانی پڑی۔

ہاں تو ڈاکٹر! جب میں اُس سڑک پر پہنچا تو میں نے دیکھا زرین کوئی میں قدم آگے خراماں خراماں جا رہی ہے۔ میں چوری چھپے۔ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ فاصلہ گھٹ کے دس قدم رہ گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور اپنے دماغ کو ایک سیاہ پردے سے ڈھک دیا۔ فاصلہ صرف پانچ قدم رہ گیا۔ اُس کے گنگنانے کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی۔ ... بال اُس ... پیچھے ... اور میری ناک ... ایک جانی پہچانی خوشبو گھس آئی۔ میں نے اُس ... خوشبو کا گلا گھونٹ دیا۔ ... اور اپنے دونوں ہاتھوں سے زرین کا گلا پکڑ کر دبایا ... یہ گلا گھونٹ کر ... ڈاکٹر! ایک گلاس پانی دیجئے۔ یہ بہت ... ہاتھوں کی کپکپی دیکھ رہے ہیں نا آپ؟

آپ ... جانے لگے ... کس ... فون کیجئے گا؟ کیا پولیس کو؟

مگر ڈاکٹر! آپ بات تو سنئے۔ میں کہاں بھاگا جا رہا ہوں جو آپ کو پولیس کو فون کرنے کی اتنی جلدی ہے؟

آپ بیٹھ جائیے ڈاکٹر! آپ کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی ہیں جیسا کہ میرے ... کیا ... آپ کو اس قدر ... نہ ہونا چاہئے

ہاں تو ڈاکٹر! وہ لمحہ۔ وہ ایک لمحہ جب میری انگلیاں زرین کی گردن پر مضبوطی سے پیوست تھیں۔ میں اُس لمحے کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک تیز جھرجھری میرے سارے بدن میں آئی اور پھر دو چیزیں ایک ساتھ ہوگئیں۔ ایک اُس کی تیز چیخ بلند ہوئی اور ایک میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"تم ہو؟"

اُس نے ایک کمزور سی آواز میں پکارا اور میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں حیرت اور غم کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔ میں اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ جی ہاں! وہیں سڑک کے بیچوں بیچ، پھر نہ جانے کیا ہوا بہت کچھ ہو گیا ڈاکٹر!

پھر ہم دونوں عدالت میں گئے اور وہاں سے شوہر اور بیوی بن کے نکلے۔ وہاں سے نکل کے ہم سیدھے آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ جی ہاں! زرین باہر بیٹھی ہے۔ کہئے تو اُسے بلاؤں۔

ہاں تو ڈاکٹر! میں یہ مشورہ لینے آیا ہوں ... زرین کے ساتھ — نہیں نہیں! زرین نے میرے ساتھ شادی کرکے غلطی تو نہیں کی! اور میرے اندر جو ایک عجیب طرح کا سکون سما گیا ہے وہ کسی ذہنی بیماری کا نتیجہ ہے یا ایک قدرتی ردِّعمل!!

غزل

کرشن موہن ایم اے

وادی وادی صحرا صحرا — گھوم رہا ہوں تنہا تنہا
آشاؤں میں کھویا کھویا — سب سنسار ہے سویا سویا
میری آہیں صحرا صحرا — میرے آنسو دریا دریا
اُلفت میں میری رسوائی — عالم عالم دُنیا دُنیا
یزداں کا دِل کانپ رہا ہے — جاگ اُٹھا ہے ذرہ ذرہ
کاش تمھارے دل میں ہوتا — میرا غم بھی تھوڑا تھوڑا
اپنی منزل پر آکر بھی — مَیں ہوں گویا بھٹکا بھٹکا
جینا تو تھا ۔ مَیں کیا کرتا — مرتا رہا ہوں رفتہ رفتہ
پاؤں نہیں پڑتے ہیں زمیں پر — نازو نزاکت اللہ اللہ
تیری آنکھیں حیراں حیراں — ساکت ساکت گویا گویا
دِل پر گھور اندھیرا چھایا — اُجلی دُھوپ بھی سایا سایا
رخساروں میں جلوہ گر ہے — رنگ شفق کا ہلکا ہلکا
یہ بھی تو اِک نادانی ہے — محوِ انا ہے دانا دانا
دل دھڑکا ہے، غم بھڑکا ہے — منزل منزل جادہ جادہ
جانِ جہاں تیری نکہت سے — سارا جہاں ہے مہکا مہکا
جینا ہوگا ، پینا ہوگا — زہرابِ غم جُرعہ جُرعہ
دل سنبھلا ہو تو لگتا ہے — سارا عالم سنبھلا سنبھلا
دل میں نہیں ہے پیار کسی کا — رنگِ زیست ہے پھیکا پھیکا
سوئی ہیں ساری اُمیدیں — شہرِ دل ہے اُجڑا اُجڑا
ہجر میں اِک اِک سال پہ بھاری — ساعت ساعت لمحہ لمحہ
جوگی بنکر عشق رواں ہے — برزن برزن کوچہ کوچہ

اُتنا اُتنا غم ملتا ہے
ظرفِ دِل ہو جتنا جتنا

افسانہ

منزل

پروفیسر انور سیوانی۔ ایم۔ اے

شیخ محلہ، نئی گلی، سیوان ضلع سارن (بہار)

برادر مکرّم جناب خوشتر صاحب! نیاز و تسلیمات

اکتوبر اور نومبر کے "بیسویں صدی" کے شمارے نہ آئے تو میں نے سمجھا، آپ کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ دسمبر کا "بیسویں صدی" آیا تو سارے خدشات دُور ہو گئے اور یقین ہو گیا کہ آپ کی عنایتوں سے محروم نہیں ہوا — سابقہ روایات کی طرح یہ سالنامہ بھی اُردو کے افسانوی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی کاوشوں اور آپ کی شخصیت کی محبوبیت سے "بیسویں صدی" اُردو کے افسانوی ادب میں نئے معیار قائم کر رہا ہے۔ خدا کرے اُردو دُنیا پر آپ کا سایہ ہمیشہ رہے۔ —— اپنی نئی تخلیق "منزل" بھیج رہا ہوں۔ حلقۂ احباب میں یہ افسانہ بہت پسند کیا گیا ہے۔ میں نے اس میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ یہ افسانہ آپ کو بھی پسند آ گیا تو سمجھوں گا میرا تجربہ کامیاب رہا۔۔۔

مخلوص کیش —— انور

آٹھ برس کے بعد میں پھر اس شہر میں آیا ہوں۔ اس شہر میں میری جوانی کی کتنی یادیں وابستہ ہیں! یہاں قدم رکھتے ہی ماضی کی یادیں میرے وجود کو چاروں طرف سے آکر گھیر لیتی ہیں۔ وقت کی نزاکت انھیں کچھ دیر کے لئے ذہن سے پرے ہٹا دینے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ سارا دن مارا مارا پھرنے کے بعد شام کو کسی طرح مشغولیت سے چھٹکارا پاتا ہوں۔ سارے دن کے تھکا دینے والے چکر کے بعد اپنے آپ میں آتا ہوں۔ اب میں اپنے چہرے کو پہچاننے لگتا ہوں۔ اس کے خد و خال اُبھرنے لگتے ہیں اور یادوں کا ہجوم جسے میں نے اپنے سے دُور ہٹا رکھا تھا آکر پھر میرے وجود سے چمٹ جاتا ہے۔ میرے پاؤں بے اختیار طور پر حرکت میں آتے ہیں اور میرے جسم کو اُٹھاتے ہوئے لے چلتے ہیں۔ جب میری نگاہوں کی روشنی واپس لوٹ آتی ہے تو میں اپنے کو کلب میں پاتا ہوں۔ کلب جو میرا دیرینہ رفیق ہے، جہاں آٹھ سال پہلے میں نے خوشیوں کی جنتیں پائی تھیں، جس کے در و دیوار مجھے دیکھتے ہی آنکھیں بچھا دیتے تھے۔ آج میں یہاں اجنبی کی طرح آیا ہوں۔ لیکن نہیں، اجنبی کیوں؟ اپنے دل کی دُنیا میں بھی بھلا کوئی کبھی اجنبی ہوتا ہے!

کلب میں داخل ہوتے ہی یادوں کا ہجوم اپنی گرفت اور مضبوط کر لیتا ہے اور میرا دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ کلب کی رونق شباب پر ہے۔ ہر طرف انجان نئے چہرے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی شناسا سا چہرہ نظر آتا ہے تو میری آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ یادیں میرا گلا دبانے لگتی ہیں۔ ہائے اُنھوں نے تو میری ہر سانس کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ یونہی، کوئی بے نام سا خیال میرے دل میں اُٹھتا ہے اور یادوں کا ہجوم مجھے اپنے حلقے میں لئے ہوئے کلب کے اُس حصّے میں پہنچا دیتا ہے جہاں آٹھ سال پہلے میں ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا۔ نگاہیں کسی کو تلاش کرنے لگتی ہیں اور جب اُن کی روشنی گھومتی ہوئی لوٹ کر واپس آتی ہے تو ایک جانا پہچانا سا چہرہ اُن پر اپنا سایہ ڈالتا ہے۔ میرا وجود مجسّم حرکت بن جاتا ہے اور میں اُس جانے پہچانے محبوب چہرے کے پاس چلا جاتا ہوں۔

اب مجھے اپنا نام یاد آ جاتا ہے اور اُس محبوب چہرے کا بھی۔ وفورِ مسرّت سے آواز میں جذبات کی ساری گرمی سمیٹے ہوئے میں کہتا ہوں: "ہیلو، ہیلو مس شیلا!"

وہ محبوب چہرہ حیرت میں آکر میرا مُنہ تکنے لگتا ہے اور پھر جوش اور مسرّت بھری آواز میں "ہیلو ہیلو شہباز ڈارلنگ!" کہتا ہوا میرے ہاتھ تھام لیتا ہے۔ اپنے بغل کی کرسی پر مجھے بٹھا کر وہ محبوب چہرہ اپنی غلافی آنکھوں کی ساری روشنی میرے چہرے پر بکھیرنے لگتا ہے۔ میں خاموش ہوں۔ وہ بھی خاموش ہے۔ میں تو اس لئے خاموش ہوں کہ

اچانک یادوں کے ہجوم نے میرے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور الفاظ جذبات کی مدہوشی میں ڈوب کر رہ گئے ہیں۔ شیلا کا بھی شاید یہی حال ہے۔ لیکن اس کے وجود پر یادوں کی گرفت اتنی شدید نہیں جیسی مجھ پر ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ اپنی غلافی آنکھوں میں چمک پیدا کرکے جذباتی انداز میں کہتی ہے: "شہباز ڈارلنگ! بڑے ظالم ہو تم! ارے ڈارلنگ! اتنے لمبے عرصے تک تم دنیا کے کن گوشوں میں چھپے رہے ―― آنکھیں ترس کر رہ گئیں۔ تمہاری کتنی مدتوں کے انتظار کے بعد تمہارا نورانی (پیارا چہرہ) نظر آیا ہے!"

الفاظ میری زبان پر واپس آجاتے ہیں اور میں کہتا ہوں: "شیلا ڈارلنگ! بزنس کا چکر ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ مت پوچھو، کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ آج صبح میں یہاں آیا ہوں تو تم سب بہت یاد آئے۔ سارا دن بزنس کے چکر نے دم نہ لینے دیا۔ ذرا جان چھڑا کر یہاں آتا آتا آیا ہوں۔"

شیلا کے چہرے پر کئی رنگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ مسلسل میرے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ شاید وہ میرے چہرے کے تاثرات سے میرے دل کا حال جاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرا دل بیقرار ہو جاتا ہے اور میں پوچھتا ہوں: "شیلا ڈارلنگ! کچھ پرانے دوستوں کا حال سناؤ۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ قدرے افسردہ لہجے میں کہنے لگتی ہے ――

"شہباز ڈارلنگ! دنیا کا دستور ہے ――――

The old order Changeth yielding Place to the new

(پرانا نظام بدل جاتا ہے اور نئے (نظام) کو اس کی جگہ ملتی ہے)

جانے کلب کا بھی اولڈ آرڈر بدل گیا۔ اب اس کی باگ ڈور نئی نسل کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اب وہ کلب کی پرانی شامیں کہاں؟ اب وہ پرانی محفل کی رونق کہاں! اب تو ہر روز نئے چہرے ہیں اور ان کا بنایا ہوا نیا دستور ―― نئی نسل کچھ عجیب طرح کی ہے۔ اس نے اپنے لئے معیار بھی اپنی پسند کا بنایا ہے۔ اب یہی دیکھو شہباز ڈارلنگ! ہم لوگ برسوں ایک ساتھ رہے اور کتنی بے تکلفی سے رہے ―― ہاں روبی ڈارلنگ کا میں نہیں کہتی، وہ بے بھی ذرا بودے ذہن کی۔ بس ایک وہی لڑکی تھی جو اتنی جلد دام میں آگئی اور اپنی آزادی کو خیرباد کہہ کر گھریلو عورت بن گئی۔ پھر بھی تین چار برس کلب کی دلچسپیوں کا لطف اٹھانے کے بعد۔ اب شہباز ڈارلنگ! تمہارے رنجیت، رمیش یا تلمر جیسے جوانمرد کہاں رہے اور رہوں بھی تو کیسے؟ اب تو کلب بھی پہلے جیسا کلب نہ رہ گیا۔ اب تو اس کا ماحول بھی بوریت کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اب تو اس کے ممبروں میں کسی لیڈی سوشل اور گنائزر کا نام آتا ہے تو کسی سیاست داں کی بیوی کا۔ لڑکیاں تو اب ادھر کبھی کبھار ہی آجاتی ہیں اور وہ بھی کچھ ایسی چھچھوری فطرت کی کہ ان کے کرتوت سنو تو کان پر ہاتھ دھرو۔ آج کل کے نوجوان بھی کچھ کم چھچھورے نہیں۔

کلب کے ممبر بنیں گے۔ سال بھی تمام نہ ہونے پائے گا کہ اُن کے کوئی نہ کوئی اسکینڈل اُڑنے لگیں گے۔ پھر سُنو گے کہ مس بملا نے مسٹر کمار سے شادی کر لی، مس رینا نے مسٹر پرویز سے سِول میرج کا اعلان کر دیا، مس سریتا مسٹر بھٹناچاریہ کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کلب نوجوانوں کے لئے میرج بیورو بنتا جا رہا ہے اور ادھیڑ عمر کے مردوں اور عورتوں کے لئے سماجی اور سیاسی کاموں کا ادارہ۔ مجھے تو کلب کے ماحول کی ایسی دُرگت ہوتے دیکھ کر ہَول آنے لگتا ہے۔"

شیلا ہانپنے لگتی ہے۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی بُوندیں چھلکنے لگتی ہیں۔ جن کے ساتھ پوڈر کی کئی تہیں بہہ جاتی ہیں اور اُس کے گندمی رخساروں کی سطح نمایاں ہونے لگتی ہے۔ میں اُس کے چہرے کو تکتا رہتا ہوں اور وہ مجھے غور سے دیکھتی رہتی ہے۔ میرا دل بیقرار ہو جاتا ہے اور وہ زبان کو اُکسانے لگتا ہے اور میں کہتا ہوں۔

"شیلا ڈارلنگ! ہر نسل اپنے لئے نئی زندگی تلاش کرتی ہے۔ ہمارے نوجوان اسی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ شیلا ڈارلنگ! غم نہ کرو (کیونکہ اُس کی آنکھوں کے اُن آنسوؤں کو جنہیں وہ بہت کوشش سے چھپا رہی ہے، میں دیکھ لیتا ہوں) چھوڑو اس نسل کو اُس کے حال پر، کچھ اپنے پُرانے دوستوں کا حال سناؤ۔"

شیلا چند لمحوں تک میرے چہرے کو تکتی رہتی ہے۔ شاید وہ میرے چہرے سے اپنے مطلب کی کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھتی ہے اور کہنے لگتی ہے "شہباز ڈارلنگ! جب طوفان آتا ہے تو کچھ پُرانے پیڑوں کو بھی اپنی زد میں لے لیتا ہے۔ ہماری نسل بھی اس نئی نسل کی چھوت سے کہاں بچ پائی ہے۔ اسی زرینہ کو دیکھو ڈارلنگ! میری کتنی اچھی سہیلی تھی اور تم تو ایک زمانے میں اُس کا نام لے کر ہی کوئی بات کرتے تھے۔ نہ جانے اُسے کیا سنک سوار ہوئی کہ وہ بھی روبی کی راہ پر چل پڑی۔ خیر رُوبی تو ذہن کی بودی تھی لیکن زرینہ تو اپنے کو بہت انٹلکچوئل پوز کیا کرتی تھی۔ رہ گئی دھری اُس کی ساری انٹلکچوئلزم اور ہمیں اُس وقت معلوم ہوئی جب وہ ایک پروفیسر کو پھانس کر اُس سے شادی رچا بیٹھی۔ یہ پروفیسر بھی بڑا کائیاں نکلا۔ اُس نے بھی زرینہ کو ایک گرلس اسکول کی پرنسپل بنا کر ہی چھوڑا۔ جب میں اُس پروفیسر اور اپنی اس سہیلی لیڈی پرنسپل کے بارے میں سوچتی ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے بیلوں کی ایک جوڑی کا خیال آتا ہے جن کے کندھوں پر کتابوں کا بار لاد دیا گیا ہو۔"

منہ پر قدرے ناگواری کے اثرات پیدا کرتے ہوئے وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ میرے دل کی بیقراری کچھ اور بڑھ جاتی ہے اور میں اُس سے نیلو کے بارے میں دریافت کرنے لگتا ہوں۔ شیلا چہرے پر فخر کے احساسات نمایاں کرتے ہوئے کہتی ہے "نیلو سویٹی کا حال پوچھتے ہو شہباز ڈارلنگ! تم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ نیلو ونڈرفل گرل ہے۔ واقعی وہ ایسی ہی ہے۔ اس میں شک کرنا گناہ ہے۔ اب یہی دیکھو سارا شہر اُس کے بارے میں طرح طرح کے اسکینڈل پھیلا رہا ہے۔ لوگوں کے مُنہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ وہ سیٹھ چمن کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ کُتّوں کو بھونکنے دو، راہ گیر کا کیا بگڑتا ہے۔ مجھ سے پوچھو اس سارے اسکینڈل کی حقیقت کیا ہے۔ نیلو سویٹی نے سیٹھ چمن سے سِول میرج کر لی ہے اور سیٹھ نے ایک امبالا اور شملہ میں ایک کوٹھی اُس کے نام منتقل کر دی ہے۔ سیٹھ چمن کی بھی اپنی کچھ مجبوریاں ہیں۔ اب بہوؤں اور پوتوں، پوتیوں کی فوج کے سامنے تو وہ اپنی شادی کا اعلان کرنے سے رہا۔ اِس لئے اُس نے اِس اسکینڈل کو پھیلنے دیا بلکہ خود کوشش کر کے اسے پھیلایا اور اب وہ اور نیلو شملہ میں سکون کی سانس لے رہے ہیں۔"

میرے دل میں آہ کی سرد لہر دوڑ جاتی ہے۔ لیکن میں اپنے چہرے کو کسی طرح کے تاثرات کے نشان سے عاری رکھنے کی پُوری کوشش کرتا ہوں اور شیلا سے روبی کے بارے میں پُوچھنے لگتا ہوں۔

رُوبی کے نام پر شیلا ناک سکوڑ لیتی ہے اور قدرے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے "نام نہ لو شہباز ڈارلنگ اُس پرکٹی کا۔ وہ تو فرسٹ کلاس کی ہائپوکریٹ (عیار) نکلی۔ اب رُوبی وہ رُوبی سویٹی کہاں؟ وہ تو ایک معمولی سی گھریلو عورت بن کر رہ گئی ہے۔ کلب کی ممبری سے تو اُس نے مسز فیروز بننے کے دو مہینوں کے بعد ہی علیحدگی اختیار کر لی۔ اپنی پُرانی سہیلیوں سے وہ کبھی کبھار ہی ملتی ہے۔ سُنا ہے اُس کے چار بچے ہیں اور ہر بچے کے نام ایک فرم قائم کر دی گئی ہے۔ مکّار کہاں کی! کبھی تو بچوں کے نام سے ناک پر انگلی رکھتی تھی اور اب وہ رات دن اپنے بچوں کی فکر میں مری رہتی ہے۔ ہر بچے کے لئے ایک نرس ہے لیکن اُس بودی ذہن کی رُوبی کو اطمینان نہیں ہوتا جب تک وہ ایک نظر اپنے سب بچوں کو دیکھ نہ لے۔ رُوبی ایسی غریب کار نکلے گی، میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی۔"

شیلا ایک بار پھر ہانپنے لگتی ہے اور میں اُسے موڈ میں لانے کے لئے بیرے کو جن کی دو بوتلیں لانے کو کہتا ہوں۔

ایک ایک پیگ سِپ کرنے کے بعد ہم اپنی پُرانی یادوں کو بیدار کر لیتے ہیں۔ میرے دل میں آرزوئیں اور تمنّائیں طوفان برپا کرنے لگتی ہیں۔ الفاظ میری زبان پر آتے وقت تذبذب میں پڑ جاتے ہیں لیکن میں ہمّت کر کے پُوچھ ہی بیٹھتا ہوں "شیلا ڈارلنگ! جگ بیتی تو یہ رہی۔ اب کچھ آپ بیتی سُناؤ۔"

شیلا چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ ایک پھیکی سی مُسکراہٹ اُس کے چہرے پر رینگنے لگتی ہے اور وہ یاس بھرے لہجے میں کہتی ہے "شہباز ڈارلنگ! میری آپ بیتی میں کیا رکھا ہے۔ میں جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہوں۔ کنواری کی کنواری ——!"

میرے دل میں اُمید کی ایک لہر اُٹھتی ہے۔ دل میں خوشی کے جذبات موجزن

جاتے ہیں اور الفاظ کو بہت سہارا ملتا ہے۔ میں اُمید آواز میں کہتا ہوں "شیلا سویٹی! آئندہ کے لئے کیا ارادہ ہے؟ کہیں عمر بھر (ہمیشہ کے لئے کنواری) رہنے کا خیال تو نہیں؟"

شیلا قدرے جذباتی انداز میں کہتی ہے "او نو شہباز ڈارلنگ! ایسی بات ہرگز نہیں۔ ایسی بات تم نے سوچا، ہاں تم ──── بات دراصل یہ رہی کہ پروپوزل آنے کو تو کئی نے سوچا لیکن سب کے سب غلط ثابت ہوئے۔ ویسے تو بھئی شادی کے لئے نہ جانے کتنے لوگ خواہاں نظر آتے ہیں۔ لیکن نہیں، ایسی بات نہیں کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ کون مجھ سے شادی کرے اور کس کو میں اپنی شادی کے لائق سمجھوں۔ شہباز سویٹی! تمہاری بات کچھ اور ہے۔"

جوش بھری مسرت سے ان میرے منہ سے نکل جاتا ہے "تو آؤ ڈارلنگ! ایک ملک، ایک پلنگ اور تمہاری صحت کا جام پئیں!"

اور جب دو سے پیگ کی گھونٹیں حلق سے نیچے اترتی ہیں تو میں شیلا سویٹی سے آنکھیں ملا کر اس کے کان میں پروپوز کر دیتا ہوں ──── شیلا سویٹی کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہے۔ اس کا پیارا چہرہ اور پیارا دکھائی دینے لگتا ہے۔ ہماری میز کے گرد کی فضا رومانوں کے کیف میں ڈوب جاتی ہے۔ ہمارے دلوں میں مسرت کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ شیلا خوشی میں جھوم کر میری پیشانی کو چوم لینا چاہتی ہے۔ آواز میں رس گھولتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہتی ہے "شہباز ڈارلنگ! تم کتنے پیارے ہو ڈارلنگ! تم مجھے ہمیشہ پیارے معلوم ہوتے۔ ڈیرسٹ شہباز! میری آنکھیں تمہارا لوفیس دیکھنے کے لئے صدیوں سے ترس رہی تھیں۔ گوڈ بی تھینکڈ (خدا کا شکر ہے) آج میری نگاہوں کی جنت میرے پاس ہے۔ اوہ! میرے دل کو کتنی خوشی ہے، کتنی خوشی شہباز ڈیرسٹ!" وفور جذبات سے مدہوش ہو کر الفاظ اس کے حلق سے باہر نہیں آتے۔

اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ہے۔ دل کا سارا پیار آنکھوں میں اتر آیا ہے اور وہ اُسے میرے چہرے پر نثار کر رہی ہے۔ جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ کہتی ہے "شہباز ڈارلنگ! بائی گوڈ (خدا کی قسم) میں زندگی کی آخری سانس تک تمہاری ہوں، صرف تمہاری! میں تمہارے حکم پر چلوں گی۔ تمہاری مرضی کے خلاف کام کرنے کا تصور بھی نہ کروں گی۔"

شیلا سویٹی کو چھیڑنے کے لئے میں کہتا ہوں "شیلا ڈارلنگ! کیا تم رُوبی کی طرح میرے لئے گھریلو عورت بن سکو گی؟"

شیلا کہتی ہے "ڈارلنگ، مائی ڈیرسٹ! کیا کہتے ہو، رُوبی! میں رُوبی سے بھی بڑھ کر گھریلو عورت بن جاؤں گی۔ رُوبی کی کیا حقیقت ہے۔ تم چاہو تو میں تمہارے نصف درجن سے بھی زیادہ بچوں کی ماں بن جاؤں گی اور خود ہی سب کی نرسنگ کروں گی۔"

ہم ہاتھ میں ہاتھ دئے کلب سے باہر آجاتے ہیں۔ ایک مشفق بیوی کی طرح شیلا میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ راستے میں ایک گوشے میں اسے چومنا چاہتا ہوں۔ ایک مشرقی دوشیزہ کی طرح وہ اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔ وہ آواز میں رس گھولتے ہوئے کہتی ہے "ابھی نہیں ڈارلنگ! ابھی نہیں۔ ذرا ضبط سے کام لو۔ کل ہماری شادی ہوگی اور اس کے بعد میرے وجود کے تم مالک ہوگے۔"

یہ کہہ کر جیا کے بارے وہی شیلا میرے پیچھے پیچھے میری کوٹھی پر آتی ہے۔ میں اُسے اُس کے بیڈ روم میں پہنچا دیتا ہوں، جیسے بہت عرصے کی مسافت طے کرنے کے بعد منزل پر پہنچ کر کسی راہی کے چہرے پر مسرت اور سکون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ویسی ہی مسرت اور ویسے ہی سکون کی جھلک شیلا سویٹی کے چہرے پر نمایاں ہے۔

شانِ نزول

—————— نریش کمار شادؔ

۱۶۳۵ تیمار پور۔ دہلی

۲۲ر جنوری ۱۹۶۸ء محبِ محترم! تسلیم و نیاز

زیرِ نظر "شانِ نزول" دیکھنے سے پہلے ذرا اس خط کی شانِ نزول ملاحظہ فرمایئے۔ ہوا یہ کہ دورانِ مطالعہ جب کسی مغربی مصنف کا یہ جملہ میری نظر سے گزرا People who want by the road [illegible] تو مجھے بے اختیار آپ کا خیال آگیا۔ اس پیرانہ سالی the men should be kicked by the road میں بھی پاؤں کے درد اور بینائی بتدریج کم ہونے کے باوجود آپ کی روزمرّہ زندگی میں محنت اور جد و جہد کا شعلہ ابھی تک پوری تابانی کے ساتھ بھڑک رہا ہے۔ میرے نزدیک آپ کی کامیابی کا باعث بھی یہی ہے۔ جن لوگوں نے آپ کو قریب سے نہیں دیکھا اور آپ کی غیر معمولی قوتِ کار کا جنہیں اندازہ نہیں جب وہ آپ کی قابلِ رشک کامیابی کو محض آپ کی خوش قسمتی پر محمول کرتے ہیں تو میں اُن سے کبھی متفق نہیں ہو سکا اور ہر بار اُن کی ایسی باتیں سُن کر دل ہی دل میں (Anon) کے اس خوب صورت جملے کو دُہرایا کرتا ہوں ...... Luck is a very good word [illegible] میرے کوارٹر کا نیا نمبر دیکھ کر چونکیے نہیں۔ کوارٹر وہی پرانا ہے۔ جب گزشتہ سال یہ کوارٹر مجھے الاٹ ہوا تھا اس کا نمبر E 1957 تھا۔ جب یہاں رہنے لگا تو معلوم ہوا کہ اب اس کا نمبر ... ہو گیا ہے اور جب پچھلے دنوں اِس کی سفیدی ہوئی تو 62 کی بجائے اس کا نمبر 35-K لکھ دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے موسم کی طرح بلکہ آج کل کے دوستوں کے چہروں کی طرح اِس مکان کا نمبر بھی بدلتا رہتا ہے۔

آپ کا اپنا —————— نریش کمار شادؔ

اخترؔ شیرانی کی محبوبہ سلمیٰ کوئی فرضی محبوبہ نہیں تھی، ایک جیتی جاگتی شخصیت تھی اور نہایت سُلجھے ہوئے اور پاکیزہ کردار کی مالک تھی۔ اُس کا ادبی مذاق بھی نہایت شُستہ اور نکھرا ہوا تھا۔ اخترؔ کو اُس سے جو رُوحانی اور جذباتی لگاؤ تھا اُس کا اندازہ اسی ایک شعر سے ہو سکتا ہے جو اخترؔ نے اُس کی بیماری کے موقع پر کہا تھا ؎

ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب
آج معلوم ہوا ہم کو علالت کیا ہے

مرزا داغؔ دہلوی بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کی طرح شگفتہ مزاج اور زندہ دل تھے۔ صاحب جان اور امیری بہت چنچل کمسن لڑکیاں تھیں۔ داغؔ اِن کی پرورش کیا کرتے تھے اور اکثر اوقات اِن دونوں سے اُن کی دل لگی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن داغؔ نے امیری سے کہا میرا دل چاہتا ہے، تیرے ساتھ شادی کر لوں۔ جواب میں امیری کہنے لگی، سرکار! آپ کے بال سفید اور مُنہ میں دانت نہیں۔ میں آپ سے شادی کر کے کیا کروں گی۔ اتنے میں مولانا احسن مارہروی وہاں پہنچ گئے تو داغؔ نے اُنہیں دیکھ کر برجستہ اور فی البدیہہ شعر پڑھا ؎

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے
جان بھی جائے تو میری جان ہنستے بولتے

کہن سال اُستاد ظہیرؔ دہلوی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی سے نکلے

رامپور، الور اور جے پور میں ایک مدت تک قسمت آزمائی کرکے ٹونک پہنچے۔ یہ واقعہ موجودہ صدی کے آغاز سے آٹھ نو سال پہلے کا ہے۔ اُس زمانے میں نواب ابراہیم علیخاں خلیل کی حکومت تھی۔ یہاں سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی کو افتخار الشعرا اعتبار الملک کا خطاب مل چکا تھا۔ اُستاد ظہیر نے ایک مشاعرے میں جب اپنی غیر طرحی غزل کا مطلع ~

قتلِ عالم کے لئے تم نے نکالا جوبن
تیغ ہاتھوں سے سنبھلی تو سنبھالا جوبن

پڑھا تو واہ واہ اور ہاہا کے شور سے مشاعرے کے باہر کی فضا بھی گونج اُٹھی اور یہ شعر شہر بھر میں کئی دن تک ظہیر کی اُستادی کی دھوم مچتی رہی۔ جواں سال مضطر ایسا تیکھا مطلع سننے کے بعد خود بھی اس زمین میں طبع آزمائی سے کیونکر باز رہ سکتے تھے۔ انھوں نے غزل لکھی اور اگلے مشاعرے میں طرحی غزل پڑھنے سے پہلے کہا کہ اُستاد ظہیر کا "نکالا جوبن - سنبھالا جوبن" والا مطلع بالائے تعریف ہے تو ضعیف ہے۔ میں نے بھی اپنی بساط کے موافق طبیعت پر زور ڈالا ہے مطلع ملاحظہ ہو ~

بالا بالا تو نہ جائے گا یہ بالا جوبن
لوٹ ہی لے گا کوئی لوٹنے والا جوبن

مضطر بار بار مطلع پڑھتے رہے اور سامعین داد دے دے کر تھک گئے۔

وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں سن ۱۹۳۰ء میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب رہا کرتے تھے۔ وہی سڑک ہے جو مزار حضرت مخدوم شاہ مینا کو علاقہ چوک سے ملاتی ہے۔ مزار شریف پر نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہر مہینے نوچندی جب بھی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ اُس نوچندی میں چوک اور سڑک کی بالانشینان کافی تعداد میں شریک ہوا کرتی ہیں۔ ہر جمعرات کو عموماً اور نوچندی جمعرات کو خصوصاً سرِ شام ہی آج بھی اودھ کی یہ دلکش شامِ نوری آب و تاب کے ساتھ ہر صاحبِ نظر کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ مجذوب صاحب نے یہ شعر اسی سڑک کی زیب و زینت اور چہل پہل کے پیشِ نظر کہا تھا ~

ہم بھی ہیں سرِ راہ کھڑے آج حسینو!
بن ٹھن کے نہ نکلو کہ لگا دیں گے نظر ہم

ایک بار مردم شماری کے متعلق پولیس محکمے کے ایک کارکن نے جب مولانا حسرت موہانی سے دریافت کیا کہ آپ کی سکونت کا مقام کانپور لکھا جائے یا لکھنؤ؟ تو حسرت نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ~

نہ چھوٹا درِ یار حسرت نہ چھوٹا
بہت ہم نے چاہا بنیں کانپوری

---

۳ ستمبر ۱۹۲۲ء کو حیرت شملوی کا ایک بچہ جو چار سال اور چار مہینے کا تھا اچانک کسی مرض میں مبتلا ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا۔ اُس سانحے کے چند سال بعد جب حیرت صاحب اپنی وہ غزل کہہ رہے تھے جس کا مطلع ہے ~

دل کہہ رہا ہے اُن کی نظر دیکھتے ہوئے
دیکھیں گے کیا اِدھر وہ اُدھر دیکھتے ہوئے

تو انھیں غیر شعوری طور پر اپنے مرحوم بیٹے کا خیال آگیا اور اس زمین میں یہ شعر اُس کی یاد میں موزوں ہو گیا ~

اُمید تھی کسے کہ گزر جائیں گے یہ دن
دل پر دفورِ غم کا اثر دیکھتے ہوئے

سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء کی بات ہے کسی اخبار میں پنڈت وجے لکشمی کی تصویر شائع ہوئی اُس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

اِس خاتون نے قومی اور اصلاحی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔

بسمل سعیدی بہت دیر تک تو مبہوت ہو کر اس حسینہ کی تصویر کو دیکھتے رہے پھر ذہنی طور پر ذرا متوازن ہو کر انھوں نے بے اختیار یہ قطعہ موزوں کر دیا ~

فطرت یہ ہے ترا خیر سے قومی اصلاح
اسی تحریک کا اے کاش تجھے دھیان ہے
ورنہ تو مذہبی تبلیغ پر آجائے اگر
پھر تو شاید کوئی کافر ہی مسلمان نہ ہے

اُستاد ذوق دہلوی، بہادر شاہ ظفر کی ایک نئی غزل دیکھ رہے تھے۔ تقدیر اور تصویر جس کے قوافی اور ہمیشہ ردیف تھی۔ اصلاح کرتے ہوئے اپنی طرف سے بھی ذوق شعر کہہ کر غزل میں شامل کرتے جا رہے تھے۔ ایسا کرتے کرتے انھیں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے محمد حسین آزاد سے کہنے لگے کہ تم بھی اس زمین میں کچھ کہنے کی کوشش کرو۔ آزاد نے ابھی باقاعدگی سے اپنی شاعری کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے ایک مصرع کہا ع

سینے سے لگا سکتے تری تصویر ہمیشہ
ذوقؔ نے اُسی وقت بلا تامّل یوں شعر بنا دیا ؎
آ جائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اکبرؔ الٰہ آبادی، الٰہ آباد یونیورسٹی کے "فیلو" بھی تھے۔ ایک بار جب "ٹیکسٹ بک کمیٹی" کی ایک میٹنگ میں درسی کتابوں کا انتخاب کرنے کی غرض سے آپ کو دعوتِ شمولیت دی گئی تو آپ کسی وجہ سے خود شامل ہونے سے تو معذور رہے لیکن یہ شعر کہہ کر کمیٹی کے منتظموں کو بھیج دیا ؎

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مولانا شبلیؔ نعمانی کو اپنے لڑکپن میں ایک بار اوڑھنے کے لیے ایک چادر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُن کے والدِ محترم شہر کے مانے ہوئے رئیس تھے اِس لیے اُنھیں یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی کہ ایک رئیس زادہ ایک چادر کا ضرورت مند ہو! اپنے باپ سے زبانی فرمائش کرنے کی بجائے اُنھوں نے ایک شعر موزوں کیا اور کاغذ پر لکھ کر اپنے والد کی خدمت میں پیش کر دیا جسے پڑھ کر اُن کے والد بہت خوش ہوئے اور فوراً ایک چادر منگوا کر بیٹے کو بطورِ انعام دی۔ وہ شعر یہ تھا ؎

پدر جس کا یوں صاحبِ تاج ہو
پسر اُس کا چادر کو محتاج ہو

دُرگا پرشاد نادرؔ مرحوم جس زمانے میں "برہمن گزٹ" کے ایڈیٹر تھے اُنھوں نے ایک بار اپنے خط میں ہندو قوم کے حالِ زار کا رونا روتے ہوئے جوشؔ ملسیانی صاحب سے پرچے کی مستقل قلمی معاونت کی استدعا کرتے ہوئے تازہ نظم کا مطالبہ کیا۔ جواب میں جوشؔ صاحب نے یہ شعر موزوں کر کے اُنھیں بھیج دیے ؎

اے فداؔ! لکھا خطِ فرحت نما جو آپ نے
جی میں آتا ہے کہ اس خط پہ فدا ہو جائیے
اِک تہی دامن کو جانا آپ نے ابرِ کرم
اور یہ چاہا کہ ہم پر بھی کرم فرمائیے
قوم کے ماتم میں شاید آپ کی خواہش یہ ہے
اِک حبیبِ مدح گو سے مرثیہ لکھوائیے

قوم سمجھی تھی، نہ سمجھی ہے، نہ سمجھے گی کبھی!
کس طرح سمجھاؤں اُس کو، مجھے سمجھائیے
ایک تو خوابِ گراں اور اُس پہ یہ گوشِ گراں،
کون سی اُمّید پہ زنجیرِ در کھڑکائیے
بے نوا کا گھر دکھا کر دل لگی کی آپ نے
کہہ دیا مجھ سے کہ دامانِ ہوس پھیلائیے
آج تو اِک نظم لکھنے کے لیے تاکید ہے
کل کہیں گے آپ کچھ چندہ ہمیں دلوائیے
یاد آتا ہے کسی کا برمحل مصرعہ مجھے
"شعر اگر کہیے تو روٹی کس کے گھر سے کھائیے"

سراج الدین علی خاں آرزوؔ عموماً اپنے یہاں مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے۔ سوداؔ اُس زمانے میں نوجوان تھے۔ ایک دن آرزوؔ کے یہاں ایک مشاعرے میں سوداؔ نے اپنی ایک نئی غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکے ہیں فلک سے زمیں کو

جو درحقیقت فارسی کے ایک شاعر قدسیؔ کے اِس مطلع کا ترجمہ تھا ؎

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
اختر زفلک می نگرد روئے زمیں را

سوداؔ کا یہ مطلع سنتے ہی آرزوؔ نے فوراً یہ شعر موزوں کیا اور سرِ مشاعرہ پڑھ دیا ؎

شعرِ سوداؔ حدیثِ قدسی ہے
چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

سعادت یار خاں رنگینؔ دہلوی نے ایک بار مکّے کے سفر کا ارادہ کیا اور کلکتہ سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جہاز میں اُنھیں کھانے پینے کی بہت تکلیف ہوئی اور وہ خارش کے مرض میں بھی مبتلا ہو گئے۔ کلکتے سے مدراس تک پہنچتے پہنچتے ہی وہ زندگی سے اِس قدر بیزار ہو گئے کہ اپنے حسبِ حال یہ مطلع کہا ؎

دم آیا ناک میں اِس آہ اور زاری کے جینے سے
طبیبو! موت ہی بہتر ہے بیماری کے جینے سے

جب امیرؔ مینائی کا مجموعۂ کلام "صنم خانۂ عشق" شائع ہوا تو اُس کے متعلق

علامہ اقبال نے یہ شعر کہہ کر امیر کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے

عجب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال
میں بت پرست ہوں رکھ دی وہیں جبیں میں نے

ریاض خیرآبادی جن دنوں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اُن کے عقیدت مند کیننگ کالج کے کچھ طلبا نے اصرار کیا کہ آپ سینما دیکھنے چلیں۔ ریاض صاحب نے مجبوراً جانے کا وعدہ کرلیا۔ شام کو جب طلبا کی ایک کثیر تعداد اُن کی قیادت میں سینما گھر چلنے کے لئے آپہنچی تو ریاض اُس وقت بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ طلبا کو دیکھ کر مسکرائے اور اپنی سفید داڑھی کو اُنگلیوں میں پھنسا کر یہ شعر موزوں کر دیا ؎

اے تماشاگاہِ عالم ریشِ تو
تو کجا بہرِ سینما می روی

کسی نے باتوں باتوں میں جب انگریزی کا یہ مشہور مقولہ سُنا دیا ——
There are many a slip between the cup and the lip
تو جوشؔ ملیح آبادی چند لمحوں کے لئے اس کی معنویت کی گہرائی میں کھو گئے اور پھر اس معنویت میں اور نزاکت پیدا کرتے ہوئے یہ رُباعی موزوں کردی ؎

ہر خشتِ خرابات ہے اک مُہلہ باز
ہر گھونٹ میں غلطیدہ ہے اک قلزمِ راز
ما بینِ لب و جام ہی پہ بس موقوف
ما بینِ لب و گلو بھی ہے راہِ دراز

لکھنؤ میں جب ایک بار شفقؔ لکھنوی کے یہاں مشاعرہ ہوا تو وہاں خفیؔ لکھنوی کے برادرِ عزیز نے مرزا یاسؔ یگانہ چنگیزی کی ہجو اُن کی موجودگی میں پڑھ دی۔ اُس طویل ہجو کے تین ابتدائی شعر تھے ؎

بنامِ خداوندِ بالا و پست
کنم یاسؔ را نیست ہرجا کہ ہست
بقرآں کہ خواندیم لاتقنطو
تفو بر رُخِ یاسؔ اینک تفو
دلِ کافراں ہمچو دوزخ بود
ز دوزخ پئے یاسؔ مطبخ بود

اُس مشاعرے میں بیشتر مشاہیر شعرا اور اساتذۂ لکھنؤ بھی شامل تھے۔ یاسؔ نے بظاہر نہایت ٹھنڈے دل سے ہجو سنی اور بعض اشعار پر داد بھی دی اور مشاعرے کے بعد ہجو گو شاعر کا شکریہ بھی ادا کیا لیکن باطن حاسدوں کے اِس رویّے نے اُن کا دل کھٹا کر دیا اور اپنی باطنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہوئے اُنھوں نے بعد میں یہ شعر کہہ کر اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ؎

مزارِ یاسؔ پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دُعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

فراقؔ گورکھپوری کی نظر سے جب پہلی بار میکسم گورکی کا یہ جملہ گزرا ——
[illegible] Our earth [illegible] تو بے اختیار اُنھوں نے یہ شعر موزوں کر دیا ؎

تجھے دکھاتے اگر کوئی آنکھ والا ہو
زمیں بھی ایک چمکتا ستارہ ہے کہ نہیں

اُردو بازار دہلی میں کتب خانہ عزیزیہ اُردو شاعروں کا ہمیشہ سے ایک محبوب مرکز رہا ہے۔ تقسیمِ وطن سے پہلے تو یہاں کئی مشاہیر شعرا باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ آنے کو تو اب بھی آتے ہیں۔ لیکن پہلی سی بات نہیں رہی۔ ایک شام حسبِ معمول جب یہاں چند شاعر موجود تھے تو کتب خانہ کے مالک مولانا سمیع اللہ نے باتوں باتوں میں یہ انکشاف کیا کہ اس بازار کا نام اُردو بازار انھیں کا تجویز کیا ہوا ہے۔ ورنہ پہلے تو اسے مچھلی بازار کہا جاتا تھا۔ مولانا کی یہ بات سُن کر اور اُردو کی موجودہ کس مپرسی کے پیشِ نظر یہ رُباعی اپنے آپ مجھ سے موزوں ہوگئی ؎

گزرے ہوئے ایّام کا افسانہ ہے
صہبائے کہن سال کا میخانہ ہے
اُردو بازار مر چکا ہے لیکن
یاد اُس کی عزیزیہ کتب خانہ ہے

ہماؔ ہرنالوی کے ایک قریبی رشتہ دار کو موسیقی کے ایک ساز "دل ربا" بجانے میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ ایک دن اُنھوں نے ہماؔ صاحب کی موجودگی میں اپنے کمالِ فن کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا کہ ہماؔ صاحب نے جذبات کی شدت میں ڈوب کر اُسی وقت یہ قطعہ موزوں کر دیا ؎

تمہارے ساز کی آواز جب کانوں میں آتی ہے
رگِ جاں ساز ہی کا تار بن کر تھرتھراتی ہے

صدائے دل ربا سے دل کو تسکیں ہو تو کیونکر ہو
کہ ہر نغمے کو سُن کر دل ربا کی یاد آتی ہے

ادب دوستوں کی ایک خاص محفل میں جب کسی صاحب نے شمیم کرہانی کا یہ شعر سُنایا ــــ

یہ زندگی تو پہاڑوں کا سلسلہ ٹھہری
تمہیں ملے گا یہاں اپنا شیشہ گر تنہا

تو پریم شنکر فرحت نے بلا تامل کہا کہ کاش دوسرا مصرعہ بھی پہلے مصرعے کی طرح خوب صورت ہوتا اور دونوں مصرعے واضح طور پر مربوط ہوتے۔ یہ سُن کر اُسی شخص نے فرمائش کی آپ برابر کے دونوں مصرعے نکال کر دکھایئے۔ فرحت نے ذرا تامل کے بعد یہ شعر کہا ــــ

یہ زندگی تو پہاڑوں کا سلسلہ ٹھہری
نفس نفس ہے یہاں امتحانِ شیشہ گری

فرمائش کرنے والا معترض ہوا کہ لطف تو جب تھا کہ آپ اِسی قافیے اور ردیف میں شعر کہتے تھوڑی سی دیر کی فکر کے بعد فرحت صاحب نے یہ تقاضا بھی اِس طرح پورا کر دیا ــــ

یہ زندگی تو پہاڑوں کا سلسلہ ٹھہری
اور اس پہ جبر کہ طے ہو یہ رہ گزر تنہا

لیکن خود فرحت بھی اِس شعر سے کچھ زیادہ مطمئن نہ ہوئے۔ اس لئے چند لمحوں کے بعد انھوں نے شمیم صاحب کے شعر کے مصرعۂ اولیٰ کو مصرعۂ ثانی بناتے ہوئے یوں شعر کہا ــــ

یہاں صعوبتِ منزل کو رویئے کب تک
یہ زندگی تو پہاڑوں کا سلسلہ ٹھہری

جسے تقریباً سبھی اصحاب نے پسند کیا اور اُس پسندیدگی نے اُسی نشست میں فرحت صاحب سے یہ شعر بھی کہلوا دیا ــــ

یہ دیکھنا ہے کسے کون بھول سکتا ہے
چلو، یہ شرطِ محبت کا فیصلہ ٹھہری

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	〃	چار روپے
گدھے کی واپسی	〃	تین روپے
الٹا درخت	〃	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	〃	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
مسٹر ۵۸	〃	تین روپے پچاس پیسے
افراط	〃	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں پڑھے ہیں	〃	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	〃	پانچ روپے
بیاہ	〃	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	〃	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	〃	تین روپے
خاک پروانہ	〃	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	〃	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	〃	ایک روپیہ [illegible] پیسے
سیدہ کی بیٹی	راشد الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	〃	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	〃	دو روپیہ پچاس پیسے
سوناگاچھی	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	〃	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود [illegible]	چار روپے پچیس پیسے

کتاب	مصنف	قیمت
شکست ظلمت	محمود جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	〃	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	〃	ایک روپیہ پچیس پیسے
خوابگاہیں	〃	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	〃	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	〃	تین روپے
اکبری دروازہ	〃	چار روپے
دوشیزۂ روم	〃	تین روپے
دیوانہ	〃	تین روپے
دو دیوانے	〃	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	〃	تین روپے
گناہ	رت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	〃	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	〃	تین روپے پچانوے پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
خباثت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	〃	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	〃	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	〃	پانچ روپے
ریحانہ	〃	سات روپے

کتاب	مصنف	قیمت
وعدہ	ہیمناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
سنی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملسیانی	چھ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یادو	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیوناتھ تسکین	چار روپے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
آواز تو پہچانو	〃	تین روپے
پرانوں کا سفر	〃	چار روپے پچاس پیسے
انتظار کے قیدی	〃	دو روپے
کل کی باتیں	〃	پانچ روپے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ حسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آبشار سپید کہے نا	ست پرکاش سنگر	دو روپے
ابراہیم لنکن	چندر موہن لامبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

افسانہ

پھول کی دُھول

ایم۔ ایف۔ پرویز۔ ایم۔ اے

آفس آف دی ڈپٹی ڈائرکٹر اکاؤنٹس اینڈ ٹریژریز

کالج بلڈنگ۔ پونہ ۴ (مہاراشٹر)

محبی و مکرمی خوشتر صاحب! خلوصِ فراواں

افسانہ "کتنے طوفان" کی اشاعت کی اطلاع مل گئی۔ آج ایک افسانہ "پھول کی دُھول" ارسال کر رہا ہوں ۔۔۔ کچھ دن پہلے ایک خاتون نے ٹیلی فون پر "راستے اور غبار" کی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مُبارکباد دی اور آئندہ لکھنے کی تلقین بھی کی۔ نام پوچھنے پر کہا کہ میں اُردو کی طالبہ اور "بیسویں صدی" کی ایک پرستار ہوں۔ اُسی رو دادِ رات میں یہ کہانی مکمل کی ہے۔ اس میں میں نے MONOLOGUE کی جگہ زیادہ تر DIALOGUE کی ایک قدیم ٹیکنک کا استعمال کیا ہے۔ جس سے کردار اپنے ماضی کو بالکل حال میں محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ کیفیت تو یوں بھی ہم سب پر کبھی نہ کبھی گزرتی ہی ہے کہ جب ہم بالکل تنہا ہوتے ہیں تو خود بخود اپنے آپ سے ریا سے اپنے آپ دل ہی دل میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ کہانی دلچسپ تو ہے مگر اب اس کے متعلق یہاں کچھ لکھنے کی بجائے یہ کام قارئین ہی پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اسے سمجھیں اور اس کی خوبیوں اور خامیوں سے مجھے مطلع کریں۔ اُمید ہے آپ اس تکنیک کی جدت کو پسند فرمائیں گے۔ اگر کہانی پسند آئے تو براہِ کرم اسے بیسویں صدی کے سالنامہ میں جگہ دیں ممنون ہوں گا ۔۔۔ اُمید ہے اب آپ بالکل صحت مند ہوں گے۔ پتہ نہیں آپ کو کس قدر محنت کرنی ہوتی ہے تب جا کر اتنے خوبصورت پرچے ہمیں ملتے ہیں۔

نیازمند: ۔۔۔ ایم۔ ایف۔ پرویز

دفتر کی خشک فائلوں سے اُکتا کر جب میں نے سر اُٹھایا اور گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے پانچ بج چلے تھے۔ بس ساری تھکاوٹ دُور ہو گئی اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ کانوں میں ابھی ٹیلیفون پر سُنی ہوئی ایک میٹھی آواز گونج رہی تھی اور میں ایک سُہانے تصور میں کھویا کھویا اپنے کمرے سے باہر نکل کر پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

پورچ میں خلافِ معمول ایک خوبصورت سی نیلی ایمبیسڈر کار دیکھ کر میں کچھ ٹھٹک گیا ۔۔۔ اور جب کار کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی ایک ریشمی بالوں والی خوبصورت دوشیزہ پر نظر پڑی تو جی چاہا کہ میں رک جاؤں اور اُسے دیکھتا رہوں۔ جیسے بچے دکانوں میں سجے ہوئے خوبصورت کھلونوں کو دیکھتے ہیں۔ لیکن میں تو بچہ نہیں ہوں کہ جو جی چاہے وہی کر سکوں۔ میں تو دفتر کا افسر ہوں اور مجھے جلد سے جلد بس اسٹاپ پہنچنا ہے تاکہ بس کی قطار میں ۔۔۔

لیکن ۔۔۔

"ایکسکیوزمی ۔۔۔!" کہہ کر کسی نے مجھے روک دیا۔ میں رک گیا۔

"آپ ہی مسٹر ظفر ہیں؟" کسی نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ۔۔۔ ہاں!"

"اوہ ۔۔۔ تھینک گاڈ ۔۔۔ میرا نام ثریا ہے!"

"ثریا ۔۔۔؟ تو کیا ابھی ابھی آپ ہی نے فون کیا تھا؟"

"جی ہاں ۔۔۔!"

"گلیڈ ٹو سی یو ۔۔۔!" میں نے خوش ہو کر کہا اور اس کی خوبصورت گلابی ساڑی کے رنگوں سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی سے آنکھوں میں پیدا ہونے والے تصورات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

"آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں ـــــ" اُس نے کہا۔

"کیسی باتیں؟"

"ایک اہم بزنس ڈیل کے متعلق" اُس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں غیر ارادی طور پر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اور کار چل پڑی۔

کالج سے دائیں طرف ایک خوبصورت سی سڑک فلم انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا تک جاتی ہے جہاں کسی وقت پر بھات اسٹوڈیو تھا اور یہیں کہیں وہ دوسرے اسٹوڈیوز بھی تھے جن میں کبھی جوش، منٹو اور کرشن چندر اور نہ جانے کتنے بڑے بڑے ادیب اور شاعر آکر چلے گئے تھے۔ فلم انسٹی ٹیوٹ کے قریب ہی کار رستہ کاٹ کر وہ ایک بنگلے میں چلی گئی اور مجھے تھوڑی دیر انتظار کرنے کو کہہ گئی۔

شام سونی تھی اور انسٹی ٹیوٹ کے ایک گوشے میں دو خوبصورت لڑکیاں ایک نوجوان لڑکے سے باتیں کر رہی تھیں۔ بہت گہری سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

شام دھندلائی ہوئی تھی۔ ہر طرف کہرا اور دھند کا چھایا تھا۔ اونچے اونچے پیڑوں سے سفید سفید سی ڈنٹھلوں والے پھول بکھر بکھر کر کار کے آس پاس پھیل گئے تھے۔ اک گہری خاموشی ہر طرف چھائی تھی۔ نہ جانے بڑے بڑے بنگلوں کے آس پاس ایسی خاموشی کیوں چھائی رہتی ہے، جیسے ان میں کوئی متنفس نہ بستا ہو۔ جیسے ان میں رہنے والے زندگی سے کوسوں دور ہوں۔

کار کی پچھلی سیٹ پر ثریا کی کچھ ساڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ جن میں اُس کے جسم اور میک اپ کی خوشبو ابتک مہک رہی تھی۔

بہت دیر تک وہ نہ آئی تو میں پریشان ہو گیا۔ چھ بج رہے تھے اور گھر جاکر پنساری کی دکان سے راشن لانا تھا۔ پھر امی کو دواخانے لے جانا تھا اور انیس کو میڈیکل کالج میں ایڈمیشن دلانے کے لئے ایک منسٹر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سیٹھ نتھو والا سے ملنا تھا۔ اس کے بعد دفتر کے باس کی لڑکی کے لئے پروفیسر کرامت علی شاہ سے مل کر چند مارکس بڑھا دینے کی درخواست کرنی تھی تاکہ اُسے امتحان میں سیکنڈ کلاس مل جائے ... اور اتنے سارے کاموں کے باوجود میں ثریا کے ساتھ چل پڑا تھا اور ثریا ابتک اُسی بنگلے میں تھی اور ایک پُراسرار خاموشی نے کار کو گھیر رکھا تھا۔

یکایک فیول میٹر کے نیچے خالی سی دراز پر نظر پڑی تو ایک چھوٹی سی فائل دکھائی دی۔ اس میں کچھ خطوط تھے ـــــ ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر فائل میں نے پھر دراز میں رکھ دی۔

اب شام اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ ایک سناٹا سا محسوس ہو رہا تھا ـــــ۔ کافی انتظار کے بعد بھی وہ نہ آئی تو اُکتا کر میں نے فائل نکالی اور اُلٹنے پلٹنے لگا۔ اُن میں کئی خطوط پڑے تھے۔ ایک خط پر میری نظر پڑی اور میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ یہ میرے ہی نام لکھا ہوا تھا۔

ڈیئر ظفر ـــــ!

بچپن سے ابتک تمہیں میں نے یاد رکھا ہے اور تم ـــــ مجھے بھول گئے ہو ـــــ شاید بھول جانا تمہاری عادت ہے ـــــ نہ جانے تم اتنے بھولے کیوں ہو، وہ سہانے دن بھی تمہیں یاد نہ رہے، جب ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ اسکول سے ایک ساتھ گھر آتے تھے۔ چاندنی رات میں جب آسمان پر اکیلا چاند تیزی سے دوڑتے ہوئے بادلوں کے پیچھے اُبھرتا چھپتا رہتا تھا۔ تب تم تنہا اور اُداس اپنی گیلری میں کھڑے گھنٹوں تکتے رہتے تھے۔ پھر شاید تمہاری آنکھیں نم ہو جاتی تھیں ـــــ میں پڑوس میں اپنی کھڑکی کے پردے سے تمہیں دیکھتی رہتی تھی۔ گھپ اندھیری برسات کی راتوں میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگ جب اپنے لحافوں میں دبکے کمروں میں بند محوِ خواب ہوتے، تب تم اکیلے گیلری کے اک ستون سے سر ٹکائے کچھ سوچتے رہتے تھے۔ ظفر ـــــ مجھے تمہاری سبھی باتیں یاد ہیں۔ لیکن تم مجھ سے دور ہو گئے ـــــ یا میں تم سے دور ہو گئی؟ ـــــ یاد ہے ایک دن تم نے اپنے ہاتھوں سے میرے باغ میں گلاب کے پودے لگائے تھے۔ اُن میں پانی دیا تھا اور جب اُن میں پہلی پہلی کلیاں کھلی تھیں تو چپکے سے توڑ کر تم نے میرے بالوں میں ٹانک دی تھیں۔ ہاں ظفر ـــــ تمہیں نے ایک شام، جب شفق بھی ڈوب چلی تھی، تمہیں نے وہ پھول ٹانکے تھے اور پھر اپنی انگلیاں میرے ہونٹوں کی طرف بڑھا کر تم نے اُنہیں ہٹا لیا تھا۔

میں اس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ ایک عجیب سی گھبراہٹ اور کپکپی سی پیدا ہو گئی تھی اور دل جیسے یکایک ڈوب گیا تھا۔

میں نے اسٹیئرنگ وہیل پہ سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ بہت کوششوں سے بھلایا ہوا درد پھر جاگ اٹھا تھا۔

یہ خط تسنیم نے لکھے تھے میرے نام۔ بالکل اُسی کی تحریر تھی میں پہچان سکتا ہوں۔ لیکن اُس نے یہ خط کیوں لکھ رکھے ہیں یا انہیں پوسٹ کیوں نہ کیا؟

تسنیم میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ ڈاکٹر شجاعت کی لڑکی۔ اکتوبر کی سردیوں میں ڈاکٹر شجاعت حیدرآباد سے پونہ چلے آئے تھے۔ آرمی میڈیکل کور میں پڑھاتے تھے۔ کیمپ میں بہت خوبصورت بنگلہ بھی مل گیا تھا انہیں ـــــ لیکن اُن کی بیگم کا ان ویرانوں سے جی گھبراتا تھا، وہ ہمیشہ بھیڑ بھاڑ، ہجوم اور محلے کے شور و غوغا میں رہنا پسند کرتی تھیں۔ ملٹری کی اُداس چھاؤنیوں سے اُنہیں وحشت ہوتی۔ اس لئے اُنہوں نے میرے پڑوس میں خالی فلیٹ لے لیا تھا اور کئی دنوں بعد ہمارے سونے آنگن میں بچوں کی چیخ پکار سنی گئی تھی۔ ... سب سے پہلے تسنیم پر میری نظر پڑی اور مجھے

اُس وقت محسوس ہوا تھا جیسے دبے قدموں بہار آگئی ہو۔ صحرا میں پہلا پہلا پھول کھلا ہو اور تپتے ہوئے کھنڈروں سے کہیں شیتل جل دھارا بہہ نکلی ہو اور جیسے صبح کی سنہری دھوپ ہر سمت شبنم بن کر پھیل گئی ہو۔

دوسرے ہی لمحے شجاعت صاحب کی کڑکتی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔

مختصر سے تعارف کے بعد اُن سے میں بہت جلد ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔

اب تسنیم میں، شجاعت صاحب اور اُن کی مسز اکثر ساتھ ہی جاتے بیٹھتے۔ سنڈے کو ایک ساتھ تفریح کے لئے جاتے اور ایک ساتھ کھاتے پیتے۔

تسنیم مجھ سے بہت اچھی اچھی باتیں کرتی تھی۔ کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتی۔ ہم ساتھ ہی اسکول جاتے۔ ساتھ لوٹتے۔ گھنٹوں کیاریوں میں سر جھکائے نئے نئے پودے لگانے کی فکر میں لگے رہتے۔

تسنیم بہت تیزی سے جوان ہو رہی تھی اور ایسی ہی تیزی سے تبدیل بھی ہو رہی تھی۔ مجھے اُس کا ہر انداز پسند تھا۔ ہر ادا پیاری تھی جو دل کو چپکے سے لبھا لیتی تھی۔

ایک دن تسنیم کی امی بمبئی چلی گئیں اور کچھ دنوں کے بعد اُنہوں نے لکھا، وہ بہت بیمار ہیں۔ تسنیم کو فوراً بھیج دو۔

شجاعت صاحب نے یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی اور کچھ پس و پیش کے بعد میں تیار ہو گیا۔

اُس وقت کالج کا پہلا سال ختم ہو چکا تھا۔ چھٹیاں بھی مل گئی تھیں۔ میں بھی کچھ دنوں کے لئے باہر جانے کی فکر میں تھا اور تسنیم کے ساتھ بمبئی تک جانے کے خیال ہی سے میں خوش ہو گیا تھا۔

میں نے اسٹیرنگ وھیل پر سے سر اُٹھایا۔ باہر اب بھی تاریکی تھی ——— اور تاریکی میں تسنیم کا چہرہ جھلملا رہا تھا ——— ہاں ——— یہ تم ہی تو ہو تسنیم ——— بالکل وہی ——— ویسی ہی معلوم ہو رہی ہو جب اکیلی تم میرے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ ڈکن کوئن کے فرسٹ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں گدّے پر نیم دراز تم نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں ——— تمہارے ہاتھوں میں کرشن چندر کی کتاب تھی ——— "آسمان روشن ہے ———" اور میں دیکھ رہا تھا کھنڈالا کے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہت اُوپر جھکے ہوئے دیودار اور ببول کے پیڑوں سے پرے آسمان روشن تھا، تمہاری نیلی آنکھوں کی طرح ——— تمہارے دل کی طرح ——— تمہارے ضمیر کی طرح ——— اور کہیں گھٹائیں نہ تھیں اور ٹرین بہت تیزی سے اُڑ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کلیان آ گیا۔ پھر تھانہ ——— پھر بدبودار کھاڑیاں۔ نمک کے ڈھیر ——— اور کولی اور ماہی گیر عورتیں ——— لنگوٹ باندھے ہوئے مچھیرے ملوں کی چمنیاں، دھواں، گیس، کارخانے ——— لوگوں کا جمِ غفیر ——— اور پھر وی۔ٹی اور شور و غل، بے پناہ ہنگامہ، چیختی دھاڑتی ٹیکسیوں کی قطاریں، انسانوں کی ریل پیل، مزدوروں اور کلرکوں کا نہ ختم ہونے والا تانتا، اور اُن سب میں تمہاری پیاری پیاری آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی محبت کی شبنم!!

اُس دن تمہیں اپنی امی کے پاس چھوڑ کر میں چلا آیا تھا ——— اکیلا اور تنہا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اُداس اور بے رحم جنگلوں میں کھو گیا تھا۔ سارا دن نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ نہ گھر لوٹنے کو جی چاہتا تھا۔ نہ تمہارے ساتھ ٹھہر سکتا تھا۔ یوں بھٹکا بھٹکا پھر رہا تھا جیسے موت کی وادی سے آتے ہوئے فرشتے قبرستان کی راہ بھول کر کہیں خلاؤں میں بھٹک گئے ہوں۔ اور قبروں میں پڑے ہوئے مُردے اُن کے منتظر ہوں، لیکن وہ راہ ہی میں مسحور کر لئے گئے ہوں، اور پھر اُنھیں ایک گہرے کنوئیں میں لٹکا دیا گیا ہو۔ نہ جانے میں کیا کیا محسوس کرتا رہا۔ اُف کس قدر تنہائی تھی۔ جیسے سُولی پر لٹکا ہوا مسیح اکیلا ہو! بس یوں ہی تنہائی کے بھنور نے مجھے لپیٹ لیا تھا۔

اور اُن تنہائیوں میں مجھے ایک دن رفعت ملی۔ اور رفعت کی دوستی میں میں سب کچھ بھول گیا۔

کیونکہ رفعت بہت دولتمند تھی۔ وہ ہر ہفتے مجھے ایر کنڈیشنڈ ہوٹلوں میں لے جاتی۔ نفیس کھانے کھلاتی، پکچر دکھاتی میرے لئے سوٹ کے عمدہ پیس لے آتی۔ مجھے ماڈرن اور اپ ٹو ڈیٹ رہنا اُس نے سکھایا۔ رئیسوں کے سارے طور طریقے جُوا ریس، شراب، رقص، کلب، اور نہ جانے کن کن چیزوں سے روشناس کرایا۔

لیکن ایک دن وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور اس نے ایک مشہور فلمی اداکار سے شادی کر لی۔

میں تمہیں یاد کرتا رہا۔ لیکن تم جا کے پھر نہ آئیں۔ تم کہاں گم ہو گئی تھیں؟ میں تمہیں بھولا تو نہ تھا۔ تمہاری پیاری مُسکان تو اب بھی میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی۔ وہ تمہارا میٹھا میٹھا سا شیریں لہجہ ——— رس گھولتی ہوئی باتیں ——— لیکن تسنیم خیالوں کی یہ گلیاں اب اُداس ہو گئی ہیں اور اُداس گلیاں اندھیروں میں ڈوب گئی ہیں، جیسے اندھیروں میں گناہ ڈوب جاتے ہیں، اور ٹمٹماتی ہوئی یادوں کی روشنیوں سے جھانکتی ہوئی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں ——— محبت کی معصوم اور کنواری کلیاں مُرجھا گئی ہیں ——— تمہاری محبت اور چاہت کے پھول پر دھول جم گئی ہے ——— گہری دھول ——— بس محبت کے وہ چند پاکیزہ لمحے اب بھی باقی ہیں ——— جب خواب جاگتے ہیں اور نیندیں سوتی ہیں۔ سحر اُونگھتی ہے۔ اور شام انگڑائیاں لیتی ہیں اور دل کے کسی گوشے سے اِک ہوک اُٹھتی ہے۔ اِک صدا آتی ہے، اِک درد کروٹ

فریب

یہ وعدہ، یہ تسکیں، یہ نیچی نگاہیں
فریبوں میں آنے کو جی چاہتا ہے ——— عرشی بھوپالی

چھلک رہے ہیں جو آنسو حسین آنکھوں میں
فریب عکس ہے یہ اُن کا اعتبار نہ کر ——— واصل مشہدی

مجھے فریب محبت میں مبتلا کر کے
رہین نالہ وفا برباد کر دیا تو نے ——— خمار دہلوی

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا ——— جوش

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے ——— غالب

مرسلہ: اعجاز فاروقی، بی۔ اے۔، گنگا گڑھ شریف

لیتا ہے اور حسینوں کے رنگ اور سندر آن کی آن میں تعمیر ہو جاتے ہیں ——— اور مندروں کے آس پاس بچپن اور لڑکپن کے سہانے دن، سہانی گلیوں میں کھوئے کھوئے وہ دن پھر یاد آ جاتے ہیں ——— پھول پر چھائی ہوئی دھول چھٹ جاتی ہے!

سوچتے سوچتے اور تصور ہی میں تسنیم کو قریب پاکر اُس سے باتیں کرتے کرتے میں نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔

جب میں ماضی کے ان دلفریب باغوں سے نکل آیا جہاں یادیں پرانی ٹہنیوں کی طرح کبھی کبھی لہلہاتی تھیں تو میں نے دیکھا ——— ثریا کار سے باہر کھڑی شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

"کیا نیند آ رہی ہے؟ ———" اُس نے پوچھا۔

"ارے نہیں تو ———" میں نے ہڑبڑا کر خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "بہت انتظار کرایا آپ نے"

"معاف کرنا ایک سہیلی کے گھر دیر ہو گئی۔ میں شاید اب رات بھر بھی یہیں ٹھہروں۔ چلئے پہلے آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔ باقی باتیں کل ہوں گی ———" اُس نے کہا۔

"لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"کل معلوم ہو جائے گا ——— !"

اتوار کے دن وہ پھر کار لے کر آ گئی۔ اُس نے ادھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔ لیکن وہ بات ابتک نہ بتائی جس کے لئے وہ میرے پاس آئی تھی۔ مجھے اُس کا قرب بہت حسین معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کی وہ دلفریب ہنسی جو چشموں کے پانیوں میں سُنی جا سکتی ہے۔ وہ شیریں لب و لہجہ جو کوئلوں کی کوک میں پنہاں ہوتا ہے اور وہ حسین ساتھ جو بہت مشکل سے کسی کو نصیب ہوتا ہے ——— مجھے اچھا معلوم ہو رہا تھا۔

سارا دن ہم نہ جانے کہاں کہاں بھٹکے، پونہ سے نکلے تو ستارہ سانگلی اور کولہاپور ہوتے ہوئے بیلگام پہنچ گئے ——— یہ چھوٹا سا خوبصورت سا شہر نہ جانے کیوں مجھے بہت پسند تھا۔ یہاں کے بھولے بھالے لوگ، اور اُن کا کنڑی لب و لہجہ!

جب ہم بیلگام پہنچے تو یہ بحث زوروں پر تھی کہ اسے میسور میں رکھا جائے گا یا مہاراشٹر میں شامل کیا جائے گا ——— ؟

اور ثریا نے ایک تلخ لہجے میں جواب دیا تھا۔

ظفر ——— شہر چاہے میسور کا ہو یا مہاراشٹر کا، ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ساری ریاستیں، اور یہاں کے سارے شہر ایک ہی ہندوستان کا حصہ ہیں؟ اور جب پورا ہندوستان ایک ہے تو پھر یہ غیر ضروری جھگڑے فسادات کیوں؟ شہر بانٹے یا کاٹے جا سکتے ہیں، مُلک الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان اور اُس کے مسائل تو نہیں حل ہو جاتے۔ ہم انسان کے مسئلے کیوں نہیں حل کرتے؟

اور سامنے ایک خوبصورت ہوٹل تھا۔

"گاڑی روک دیجئے۔ بھوک لگی ہے یہیں کھانا کھائیں گے" میں نے کہا اور ہم کار سے نکل کر ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ لیکن اُس کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور وہ کچھ جا رہی تھی۔

"میرا بس چلے تو دنیا سے ساری حد بندیاں ختم کر دوں۔ تمام سرحدیں مٹا دوں اور مشرق سے مغرب تک ساری دنیا کو ایک نام دیدوں ——— بس ایک ہی دنیا ——— ایک ہی نام۔ اور ساری دنیا کو حسین بنا دوں ——— اور میں نے جلدی سے کہا

"کیا اپنی حسین آنکھوں کی طرح؟"

وہ سہانی رات ہم نے بیلگام میں گذاری۔ ثریا میرے لئے ابتک اجنبی تھی۔ لیکن اُس کا یہ حسین ساتھ بہت پیارا تھا۔

دوسری صبح بے حد سہانی تھی۔ سُنہری اور چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ سلانے کے پھول سُنہری کرنوں میں مشعلے کی طرح چمک رہے تھے۔ کار کے شیشوں سے ٹکراتی ہوئی روشنی اُس کے رخساروں کو آنچ دے رہی تھی۔

سیاہ عینک سے اُس نے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں اور میری طرف دیکھ کر

دلفریب انداز میں مُسکرانے لگی۔

بالکل اُسی انداز میں ـــــ جس انداز میں کُبری مجھے دیکھ کر مُسکرایا کرتی تھی۔ کبری ایک غریب ماسٹر کی لڑکی تھی اور جب ماسٹر جی کو معلوم ہوا کہ وہ چوری چھپے مجھے چھانے لگی ہے تو ماسٹر جی نے جلدی سے اُس کا بیاہ رچا دیا۔ ایک ٹرک ڈرائیور سے۔ پھر نیمے کلثوم بی۔ پھر ممتاز ـــــ اور شبنم ـــــ اور یہ سب لڑکیاں پہلی برسات کی طرح تیزی سے آئیں اور ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ میری زندگی سے نکل گئیں ـــــ میری زندگی یوں ہی گذر گئی۔ جو ساتھی بنا پل بھر کا ساتھ پل بھر کی رفاقت دے کر چلا گیا اپنی اپنی منزل کی طرف ـــــ میں اکیلا اب بھی اُس رہبر کی تلاش میں سرگرداں ہوں جو میری زندگی کے منتشر کاروان کو یکجا کر سکے۔ مجھے ازلی پیار دے سکے۔

"اب کہاں چلیں گے؟" اُس نے یکایک سوال کیا۔

"واپس۔"

"اتنی جلدی؟"

"ارے مجھے دفتر نہیں جانا ہے کیا؟"

وہ یکایک کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ پہلی بار اتنی سنجیدہ نظر آ رہی تھی وہ۔

"ظفر صاحب ـــــ" وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ "کیا آپ تسنیم سے محبت کرتے تھے؟"

"تسنیم ـــــ؟ میں ـــــ؟"

میں چونک پڑا۔

"نہیں ـــــ شاید میں اُسے نام ہی سے جانتا ہوں ـــــ" میں نے ٹالنا چاہا۔

"آؤ کوئی اور بات کریں۔"

لیکن وہ چُپ ہو گئی۔ ہم نے سات آٹھ گھنٹوں کا سفر چُپ چاپ ہی طے کیا۔ پُونہ لوٹ کر وہ اپنے گھر چلی گئی اور کہا۔ "ارے وہ بات تو رہ ہی گئی جو میں آپ سے کہنا چاہتی تھی ـــــ"

"کوئی بات نہیں۔ کل کہدینا ـــــ" میں نے کہا۔ اور لوٹ آیا۔

دوسرے دن وہ پھر کار لے آئی۔ جُوہی اور موتیے کی کلیاں اُس کی سُنہری لٹوں میں مچل رہی تھیں ایک خوبصورت سا بڑے بڑے موتیوں والا ہار اُس کی خوبصورت گردن میں لٹک رہا تھا اور ہار کا تعویذ اُس کے سینے کی گہری وادیوں میں پڑا ہوا چمک رہا تھا۔

بمبئی پونہ روڈ پہ پینی سیلن کے کارخانے کے سامنے اُس نے کار روک دی۔ اُس کی آنکھوں میں آج بہت چمک تھی اور وہ مُسکرا رہی تھی۔

آنکھیں

آنکھوں میں نمی سی ہے چُپ چُپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے ـــــ جگر مرادآبادی

اے خدا میری شرر انگیز آہیں کیا ہوئیں
کیوں وہ پہلی سی مری آنکھوں کی برساتیں نہیں ـــــ جلیل

جن کی شورش کے لئے آغوشِ دنیا تنگ تھا
اشک کے قطرے وہ اِن آنکھوں میں پنہاں ہو گئے ـــــ چکبست

یہ نرگس اُن آنکھوں سے ملتی تو ہے
مگر اِس میں شرم و حیا وہ نہیں ـــــ عاشق

دیکھا مجھے قریب تو اُس مستِ ناز نے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے غافل بنا دیا ـــــ نامعلوم

مُرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہنکاری، ایم اے، آگرہ

ثُریا، تم نے اپنے مُتعلق کچھ بتایا اور نہ وہ بات کہی جس کے لئے تم نے فون کیا تھا ـــ؟"

وہ مُسکرا دی۔

"کیا کرو گے جان کر۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ میں تمھارے ساتھ ہوں ـــ تمھارے شہر میں رہتی ہوں، اور تمھارے اتنے قریب ہوں ـــ؟" اُس نے عجیب شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں تم میرے قریب ہو۔ بہت ہی۔ میں چاہوں تو تمہیں چھُو سکتا ہوں۔ تمہاری نازک کلائی کو تھام کر دیر تک اِس کے لمس سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ چاہوں تو تمہارے رخساروں کو چھُو سکتا ہوں ـــــ تم میرے بہت قریب ہو ـــــ بہت ہی۔ لیکن یہ سب ایک لمحے کے لئے ہے۔ لمحہ بیت جائے گا۔ تم چلی جاؤ گی۔ یہ حسین ساتھ ختم ہو جائے گا۔ اِس کے بعد وہی کربناک جُدائی اور تنہائی کے ویرانے میرے ساتھ ہوں گے۔" میں جنون کی سی کیفیت میں سوچ رہا تھا، اور کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ بہت دیر تک خاموش رہی۔ پھر ذہن کے دریچوں سے وہ شام لوٹ آئی۔ جب میں کالج میں تھا۔ تسنیم بھی کالج میں تھی۔

اشرف اور اُس کے ساتھی قہقہے لگا رہے تھے۔ میرے ساتھ تسنیم لان میں ٹہل رہی تھی اور وہ زیرِ لب میرا مضحکہ اُڑا رہے تھے ـــــ تسنیم کیا تمھیں بھی وہ شا

یاد ہے؟ جو میرے سینے میں اب تک خلش بن کے کھٹکتی ہے۔ اسپورٹس کلب کی پارٹی تھی۔ اشرف تمہیں دعوت دینے آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی شرارت ناچ رہی تھی۔ جسے تم نے شاید محسوس نہ کیا ہو۔

"آپ کا گیم بہت شاندار رہا" اُس نے تم سے کہا تھا۔ "اگر اعتراض نہ ہو تو کل میرے گھر تشریف لے آئیے۔ امی تمہیں اِس کامیابی پر مبارکباد دینا چاہتی ہیں۔"

"شاید میں نہ آسکوں" تم نے معذرت پیش کی تھی۔

"شاید ظفر کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام ہوگا؟ حیرت ہے آپ کالج کے کسی لڑکے سے بات نہیں کرتیں اور صرف ظفر کے ساتھ گھومتی رہتی ہیں۔ ——— !"

اور نہ جانے وہ کیا کیا کہہ رہا تھا۔

میں وہاں سے چلا آیا۔ نہ جانے مجھے سب کچھ کیوں بے معنی معلوم ہوا۔ اِس دِن کے بعد میں کبھی تمہارے ساتھ نہ دیکھا گیا۔ میں نے تمہارے ساتھ آنا جانا چھوڑ دیا اور کئی دِن تمھیں نظر بھی نہ آیا۔

کچھ دِنوں بعد میرے والد ریٹائر ہو گئے۔ بڑے بھائی کی شادی ہو گئی اور وہ الگ رہنے لگے۔ ہماری مالی حالت گر گئی ——— میں نے وہ سب دن بھلا دئے جن میں ہمارے دوستی کی بہاروں کے پھول کھلے تھے اور اب اُن پھولوں پر دھول جمنے لگی تھی۔ وہ سب سہانی شامیں اب مایوسی کے اندھیروں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ سب ملاقاتیں، وہ سب لمحے، وہ سب گھڑیاں جن میں تم اور میں کبھی ایک دوسرے کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ میں نے بھلا دئے ——— !

اور کیا تم وہ شام بھول سکتی ہو جب میں کالج ہی میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ جھرنے کے قریب، جو کالج کے پیچھے بہتا تھا اور جہاں گھنی جھاڑیاں تھیں۔ میں وہاں بیٹھا رہا اور میں نے دیکھا تھا کہ اُنھیں جھاڑیوں کی ٹھنڈی اور پرسکون چھاؤں میں اشرف تمھارے قریب کھڑا ہے اور اُس نے تمھاری زلفوں کو چھو لیا ہے

تم نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی ——— اُس نے آہستہ سے تمھارے کندھوں پہ ہاتھ رکھ دیا ——— اور پھر میں لوٹ آیا۔ ہمیشہ کے لئے تم سے دور اور محبت کے کھلے ہوئے پھولوں پر دھول ڈال دی۔ جن کی مہک نے مجھے ایک عجیب سے نشے میں متوالا کر دیا تھا۔

——— کہو تسنیم کیا اِس کے بعد بھی تم یہ سمجھتی ہو میں بے وفا ہوں میں نے تمھیں بھلا دیا۔ بچپن کی دوستی کو فراموش کر دیا؟ بتاؤ کیا محبت اِسی کو کہتے ہیں؟

پھر تم نے یہ خطوط کیوں لکھ رکھے ہیں؟

میں نہ جانے کب تک تسنیم سے باتیں کرتا رہا دِل ہی دِل میں ——— جب تھک گیا تو دیکھا میری آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں۔ تسنیم نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ سامنے بیٹھی ثریا جب چاپ اُفق پر نظریں جمائے جو سوچ رہی ہے۔

"اوہ معاف کرنا ثریا ——— میں نہ جانے کن خیالوں میں کھو گیا تھا"

"اچھا بتایئے کیا سوچ رہے تھے؟"

"میں؟ ——— ثریا میں سوچ رہا تھا آج ہی تمہیں اپنے گھر لے چلوں گا اپنی امی سے ملاؤں گا۔ اُن سے کہوں گا آج گھر پر شام کا کھانا ثریا اپنے ہاتھ سے پکائے گی ہونے سوندھے آلو، بھونی ہوئی مچھلیاں، ساگ کی خوشبو دار بھاجی ——— ٹماٹر اور آلو کی چٹنی، کبھی اور قیمے کے پراٹھے، اور ہم سب مل کر اپنے دوستوں کو دعوت دیں گے اور چاندنی رات میں کرسیاں ڈالے آنگن میں بیٹھ کر شب بھر گپ بازی کریں گے پھر جب تھک جائیں گے تو چپ چاپ اپنے اپنے بستروں پہ جاکر لحافوں میں دبکے مستقبل کے سپنے سجائیں گے ——— !

وہ ہنس پڑی۔

چاند بوڑھے چہرے کی طرح تھکا تھکا اُفق سے اُبھر رہا تھا۔

"ظفر ———!"

"ہوں؟"

"رات بہت اُداس معلوم ہو رہی ہے۔" اُس نے کہا۔

"کیا میرے ہوتے ہوئے بھی تم اُداس ہو؟"

"واقعی یہ رات بہت اُداس ہے" اُس نے کہا۔ اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ رات کا دامن اُداس ہے تو کیا ہوا۔ میری طرف دیکھو۔ میرے دل میں سلگتا ہوا شدید پیار محسوس کرلو ——— میں تنہا ہوں۔ میرے درد کی وحشت کو کم کر سکتی ہو تو کم کر دو۔ دیکھو دل کی گلیاں سنسان ہیں۔ ستاروں کی چادر بے نور ہے۔ تمناؤں کی وادیوں میں سوکھے مسلے پھول بکھرے پڑے ہیں اور وہ گرد آلود ہیں۔ میرے ہونٹ خشک ہیں۔ آنکھیں ویران غار کی طرح بے نور ہیں اور تم کہیں دُور کھوئی ہوئی میرے قریب ہو کے بھی مجھے اپنا نہیں کہہ سکتیں۔ کہہ دو۔ خدا کے لئے کہہ دو کہ تم میری ہو! یہ آنکھیں میری ہیں۔ ان میں سوئی ہوئی تمنائیں میری ہیں۔ اِن میں بسنے والے سپنے میرے ہیں۔ یہ زلفیں میری ہیں۔ ان کی نکہتیں میری ہیں۔ کہہ دو ثریا کہ تم میری ہو ——— وہ سب دِن بیت گئے ——— نہ تسنیم میری ہوئی نہ کلثوم۔ نہ کبریٰ نہ ممتاز نہ رفعت نہ شمیم ——— اِن سب نے مجھے ساری زندگی فریبوں میں مبتلا رکھا۔ کوئی بھی میرا غم گسار نہ بنا۔ آج جبکہ زندگی کی اس رہگذر پہ آگیا ہوں جہاں تم میرے ساتھ ہو،

محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف خوشبو پھیلی ہے۔ یاسمن کی کلیوں کی مہک ہے ندسکی خوش سیلی موجوں کی بیتابی دل کو مسوس رہی ہے۔ ایک نئی دنیا جاگ رہی ایک نیا پھول کھل رہا ہے -!

ارے تمھاری آنکھیں کیوں بھیگ گئی ہیں ؟

لیکن ثریا نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے بس کارا سٹارٹ کی اور تیزی سے ایسی سڑک پر لے آئی جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا

"ہاں یہ وہی تو جگہ ہے ——— جہاں تسنیم رہتی تھی —— " میں نے کہا۔

اتنے میں ڈاکٹر شجاعت سامنے آگئے۔

مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گئے اور کہا۔

"ارے میاں ظفر! کہاں غائب تھے اتنے دنوں سے ؟ آج اچانک یہاں"

"کون صاحب ہیں ؟" ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک قوی ہیکل بھاری بھرکم شخص نے پوچھا جس کے سفید بال چاندنی میں چمک رہے تھے۔

"یہ ہیں مسٹر ظفر صاحب ——— ہمارے نئے دوست" ثریا نے کہا اور "ان سے ملئے" اُس نے زینے میں رستے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہیں میرے شوہر ڈاکٹر اشرف !"

اور میں نے دیکھا اُس کی دونوں ٹانگیں کٹ چکی تھیں اور وہ عجیب کیپرسی کی حالت میں مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن اُس کے پاؤں ——— ؟"

"دو سال پہلے جنگ میں زخمی ہو گئے تھے اور اُن کی ٹانگیں کاٹ دی گئیں" ثریا نے بتایا۔

مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا دیکھ رہا تھا اور کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے تسنیم کا خیال آیا جسے میں نے ایک بار اشرف کے ساتھ بیر نے کے پیڑوں کے قریب دیکھا تھا۔ کیا یہ وہی اشرف ہے ؟

پھر ثریا نے ہال میں لٹکی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تسنیم کی تصویر ہے ۔ اشرف کی پہلی بیوی —— !"

مجھ پر ایک بجلی سی گری۔

"تسنیم ؟ وہ کہاں ہے ؟" میں نے اپنی اضطراری کیفیت کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

"اب اِس دنیا میں نہیں ہے" ثریا نے تصویر ہی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے اپنی سانس روک لی "کیا ہو گیا تھا اُسے ؟"

"ہارٹ فیل ——! بہت دنوں سے دل کی مریض تھیں ——— جب میں یہاں آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ اشرف صاحب سے اُسے کبھی محبت نہ تھی۔ اشرف نے کالج کے دنوں میں اُس پر ہزاروں روپے صرف کئے تھے۔ صرف اِس لئے کہ اشرف کو رضیہ سے محبت تھی اور رضیہ اُس سے نفرت کرتی تھی اور صرف رضیہ کو نیچا دکھانے اور جلانے کی غرض سے اُس نے تسنیم سے دوستی بڑھائی تھی۔

——— اور تم نے کبھی آگے بڑھ کر تسنیم سے پیار نہیں جتایا۔ اُس کی انگلیاں تھام کر اپنے ہونٹوں سے نہیں لگائیں ——— اُس کی زلفوں کو چھونے کی کوشش نہیں کی ؟ اور اسی لئے اشرف اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ———"

"اور وہ کرنل صاحب کا بیٹا بھی تو تھا!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"تسنیم اشرف کی تو ہو گئی۔ لیکن اُس کا دل کبھی اشرف کا نہ تھا ——— اُس کی میز سے اور اُس کے پرائیوٹ فائلوں سے کئی خطوط برآمد ہوئے ہیں جو اُس نے تمہارے نام لکھ رکھے تھے۔ لیکن تمھیں پوسٹ نہیں کئے ——— وہ میری چچازاد بہن تھی اور مجھے اُس سے بہت پیار تھا ——— اُس کی خواہش تھی کہ یہ سارے خطوط ایک دن تمھیں پہنچا دیئے جائیں۔ اِس لئے اُس کی موت کے بعد اُس کی روح کے سکون کے لئے میں نے تمھیں یہ خطوط دینے چاہے ——— کچھ خطوط تو میں نے کار میں بھی رکھ چھوڑے تھے۔ تاکہ تم اُنھیں پڑھ سکو۔ لیکن تم نے شاید اُنھیں نہیں دیکھا۔

میں وہ سارے خطوط لے آیا جن کی تعداد چار پانچ سو سے بھی زیادہ تھی۔ میں ساری رات اُنھیں پڑھتا رہا اور شدت سے محسوس کرتا رہا۔ تسنیم کو مجھی سے محبت تھی۔ وہ آخری دم تک میری محبت کی متلاشی رہی۔ لیکن میں نے اُس کے پیار کے پھول پر دھول ڈال دی تھی۔

جب صبح ہونے لگی تو مجھے محسوس ہوا ساری فضا خوشگوار ہے۔ ہر طرف بے شمار پھول بکھرے ہیں اور ہر پھول کے چہرے سے گرد اور دھول صاف ہو چکی ہے اور ہر شے میں نکھار ہے۔

اور تسنیم اِن شفاف پھولوں سے جھانک رہی ہے !!

[redacted]

غزل

کیف احمد صدیقی

عارض و زلف کی خوشبوئے معطر یادیں
گلشنِ دل میں کھلیں مثلِ گُلِ تر یادیں

پہلے رُخسار کے پھولوں کی طرح نازک تھیں
اب ترے دل کی طرح بن گئیں پتھر یادیں

درِ ماضی پہ کسی درد کی دستک سُن کر
کھول دیتی ہیں خیالات کا دفتر یادیں

جب مرے سر پہ چمکتا ہے دُکھوں کا سورج
تان دیتی ہیں ترے پیار کی چادر یادیں

جب بھی گذرے ہوئے لمحوں کا خیال آتا ہے
خوب روتی ہیں مرے دل سے لپٹ کر یادیں

وہی انداز، وہی شکل، وہی ناز و ادا
بن گئیں جیسے مجسم ترا پیکر یادیں

اُف وہ آغازِ محبت کے سنہرے لمحے
ہائے وہ عہدِ گذشتہ کی منوّر یادیں

جس کے دیدار کی طاقت مری آنکھوں میں نہیں
آئینہ بن کے دکھاتی ہیں وہ منظر یادیں

اِک طرف زخم میں بھرتی رہیں غم کا مرہم
اِک طرف دل میں چبھوتی رہیں نشتر یادیں

اب کہاں تیرے خیالوں سے مرے دل کو مفر
بن گئیں جیسے مرے دل کا مقدر یادیں

جب زمانے میں کہیں اُن کا ٹھکانہ ہی نہیں
پھر کہاں جائیں مرے دل سے نکل کر یادیں

غزل

نیّر قریشی گنگوہی

ہر گُل ہے سوگوار مجھے کچھ پتہ نہیں
کیا کر گئی بہار مجھے کچھ پتہ نہیں

آنکھیں ہیں اشکبار مجھے کچھ پتہ نہیں
میں کیوں ہوں بیقرار مجھے کچھ پتہ نہیں

مُرجھا گئے ہیں پھُول نظارے اُداس ہیں
کیوں کر لُٹی بہار مجھے کچھ پتہ نہیں

کھایا تو ہے حسین سا اک زخم دل نے آج
کس نے کیا ہے وار مجھے کچھ پتہ نہیں

تُو ہی بتا سبب مرے حالِ تباہ کا
اے میرے غمگسار مجھے کچھ پتہ نہیں

سُن کر نویدِ فصلِ بہاراں کھِلے تھے گُل
کیوں ہر طرف ہیں خار مجھے کچھ پتہ نہیں

سینچا تو ہے لہو سے اُمیدوں کا گلستاں
اب گُل ملیں کہ خار مجھے کچھ پتہ نہیں

ہے دوستوں کی بات مگر کچھ نہ پوچھیے
کتنے ہیں غمگسار مجھے کچھ پتہ نہیں

مبہم سا ایک خاکۂ رنگیں نظر میں ہے
کس کا ہے انتظار مجھے کچھ پتہ نہیں

پھونکا ہے کس نے خرمنِ صبر و قرارِ دل
برقِ جمالِ یار مجھے کچھ پتہ نہیں

نیّر جہاں میں وقف ہیں کیوں میرے واسطے
آفاتِ روزگار مجھے کچھ پتہ نہیں

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

آتش گل	جگر مراد آبادی	پانچ روپے
کلیات اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	جوش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	"	ایک روپیہ
سحرِ غزل	آرزو لکھنوی	تین روپے
دستک	[illegible]	دو روپے ۲۵ پیسے
پھوار		دو روپے ۵۰ پیسے
لاکار	"	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	"	تین روپے
آیاتِ جنوں	"	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	"	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۵۰ پیسے
گنجِ معانی	"	سات روپے ۵۰ پیسے
روپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
رمز و کنایات	"	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	"	دو روپے ۵۰ پیسے
کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (اول)	اکبر الٰہ آبادی	پانچ روپے
" حصہ دوم	"	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	"	دو روپے ۲۵ پیسے
گلِ رعنا	جگر	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ نادان	"	چھ روپے

خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	"	چار روپے
گلنار	"	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	"	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	"	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	"	دو روپے ۵۰ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
رسالت آب	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
اسلام اور عورت	مولانا مظہر الدین	تین روپے
نماز کیا ہے	مولانا محمد علی	دو روپے ۲۵ پیسے
نیا [illegible]	[illegible] سہسوانی	پانچ روپے ۵۰ پیسے
[illegible] مستقل	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ پیسے
شرارت	جمیل [illegible]	تین روپے
عشق اور خون	رائیڈن ہگرڈ	سات روپے
سوکھا ساون	انیس مرزا	دو روپے ۵۰ پیسے
محبت اور جرم	انور کمال حسینی	دو روپے ۷۵ پیسے
فن اور تنقید	"	چار روپے ۵۰ پیسے
نوائے دل	منشاء الرحمٰن خاں منشاء	دو روپے ۵۰ پیسے
شاہنامۂ اسلام	حفیظ جالندھری	نو روپے
تلامذۂ غالب	مالک رام	سات روپے ۵۰ پیسے
یادیں	اختر الایمان	چھ روپے
مضراب	شباب للت	تین روپے
تماشائی	کرشن موہن	[illegible] روپے
روپ رس (ہندی رسم الخط میں)	"	[illegible]
نگاہِ ناز	"	ایک روپیہ [illegible] پیسے
تبسمِ غم	وسیم بریلوی	دو روپے ۵۰ پیسے
دیوانِ مصحفی	مرتبہ: نور نقوی	بارہ روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور مشق نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام۔ حضرت اختر [illegible] ہیں اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے۔ کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ [illegible] کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپے

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام [illegible] چار [illegible] ہیں [illegible] اسلام [illegible] کو منظم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ [illegible] کے [illegible] چھپا ہے۔ قیمت سولہ روپے اب صرف نو روپے میں [illegible] جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں آنسو [illegible] دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں [illegible] جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے

گردِ راہ ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعۂ کلام [illegible] ایک صاحب طرز شاعر ہیں۔ ان کے انداز [illegible] و لہجہ میں انفرادیت و ندرت ہے۔ قیمت [illegible]

[illegible]

پتہ: رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی

جب سرسوں پھولتی ہے

اختر ملیح آبادی بی۔ اے، بی۔ ٹی

۲۴ چھیتاپور روڈ۔ لکھنؤ

میرے پیارے بھائی خوشتر!

... ایک کہانی اسٹوری بھیج رہا ہوں۔ مشاہدہ و تاثرات نے اسے جنم دیا ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔ "دائمی پیار" محبت کا افسانہ ابھی [illegible] ہے۔ کل ایک صاحب ایم حسین قیصری مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے کچھ افسانے آپ کو بھیجے تھے۔ شاید انھیں رسید نہیں ملی۔ وہ میرے پاس آئے کہ سفارش کرا دیں۔ میں نے پوچھا کہ کس لئے آپ نے مجھے [illegible] کا اہل سمجھا۔ جواب ملا کہ خوشتر [illegible] کے تحت۔ اس لئے کہ آپ دونوں ایک جان دو قالب ہیں! میں نے وعدہ کیا کہ آپ کی بات بھائی تک پہنچا دوں گا، لیکن یہ یقین کرنے میں تامل کیا کہ دفتر سے جواب مل گیا ہو۔ میں نے قیصری صاحب سے کہا کہ دفتر "بیسویں صدی" اس معاملے میں ہندوستانی دفتروں میں نمایاں ہے۔ جواب نہ آنے پر خوشتر بھائی دفتر کو ہلا دیتے ہیں۔ وہ مطمئن ہو گئے اور میں تو مطمئن تھا اور ہوں...

آپ کا تاحیات بھائی

اختر ———— اختر ملیح آبادی

میں شہر سے اپنے قصبے جا رہا تھا۔ ایک منظر دیکھ کر دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وجدان بیدار ہو گیا۔ جب یکایک ڈرائیور نے کنڈکٹر سے پوچھا۔ "کوئی جگہ ہے؟"

"جانے دو۔" کنڈکٹر نے بس نہ روکنے کا حکم دیا۔ لیکن مسافروں کی امید کے خلاف بس رکنے لگی تو چند مسافروں نے گھبرا کر ڈرائیور کو اور سامنے دیکھا اور کچھ نے کنڈکٹر کو گھورا۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ "دیکھو! تمھارے حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے!"

[illegible] احساس میرا بھی تھا۔ [illegible] مسافروں کے عام احساسات کی طرح [illegible] ہوتا ہے۔

"کوئی جگہ نہیں ہے" کنڈکٹر چلایا لیکن ڈرائیور نے گاڑی کو [illegible]...

"کوئی بیمار معلوم ہوتا ہے۔"

"ہونے دو بیمار" کنڈکٹر بولا۔

"[illegible] ہی کے لئے بس نہیں ہوتی!" ڈرائیور نے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔ "انسانیت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟"

کنڈکٹر نے تو بہت اطمینان سے انسانیت کو گالی دی لیکن اُس وقت میں نے [illegible] طرف دیکھا تو آم کے پیڑوں کے نیچے دو عورتیں نظر آئیں۔ ایک عمر عورت ہاتھ اُٹھائے تھی اور آم کے پیڑ کے تنے سے چپکی ہوئی ایک دیہاتی لڑکی اس طرح بے سُدھ بیٹھی [illegible] کہ اُس کا سر ایک طرف [illegible] گیا تھا اور سینے کا تموج طوفانی تھا۔

"بٹیوا کو بُکھار (بخار) ہے [illegible] وڑے ور صاب (صاحب)!"

کنڈکٹر نے گرج کر [illegible] کہا: "جگہ نہیں ہے۔ پیدل لے جاؤ بٹیوا کو!"

"ٹھہرو" ڈرائیور [illegible] اُتر گیا۔ اس نے لڑکی کے چہرے کو جو سرسوں کے پھول جیسا پیلا تھا، دیکھا۔ پھر عورت سے بات کی اور کنڈکٹر سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا اور پھر لوگ [illegible] پارلیمنٹ کی طرح تقسیم ہو کر شور و غوغا کرنے لگے ـــ سب اصول اور قاعدے کی بات کر رہے تھے اور میں حیران تھا کہ لوگ ڈرائیور کی بات

کیوں نہیں تسلیم کرتے کہ قانون، اصول اور قاعدے بقائے انسانیت کے لئے ہیں یا تخریبِ انسانیت کے لئے!؟

جب ڈرائیور نے دھمکی دے کر [illegible] آگے نہیں بڑھائے گا تب وہ [illegible] لڑکی کو بس کے پچھلے حصّے میں [illegible] پر بیٹھنے [illegible] اور ڈرائیور نے [illegible] دت ہوتے [illegible] اشارت کر دی [illegible] انسان [illegible]

اب سب [illegible] کی طرف [illegible] جو لوگ [illegible] پہلے مخالفت کر رہے تھے [illegible] کا [illegible] لڑکی [illegible] اور [illegible] کوشش کر رہا تھا [illegible] سرسوں کے [illegible] کوشش جاری تھی [illegible]

[illegible] اور بس [illegible] ڈرائیور کی طرف [illegible] تھا

وہ [illegible] احساس [illegible] باعث فخر بنا اور پھر ہنستا چلا گیا!

[illegible] تھا اور [illegible] ڈرائیور تھا شاید یہی وجہ تھی [illegible] اس کی کوئی اہمیت و مقام ہی تھا [illegible] بس سے اتر کر گھر جانے کے [illegible] سلام [illegible] اور گھر آگیا۔ اُسے شاید میرے سلام نے [illegible] کر دیا تھا لیکن [illegible] اپنے [illegible] خود محسن نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا!

محسن [illegible] کا وہ عمل تھی جس نے محسن کا خود سے تعارف ہی نہیں کرایا تھا بلکہ [illegible] قریب سے دیکھنے کی خواہش پیدا کر دی تھی ۔۔۔۔ جب دوسرے دن میں محسن سے ملنے گیا تو وہ بس اسٹینڈ پر نظر نہ آیا کنڈکٹر سے استفسار پر معلوم ہوا کہ محسن کو برخاست کر دیا گیا ہے!" یہ کہہ کر کنڈکٹر ہنسنے لگا اور میں ساکت ہو گیا۔ ایک سوالیہ نشان نے میرے وجود کو گھیر لیا ۔۔۔۔ کیا انسانیت جرم ہے!؟

لیکن محسن ملا تو اس کے لبوں پر شکوہ تک نہ تھا۔ میرے سوال پوچھنے پر لب [illegible] "جو کچھ میں نے کیا اس پر شرمندہ نہیں [illegible] نوکری جانے کا غم نہیں!"

اس سے میری گرویدگی اور بڑھ گئی اور [illegible] جگہ پر زبان محسن کی [illegible] محسن میری نظر میں احترام حاصل کر رہا تھا۔ وہ تھا بھی احترام کے قابل!

سرسوں کا پھول قصبے کے اسپتال میں تھا۔ اُس کی ماں اپنی لڑکی کو علاج [illegible] کا علم تھا لیکن پھر وہ اسپتال نہیں گیا۔ لڑکی کی ماں البتہ محسن کے [illegible] افسوس کر رہی تھی۔ اس [illegible] محسن کو نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

ایک دن میرے پوچھنے پر محسن نے کہا۔

"خدا میں اس لڑکی کو نہیں جانتا اور نہ میں نے کسی وجہ سے اُسے بس میں بٹھایا تھا!"

"لوگ عجیب باتیں کرتے ہیں!" میں نے کہا "کہ تمھیں اُس سے دلچسپی ہے!"

"آج کی دنیا انسانیت اور ہمدردی سے خالی ہے!" محسن نے کہا "آج بھی سے ہمدردی کی [illegible] لوگوں نے ہمدردی کو محبت سمجھا!"

"محبت تو تمھیں ہے محسن!" میں نے مسکرا کر کہا "میری آنکھیں گواہ ہیں!"

محسن چونک پڑا۔ اُس نے گلہ آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور قدرے گھبرا کر کہا "کیا آپ نے بھی میری انسانی ہمدردی کو کچھ اور سمجھا؟"

جب میں نے اُسے بتایا کہ محبت سے میری مراد کیا ہے اور یہ انسانی محبت نہ ہوتی تو تم بس روکتے ہی نہیں۔ تب وہ مسکرایا "میں نے سُنا تھا کہ آپ کہانیاں لکھتے ہیں لیکن آج میں نے خود دیکھ لیا!"

محسن کی صرف ماں تھی اور کوئی نہ تھا۔ وہ اچھا انسان ہی نہیں، مثالی بیٹا بھی تھا۔ اُسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ اُن محبت کرنے والے بیٹوں کی طرح نہیں جو جوان ہو کر جوان لڑکیوں کو ماں پر ترجیح دیتے ہیں۔ محسن بھی [illegible] کر سکتا تھا۔ لیکن ایک دن میرے سوال پر اُس نے کہا "میری ماں نے دُکھ جھیل کر مجھے پالا ہے۔ اب تکلیف اُٹھا کر ماں کو خوش رکھنا میرا ایمان ہے!" اسی لئے [illegible] شادی نہیں کی تھی۔ آمدنی کم تھی یقیناً ماں کو تکلیف [illegible]

اور سارا قصہ بتا دیا تھا کہ محسن بہت بلند کردار ہے۔ یہاں تک کہ سننے کا عادی نہیں جو اُس کے پیشے میں ضروری ہے۔ تا حال سے بھی نا آشنا تھا لیکن پھر بھی جب میں لوگوں کو سرسوں کے پھول والا کہتے سنتا تو اس کا تضاد میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اکثر میں سوچتا ہو سکتا ہے کہ محسن کو اُس لڑکی سے دلچسپی نہ ہو لیکن عین نفسیاتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ ایسی صورت میں دلچسپی دوسرا رُوپ دھار سکتی ہے!

لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ محسن نے ساری بات اپنی ماں کو بتا دی تب مجھے یقین ہو گیا کہ اُسے اُس زرد چہرے والی لڑکی سے اور کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے محسن سے پُوچھا کہ اُس نے اپنی ماں کو ساری بات کیوں بتائی تو ایک نیا رُخ کھُلا۔ محسن نے کہا "میری ماں نے مجھے دو نایاب چیزیں دی ہیں۔ ایک یہ کہ سچ بولنا بچپن سے سکھایا دوسرے یہ کہ جس مٹی سے ماں بنی ہے اُس سے پیار کرنا۔ ان نایاب موتیوں کو میں سینے سے لگائے ہوں۔۔"

محسن کی ماں تو دیہاتی عورت ہے۔ جاہل —— میں سوچ رہا تھا اُس کے دل میں یہ سوتے کیسے پھوٹے!؟ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں چُپ ہو گیا۔ محسن کو میری خاموشی سے شک ہوا تب اُس نے کہا "آپ نے یقین نہیں کیا شاید مشکل سے یقین آنے والی بات ہے۔ لیکن آج کی پڑھی لکھی مائیں اِن جذبوں سے خالی ہیں اور میری ماں جاہل ہے۔ میرے پُوچھنے پر میری ماں نے کہا تھا کہ کسی بزرگ نے اُن سے کہا تھا کہ اپنے بیٹے کو دو باتیں یاد کرا دینا۔ ماں نے وہی کیا"

"تمھاری ماں نے نوکری جانے پر کیا کہا؟" میں نے پُوچھا "تم پر ناراض ہوئی ہوں گی؟"

"جی نہیں!" محسن بولا "اماں نے کہا کہ سچ بولنے والے نقصان ہی اُٹھاتے ہیں لیکن پھر بھی سچ بولتے ہیں"

میں نے کہا "یہ درست ہے کہ سچ بولنے والا بُرائیوں سے بچتا ہے۔ لیکن وطن والی بات سمجھ میں نہیں آئی!"

"آپ سمجھ نہیں سکتے" محسن نے کہا "وطن سے پیار کرنے والے اپنی ماں سے بھی پیار کرتے ہیں اس لئے میری ماں نے وطن کی محبت سے اپنی محبت کو پختہ کیا۔۔"

"نہیں محسن!" میں نے ٹوک دیا اور کہا "ماں کی محبت سے وطن کی محبت جنم لیتی ہے"

"دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں" محسن نے ہنستے ہوئے کہا "ایک بات کے دو رُوپ ہیں اور بس!"

لیکن محسن کے کردار میں سچائی تو تھی۔ وفا بھی تھی۔ انسانیت بھی تھی۔ ماں کا پیار بھی تھا لیکن وطن کے لئے کوئی عملی مثال نہ تھی۔ لیکن یہ بات نہ کہنے والی تھی اور نہ طعنہ ہی دینے والی تھی۔ اس لئے کہ عملی رُوپ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ محسن نے کوئی بے ایمانی دغابازی نہیں کی۔ جھوٹ نہیں بولا۔ دھوکا نہیں کیا۔ قانون شکنی نہیں کی اور نہ کوئی جُرم ہی کیا تھا۔

محسن ایک دن ملا تو ہنس کر بولا "اتفاق دیکھئے کہ اُس کا نام بھی گیندا ہے"

میں سمجھ نہ پایا کہ اشارہ کس طرف ہے۔ پھر اُسی نے بتایا کہ وہ دیہاتی عورت اپنی لڑکی کو لے کر میری ماں سے ملنے گئی تھی۔ پتہ نہیں گھر کس نے بتا دیا۔ اُسی کے لیے میری نوکری گئی تھی۔ وہ اظہارِ افسوس کرنے آئی تھی۔ اِسی کا نام انسانیت ہے!

"اُس کی لڑکی کا نام گیندا ہے" محسن نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "میری ماں کو سرسوں کے پھول بہت پسند ہیں۔ کہہ رہی تھیں نام تو گیندا ہے لیکن وہ سرسوں کے پھول جیسی ہے۔ میری ماں نے گیندا کو بہت پسند کیا"

"انھیں کوئی اور شک تو نہیں ہوا؟" میں نے ہنس کر پُوچھا تو محسن نے مجھے چونک کر دیکھا۔ پھر شرما کر کہا۔

"وہ اپنے بیٹے کو آپ سے زیادہ جانتی ہیں"

اُس دن کے بعد محسن جب بھی ملتا بغیر پُوچھے گیندا کے متعلق خود ہی سب کچھ بتا دیتا تھا۔ یہ اُس کے کردار کی معصومیت تھی۔ ایک دن اُس نے بتایا کہ گیندا نے ماں کے سامنے گوئی اور کھیت کی پیش کش کی۔ اُس کے پُوچھنے پر گیندا نے کہا کہ اُس کے لئے نوکری گئی اِس لئے وہ احسانمندی کے طور پر کھیت اور گوئی دینا چاہتی ہے۔ لیکن ماں نے کہہ دیا کہ انسانیت اپنی قیمت نہیں رکھتی!

"گیندا اپنے گاؤں کیوں نہیں جاتی؟" ایک دن میں نے پُوچھا تو محسن نے بتلایا کہ طاقت کے انجکشن لگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے روکا ہے اور میرے اِس خیال پر کہ ہو سکتا ہے، محسن کی ماں نے روکا ہو، تو محسن نے اِس خیال کی تردید کر دی اور کہا۔

"سچ کی تعلیم دینے والی ماں سچ سے ڈرتی بھی ہے۔۔۔!؟"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ محسن ہنسا اور اُس نے کہا۔

"گیندا لڑکی ہے، خوبصورت ہے، جوان ہے —— جوان لڑکی بھی تو سچ ہوتی ہے اور سچا اثر کرتی ہے۔ اِس لئے میری ماں گیندا کو بلا ضرورت نہ روکے گی!"

"کیا تم پر اعتبار نہیں؟"

محسن نے پہلے تیوریاں چڑھائیں اور پھر مُسکرا کر کہا "اعتبار اور نا اعتبار کا کیا سوال ہے —— آگ جلا دیتی ہے، یہ سچ ہے۔ پانی ڈھال کی طرف بہہ جاتا ہے، یہ سچ ہے اور۔۔"

"پھر تمھاری ماں سچ کو سچ سے ملا کیوں نہیں دیتی ہیں؟"

"غریبی بھی سچ ہے!" محسن نے کہا "آج کل میں بیکار بھی ہوں"

"میں تمھاری نوکری کی تلاش میں ہوں" میں نے کہا۔ محسن نے ممنون آنکھوں سے

اب دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں۔

محسن سے ملنے پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ ایک دن محسن نے مجھ سے کہا مجھے اس کے پہلے سے علم تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ محسن کی اگر کوئی بہن ہوتی تو افواہیں ہی گونجنے لگتیں۔ لیکن حقیقت تھا کہ بات وہاں تک نہیں پہنچی۔ لیکن لوگ حیران تھے کہ کوئی مشترک قدر نہ تھی اس دوستی کی بنیاد میں ــــــ اس لئے کہ محسن محض ڈرائیور اور میں مالدار تھا۔ لیکن میں گدڑی میں لعل دیکھ رہا تھا جہاں لوگوں کی نظر نہیں جا سکتی تھی۔ میں محسن ڈرائیور سے نہیں، محسن انسان سے ملتا تھا اور اس کے وہ جوہر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اب تک چھپا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایسے ہی لوگ غیر معمولی جوہر کے مالک ہوتے ہیں!

گیندا نے محسن کو اپنے گاؤں بلایا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا تھا۔ کہنے لگا، گیندا جاتے وقت رو دی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ روئی کیوں تھی؟

"اکیلے میں یا سب کے سامنے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں سب کے سامنے کئی بار روئی!" محسن نے سیدھے سادے انداز میں کہا۔ "اور پھر بس پر بیٹھتے وقت، جب میں اسے پہنچانے گیا تھا۔۔"

"گیندا اس کا نام ہے محسن!" میں نے کہا۔

"اب تو اگر جھوٹ کہ سچ کہ [illegible] محسن!" یہ میری بات محسن اَن سنی کرتے ہوئے کہا "میں پہنچانے نہیں آ رہا تھا لیکن ماں نے کہا تھا۔"

"تمھیں گیندا کے جانے کا رنج ہوا محسن؟" میرے سوال پر محسن نے بغیر کسی تاثر کے کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک انسان کی مدد کی اور قربانی دے کر ــــ اگر میں گیندا کو نہ لے آتا تو وہ اس روز مر جاتی۔ یہ خوشی میرے دل سے کبھی نہ جا سکے گی۔"

ملازمت کے سلسلے میں محسن ایک سال سے باہر تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میری کوشش بارآور ہوئی اور میرے کہنے پر محسن ملازمت کے لئے آمادہ ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اُسے ماں کا خیال نہ ہوتا تو وہ باہر نہ جاتا۔ اسے اپنا خیال نہ تھا۔ محسن نے کہا تھا "میرا سرسوں کا کھیت پھولے یا نہ پھولے لیکن جس ماں نے میرے لئے دُکھ سہے اُس کے لئے میں ہر دُکھ سہہ سکتا ہوں!"

نئے مالکوں نے محسن کی مستعدی، خلوص اور جذبے کو سراہا تھا۔ وہ میرے احسان مند تھے کہ میں نے محسن جیسا آدمی انھیں دیا۔ ڈرائیور ہو کر محسن نے جس انسانی کردار کی بلندیوں کو اُجاگر کیا وہ میرے لئے باعثِ مسرت تھیں۔

ایمان داری کی کمائی میں برکت ہوتی ہے۔ محسن کے خطوط اس حقیقت کے مظہر تھے اور اس کے ردِّ عمل کے بھی۔ اسی لئے محسن لکھا کرتا تھا "اب مجھے سرسوں کے کھیت کی تمنا ہے جس میں ماں کی محبت کی نمی ہو۔۔۔!" یہ فطری اور معصوم جذبہ تھا۔

محسن کو جب معلوم ہوا کہ گیندا اپنی ماں کے ساتھ جب قصبے کے بازار آتی ہے تو اُس کی ماں سے بھی ملتی ہے اور اُس کی ہمدردی کی آج بھی قدر داں ہے، تو محسن کا پہلا پہلا خواب سمٹ کر گیندا کا رُوپ دھار گیا۔

وہ جب گھر آیا تو گیندا کے گاؤں بھی گیا تھا۔ اُس وقت سرسوں ہر طرف پھولی تھی۔ سرسوں کے کھیت ہی میں گیندا سے ملاقات ہوئی تھی۔ محسن نے مجھے بتایا تھا کہ گیندا کی شرمیلی مسکراہٹ میں اُسے سرسوں کے پھولوں کی نزاکت و لطافت محسوس ہوئی تھی لیکن وہ شرم کی وجہ سے بات نہ کر سکا تھا لیکن وہ گیندا کی مسکراہٹ دل میں ضرور چرا لایا ہے اور جو اُس کے دل ہی میں رہے گی۔

محسن کی تنخواہ اچھی تھی۔ ماں بیٹے کو دولھا بنانے کا انتظام کرنے لگی۔ جب محسن کی ماں نے گیندا کی ماں سے دل کی بات کہی تو گیندا کی ماں نے کہا "اُس کا احسان مجھ پہ قرض ہے۔ اگر گیندا اُس قرض کو ادا کر دے تو مجھ کو خوشی ہوگی۔"

محسن کے ہاتھ پیلے کرنے کی تاریخ رکھ لی گئی تھی۔ محسن اب آنے والا تھا کہ ایک دن اخبار میں یہ خبر پڑھ کر میں چونک پڑا کہ ــــ نیپال کی سرحد پر اسمگل ہونے والی اشیائے ضروری کی اسمگلنگ ہونے والی تھیں کہ پولیس نے چھاپہ مارا۔ ڈرائیور جس کا نام محسن ہے گرفتار ہوا باقی لوگ بھاگ گئے۔ اس خبر نے مجھے پریشان کر دیا۔ اُسی دن گیندا بازار آئی تھی اور اپنی ماں سے مسکرا کر بات کر رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ سرسوں کے ان پھولوں جیسی معصوم ہوتی جو ژالہ باری سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت میرے دل پر چوٹ لگی اور سوچنے لگا کہ گیندا کی وہ مسکراہٹیں جنھیں محسن چرا لے گیا تھا اب تک [illegible]

جب میں محسن سے ملا تو وہ جیل میں تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور اُس نے [illegible]

"میری ماں نے کہا تھا کہ سچ بولنے والے ستائے جاتے ہیں۔" [illegible] دل تھا۔ اس لئے کہ محسن نے کہا تھا کہ میری ماں مجھے [illegible] ہوتی تو وطن بھی [illegible] نہ ہوتا۔ اگر میں ماں کو گزند نہ پہنچا سکتا تو وطن کو بھی گزند نہ پہنچا [illegible] نہ تھا۔۔" اور یہی محسن کا جُرم تھا۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ وطن کو یا ماں کو اصطلاحی اور جذباتی طور پر ایک ہی ہستی ہوتی ہے نقصان پہنچائے اور [illegible] کرے۔ اسی لئے اُس نے اسمگل والا سامان نیپال پہنچانے کے بجائے [illegible] کے مستقر پر پہنچا دیا اور کہا کہ دولت مند جنھیں نہ اپنی [illegible] پریم، وطن کو بے ننگ و نام و رسوا کر دینا چاہتے ہیں [illegible]

یہ سچ تھا محسن کا عقیدہ سچ پر تھا [illegible]

جیل پہنچا دیا اور سارا الزام محسن پر عائد ہو گیا۔

ایک حقیقت سامنے آئی ــــــ محسن کی ماں یہ سوچ کر اور دل برداشتہ ہو کر مر گئی کہ کیا سچ زہر ہلاہل ہوتا ہے !!

دوسری حقیقت گیندا تھی۔ وہ زندہ تھی لیکن اب وہ سرسوں کے پھول جیسی تر و تازہ نازک اور حسین نہ تھی۔ وہ ایک ببول کا ٹھٹھرا ہوا بے رنگ پیڑ ہو کر رہ گئی تھی! محسن جیل میں تھا۔ اُسے سزا ہو گئی تھی ــــــ دولت کا زہر بھی کالے ناگ کے زہر سے کم نہیں ہوتا!

محسن کو سب ہی بُرا کہتے تھے لیکن میں محسن سے ملنے اور اعتراف حق کرنے ضرور جاتا تھا۔ لیکن محسن اب پتھر کی طرح جامد نظر آتا تھا اور جب وہ جیل سے آیا تو ماں کی قبر پر گیا اور آنسوؤں کی زبان سے کہنے لگا: "میری ماں! تم سچ تھیں پھر تم ناسچ کی طرح کیوں مٹ گئیں!؟"

اور جب میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے گیندا کا ذکر کیا تو محسن پہلے تو چُپ رہا، پھر کہا: "جب ماں ہی سرسوں کے پھول کھلتے اور مُسکراتے نہ دیکھ سکی تب وہ میرے لئے کیا بہار لا سکیں گے!"

اور میرے سوال پر اُس نے بڑے عزم سے کہا: "ماں جب تک زندہ رہتی ہے حقیقت ہوتی ہے اور مر کر غیر فانی حقیقت بن جاتی ہے۔ اجنتا اور تاج محل کے نقوش سے زیادہ امٹ!"

گیندا پھر نظر نہ آئی اور ایک دن جب میں نے پُوچھا تو محسن نے کہا: "چُرائی ہوئی اُس کی مُسکراہٹیں میرے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ اپنی مُسکراہٹیں دے کر گیندا میری ماں کے پاس چلی گئی اور ماں کی طرح وہ بھی روشن حقیقت بن گئی!"

واقعی ایسا ہی ہوا تھا ــــــ سرسوں کے پھول تو مُرجھا گئے تھے لیکن جب سرسوں پھولتی ہے تو محسن کو گیندا کی مُسکراہٹیں ہر طرف بکھری نظر آتی ہیں!!

غزلیں

شباب للت ایم اے

بن جائے نہ محفل کی فضا اور طرح کی
اب چھیڑ مغنی تُو نوا اور طرح کی

بیمارِ محبت کا اب اللہ نگہباں
احباب نے مانگی ہے دُعا اور طرح کی

کیوں درد کے ماروں کو نہ آئے یہ موافق
مے خانے کی ہے آب و ہوا اور طرح کی

اے قافلے والو ذرا ہُشیار! کہ باتیں
کرنے لگے اب راہنما اور طرح کی

محلوں کے مکیں آج بھی ہیں اور ہوا میں
لیکن ہے زمانے کی ہوا اور طرح کی

ساقی! یہ کہیں تشنہ لبوں کی نہ ہوں آہیں
مے خانے پہ چھائی ہے گھٹا اور طرح کی

ایسے تو نہ بدلے گا شبابؔ عالمِ محفل
محفل میں غزل آج سُنا اور طرح کی

سعید اعجاز

سب لوگ سوئے دیر و حرم دیکھ رہے ہیں
ہم ہیں کہ ترا نقش قدم دیکھ رہے ہیں

روز ایک نیا فتنۂ غم دیکھ رہے ہیں
اِس دورِ ترقی کا کرم دیکھ رہے ہیں

وہ کشمکش دہر سے آزاد ہیں اے دوست
جو لوگ تری زلف کے خم دیکھ رہے ہیں

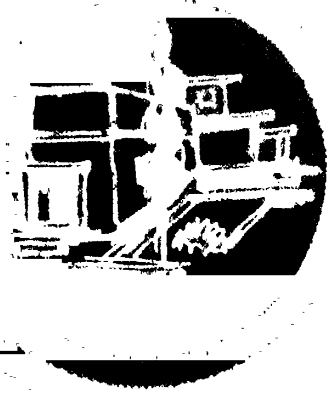
پھر کیجیئے گستاخ نگاہی کی شکایت
ہاں دیکھئے پھر آپ کو ہم دیکھ رہے ہیں

جس رند کو پینے کا قرینہ بھی نہ آیا
اُس رند پہ ساقی کا کرم دیکھ رہے ہیں

گیسوئے دراز اُن کے بہت دیکھ چکے ہم
تُو بھی ہے کہاں تک شبِ غم دیکھ رہے ہیں

آتی ہوئی اعجازؔ دبے پاؤں قیامت
اُن قدموں کی آہٹ کی قسم دیکھ رہے ہیں







پُجارن

پروفیسر طاہرہ شہاب۔ ایم۔ اے

۲۰۳ ممتاز آباد۔ ملتان

مکرّمی و محترمی سلام مسنون!

"پُجارن" حاضر ہے۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گی۔ اس دنیا میں سکھ کے پھول ہی نہیں دُکھ کے کانٹے بھی ہیں۔ ان نکیلے کانٹوں کی چبھن کتنی تیز اور کس قدر ناقابلِ برداشت ہے۔ اُف!

نیاز کیش ——— طاہرہ شہاب

"اے لڑکی! کون ہو تم؟"

آخر ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھ ہی لیا۔

وہ ایک دم چونک گئی۔ جیسے چلتے چلتے آگ پر پاؤں پڑ گیا ہو۔۔۔ میری طرف ایک نظر ڈالی اور تڑپ کر بھاگ گئی، جیسے میں اُسے پکڑ ہی تو لوں گی

ہمیں سوات آئے ہوئے پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ سارا دن ہم لوگ چشموں کے گرد منڈلاتے، پہاڑوں پر چڑھتے اور بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلنے کی ناکام کوششوں میں لگے رہتے۔

جیسے ہی شام کے سائے گہرے ہونے لگتے۔ ہم ساری شرارتیں اور شوخیاں بھول کر اپنی منزل کی راہ لیتے ہیں۔

جس جگہ ہم مقیم تھے وہ کالج کے ہوسٹل کی ایک خوبصورت عمارت تھی۔ ہوادار ہونے کے علاوہ کمرے نہایت وسیع، روشن اور ہوادار تھے۔ کمروں کے آگے برآمدے تھے۔ جو کالج کی تین اطراف کو گھیرے ہوئے تھے۔ ہم سب سے اوپر والی منزل میں ٹھہری تھی۔ کیونکہ نیچے والے کمروں میں دُور دراز سے آ کر کالج کے طلباء ٹھہرتے تھے اور خوب ہنگامہ آرائی کرتے تھے۔

میں جب پہلی بار اوپر پہنچی تو اپنے آپ کو اتنی بلندیوں پر پا کر بہت سکون محسوس ہوا۔ جیسے میری آرزوؤں کی انتہا انہی بلندیوں کو پا لینا ہو۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اپنی مضطرب اور بے کل رُوح کو آسودہ پایا۔ وسیع و عریض برآمدوں سے گزرتے ہوئے میں نے اتنی راحت محسوس کی کہ جذبات کی شدت سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن

نجمی بھلا میری آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ سکتے تھے۔ فوراً ہی بول پڑے۔

"حضرات! محترمہ ریحانہ کو ابھی سے گھر کی یاد ستانے لگی ہے۔"

اُن کی آواز کے ساتھ ہی بہت سی نگاہیں شرارت سے مجھے دیکھنے لگیں۔

"ہائے اللہ! نجمی!! سر قاسم بھلا کیا سوچیں گے؟"

میں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے نجمی کی خوشامد ہی میں بھلائی سمجھی۔

اِس مرتبہ ہماری مِس فرحت رضوی اور سر قاسم نے مل کر پروگرام بنایا تھا کہ سوات کی سیر کی جائے۔

ہم بھلا کہاں رُکنے والے تھے۔ فوراً دس لڑکیاں اور دس لڑکے سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ گھر سے اجازت بھی لے لی مس انجمن آرا بیدیونی کی ٹیچر تھیں لیکن مس فرحت سے تعاون کرتے ہوئے انھوں نے یہ ذمّے داری قبول کر لی۔ مس فرحت کسی مجبوری کی بنا پر عین وقت پر رُک گئیں اور ایک ماہ کی چھٹی لے لی۔ اُن کی جگہ آج کل ہمیں سر قاسم پڑھاتے تھے۔ جب ہم نے دبی زبان سے سیر کا ذکر کیا تو یہ صاحب بھی فوراً آمادہ ہو گئے اور اپنے ساتھ اپنے شاگردوں کو بھی لے لیا۔

وہاں پہنچنے پر سب نہا دھو کر تیار ہو گئے اور منگورہ کی طرف چل پڑے۔ شام کا وقت تھا اور آہستہ آہستہ چشمے سے بہتا ہوا پانی بے حد دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔ پُل پر سے گزرتے ہوئے مجھے بہت ڈر معلوم ہوا اور میں مدد کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ لیکن نجمی دانستہ سر قاسم سے باتوں میں مصروف ہو گئے اور لڑکیاں ہلکی ہلکی مسکراہٹیں بکھیرتی آگے بڑھ گئیں۔ نجمی ہمیشہ مجھے تکلیف میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

لڑکیوں کو گھر سے نکل کر آزادی ملی تھی۔ اِس لئے وہ نہایت بے فکری سے باتیں کرتی آگے بڑھ رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی، اس طرح سیکڑوں نگاہوں کا شکار بننے کے بجائے یہ کہیں بہتر تھا کہ میں ہوسٹل کے برآمدے میں کھڑی ہو کر پہاڑوں اور چشموں کا نظارہ کرتی۔

"مس! اگر آپ اجازت دیں تو میں واپس ہوسٹل چلی جاؤں؟" میں نے مس کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟ تھک گئی ہو کیا؟"

اُنہوں نے بہت شفقت سے پوچھا۔

"جی بہت!"

نگاہیں جھکا کر میں نے جواب دیا، کہیں نگاہیں دل کی بات نہ کہہ دیں۔

- انسان جب سختی میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُسے پکارنے لگتا ہے اور جہاں اُسے سختی سے نجات ملی اُس نے خدا کو بھلا دیا (قرآن پاک)
- تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ وہی ہوتی ہے جسے تمہارے ہاتھوں نے کمایا۔ (قرآن پاک)
- امین بن کر خیانت کرنا بڑا گناہ ہے (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو کر سکے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- دل کو روشن کرنا ہو تو غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔ (حضرت امام شافعیؒ)

"اچھا تم خیرو بابا کے ساتھ چلی جاؤ، وہ سبزی لے کر ہوسٹل واپس جا رہا ہے۔"

"تھینک یو مس!"

میں نے کہا اور خیرو بابا کے ساتھ ہوسٹل واپس آ گئی۔

خیرو بابا تو باورچی خانے کی طرف بڑھ گئے اور میں زینے طے کرتی ہوئی اُسی مقام پر پہنچ گئی جہاں کھڑے ہو کر میں اپنے کو فضاؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرتی تھی۔

میں ستون کا سہارا لئے دُور دُور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کا نظارہ کر رہی تھی کہ شام کے دھندلکے میں ایک سایہ چادر میں لپٹا ہوا گیٹ میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ محتاط چال سے چلتا ہوا دوسری جانب بڑھنے لگا۔ اُس طرف باورچی خانہ تھا اور اُس کے پیچھے زور شور سے چشمہ بہہ رہا تھا۔

چشمے سے ذرا ہٹ کر پتّوں کے ڈھیر کے قریب وہ سایہ رُک گیا۔ سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، پتّوں کو ایک طرف ہٹایا پھر روشنی کی ایک باریک سی لکیر نظر آئی۔ شاید کسی چراغ کی لَو تھی یا موم بتی کی۔ پھر اُس چراغ کو بہت احتیاط سے ہری ہری ٹہنیوں میں چھپا دیا۔ کچھ دیر تک وہ سایہ وہاں جھکا رہا پھر بوجھل بوجھل قدموں سے گیٹ کی طرف لَوٹ گیا۔

نہ جانے کیوں ایک سوگواری سی سارے ماحول پر چھا گئی۔ پتّوں کی سرسراہٹ میں ایک ماتمی شور سا پھیل گیا اور چشمے کی مدھ بھری آوازوں نے ایک المیہ راگ چھیڑ دیا۔

"دیکھو ریشماں! آج ہم سفید محل دیکھنے جا رہے ہیں۔ کہیں اُسے دیکھ کر اپنے دیس کو نہ بھول جانا!"

نجمی نے ناشتے کی میز پر سرگوشی کی۔ لیکن خالدہ جس کے کان ہمیشہ نجمی کی بات پر لگے رہتے ہیں، جھک کر بولی۔

"اچھا تو ہے ریشماں کے نصیب جاگ جائیں گے!"

"اگر سفید محل دیکھنے سے ہی کسی کے نصیب جاگ سکتے ہیں تو تم بھی ذرا ہوشیار رہنا!"

نجمی نے گھور کر اُسے دیکھا اور خالدہ جلدی سے انڈا چھیلنے لگی کہیں سرقاسم ڈانٹ نہ پلا دیں۔

'سفید محل' واقعی بہت خوبصورت تھا۔ یہ 'بادشاہ صاحب' کی قیام گاہ ہے۔ اِس جگہ کو مرغزار کہتے ہیں اور مرغزار میں سنگِ مرمر سے بنا ہوا یہ خوبصورت محل بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم کبھی بچپن میں پریوں کی کہانیوں میں پڑھا کرتے تھے۔ پریوں کا محل عارضی ہوتا تھا کیونکہ وہ اکثر غائب بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اِسی لئے میں نے مرمر کی سفید کرسیوں کو چھُو کر دیکھا۔ وہ سخت تھیں۔ پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اِس اُمید پر کھولیں کہ شاید اب یہاں جنگل بیابان ہو گا اور میں اکیلی بھٹکتی پھر رہی ہوں گی۔

اُس وقت پہلی نظر نجمی پر پڑی۔ یہ صاحب سیڑھیوں پر بیٹھے میری تصویر لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بولے۔

"ریڈی!"

میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ، پہاڑ ہی پہاڑ اور قدرت کا اتنا بے پایاں حُسن دیکھ کر اتنی مبہوت ہو رہی تھی کہ مُسکرانے کے سوا اور کوئی حرکت نہ کر سکی۔

"ارے بھئی ریشماں! سب چلے گئے۔ پرتھا انتظار کر رہے ہیں اور تم یہاں تنہا

بیٹھی ہو؟"

یہ خالدہ تھی جو حسبِ معمول میری حفاظت کر رہی تھی۔

ہم سب نے چائے پی اور پھر سفید تل پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے ٹکٹ لاؤن میں سوار ہوگئے اور سر سبز اور پُر پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے ہاسٹل جا پہنچے۔

سب لوگ کھانا کھا کر پھر منگورہ چل پڑے۔ آج شاپنگ کا موڈ تھا لیکن میں آج پھر رُک گئی۔

"مِس! میرا موڈ شاپنگ کا نہیں ہے پلیز!"

"تم اکیلے میں ڈر و گی تو نہیں؟" انھوں نے پرس گھماتے ہوئے کہا۔

"نہیں مِس! بالکل نہیں۔ میں یہاں برآمدے کے ستون سے لگ کر نظارہ کروں گی۔ تھک جاؤں گی تو "EMA" پڑھوں گی۔"

"اچھا تو یوں کہو بہن آسٹن جانے نہیں دیتی۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں اور پھر بائی بائی کرتی ہوئی لڑکیوں کو لے کر روانہ ہوگئیں۔

سر قاسم لڑکوں کو نیچے اُترتے دیکھ رہے تھے اور نجمی مجھے آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

سب کے جانے کے بعد میں نے شکر کی سانس لی۔ یکایک مجھے نجمی کا خیال آیا۔ وہ مجھے ساتھ نہ پاکر ضرور دُکھی ہوں گے۔

"نجمی! تم خود ہی سوچو۔ میں اتنے حسین مناظر سے جتنا تنہائی میں لُطف اندوز ہو سکتی ہوں، لوگوں کی موجودگی میں نہیں۔" میں نے دل ہی دل میں نجمی سے معافی مانگ لی اور چمکیلی اور خوبصورت سڑک پر نئے نئے ماڈل کی حسین کاروں کو آگے پیچھے بھاگتے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی اسکول کے ہاسٹل سے لڑکیوں کا کوئی گروپ گزرتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے فضا میں قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے ہوں اور قدرت اپنے تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ مجسّم ہوکر اُتر آئی ہو۔

ہائے اللہ! کتنے پیارے مناظر ہیں۔ کتنا حُسن ہے، کتنا کیف ہے! ——— میں اُس خوبصورت شام کے حُسن میں کھو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر اُس محویت میں گزرتی کہ چاروں طرف جگمگاتے ہوئے بلب نظر آنے لگے۔

لیکن یہ کیا؟ یہ تو وہی کل والا سایہ ہے! ——— لرزاں لرزاں، سہما سہما۔ اُسی طرح احتیاط سے روشیں طے کرتا ہوا ہوسٹل کے چھوٹے دروازے سے نکل کر سبزے کو روندتا ہوا چشمے کی طرف بڑھ رہا ہے ——— میں بھی اُس سائے کے ساتھ چلی۔ وہ نیچے، میں اوپر۔ گیٹ کے رُخ نہیں بلکہ اُس کے بالکل دوسری جانب، باورچی خانے کے اُدھر، وہی سایہ پتّوں کے ڈھیر پر جُھکا۔ چراغ کی لَو تھرتھرائی۔ پھر چراغ کو ٹہنیوں میں چُھپا دیا۔ اور پھر وہ سایہ اُسی راستے سے کالج سے گزر کر غائب ہوگیا۔

خدا نے نظر دی ہاتھی رنگ الٹا اور جیسے دل میں قدرت کے حُسن کا سُرور ناپید ہوگیا۔ بلند و بالا پہاڑ مجھے اپنے بالکل قریب آتے ہوئے محسوس ہوئے اور اونچے اونچے درختوں کے پتوں نے مجھے اپنے میں ڈھانپ لینا چاہا۔ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چُھپا لیا اور سسکیاں لیتی ہوئی کمرے میں لیٹ گئی۔

چھ دن اور راتیں اسی طرح گزر گئے۔ دن میں سوات کا حُسن مجھے مسحور رکھتا اور رات کو وہ سایہ میرے ذہن پر موت کی سوگواری مسلّط کر دیتا۔

یہ کون ہے۔ یہاں ہر روز سورج ڈوبنے پر کیوں آتی ہے پھر آنے کا یہ انداز اتنا سہما سہما کیوں ہے ——— میں اپنے دل سے یہ سوال کرتے کرتے تھک گئی اور کوئی جواب نہ ملا تو خود عقل کا دامن تھام کر ایک شام بندیوں سے نیچے اُتر آئی سب جا چکے تھے۔ شام کا وہی پُر اسرار ماحول تھا۔ ایک طرف ہوسٹل کا خوبصورت صحن، درخت، پودے، اور پھول!

- سارى دُنیا کے درختوں کے قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی تو بھی انسان خدا کی نعمتیں نہیں گِن سکتا۔ (گورو گرنتھ صاحب)
- دوسروں کی خامیاں تلاش کرنے سے پہلے اپنی خامیاں تلاش کرلو۔ (ماتا ریحانہ جی)
- جاہل اور کاہل کسی کامرانی کی اُمید نہ رکھیں۔ (سوامی سارشبدانند جی)
- جو ایشور کے ذکر میں رہتا ہے ایشور اُس کی فکر میں رہتا ہے۔ (سوامی سارشبدانند جی)
- جو لوگ زندگی کو مسلسل محنت اور مشقّت کا عادی بناتے ہیں، سُکھی رہتے ہیں۔ (سوامی سارشبدانند جی)

دوسری طرف کچن، سبزہ اور چشمہ اور وہ سایہ جو اِن چند دنوں میں میری زندگی کی ساری مسرّتوں اور راحتوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اور ایک خلش مجھے دے گیا تھا۔ نامعلوم سی، انجانی سی!

اُسی وقت، جب دن اور رات کا مِلاپ ہوتا ہے اور اندھیروں کی چادر دن کے نُور کو رفتہ رفتہ اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، وہ سایہ نمودار ہوا اور اپنے مرکز کی طرف بڑھنے لگا۔ میں پیچھے چلی اور قریب ہوکر میں نے دیکھا۔ جیسے کوئی کلی بس کِھلتے کِھلتے رہ گئی ہو۔ برف سا سفید چہرہ، سیاہ بال کانوں کے پیچھے جھولتے ہوئے اور آنکھیں جیسے گدلے گدلے پانی میں بڑا سا کنول! صاف شفاف لیکن غم کے گہرے سائے تلے دبی ہوئیں ——— اور جب میں نے پُوچھا۔ تم کون ہو؟ تو وہ بھاگ گئی۔

آج میرا یہاں آخری دن ہے۔ میں کل چلی جاؤں گی۔ اِس اُلجھن کو سُلجھانا ہی

پڑے گا۔

"بتاؤ تم کون ہو؟ بتاؤ نا! ہر روز کیوں آتی ہو؟" میں اُس کے بالکل قریب پہنچ گیا، وہیں، جہاں وہ ہر روز چراغ روشن کرتی تھی۔

"تم پولیس والے ہو؟" اُس نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ میں تو بس ایک لڑکی ہوں تمہاری طرح!"

"تو سُنو ——" اُس نے چاروں طرف احتیاط سے دیکھا کہیں کوئی اور آس پاس تو نہیں، پھر میری طرف جھک کر بولی: "میں نے مار دیا اُسے!"

"کسے؟" میرے دل سے ایک چیخ نکلی۔

"وہی بھورے بھورے بالوں والا بابو۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا نا، اس لئے۔"

"لیکن تم نے اُسے مارا کیوں؟"

"اُسے پورے دو ماہ گزر گئے تھے اور اگر میں اُسے اُس رات نہ مارتی تو وہ صبح کو شہر جا چکا ہوتا۔ میں نے اُس سے کہا۔ بابو رُک جاؤ۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو نا! لیکن وہ بولا نہیں گُل ریز! مجھے اپنا گھر یاد آرہا ہے۔ میں کل ضرور جاؤں گا۔ اور پھر رات کو، جب وہ وہاں بلندیوں پر سو رہا تھا، میں نے اپنے باپ کی پستول سے اُسے ختم کر دیا۔ اب وہ ہمیشہ میرے پاس رہے گا۔ ہمیشہ! میں اسی طرح اُس کی پوجا کرتی رہوں گی۔"

وہ عقیدت سے جھکی، چراغ روشن کیا اور دھیرے دھیرے واپس چلی گئی!!

غزل

سید حباب ترمذی

اُن کی محفل سے جھومتی آئی — زندگی تشنہ لب تھی، پی آئی

جب اُنھیں زیرِ لب ہنسی آئی — رقص میں موجِ زندگی آئی

دل کا آنکھوں نے کتنا ساتھ دیا — اِن دریچوں سے روشنی آئی

ہم نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں — دار پر بھی جنھیں ہنسی آئی

خاک میں جس کی چاند تارے ہیں — رہ روِ شوق وہ گلی آئی

اللہ اللہ لطافتِ جلوہ — رُوح کو جیسے نیند سی آئی

وقت نے میرے ہاتھ کاٹ دئے — جب مرے فن میں پُختگی آئی

مجھ سے رُخصت ہوئی یہ کہہ کے خوشی — ٹھیرئیے آپ، میں ابھی آئی

ہے جُنوں خام ابھی کہ زنداں میں — حال پر اپنے خود ہنسی آئی

نگہِ شوق اُن کی جانب سے — جیسے کچھ بن کے اجنبی آئی

دل پہ گزرا ہے اک وہ عالم بھی — ہر نفس ایک وحی سی آئی

ذکر جب چھڑ گیا مسرت کا — غم کو بے ساختہ ہنسی آئی

میری کشتی حبابؔ ساحل تک

موجِ طوفاں سے کھیلتی آئی

حُسنِ وفا

سلام بن رزاق

مجھے تسلیم، تم سب سے حسیں بلکہ حسیں تر ہو

تمہارا چہرۂ شفاف رشکِ ماہ و انجم ہے

تمہاری مدھ بھری آنکھوں میں میخانوں کی مستی

لبوں پر گنگناتی صبح کا دلکش تبسم ہے

تمہاری خامشی جیسے ہنسی نو خیز کلیوں کی

تمہاری گفتگو گویا بہاروں کا ترنم ہے

مجھے تسلیم، تم سب سے حسیں بلکہ حسیں تر ہو

سیہ گیسو کھلیں تو رات کا ایواں مہک جائے

یہ قامت کی بلندی ہے کہ مہتابی دھڑکتی ہے

یہ مستانہ ادائیں جیسے کوئی بھیرویں گائے

اگر تم زلف جھٹکو تو ستارے ٹوٹ کر برسیں

اگر تم مسکراؤ چاند کیا سورج کو غش آئے

مجھے تسلیم، تم سب سے حسیں بلکہ حسیں تر ہو

تمہارا حسن سر سے پاؤں تک اک مسکراہٹ ہے

سراپا میکدہ ہو، جام ہو، شیشہ ہو، ساغر ہو

خرامِ ناز ہے یا موجِ مے کی تھرتھراہٹ ہے

مجسّم ایک نغمہ ہو، غزل ہو، گیت ہو، لے ہو

اداؤں میں لہکتی ندیوں کی گنگناہٹ ہے

مجھے تسلیم، تم سب سے حسیں بلکہ حسیں تر ہو

پری ہو، اپسرا ہو، حسن کے مندر کی دیوی ہو

مجسّم رنگ و نکہت ہو سراپا نور و نغمہ ہو

سبھی کچھ ہو مگر اتنا بتا دو "باوفا بھی ہو"

افسانہ

پھولوں کی آرزو میں کانٹوں سے جا ملے

نکہت ریحانہ۔ ایم۔ اے

صباحت ہاؤس" سرکٹ ہاؤس روڈ (کیمپ) امراوتی (مہاراشٹر اسٹیٹ)

مشفق و محترم چچا جان! احترام و خلوص

"کلائمکس" اور "ماضی" کے کھنڈر" کی اشاعت پر لندن، بحرین، کویت، زیمبیا (افریقہ) سنگاپور، پاکستان... غرضیکہ ہند و بیرونِ ہند کے ہر گوشے سے اب تک خطوط وصول ہو رہے ہیں۔ مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے کہ ہمارے محبوب صحیفہ" بیسویں صدی" کے پرستار دُنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میری پہلی تخلیق "بیسویں صدی" میں شائع ہوئی ـــــ قارئین کے خطوط میرے لئے مہر و خلوص کے پھول ہیں۔ کبھی سوچتی ہوں ان بے شمار پھولوں کا بوجھ سہار بھی سکوں گی یا نہیں ـــــ تب شدت سے تنگیٔ داماں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ "بیسویں صدی" پابندی سے مل رہا ہے۔ جب کوئی حقیقت سامنے آتی ہے۔ مصروفیات کے باوجود قلم اُٹھ ہی جاتا ہے" پھولوں کی آرزو میں کانٹوں سے جا ملے" ایک تلخ حقیقت ہے۔ اس سے زیادہ افسانے کے بارے میں کیا کہوں۔ آپ کی گرانقدر رائے میرے لئے مشعلِ راہ ہوگی۔ آپ کے خلوص و محبت سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں...

سراپا خلوص آپ کی بھتیجی ـــــ نکہت ریحانہ

"احمر!" زینو بیا نے ہولے سے پکارا۔

"ہوں!" وہ نہ جانے کہاں سے بولا۔

"کتنا سُہانا موسم ہے!" وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

"سُہانے سے تمھاری کیا مُراد ہے؟"

"تم سُہانے کا مطلب نہیں جانتے؟" وہ جل ہی تو گئی۔

"کیوں نہیں" احمر گردن ہلاکر بولا "آخر تمھیں ایسا کیا بھا گیا جو موسم سُہانا نظر آرہا ہے۔ روز ایسی طرح شام ہوتی ہے"

"کیا تمھیں جھرنے کا گیت نہیں سُنائی دے رہا؟ ـــــ وہ دیکھو! سورج نے کائنات پر اپنا سونا نچھاور کر دیا اور شفق نے اس کے چہرے پر سُرخی لگا کر اُس کے حُسن کو دوبالا کر دیا۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے پھولوں سے مہک چُرا کر کس تیزی سے بھاگے جا رہے ہیں۔ کیا تم اس مہک کو اپنی سانسوں میں بسا محسوس نہیں کرتے۔ تھوڑی ہی دیر میں جب سورج اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ کر تمام دریچے بند کر لے گا تب ماہ و انجم اپنی ضیا پاشیوں سے آسمان پر ایک زرنگار چادر تان دیں گے ـــــ دیکھو! وہ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چاند ستاروں کو راستہ دیتے کس سُرعت سے اُسی سمت دَوڑے جا رہے ہیں۔ سبزہ پر بکھرے پھول جیسے سبز آنچل میں کسی حسین دوشیزہ کا چہرہ! رات میں مُسکرانے کے انتظار میں شرمائی لجائی معصوم اَن چھوئی کلیاں۔ شرم سے مُنہ چُھپائے سورج مُکھی اور... اور... وہ... وہ درخت کے سہارے لپٹی عشق پیچاں کی بیل۔ اوہ! احمر! کیا تمھیں اِن میں کوئی حُسن نظر نہیں آتا؟"

"کیوں نہیں زینی! لیکن یہ سب چیزیں صرف محسوس بھی تو کی جا سکتی ہیں۔ الفاظ کا جامہ پہنانے سے اِن کا حُسن ماند پڑ جاتا ہے!!"

زینو بیا پر ماحول کا نشہ پوری طرح اثر کر چُکا تھا۔ وہ بہکنے لگی۔

"نہیں احمر! یہ حُسن لازوال ہے!!"

"لازوال ہے؟" اُس کے لہجے میں طنز تھا۔ "ابھی جب رات کے مہیب سائے گہرے ہو جائیں گے۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ جائے گا۔ تب پھول بھی اندھیرے کی

...جائیں گے۔ نگاہوں کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔"

"احمر! اگر اسے تھوڑی دیر کا حُسن بھی سمجھ لو تو کیوں نہ ہم اِسی ایک لمحہ کے ہو کر رہ جائیں ـــــ آؤ! کائنات کا حُسن چُرا کر مجھے دُلہن بنا دو، چاند کے جھومر سے میری پیشانی سجا دو، میرے آنچل میں ستارے ٹانک دو، بادل کے سُرمئی ٹکڑوں سے کاجل مانگ کر میری آنکھوں میں لگا دو، شفق کی سُرخی میرے ہونٹوں پر لگا دو، ہواؤں سے پھولوں کی مہک چُرا کر میرے جسم میں بسا دو، عشق پیچاں کی اِس بیل کی طرح آؤ ہم بھی ایک دوسرے . . . !!"

اُس کی آواز جذبات کی شدت سے رُندھ سی گئی۔ احمر نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"کاش! تم خوابوں کی دُنیا میں رہنا چھوڑ دو۔ مجھ جیسے حقیقت پسند انسان سے تم ایسی توقع رکھتی ہو؟ میری زینی! یہ سنگھار تمہیں محض شاعری ہے۔ جو تمہارے حُسن میں اضافہ نہیں کر سکتی۔ اِن مصنوعات میں اُلجھ کر تمہارا اچھوتا حُسن ماند پڑ جائے گا۔ جب شفق کی لالی تمہارے یاقوتی ہونٹوں سے اُڑ جائے گی۔ جب یہ کاجل تمہاری آنکھوں کی جھیلوں میں ڈوب کر کہیں کھو جائے گا۔ جب تمہارے ماتھے کا ٹیکہ کہیں گر جائے گا۔ جب اِس زرنگار آنچل سے ستارے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ تب صرف تمہارا حقیقی حُسن ہی باقی رہ جائے گا۔ اِن عارضی چیزوں سے اپنے حُسن کو کیوں داغدار بنانا چاہتی ہو اور پھر تم تو جانتی ہو، میں خوابوں اور خیالوں کی دُنیا کا انسان نہیں ہوں۔ میں زندگی کو اُس کے حقیقی رُوپ میں دیکھتا ہوں۔ اپنے حقیقی حُسن کو اِن لوازم کا مرہونِ منت نہ بناؤ!"

"تم بھی میرے خوابوں پر ایسی کاری ضرب نہ لگاؤ۔ میرے جذبات کو یوں مجروح نہ کرو!"

"میری زندگی میں آنے سے پہلے تمہیں اپنے سُہانے خواب توڑنے پڑیں گے۔"

"ہائے احمر! تم انسان نہیں پتھر ہو!" اُس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ "جذبات کے شیشے پر یہ پتھر اُٹھا کر تمہیں شرم نہیں آتی۔ شہد نہیں دے سکتے تو زہر بھی کیوں پلاتے ہو!"

"ابھی تم میں شہد اور زہر میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی کہاں پیدا ہوئی؟"

"میں تمہیں صرف عاشق کے رُوپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ناصحِ مشفق کے رُوپ میں نہیں۔" اُس کی آواز میں بلا کا طنز تھا۔

"زینی! زمانے کی چکی نے مجھے اِس طرح پیس دیا ہے کہ . . ."

"تمہارا قصور نہیں۔ تم خزاں کے پروردہ بہار کے رنگ کیا جانو۔ میں ہی نادان تھی جو چٹان سے ٹکرا بیٹھی۔ یہ بھی نہ سوچا میرے احساسات کے پھول شعلوں کی اِن لپٹوں کے متحمل ہو سکیں گے یا نہیں۔" وہ اُٹھ کر جانے لگی۔

"پھر کب ملو گی؟"

"ہمارے درمیان خواب اور حقیقت کی دیواریں ہیں۔ جب کبھی تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر خوابوں کی دُنیا میں پناہ لینے کو آؤ گے مجھے منتظر پاؤ گے۔"

"جب ٹوٹے خوابوں کا بوجھ نہ سہار سکو تو میری حقیقتوں کا سہارا لینا نہ بھولنا! میرے دل میں ہمیشہ تمہارے لئے جگہ رہے گی۔ تم کسی رُوپ میں بھی آؤ میرے گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کُھلے رہیں گے۔"

"اُف! کتنی گُھٹن ہے یہاں! تھکن سی محسوس ہونے لگی جُنید! مجھے باہر لے چلو۔"

جُنید اُسے سہارا دے کر باہر لان میں لے آیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ سرد ہوا نے اُسے عجیب سی فرحت بخشی۔ وہ وہیں گھاس پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ جُنید اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔ پھر اُسے دُور جیسے بہت دُور سے جُنید کی آواز سُنائی دی۔

"زینو!"

"ہوں!" وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

"کتنا سُہانا موسم ہے!"

اُس کے کانوں میں جیسے کسی نے شہد ٹپکا دیا۔

"ہاں جُنید! موسم بہت سُہانا ہے۔ جیسے بہار دُلہن بن کر آ گئی ہو!"

"آؤ! میں بھی تمہیں دُلہن بنا دوں، چاند کے جھومر سے تمہاری پیشانی سجا دوں، تمہارے آنچل میں ستارے بھر دوں، لالے سے سُرخی چُرا کر تمہارے ہونٹوں پر لگا دوں، پھولوں کی مہک . . . !"

"اوہ! جُنید۔ یہ تم نے کیا کہا۔ میری جنم جنم کی پیاسی روح کو جیسے آبِ حیات پلا دیا۔ ایک عجیب سا سُرور . . . ایک عجیب سا نشہ . . . کہیں میں بہک نہ جاؤں۔"

"ایسے زہر شکن ماحول میں نہ بہکو تو کفر ہے!"

"ہائے جُنید! تم تو مجھے پاگل بنا دو گے۔"

"زینو!"

"جُنید!"

"زینو! میری زینو!!"

دو جوان دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو گئیں ـــــ رات کے اندھیرے گہرے ہو گئے ـــــ اور . . . اور گناہوں کے پھول مُسکرانے لگے۔

"میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔" زینو بیا نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "مجھے گناہ کے اندھیروں میں دھکیل کر تم اِس طرح دامن بچا کر نہیں جا سکتے!"

گھٹا ٹوپ اندھیرے! یہ راہ تم نے خود اپنائی تھی۔ میں نے تمھیں مجبور نہیں کیا تھا۔ تم چھوٹی بچی تو نہ تھیں کہ . . .

"اگر اس وقت میں بچی نہ تھی تو اب بھی اتنی معصوم بچی نہیں ہوں جو تمھیں اس طرح جانے دوں!"

"کیوں میرے پیروں کی زنجیر بن رہی ہو؟"

"اتنی جلدی بھول گئے یہی زنجیر کبھی تمھارے گلے کا ہار تھی!"

"تب میں اس بات سے بے خبر تھا کہ ایک دن یہی ہار میری گردن کے لئے پھانسی

1 کا پھندا بن جائے گا۔"

"مجھے بھی تمھارے فریب نے زندہ درگور کر دیا۔ لیکن مجھے جہنم کی آگ میں جھونک کر تم بھاگ نہیں سکتے! ان شعلوں سے تم بھی اپنا دامن نہ بچا سکو گے!"

"دنیا کی کوئی طاقت مجھے جرمنی جانے سے نہیں روک سکتی! میرے مستقبل کی راہوں کو کیوں تاریک کرنا چاہتی ہو؟"

"میرے پیار کی شمع تمھاری راہوں کو تاریک کر دے گی؟ کاش! میں جانتی تمھاری محبت اک سراب ہے! ——— کاش! میں نے آحمر کے پیار کی قدر کی ہوتی۔ تو آج یوں راستے کی دھول نہ بنتی!"

"میں آحمر کو بچپن سے جانتا ہوں۔ اس کا سہارا لے لو۔ وہ اس دھول کو پھول بنا دے گا!" اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔

"ہوش بھی کب آیا! جب سب خواب بکھر گئے۔"

"اسی لئے کہہ رہا ہوں۔ بکھرے خوابوں کو سمیٹ نہ سکو تو کسی کا سہارا لے لو۔ جو انھیں اپنی پلکوں پر اٹھا لے۔"

"لیکن یہ خواب میں نے تمھارے ساتھ دیکھے تھے۔ یہ تمھاری ذات سے وابستہ تھے۔"

"بھول جاؤ! بھول جاؤ!! کبھی یاد بھی آؤں تو یہ سوچ کر فراموش کر دینا ؎

زندگی ایک دوراہا ہے جہاں پر اکثر

راہرو ملتے ہیں اور مل کے بچھڑ جاتے ہیں

اور تم جس راہ پر جا رہی ہو وہاں تمھیں کئی جنید مل جائیں گے!!"

"تڑاخ! تڑاخ!!" زوردار آواز آئی۔ جنید اپنا رخسار سہلا کر رہ گیا۔ وہ بل کھائی ناگن کی طرح کمرے سے باہر چلی گئی۔ رات کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ آرزوؤں کی کلیاں مرجھا گئیں۔ حسرتوں کے پھول فریب کی دھوپ میں جلنے لگے۔

اپنی سسکیوں کی آواز میں زینو بیا کو کسی کے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دی۔ وہ اس وقت چونکی جب کسی کے کرخت ہاتھوں کا دباؤ اسے اپنے شانوں پر محسوس ہوا۔

"تم!" وہ متحیر رہ گئی۔ اگلے ہی پل اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ٹوٹے خوابوں کا بوجھ ہلکا کرنے آئے ہونا؟"

"میرے ہوتے تمھارے خواب نہیں ٹوٹ سکتے زینی!"

"میری بربادی کا تماشا دیکھنے آؤ گے، مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔"

"غلط نہ سمجھو زینی!"

"مجھے اپنی شکست کا احساس دلانے آئے ہو؟"

"نہیں زینی! یہ سب نہ سوچو۔ میں تو تمھارے حضور میں ایک مجرم کو پکڑ لایا ہوں۔"

"مجرم؟"

"ہاں! وہ دیکھو وہاں کون کھڑا ہے؟"

"جنید! ——— تم! ——— یہاں! ——— کیوں آئے ہو؟"

"آئے نہیں لائے گئے ہیں۔ اپنے قیدی کو اب ایسی زنجیریں پہنا دو کہ یہ بھاگنے نہ پائے۔ جناب کو ایرپورٹ کی راہ سے اغوا کر لایا ہوں۔ اب تم دونوں ساتھ ہی جاؤ گے۔"

وہ مبہوت سی انھیں تکتی رہ گئی۔

"آپ حیران و پریشان نہ ہو۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے!"

وہ بہت تلخ لہجے میں بولی "ہاں آخر! خواب اور حقیقت کے فرق کو اب خوب سمجھ گئی۔ خواب تو ٹوٹ کر کبھی کے بکھر چکے۔ اب صرف حقیقت ہی حقیقت رہ گئی ہے۔"

جنید نے مجل ہو کر کہا "زیادہ شرمندہ نہ کرو زینو! جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔ دیکھو وقت مستقبل کی خوشیاں لئے ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ اس میں سے اپنے حصے کے پھول چن لو۔ آج سے ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔"

"آج بلکہ ابھی سے میں نے بھی ایک نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

وہ طنز آمیز لہجے میں ہنس پڑی۔

"جنید! میں تمہارے پیروں کی زنجیر بننا نہیں چاہتی۔ نہ تمہاری گردن میں پھانسی کا پھندا بن کر لٹکنا چاہتی ہوں۔ مجھے ہر گام پر سجدہ کرنے والے جنید نہیں چاہئیں۔ بقول تمہارے ایسے جنید تجھے پہلی، ہر لمحہ مل سکتے ہیں تم نہ سہی اور سہی۔ اب تو مجھے ایسے احمد کی ضرورت ہے جس کی نظیر ڈھونڈے سے نہ ملے جو میرا آنچل پھولوں سے بھر کر میری راہ کے تمام کانٹے چن لے ——— جو مجھے ایک بار اپنانے کے بعد پھر کسی جنید کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے!"

"زینو! تم اس وقت بے حد جذباتی ہو رہی ہو لیکن ...!" جنید نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"نہیں جنید! اب کچھ نہ کہو، کچھ نہ سمجھو۔ جاؤ۔ ہندوستان سے باہر جنت کے نظارے تمہارے منتظر ہیں!" ——— ابھی پلین روانہ ہونے میں کافی دیر ہے۔ جلد نکلو تو تو با آسانی ایرپورٹ پہنچ سکتے ہو۔ بھولے سے کبھی میرا خیال آجائے تو سمجھ لینا زندگی کے دوراہے پر دو راہی ملے اور مل کے بچھڑ گئے!!"

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔



غزلیں

طاہر تلہری

ہائے اُس بنتِ ماہتاب کا رنگ   چاندنی رات میں شراب کا رنگ
کچھ حیا اور کچھ شباب کا رنگ   جیسے دو آتشہ شراب کا رنگ
یوں ہے اُس آنکھ میں حجاب کا رنگ   جھیل میں جیسے ماہتاب کا رنگ
نغمہ و نکہت و شراب کا رنگ   ہائے اُس شوخ کے شباب کا رنگ
میں تو شکوہ گزارِ دنیا تھا   اُڑ گیا کس لیے جناب کا رنگ
اُس کی دوشیزگی کو کیا کہیئے   جیسے اک بے پڑھی کتاب کا رنگ
بند ہوتا ہو جیسے میخانہ   ہائے اُس چشمِ نیم خواب کا رنگ
اور کچھ بڑھ گیا حجاب اُس کا   اور گہرا ہوا شراب کا رنگ
اللہ اللہ اُس کی انگڑائی   جیسے اُمنڈے ہوئے سحاب کا رنگ

یوں ہے ماضی کی یاد اے طاہر
جیسے پچھلے پہر کے خواب کا رنگ

غزل — اشفاق شاہجہانپوری

موسمِ گُل تو کبھی دورِ خزاں آج بھی ہے   جیسا پہلے تھا وہی رنگِ جہاں آج بھی ہے
بزم میں وہ مسرت تھا جو آہنگِ رباب   وہی آہنگ بہ اندازِ فغاں آج بھی ہے
جانتے ہیں کہ ہے یہ ٹوٹنے والی اِک چیز   قدرِ شیشہ مگر اے شیشہ گراں آج بھی ہے
ایک مدت سے یہ سرگرمِ سفر ہے لیکن   راہ میں قافلۂ راہ رواں آج بھی ہے
ہائے یہ زیست کہ سمجھے تھے جسے پیکرِ گُل   کل بھی تھی بارِ گراں۔ بارِ گراں آج بھی ہے
اجنبی آپ سمجھتے رہے پہلے بھی مجھے   میرا افسانہ حدیثِ دگراں آج بھی ہے
ایک مدت ہوئی گو جل بھی چکا بجھ بھی گیا   دل میں سُلگن ہے ابھی دل میں دھواں آج بھی ہے
بادۂ ناب سے لبریز رہے جام تو کیا   شدتِ تشنگیٔ تشنہ لباں آج بھی ہے
نگہِ ناز ہوئی تھی کبھی مائل بہ کرم   دُھندلا دُھندلا سا مرے دل میں نشاں آج بھی ہے

حُسن سرگرمِ تقاضا ہے غزالہ اب بھی
دلِ شوریدہ متاعِ دِگراں آج بھی ہے

سعید الدین حسن ذوق کیفی

جو کچھ بھی میں نے عشق میں ہارا ہے دوستو   اِس میں کچھ آپ کا بھی اشارا ہے دوستو
ہر ہر قدم پہ تم نے فریبِ وفا دیا   پھر بھی تمھارا ساتھ گوارا ہے دوستو
برہم ہے ہم سے آج بھی وہ زلفِ پُر شکن   جس کو تمام عمر سنوارا ہے دوستو
وہ جانِ زندگی ہی سہی تم اگر کہو   ترکِ تعلقات گوارا ہے دوستو
تم اپنے دامنوں کو بچاتے ہوئے رہو   میرا ہر ایک اشک شرارا ہے دوستو
طوفاں کی شورشیں ہیں کوئی ناخدا نہیں   حدِ نظر سے دور کنارا ہے دوستو
تم ساتھ دے سکو جو مرا راہِ شوق میں   ہر تلخیٔ حیات گوارا ہے دوستو
کیوں اِس قدر ہے تم کو تمنائے زندگی   مجھ کو تو زندگی ہی نے مارا ہے دوستو
کیوں ڈگمگا رہی ہے مری کشتیٔ حیات   ساحل سے کس نے مجھ کو پُکارا ہے دوستو

یہ اور بات ہے کہ نہ ہو تم کو اعتبار
ہر حال میں یہ ذوقؔ تمھارا ہے دوستو

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

افسانہ لکھ رہی ہوں	خوشی بانو ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل ادیب	دو روپے
آگ اور دھواں	مسز مہر النساء ایم اے	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
داماد		دو روپے ۲۵ نئے پیسے
بگل	〃	تین روپے ۵ نئے پیسے
بے غیرت	مصطفیٰ ہاشمی	چار روپے ۲۵ 〃
باون پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ 〃
پہلی لڑکی	[illegible] ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انورہ	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ 〃
[illegible]	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ 〃
ستم	〃	چار روپے ۵۰ 〃
گھائل	〃	تین روپے ۹۵ 〃
ظالم	[illegible]	دو روپے ۵۰ 〃
[illegible]	اختر عادل ادیب	تین روپے ۵۰ 〃
[illegible]	[illegible] مرادآبادی	چار روپے
چوٹ	[illegible]	تین روپے ۵ نئے پیسے
[illegible]	〃	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
[illegible]	بیگم تنویر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ 〃
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
[illegible]	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ 〃
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	[illegible]	چھ روپے
برہمن	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
[illegible]	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ 〃
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ 〃
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گذر	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظر کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
[illegible]	جہاں دار افسر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	〃	دو روپے ۵۰ 〃
رادھا الزبتھ	〃	دو روپے ۵۰ 〃
پاپی	〃	چار روپے
سونا گاچھی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
طوفانوں کی کہانی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
جوار بھاٹا	〃	چار روپے ۵۰ 〃

قیامت	زکی انور	دو روپے [illegible]
سازش	〃	دو روپے ۵۰ 〃
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گمراہ	قیسی رامپوری	چار روپے [illegible]
ناگ دیوتا	مخمور جالندھری	دو روپے ۵۰ 〃
خون کے چھینٹے	〃	دو روپے ۵۰ 〃
خوابگاہ میں	〃	تین روپے ۵۰ 〃
فراق	[illegible] بھارتی	تین روپے ۵۰ 〃
پیاسا	〃	تین روپے ۵۰ 〃
پراسرار رقاصہ	〃	دو روپے
پراسرار قاتل	〃	دو روپے
پیاس	کے۔ ایل [illegible] بی اے	تین روپے ۵۰ 〃
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی کی ترجمہ نریش کمار شاد	ایک روپیہ ۷۵ 〃
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۷۵ 〃
جی ہاں چھپے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ 〃
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ 〃
[illegible]	اوم پرکاش [illegible]	[illegible] روپے ۵۰ 〃
خاموش نغمہ		چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال	[illegible]	[illegible]
تلخیاں (کلام)	ساحر	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
پرچھائیاں	[illegible]	[illegible] ۲۵
انسانیت موت کے دروازے پر	[illegible]	[illegible] ۵۰
کیٹلاگ سازی	[illegible]	[illegible] ۵۰

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

اِک شامِ حسیں

اخترِ عابد نوگانوی

گمیر مناف۔ امروہہ

محبتی! ہدیۂ خلوص

. . . میرے دل کے تہی دامن میں صرف چند الفاظ ہی ہیں جو آپ کے محبت بھرے دل کی نذر کر رہا ہوں! اور ساتھ ہی ایک افسانہ "اِک شامِ حسیں" ارسالِ خدمت ہے۔ یہ افسانہ اس دور کے نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے دلوں کی ترجمانی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ رائے گرامی سے جلد نوازئیے گا ۔۔۔ آپ کی محبت کا ہمیشہ طلب گار . . .

آپ کا خلوص کار ۔۔۔۔۔ عابد

شام حسین کب معلوم ہوتی ہے؟

یہ مجھے آج پہلی بار احساس ہوا ہے کہ شاعروں نے شام کی اتنی تعریف کیوں کی ہے؟ کہیں سہانی شام کہا ہے، کہیں کسی مہ جبیں کے چہرے سے تشبیہ دی ہے کہیں شام کے آنچل میں نکہتیں بھر دی ہیں۔ غرض کہ پروازِ تخیل نے جو بھی تلاش کیا وہی نام دے دیا۔

آج میں بھی اس شام کو کوئی نام دینا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی شام کے لئے نہیں سوچا تھا کہ وہ سہانی اور حسین کیوں ہوتی ہے۔ میں تو ہر شام کو اِک مفلس کی جوانی کی طرح سمجھتا تھا۔ جس کے لئے کوئی نہیں سوچتا۔ جس کے دل سے اٹھتا ہوا دھواں کوئی نہیں دیکھتا۔ یا اکثر یہ شعر جو کسی سے سُن لیا تھا، دُہرایا کرتا ہے

گرمیٔ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

لیکن یہ شام مجھے پہلی بار سہانی معلوم ہو رہی ہے۔ اس کے دامن میں رعنائیاں نظر آ رہی ہیں۔ یوں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اس کے سُرمئی آنچل سے جلوے پھوٹ رہے ہیں اور میری افسردہ رُوح کو توانائی بخش رہے ہیں۔

یہ شام مجھے حُسنِ مجسّم کی پرچھائیں معلوم ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس پرچھائیں میں کھو جاؤں اور ماضی کی اُن تلخ یادوں کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤں جنھوں نے میری ہر صبح، ہر شام اور ہر رات کے سینے میں زہریلی گیس سی بھر دی تھی۔ میری سانسوں میں تعفن بھر دیا تھا۔

میں اُس وقت کا دامن چھوڑ دینا چاہتا ہوں جس نے میرے سہارے چھین لئے ہیں، غموں کے بحرِ بیکراں میں غرق کر دیا ہے، وہ زندگی دی ہے جو مجھے کئی بار خودکشی کر لینے پر مجبور کر چکی ہے۔

آج میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔

کسی فہمیدہ کو یاد کرنا نہیں چاہتا۔ ایسی فہمیدہ کو جس کے دل میں آرزوؤں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایک طوفان سا تھا۔ جو چاہتی تھی کہ میرے پاس ایک عالیشان مکان ہو۔ عیش و طرب کا ہر وہ سامان ہو جو اس کی رُوح کو ہمیشہ تازہ رکھے لیکن میں اُسے اپنی سادگی اور غریبی کے سوا کچھ نہ دے سکتا تھا۔

میں کسی زینبی کو بھی یاد کرنا نہیں چاہتا۔ اُس زینبی کو جو بدصورت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سیم و زر کا مجسمہ بنا کر دُنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی تھی جسے کاغذی سکّوں کے ڈھیر کی تلاش تھی۔ لیکن میں ایک معمولی انسان تھا۔ اب بھی وہی ہوں۔ ایک ہی مزدور ہے ۔۔۔ اور جس کی زندگی مشین بن کر رہ گئی ہے۔ کیونکہ ہر وقت مشینوں سے رابطہ ہے۔ انھیں کو کبھی کبھی محبوبہ یا رفیقِ حیات تصوّر کر لیتا ہوں میں ایک کلاتھ مِل میں مکینک ہوں۔ عام زبان میں مستری ہوں۔ ہائی اسکول کر لینے کے بعد اسی پیشے کو مجبوراً اپنانا پڑا۔ اب یہی "پیشہ" زندگی بن گیا ہے۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مشین ہی نے مجھے جنم دیا تھا۔ معمولی تنخواہ ملتی ہے جس کی وجہ سے بہت سی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیتا ہوں۔ میری زندگی نغمہ نہیں بن سکتی تھی اس لئے میں کسی کو اپنا نہ بنا سکا۔

کسی کو میرے کپڑوں پر لگے تیل کے داغ پسند نہیں، کسی کو میرا قد بُرا لگتا ہے، کسی کو میرا چیچک زدہ اور کالا چہرہ، اس پر اُگی ہوئی سیاہ داڑھی، جسے بہت کم صاف کرنے کی فرصت ملتی ہے اور بکھرے ہوئے بال جن میں کبھی تیل نظر نہیں آتا۔ یہ تمام کوئی مہلک بیماری معلوم ہوتے ہیں اور کوئی مجھے یوں اپنا بنانا نہیں چاہتی کہ میرا حال تاریک ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن مشین میں آکر میرے ہاتھ کٹ جائیں اور میں اس قابل نہ رہوں کہ کسی کے مستقبل میں روشنی کا چراغ بھی جلا سکوں۔

لیکن آج میں اپنی اُس زندگی کو بھول جانا چاہتا ہوں جس سے خاندانی روایات وابستہ ہیں اور اِرد گرد رسم و رواج کی دیواریں کھڑی ہیں۔ اُن روایات کو دفن کر دینا چاہتا ہوں، اُن دیواروں کو گرا دینا چاہتا ہوں۔ یہ سوچ کر ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ میں سالہاسال سے مقید تھا اور اب آزاد ہو گیا ہوں، مہکتی فضا میں سانسیں لے رہا ہوں۔

- سچی بات غور سے سنو۔ کہنے والا کوئی ہو۔ غوطہ زن کی بُرائی بھلائی سے موتی کی اصلیت میں فرق نہیں پڑتا۔ سچی بات سُننا اور سچی بات کہنا یہی عبادت ہے۔ (سقراط)
- موت کے وقت توبہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے عین جنگ کے وقت تلوار سنبھالی جائے۔ (ایک مشرقی مفکر)
- رات کے غیر متناہی سکون میں ہم اِس طرح پڑے رہتے ہیں جیسے ریگستان میں کوئی نقشِ قدم! (خلیل جبران)
- دشمن سے صلح کر لو، یہی بہتر ہے، چاہے تمہیں اپنی قوت و اقتدار پر پُورا پُورا اعتماد ہو۔ (جالینوس)

یہ رات بھی حسین ہے۔ خوشیوں کی شمع اندھیروں کے سینے پر جل رہی ہے۔ اِس کی روشنی میں کائنات کی ہر شے مسکرا رہی ہے۔ میں بھی مسکرا رہا ہوں۔ تنہائیاں مسکرا رہی ہیں۔ وہ در و دیوار مسکرا رہے ہیں جو ایک مدت سے میری روتی سسکتی جوانی پر سوگوار تھے اور اُن سب کے ساتھ فردوس مسکرا رہی ہے۔

فردوس اچانک مجھے ایک موڑ پر مل گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا دو موڑ باہم مل گئے ہوں۔ میں حسبِ معمول اپنی منزل کی جانب قدم اُٹھا رہا تھا۔ تصورات میں صرف مل کی مشینیں، اُن کی بے ہنگم آوازیں تھیں اور اِرد گرد مشینوں کی طرح چلتے پھرتے انسان تھے۔ جن سے مجھے کوئی ربط نہ تھا۔ ہوتا بھی کیوں؟ میں بھی تو اِسی دُنیا کا انسان ہوں جس کے دامن میں اب خود غرضی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

یکایک غیر مانوس آواز کانوں میں آئی۔

"جلدی چلو مُنّو! ورنہ وہ ہم سے دُور نکل جائے گا۔"

ایک لمحہ کے لئے میں ٹھٹکا لیکن قدم اُسی طرح اُٹھتے رہے۔ یہ سوچ کر کہ شاید کسی اور سے کوئی مخاطب ہو گا۔

لیکن آواز پھر آئی۔

"سُنئے!"

میں چونکا۔ آواز میرے بہت قریب سے آئی تھی اور کانوں کو خوشگوار معلوم ہوئی تھی۔ میں ٹھہر گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی میرے نزدیک تھی۔ سانولا چہرہ، جھکی جھکی پلکیں اور ہلکے تبسم کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھی۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ نہ ہونے والی بات ہو رہی تھی۔ میں ایمان لے آیا کہ آج کی اِس دُنیا میں نہ ہونے والی بات بھی ہو سکتی ہے۔

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟" میں نے اپنے یقین کو تقویت دینے کی کوشش کی۔

"جی!" اُس نے شہد آفریں انداز سے کہا۔

"کہئے ــــــ" میں نے اُس کے ساتھ والے لڑکے کو دیکھا جس کی عمر تقریباً دس سال ہو گی۔ خیال ہوا، شاید کچھ سوال کرے گی۔ جسے میں پورا نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ میری جیب میں چار مینار کی سگریٹ کی ایک ڈبیا اور ماچس کے سوا کچھ نہ تھا۔ خلافِ توقع اُس نے کہا۔

"آپ مل میں کام کرتے ہیں؟" اُس کی آواز دل کو چھو لینے والی مٹھاس تھی۔

"ہاں یہ بات کسی سے چھپی نہیں ہے۔ میں مشینیں چلاتا ہوں" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"میں بھی مل جا رہی ہوں"

"اچھا ہے چلئے" میں نے قدم بڑھا دئے۔ وہ بھی میرے ساتھ چلنے لگی اُسی درمیان بولی۔

"میں مل میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں"

"بہت خوشی کی بات ہے۔ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔" میں نے اپنی رَو میں کہا۔

"آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

"کس طرح کی مدد چاہتی ہو؟" میں نے اُس کے چہرے کو گھورا۔

"لیڈیز اسٹاف میں کئی جگہیں خالی ہیں جن کے لئے اخباروں میں اشتہار بھی شائع ہو چکا ہے۔ منیجر سے آپ کی جان پہچان ہے۔ اگر سفارش کر دیں تو مہربانی ہو گی"

"ہاں منیجر سے میری اِتنی ہی جان پہچان ہے کہ میں اُس کے کام آجاتا ہوں لیکن

تم کیا کام کرانا چاہتی ہو؟"

"میں نے ٹائپسٹ کی جگہ کے لئے درخواست دی تھی۔ آج مجھے بلایا گیا ہے۔ مجھے بارے میں ایک شخص نے مجھے بہت کچھ بتایا تھا اس لئے۔۔" اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کسی نے بتایا ہوگا کہ میں منیجر کا بے دام غلام ہوں۔ وہ میری سفارش مان سکتا ہے۔" یہ کہہ کر چند لمحوں تک میں نے سوچا۔ اُس کے بعد پوچھا۔

"تم کس جگہ رہتی ہو؟"

"ذکریا اسٹریٹ۔"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے پھر کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی ذکریا اسٹریٹ ہی رہتے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن چلتے چلتے اُسے مڑ کر دیکھ لیتا۔ مل پہنچنے کے بعد میں سیدھا منیجر کے کمرے میں چلا گیا اور جو بات نہ ہونے والی تھی وہ ہو گئی۔ منیجر نے جس لڑکی کے لئے جگہ تجویز کر لی تھی میرے کہنے سے اُسے کینسل کر دی اور اُسے وہ جگہ مل گئی۔ ایک دل ٹوٹ گیا۔ ایک شاد ہو گیا۔ فردوس نے اپنی مسکراہٹوں کے پھول میرے قدموں میں بکھیر دیئے اور میں اُنھیں چننے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

اور یہ شام میں نے فردوس کے ساتھ گزاری ہے۔ اُس کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ بے سہارا ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے۔ ایک بوڑھی نانی ہے جو افلاس کے اندھیرے میں سسکتی رہتی ہے۔ لیکن فردوس اُس اندھیرے کو اپنے دل کی روشنی دینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ وہ اِس سے پہلے بھی کہیں ملازمت کرتی تھی لیکن کسی مجبوری کے باعث وہ ملازمت اُسے چھوڑنی پڑی۔ اِس لئے دوسری ملازمت کی تلاش تھی۔ اُسے صرف ملازمت ہی کی تلاش نہ تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ایسے ساتھی کی تلاش بھی رہی ہے جو ہمیشہ کے لئے اُس کا دامن تھام لے۔ اپنی مضبوط بانہوں کا سہارا دے۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی یاس کی پرچھائیاں کہتی ہیں وہ ساتھی تلاش کرنے میں ابھی تک ناکام رہی ہے۔

اور یہ شام ـــــ میں نے فردوس کے گھر پر گزاری ہے۔ جہاں وہ رہتی ہے میرے نزدیک گھر نہیں کال کوٹھری ہے۔ جس میں بھولے سے بھی شاید ٹھنڈی ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ سوگوار دیواریں، اشک برساتی ہوئی چھت۔ جس پر انسانوں سے زیادہ مکڑیوں کا قبضہ معلوم ہوتا ہے۔ اُسے فردوس گھر کہتی ہے۔ اُس میں مسکراہٹیں بکھیرتی ہے۔ سانسیں لیتی ہے۔ اُسی کے اندھیرے میں بوڑھی نانی آہیں بھرتی ہے ـــــ لیکن اُس وقت مجھے وہ کال کوٹھری بھی اچھی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ فردوس کی مسکراہٹیں میرے لئے بکھر رہی تھیں اور اُس کی نانی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر ایسی روشنی پھیل گئی تھی جس میں اپنائیت کی خنکی محسوس ہوئی ہے۔ میں نے چاہا اُس خنکی کو سمیٹ کر اپنے سینے میں بھر لوں تاکہ سلگتے ہوئے دل کو سکون مل جائے۔ کچھ دیر تک میں ایسا ہی محسوس کرتا رہا کہ رُوح تازہ ہو گئی ہے اور وقت کی گردش نے ایک نئی کروٹ لے لی ہے۔

میں نے کتنے ہی تصورات کے محل بنا ڈالے ہیں۔ دل سے دل کا سودا کر لیا ہے۔ کتنی ہی بار فردوس کی نگاہیں مجھے محبت بھرا پیام دے چکی ہیں۔ کتنی ہی بار اُس نے میری تنہائی کے ویرانے میں اپنی محبت کے پھول کھلائے ہیں ـــــ آج فردوس کی نانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

"بیٹا شکیل! میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ فردوس کی فکر ہے۔ اُس نے میرے بڑھاپے کا بہت ساتھ دیا ہے۔ اِس کے لئے تم سے اچھا ساتھی اور کون مل سکتا ہے۔"

- عقلمند ہمیشہ اپنی معتدل چال چلتا ہے لیکن احمق ہر وقت اور ہر حال میں مکر و تزویر کا دام بچھانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ (بیکن)
- بزدل بار بار مرتا ہے اور بہادر صرف ایک بار موت کا مزہ چکھتا ہے۔ (شیکسپیر)
- قوتِ حیات کی کمی دُنیا کے بہت سے مصائب و آلام تجربوں اور ناکامیوں کا سبب ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- یہ ہماری نہیں، دوسروں کی آنکھیں ہیں، جو ہمیں مبتلائے رنج و حسرت رکھتی ہیں۔ اگر میرے سوا سب اندھے ہوتے تو کبھی مجھے عمدہ لباس اور آسائشی چیزوں کی ضرورت نہ ہوتی۔ (فرینکلن)

میری عجیب کیفیت ہو گئی ہے۔ دل سینے میں مچلنے لگا۔ سوئی ہوئی آرزو کروٹ لینے لگی اور فردوس کی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔ شکو مجھے حیرت سے دیکھ رہا ہے پھر پوچھا ہے۔

"شکیل بھائی! آپا کو آج کیا ہو گیا ہے۔ چور سی کیوں بن گئی ہیں؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا ہے لیکن بوڑھی نانی نے اپنی بات شروع کر دی ہے۔

"بیٹا! میں آج تمھیں کچھ اور بھی بتانا چاہتی ہوں۔ فردوس بہت غمزدہ ہے۔ ماں باپ نے ساتھ چھوڑا تو بے سہارا ہو گئی۔ میں اِس کی سگی نانی نہیں ہوں۔ میں نے تو ترس کھا کر ان دونوں کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میرے بڑھاپے کو بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن فردوس نے مجھے سگی نانی سے کبھی کم نہیں سمجھا۔ میں بھیک مانگ کر پیٹ کی آگ بجھاتی تھی۔

کسی کو میرے کپڑوں پر لگے تیل کے داغ پسند نہیں، کسی کو میرا قد بُرا لگتا ہے، کسی کو میرا چیچک زدہ اور کالا چہرہ، اس پر اُگی ہوئی سیاہ داڑھی، جسے بہت کم صاف کرنے کی فرصت ملتی ہے اور بکھرے ہوئے بال جن میں کبھی تیل نظر نہیں آتا۔ یہ تمام کوئی مہلک بیماری معلوم ہوتے ہیں اور کوئی مجھے یوں اپنا بنانا نہیں چاہتی کہ میرا حال تاریک ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن مشین میں آکر میرے ہاتھ کٹ جائیں اور میں اس قابل نہ رہوں کہ کسی کے مستقبل میں روشنی کا چراغ بھی جلا سکوں۔

لیکن آج میں اپنی اُس زندگی کو بھول جانا چاہتا ہوں جس سے خاندانی روایات وابستہ ہیں اور اردگرد رسم و رواج کی دیواریں کھڑی ہیں۔ اُن روایات کو دفن کر دینا چاہتا ہوں، اُن دیواروں کو ڈھا دینا چاہتا ہوں۔ یہ سوچ کر ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ میں سالہا سال سے مقید تھا اور اب آزاد ہو گیا ہوں، مہکتی فضا میں سانسیں لے رہا ہوں۔

- سچی بات غور سے سنو۔ کہنے والا کوئی ہو۔ غوطہ زن کی بُرائی بھلائی سے موتی کی اصلیت میں فرق نہیں پڑتا۔ سچی بات سُننا اور سچی بات کہنا بھی عبادت ہے۔ (سقراط)
- موت کے وقت توبہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے عین جنگ کے وقت تلوار سنبھالی جائے۔ (ایک مشرقی مفکر)
- رات کے غیر متناہی سکوت میں ہم اِس طرح پڑے رہتے ہیں جیسے ریگستان میں کوئی نقشِ قدم! (خلیل جبران)
- دشمن سے صلح کر لو، یہی بہتر ہے، چاہے تمہیں اپنی قوت و اقتدار پہ پورا پورا اعتماد ہو۔ (جالینوس)

یہ رات بھی حسین ہے۔ خوشیوں کی شمع اندھیروں کے سینے پر جل رہی ہے۔ اِس کی روشنی میں کائنات کی ہر شے مُسکرا رہی ہے۔ میں بھی مُسکرا رہا ہوں۔ تنہائیاں مُسکرا رہی ہیں۔ وہ در و دیوار مُسکرا رہے ہیں جو ایک مُدّت سے میری روتی سِسکتی جوانی پر سوگوار تھے اور اُن سب کے ساتھ فردوس مُسکرا رہی ہے۔

فردوس اچانک مجھے ایک موڑ پر مِل گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا دو موڑ باہم مِل گئے ہوں۔ میں حسبِ معمول اپنی منزل کی جانب قدم اُٹھا رہا تھا۔ تصوّرات میں صرف مِل کی مشینیں، اُن کی بے ہنگم آوازیں تھیں اور اِردگرد مشینوں کی طرح چلتے پھرتے انسان تھے۔ جن سے مجھے کوئی ربط نہ تھا۔ ہوتا بھی کیوں؟ میں بھی تو اسی دُنیا کا انسان ہوں جس کے دامن میں اب خودغرضی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

یکایک غیر مانوس آواز کانوں میں آئی

"جلدی چلو سُنو! ورنہ وہ ہم سے دُور نکل جائے گا۔"

ایک لمحہ کے لئے میں ٹھٹکا لیکن قدم اُسی طرح اُٹھتے رہے۔ یہ سوچ کر کہ شاید کسی اور سے کوئی مخاطب ہوگا۔

لیکن آواز پھر آئی۔

"سُنیئے!"

میں چونکا۔ آواز میرے بہت قریب سے آئی تھی اور کانوں کو خوشگوار معلوم ہوئی تھی۔ میں ٹھہر گیا۔ مُڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی میرے نزدیک تھی۔ سانولا چہرہ، جھکی جھکی پلکیں اور ہلکے تبسم کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھی۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ نہ ہونے والی بات ہو رہی تھی۔ میں ایمان لے آیا کہ آج کی اِس دُنیا میں نہ ہونے والی بات بھی ہو سکتی ہے۔

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟" میں نے اپنے یقین کو تقویت دینے کی کوشش کی۔

"جی!" اُس نے شہد آفریں انداز سے کہا۔

"کہئیے ——" میں نے اُس کے ساتھ والے لڑکے کو دیکھا جس کی عمر تقریباً دس سال ہوگی۔ خیال ہوا، شاید کچھ سوال کرے گی۔ جسے میں پورا نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ میری جیب میں چارمینار کی سگریٹ کی ایک ڈبیا اور ماچس کے سوا کچھ نہ تھا۔ خلافِ توقع اُس نے کہا۔

"آپ مِل میں کام کرتے ہیں؟" اُس کی آواز دل کو چھو لینے والی مٹھاس تھی۔

"ہاں یہ بات کسی سے چھپی نہیں ہے۔ میں مشینیں چلاتا ہوں" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"میں بھی مِل جا رہی ہوں۔"

"اچھا ہے چلئے۔" میں نے قدم بڑھا دئیے۔ وہ بھی میرے ساتھ چلنے لگی۔ اُسی درمیان بولی۔

"میں مِل میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔"

"بہت خوشی کی بات ہے۔ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ میں نے اپنی رو میں کہا۔

"آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

"کس طرح کی مدد چاہتی ہو؟" میں نے اُس کے چہرے کو گھورا۔

"لیڈیز اسٹاف میں کئی جگہیں خالی ہیں جن کے لئے اخباروں میں اشتہار بھی شائع ہو چکا ہے۔ منیجر سے آپ کی جان پہچان ہے۔ اگر سفارش کر دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"ہاں منیجر سے میری اتنی ہی جان پہچان ہے کہ میں اُس کے کام آجاتا ہوں۔ لیکن

تم کیا کام کرانا چاہتی ہو؟"

"میں نے ٹائپسٹ کی جگہ کے لئے درخواست دی تھی۔ آج مجھے بلایا گیا ہے۔ آپ کے بارے میں ایک شخص نے مجھے بہت کچھ بتایا تھا اس لئے..." اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کسی نے بتایا ہوگا کہ میں منیجر کا بے دام غلام ہوں۔ وہ میری سفارش مان سکتا ہے" یہ کہہ کر چند لمحوں تک میں نے سوچا۔ اُس کے بعد پُوچھا۔

"تم کس جگہ رہتی ہو؟"

"ذکریا اسٹریٹ"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے پھر کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی ذکریا اسٹریٹ ہی رہتے ہیں"

میں خاموش ہوگیا۔ لیکن چلتے چلتے اُسے غور دیکھ لیتا۔ مِل پہنچنے کے بعد میں سیدھا منیجر کے کمرے میں چلا گیا اور جو بات نہ ہونے والی تھی وہ ہوگئی۔ منیجر نے جس لڑکی کے لئے جگہ تجویز کر لی تھی میرے کہنے سے اُسے کینسل کر دی اور اُسے وہ جگہ مل گئی۔ ایک دل ٹوٹ گیا۔ ایک شاد ہوگیا۔ فردوس نے اپنی مُسکراہٹوں کے پھول میرے قدموں میں بکھیر دیئے اور میں انھیں چُننے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

اور یہ شام میں نے فردوس کے ساتھ گزاری ہے۔ اُس کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے کہ وہ بے سہارا ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے۔ ایک بوڑھی نانی ہے جو افلاس کے اندھیرے میں سسکتی رہتی ہے۔ لیکن فردوس اُس اندھیرے کو اپنے دل کی روشنی دینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ وہ اِس سے پہلے بھی کہیں ملازمت کرتی تھی لیکن کسی مجبوری کے باعث وہ ملازمت اُسے چھوڑنی پڑی۔ اِس لئے دوسری ملازمت کی تلاش تھی۔ اُسے صرف ملازمت ہی کی تلاش نہ تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ایسے ساتھی کی تلاش بھی رہی ہے جو ہمیشہ کے لئے اُس کا دامن تھام لے۔ اپنی مضبوط بانہوں کا سہارا دے۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی یاس کی پرچھائیاں کہتی ہیں وہ ساتھی تلاش کرنے میں ابھی تک ناکام رہی ہے۔

اور یہ شام ـــــ میں نے فردوس کے گھر پر گزاری ہے۔ جہاں وہ رہتی ہے میرے نزدیک گھر نہیں کال کوٹھری ہے۔ جس میں بھُولے سے بھی شاید ٹھنڈی ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ سوگوار دیواریں، اشک برساتی ہوئی چھت۔ جس پر انسانوں سے زیادہ مکڑیوں کا قبضہ معلوم ہوتا ہے۔ اُسے فردوس گھر کہتی ہے۔ اُس میں مُسکراہٹیں بکھیرتی ہے۔ سانسیں لیتی ہے۔ اُسی کے اندھیرے میں بُوڑھی نانی آہیں بھرتی ہے ـــــ لیکن اُس وقت مجھے وہ کال کوٹھری بھی اچھی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ فردوس کی مُسکراہٹیں میرے لئے بکھر رہی تھیں اور اُس کی نانی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر ایسی روشنی پھیل گئی تھی جس میں اپنائیت کی خنکی محسوس ہوئی ہے۔ میں نے چاہا اُس خنکی کو سمیٹ کر اپنے سینے میں بھر لوں تاکہ سُلگتے ہوئے دل کو سکون مل جائے۔ کچھ دیر تک میں ایسا ہی محسوس کرتا رہا کہ رُوح تازہ ہوگئی ہے اور وقت کی گردش نے ایک نئی کروٹ لے لی ہے۔

میں نے کتنے ہی تصوّرات کے محل بنا ڈالے ہیں۔ دل سے دل کا سودا کر لیا ہے۔ کتنی ہی بار فردوس کی نگاہیں مجھے محبت بھرا پیام دے چکی ہیں۔ کتنی ہی بار اُس نے میری تنہائی کے ویرانے میں اپنی محبت کے پھُول کھِلائے ہیں ـــــ آج فردوس کی نانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

"بیٹا شکیل! میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ فردوس کی فکر ہے۔ اُس نے میرے بڑھاپے کا بہت ساتھ دیا ہے۔ اِس کے لئے تم سے اچھا ساتھی اور کون مل سکتا ہے"

• • • ─────── • • • ─────── • • •

- عقلمند ہمیشہ اپنی معتدل چال چلتا ہے لیکن احمق ہر وقت اور ہر حال میں مکر و تزویر کا دام پھیلانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ (بیکن)
- بزدل بار بار مرتا ہے اور بہادر صرف ایک بار موت کا مزہ چکھتا ہے۔ (شیکسپیر)
- قوتِ حیات کی کمی دُنیا کے بہت سے مصائب و آلام، جرموں اور ناکامیوں کا سبب ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- یہ ہماری نہیں، دوسروں کی آنکھیں ہیں، جو ہمیں مُبتلائے رنج و حسرت رکھتی ہیں۔ اگر میرے سوا سب اندھے ہوتے تو کبھی مجھے عمدہ لباس اور نمائشی چیزوں کی ضرورت نہ ہوتی۔ (فرینکلن)

• • • ─────── • • • ─────── • • •

میری عجیب کیفیت ہوگئی ہے۔ دل سینے میں مچلنے لگا۔ سوئی ہوئی آرزو کروٹ لینے لگی اور فردوس کی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھُک گئیں۔ شُنو مجھے حیرت سے دیکھ رہا ہے پھر پُوچھا ہے۔

"شکیل بھائی! آپی کو آج کیا ہوگیا ہے۔ چور سی کیوں بن گئی ہیں؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا ہے۔ لیکن بُوڑھی نانی نے اپنی بات شروع کر دی ہے۔

"بیٹا! میں آج تمھیں کچھ اور بھی بتانا چاہتی ہوں فردوس بہت غمزدہ ہے۔ ماں باپ نے ساتھ چھوڑا تو بے سہارا ہوگئی۔ میں اِس کی سگی نانی نہیں ہوں میں نے تو ترس کھا کر ان دونوں کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میرے بڑھاپے کو بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن فردوس نے مجھے سگی نانی سے کبھی کم نہیں سمجھا۔ میں بھیک مانگ کر پیٹ کی آگ بُجھاتی تھی۔

فردوس نے میرا بڑھاپا سنوار دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تو میری آنکھوں کی روشنی کو کبھی اندھیرے میں نہ ڈوبنے دے گا۔"

جو نہی نانی خاموش ہو گئی تو میں نے فردوس کو دیکھا ہے۔ وہ ایک مجسمہ معلوم ہو رہی ہے۔ چند لمحوں بعد میں نے کہا:

"فردوس میرے بھٹکے ہوئے دل کو تم ضرور ایک ڈگر پر لا سکتی ہو۔"

جواب میں فردوس کی آنکھوں سے چند آنسو بکھر گئے ہیں جن میں محبت اور خلوص کی تازگی کو میں نے محسوس کر لیا ہے۔

تیسری شام ــــــ میں اسے تیسری شام ہی کہوں گا حالانکہ کتنی ہی شامیں گزر چکی ہیں لیکن اس شام نے میری تقدیر کا فیصلہ کر دیا ہے۔ فردوس کی اور میری سانسیں ہم آہنگ ہو گئی ہیں۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی ہے کہ میں اس کی دھڑکنوں کی بازگشت بھی سن سکتا ہوں۔

مسلسل خاموشی کے بعد اس نے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہے۔

"شکیل! میں نے ہمیشہ کے لئے تمھیں اپنا سمجھ لیا ہے۔ وعدہ کرو کہ گردشِ وقت کی آندھیوں میں تنہا تو نہ چھوڑ دوگے؟"

میں نے جذبات کے سیلاب میں بہتے ہوئے جواب دیا ہے۔

"فردوس! میں تمھاری آنکھوں میں ڈوب جانے کے لئے بے قرار ہوں اور تمھیں دل کے ان نہاں خانوں میں چھپا لینا چاہتا ہوں جہاں کوئی نظر اٹھا کر بھی تمھیں نہ دیکھ سکے۔"

آج میری بدنصیبیاں دم توڑ چکی ہیں۔ میں نے ماضی کی ان یادوں کا گلا گھونٹ دیا ہے جو دیمک کی طرح دل و دماغ کو چاٹتی رہی تھیں۔ جنھوں نے میری نیندیں، میرا صبر و قرار چھین کے مجھے بھٹکا دیا تھا۔ میری زندگی کے ہر ہر لمحے کو تاریک بنا دیا تھا۔ چند دنوں بعد فردوس میرے بے نور خوابوں کی تعبیر بن جائے گی اور میری گھٹتی ہوئی زندگی کو اپنی سانسوں سے مہکائے گی اور میں تصورات کا شیش محل توڑ کر حقیقت کی روشنی میں آ جاؤں گا۔ میرا گھر ہوگا، میری منزل ہوگی!

لیکن اچانک ہی یہ کیا ہو گیا ہے کہ میں تاریکیوں میں ڈوب گیا ہوں! وہ شام کہاں ہے جس کے دامن میں رعنائیاں سمٹ آئی تھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ فردوس جیسے دل والی لڑکی بھی دولت کی پوجا کرنے لگے گی اور اس دل کو کچل کر گزر جائے گی جو صرف اس کی محبت سے آباد تھا ــــــ مل کے منیجر جاوید کی کار کی چمک اسے اندھا بنا دے گی!

فردوس کے وہ جملے میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"شکیل! ہر انسان کو اپنے لئے بہتر سوچنے کا حق ہے۔ مجھے تمھارا، اپنا اور اپنے بھائی کا مستقبل تاریک نظر آیا۔ اس لئے میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ میں تمھاری احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے راہ دکھائی۔ اپنے لئے بھی نئی راہ تلاش کر سکتے ہو!"

اتنا کہہ کر وہ منیجر جاوید کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی اور میں ایک جگہ کھڑا یہی سوچتا رہا کہ میری کون سی راہ ہے جس پر قدم اٹھاؤں تاکہ وہ شام لوٹ آئے جو سہانی ہوتی ہے، جس کے دامن میں رعنائیاں ہوتی ہیں!!

مستقبل للت۔ ایم۔ اے کا تازہ مجموعہ کلام۔ عمدہ کتابت، بہترین طباعت

پروائی خوشنما گرد پوش۔ قیمت چار روپے

خاوند بیوی کا رہنما

پریم شاستر — کام شاستر — گرہستھ شاستر

اِن کتابوں میں ایسے ایسے راز اور نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ جن کا جاننا نوجوان جوڑوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ ایسے ایسے کارآمد نکتے جو اکثر تجربہ کار سے تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور جنھیں جاننے کے بعد آپ کو شادی کی اصلی مسرتیں حاصل ہوں گی۔ گھر کو بہشت بنانے کی تدابیر تفصیل سے لکھ دی گئی ہیں۔ خاوند اور بیوی کے لئے اِن کتب کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنی ایک انسان کے لئے ہوا اور غذا ضروری ہے۔

اِن کتب کی مقبولیت کا اندازہ آپ اِس بات سے لگا سکتے ہیں، کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں اِن کتب کی چار لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی۔

پریم شاستر باتصویر ــــــ قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

کام شاستر باتصویر ــــــ قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

گرہستھ شاستر باتصویر ــــــ قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

غزلیں

ڈاکٹر شفا گوالیاری

اُس نگاہِ ناز سے، دل مرا سنور گیا — آئینے کے عکس سے، آئینہ نکھر گیا
آہ اُس کی بے بسی دیکھیے، جو آدمی — موت سے ڈرا نہیں زندگی سے ڈر گیا
راز جانے کیا تھا یہ کچھ سمجھ سکا نہیں — پھول اُدھر نکھر گیا، دل اِدھر بکھر گیا
جذبۂ نیاز میں، احترامِ ناز میں — لے کے اُن کے سامنے بے نظر گیا
میکدے کے نظم کا انتشار دیکھ کر — خُمِ ہر ایک رند کا آنسوؤں سے بھر گیا
لرزشیں فضاؤں میں لغزشیں ہواؤں میں — زندگی کا قافلہ یہ کہاں ٹھہر گیا
بزمِ گُل کو نہ دھڑک بزمِ خار کہہ دیا — کون سا چمن میں یہ آج دیدہ ور گیا
روشنی عزم پر کس قدر تھا اعتماد — شمعِ رہگزر کو میں چھوڑ کر گزر گیا

ساٹھ سالہ عُمر کے تجربات ہیں مرے
اے شفاؔ نگاہ سے ہر سماں گزر گیا

حمید قریشی سہارنپوری

دل کا یہ حال کہ مرقد کا دِیا ہو جیسے — آہ کا طور کہ طوفاں کی ہوا ہو جیسے
تیرگی ہے مرے مقدر کا لکھا ہو جیسے — روشنی ہے آپ کے جلوؤں کی ضیا ہو جیسے
یوں سرِ شام فلک سے کوئی تارا ٹوٹا — کوئی آنسو مری پلکوں سے گرا ہو جیسے
سوزشِ دہر سے یوں سرد ہوا شعلۂ دل — جگمگاتا ہوا فانوس بجھا ہو جیسے
اب کچھ اس رنگ سے کٹتی ہے تری فرقت میں — زندگی! جرمِ محبت کی سزا ہو جیسے
ہائے یہ درد کا طوفان تری یاد کے ساتھ — چاندنی رات میں بادل سا اٹھا ہو جیسے
بعد مدت کے بھی احساس یہی ہوتا ہے — کوئی اُٹھ کر ابھی پہلو سے گیا ہو جیسے
اُف یہ پلکوں کو جھپکنے کی ادائے معصوم — آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ تم نے کہا ہو جیسے

اُن کی آنکھوں میں وہ تحریر ہے کاجل کی حمیدؔ
کسی خوش بخت کی قسمت کا لکھا ہو جیسے

انور ایوبی گنگوہی

وفاؤں کے ہماری یہ صلے ہیں — تصنّع سے ملے وہ جب ملے ہیں
نہ ہو مایوس فصلِ گُل کے جویا — خزاؤں میں بھی کچھ غنچے کھلے ہیں
زمانہ لاکھ آندھی بنکے آئے — کہیں اہلِ عزائم بھی ہلے ہیں
شکایت کیا، مقدر اپنا اپنا — عدو کو گُل، مجھے کانٹے ملے ہیں
پشیماں لاکھ ہو۔ اب وہ ستمگر — کہیں اِس طرح چاکِ دل سلے ہیں
فنا بھی ہو گیا ہوں اُن کی خاطر — مگر اُن کے وہی شکوے گلے ہیں
خودی نے مُہرِ خاموشی لگا دی — لبِ شکوہ ذرا بھی گر ہلے ہیں

نگاہِ مہر سے دیکھا جو تم نے
فسردہ غنچہ ہائے دل کھلے ہیں

ہے : آپ ایک فیکٹری میں 'اسسٹنٹ فورمین' ہیں۔
گی کا آغاز 'لیباریٹری اسسٹنٹ' کے روپ میں
لا اور سات سال کے عرصے میں ہی اِس عہدہ پہ پہنچ
گئے۔ اِن کی کامیابی کا راز انھیں کے الفاظ میں سُنیئے ——

کام تو سبھی کرتے ہیں لیکن میں نے کچھ زیادہ ذمّہ داریوں کے کام
ہاتھ میں لئے اور بڑی سوجھ بوجھ اور محنت سے انھیں پورا کیا گھر کی طرف سے
پریشان نہیں رہا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا، اُن کے لمبے
چوڑے خاندان ہیں۔ اُن کی ساری توجہ اور سوجھ بوجھ اُن کے
گھر کی آئے دن کی پریشانیوں میں ہی لگ جاتی ہے۔ میں نے اِس

بات پر توجہ دی میرے دو ہی
بچے ہیں، جنھیں میں اچھی سے اچھی
تعلیم دینا چاہتا ہوں میرا
چھوٹا سا خاندان سُکھی ہے"



یہ خوش میں ——

اور آپ؟



طنزیہ

ماڈرن ہتوپدیش

فکر تونسوی

ملاّمہ خوشتر!

عاشقانہ خطوط ختم ہوئے۔ آؤ، اب ذرا ماضی کی طرف لوٹ چلیں ـــــ مضمون جدید بطرزِ قدیم لکھیں اور "ہتوپدیش" کے انداز میں نئے انسان کے نئے زخم کریدیں۔

ـــــ فکر تونسوی

مسٹر معلوم نہیں ـــــ ●

ایک بدیشی سیّاح ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں آیا۔ سب سے پہلے وہ لال قلعہ دیکھنے کے لئے گیا۔ لال قلعے کے اندر کچھ ہندوستانی سٹوڈنٹس گھوم رہے تھے۔ بدیشی سیّاح نے اُن سے پُوچھا۔

"اِس لال قلعے کی تعمیر کرنے والا کون تھا؟"

سٹوڈنٹس نے جواب دیا "معلوم نہیں۔"

بدیشی سیّاح بہت متاثر ہوا اور اُس نے سوچا، مسٹر معلوم نہیں کوئی بہت عظیم آدمی ہوگا جس نے اِتنا عظیم قلعہ بنا ڈالا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ مسٹر معلوم نہیں سے ضرور ملاقات کرے گا۔

لال قلعے سے باہر نکل کر جب وہ سڑک پر آیا تو کچھ لوگ ایک جنازہ اُٹھائے لئے جا رہے تھے۔ بدیشی سیّاح نے ایک آدمی سے پُوچھا "یہ کون انتقال کر گیا؟"

اُس آدمی نے جواب دیا "معلوم نہیں۔"

مسٹر معلوم نہیں کے انتقال پر بدیشی سیّاح کو بہت افسوس ہوا۔ آہ! وہ ایک عظیم آدمی کی ملاقات سے محروم رہا۔

دھرم کا رکھشک ـــــ ●

شہر کے بہت بڑے مندر میں شہر کے بہت بڑے بڑے معززین جمع تھے۔ یہاں وہ مندر کمیٹی کے پردھان کا چناؤ کرنے آئے تھے۔ کئی تقریروں کے بعد سیٹھ ڈھینگر چند جی کو اتفاقِ رائے سے پردھان چُن لیا گیا۔ تالیوں کی گونج میں سیٹھ ڈھینگر چند جی کو پھول مالاؤں سے لاد دیا گیا۔ سیٹھ جی نے جوابی تقریر میں سب کا شکریہ ادا کیا اور سرنیاز جھکا کر بھگوان کی مُورتی کے سامنے وعدہ کیا کہ وہ دھرم کی رکھشا کے لئے اپنی جان تک نثار کر دیں گے۔

جب پردھان جی مندر سے باہر تشریف لائے تو ایک پولیس پارٹی نے انھیں افیون کی سمگلنگ کے جُرم میں گرفتار کر لیا۔

حضرتِ عیسیٰ مسیح ـــــ ●

سڑک کے بائیں فٹ پاتھ پہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تیز چاقو چمک رہے تھے جن سے وہ ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتے تھے۔

ایک صاحب انھیں لڑتے دیکھ کر تیزی سے اُن کی طرف لپکے اور اُن دونوں کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ایک پُرزہ دے کر چلے گئے۔ دونوں نے پُرزے کی طرف دیکھا۔ اُس پر لکھا تھا۔

"ڈاکٹر بھیم سنگھ سرجن۔"

"ہمارے کلینک میں زخموں کی مرہم پٹی کا بہترین انتظام ہے۔"

سیدھے سادے جواب ـــــ ●

"آپ دوسرے نیتاؤں کے ساتھ جیل کیوں نہیں گئے؟"

"مجھے گھر میں تھوڑا سا کام تھا۔"

"آپ دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے گئے تھے۔ لوٹ کیوں آئے؟"

"[illegible]"

"آپ نے اپنی محبوبہ کے نام جو 'لو لیٹر' لکھا تھا اُسے پہنچانے کے لئے خود اُس کے گھر کیوں گئے تھے؟"

"ڈاک کا ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہیں تھے۔"

"میں نے آپ کو اپنے جنم دن پر ڈنر کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔ آپ تشریف کیوں نہیں لائے؟"

"دعوت نامے پر تاریخ درج نہیں تھی۔"

"آپ نے اُس بھدی عورت سے کیوں عشق کرنا شروع کر دیا، جبکہ آپ کی اپنی بیوی انتہائی خوبصورت تھی؟"

"کیونکہ میری بیوی نے ایک موٹے بھدے شخص سے عشق شروع کر دیا تھا۔"

ساتویں لڑکی ———●

ایک صاحب تعلیمِ نسواں کے بڑے حامی تھے۔ جب اُن کے یہاں ساتویں لڑکی پیدا ہوئی اور میٹرنٹی ہسپتال میں نرس نے انہیں یہ ساتویں لڑکی لاکر دکھائی تو وہ صاحب لڑکی کو دیکھ کر رونے لگے۔

نرس نے پوچھا "روتے کیوں ہو؟"

وہ بولے "میں تعلیمِ نسواں کا حامی تھا، پیدائشِ نسواں کا نہیں۔"

کنوارا حُسن ———●

میں ایک ایسی کافر ادا حسینہ کو جانتا ہوں جس کا بدن کُندن کی طرح دمکتا تھا۔ جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شراب کی سی مستی تھی۔ جس کے ہونٹ گلاب کی پتّیوں کی طرح تھے۔ جس کے رخساروں پر شعلے دہکتے تھے۔ جس کی گردن بلوریں صراحی کی طرح تھی۔ جس کی آواز میں جھنکار کی مستی تھی۔ جو چلتی تھی تو چاند اور ستارے اور سورج دم سادھ لیتے تھے۔ جو ہنستی تھی تو پھول ہی پھول چاروں طرف بکھر جاتے تھے۔

لیکن وہ حسینہ ساری زندگی کنواری رہی۔ کیونکہ اُس کے بے پناہ حُسن کی وجہ سے کسی کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ اُس سے اظہارِ محبت کرے۔

تین ادھوری خبریں ———●

۱۔ اٹلی میں ابھی ابھی ایک ایسی عورت کا انتقال ہوا ہے جس کی عمر ایک سو تیس سال تھی۔ خبر میں لکھا گیا ہے کہ اُس کی درازیٔ عمر کا راز یہ تھا کہ اُس نے ساری زندگی کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم نہیں کئے تھے۔

خبر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ عورت جنم سے ایک چشم تھی۔

۲۔ ڈاکٹروں نے ایک کا دل دوسرے کے سینے میں فٹ کرنے کے لئے چھ آدمیوں پر تجربے کئے۔ اُن میں سے پانچ تجربے ناکام رہے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ لیکن چھٹا آدمی جس کے سینے میں ایک عورت کا دل فٹ کیا گیا وہ ابھی تک زندہ ہے۔

مرد مر گیا، عورت زندہ ہے۔

۳۔ ایک امیر ترین آدمی نے پچاس سال کی عمر میں ایک وصیت لکھ کر رکھ دی کہ جب وہ انتقال کر جائے تو اُس کی ساری جائداد ایک وِدھوا آشرم کو دے دی جائے۔ لیکن جب وہ اٹھانوے سال کی عمر میں فوت ہوا تو اُس وقت اِس حد تک دیوالیہ ہو چکا تھا کہ اُس کے کفن کے لئے بھی محلّے سے چندہ جمع کرنا پڑا۔

خبر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اُس کی بیوہ بیوی کو اُسی وِدھوا آشرم میں داخل کر لیا گیا!

موضوع نہیں ملتا ———●

آج کے ادیب کی سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ وہ کیا لکھے؟ ادب کی اساس انسانی جذبات پر ہے اور آج کے سماج کا انسان جذبات سے محروم ہو گیا ہے۔ جذبوں کے رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ کردار پھُس اور بے جان ہو گئے ہیں۔ ادیب کو متاثر کرنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہی تو وہ کس پر لکھے؟ (ایک افسانہ نگار نے کافی ہاؤس میں ایک اکتائی ہوئی جمائی لیتے ہوئے کہا)

اور تین دن بعد وہی افسانہ نگار ایک ہپی لڑکی کے ساتھ ناجائز چرس بیچتے ہوئے پکڑا گیا۔

دو بھوکے ———●

ایک بلّی نے کہا "میاؤں!"

چوہے نے جواب دیا "لیکن میں بے حد بھوکا ہوں۔ پہلے مجھے کچھ کھانے کو لاکر دو۔"

بلّی نے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے لاکر اُسے دئے۔ جسے چوہا کھا گیا۔ اُس کے بعد بلّی چوہے کو کھا گئی۔

مُنہ بولتی خبریں ———●

- ایک میونسپل کارپوریشن نے لوگوں سے اپنا ایک کروڑ روپیہ ٹیکس وصول کرنے کے لئے جو نئے طریقے اختیار کئے، اُن پر کارپوریشن کے ڈیڑھ کروڑ روپے خرچ ہو گئے۔ اِس گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے آدھے کروڑ کے نئے ٹیکس لگا دئے گئے۔
- ایک چپراسی سرکاری ڈیوٹی سرانجام دینے کے دوران ایک ٹرک کے نیچے آکر ہلاک

ہوگیا۔ حکام نے انسانی ہمدردی کے طور پر فیصلہ کیا کہ بطور معاوضہ اُس کی بیوی بچوں کو پانچ ہزار روپے نقد ادا کیے جائیں۔ جب حکومت کے کارندے مرحوم چپراسی کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اُس کے بیوی بچے تو چپراسی سے پہلے ہی مر چکے تھے۔

● حکومت کے ایک وزیر کا جب انتقال ہوا تو اُس کے وصیت نامے میں یہ درج تھا: میری ساری جائداد ملک کا اخلاق بلند کرنے پر خرچ کی جائے۔

وزیر صاحب نے یہ سارا روپیہ بھرشٹاچار سے پیدا کیا تھا۔

● ایک لیڈر نے پبلک جلسے میں دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے کہا "جب تک اس ملک میں سوشلزم نہ آئے گا میں چین سے نہ بیٹھوں گا! اس ملک کے مصائب کا سب سے بڑا کارن سرمایہ داری ہے۔ آؤ لوگو! مل جل کر سرمایہ داری کا قلع قمع کر دیں۔"

تقریر کرنے کے بعد وہ لیڈر ایک سرمایہ دار کے ہاں ڈنر کھانے چلا گیا۔

● جنگلات کے ایک ٹھیکیدار نے [illegible] حکومت کو پانچ کلو سونا دے دیا۔ جس کے عوض سرکار نے اُسے جنگلات کے مزید ٹھیکے دے دیئے جن سے اُس نے پچاس کلو سونا بنا لیا۔

حاتم طائی دہلی میں ●

چند دن ہوئے، حاتم طائی دہلی میں آیا۔ کیونکہ اُس کے پاس دہلی کے پوسٹ آفس سے سیکڑوں خط پوسٹ کیے گئے تھے کہ کبھی دہلی میں بھی قدم رنجہ فرمایئے۔ یہاں کے باشندے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

چنانچہ حاتم طائی کو ایک دن رحم آگیا اور وہ دہلی میں آگیا۔ اُسے راستے میں جو بھی حاجت مند ملا اُس نے اُس کی حاجت پوری کر دی۔ بھکاری، کلرک، مزدور، ٹیچر، دکاندار، وکیل، حتیٰ کہ ایک رشوت خور افسر کو بھی اُس نے دس ہزار روپے دے دیئے کیونکہ اُسے اپنی بیٹی کی شادی پر شاندار جہیز دینا تھا۔۔۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سارے دہلی شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ حاتم طائی شہر میں آیا ہوا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا ہے۔ چنانچہ سارے باشندے اپنا کام کاج چھوڑ کر حاتم طائی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ حاتم طائی کو شام تک ڈھونڈتے رہے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر اخبار کے ایک ایڈیٹر نے اُس کا پتہ چلا لیا اور اُسے معلوم ہوا کہ جتنا روپیہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا، وہ سبھی بانٹ چکا اور اُس کے پاس روٹی کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں بچے۔ چنانچہ اُس نے اللہ کے نام پہ ایک راہگیر سے بھیک مانگی تو پولیس اُسے انسدادِ گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کر کے تھانے لے گئی ــــــ اور وہ اس وقت تھانے میں قید ہے۔

مانو نہ مانو ــــــ ●

۱۔ ڈاکٹر اپنا علاج ہمیشہ دوسرے ڈاکٹر سے کراتے ہیں۔ کیونکہ انھیں اپنی تشخیص پر اعتبار نہیں ہوتا۔

۲۔ دھوبیوں کے اپنے کپڑے ہمیشہ میلے ہوتے ہیں۔

۳۔ فلمی اداکار جب روزمرّہ زندگی میں بھی ایکٹنگ کرتے ہیں تو بہت مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔

۴۔ دھارمک کتابیں بیچنے والے خود بڑے ادھرمی ہوتے ہیں۔

۵۔ جس لاری پر لکھا ہو "شراب پی کر گاڑی مت چلاؤ" اُس لاری سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہیے۔

۶۔ ہوٹل کے مالک اپنا کھانا ہمیشہ اپنے گھر سے منگواتے ہیں۔

۷۔ سوشلزم کا پرچار کرنے والے اپنے گھر میں ڈکٹیٹر ہوتے ہیں۔

۸۔ شاعروں کے تخیل کی محبوبہ ہمیشہ غیر شاعروں سے شادی کرتی ہے۔

"بیسویں صدی" کے غیر ملکی خریدار سالانہ قیمت بائیس شلنگ بذریعہ ڈرافٹ یا برٹش پوسٹل آرڈر بذریعہ رجسٹری بھیجیں۔ رجسٹری ملتے ہی رسالہ جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس قلیل رقم میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جاتے ہیں۔

غزلیں

نسیم شاہجہانپوری

اُن کو مستقبلِ دَوراں کی خبر رہتی ہے
جن کی حالات پہ ہر وقت نظر رہتی ہے

جو دُعا دل سے نکلتی نہیں اِخلاص کے ساتھ
ہم نے دیکھا ہے کہ محرومِ اثر رہتی ہے

بیخودی بھی مری کچھ کم نہیں ہُشیاری سے
مجھ کو اپنی نہ سہی، اُن کی خبر رہتی ہے

اب یہ عالم ہے تری یاد کا دل میں جیسے
روشن اِک شمع سرِ راہ گذر رہتی ہے

بے تقاضا کبھی اُٹھتی نہیں جلوؤں کی طرف
کتنی محتاط محبت میں نظر رہتی ہے

دیکھتا کوئی نہیں شیخ کی تردامانی
میری رِندی پہ زمانے کی نظر رہتی ہے

ہم نے دیکھا ہے کہ دریائے محبت میں نسیمؔ
ڈوبنے والے کی ساحل پہ نظر رہتی ہے

افضال عاجز

یہ ترا ہی نقشِ پا ہے مجھے سوچنا پڑے گا
جو چراغ رہنما ہے مجھے سوچنا پڑے گا

غمِ زندگی کا اب تک نہ مِلا کوئی مداوا
میری سوچ کیا بلا ہے مجھے سوچنا پڑے گا

مرے دِل کی اِک تمنا ہوئی آج تک نہ پوری
یہی آپکی رضا ہے ؟ مجھے سوچنا پڑے گا

جو لگا رہا ہے تہمت مری پاک دامنی پر
وہ کہاں کا پارسا ہے مجھے سوچنا پڑے گا

مرے ساتھ جو رہا ہے میرے سائے کی طرح سے
وہ حسین کیوں خفا ہے مجھے سوچنا پڑے گا

کبھی دِل میں جلوہ گر ہیں کبھی آنکھ سے بھی اوجھل
یہ وفا ہے یا جفا ہے مجھے سوچنا پڑے گا

میں جھکاؤں سر کو عاجزؔ کسی آستاں پہ کیسے
کہاں جانِ مُدعا ہے ؟ مجھے سوچنا پڑے گا

ساغر وارثی شاہجہانپوری

تم نازشِ بہار ہو۔ تم جانِ رنگ و بُو
افسانۂ حیات ہو تفسیرِ آرزو

وہ دِن بھی کاش آئے کبھی راہِ عشق میں
روداِدِ غم سُناؤں اُنھیں اُن کے رُو بہ رُو

تیرا پتہ نہ کوئی بھی مجھکو بتا سکا
اکثر ہوئی ہے چاند ستاروں سے گفتگو

یہ کیا خبر تھی تم ہو مرے دل میں ضو فگن
میری نگاہ نے تمھیں ڈھونڈا ہے چار سُو

اے بخیہ گر نہ چھیڑ خُدارا اسے نہ چھیڑ
دل ہے وہ چاک جس کو نہیں حاجتِ رفو

ہو کوئی غمگسار نہ کوئی جلیس ہو
اب جی یہ چاہتا ہے کہ بس میں ہوں اور تُو

رُخ میں نے حادثات کے موڑے ہیں بارہا
ساغرؔ مجھے مٹائے گا کیا چرخِ فتنہ خُو

فلم انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا پونا

نوٹس داخلہ

برائے اکیڈیمک سال جس کا اجرا یکم جولائی 1968ء سے ہوگا مندرجہ ذیل ریگولر کورسز کے فرسٹ ایر میں داخلہ کے واسطے مجوزہ فارموں پر درخواستیں طلب کی جاتی ہیں :-

1۔ ڈائرکشن

تین سال۔ کم سے کم تعلیمی قابلیتیں :- ڈگری آرٹس یا سائنس میں یا مساوی۔
عمر :- مورخہ 1.7.68 کو 18 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ تعداد سیٹس :- 13

2۔ سکرین پلے رائٹنگ

تین سال۔ کم سے کم تعلیمی قابلیتیں :- ڈگری آرٹس یا سائنس میں یا مساوی۔
عمر :- مورخہ 1.7.68 کو 18 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ تعداد سیٹس :- 7

3۔ موشن پکچر فوٹوگرافی

تین سال۔ کم سے کم تعلیمی قابلیتیں :- انٹرمیڈیٹ معہ فزکس اور کیمسٹری بطور مضامین یا مساوی (جو امیدوار ہائر سکنڈری امتحان پاس ہیں ان کو فزکس اور کیمسٹری بطور مضامین کے ساتھ سائنس میں تین سالہ ڈگری کورس کا فرسٹ ایر امتحان پاس کرنے کے بعد داخلہ مل سکے گا) یا فائن آرٹس (پینٹنگ) میں کسی یونیورسٹی یا سٹیٹ سرکار کے کسی منظور شدہ انسٹی ٹیوٹ سے انہوں نے ڈگری/ڈپلومہ لیا ہونا چاہئے۔ میٹرکولیشن کے بعد کم سے کم دو سالہ میعاد کا ڈپلومہ کورس ہونا چاہئے۔
عمر :- مورخہ 1.7.68 کو 17 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ تعداد سیٹس :- 10

4۔ ساؤنڈ ریکارڈنگ اینڈ ساؤنڈ انجینئرنگ

تین سال۔ کم سے کم تعلیمی قابلیتیں :- انٹرمیڈیٹ معہ فزکس، کیمسٹری اور میتھمیٹکس بطور مضامین یا مساوی (جو امیدوار ہائر سیکنڈری امتحان پاس ہیں ان کو فزکس، کیمسٹری اور میتھمیٹکس بطور مضامین کے ساتھ سائنس میں تین سالہ ڈگری کورس کا فرسٹ ایر امتحان پاس کرنے کے بعد داخلہ مل سکے گا) عمر :- مورخہ 1.7.68 کو 17 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ تعداد سیٹس :- 10

5۔ فلم ایڈیٹنگ

دو سال۔ کم سے کم تعلیمی قابلیتیں :- انٹرمیڈیٹ آرٹس یا سائنس میں یا مساوی (جو امیدوار ہائر سکنڈری امتحان پاس ہیں ان کو تین سالہ ڈگری کورس کا فرسٹ ایر امتحان پاس کرنے کے بعد داخلہ مل سکے گا) عمر :- مورخہ 1.7.68 کو 17 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ تعداد سیٹس :- 5

6۔ فلم ایکٹنگ

دو سال۔ کم سے کم تعلیمی قابلیتیں :- میٹرکولیشن یا اس کے مساوی معہ انگلش بطور ایک مضمون کے لی ہو۔ ہندی میں ورکنگ نالج ہونا نہایت ضروری ہے۔ مستحق صورتوں میں لڑکی امیدوار کے لئے قابلیتوں میں رعایت۔ عمر :- مورخہ 1.7.68 کو لڑکیوں کی صورت میں 16 اور 25 سال کے درمیان اور لڑکوں کی صورت میں 18 اور 25 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔ تعداد سیٹس :- 20 (10 مستورات اور 10 مردوں کے لئے)

امتحان داخلہ

جو امیدوار لڑکا/لڑکی اپنے کوالیفائنگ یونیورسٹی/بورڈ امتحان میں اپریل/مئی/جون 1968ء میں شامل ہوا ہے یا ہونے والا ہے اور درخواست کرتے وقت اس کے نتائج دستیاب نہیں ہیں وہ انسٹی ٹیوٹ کے امتحان داخلہ میں شامل ہونے کا اہل ہے بشرطیکہ اس لڑکے/لڑکی کی درخواست کے ساتھ اس لڑکے/لڑکی کے کالج/سکول کے پرنسپل/ہیڈ ماسٹر کی جانب سے اس مطلب کا سرٹیفکیٹ شامل ہے۔ اگر امتحان داخلہ میں منتخب ہو جائے تو وہ لڑکا لڑکی عارضی طور پر داخل کر لئے جائیں گے جس پر یہ شرط لاگو ہوگی کہ اس لڑکے/لڑکی کو 31 جولائی 1968ء کو دستاویزی ثبوت بدیں مطلب پیش کرنا ہوں گے کہ انہوں نے مطلوبہ یونیورسٹی بورڈ امتحان پاس کر لیا ہے۔ نہ پیش کرنے کی صورت میں اس لڑکے/لڑکی کا عارضی داخلہ از خود منسوخ ہو جائے گا اور ادا شدہ فیس واپس مجرا نہیں دی جائے گی۔

متعدد کورسوں میں داخلہ انٹرینس امتحان کی بنیاد پر ہوگا۔ ڈائرکشن، سکرین پلے رائٹنگ، موشن پکچر فوٹوگرافی، ساؤنڈ ریکارڈنگ انجینئرنگ اور فلم ایڈیٹنگ میں کورسوں کے لئے جو امتحان لیا جائے گا اس میں ایک تحریری ٹیسٹ اور زبانی امتحان شامل ہیں۔

تحریری ٹیسٹ بمبئی، دہلی، کلکتہ اور مدراس میں مورخہ 12 مئی 1968ء (اتوار) کو منعقد ہوں گے۔ انٹرویو امتحان میں تحریری ٹیسٹ کے اندر کوالیفائنگ مارکس حاصل کرنے والے تمام اُمیدواروں کو زبانی امتحان میں شامل ہونا پڑے گا جو انسٹی ٹیوٹ ہٰذا میں مورخہ 18 جون سے 22 جون 1968ء تک منعقد ہوگا۔

فلم ایکٹنگ میں انٹرویو امتحان برائے کورس میں ایک مقابلہ متعلقہ فوٹو، سماعت اور سکرین ٹیسٹ شامل ہیں تاکہ فوٹو کی حیثیت میں ظاہری شخصیت کا اندازہ لگ سکے۔ ٹیسٹ بمبئی، دہلی، کلکتہ اور مدراس میں ماہ جون 1968ء کے ابتدا میں منعقد ہوں گے۔ اس دوران میں اُمیدواروں کو ٹیسٹ سے متعلق اطلاع دے دی جائے گی۔

وظائف

متعلقہ کورسوں میں جو اُمیدوار خصوصی طور سے رجحان طبع رکھتے ہیں اور اس کے لئے وہ تسلی بخش ثبوت پیش کر سکتے ہیں ان پر خاص طور سے غور کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں بڑی تعداد میں وظائف موجود ہیں جو مرکزی حکومت، گورنمنٹ آف آندھرا پردیش، آسام، بہار، گجرات، کیرالا، مہاراشٹر، میسور، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، پنجاب، ویسٹ بنگال اور مدراس و یونین ٹیریٹری آف [illegible] کی جانب سے مستحق طلبا کو دئے جائیں گے۔

ہوسٹلز

انسٹی ٹیوٹ ہٰذا کی جانب سے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے الگ الگ ہوسٹلز کے انتظامات ہیں۔

درخواست دینے کا طریقہ

پراسپکٹس جس میں ایپلیکیشن فارم، تفصیلی کورس ہائے، انٹرویو امتحان، اسکالرشپس (وظائف) وغیرہ درج ہیں پرنسپل فلم انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، پونا نمبر 4 سے تحریری درخواست بھیج کر اور اس کے ساتھ پوسٹل آرڈر برائے ۔/۲ روپے جو قابل ادائیگی پرنسپل فلم انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا تمام پونا بھیج کر اور اس کے ساتھ ایک لفافہ سائز 5 x ... جس پر 18 پیسے کے ٹکٹ اور اُمیدوار کا نام اور پورا پتہ درج کرکے بھیج کر حاصل کر سکتے ہیں۔ جن درخواستوں کے ساتھ پوسٹل آرڈر اور لفافہ جس پر پتہ درج ہونا چاہئے اور ڈاک ٹکٹ چسپاں ہو شامل نہیں ہوں گے ان کے عوض پراسپکٹس نہیں بھیجا جائے گا۔ [illegible] چیک قبول نہیں کی جائے گی۔

ہر لحاظ سے مکمل طور پر پُر شدہ درخواست برائے داخلہ انسٹی ٹیوٹ ہٰذا میں [illegible] اپریل 1968ء تک پہنچ جانی لازمی ہے اور ہر درخواست کے ساتھ پوسٹل آرڈر برائے ۔/5 روپے جیسا کہ پراسپکٹس میں درج ہے آنا ضروری ہے۔

DAVP 571(67)67

روس کے عظیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار

طوفانِ بہار

جسے حضرت منظور جالندھری نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ اس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جس کا شمار دُنیا کے دس عظیم رومانی ناولوں میں ہوتا ہے جس کی دو کروڑ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ ناول پاکیزہ اور دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان ہے۔ جاذب نظر کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، پختہ جلد۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

وہ کتاب جو بیسویں صدی کی بہترین کتب کے [illegible]

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری

پیش کی جا سکتی ہے۔ اس مفید کتاب میں کشیدہ کاری کے وہ تمام نمونے پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستان اور ولایت میں رائج ہیں۔ اور جنہیں ہندوستانی اور یورپین عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ اونچے گھرانے کی معزز خواتین اور چوٹی کے زنانہ رسائل کی رائے ہے کہ کشیدہ کاری پر اس سے بہتر کتاب آج تک شائع نہیں کی گئی۔ اُردو و ہندی مشترکہ زبانوں میں شائع کی گئی ہے تحفے میں دینے کے لئے معزز گھرانے کی خواتین یہ مفید کتاب اپنی پیاری لڑکیوں کو جہیز میں دیتی ہیں۔ قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

صحت و زندگی

یہ مفید کتاب کا مطالعہ آپ کے لئے اتنا مفید ثابت ہوگا کہ آپ اسے خود پڑھنے کے بعد اپنے اُن دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کی ہدایت کریں گے جن کی صحت آپ کو عزیز ہے۔ انسانی جسم کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ امراض کو بلا دوا دُور کرنے کے لئے آسان طریقے، غذا اور علاج درج کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے آپ بہت سی بیماریوں سے عمر بھر کے لئے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ غذا، صحت، شباب اور تندرستی کے متعلق تمام باتیں تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ جن کا جاننا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ قیمت تین روپے

زنجیر

ایک گناہ گار لڑکی کی حسین و جمیل داستان جس کے گناہ یہ تھے کہ وہ غریب تھی۔ وہ حُسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ وہ رقص کے ایک اسکول میں کام کرتی تھی۔ وہ تنہا تھی اُس کا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک شریف گھر کے لڑکے سے محبت کرتی تھی چنانچہ وہ ایک شریف وکیل صاحب کو گناہوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی نظر آئی اور وکیل صاحب نے اُسے اپنی بہو بنانے سے انکار کر دیا۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُر پیچ رومانی پُردرد داستان، جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے، جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

افسانہ

دو تصویریں

عبد الصمد

مکرمی بہار شاہین (پٹنہ)

تسلیم [illegible]

... مجھے پلاٹ کے اعتبار سے کامیابی کا دعویٰ تو نہیں ہے لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس میں میں نے کچھ ایسے نفسیاتی تجزیے پیش کئے ہیں جو میرے خیال میں بیسویں صدی اور آپ کے معیار کے عین مطابق ہیں اور صرف اسی لئے میں اس دعوے کے ساتھ افسانہ پیش کر رہا ہوں ـــــــ میرے ایک نئے ابھرنے والے افسانے کے بارے میں آپ کے [illegible] اور مشہور افسانہ نگار حضرت [illegible] نے مجھے ایک خط میں لکھا ہے "آپ کی تحریر میں بلا کی شگفتگی، انفرادیت اور البیلا پن ہے" اب یہ آپ کا کام ہے کہ اس پر تصدیق کی مہر ثبت کریں ...

مخلص ـــــــ عبد الصمد

"بھئی اب عمر رفتہ کو یاد کر کے کہاں تک کڑھا جائے۔ جوانی تو خود ہی ایک حسین دور ہے اور اس سے وابستہ ہر یاد حسین تر!"

بیرسٹر فخر الدین نے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"لیکن اس حسین دور سے وابستہ حسین تر یادوں میں بھی چند یادیں [illegible] ہوتی ہیں جو ساری زندگی دل کا دامن نہیں چھوڑتیں اور ایسی ہی چند یادوں پر تو کبھی کبھی زندگی کی بنیاد بھی استوار ہوتی ہے"۔ میں نے کہا۔

بیرسٹر صاحب صرف مسکرا کر رہ گئے اور اپنے تمباکو سے بھرے پائپ کو سلگانے لگے۔ یہ جیسے ان کے اعتراف کا اظہار تھا۔

بیرسٹر فخر الدین نے رات مجھ سے کلب کی ایک محفل میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی جوانی کے دور کی ایک اہم اور حسین داستان مجھے سنائیں گے۔ اس لئے میں صبح ہی ان کے پاس جا پہنچا۔

"بھئی جوانی تو میری بغیر کسی خوف و خطر کے گزر گئی [illegible] اس کے فوراً بعد کی منزل کا ایک واقعہ ہے۔ واقعہ کیا حادثہ ہے۔ تمہیں اگر دلچسپی ہو تو بیان کروں"۔ بیرسٹر صاحب نے پائپ کا ایک کش لے کر کہا۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں!"

"تو لو سنو ـــــ یہ آج سے تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میری زندگی پن کے لگ بھگ ہے۔ اس وقت میری عمر پینتیس سال تھی۔ شادی تو میری بیس ہی سال کی عمر میں ہو گئی تھی اس لئے جوانی کا جو حسین دور تم لوگوں کے خیال میں ہے وہ دور مجھ سے دور رہا، اس لئے کسی رنگین حادثے یا واردات سے دوچار ہونے کا موقع نصیب ہی نہ ہو سکا۔ میں تھا، میرا گھر تھا، میری بیوی تھی، میرا پڑھنا لکھنا تھا اور بس! باہر کیا ہوتا ہے، دلوں میں آگ کیسے سلگتی ہے، نینوں کے تیر کیسے چلتے ہیں، شب فرقت کیوں کاٹے نہیں کٹتی ہے؟ اس سے مجھے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ شب فرقت کاٹنے کی جب میری باری آئی تو صبح ہو چکی تھی۔ رات کیسے کٹ گئی اس کا مجھے کوئی احساس ہی نہ ہو سکا"

بیرسٹر صاحب مسکرا کر ایک لمحے کے لئے رک گئے۔ پائپ کا ایک زوردار کش لیا اور پھر کہنے لگے۔

"شادی کے کئی برس بعد میں نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ گھر کی مالی حالت اچھی نہ تھی اس لئے بھی تعلیم کی تکمیل میں کچھ دیر ہو گئی۔ شادی کے بعد بچے آئے تو فکر معاش سنجیدگی اختیار کرنے لگی۔ آخر میں نے اپنے شہر کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے شہر سے نزدیک ایک دوسرے بڑے شہر میں وکالت شروع کرنے کی ٹھانی۔ اپنے شہر میں

عدالت یا کچہری وغیرہ قسم کی چیز تھی ہی نہیں۔ اس لئے وہاں کا سبھی معاملہ مقدمہ اُسی شہر میں چلتا تھا۔

اُس شہر میں بالکل بے یار و مددگار تھا۔ کسی سے ملاقات نہ بات، کسی سے جان پہچان۔ گھر چھوڑنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں، کدھر جاؤں۔ کبھی کبھی جی چاہنے لگتا سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگ جاؤں۔ لیکن یہ کیسے کر سکتا تھا۔ آخر دل کو ڈھارس بندھائی۔ خود کو تسلّی دی۔ اللہ پر بھروسہ کیا اور کہیں ٹھکانہ ڈھونڈنے نکل پڑا۔ سامان اسٹیشن ماسٹر کی تحویل میں دے دیا۔ اب اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا خدا کی مہربانی کہ مکان مجھے پہلے ہی قدم پر مل گیا۔ ایک تین منزلہ کالونی کی سب سے اوپر کی منزل کے کنارے والا فلیٹ کرایہ دینے کے لئے خالی تھا۔ کرایہ کتنا تھا، اب مجھے صحیح یاد نہیں لیکن اتنا یاد ضرور ہے کہ مجھ جیسے مفلوک الحال کے لئے بھی وہ بخوشی قابلِ قبول تھا۔

اُس زمانے میں میری کیا جوانی تھی، اب تمہیں کیا بتاؤں۔ خواہ مخواہ مبالغے پر محمول کرو گے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تم اگر دیکھ لیتے تو رشک کئے بغیر نہ رہ سکتے۔"

بیرسٹر صاحب نے میری جوانی کا جیسے مذاق اُڑاتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ میں بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں تو پھر۔ . . " میں نے آگے سُننا چاہا۔

"ہاں۔ ہاں بھئی بول ہی تو رہا ہوں۔ میں فلیٹ میں آ گیا اور وکالت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ میری وکالت خوب چمکنے لگی۔ چند ہی مہینوں میں شہر کے مشہور وکیلوں میں میرا شمار ہونے لگا۔ اب میں اُسی شہر میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ لیکن اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس نے میری قسمت کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔"

بیرسٹر صاحب بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ اُن کی ذہنی حالت کا احساس کر کے میں خاموش ہی رہا۔

"اب میں سوچتا ہوں، اگر وہ بات نہ ہوئی ہوتی تو میرا شمار صوبے کے بڑے بیرسٹروں میں ہوتا!"

بیرسٹر صاحب نے خلا میں گھورتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"جناب! میں وہ بات جاننے کے لئے بے چین ہوں۔" میں نے کہا۔

"کہہ تو رہا ہوں۔ بول تو رہا ہوں ——— تم خاموشی سے سُنتے جاؤ ———

میرے فلیٹ کے بغل والے فلیٹ میں ایک پروفیسر رہتا تھا رحمان! مجھ سے عمر میں کچھ ہی بڑا ہوگا۔ اُس کی ایک لڑکی تھی جو کسی دوسری جگہ تعلیم پاتی تھی۔ انٹر کرنے کے بعد پروفیسر اُسے اپنے ساتھ ہی لے آیا تاکہ اپنی نگرانی میں کالج میں تعلیم دلا سکے۔ پروفیسر نے مجھ سے اپنی بیٹی کا تعارف کرایا۔

"ان سے ملو بیٹی! یہ ہیں تمھارے چچا فخر الدین ——— اور یہ رہی میری بیٹی شگفتہ!"

"یہ چچا ہیں!" شگفتہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے بے حد شوخی سے کہا۔

پروفیسر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"بھئی معاف کرنا وکیل صاحب! شگفتہ کچھ ضرورت سے زیادہ شوخ ہے۔ ارے دیکھو بھئی شگفتہ! یہ اپنے وکیل صاحب ہیں انھیں تم ذرا بخش دیا کرنا آں!"

شگفتہ نے منہ اُٹھا کر اور ایک آنکھ داب کر غور سے مجھے دیکھا جیسے میرا مذاق اُڑا رہی ہو اور قہقہہ لگاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے اُس کی شوخی کچھ اچھی نہ معلوم ہوئی۔ شگفتہ کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھی اور یہی عمر میری بیٹی نیلوفر کی ہوگی۔ پھر بھلا میں اُس کی بدتمیزی کی حد تک شوخی کو کیونکر پسند کر سکتا ہے۔"

بیرسٹر صاحب کے چہرے پر ناگواری کے ہلکے سے تاثرات اُبھر آئے۔ پھر وہ کہنے لگے۔

"شگفتہ نے پروفیسر کی تاکید کے باوجود کبھی مجھے چچا نہ کہا۔ ہمیشہ وکیل جی، وکیل جی کہتی۔ جیسے مجھے چڑاتی ہو۔ اُس کی شوخیاں حد سے بڑھی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی اُس کی شوخیوں اور شرارتوں کی تہ میں ایک گہری سنجیدگی پاتا تو میں کانپ کانپ جاتا۔ وہ میری بیٹی نیلوفر سے بہت مشابہ تھی . . ."

بیرسٹر صاحب کی ادھ پکی مونچھوں میں پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں تھرتھرانے لگیں جسے اُنھوں نے رومال سے صاف کر ڈالا اور میز کی دراز سے نیلوفر اور شگفتہ کی تصویریں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔

"تم خود دیکھ لو۔ کتنی مشابہت ہے دونوں میں!"

واقعی دونوں حیرت انگیز طور پر ملتی جلتی تھیں۔

اور جب میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو بیرسٹر صاحب آنکھیں موندے پڑے تھے۔ پائپ کو اُنھوں نے میز پر رکھ دیا تھا۔

"بیرسٹر صاحب!" میں نے انھیں ہلکے سے پکارا۔

"آں ہاں کیا ———؟" بیرسٹر صاحب جیسے چونک گئے لیکن فوراً ہی پھر سنبھل گئے۔

"اوہ! ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں وہ قصہ بیان کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ہاں تو بھئی میں یہ کہہ رہا تھا۔ شگفتہ کی شوخیاں ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ کبھی میں اپنے کمرے میں بیٹھا ضروری کاغذات دیکھتا ہوتا تو وہ کمرے کے باہر لگی کال بیل اتنی زور زور سے لگاتار بجاتی رہتی کہ مجھے اُٹھ کر آنا ہی پڑتا۔ نتیجے کے طور پر میرا ذہنی تسلسل ٹوٹ جاتا

اور پھر تھوڑا بنانے کے بعد مجھے گھنٹوں تک وہ دو کرنی پڑتی۔

کبھی کوئی ضروری کام کرتا ہوتا تو بلب گل کر دیتی۔ اب کیا بتاؤں مجھے کیسی کوفت ہوتی۔ لڑکی کیا تھی شرارت اور شوخی کا پیکر تھی۔ کبھی میں اپنے باتھ روم سے نہا کر باہر نکلنا چاہتا تو دروازہ باہر سے بند پاتا! اب تم ہی بتاؤ تم میری جگہ ہوتے تو تمھیں کیسا معلوم ہوتا۔ لیکن نہیں تمھیں وہ احساس کہاں سے ہو سکتا ہے تمھیں اس میں لطف مل سکتا تھا لیکن مجھے . . . ؟"

بیرسٹر صاحب کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے انھوں نے پائپ کو میز پر سے اٹھا کر پھر رکھ دیا۔ اس سے ان کی ذہنی کیفیت پوری طرح آشکارا تھی۔ میں بھی خاموش تھا۔ کچھ توقف کے بعد وہ آگے بڑھے۔

"لیکن ایک دن تو اس نے حد کر دی۔ میں اپنے غسل خانے میں نہا رہا تھا۔ تولیہ اور کپڑے میں نے غسل خانے کی کواڑ پر لٹکا دئے تھے، اور دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ دفعتہً دروازے کے کواڑ پر لٹکے کپڑے کھینچ لئے گئے اور ایک نقرئی قہقہے کی آواز پورے کمرے میں گونج اٹھی۔ میرے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ میں صرف انڈرویر پہن کر نہا رہا تھا اور باہر کمبخت شگفتہ موجود تھی۔ بتاؤ بھلا کتنی جھنجھلاہٹ مجھے ہو سکتی تھی۔ شگفتہ میری بیٹی کے برابر تھی اور کوئی بھی باپ اس حالت میں اپنی بیٹی کے سامنے آنا پسند کر سکتا ہے ؟ میں نے غسل خانے کے اندر سے اس کی بہت منت سماجت کی اور کپڑے مانگے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور قہقہے لگاتی رہی۔ یہ بھی نہ کرتی تھی کہ کمرے ہی سے نکل جاتی۔ مجبور ہو کر مجھے اسی حالت میں باہر نکلنا پڑا۔ لاحول ولاقوۃ کس قدر کوفت ہو رہی تھی! مجھے دیکھ کر وہ قہقہے لگاتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئی۔ میرے غصّے کی انتہا نہ تھی میں نے اپنے دل میں تہیّہ کر لیا تھا کہ آج پروفیسر سے اس کی شکایت ضرور کروں گا! کپڑے بدل کر میں پروفیسر رحمان کے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ پروفیسر کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا اور شگفتہ چپ چاپ کونے میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔

"آہا! آیئے وکیل صاحب۔ آیئے! بہت دنوں بعد آئے ہیں آپ! ہاں بھئی آپ کو تو فرصت ہی نہیں رہتی۔ لیکن یہ کہئے کیسے آنا ہوا؟"

پروفیسر نے میرا پُرجوش خیر مقدم کیا۔

"دیکھئے پروفیسر رحمان بات یہ ہے کہ . . ."

معاً میری نگاہ شگفتہ پر پڑ گئی۔ اخبار میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے وہ مجھے تک رہی تھی۔ نہ جانے اس کی نظروں میں کیا بات تھی کہ اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہاں، ہاں، کیا بات ہے۔ آپ خاموش کیوں ہو گئے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"بات یہ ہے پروفیسر صاحب کہ آج میرا ارادہ کورٹ جانے کا نہیں اس لئے آپ کی طرف چلا آیا" میں نے مسکراتے ہوئے بات ٹال دی۔

"اوہ! یہ تو بہت ہی اچھا کیا۔ ارے دیکھو بھئی شگفتہ بیٹی! وکیل صاحب کو چائے وائے تو پلاؤ۔"

شگفتہ اٹھ کر چلی گئی اور میں پروفیسر سے باتیں کرنے لگا۔

چائے آئی تو میری پیالی میں شکر نہ تھی میں نے شگفتہ کی طرف دیکھا۔ شگفتہ نے خاموشی سے شکر کی ڈش میری طرف سرکا دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بالکل غیر ارادی طور پر وہ مجھے پریشان کیا کرتی تھی۔

اس کے بعد یہ ضرور ہو گیا کہ اس کی شرارتوں میں کمی آگئی تھی لیکن شوخیاں تو اس کی زندگی کا ایک جزو تھیں۔ وہ میرے کمرے میں آکر مجھ سے عجیب عجیب باتیں کرتی۔

"اِیں جی۔ یہ آپ کے سر پر اُگے ہوئے بڑے بڑے بالوں کو چھیل کر اگر چکنا کر دیا جائے تو آپ کتنے خوبصورت معلوم ہوں اللہ قسم!"

"وکیل جی جب آپ کی شادی ہوئی ہو گی تو آپ کی بیگم آپ کو گود میں لے کر چمکارتی ہوں گی نا!"

"پیدا ہوئے وکیل تو ابلیس نے کہا
لو آج ہم بھی صاحبِ اولاد ہو گئے!"

اور میں بھنا جاتا۔ میں اسے ڈانٹ کر بھگا دینا چاہتا لیکن وہ ڈھیٹ بنی بیٹھی

ہنستی رہی۔ میں نے جان بوجھ کر کئی بار اُسے اپنی بیوی اور بیٹی کے خطوط پڑھنے کو دئے لیکن اُس کے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ خدا جانے وہ کیا چاہتی تھی کچھ دنوں بعد اُس کی شرارتیں پھر بڑھ گئیں اور میں پھر پریشان رہنے لگا۔ پروفیسر سے شکایت کرنے کی ٹھانتا تو شگفتہ کی نگاہیں آڑے آجاتیں۔ اُف! اُس کی آنکھوں میں کیا جادو تھا۔

پھر وہی بجلی کے بلب کا جلنا بجھنا، کال بیل کا مسلسل بجتے رہنا۔ ایک دو شرارتیں تھیں جو کہوں۔

آخر میں نے خود ہی اُس کی اصلاح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک دن میرے کمرے میں بہت دیر میں ٹک چھوڑ کر وہ بھاگ رہی تھی کہ میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ گھبرا گئی اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ اُس نے جلدی سے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا اور میرے ہاتھ کواڑ پر پڑ گئے۔ اندر کمرے سے اُس کے قہقہے کی آواز آرہی تھی۔ اُف ایسی جھنجھلاہٹ ہوئی تھی مجھے ایسی خفت، کتنی شرمندگی۔ اُف میں بیان نہیں کر سکتا۔۔"

بیرسٹر صاحب کے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھر جھلک پڑی تھیں جسے انھوں نے رومال سے پھر صاف کر ڈالا اور یوں نڈھال ہوگئے جیسے بہت تھک گئے ہوں۔ کچھ دیر رُک کر پھر کہنے لگے۔

"میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب اُسے اپنے کمرے میں نہ آنے دوں گا۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ وہ میرے کمرے میں برابر آتی رہی اور مجھے طرح طرح سے پریشان کرتی رہی۔ بہت بے باک تھی وہ! اور سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں بھی اُس کی شرارتوں کا عادی ہو چلا تھا کہ ایک دن۔۔"

بیرسٹر صاحب کچھ دیر کے لئے رُک گئے۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔" بیرسٹر صاحب کی کہانی کا کلائمکس سننے کے لئے میں بیتاب ہو گیا۔

بیرسٹر صاحب کہنے لگے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ نڈھال معلوم ہو رہے تھے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا ایک دن اُس کی آنکھوں میں مجھے نہ جانے کیا نظر آیا جیسے مجھے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو اور پھر جیسے کسی غیبی طاقت نے مجھے اُس سے جُدا کر دیا۔ میں اُس پر بُری طرح برس پڑا۔

"ابھی نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ فوراً نکل جاؤ!!"

شگفتہ نے حیران حیران اور کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور چُپ چاپ واپس مُڑ گئی۔ اُف! اُس کی آنکھوں میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا تھا اور سوز و درد کا ایک طوفان تھا جو اُمڈا چلا آرہا تھا۔

ساری رات میں بے چین رہا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔

دوسرے دن صبح پروفیسر رحمان نے مجھے بتایا کہ رات شگفتہ کی طبیعت اچانک بہت بگڑنے لگی تھی اس لئے وہ اُسے اُس کے ننھیال جانے والی گاڑی پر بٹھا آئے ہیں۔

میں پھر اُس شہر میں ایک لمحہ کے لئے نہ رُک سکا اور سیدھا گھر چلا آیا۔ میرا سکون چین مجھ سے چھن گیا تھا۔ گھر میں بھی مجھے چین نہ ملا اور میں بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ چلا گیا۔

میں کوشش اور خواہش کے باوجود پھر کبھی اُس شہر میں نہ گیا اور نہ شگفتہ اور پروفیسر رحمان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکا۔"

بیرسٹر صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔

فضا بہت بوجھل ہو گئی تھی۔ ماحول پر گہری سنجیدگی نے اپنا پر تو پھیلا رکھا تھا۔ بیرسٹر صاحب کی داستان بے حد تاثر انگیز تھی۔ وہ بالکل خاموش تھکے تھکے سے بیٹھے تھے۔

چلنے کے لئے میں کرسی سے اُٹھنے لگا دفعتاً میری نگاہ بیرسٹر صاحب کی پشت پہ آویزاں قد آدم آئینے پر پڑ گئی۔

بیرسٹر صاحب میز کے پیچھے اپنے ہاتھوں میں شگفتہ اور نیلوفر کی تصویریں لئے تاش کے پتّے کی طرح پھینٹ رہے تھے جیسے دونوں میں فرق سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں! آئینے میں عکس صاف دکھائی دے رہا تھا!!



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱۔ آپ کس طرح پانی پیتے ہیں؟

عام طور پر لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ نہیں کرتے۔ لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ درحقیقت چھوٹی باتیں بھی بڑے نتائج کا باعث ہو سکتی ہیں اور دُور رس اثرات رکھتی ہیں۔

بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پانی پینا بھی ہے۔ بہت سے لوگ ایک ہی سانس میں پانی سے بھرا گلاس خالی کر دیتے ہیں۔ پانی پینے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ طبّی اصول سے تین سانس میں پانی پینا مفید ہے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح پانی پینے سے پُوری تسکین اور سیری حاصل ہو جاتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ پیاس کی حالت میں اگر ایک ہی سانس میں زیادہ پانی پیا جائے تو پیاس ایک حد تک ختم ہونے کے باوجود پانی کی خواہش باقی رہ جاتی ہے اور پُوری سیری نہیں ہوتی۔

تین سانس میں پانی پینا صحت کے لئے مفید بھی ہے۔ اس طرح پانی پینے سے پیاس کی تکلیف اور پریشانی سے نجات مل جاتی ہے۔ ٹھنڈک کی کمی سے معدے میں گرمی اور سوزش کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو آہستہ آہستہ چند بار میں دُور کرنا آسان ہے۔ اس کے برعکس ایک ہی سانس میں زیادہ مقدار میں پانی پینے سے معدے کی حرارت کی شدت پُورے طور پر ختم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ معدے کی حرارتِ غریزیہ و اصلیہ یکایک ختم یا کمزور ہو جائے، جس کی وجہ سے معدے اور جگر کے مزاج فاسد ہو کر مختلف بیماریاں پیدا ہو جائیں۔ خصوصاً گرم مُلکوں میں یا گرمی کے موسم میں شدید اندیشہ ہوتا ہے کہ ایک ہی سانس میں زیادہ پانی پینے سے کوئی مرض لاحق ہو جائے۔ کبھی کبھی ایک سانس میں پانی پینے سے سانس گھٹ جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ کیونکہ نرخرے میں یکایک زیادہ مقدار میں پانی پہنچنے سے سانس کی نالی بالکل بند ہو سکتی ہے۔

تیزی کے ساتھ پانی پینے اور یکایک زیادہ مقدار میں معدے میں پانی انڈیلنے سے دردِ جگر پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کو کھڑے کھڑے پانی پینے کی عادت ہوتی ہے۔ یہ عادت بھی بے حد نقصان دہ اور مضرت رساں ہے۔ کھڑے کھڑے پانی پینے سے معدے میں پانی پہنچنے کے ساتھ ہی جگر اس پانی کو اعضاء میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کھڑے ہو کر پانی پینے سے دفعتہً تیزی کے ساتھ معدے میں پانی پہنچ جاتا ہے۔ اس سے اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ پانی کی ٹھنڈک معدے کی حرارتِ اصلیہ کو بُجھا نہ دے اور معدے میں کوئی بیماری پیدا نہ ہو جائے۔

کھڑے ہو کر پانی پینے سے بدن کے نچلے اعضاء میں پانی جلد نفوذ کر جاتا ہے۔ اس طرح فوطوں میں پانی اُتر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں۔ اسی لئے اطبّا نے کھڑے ہو کر پانی نہ پینے کی ہدایت کی ہے۔

یہ باتیں چھوٹی ہیں۔ لیکن ان کی طرف توجہ نہ کرنے سے بڑے اور تلخ نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

۲۔ زمین کند ــــ ایک مفید سبزی

یہ ایک لذیذ اور مفید سبزی ہے۔ اس کا اچار بھی لذیذ ہوتا ہے۔ یہ سبزی موسمِ سرما میں ہر جگہ ملتی ہے اور بکثرت کھائی جاتی ہے۔

یہ خوش ذائقہ سبزی دوائی افادیت بھی رکھتی ہے۔ زمین کند ہاضمہ کی حرارت کو تیز کرتا اور اشتہا پیدا کرتا ہے۔ کف اور بواسیر کے لئے نافع ہے۔ سنگرہنی اور پیچش میں مفید ہے۔ اس کے کھانے سے معدے کی اصلاح ہوتی ہے۔ جنگلی زمین کند

بواسیر کے لئے زیادہ مفید ہے۔

پیٹ کا گولہ، ریاح اور موٹاپا دُور کرتا ہے۔ کف اور صفرا میں نافع ہے۔

بواسیر کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔

۳ • صحت اور زندگی کے لئے پھلوں کی افادیت و اہمیت

چھوٹے چھوٹے پھل انسانوں کے لئے قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں۔ ان کے استعمال سے تازہ خون پیدا ہوتا ہے، اعضائے ہضم کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ پھل قبض کُشا اور طاقت بخش ہوتے ہیں۔ ان میں نمکیات، کیلشیم، فولاد، فاسفورس، سوڈیم اور میگنیشیم وغیرہ ہوتے ہیں، جو جسم کی پرورش کے لئے بہت ضروری ہیں۔

کچے پھل بہت زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ اُن میں وٹامنز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ گلے سڑے پھل مضر ہوتے ہیں۔

پھل اپنے اندر حیات بخش وٹامنز کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔ انھیں صحیح طریقے پر استعمال کیا جائے تو بہت سے امراض سے بچنے اور نقصِ تغذیہ کو دُور کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

کشمش، آڑو اور انگور کھانے سے گُردوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ سنگترہ خون کی صفائی کے لئے معجز نما اثرات کا حامل ہے۔ انگور، انار، سیب، پستہ، بادام وغیرہ قیمتی ہی پھلوں میں نہیں، ارزاں اور عام پھلوں میں بھی قدرت نے حیات بخش اجزاء کا خزانہ بھر دیا ہے۔ پھلوں میں صحت کی حفاظت کی صلاحیت بھی موجود ہے۔

پھل کھانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انھیں حتی الامکان تازہ حالت میں کھایا جائے۔ جن پھلوں کے چھلکے کھائے جاسکتے ہیں اُن کا چھلکا دُور نہ کیا جائے۔ پھلوں کے غذائی عناصر برقرار رکھنے میں ان کے چھلکے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مختلف پھلوں میں ۳ فیصدی سے ۸۲ فیصدی تک غذائی صلاحیت اُن کے چھلکوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ وٹامنز اور معدنی مادّے زیادہ تر چھلکوں یا اُن سے ملے ہوئے گُودوں کی سطح کے نیچے ہوتے ہیں۔

پھل کو چُھری یا چاقو سے کاٹنے یا چھیلنے سے اُس کی سطح پر جو سُرخی یا سیاہی مائل کیمیاوی رنگ پیدا ہوجاتا ہے وہ بھی چند منٹ میں وٹامنز سی کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔ اِس لئے پھل کو چُھری سے کاٹ کر کھانے کے بجائے بہتر طریقہ یہ ہے کہ دانتوں سے کاٹ کر اچھی طرح چبا کر کھایا جائے۔ اِس طرح پھلوں کی غذائی صلاحیت پُوری طرح برقرار رہتی ہے اور یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ چبانے کا عمل دانتوں کو اور دانتوں کی جڑ کے عضلات کو قوت بخشتا ہے۔

ہر کھانے کے بعد کچھ ایسے پھل کھانے چاہئیں جنھیں چبانا ضروری ہو۔ اِس سے دانت شکری اور نشاستی غذائی اثر سے پاک ہوجاتے ہیں اور دشتہ گلنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

سیب، شفتالو، سنگترہ، کھجور، خوبانی، کشمش، منقّیٰ، آلو بخارا کھانا کھانے کے بعد کھانے کے لئے مناسب پھل ہیں۔ بالخصوص کھجور میں سب سے زیادہ افادیت ہے۔

مصنوعی طور پر پکائے ہوئے پھلوں کے مقابلے میں درخت پر پکے ہوئے پھل غذائی اعتبار سے بہتر ہوتے ہیں۔

پھل اپنے اندر زود ہضم شکری مادّوں کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتے ہیں۔ یہ مادّے بدن کو قوت بخش کر اُسے زندگی کی سرگرمی قائم رکھنے کے قابل بناتے ہیں۔ کشمش، منقّیٰ، املی کا گُودا اور کھجوریں بدن کے لئے شکری مادّوں کا بہت اہم ذریعہ ہیں۔ آم، انار، انگور، سیب امرود یہ سارے پھل شکری مادّہ رکھتے ہیں۔

دوائی اعتبار سے بھی پھل بہت اہمیت اور بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں بہت سے امراض میں پھلوں سے غذا اور دوا کا مشترکہ کام لیا جاتا ہے۔ پھل اشتہا کو تیز کرتے ہیں، ہضم میں مدد دیتے ہیں بدن کو تقویت دیتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اپنی شور کیفیت سے تیزابی کیفیت کو توڑنے اور جسم کے اندر دونوں کیفیتوں کے درمیان توازن اور اعتدال قائم رکھنے میں پھل بیش بہا خدمات انجام دیتے ہیں۔

۴ • کامیاب زندگی کے لئے صحت کی اہمیت

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ جو انسان بہترین صحت کا مالک ہے وہی زندہ ہے، کیونکہ اُس کے جسم کی ہر رگ میں زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ زندگی کی بازی گاہ میں وہی کامیاب و کامراں ہوسکتا ہے۔

اِس سخت مقابلے کے زمانے میں کامیاب و کامراں ہونے کے لئے اچھی صحت اور قوت لازمی ہے۔ وہ آدمی جو سخت سے سخت کام کرسکتا ہے۔ اپنے ارادے پر جما رہتا ہے۔ جو آگے کی طرف قدم بڑھائے چلا جاتا ہے، جبکہ اُس کے ساتھی مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ کام کو ہاتھ میں لے کر ختم کئے بغیر دم نہیں لیتا۔ جس کا عزم پُختہ، جس کا ارادہ غیر متزلزل ہے، وہی میدانِ عمل میں بازی لے جاتا ہے اور کامیاب و کامراں ہوتا ہے۔

دُنیا کے بڑے بڑے انعامات اُس آدمی کے نصیب میں ہیں جس کا جسم توانا، پھیپھڑے قوی اور جس کی جسمانی قوت بہت زیادہ ہو۔ اُس کے مقابلے میں نہ خاندانی وجاہت ٹھہر سکتی ہے، نہ قابلیت، نہ تعلیم، نہ تربیت۔ ذاتی طاقت کا مقابلہ کوئی چیز بھی نہیں کرسکتی اور ذاتی طاقت کا انحصار ہے زبردست اور بھرپور قوتِ حیات پر۔ جو چیز تمھاری تندرستی اور صحت میں اضافہ کرسکے وہ تمھاری ترقی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

اکثر لوگ سمجھتے ہیں وہ عظیم الشان کارنامے صرف اُمنگ اور تمنا کے بل بُوتے پر کرسکتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بڑے ارادوں کی بُنیاد اچھی صحت اور توانا جسم پر ہے۔

۵ • زندگی کی نعمتیں

دُنیا میں کون ایسا ہوگا جو زندگی کی بہترین نعمتوں سے اپنا دامن نہیں بھرنا چاہتا۔ لیکن ان میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو اپنے دل میں اُن نعمتوں کی صرف آرزو رکھتے ہیں لیکن اُنھیں حاصل کرنے کے لئے جدّوجہد نہیں کرتے۔

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے —— زندگی کی بہترین نعمتیں حدِ رسائی کی سب سے اونچی شاخ پر ہوتی ہیں اور وہ ایسے سرگرم عمل بلند حوصلہ لوگوں کا انتظار کرتی ہیں جو ہاتھ بڑھا کر اُنھیں اپنے دامن میں لے لیں۔ اُنھیں ایسے لوگ حاصل کرلیتے ہیں جو اپنی بیدار قوتوں کو اُنھیں حاصل کرنے کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ ناساعد حالات سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔

"دُنیا کا کوئی معرکہ اُس وقت تک سر نہیں ہوا —— "دنیا میں کسی نے اُس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کی، جب تک تمناؤں اور تصوّرات سے آگے بڑھ کر اُسے حاصل کرنے کے لئے ٹھوس عمل نہ کیا جائے، سرگرم عمل نہ ہوا جائے۔

۶ • صحت و زندگی کے لئے ورزش

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے —— "انسانی ضروریات میں سب سے پہلی ضرورت ہوا ہے۔ اُس کے بعد خوراک اور تیسرے درجے پر صحت اور کسرت اور ورزش کا درجہ ہے۔ ہمارے پاس تازہ ہوا کی کافی مقدار ہو اور مقوّی غذا بھی مناسب طور پر ملتی رہے۔ پھر بھی روزانہ ورزش کے بغیر ہمارا جسم صرف ہوا اور خوراک ہی سے تندرست نہیں رہ سکتا اور نہ بڑھاپا لانے والے عمل کو روک سکتا ہے۔"

تندرستی اور طویل عمری پر ورزش کے اثرات کے متعلّق اعداد و شمار تو موجود نہیں ہیں، لیکن ڈاکٹر اور اطبّا ورزش کو انسان کے لئے اِتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنی نیند، خوراک، کام، تفریح اور سکون و اطمینان ہے۔ پابندی کے ساتھ ورزش کی جائے تو دَورانِ خون درست رہتا ہے۔ اِس سے قوتِ ہضم کو تقویت و طاقت ملتی ہے۔ آنتیں اپنے فرائض اچھی طرح انجام دینے لگتی ہیں، ملیّن (قبض کشا) دواؤں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر شام کو لمبی سیر کی جائے تو نیند بہت اچھی اور گہری آتی ہے۔ کبھی کسی خواب آور دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ورزش کا ایک اور فائدہ اور شاید سب سے اہم فائدہ نظامِ عصبی پر اُس کا اثر ہے۔ ایک مغموم اور متفکّر لیکن نوجوان پر پانچ میل تک ٹہلنے کا جتنا اچھا اثر ہوتا ہے اُتنا کسی دوا کا نہیں ہوتا۔ تجربے سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ عصبی تناؤ باقاعدہ ورزش سے جاتا رہتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ثابت قدمی اور پابندی سے ورزش کی جائے۔

تندرست آدمیوں کو عمر کے بڑے حصّے میں باضابطہ ورزش کرنی چاہیئے۔ ستّر برس کی عمر کے بعد شدید ورزش نہ کرنی چاہیئے۔ بُوڑھے آدمیوں کے لئے لمبی سیر کرنا، تیرنا اور باغبانی مفید اور مناسب ورزش ہیں۔

اُن لوگوں کے لئے جو کسی عارضہ میں مُبتلا ہوں قلبی یا کسی اور عارضہ میں۔ اُن کے لئے ہلکی ورزش مناسب ہے۔

۷ • انسان کی سب سے بڑی طاقت

یقین انسان کی ناقابلِ تسخیر قوت —— انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ زندگی کی بازی گاہ میں وہی لوگ کامیاب و کامران ہوتے ہیں جو یقینِ محکم کے مالک ہوتے ہیں۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے —— یقین ہی وہ ناقابلِ تسخیر قوت ہے جو پہاڑوں کو بھی ہلا سکتی ہے۔ کتنے ناممکن کام اُن لوگوں نے کر دکھائے جن کی خود اعتمادی بیدار ہو چکی تھی۔

آپ کے یقین کے مطابق ہی آپ کی زندگی ہوگی۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اہم بات یہ ہے کہ آدمی زندگی کو اُمید اور مسرّت سے دیکھے اور اپنی قوتوں پر یقین رکھتا ہوا کامیابی کی طرف بڑھتا رہے۔

"اگر میں ناکام ہو گیا تو؟" بس اِسی شک اور یقین کی کمی نے بہت سے لوگوں کی زندگیوں کو ناکام بنا دیا۔ اگر ہم خود اعتمادی سے سوچنے لگیں —— شک و شبہ کو دل سے نکال دیں تو زندگی ہی بدل جائے۔ ہم جبھی ناکام ہوتے ہیں جب اپنی صلاحیت پر شک کرکے خود اعتمادی کھو بیٹھتے ہیں۔

یقین ہی فتح و کامرانی کی کلید ہے۔ اگر یقینِ محکم حاصل ہے تو کامرانی خود آپ کے قدم چُومے گی۔ یقین ہی عالمِ کائنات کا عجیب و غریب معجزہ ہے۔ انسان اپنی کامرانی کا عالی شان محل یقین ہی کی مستحکم بُنیادوں پر تعمیر کرتا ہے —— یقین انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

۸ • نکتہ چینی سے نہ گھبرائیے

بیشتر لوگوں کے لئے نکتہ چینی بہت تلخ ہوتی ہے۔ وہ نکتہ چینی کرنے

بواسیر کے لئے زیادہ مفید ہے۔

پیٹ کا گولہ، ریاح اور موٹاپا دور کرتا ہے۔ کف اور صفرا میں نافع ہے۔

بواسیر کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔

۳ • صحت اور زندگی کے لئے پھلوں کی افادیت واہمیت

چھوٹے بڑے پھل انسانوں کے لئے قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں۔ ان کے استعمال سے تازہ خون پیدا ہوتا ہے، اعضائے ہضم کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ پھل فرحت بخش اور طاقت بخش ہوتے ہیں۔ ان میں نمکیات، کیلسیم، فولاد، فاسفورس، سوڈیم اور میگنیشیم وغیرہ ہوتے ہیں، جو جسم کی پرورش کے لئے بہت ضروری ہیں۔

کچے پھل بہت زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ اُن میں وٹامنز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ گلے سڑے پھل مضر ہوتے ہیں۔

پھل اپنے اندر حیات بخش وٹامنز کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔ انھیں صحیح طریقے پر استعمال کیا جائے تو بہت سے امراض سے بچنے اور نقص تغذیہ کو دور کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

کشمش، آڑو اور انگور کھانے سے گردوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ سنگترہ خون کی صفائی کے لئے معجز نما اثرات کا حامل ہے۔ انگور، انار، سیب، پستہ، بادام وغیرہ قیمتی ہی پھلوں میں نہیں، ارزاں اور عام پھلوں میں بھی قدرت نے حیات بخش اجزاء کا خزانہ بھر دیا ہے۔ پھلوں میں صحت کی حفاظت کی صلاحیت بھی موجود ہے۔

پھل کھانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انھیں حتی الامکان تازہ حالت میں کھایا جائے۔ جن پھلوں کے چھلکے کھائے جاسکتے ہیں اُن کا چھلکا دور نہ کیا جائے۔ پھلوں کے غذائی عناصر برقرار رکھنے میں ان کے چھلکے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مختلف پھلوں میں ۴ فیصدی سے ۸۲ فیصدی تک غذائی صلاحیت اُن کے چھلکوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ وٹامنز اور معدنی مادے زیادہ تر چھلکوں یا اُن سے ملے ہوئے گودوں کی سطح کے نیچے ہوتے ہیں۔

پھل کو چھری یا چاقو سے کاٹنے یا چھیلنے سے اس کی سطح پر جو سرخی یا سیاہی مائل کیمیاوی رنگ پیدا ہوجاتا ہے وہ بھی چند منٹ میں وٹامن سی کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔ اس لئے پھل کو چھری سے کاٹ کر کھانے کے بجائے بہتر طریقہ یہ ہے کہ دانتوں سے کاٹ کر اچھی طرح چبا کر کھایا جائے۔ اس طرح پھلوں کی غذائی صلاحیت پوری طرح برقرار رہتی ہے اور یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ چبانے کا عمل دانتوں کو اور دانتوں کی جڑ کے عضلات کو قوت بخشتا ہے۔

ہر کھانے کے بعد کچھ ایسے پھل کھانے چاہئیں جنھیں چبانا ضروری ہو۔ اس سے دانت شکری اور نشاستی غذائی اثر سے پاک ہوجاتے ہیں اور ریشہ نکلنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

سیب، شفتالو، سنگترہ، کھجور، خوبانی، کشمش، منقیٰ، آلو بخارا کھانا کھانے کے بعد کھانے کے لئے مناسب پھل ہیں۔ بالخصوص کھجور میں سب سے زیادہ افادیت ہے۔

مصنوعی طور پر پکائے ہوئے پھلوں کے مقابلے میں درخت پر پکے ہوئے پھل غذائی اعتبار سے بہتر ہوتے ہیں۔

پھل اپنے اندر زود ہضم شکری مادّوں کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتے ہیں۔ یہ مادّے بدن کو قوت بخش کر اُسے زندگی کی سرگرمی قائم رکھنے کے قابل بناتے ہیں۔ کشمش، منقیٰ، املی کا گودا اور کھجوریں بدن کے لئے شکری مادّوں کا بہت اہم ذریعہ ہیں۔ آم، انار، انگور، سیب امرود یہ سارے پھل شکری مادّہ رکھتے ہیں۔

دوائی اعتبار سے بھی پھل بہت اہمیت اور بڑی قدر وقیمت رکھتے ہیں بہت سے امراض میں پھلوں سے غذا اور دوا کا مشترکہ کام لیا جاتا ہے۔ پھل اشتہا کو تیز کرتے ہیں، ہضم میں مدد دیتے ہیں بدن کو تقویت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی شور کیفیت سے تیزابی کیفیت کو توڑنے اور جسم کے اندر دونوں کیفیتوں کے درمیان توازن اور اعتدال قائم رکھنے میں پھل بیش بہا خدمات انجام دیتے ہیں۔

۴ • کامیاب زندگی کے لئے صحت کی اہمیت

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ جو انسان بہترین صحت کا مالک ہے وہی زندہ ہے، کیونکہ اُس کے جسم کی ہر رگ میں زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ زندگی کی بازی گاہ میں وہی کامیاب و کامراں ہوسکتا ہے۔

اس سخت مقابلے کے زمانے میں کامیاب و کامراں ہونے کے لئے اچھی صحت اور قوت لازمی ہے۔ وہ آدمی جو سخت سے سخت کام کرسکتا ہے۔ اپنے ارادے پر جما رہتا ہے۔ جو آگے کی طرف قدم بڑھائے چلا جاتا ہے، جبکہ اُس کے ساتھی منہ موڑ لیتے ہیں۔ کام کو ہاتھ میں لے کر ختم کئے بغیر دم نہیں لیتا۔ جس کا عزم پختہ، جس کا ارادہ غیر متزلزل ہے، وہی میدان عمل میں بازی لے جاتا ہے اور کامیاب و کامراں ہوتا ہے۔

دُنیا کے بڑے بڑے انعامات اُس آدمی کے نصیب میں ہیں جس کا جسم توانا، پٹھے قوی اور جس کی جسمانی قوت بہت زیادہ ہو۔ اُس کے مقابلے میں نہ خاندانی وجاہت ٹھہر سکتی ہے، نہ قابلیت، نہ تعلیم، نہ تربیت۔ ذاتی طاقت کا مقابلہ کوئی چیز بھی نہیں کرسکتی اور ذاتی طاقت کا انحصار ہے زبردست اور بھرپور قوت حیات پر۔ جو چیز تمھاری تندرستی اور صحت میں اضافہ کرسکے وہ تمھاری ترقی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

اکثر لوگ سمجھتے ہیں وہ عظیم الشان کارنامے صرف اُمنگ اور تمنا کے بل بوتے پر کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بڑے ارادوں کی بُنیاد اچھی صحت اور توانا جسم ہوتا ہے۔

۵ • زندگی کی نعمتیں

دُنیا میں کون ایسا ہوگا جو زندگی کی بہترین نعمتوں سے اپنا دامن نہیں بھرنا چاہتا۔ لیکن اُن میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو اپنے دل میں اُن نعمتوں کی صرف آرزو رکھتے ہیں لیکن اُنھیں حاصل کرنے کے لئے جدّوجہد نہیں کرتے۔

مشہور مفکّر ڈگلس لرٹن نے لکھا ہے ـــــ زندگی کی بہترین نعمتیں عدرسائی کی سب سے اونچی شاخ پر ہوتی ہیں اور وہ ایسے سرگرم عمل بلند حوصلہ لوگوں کا انتظار کرتی ہیں جو ہاتھ بڑھا کر اُنھیں اپنے دامن میں لے لیں۔ اُنھیں ایسے لوگ ـــ حاصل کر لیتے ہیں جو اپنی بیدار قوتوں کو اُنھیں حاصل کرنے کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ ناسازگار حالات سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔

دُنیا کا کوئی معرکہ اُس وقت تک سر نہیں ہوا ـــــ دُنیا میں کسی نے اُس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کی، جب تک تمناؤں اور تصورات سے آگے بڑھ کر اُسے حاصل کرنے کے لئے ٹھوس عمل نہ کیا جائے، سرگرم عمل نہ ہو جائے۔

۶ • صحت و زندگی کے لئے ورزش

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "انسانی ضروریات میں سب سے پہلی ضرورت ہوا ہے۔ اُس کے بعد خوراک اور تیسرے درجے پر صحت اور کسرت اور ورزش کا درجہ ہے۔ ہمارے پاس تازہ ہوا کی کافی مقدار ہو اور مقوّی غذا بھی مناسب طور پر ملتی رہے۔ پھر بھی روزانہ ورزش کے بغیر ہمارا جسم صرف ہوا اور خوراک ہی سے تندرست نہیں رہ سکتا اور نہ بڑھاپا لانے والے عمل کو روک سکتا ہے۔"

تندرستی اور طویل عمری پر ورزش کے اثرات کے متعلق اعداد و شمار تو موجود نہیں ہیں، لیکن ڈاکٹر اور اطبّا ورزش کو انسان کے لئے اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنی نیند، خوراک، کام، تفریح اور سکون و اطمینان ہے۔ پابندی کے ساتھ ورزش کی جائے تو دورانِ خون درست رہتا ہے۔ اِس سے قوتِ ہضم کو تقویت و طاقت ملتی ہے۔ آنتیں اپنے فرائض اچھی طرح انجام دینے لگتی ہیں۔ ملیّن (قبض کُشا) دواؤں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر شام کو لمبی سیر کی جائے تو نیند بہت اچھی اور گہری آتی ہے۔ کبھی کسی خواب آور دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ورزش کا ایک اور فائدہ اور شاید سب سے اہم فائدہ نظامِ عصبی پر اُس کا اثر ہے۔ ایک مغموم اور متفکر لیکن نوجوان پر پانچ میل تک ٹہلنے کا جتنا اچھا اثر ہوتا ہے اُتنا کسی دوا کا نہیں ہوتا۔ تجربے سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ عصبی تناؤ باقاعدہ ورزش سے جاتا رہتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ثابت قدمی اور پابندی سے ورزش کی جائے۔

تندرست آدمیوں کو عمر کے بڑے حصّے میں باضابطہ ورزش کرنی چاہئے۔ ستّر برس کی عمر کے بعد شدید ورزش نہ کرنی چاہئے۔ بوڑھے آدمیوں کے لئے لمبی سیر کرنا، تیرنا اور باغبانی مفید اور مناسب ورزش ہیں۔

اُن لوگوں کے لئے جو کسی عارضہ میں مُبتلا ہوں۔ قلبی یا کسی اور عارضہ میں۔ اُن کے لئے ہلکی ورزش مناسب ہے۔

۷ • انسان کی سب سے بڑی طاقت

یقین انسان کی ناقابلِ تسخیر قوت ـــــ انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ زندگی کی بازی گاہ میں وہی لوگ کامیاب و کامراں ہوتے ہیں جو یقین محکم کے مالک ہوتے ہیں۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ یقین ہی وہ ناقابلِ تسخیر قوت ہے جو پہاڑوں کو بھی ہلا سکتی ہے۔ کتنے ناممکن کام اُن لوگوں نے کر دکھائے جن کی خود اعتمادی بیدار ہو چکی تھی۔

آپ کے یقین کے مطابق ہی آپ کی زندگی ہوگی۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اہم بات یہ ہے کہ آدمی زندگی کو اُمید اور مسرّت سے دیکھے اور اپنی قوتوں پر یقین رکھتا ہوا کامیابی کی طرف بڑھتا رہے۔

"اگر میں ناکام ہو گیا تو؟" بس اسی شک اور یقین کی کمی نے بہت سے لوگوں کی زندگیوں کو ناکام بنا دیا۔ اگر ہم خود اعتمادی سے سوچنے لگیں ـــ شک و شبہ کو دل سے نکال دیں تو زندگی ہی بدل جائے۔ ہم جبھی ناکام ہوتے ہیں جب اپنی صلاحیت پر شک کر کے خود اعتمادی کھو بیٹھتے ہیں۔

یقین ہی فتح و کامرانی کی کلید ہے۔ اگر یقینِ محکم حاصل ہے تو کامرانی خود آپ کے قدم چومے گی۔ یقین ہی عالم کائنات کا عجیب و غریب معجزہ ہے۔ انسان اپنی کامرانی کا عالی شان محل یقین ہی کی مستحکم بُنیادوں پر تعمیر کرتا ہے ـــــ یقین انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

۸ • نکتہ چینی سے نہ گھبرایئے

بیشتر لوگوں کے لئے نکتہ چینی بہت تلخ ہوتی ہے۔ وہ نکتہ چینی کرنے

والے کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت نکتہ چیں کا ممنون ہونا چاہئے۔ وہ آپ کو خامیوں کی اصلاح کرنے کے لئے آپ کو روشنی دیتا ہے۔

مشہور مفکر کے۔ نولسن نے لکھا ہے ——— "مناسب نکتہ چینی کرنے والا اس دوست سے بہتر ہے جو آپ کے عیب تو دیکھتا ہے لیکن زبان بند رکھتا ہے۔" پرانی کتابوں میں اکثر یہ فقرہ ملتا ہے ——— "ایک دوست کے دئے ہوئے زخم بڑے وفادار ہوتے ہیں۔" لیکن موجودہ دور کی رفاقت آپ کو کوئی دکھ نہیں دیتی۔ یہ دوستوں کو ہوا دینا جانتی ہے۔ کسی طرح کی نکتہ چینی کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آپ اُسے اپنا صحیح دوست سمجھتے ہیں جو آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے۔

تحسین حاصل کرنے کی خواہش کے اثرات صحت مند نہیں ہوتے۔ آپ کے دوست آپ کی اُس خوبی کی تعریف کرتے ہیں جو آپ میں موجود نہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ پھولے نہیں سماتے۔ آپ کے دوست کی جھوٹی تعریف آپ کی جد وجہد کی کشمکش کو ختم کر دیتی ہے۔ ہماری جد و جہد کی رفتار مخالفت کی موجودگی میں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ مخالفت ہی مخالفت کا ہونا اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا صرف تعریف کا ہونا۔ دونوں باتوں کی انتہا نقصان دہ ہے۔

کوئی آپ کے کسی کام کو بہت اچھا کہتا ہے اور دوسرا اُس کے چند حصوں پر اعتراض کرتا ہے، تو نکتہ چینی سے زیادہ فائدہ ہوگا بہ نسبت تعریف کے۔ اِس طرح آپ اپنے کام کے کمزور حصوں پر زیادہ نظر دوڑا سکیں گے لیکن صرف تعریف آپ کو کچھ نہیں سکھاتی، کوئی روشنی نہیں دیتی۔ ہو سکتا ہے اس طرح آپ اپنے ناقابلِ اطمینان کام سے مطمئن ہو جائیں۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سیما پروین۔ پٹنہ

س۔ اردو سے لوگ اتنا حسد کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ دُنیا ہر قابلِ رشک چیز سے حسد کرتی آئی ہے۔

س۔ مُلک میں باہمی نااتفاقی کے اسباب کیا ہیں؟

ج۔ صرف ایک سبب ——— تعصّب!

س۔ بھائی جان! داغ کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ سُنیئے ؎

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دلِ بے مُدعا دیا تُو نے!

ذکیہ سجاد پھلواری شریف۔ پٹنہ

س۔ عورت کے متعلق ارسطو نے جو کہا ہے کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج۔ جی نہیں۔ ہم دُنیا کے ان دانشوروں کے ہمخیال ہیں ——— ٹامس مور نے کہا ہے "نیک عورت رات کا تارا اور صبح کا ہیرا ہے"، شیکسپیئر نے کہا ہے "عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے" گولڈ اسمتھ نے کہا ہے "کانٹوں سے بھری ہوئی شاخ کو ایک پھول خوبصورت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح غریب کے دل کو اور گھر کو نیک شعار عورت جنّت بنا دیتی ہے۔

ایم عثمان باگ بسواکلیانی کرناٹک

س۔ کیا ناکامیوں کا واحد علاج خودکشی ہے؟

ج۔ ناکامیوں کا واحد علاج کامیابی حاصل کرنے کے لئے جدّوجہد کرنا ہے۔

س۔ عورت اپنے شوہر سے کب دُور ہوتی ہے؟

ج۔ سختیاں جھیل کر بھی عورت اپنے شوہر سے دُور ہونا نہیں چاہتی۔

سیّد قدرت علی۔ جلگاؤں

س۔ خوشتر صاحب! کیا وجہ ہے کہ "زبان" کو بھی فساد کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے؟

ج۔ خُوئے بد را بہانۂ بسیار! ——— فساد کرنے والے فتنہ پرور لوگوں کو کوئی بہانہ چاہیئے۔

س۔ آج کی دُنیا امن سے دُور کیوں ہوتی جا رہی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسانیت سے دُور ہوتی جا رہی ہے، اس لئے کہ انسان انسان نہ رہا ؎

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا!

س۔ اُردو زبان پر کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ ایک ہی کیوں کئی اشعار سُنیئے ؎

کتنی میٹھی زباں، کیسی پیاری زباں
میری اُردو زباں، فخرِ ہندوستاں
اس میں رادھا کے پائل کی جھنکار ہے
زُلفِ زیب النساء کی بھی مہکار ہے
اس میں جھانسی کی رانی کی للکار ہے
اس کے دامن میں ہیں کتنی رنگینیاں
میری اُردو زباں، فخرِ ہندوستاں!

شہناز پروین گیلانی صبا۔ مونگیر

س۔ آج کے طلباء کا مستقبل روشن ہے یا تاریک؟

ج۔ بالکل روشن! اُن کے حال کے قابلِ رشک و باعثِ فخر کارنامے اُن کے روشن مستقبل کے ضامن ہیں۔

[illegible]

س۔ میرا گدھا گدھوں کا لیڈر
پھر تو بولو بھیّا خوش تر؟

ج۔ آپ کی سطوت، آپ کی عظمت
اللہ اکبر، اللہ اکبر
کون بھلا ہے آپ کا ہمسر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!!

عشرت گیاوی۔ گیا

س۔ کوئی درد انگیز شعر سنایئے۔

ج۔ دل میں اک درد اٹھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

س۔ انسان میں سب سے زیادہ کون چیز ضروری ہے۔ جذبۂ ہمدردی، پیار، محبت، خلوص، ایمانداری، ایثار، نیکوکاری، رحم، قوت برداشت یا صرف ڈگری؟

ج۔ کبھی یہ سارے اوصاف ڈگری سے زیادہ ضروری تھے، اب سب سے زیادہ ضروری ڈگری ہے!

محمد عبدالحمید صدیقی۔ اورنگ آباد

س۔ زندگی پھول ہے یا پتھر؟

ج۔ کبھی پھول، کبھی پتھر!

س۔ دنیا میں سب سے بڑی چیز کیا ہے؟

ج۔ انسان! جو اب انسانیت سے دور ہوتا جا رہا ہے! جو اب انسان نہ رہا!!

نذیر لونیاری۔ ترکانجن کشمیر

س۔ یہ لیڈر لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ سیاست جھوٹ کا خوبصورت نام ہے!

س۔ شبنم اور سمندر میں نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے فرق؟

ج۔ کوئی فرق نہیں ——— نظر گہری ہو تو شبنم بھی سمندر ہے۔

جلیل احمد . . . . . .

س۔ بعض لوگ دھوکا دے کر مسکراتے ہیں، بعض لوگ دھوکا کھا کر مسکراتے ہیں۔ جیت کس کی ہے؟

ج۔ دھوکا کھا کر مسکرانے والوں کی!

مس یاسمین۔ بحرین

س۔ آپ بتا سکتے ہیں یہ اشعار کس کے ہیں ؎

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

ج۔ یہ اشعار ساحر لدھیانوی کے ہیں۔

س۔ ایک خوبصورت قطعہ سنایئے۔

ج۔ سنئے ؎

چاندنی رات کی خموشی میں
یوں کوئی مہ جمال آتا ہے
ایک شاعر کے ذہن میں جیسے
خوبصورت خیال آتا ہے

خواجہ حیدر مہدی۔ عادل آباد۔ دکن

س۔ سارے ہندوستان میں کتنے لوگ اردو بولتے ہیں؟

ج۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں نوّے فیصدی لوگ اردو بولتے ہیں۔ اردو کی مخالفت کرنے والے، اردو کو اس دیس سے نکالا دینے والے بھی اسٹیج پر اردو کی مخالفت کرتے ہیں۔ اپنے [illegible] حکومت کے بیان کے مطابق سارے ملک میں ۳ کروڑ، ۲۱ لاکھ، ۲۴ ہزار آدمی اردو بولتے ہیں۔

الیاس احمد انصاری۔ رام پور

س۔ ہمارے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کہاں سے حاصل کی ہے۔ بہت سے لوگوں کی طرح ہندوستان ہی سے، یا کسی دوسرے ملک سے؟

ج۔ موصوف نے برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

راز بھٹکلی۔ بنگلور

س۔ جدید عورت کیا ہے؟

ج۔ مرد کی بے راہ روی کا شاہکار!

س۔ اچھی بیوی تقدیر سے ملتی ہے یا تدبیر سے؟

ج۔ تقدیر اور حسنِ تدبیر سے۔

منظر الحق کشن گنج۔ پورنیہ

س۔ یہ انتشار اور خلفشار آخر کب تک رہے گا؟ انسانیت کب تک سسکتی رہے گی؟ آخر اس کا علاج؟

ج۔ جب تک تباہ و برباد ہو جانے کے بعد انتشار اور خلفشار کی آگ بھڑکانے والوں کی آنکھیں نہ کھلیں گی! اس کا علاج وقت کرے گا۔

س۔ انسانیت اور اخلاق کا معیار؟

ج۔ ہندوستان میں انسانیت اور اخلاق کا معیار اتنا کبھی نہیں گرا تھا۔

س۔ ہند کا مستقبل؟

ج۔ ہند کا حال مستقبل کا آئینہ ہے۔

شمس الاسلام۔ ادری، اعظم گڑھ

س۔ ہندوستان کا ہر آدمی مغربیت کو مشرقیت پر کیوں ترجیح دیتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ہندوستان عرصہ تک مغربی آقاؤں کا غلام رہ چکا ہے۔

س۔ شوہر کو بیوی کب زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے؟

ج۔ جب بیوی اُس کی آزادی کی راہ میں سدِ راہ نہیں ہوتی اور اپنی ہر سانس کو شوہر کی مرضی کی پابند بنا لیتی ہے۔

عبدالحمید خاں۔ برہان پور

س۔ شہیدِ اُردو دیونارائن پانڈے کی قربانی پر بھی حکومت کی آنکھیں کیوں نہیں کھلتیں؟

ج۔ کاش! ایسی ہزاروں آوازیں حکومت کی آنکھیں کھول سکیں، حکومت کی آنکھیں اُس وقت کھلیں گی جب تخریب پسند حکومت کے ایوان کو آگ لگا دیں گے!

س۔ چاند پر کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ سُنیئے ؎

چاند تک تم ہو گئے بھی تو ملا کیا ہم کو
مژدۂ امن لئے اہلِ جہاں تک آؤ!

الیاس احمد۔ پورنیہ

س۔ کوئی نصیحت کی بات بتایئے۔

ج۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو آویزۂ گوش بنالیجئے۔

- سب سے اچھا وہ انسان ہے جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے۔
- جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔

تنویر احمد قاسمی۔ دیوبند

س۔ اُردو کا پہلا اخبار کب جاری ہوا تھا؟ اُس کا نام کیا تھا؟ اُسے کس نے جاری کیا تھا؟ اور کہاں سے جاری کیا تھا؟

ج۔ اُردو کا پہلا اخبار ۱۸۳۵ء میں مولوی باقر علی نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ اُس کا نام "اُردو اخبار" تھا۔

مبین الرحمٰن خاں۔ برنداوان

س۔ منٹو کے افسانے "بیسویں صدی" میں کب آنے والے ہیں؟

ج۔ یہ آپ کو منٹو ہی سے پوچھنا چاہئے۔

س۔ زندگی کی خوشیاں کب ملتی ہیں؟

ج۔ دوسروں کو خوشیاں دے کر!

محمد شمیم ششیہ باڑی۔ پورنیہ

س۔ بھائی جان! فلم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ بعض کے سوا ساری فلمیں اخلاق کو تباہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ فلموں نے عوام کے اخلاق کو افسوس ناک حد تک تباہ کیا ہے۔

خواجہ عبدالرحمٰن پربھنی۔ مہاراشٹر

س۔ دُنیا میں سب سے زیادہ امن کس حکومت میں ہے؟ اور سب سے زیادہ بدنظمی کہاں ہے؟

ج۔ ہمارے ہندوستان جنت نشان میں سب سے زیادہ امن ہے! ـــ سب سے زیادہ بدنظمی کس مُلک میں ہے؟ یہ کسی اور سے پُوچھئے۔

س۔ جب کسی کشتی کو سہارا نہیں ملتا تو وہ ساحل پر کیسے لگتی ہے؟

ج۔ ناخدا جس کا نہ ہو اُس کا خدا ہوتا ہے! ـــ اگر کشتی آپ کی ہو تو ہم آپ سے کہیں گے ؎

بن آپ اپنے سفینے کا ناخدا اے دوست!
بلند عزم ہواؤں کے رُخ بدلتے ہیں

یاسمین رضوی۔ لکھنؤ

س۔ جب یہ معلوم ہے کہ وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ نہیں مل سکتا تو دعا کا مطلب؟

ج۔ قرآن پاک میں یہ بھی ارشادِ باری ہے کہ تم دعا مانگو میں قبول کروں گا (یہ مفہوم ہے)

س۔ شاعری اور ترنم؟

ج۔ اس دور میں لازم و ملزوم ہیں۔

قاضی سعیدالدین۔ بدنیرہ گنگائی

س۔ کیا اُردو بین الاقوامی زبان ہے؟

ج۔ اُردو بین الاقوامی زبان نہیں ہے لیکن اُردو میں ہندی سے کہیں زیادہ بین الاقوامی زبان بننے کی صلاحیت ہے۔

س۔ انسان دُنیا میں تکلیف اُٹھانے کے باوجود اس دُنیا کو کیوں چاہتا ہے؟

ج۔ انسان دُنیا سے نہیں، زندگی سے پیار کرتا ہے۔ اس محبوبہ کے لئے دُنیا کو بھی چاہتا ہے۔

س۔ انسان کی زندگی کب دوبھر ہو جاتی ہے؟

ج۔ جب اپنی پست ہمتی سے اُسے دُوبھر بنا لیتا ہے۔

منور سلطانہ عتیق۔ بگل کنڈہ، حیدرآباد

س۔ زندگی کی اُلجھنیں سُلجھانے کے باوجود نہ سُلجھ سکیں تو؟

ج۔ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے۔ جدّوجہد جاری رکھنی چاہئے۔

جمال الدین پرواز انصاری نینی تال

س۔ کانگریس کے نئے صدر کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ ایس نجلنگپا۔

س۔ شمالی ویت نام کے صدر کا کیا نام ہے؟

ج۔ ہوچی منہ۔

میر امانت علی۔ ناندیڑ۔ دکن

س۔ خوشتر بھیا! آج کل کے کسی مشہور شاعر کا ایک شعر تحریر فرمائیے۔

ج۔ اعجاز صدیقی کا ایک شعر سُنئے ؎

جو منہ پھیر دیں موجِ تیز و رواں کا
کہیں ڈوبتے ہیں بھلا وہ سفینے

س۔ عورتوں کے پردے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہم ضروری پردے کے حامی ہیں۔ ہم عورت کو شمعِ انجمن بنانے کے حامی نہیں۔ پردے کے متعلق اکبر الہ آبادی کا بھی خیال سُن لیجئے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

ع۔ س۔ پورنیہ

س۔ آخر یہ گرانی کب تک؟

ج۔ جب تک ذخیرہ اندوزوں کو مصنوعی گرانی میں اضافہ کرتے رہنے کی حکومت کی طرف سے کھلی چھوٹ ملتی رہے گی۔

س۔ ہندوستان میں زبان کا مسئلہ؟

ج۔ کہیں ہندوستان کے سفینے کو ساحل پر نہ لے ڈوبے!

س۔ کسی کو کسی کا خط پڑھنا چاہئے یا نہیں؟

ج۔ نہیں۔ یہ اخلاقی گناہ ہے۔

ریاض الحق انصاری۔ بنارس

س۔ ایک اچھا شعر سنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

بجھا بجھا شہرِ آرزو ہے، دیارِ دل میں کوئی نہیں ہے
وفا کی پلکوں پہ جگمگاتے دیے سرِ شام بجھ گئے ہیں

رام پرکاش شُکلا پہانی۔ ہردوئی

س۔ کسی نئے فنکار کا افسانہ آپ کے معیار کے مطابق ہو اور آپ شریکِ اشاعت کریں تو اُسے کچھ معاوضہ دیں گے؟

ج۔ نئے اور نو آموز فنکاروں کے لئے بہت بڑا معاوضہ یہی ہے کہ اُن کی تخلیقات کو بیسویں صدی میں جگہ دیکر اُن کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ایم۔ اے۔ تاج

س۔ انسان بُرے کاموں سے کس طرح بچ سکتا ہے؟

ج۔ ضمیر کی رہنمائی پر عمل کرکے۔

ابوحامد سعیدی۔ دارانگر۔ بنارس

س۔ اُردو نثر کا معمارِ اوّل کون ہے؟

ج۔ اُردو نثر کی پہلی کتاب خواجہ اشرف جہاں گیری نے ۸۰۷ھ میں ایک رسالے کی صورت میں لکھی۔

س۔ اِن دونوں اشعار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؎

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

مقامِ امن ہے جنّت مجھے کلام نہیں
شباب کے لئے موزوں ترا پیام نہیں

ج۔ پہلا شعر جتنا بلند ہے، دوسرا شعر اُتنا ہی پست ہے — پہلا شعر جتنا ہی بامعنی ہے، دوسرا اُتنا ہی بے معنی ہے۔

انور حسین کاظمی۔ نئی دہلی

س۔ کوئی حسین شعر سُنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

چہرے کے پھول، زُلف کے سائے، بدن کی آنچ
کیا کیا سمیٹ لائی تری یاد کی ہوا

اظہار کندھائی پوری جمشید پور

س۔ مُلک کا موجودہ سیاسی انتشار، ہولناک گرانی، پریشان زندگی، زبان کا مسئلہ، دوسری اُلجھنیں، پریشانیاں — ان سب کا انجام کیا ہوگا؟

ج۔ ناقابلِ بیان وناقابلِ تلافی تباہی و بربادی!

س۔ موجودہ حالات میں ایک فرض شناس فرد کا کردار کیا ہونا چاہئے؟

ج۔ تخریب پسندی کی آگ کو بھڑکنے سے روکے۔

س۔ ایک جوش آفریں شعر سُنائیے۔

ج۔ حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک شعر سُنئے ؎

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں سے بہار پیدا کر!

رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

بیان بابت ملکیت و جملہ تفصیلات "بیسویں صدی" دہلی

(۱) مقامِ اشاعت:۔ دہلی (۲) وقفہ اشاعت:۔ ماہوار
(۳) پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر:۔ خوشتر گرامی۔ قومیت ہندوستانی
پتہ:۔ دریا گنج دہلی (۴) ملکیت:۔ خوشتر گرامی

میں خوشتر گرامی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط خوشتر گرامی پروپرائٹر

مورخہ یکم مارچ ۱۹۶۸ء



درد؟

اناسِن

درد سے آرام پانے کیلئے بہتر ہے کیونکہ یہ ۴ طرح سے کام کرتی ہے۔



اناسِن ڈاکٹر کے نسخے کی طرح دواؤں کا بے مثال مرکب ہے۔
اِسی لئے یہ ۴ طریقوں سے جلد آرام دِلاتی ہے :

۱۔ اناسِن سر درد سے آرام دلاتی ہے اور فوراً۔
۲۔ اناسِن اعصابی تناؤ کو کم کرتی ہے جو سر درد کا عام باعث ہوتا ہے۔
۳۔ اناسِن تھکاوٹ کو دُور کرتی ہے، جو سر درد کے ساتھ اکثر ہوجاتی ہے۔
۴۔ اناسِن افسردگی کو ختم کرتی ہے اور آپکے چہرے پر پھر مُسکراہٹ آجاتی ہے۔

اناسِن سردی زکام اور فلو، دانت کے درد اور بدن کے درد سے بھی آرام دِلاتی ہے۔

جھٹ پٹ آرام پانے کیلئے ۲ اناسِن لیجئے۔

Regd. User. Geoffrey Manners & Co. Ltd.

A-28

محمد انصاری۔ رام پور

س۔ اُردو کی مقبولیت کا راز ؟

ج۔ اُردو کی دلکشی و رعنائی۔ اُردو کی ہمہ گیری۔

رضیہ حیات۔ دہلی

س۔ بھائی جان! دریائے نیل کہاں ہے ؟

ج۔ مصر (افریقہ) میں۔

مس چاند سلطانہ جگلانی جمشید پور

س۔ یہ شعر مجموعۂ کلام اقبال اور کلام میرؔ دونوں میں پایا گیا ہے۔ آپ ہی بتائیے کس کا ہے ؟

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

ج۔ گمان غالب ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔

س۔ کون صحیح ہے ؟

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
یا
ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے

ج۔ دوسرا مصرع صحیح ہے۔

س۔ بھائی جان! تقدیر، مقدر اور قسمت میں کیا فرق ہے ؟

ج۔ ایک ہی حقیقت کے یہ تین نام ہیں۔

عبدالرؤف شوقی (باگل کوٹ)

س۔ دولت مند اپنے آپ کو غریب اور غریب اپنے آپ کو دولت مند ظاہر کرتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں لوگ ؟

ج۔ دولت مند دوسروں کو کچھ نہ دینے کے لئے اپنے کو غریب ظاہر کرتے ہیں۔ غریب لوگوں سے وقار پانے کے لئے اپنے کو دولت مند ظاہر کرتے ہیں۔

س۔ "بیسویں صدی" ہر ماہ کون سی تاریخ تک چھپ کر تیار ہوتا ہے۔

ج۔ دس تاریخ تک۔

محمد ابراہیم۔ سوپور۔ کشمیر

س۔ خوشتر صاحب! میرے دو دوست ہیں۔ جو چچازاد بھائی بھی ہیں۔ دونوں میں کشیدگی ہے۔ میرے تعلقات دونوں سے بہت اچھے ہیں۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی کہئے یا میری بدنصیبی۔ ایک کا ساتھ دیتا ہوں تو دوسرا ناراض ہو جاتا ہے۔ بتائیے میں کیا کروں ؟

ج۔ کوشش کیجئے کہ دونوں میں صلح ہو جائے۔

س۔ خوشتر بھیا! کیا آپ اپنے والد بزرگوار کے نام سے ہمیں آشنا کریں گے ؟

ج۔ ہم نے پدرم سلطان بود کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ ایک معمولی انسان کا نام جان کر آپ کیا کریں گے۔

س۔ کامیابی کا راستہ بتائیے۔

ج۔ ان تھک جد و جہد کرنا ـــــ عزمِ محکم جہدِ پیہم !

فخرالدین خاں۔ چکردھرپور۔ بہار

س۔ ویت نام میں جو جنگ ہو رہی ہے، اُس کا انجام کیا ہوگا ؟

ج۔ تباہ کن !

س۔ پھول کے موضوع پر کوئی خوبصورت شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

ہلتی نہیں ہوا سے چمن میں یہ ڈالیاں
منہ چومتے ہیں پھول عروسِ بہار کا

آنسہ رحمان۔ رام پور۔ یو۔ پی

س۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ قدر کس چیز کی ہے ؟

ج۔ آج کی دنیا میں دولت کی قدر سب سے زیادہ ہے۔

س۔ آج کی فلموں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج۔ آج کی فلموں نے معاشرے پر تباہ کن اثر ڈالا ہے۔

اظہر حسین۔ دھن گڑھی نیپال

س۔ شیشے اور عورت کے دل میں کیا فرق ہے ؟

ج۔ شیشہ ٹوٹتا ہے تو جھنکار پیدا ہوتی ہے۔ عورت کا دل ٹوٹتا ہے تو دل ہی سنتا ہے۔

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

س۔ پھول اور کانٹے میں کیا رشتہ ہے ؟

ج۔ چولی دامن کا ساتھ ہے۔

سید ثروت حسین۔ سیتاپور

س۔ گلاب کے پھول کے ساتھ کانٹے کیوں ؟

ج۔ تاکہ بد ذوق آسانی سے توڑ نہ لیں۔

س۔ انسان گناہوں سے آشنا ہو کر بھی گناہ کیوں کرتا ہے ؟

ج۔ گناہ میں بہت کشش ہوتی ہے۔

س۔ بعض دولت مند بخیل کیوں ہوتے ہیں ؟

ج۔ بعض نہیں، بیشتر دولت مند بخیل ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے دل میں دولت جمع کرنے کی حرص ہوتی ہے۔ جس کے پاس دولت ہی نہ ہو، جسے دولت ملتی ہی نہ ہو اُس کے دل میں دولت جمع کرنے کی کیا حرص ہوگی۔

ایم [illegible] کشن گنج۔ پورنیہ

س۔ اکثر و بیشتر [illegible] ہیرو اور لڑکیاں فلمی ہیروئن بننے کے خواب کیوں دیکھا کرتی ہیں؟

ج۔ اس لیے کہ ان کے بڑوں نے انھیں اپنے ساتھ سینما دکھا کر ان کے دلوں میں ہیرو اور ہیروئن بننے کی آرزو پیدا کر دی ہے۔

س۔ قابلِ قدر صورت ہے یا سیرت؟

ج۔ سیرت! آپ نے کتنے صورت حرام دیکھے ہوں گے۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ج۔ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔

نجمہ عبدالخالق انصاری بھیونڈی

س۔ بھائی جان! ہمارے ملک ہندوستان کو آزاد ہوئے بیس سال ہو گئے۔ ان بیس سالوں میں غریب عوام کو کیا ملا؟

ج۔ لیڈروں کے حقیقت سے عاری بیانات ــ ایسے خواب جو کبھی تعبیر آشنا نہ ہوئے۔

س۔ کانگریسی لیڈروں کا مستقبل؟

ج۔ خود غرضی اور اقتدار پرستی کو خیر باد کہہ کر اب بھی منظم ہو جائیں تو کانگریس کے لیڈروں کا مستقبل کانگریس کے مخالفین سے روشن ہوگا۔

عزادار حسین پہانی۔ ہردوئی

س۔ غالب اور اقبال میں بحیثیت شاعر کس کا مرتبہ بلند ہے؟

ج۔ غالب کا۔ اقبال نے بھی غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

س۔ میرے ایک دوست کا خیال ہے اُردو شاعری میں کراہوں، آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا وہ صحیح کہتے ہیں؟

ج۔ آپ کے دوست کا مطالعہ بہت محدود ہوگا۔ انھیں اُردو کے یہ اشعار سنائیے ؎

ہے جو گہری سی شکن وقت کی پیشانی پر
تیری خودبین جبیں ہے تجھے معلوم نہیں
دھڑک رہی ہے صدائے جرس بگولوں میں
نہ جانے اُن سے عیاں کتنے کارواں ہوں گے
قسم تمھارے عزم کی فدا تمھاری شان کے
بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے
جھکا دو شاخِ کہکشاں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو
جو دیے ہیں گردشِ وقت سے کوئی اور ہوں گے وہ ہم نہیں
جو ہجومِ غم ہے بہت تو ہو، طلبِ حیات تو کم نہیں

غضنفر حسین عاقل [illegible]

س۔ خوشتر بھائی! آج کے زمانے [illegible] سوچتے [illegible]

ج۔ آج [illegible] زمانے [illegible] بھلے [illegible] سوچ [illegible] مگر [illegible]

س۔ انسان [illegible]

ج۔ [illegible] وہ حوصلہ [illegible]

س۔ آج کل کا [illegible] جا رہا ہے؟

ج۔ خوفناک اندھیرے کی طرف!

خالد حسین۔ پانچ فوارہ [illegible]

س۔ آپ نے میرا سوال کسی اور کے نام [illegible]

چھاپ دیا تھا؟

ج۔ آپ نے اپنا نام غلط [illegible] ہوگا۔ بعد کہ اس [illegible]

[illegible] پانچ فوارہ [illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

[illegible]

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ــ مطبوعہ: [illegible] پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ بلاک و تصاویر: [illegible] پریس حیدر بازار دہلی

ڈکشنریاں، صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

خانہ داری	صنعت و حرفت	کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں
[illegible]	[illegible]	[illegible]

ایم شریف [illegible] گنج۔ پورنیہ

س۔ اکثر و بیشتر [illegible] اور لڑکیاں فلمی ہیروئن بننے کے خواب کیوں دیکھا کرتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ ان کے بڑوں نے انھیں اپنے ساتھ سینما دکھا کر ان کے دلوں میں ہیرو اور ہیروئن بننے کی آرزو پیدا کر دی ہے۔

س۔ قابلِ قدر صورت ہے یا سیرت؟

ج۔ سیرت! آپ نے کتنے صورت حرام دیکھے ہوں گے۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ج۔ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔

نجمہ عبدالخالق انصاری [illegible]

س۔ بھائی جان! ہمارے ملک ہندوستان کو آزاد ہوئے بیس سال ہو گئے۔ ان بیس سالوں میں غریب عوام کو کیا ملا؟

ج۔ لیڈروں کے حقیقت سے عاری بیانات ... ایسے خواب جو کبھی تعبیر آشنا نہ ہوئے۔

س۔ کانگریسی لیڈروں کا مستقبل؟

ج۔ خود غرضی اور اقتدار پرستی کو خیر باد [illegible] بھی ختم ہو جائیں تو کانگریس کے امیدواروں کا مستقبل کانگریس کے مخالفین سے روشن ہوگا۔

عزادار حسین بھائی۔ ہردوئی

س۔ غالب اور اقبال میں بحیثیت شاعر کس کا مرتبہ بلند ہے؟

ج۔ غالب کا۔ اقبال نے بھی غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

س۔ میرے ایک دوست [illegible] شاعری میں کراہوں، آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا وہ صحیح کہتے ہیں؟

ج۔ آپ کے دوست کا مطالعہ بہت محدود ہوگا۔ انھیں اردو کے یہ اشعار سنائیے ؎

ہے جو گہری سی شکن وقت کی پیشانی پر
تیری خود چین جبیں ہے تجھے معلوم نہیں

دھڑک رہی ہے صدائے جرس بگولوں میں
نہ جانے ان سے عیاں کتنے کارواں ہوں گے

قسم تمہارے عزم کی فدا تمہاری شان کے
بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے

کمندِ دو شاخِ کہکشاں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادران نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو

[illegible] گردشِ وقت [illegible] کوئی اور ہوں گے وہ ہم [illegible]
جو ہم [illegible] حیات کو کم [illegible]

[illegible] حسین عادل [illegible]

س۔ [illegible]
سوچتے کیا؟

ج۔ [illegible]
[illegible]

س۔ انسان [illegible]

ج۔ جب وہ خود [illegible]

س۔ [illegible]
[illegible]

ج۔ خوفناک اندھیرے [illegible]

خالق حسین پانچ فوارہ [illegible]

س۔ آپ نے میرا سوال کسی اور [illegible]

[illegible] آپ نے اپنا نام غلط لکھا ہوگا ہوگا۔ جیسا کہ اس خط میں بھی "خالق حسین پانچ فوارہ" لکھا [illegible]

س۔ صبر کا پیمانہ اتنا چھوٹا کیوں ہوتا [illegible]

ج۔ صبر کا پیمانہ چھوٹا نہیں ہوتا۔ یہ ظرف کی بات ہے۔

شمیم یاسمین ممتاز بیگم۔ کلکتہ

س۔ میں اپنا افسانہ بھیجوں تو آپ "بیسویں [صدی]" میں جگہ دیں گے؟

ج۔ افسانہ "بیسویں صدی" [illegible]
"بیسویں صدی" میں جگہ [illegible]

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی
مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی [illegible] برانچ [illegible] بازار دہلی
بیسویں صدی دہلی

ڈکشنریاں صنعت و حرفت، کیشدہ کاری اور خانہ داری

کیشدہ کاریاں و ڈکشنریاں

صنعت و حرفت

خانہ داری

ایم شر[illegible] گنج پور نیہ

س۔ اکثر و بیش[illegible] لڑکیاں فلمی ہیروئن بننے کے [illegible] دیکھا کرتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ اُن کے بڑوں نے انھیں اپنے ساتھ سنیما دکھا کر اُن کے دلوں میں ہیرو اور ہیروئن بننے کی آرزو پیدا کر دی ہے۔

س۔ قابلِ قدر صورت ہے یا سیرت؟

ج۔ سیرت! آپ نے کتنے صورت حرام دیکھے ہوں گے۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ج۔ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔

نجمہ عبدالخالق انصاری بھیونڈی

س۔ بھائی جان! ہمارے مُلک ہندوستان کو آزاد ہوتے بیس سال ہو گئے۔ ان بیس سالوں میں غریب عوام کو کیا ملا؟

ج۔ لیڈروں کے حقیقت سے عاری بیانات ایسے خواب جو کبھی تعبیر آشنا نہ ہوئے۔

س۔ کانگریسی لیڈروں کا مستقبل؟

ج۔ خود غرضی اور اقتدار پرستی کو خیرباد کہہ کر اب بھی منظم ہو جائیں تو کانگریس کے لیڈروں کا مستقبل کانگریس کے مخالفین سے روشن ہوگا۔

عزادار حسین پہانی۔ ہردوئی

س۔ غالب اور اقبال میں بحیثیت شاعر کس کا مرتبہ بلند ہے؟

ج۔ غالب کا۔ اقبال نے بھی غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

س۔ میرے ایک دوست کا خیال ہے، اُردو شاعری میں کراہوں، آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا وہ صحیح کہتے ہیں؟

ج۔ آپ کے دوست کا مطالعہ بہت محدود ہوگا۔ انھیں اُردو کے یہ اشعار سنایئے ؎

ہے جو گہری سی شکن وقت کی پیشانی پر
تیری خود بینِ جبیں ہے تجھے معلوم نہیں
دھڑک رہی ہے صدائے جرس بگولوں میں
بچھائے اُن سے عیاں کتنے کارواں ہوں گے
قسم تمھارے عزم کی فدا تمھاری شان کے
بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے
جھکا دو شاخِ کہکشاں   بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں   بڑھے چلو بڑھے چلو
جو بنے ہیں گردشِ وقت سے کوئی اور ہوں گے وہ ہم نہیں
جو ہجومِ غم ہے بہت تو ہو، طلبِ حیات تو کم نہیں

غضنفر حسین عامل۔ ناگپور

س۔ خوشتر بھائی! آج کے زمانے میں امیر لوگ کیا سوچتے ہیں؟

ج۔ آج ہی نہیں ہر زمانے میں امیروں نے اپنے ہی بھلے کی بات سوچی۔ غریب کبھی اُن کی توجہ کا مرکز نہ بنے۔

س۔ انسان کی اُمیدیں کب ٹوٹ جاتی ہیں؟

ج۔ جب وہ حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ آج کل کا دور ہمیں کس منزل کی طرف لے جا رہا ہے؟

ج۔ خوفناک اندھیرے کی طرف!

خالق حسین۔ پانچ فوارہ۔ برہان پور

س۔ آپ نے میرا سوال کسی اور کے نام سے کیوں چھاپ دیا تھا؟

ج۔ آپ نے اپنا نام غلط لکھا ہوگا۔ جیسا کہ اس خط میں آپ نے خالق حسین پانچ فوارہ لکھا۔

س۔ صبر کا پیمانہ اتنا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ صبر کا پیمانہ چھوٹا نہیں ہوتا۔ یہ ظرف کی بات ہے۔

شمیم یاسمین ممتاز بیگم۔ کلکتہ

س۔ میں اپنا افسانہ بھیجوں تو آپ بیسویں میں جگہ دیں گے؟

ج۔ افسانہ "بیسویں صدی" کے معیار کا ہو تو "بیسویں صدی" میں جگہ پائے گا۔

نکہت ریحانہ۔ لکھنؤ

س۔ دو خوبصورت اشعار سنایئے۔ اُن میں پیار ہو لیکن عریانیت کی جھلک بھی نہ ہو۔

ج۔ کوئی کل تلک میرے دل کے قریں تھا
مگر آج اِک بوئے گل رہ گیا
مہرباں وہ ہے تو راہِ زندگی میں دور تک
بوئے گل ہے، سایۂ سروِ چمن ہے دوستو

شکیلہ قریشی۔ بی۔ اے۔ سہارنپور

س۔ بھائی جان! آزادی پر کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ کہتا ہے اربابِ وطن سے گنگ و جمن کا سنگم
قوموں کی تفریق مٹاؤ آج ہے یومِ آزادی

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ——— مطبوعہ: دہلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر: برائٹ پریس صدر بازار دہلی ——— پتہ: دفتر بیسویں صدی، صدر گنج، دہلی [illegible]

APRIL 1968
Registered with the Registrar of Newspapers ...
BISWIN SADI
32 nd. YEARS OF PUBLICATION
Telephones Office 271637 Residence 619927

RADIUM TONIC PILLS

نیا خون — نئی طاقت

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کرکے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں، وزن اور
خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور صحت
واپس لانے کیلئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول
ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ
کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل
ہوتی ہے تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے
اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف
چھ روپے محصولڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹس
ایم این اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمیٹڈ
نمبر ۳۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

پتہ: ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ لوہے ... نمبر ۱۳۵

بیسویں صدی دہلی

اگست

بیسویں صدی



Biswin Sad

DELHI

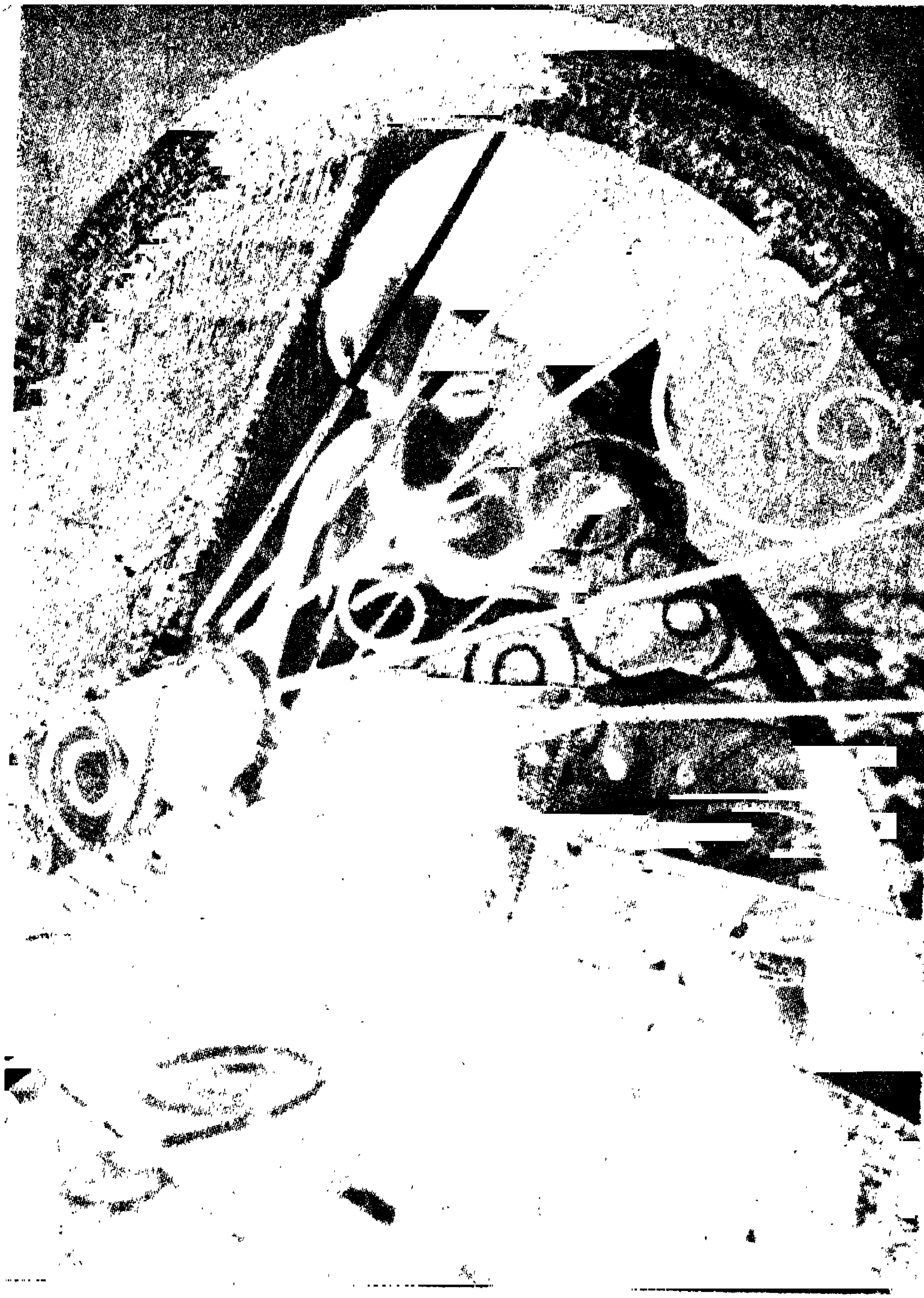
RS. 1.25



میں سوچتی ہوں کہ اِک جسم کے پجاری کو
مری وفا نے وفا کا سہاگ کیوں سمجھا

ہوس کے ساز پہ گائے ہوئے ترانے کو
دھڑکتے دل کی محبت کا راگ کیوں سمجھا

نرش کمار شاد ——————— فوٹو : ایم ڈی مشر ملسجہاد



خاموش نگاہ کے تکلّم کی قسم　　اس سازِ جمال کے ترنُّم کی قسم
کلیاں سی چٹک رہی ہیں سینے میں تمام　　مہکے ہوئے شبنمی تبسُّم کی قسم

فراق گورکھپوری ——— فوٹو۔ روشن لال وشِشٹ۔ جے پور



رُخ پر جو تبسّم سا دمک اُٹھتا ہے — ہونٹوں پہ ترا وعدہ تھرک اُٹھتا ہے
حیلے کی دُلائی کا سُنہرا لچکا — آنکھوں کے کناروں پہ جھلک اُٹھتا ہے

جوشؔ ملیح آبادی ——— فوٹو: روشن لال وشِشٹ۔ جےپور



احساسِ حیا سے ہے نزاکت بوجھل   رخسارِ حسیں پہ ہے گلابی آنچل
ہے رقص کے وقت تیرے دانتوں کی چمک   گلرنگ شفق میں جیسے تاروں کے کنول

جلال ملیح آبادی ———— فوٹو: روشن لال ہوشیار پور



حال ہی میں دہلی رائٹرس ایسوسی ایشن کی طرف سے جناب کرشن موہن کی غزلوں کے مجموعے "غزال" کی رسم اجرا منعقد ہوئی۔ اس اجتماع کی صدارت نامور شاعر جناب آنند نارائن ملّا نے کی اور اپنی معرکتہ الآرا تقریر میں انھوں نے اردو غزل کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ غزل صرف ایک صنف سخن ہی نہیں بلکہ ایک کلچر ہے۔ جو ہماری تہذیبی بیداری اور سربلندی کی ترجمان ہے ــــ



افتتاح کی رسم جناب آئی۔ کے۔ گجرال وزیر مواصلات نے کی اور انھوں نے اپنی تقریر میں جناب کرشن موہن کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی زندگی کے ابتدائی دور سے اردو زبان و ادب کا مدّاح ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے اردو کے صف [illegible]
شد اکا ہو ... [illegible]

نئی صدی

ٹیلیفون دفتر ———— ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ———— ۶۱۹۹۲۷
ایڈیٹر۔ خوشتر گرامی

تیر و نشتر



* فرقہ پرست پارٹیوں پر پابندی کا سوال زیرِ غور نہیں " شری چوہان کا اعلان ـــــــ فرقہ پرست پارٹیاں گھی کے چراغ جلائیں، شہنائیاں بجائیں۔

---

* مذہب کو پالٹیکس سے الگ رکھا جائے " مرارجی ڈیسائی ـــــــ
ں کے لئے بھی گولڈ کنٹرول آرڈر کی طرح کوئی پالٹیکس کنٹرول آرڈر بنا دیجئے۔

* مدھیہ پردیش کابینہ میں جن سنگھ کے وزیر دوبارہ شامل ہوں گے " بلا خبر ـــــــ
چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

* کانگریس کی پالیسیوں نے ہند کو بھکاری بنا دیا ہے " کرشنا مینن
ں تقریر ـــــــ
۱۔ اُس کانگریس نے جس میں کل تک آپ بھی شامل تھے۔
۲۔ اُس کانگریس نے جس کی وزارت میں آپ وزیر تھے۔
۳۔ اُس کانگریس نے جس نے آپ کو سفیر بنایا تھا۔
۴۔ اُس کانگریس نے جس نے آپ کے جیپ اسکینڈل کی پردہ پوشی کی تھی۔
۵۔ اُس کانگریس نے جس نے چینی حملے کے بعد آپ کو جنگی مجرم بنا کر مقدمہ نہیں چلایا۔
۶۔ اُس کانگریس نے جس کی حکومت میں آپ جیل کی بجائے آزاد گھوم رہے ہیں۔

* آوارہ کُتّے ہلاک کرنے کی ہدایت " ایک خبر ـــــــ اور آوارہ سیاستدانوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

* دِلّی میں مکمل نشہ بندی کی جائے " مرارجی ڈیسائی سے مانگ ـــــــ
پہلے تو خود کانگریسی کریں۔

* ہریانہ میں کم سے کم اُجرتیں مقرر " ایک خبر ـــــــ کیا وزیروں کی؟

تیرونشتر



"فرقہ پرست پارٹیوں پر پابندی کا سوال زیرِ غور نہیں": شری چوہان کا اعلان ——— فرقہ پرست پارٹیاں گھی کے چراغ جلائیں، شہنائیاں بجائیں۔

"مذہب کو پالٹیکس سے الگ رکھا جائے": مرارجی ڈیسائی ———
ن کے لئے بھی گولڈ کنٹرول آرڈر کی طرح کوئی پالٹیکس کنٹرول آرڈر بنا دیجئے۔

"مدھیہ پردیش کابینہ میں جن سنگھ کے وزیر دوبارہ شامل ہوں گے": ایک خبر ———

چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

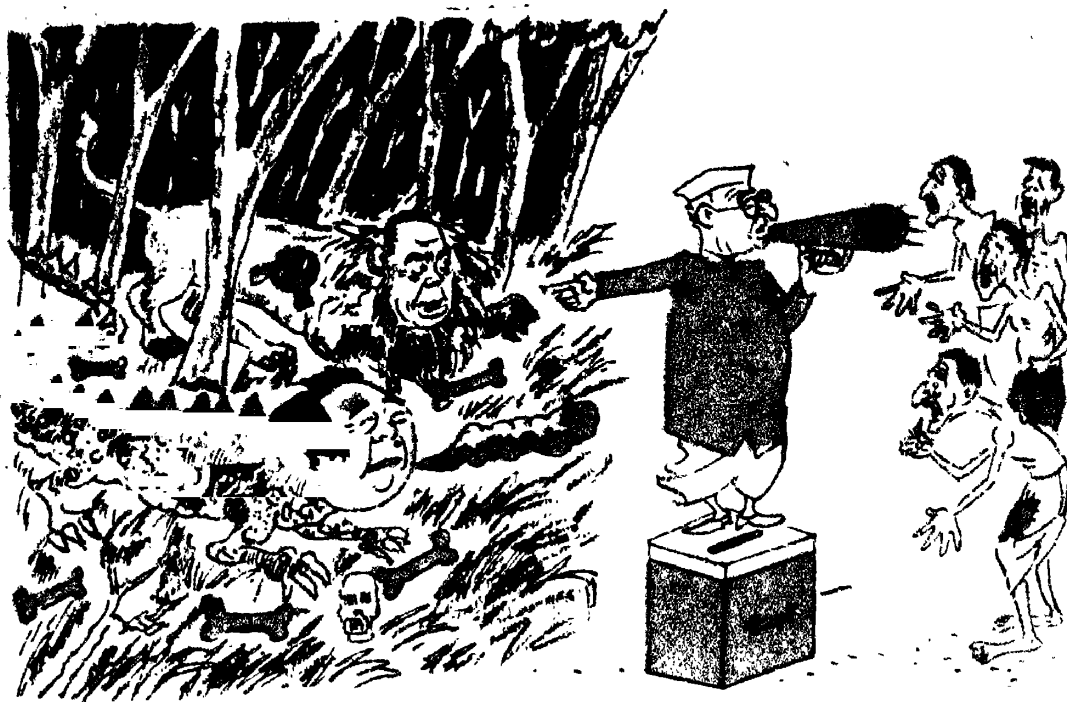
"کانگریس کی پالیسیوں نے ہند کو بھکاری بنا دیا ہے": کرشنا مینن کی تقریر ———

۱۔ اُس کانگریس نے جس میں کل تک آپ بھی شامل تھے۔
۲۔ اُس کانگریس نے جس کی وزارت میں آپ وزیر تھے۔
۳۔ اُس کانگریس نے جس نے آپ کو سفیر بنایا تھا۔
۴۔ اُس کانگریس نے جس نے آپ کے جیپ اسکینڈل کی پردہ پوشی کی تھی۔
۵۔ اُس کانگریس نے جس نے چینی حملے کے بعد آپ کو جنگی مجرم بنا کر مقدمہ نہیں چلایا۔
۶۔ اُس کانگریس نے جس کی حکومت میں آپ جیل کی بجائے آزاد گھوم رہے ہیں۔

"آوارہ کتے ہلاک کرنے کی ہدایت": ایک خبر ——— اور آوارہ سیاستدانوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

"دلّی میں مکمل نشہ بندی کی جائے": مرارجی ڈیسائی سے مانگ ——— پہلے تو خود کانگریسی کریں۔

"ہریانہ میں کم سے کم اُجرتیں مقرر": ایک خبر ——— کیا وزیروں کی؟



"جمہوریت فیل ہوئی تو کیمونزم آئے گا" ——— کے۔ کے شاہ کی وارننگ۔

"ہریانہ میں ملک پلانٹ لگایا جائے گا" ایک خبر ——— تاکہ دودھ والے بھوں اور پیدا ہوں۔

"بے ایمانی تیرا دوسرا نام کانگرس ہے" ایک جن سنگھی اخبار کا عنوان ———
ایمانی کا تیسرا نام جن سنگھ ——— چوتھا نام پی۔ایس۔پی ——— پانچواں ایس۔ایس۔پی ——— چھٹا کمیونسٹ پارٹی ——— ساتواں مارکس کمیونسٹ پارٹی ——— آٹھواں بھارتیہ ...دل ———
آگے ہمیں گنتی یاد نہیں آپ گنئے۔

"بھارت پر ٹڈی دل کے بہت بڑے حملے کا خدشہ" ایک خبر ——— جو ... کے حملے کا مقابلہ کر سکتا ہے، وہ اس سے بھی نپٹ لے گا۔

"ماؤ کی بیوی کا اثر و رسوخ بڑھ گیا" ایک خبر ——— اللہ کرے جمال اور زیادہ۔

"پولیس نے الٰہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے دفتر سے آٹھ ہزار سے زیادہ چین نواز کتابیں برآمد کیں" ایک خبر ——— نہ ہوا انجمن ترقی اردو کا دفتر اب تک پھانسی لگا دی ہوتی۔

"ہریانہ کے بیوپاریوں کا ضبط شدہ اناج واپس کیا جائے" پروفیسر رنگا کا مطالبہ ——— اس کے بعد کہئے کہ سوتنتر پارٹی اور جن سنگھ کے امیدواروں کی حالیہ الیکشن میں ضبط ضمانتیں واپس کی جائیں۔

"گھوڑے کرکٹ کی افادیت" ایک عنوان ——— ...کارپوریشن کو پہلے ہی بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ گلی گلی ڈھیر نظر آتے ہیں۔

"دلی میں مچھر مکھی مار کمیٹی کا قیام" ایک خبر ——— جن سنگھی اور تو سب کام کر چکے یہ باقی تھا۔ اب جو تیس مکھیاں مار لے وہ آکر دلی کے ... تیس مار خاں کا خطاب لے جائے۔

"آدمی کے دل کی جگہ بھیڑ کا دل" ایک خبر ——— اب اُسے سردی میں سوئیٹر نہ پہننا پڑے گا۔ جسم پر اُون نکل آئے گی۔

"ہریانہ میں کربلا کے نظارے" ایک خبر ——— شری گلزاری لال نندہ کے چیلے چودھری بنسی لال کے راج میں۔

"بھارت میں فرقے وارانہ فسادات پر روس کا اظہارِ تشویش" ایک خبر ——— خود یہاں بھی بڑی تشویش پائی جاتی ہے۔ دھڑا دھڑ بیانات آرہے ہیں۔ اور ریزولیوشن منظور ہو رہے ہیں۔

"یو۔پی کے نوجوان کانگریسیوں کا نعرہ۔ بوڑھے لیڈر شٹ کرو" ایک خبر ——— اور خدا ان نوجوانوں کو بڑھاپے سے محفوظ رکھے۔

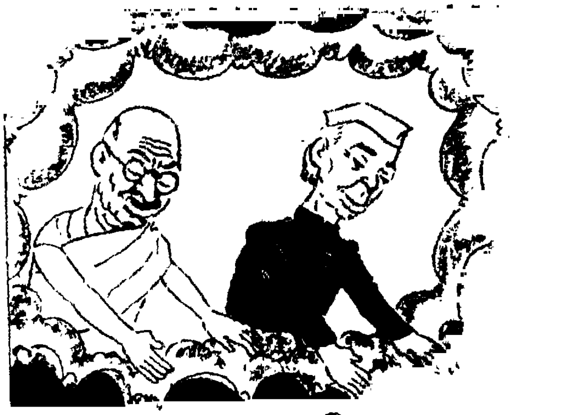
"ہریانہ میں دو عملی نہیں ہے" چودھری بنسی لال کا بیان ——— بجا فرمایا۔ وہاں تو سہ عملی ہے۔ آپ مکھیہ منتری ہیں۔ شری گلزاری لال نندہ آپ کے گورو ہیں اور پنڈت بھگوت دیال شرما آپ کے لیڈر۔ اِس لئے ہریانہ پر تینوں کا راج ہوا۔

"پنجاب کا گورکھ دھندا" ایک جن سنگھی اخبار کی سُرخی ——— یہ آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے مہاشہ جی!

"پنجاب میں اینٹوں کی تقسیم پر کنٹرول" ایک خبر ——— اچھا کیا۔ نہیں تو جلسوں جلوسوں میں کام آتیں۔

"ہریانہ سرکار نے ۵۵ برس کی عمر کے سرکاری ملازم ریٹائر کرنے کا فیصلہ کر لیا" ایک خبر ——— مگر ساتھ ساتھ اس عمر کے سیاستداں بھی ریٹائر کئے جائیں تاکہ ہریانہ والوں کو پنڈت بھگوت دیال اینڈ کمپنی سے نجات ملے۔

"بنگال بھانے والا ایک ہزار ٹن گیہوں خراب ہو گیا" ایک خبر ——— پروا نہ کرو۔ بھیڑ بکریوں سے بدتر بھارتی انسان سب کچھ کھا لیتے ہیں۔





"ہم فرقہ پرستوں کی دھمکیوں کے سامنے ہرگز نہیں جھکیں گے" وزیرِ اعظم کا اعلان۔



"جمہوریت فیل ہوئی تو کمیونزم آئے گا" ـــــــ کے۔ کے شاہ کی وارننگ ـــــ۔

"ہریانہ میں ملک پلانٹ لگایا جائے گا" ایک خبر ـــــــ تاکہ دودھ پینے والے مجنوں اور پیدا ہوں۔

"بے ایمانی تیرا دوسرا نام کانگرس ہے" ایک جن سنگھی اخبار کا عنوان ـــــ بے ایمانی کا تیسرا نام جن سنگھ ـــــ چوتھا نام پی۔ ایس۔ پی ـــــ پانچواں ایس۔ ایس۔ پی ـــــ چھٹا کمیونسٹ پارٹی ـــــ ساتواں مارکس کمیونسٹ پارٹی ـــــ آٹھواں بھارتیہ کرانتی دل ـــــ

آگے ہمیں گنتی یاد نہیں آپ گنیے۔

"بھارت پر ٹڈی دل کے بہت بڑے حملے کا خدشہ" ایک خبر ـــــ جو چین کے حملے کا مقابلہ کر سکتا ہے، وہ اس سے بھی نبٹ لے گا۔

"ماؤ کی بیوی کا اثر و رسوخ بڑھ گیا" ایک خبر ـــــ اللہ کرے زورِ جمال اور زیادہ۔

"پولیس نے الہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے دفتر سے آٹھ ہزار سے زیادہ چین نواز کتابیں برآمد کیں" ایک خبر ـــــ نہ ہوا انجمن ترقی اُردو کا دفتر اب تک پھانسی لگا دی ہوتی۔

"ہریانہ کے بیوپاریوں کا ضبط شدہ اناج واپس کیا جائے" پروفیسر رنگا کا مطالبہ ـــــ اس کے بعد کہیے کہ سوتنتر پارٹی اور جن سنگھ کے امیدواروں کی حالیہ الیکشن میں ضبط ضمانتیں واپس کی جائیں۔

"کوڑے کرکٹ کی افادیت" ایک عنوان ـــــ دِلی کارپوریشن کو پہلے ہی بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ گلی گلی ڈھیر نظر آتے ہیں۔

"دِلی میں چھتر مکتی مار کمیٹی کا قیام" ایک خبر ـــــ جن سنگھ سب کام کر چکے یہ باقی تھا۔ اب جو بیس مکھیاں مارلے وہ آ کر دِلی کے میئر سے تیس مار خاں کا خطاب لے جائے۔

• آدمی کے دل کی جگہ بھیڑ کا دل " ایک خبر ـــــــ اب اُسے سردی میں
پہننا پڑے گا جسم پر اُون نکل آئے گی۔

• ہریانہ میں کرپا کے زمانے " ایک خبر ـــــــ شری گلزاری لال نندہ
یہ چودھری بنسی لال کے راج میں۔

• بھارت میں فرقے وارانہ فسادات پر روس کا اظہار تشویش " ایک خبر
ـــــــ خود یہاں بھی بڑی تشویش پائی جاتی ہے۔ دھڑا دھڑ بیانات آرہے ہیں۔
ریزولیوشن منظور ہورہے ہیں۔

"یو۔ پی کے نوجوان کانگریسیوں کا نعرہ۔ بوڑھے لیڈر رخصت کرو" ایک خبر
ـــــــ اور خدا ان نوجوانوں کو بڑھاپے سے محفوظ رکھے۔

• ہریانہ میں دو عملی نہیں ہے " چودھری بنسی لال کا بیان ـــــــ
بجا فرمایا۔ وہاں تو سہ عملی ہے۔ آپ مکھیہ منتری ہیں۔ شری گلزاری لال نندہ آپ کے
گورو ہیں اور پنڈت بھگوت دیال شرما آپ کے لیڈر۔ اس لئے ہریانہ پر تینوں کا
راج ہوا۔

• "پنجاب کا گورکھ دھندا" ایک جن سنگھی اخبار کی سُرخی ـــــــ یہ آپ کی
سمجھ سے بالاتر ہے مہاشہ جی!

• "پنجاب میں اینٹوں کی تقسیم پر کنٹرول" ایک خبر ـــــــ اچھا کیا۔
نہیں تو جلسوں جلوسوں میں کام آتیں۔

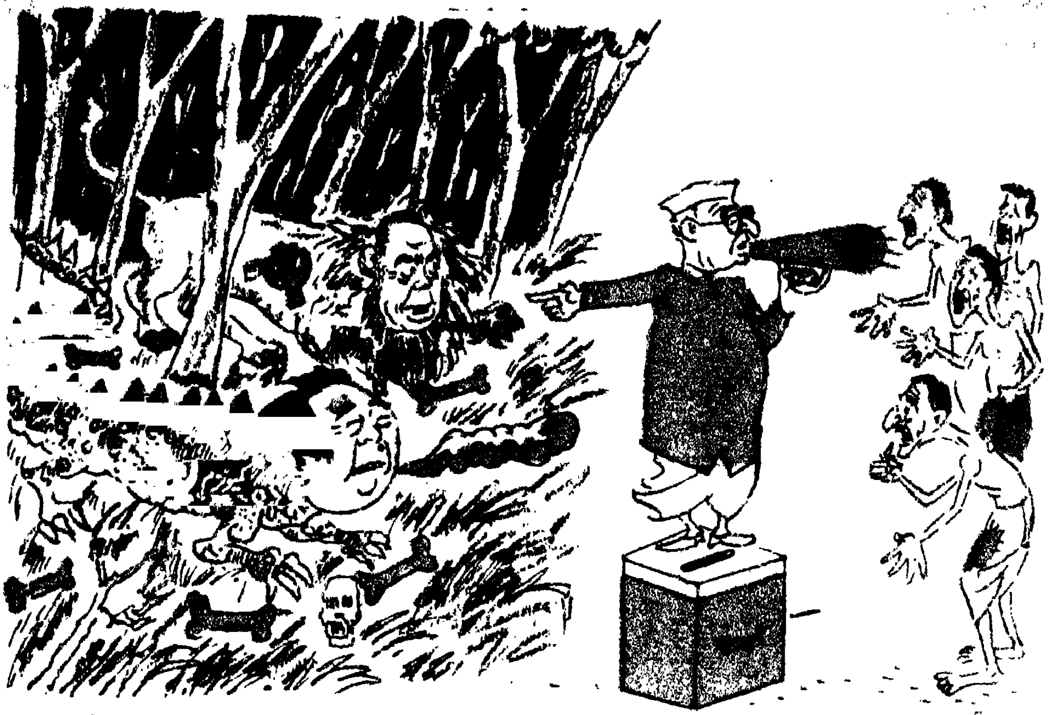
• ہریانہ سرکار نے ۵۵ برس کی عمر کے سرکاری ملازم ریٹائر کرنے کا فیصلہ
کرلیا " ایک خبر ـــــــ مگر ساتھ ساتھ اس عمر کے سیاستداں بھی ریٹائر کئے جائیں تاکہ ہریانہ
والوں کو پنڈت بھگوت دیال اینڈ کمپنی سے نجات ملے۔

• بنگال بھانے والا ایک تہائی گیہوں خراب ہوگیا " ایک خبر ـــــــ پروا نہ کرو۔
بھیڑ بکریوں سے بدتر بھارتی انسان سب کچھ کھالیتے ہیں۔





"ہم فرقہ پرستوں کی دھمکیوں کے سامنے ہرگز نہیں جھکیں گے" وزیر اعظم کا اعلان۔



"جمہوریت نیل ہوئی تو کیمونزم آئے گا" ـــــــ کے۔ کے شاہ کی وارننگ ـــــــ۔

"ہریانہ میں ملک پلانٹ لگایا جائے گا" ایک خبر ـــــــ تاکہ دودھ پینے والے مجنوں اور پیدا ہوں۔

"بے ایمانی تیرا دوسرا نام کانگریس ہے" ایک جن سنگھی اخبار کا عنوان ـــــــ
بے ایمانی کا تیسرا نام جن سنگھ ـــــــ چوتھا نام پی۔ایس۔پی ـــــــ پانچواں ایس۔ایس۔پی ـــــــ چھٹا کیمونسٹ پارٹی ـــــــ ساتواں مارکس کیمونسٹ پارٹی ـــــــ آٹھواں بھارتیہ کرانتی دل ـــــــ
آگے ہمیں گنتی یاد نہیں آپ گنئے۔

"بھارت پر نڈی دل کے بہت بڑے حملے کا خدشہ" ایک خبر ـــــــ جو چین کے حملے کا مقابلہ کر سکتا ہے، وہ اس سے بھی نبٹ لے گا۔

"ماؤ کی بیوی کا اثر و رسوخ بڑھ گیا" ایک خبر ـــــــ اللہ کرے زورِ جمال اور زیادہ۔

"پولیس نے الہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے دفتر سے آٹھ ہزار سے زیادہ چین نواز کتابیں برآمد کیں" ایک خبر ـــــــ نہ ہوا انجمن ترقی اردو کا دفتر۔ اب تک پھانسی لگا دی ہوتی۔

"ہریانہ کے بیوپاریوں کا ضبط شدہ اناج واپس کیا جائے" پروفیسر رنگا کا مطالبہ ـــــــ اس کے بعد کہتے کہ سوتنتر پارٹی اور جن سنگھ کے امیدواروں کی حالیہ الیکشن میں ضبط ضمانتیں واپس کی جائیں۔

"کوڑے کرکٹ کی افادیت" ایک عنوان ـــــــ دِلّی کارپوریشن کو پہلے ہی بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ گلی گلی ڈھیر نظر آتے ہیں۔

"دِلّی میں مچھر مکھی مار کمیٹی کا قیام" ایک خبر ـــــــ جن سنگھی اور تو سب کام کر چکے یہ باقی تھا۔ اب جو تیس مکھیاں مارلے وہ آکر دِلّی کے میئر سے تیس مار خاں کا خطاب لے جائے۔





"ہم فرقہ پرستوں کی دھمکیوں کے سامنے ہرگز نہیں جھکیں گے" وزیر اعظم کا اعلان۔

"آدمی کے دل کی جگہ بھیڑ کا دل" ایک خبر —— اب اُسے سردی میں سوئیٹر نہ پہننا پڑے گا۔ جسم پر اُون نکل آئے گی۔

"ہریانہ میں کربلا کے نالے" ایک خبر —— شری گلزاری لال نندہ کے چیلے چودھری بنسی لال کے راج میں۔

"بھارت میں فرقے وارانہ فسادات پر روس کا اظہار تشویش" ایک خبر —— خود یہاں بھی بڑی تشویش پائی جاتی ہے۔ دھڑا دھڑ بیانات آرہے ہیں۔ اور ریزولیوشن منظور ہو رہے ہیں۔

"یو۔پی کے نوجوان کانگرسیوں کا نعرہ۔ بوڑھے لیڈر ٹسٹ کرو" ایک خبر —— اور خدا ان نوجوانوں کو بڑھاپے سے محفوظ رکھے۔

"ہریانہ میں دو عملی نہیں ہے" چودھری بنسی لال کا بیان —— بجا فرمایا۔ وہاں تو سہ عملی ہے۔ آپ مکھیہ منتری ہیں۔ شری گلزاری لال نندہ آپ کے گورو ہیں اور پنڈت بھگوت دیال شرما آپ کے لیڈر۔ اِس لئے ہریانہ پر تینوں کا راج ہوا۔

"پنجاب کا گورکھ دھندا" ایک جن سنگھی اخبار کی سُرخی —— یہ آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے مہاشہ جی!

"پنجاب میں اینٹوں کی تقسیم پر کنٹرول" ایک خبر —— اچھا کیا۔ نہیں تو جلسوں جلوسوں میں کام آتیں۔

"ہریانہ سرکار نے ۵۵ برس کی عمر کے سرکاری ملازم ریٹائر کرنے کا فیصلہ کر لیا" ایک خبر —— مگر ساتھ ساتھ اِس عمر کے سیاستداں بھی ریٹائر کئے جائیں تاکہ ہریانہ والوں کو پنڈت بھگوت دیال اینڈ کمپنی سے نجات ملے۔

"بنگال جانے والا ایک تہائی گیہوں خراب ہو گیا" ایک خبر —— پروا نہ کرو۔ بھیڑ بکریوں سے بدتر بھارتی انسان سب کچھ کھا لیتے ہیں۔



ہریانہ کیبنٹ میں توسیع

"ایک فلمسٹار کے خلاف ۴۲۰ کا مقدمہ" ایک خبر ـــــ یہ ایک بیچاری پکڑی گئی۔ حالانکہ ایسیاں سے اکثر ۸۴۰ ہوتی ہیں۔

"بجلی کے کرنٹ سے موت" ایک خبر ـــــ عجیب بات ہے۔ روشنی ہونی چاہیئے تھی۔

"یو۔پی میں بیوپاریوں کو زیادہ سے زیادہ اناج رکھنے کی اجازت" ایک خبر ـــــ تاکہ زیادہ سے زیادہ بلیک مارکیٹ کر سکیں۔

"آئندہ موسم خزاں میں ہند اور روس میں اہم بات چیت ہوگی" ایک خبر ـــــ موسم اچھا نہیں۔ موسم بہار رکھتے کہ تعلقات میں بھی بہار آتے۔

"دلی میونسپل کارپوریشن کی مالی مشکلات" ایک عنوان ـــــ جن سنگھ قابض رہا تو دن دونی رات چوگنی ہوں گی۔

"بے ایمان افسر برداشت نہیں کروں گا" ہریانہ کے وزیرِ اعلیٰ چودھری بنسی لال کا اعلان ـــــ ٹھیک اسی طرح آپ کے گورو شری گلزاری لال نندہ کہا کرتے تھے کہ دو سال میں کرپشن ختم کر دوں گا۔ کرپشن ختم نہیں ہوئی بلکہ دن دگنی ہو گئی۔

"امریکہ میں بہت سے بیمار لوگ ہیں مگر ملک بیمار نہیں" صدر جانسن ـــــ اور ہمارے یہاں ملک اور ملک والے دونوں ہی بیمار ہیں۔ امریکہ دوائیں بھیجتا ہے۔

"آگرے میں ہندی تار لینے سے انکار" ایک خبر ـــــ [illegible] والے مورچہ لگائیں۔

"پنجاب میں سنت فتح سنگھ نے گل کے خلاف مہم شروع کر دی" ـــــ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ پر عمل کرتے ہوئے۔

"تجدیدِ شباب کی مشین تیار ہو گئی" یہ ایک خبر ——— شری راج گوپال اچاریہ، مرار جی ڈیسائی، گلزاری لال نندہ، ڈاکٹر سید محمود، گیانی گرمکھ سنگھ راڑیوالہ کے لئے مژدۂ جانفزا۔

"موت کے سزا یافتہ قیدی کے ساتھ شادی" یہ ایک خبر ——— تاکہ بے چاری کنواری نہ مرے۔

"مہاشا کے شکار" یہ ایک عنوان ——— یہ بیچارے اُردو زبان والے۔

"دِلّی کے اُردو میڈیم اسکولوں کو ہندی میں کام کرنے کی ہدایت" یہ ایک عنوان ——— دِلّی میں جن سنگھ راج کے نظارے۔

"پنجاب کانگریس میں راڑیوالہ کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی" یہ ایک خبر ——— کانگریسیوں کو اُن کی پٹیالہ کی وزارتِ عظمیٰ کا دَور یاد آ رہا ہوگا۔

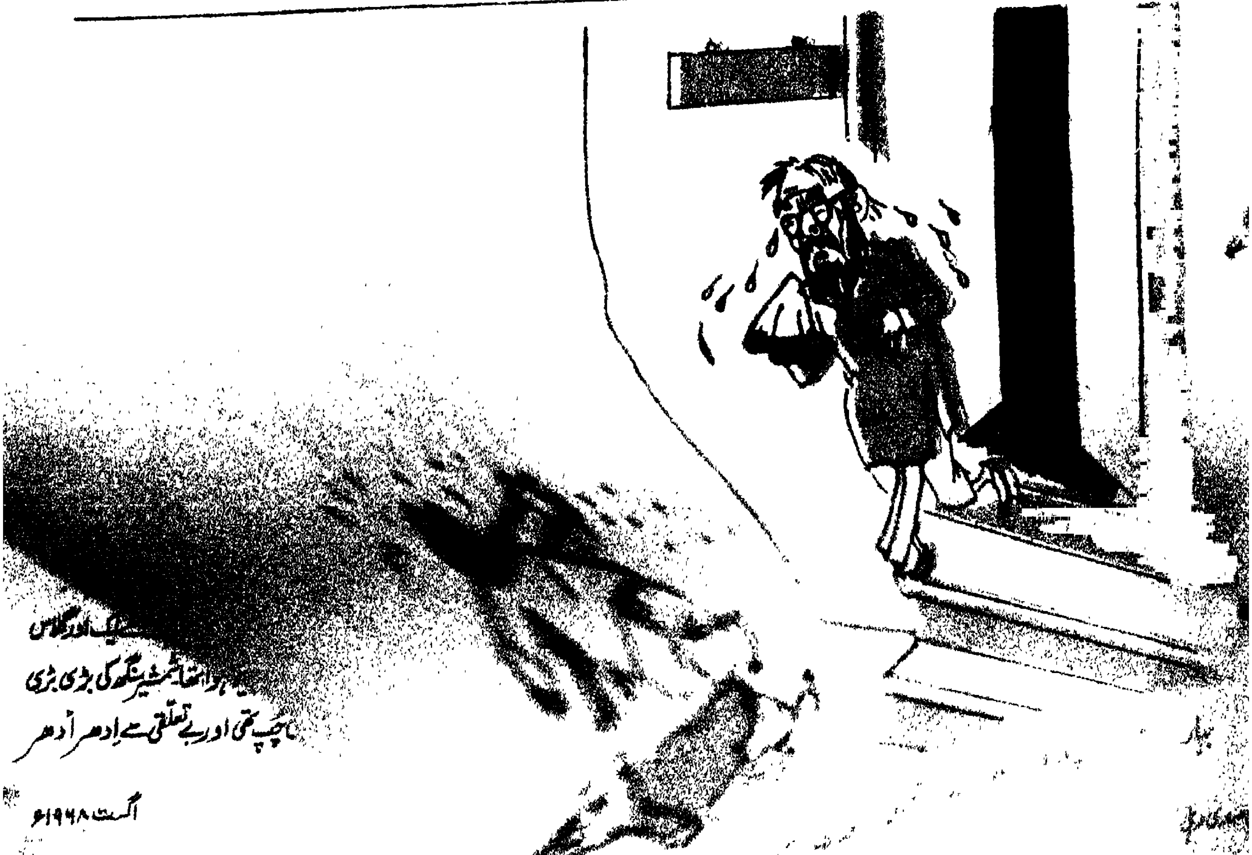
"دِلّی میں جن سنگھی میونسپل کونسلر کے خلاف تحقیقات۔ فائل سے ایک اہم دستاویز غائب ہو گئی" یہ ایک خبر ——— ابتدائے تحقیقات ہے۔ ع
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

"محکمۂ ڈاک کی پھرتی" یہ ایک عنوان ——— کہ اخبارات و رسائل کا ڈاک خرچ بڑھا دیا۔

"اپوزیشن کی بعض وزارتیں کانگریس سے بھی بدتر" یہ ایک عنوان ——— اب بھی کچھ چھپایا۔ بعض نہیں سب کی سب بدتر۔ بلکہ بدترین۔

"یہ ہریانہ کے چیف منسٹر سپاہیوں اور پٹواریوں کے بھی تبادلے کر رہا ہے" یہ ایک خبر ——— یہ شری گلزاری لال نندہ کے چیلے ہیں۔

"تین ماہ پُرانی وزارت کا خاتمہ" یہ ایک خبر ——— یہ اچھا ہے۔ سب تین تین ماہ بانٹ لیں تو بہتوں کا بھلا ہو جائے۔



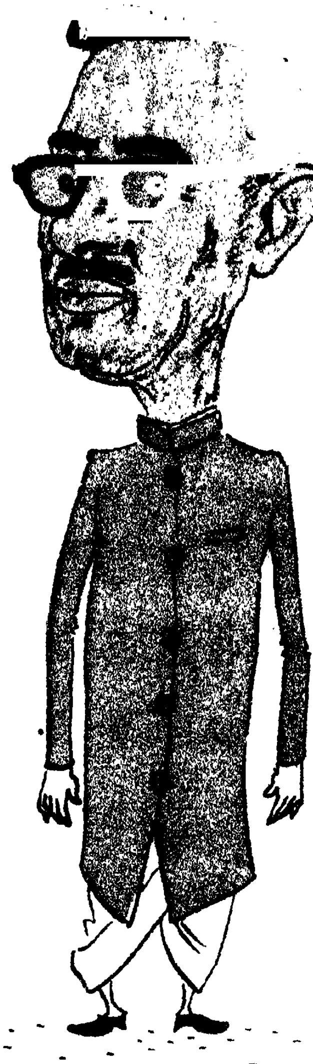
...یک اور گلاس
...ہوا تھا شمشیر سنگھ کی بڑی بڑی
...ا چپ تھی اور بے تعلقی سے اِدھر اُدھر

چودھری بنسی لال ——————

خوشترگرامی

لمبا قد، اکہرا بدن، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، اُن پر موٹے فریم کا چشمہ، لمبی ناک، لمبے کان، سیاہ بال، آڑی مانگ، نکھرا رنگ، ڈھیلا کُرتا پاجامہ ——— اِس حلیے کے ہیں ہریانہ کے نئے وزیرِ اعلیٰ ———

چودھری بنسی لال



ایک دن آدھی رات کو جب دُنیا محوِ خواب تھی اور ہریانہ کے کئی سینئر کانگرسیوں کی قسمت سوئی ہوئی تھی شری گلزاری لال نندہ کی کوٹھی پر پنڈت بھگوت دیال نے کانگرس اسمبلی پارٹی کے ممبروں کو جمع کیا اور ان کے سر پر وزیرِ اعلیٰ کا تاج رکھ دیا ——— سب سے چھوٹی ریاست کے سب سے کم عمر وزیرِ اعلیٰ ہیں۔ یوں بھی سیاست کے میدان میں کم سن بلکہ بچے اور عقل کے کچے ہیں۔ پیدائشی جاٹ ہیں ——— بساطِ سیاست کے پٹے ہوئے دو مہروں میں سے ایک شری نندہ کو گورو مانتے ہیں اور پنڈت بھگوت دیال شرما کو اپنا لیڈر کہتے ہیں۔ یعنی سرِ دست دو کشتیوں میں سوار ہیں ع آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ خود اعتمادی سے محروم نظر آتے ہیں۔ مقدمہ کی پیروی پیشہ تھی۔ اب سیاست میں پیروی عادت بنا رہے ہیں۔ شاید اِس لئے کہ اِنھیں یہ احساس کھٹکتا ہے کہاں میں اور کہاں وزارتِ اعلیٰ ؎

افسانہ

سنہری آنکھیں

پروفیسر ڈاکٹر حامدی کاشمیری ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

۲۹۶ جواہر نگر۔ سری نگر (کشمیر)

برادرِ عزیز! آداب

کل ہی ایک خط ارسال کر چکا ہوں اور آج تازہ ترین افسانہ "سنہری آنکھیں" بھیج رہا ہوں۔ جدید مشینی دور میں انسانی تعلقات اور جذبات کی نا استواری ایک اچھا مطالعہ ہے۔ اس افسانے میں اسی موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔ اُمید ہے افسانہ آپ کو پسند آئے گا۔ اپنی رائے ضرور لکھئے۔ میں قارئینِ کرام کی رائے کا بھی انتظار کروں گا . . .

آپ کا ——— حامدی کاشمیری

شمشیر سنگھ نے ایک بھرپور گھونٹ لے کر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا اور اپنی لمبی نم آلود مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولا "لیجئے ایک اور شعر یاد آیا۔ عرض کرتا ہوں ؎

لذتِ مے شیخ جی تم سے زبانی کیا کہوں
میرے پیمانے سے تھوڑی سی اُلٹ کر دیکھ لو

کیتھرین دھیرے سے مُسکرائی، روشنی کی ایک باریک سی لکیر اُس کے ہونٹوں کے کناروں کو چھو کر گزر گئی اور پھر اُس کی سنہری آنکھوں کی اُداسی گہری ہو گئی۔ اُس نے بادلِ ناخواستہ اپنے چھوٹے سے مرمریں تراشے ہوئے ہاتھ میں گلاس اُٹھایا اور ہونٹوں تک لے گئی۔ پرکاش اپنے دوست شمشیر سنگھ کو توصیفی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اُس کے لطیفوں اور برجستہ اشعار سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ مدّت کے بعد آج شام کو سُپر بازار میں ملے تھے اور پھر شمشیر سنگھ نے اُس کے کندھے پر بازو رکھ کر اُسے اپنی کار کی طرف کھینچ لیا اور اُسے اپنی بغل میں بٹھایا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر مِس کیتھرین بیٹھی تھی۔ گورے رنگ کی دلکش خدوخال والی عورت! خاموش، اُداس، کھوئی ہوئی سی۔ شمشیر سنگھ نے اُس کا تعارف کرتے ہوئے کہا تھا "یہ مِس کیتھرین ہے، پچھلے ہفتے پیرس سے آئی ہے" اور جلد ہی اُس نے گفتگو کا رُخ موڑ دیا تھا۔ پرکاش، شمشیر سنگھ کی فطرت سے واقف تھا۔ وہ برسوں سے اُسے جانتا تھا۔ اُس کی کھلنڈری طبیعت، عیش پسندی، یار باشی اور قہقہہ بازی سے بخوبی واقف تھا۔ کئی سال پہلے وہ انجینئرنگ کی تعلیم کے سلسلے میں پیرس گیا تھا لیکن وہاں سے دو ہی سال کے بعد لوٹا، انجینئرنگ ادھوری چھوڑ کر، اور اُس نے وسیع پیمانے پر بزنس شروع کی اور پچھلے دو تین برسوں میں اُس کی بزنس خوب چمک اُٹھی تھی۔ ہو سکتا ہے مِس کیتھرین اُس کی نئی دوست ہو ——— اُس نے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دو سال پہلے ایک کنواری لڑکی سے شادی کی تھی اور وہ اُس شادی کی تقریب میں بھی مدعو تھا۔

شمشیر سنگھ کا بھرا بھرا کتابی چہرہ دمک رہا تھا۔ اُس کے چہرے کی سیاہ داڑھی، جو اُس کے چہرے پر چپکی ہوئی معلوم ہوتی تھی، چمک رہی تھی۔ وہ تیز عمر کے باوجود اب بھی خاصا جوان معلوم ہو رہا تھا۔ اصل میں اُس نے غم یا تردد کو کبھی اپنے پاس پھٹکنے بھی نہ دیا تھا۔ جب بھی وہ اُس سے ملا، وہ خوش خوش نظر آیا۔ وہ اُس وقت بھی بشاش تھا اور شعر پر شعر اور چٹکلے پر چٹکلہ سُنا رہا تھا۔ لیکن پرکاش سوچ رہا تھا، نو بج چکے ہیں، للِتا اُس کی منتظر ہوگی۔ وہ بے چینی سے اُس کا انتظار کرتی ہے، اور پھر اُس نے کہا تھا، وہ آج جلدی سے شام کو لوٹے گا اور ضروری سامان وغیرہ پیک کروائے گا۔ لیکن اب تو کافی دیر ہو گئی۔ اُسے اُکتاہٹ سی محسوس ہوئی۔ ہوٹل کے چکنے فرش پر اب ایک لمبی مونچھوں والا سفیدے کی طرح لمبا آدمی ایک میانے قد کی عورت کو اپنے بازوؤں میں تھامے ہوئے تھا اور دونوں کے جسم تھرک رہے تھے۔ کیا جوڑا ہے دونوں کا؟ بے ہودہ پن!

رقص کے خاتمے تک وہ وہیں بیٹھا رہا اور اُس نے بیزاری سے ایک اور گلاس خالی کیا۔ ہال میں اب مدھم سی سبز روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ شمشیر سنگھ کی بڑی بڑی آنکھوں میں نشے کی چمک تھی۔ مِس کیتھرین اب بھی چُپ تھی اور بے تعلقی سے اِدھر اُدھر

دیکھ رہی تھی۔ پرکاش کی بے چینی بڑھ گئی۔ اُس کے لئے وہاں کوئی دلکشی نہ تھی پچھلے ایک سال سے وہ کم ہی ہوٹلوں میں جاتا تھا۔ سارا دن وہ بزنس کے امور طے کرتا رہتا اور شام کو گھر جاتا۔ للتا کے لئے نئے نئے تحفے لے کر، اور پھر اُس کے قریب بیٹھ کر اُس سے باتیں کرتا اور پھر اُس کے جسم کے حُسن میں کھو جاتا۔ للتا کو پاکر وہ ساری دُنیا کو بھول چکا تھا ——— وہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔

"بھئی ایک بے ادبی کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔"

"یعنی؟"

"اب اجازت چاہوں گا۔ ایک ضروری کام ——"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں، یہ ضروری کام گھر میں ہوگا ——" شمشیر سنگھ نے قہقہہ مارا۔

کیتھرین بھی مُسکرائی۔

اور وہ بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

وہ ریلوے سٹیشن پر آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ للتا سچ کہتی ہے وہ بہت جلد باز ہے، صبر کسے کہتے ہیں وہ جانتا ہی نہیں۔ وہ ویٹنگ رُوم میں پنکھے کے نیچے ایزی چیئر میں ٹانگیں پسار کر بیٹھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر پلیٹ فارم پر نکلا۔ وہاں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ وہ بُک سٹال کی طرف گیا اور سٹال پر سجی ہوئی کتابوں پر ایک نظر ڈال کر اُس نے ایک کتاب The Lovers پسند کی اور پیسے ادا کر کے چل دیا اور پھر ویٹنگ رُوم میں گیا اور دروازے کے اندر آکر اُس کی حیرت کی حد نہ رہی۔ سامنے شمشیر سنگھ کھڑا تھا پسینے میں ڈُوبا ہوا، اور اُس کے ساتھ مِس کیتھرین کھڑی تھی۔

"ارے پرکاش! تم یہاں کیسے؟" شمشیر سنگھ نے اُس کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔

"میں بمبئی جا رہا ہوں، اور تم ——؟"

"میں تم دونوں کو سی آف کرنے آیا ہوں۔"

"ہم دونوں کو؟"

"ہاں ہاں، کیتھرین بھی بمبئی جا رہی ہے۔ اچھا ہوا کہ تم بھی اسی ٹرین سے جا رہے ہو، تمھارا ساتھ رہے گا۔" اِس کے بعد شمشیر سنگھ نے کیتھرین کو مخاطب کیا۔

"اب بتاؤ مِس کیتھرین! طبیعت گھبرا تو نہ جائے گی۔ پرکاش تمھارا ہمسفر ہے۔ میں نے کل شاید بتایا تھا پرکاش میرا اولڈ فرینڈ ہے۔"

کیتھرین مُسکرائی۔ وہی اُداس کھوئی کھوئی سی مُسکراہٹ!

ٹرین چل دی۔ فرسٹ کلاس کے اُس کمپارٹمنٹ میں خاموشی تھی۔ اُس نے کمپارٹمنٹ کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کسی اگلے سٹیشن سے کوئی اور آ دھمکے۔ وہ دل ہی دل میں اِس دلچسپ سفر کے بارے میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ایک رات اور ایک دن کا سفر تھا۔ لیکن مِس کیتھرین کی خاموشی پُر وقار شخصیت اُس کے لئے ایک معمّہ سی بنی تھی۔ وہ اُس کے اُداس حُسن کی تمکنت اور اُس کی خاموشی سے بہت مرعوب ہو چکا تھا۔ چہرے کے خد و خال سے وہ اُس سے کم عمر کی معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ اُس کی عمر پھر بھی تیس بتیس سے کم نہ ہوگی۔ وہ اُس سے بات چیت کرنے کی ہمت نہ پا رہا تھا۔ آج تک وہ کئی عورتوں کو نزدیک سے دیکھ چکا تھا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ عورت بھی دو ایک ملاقاتوں کے بعد اپنے اصلی رُوپ میں آتی ہے اور تکلّف اور تصنّع کے پردے اُٹھ جاتے ہیں اور پھر عورت صرف عورت رہتی ہے۔ وہ مُسکرایا، ایک پُرغرور مُسکراہٹ ——— لیکن یہ مُسکراہٹ جلد ہی اُس کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی۔ اُس نے کیتھرین کی طرف اُچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ کھڑکی پر بیٹھی باہر کے بھاگتے ہوئے جنگلی نظاروں کو دیکھ رہی تھی اور نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ سوچ کی لکیریں اُس کے چہرے پر اُبھر اُبھر کر مِٹ رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا کیتھرین کے سفید چہرے پر زردی کا غُبار سا پھیلا ہوا تھا۔ سُنہری آنکھوں کے نیچے ہلکا سا دائرہ نمایاں تھا۔ اُس حُسن کے لپ اسٹک لگے ہونٹ بے حد خوبصورت تھے۔ حسّاس، خمار آلود، شعلہ آگیں! اُس کے ترشے ہوئے سُنہرے بال اُس کی گوری گردن پر سایہ ڈال رہے تھے اور پنکھے کی تیز ہوا سے اُس کے ماتھے پر بالوں کے ریشمی تار جھول رہے تھے، اُس کے سینے کی مرمریں لہریں کچھ کچھ نظر آ رہی تھیں۔ اُس کے جذبات میں عجیب سی گدگدی پیدا ہوئی۔ ایک اجنبی عورت کے ساتھ اُس کا یہ سفر ہمیشہ یاد رہے گا۔ چانس بھی کیا چیز ہے! سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں چانس ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ یہ چانس ہی تھا کہ ایک بار ریلوے سفر میں ٹھاکر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بیمار تھے اور تیز بخار سے اُن کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اُن کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور پھر بیس گھنٹے کے سفر میں اُس نے انسانیت کے ناطے ٹھاکر صاحب کی تیمار داری کی۔ انھیں گرم پانی پلایا، وقت پر دوا دی اور پھر بھگوان کا کرنا کیا ہوا ٹھاکر اُس کے سُسر بن گئے۔ اُن کی اکلوتی بیٹی للتا اُس کی شریکِ زندگی ہے اور وہ ٹھاکر صاحب کے سارے بزنس کو چلا رہا ہے اور آج وہ شہر کا سب سے بڑا ممبر مرچنٹ بن گیا ہے۔ ایک فاتحانہ مُسکراہٹ کے ساتھ اُس نے نیا سگریٹ سُلگایا۔

لیکن کیتھرین اِس دُنیا کی نہیں۔ کسی اور دُنیا کی مخلوق معلوم ہوتی ہے ——— اور پھر ——— معاً شمشیر سنگھ کی صورت اُس کی نگاہوں میں پھر گئی۔ بھرا بھرا کتابی چہرہ، چِپکی ہوئی داڑھی، بڑے بڑے سفید دانت۔ شمشیر سنگھ اُس کا دوست تھا اور اُس پر پُورا بھروسہ رکھتا تھا۔ اُسے شمشیر سنگھ کے یہ الفاظ یاد آئے: "اچھا ہوا کہ تم بھی اِسی ٹرین سے جا رہے ہو، تمھارا ساتھ رہے گا۔"

پرکاش نے ذہن میں آتے ہوئے خیالوں کو دُور جھٹک دیا اور سامنے بیڈ پر رکھا ناول پھر ہاتھ میں اُٹھایا اور پڑھنے لگا۔

دن کے دو بج رہے تھے۔

گرمی سے کمپارٹمنٹ جہنم معلوم ہو رہا تھا۔

پنکھا آگ برسا رہا تھا۔

وہ انگڑائی لے کر اُٹھا اور تولیہ اور صابن لے کر باتھ رُوم میں چلا گیا۔ مُنہ ہاتھ دھو کر جب وہ اپنی جگہ آ بیٹھا تو اُس نے دیکھا کیتھرین اُس کے بیڈ سے ناول اُٹھا کر پڑھنے لگی ہے۔

"Excuse me، آپ کی اجازت کے بغیر یہ ناول ______"

"Never mind please ______" پرکاش نے مُسکرا کر اُس کی بات "Thank you"

وہ ناول پڑھنے لگی۔

اِتنے میں ٹرین ایک چھوٹے سے سٹیشن پر رُکی۔ پرکاش دوڑ کر کوکا کولا کے دو گلاس لایا اور ایک گلاس اُسے پیش کیا۔

"O, Thank you" اُس نے تشکّر آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھا، اُس کے چہرے سے ایک لمحے کے لئے اُداسی کی دُھند چھٹ گئی۔

اُس لمحے وہ کتنی دلکش معلوم ہوئی۔

"آپ کو گرمی محسوس ہو رہی ہوگی" وہ اِتنی دیر کی اُکتا دینے والی خاموشی کو توڑنے پر تُل گیا تھا۔

"ہاں بہت گرمی لگتی ہے ہم کو۔"

"آپ پہلی بار انڈیا آئی ہیں کیا؟"

"نہیں ______ اِس سے پہلے بھی آئی ہوں۔"

"گُڈ ______ آپ کسی کام کے سلسلے میں آئی ہوں گی۔"

"کام ______؟" اچانک اُس کے چہرے کی شگفتگی اور لہجے کی بشاشت کافور ہو گئی اور اُس کے چہرے پر دُھند پھیل گئی۔

اور پھر رات کے بارہ بجے تک وہ اپنی کہانی سُناتی رہی۔ رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر۔ کتنی دلگداز کہانی تھی۔ آنسوؤں کا ترنّم لئے ہوئے۔ ایک ایک لفظ نشتر بن کر اُس کے دل میں اُتر گیا اور اُس کی اُداس، سوچتی ہوئی سُنہری آنکھیں ______!

وہ دونوں کھڑکی کے ساتھ آمنے سامنے لگی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

"چار سال پہلے کی بات ہے" کیتھرین کی آنکھوں میں خوابوں کی پرچھائیاں گہری ہو گئیں "شمشیر سنگھ پیرس میں ایک مشہور انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے چکا تھا۔ میں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں نئی نئی ملازم ہوئی تھی۔ اُس دن سخت بارش ہو رہی تھی۔ شمشیر سنگھ دیر تک لائبریری میں بیٹھا رہا اور ایک کتاب کے نوٹس لیتا رہا اور میں لائبریری کے اُس سیکشن میں چُپ چاپ کُرسی پر سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ شیشوں سے باہر متواتر بارش سے دن کی روشنی دُھندلی پڑ گئی تھی۔ اُسی دن ہمارا تعارف ہوا۔ میں شمشیر سنگھ کو جانتی تھی۔ میرے ہی ہاتھوں کتابیں اُس کے نام اِشو ہوتی تھیں۔ اُس کی وجیہہ شخصیت مجھے پسند آئی تھی۔ ہم کچھ دیر تک لائبریری کے اُس خاموش سیکشن میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں بہت دلچسپی سے شمشیر سنگھ کی باتیں سُنتی رہی۔ اور وہ مجھے میرے خوابوں کی دُنیا انڈیا کی عجیب و غریب باتیں سُناتا رہا۔ میں بچپن ہی سے ہندوستان کو اپنے خوابوں میں بسائے ہوئے تھی۔ ڈیڈی اپنے زمانے کے جاگیردار تھے اور اُنھیں شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اُسی شوق نے اُنھیں ہندوستان کے دُور اُفتادہ جنگلوں کی خاک چھنوائی تھی اور واپس آکر اُنھوں نے ہندوستان کے جنگلی جانوروں، وہاں کے رہنے والوں، اُن کی رسموں، لباس وغیرہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سُنائی تھیں۔" وہ رُک گئی اور قدرے توقّف کے بعد بولی: "ڈیڈی کو انڈیا سے عشق تھا اور پھر جب دو سال کے بعد وہ پھر انڈیا گئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے اور ممی کو بھی ______ اور پھر ہم پندرہ سال تک یہاں رہے اور یہیں ڈیڈی کی Death بھی ہوئی اور پھر ہمیں وطن واپس جانا پڑا ______" اُس کا لہجہ مدھم پڑ گیا تھا اور پرکاش گردن آگے بڑھا کر ہمہ تن گوش تھا۔

کیتھرین نے دائیں رخسار پر جھُولتے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے ٹھیک کیا اور کہنے لگی۔

"انڈیا سے مجھے بھی بہت پیار تھا اور میں پھر یہاں آنے کی آرزو کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی ______" ٹرین ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ رُک گئی۔ کیتھرین نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ دُور تک پھیلے ہوئے میدانوں میں جنگلی درخت اور خاردار جھاڑیاں دھوپ میں جُھلس رہی تھیں۔

"______ اور پھر اُس شام کو ہم بھیگتے ہوئے امپیریل کیفے پہنچے اور وہاں ہم نے کافی پی اور رات کو دیر میں میں گھر پہنچی، شمشیر سنگھ میرے ساتھ تھا۔ ممی میرے انتظار میں تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور میں نے بہت چاؤ سے شمشیر سنگھ کا تعارف ممی سے کرایا۔ ممی اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اُسے دعائیں دیتی رہی۔"

ٹرین چھک چھک کرتی ہوئی بھرپور رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

"اور پھر شمشیر سنگھ ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ وہ جب چاہے بلا تکلّف چلا آتا اور ممی اُس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتی اور مجھے دن رات شمشیر سنگھ کا خیال رہتا۔ ہماری اکثر شامیں ساتھ گزرنے لگیں، ہم پکنک کو ساتھ جاتے، سنیما دیکھتے،

باتیں کرتے۔ بحثوں میں اُلجھتے اور ایک دن راکس کلب میں شمشیر سنگھ نے مجھ سے پروپوز کیا۔ میں شرم سے [illegible] گئی اور اُسی جگمگاتی رات کو شمشیر سنگھ نے قیمتی ہیرا جڑی ہوئی سونے کی انگوٹھی میری اُنگلی میں پہنا دی۔"

پرکاش کہانی میں ڈوب چکا تھا۔ کیتھرین چپ ہو گئی تھی۔ اُس کی خاموشی کی تاب نہ لا کر پرکاش نے پوچھا۔

"اچھا اُس کے بعد کیا ہوا؟"

"اُسی سال شمشیر سنگھ کا امتحان ہو رہا تھا۔ وہ امتحان میں شامل نہ ہوا اور گھر سے ٹیلیگرام ملنے پر وہ انڈیا چلا گیا اور ایک ہفتہ میں واپس آنے کا وعدہ کر گیا لیکن وہ واپس نہ آیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا، دو ہفتے گزر گئے، ہفتوں کے بعد مہینے گزر گئے اور پھر ایک سال گزر گیا۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں بے چینی سے پاگل ہو رہی تھی اور دن رات روتی رہتی۔ ممی مجھے تسلی دیتی رہی ـــــ" پرکاش نے دیکھا اُس کے چہرے پر ساری دُنیا کی اُداسی سمٹ آئی تھی اور لہجے میں آنسوؤں کا ارتعاش تھا۔

"میری زندگی کا واحد سہارا وہ خطوط تھے جو مہینے میں ایک دو بار شمشیر سنگھ بھیجتا تھا۔ وہ ابھی تک برابر یہی لکھتا رہا کہ وہ جلد آ جائے گا اور مجھے دُلہن بنا کر ہندوستان لائے گا۔ اُس نے انجینئرنگ کا خیال ترک کر دیا تھا اور بزنس شروع کی تھی اور اِس سال میں نے شمشیر سنگھ کو لکھا کہ میں خود اُس کے پاس آ رہی ہوں اور اُس کا جواب ملنے سے پہلے ہی میں شمشیر سنگھ کے پاس پہنچی۔ بے چینی سے میرا بُرا حال ہو چکا تھا اور وہاں معلوم ہوا ـــــ"

"کیا؟"

"یہ کہ شمشیر سنگھ نے شادی کی ہے۔ یہ اُس کی دوسری شادی ہے۔ ایک اچھی خاصی پڑھی لکھی بیوی اُس کے گھر میں موجود ہے۔ میں اُس سے ملی۔ وہ مجھ سے بہت پیار سے ملی اور پھر ـــــ"

کہانی کے اِس موڑ پر کیتھرین اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اُس کا گلا رُندھ گیا۔ الفاظ اُس کے جذبات کا ساتھ نہ دے سکے۔ اُس کے خوبصورت ہونٹ تھرتھرا کر ساکت ہو گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کی سنہری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات دیکھ کر پرکاش کے دل میں ایک عجیب سا، گہرا سا نامعلوم جذبہ جاگ اُٹھا اور لمحہ بھر میں اُس جذبے نے اُس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ کون سا جذبہ تھا؟ اُس کے دل میں آیا کہ کیتھرین کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر اُس کی آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں کو چوم لے۔ وہ ایک اجنبی عورت کی دلگداز کہانی کے تانے بانے میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اُس کے جسم کا رُواں رُواں اِن تانوں بانوں میں جکڑ گیا تھا۔

بمبئی پہنچ کر کیتھرین نے اپنا پروگرام منسوخ کر دیا تھا اور وہ پرکاش کے ساتھ گرین ہوٹل میں ٹھہرنے پر رضامند ہو چکی تھی۔

دس دن گزر گئے تھے۔

اور پرکاش کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے صرف ایک لمحہ گزر گیا ہے۔ صبح کب ہوتی ہے اور شام کب ہوتی ہے اُسے بالکل احساس نہ تھا۔ وقت اپنی رفتار بھول چکا تھا۔ وہ کہاں سے آیا تھا اور کس کام کے لیے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا، اُسے بالکل ہوش نہ تھا۔ وہ دن رات کیتھرین کے پاس رہتا، اُس کی اُداسیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ مسکراتی تو وہ مسرت سے ناچنے لگتا۔ کیتھرین اُس کی ہو چکی تھی۔ اُس کی سنہری آنکھوں کی اُداسی دُور ہو چکی تھی ـــــ اور پھر اِن دنوں برابر اپنے شہر کے مشہور پامسٹ کے الفاظ رہ رہ کر اُسے یاد آتے رہے ـــــ "آپ قسمت کے دھنی ہیں۔ دو شادیاں آپ کی قسمت میں لکھی ہیں، آپ کے ہاتھ کی لکیریں کہتی ہیں۔"

کیا ہاتھ کی لکیریں سچ کہتی ہیں؟

کیتھرین ڈریسنگ ٹیبل پر بناؤ سنگھار میں محو تھی۔ وہ کمرے کے باہر کے حصے میں پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ وہ لبرٹی سینما جا رہے تھے۔ اُسے آج گھر سے دو ہزار روپے کا منی آرڈر موصول ہوا تھا۔ اُس نے دو دن پہلے گھر تار بھیجا تھا، کیونکہ اُس کی جیب خالی ہو چکی تھی۔ اُس نے کیتھرین کو ساری بمبئی دکھائی تھی اور روپے پانی کی طرح بہائے تھے اور کل سے وہ ہوٹل کے کمرے میں قید رہنے کے بعد آج منی آرڈر وصول کر چکا تھا اور جیسے اُس کے پر لگ گئے تھے۔ فوراً اُس نے انگریزی فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اِن دس دنوں میں اُسے دو تین بار گھر کا خیال آیا اور للِتا کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی، اُس کی سیاہ آنکھیں، نرمی اور سکون لیے ہوئے، اُس کی سلیقہ مندی اور سگھڑ پن۔ لیکن ہر بار اُسے محسوس ہوا کہ للِتا اور گھر کے دوسرے افراد دُور سایوں میں تحلیل ہو رہے ہیں۔ اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ اُن سے ایک ہزار میل کی دُوری پر ہے۔ صدیوں کی مسافت ہے، کبھی نہ طے ہونے والی اور ماضی ہے، مٹتا سا سایہ۔ زندگی حال کے لمحوں میں کھِلتی ہے، مہکتی ہے، جگمگاتی ہے ـــــ وہ مسکرایا۔

صبح کو وہ دیر سے جاگا۔

اُس کا جسم کافی تھکا ہوا تھا اور گہری نیند سونے کے باوجود ابھی اُس کی تھکاوٹ دُور نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے ایک انگڑائی لی اور بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ گذشتہ رات کی دُھندلی سی تصویر اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ وہ دونوں پرنس کلب میں بیٹھے تھے اور کافی زیادہ پی گئے تھے لیکن اُس کے حواس قائم تھے۔ البتہ کیتھرین پر نشہ کی سی حالت طاری ہو رہی تھی اور وہ کلب کے ادھیڑ عمر منیجر سے لہک لہک کر باتیں کر رہی تھی اور منیجر بھی اُس سے اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگا تھا۔ اُس نے موقع کی نزاکت بھانپ لی اور بوائے کو ٹیکسی لانے کو کہا لیکن منیجر نے بہت ڈھٹائی سے کیتھرین کو ناچنے کی دعوت دی۔

"ہم اب جا رہے ہیں۔" اُس نے ناراضگی سے کہا۔

"آپ چاہیں تو شوق سے جا سکتے ہیں مسٹر!" منیجر کی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔

"شٹ اپ، نان سنس ـــــ" وہ شیر کی طرح دہاڑا۔

کلب میں سنّاٹا چھا گیا۔

کیتھرین چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری بہن سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

"اوہ! آئی ایم سوری مسٹر ——— آئی ایم ریلی سوری" منیجر کا چہرہ راکھ ہوا۔

اور اُس نے کیتھرین کے شانے پر ہاتھ رکھا اور سرگوشیوں کے سیلاب میں راستہ بناتے ہوئے باہر نکلا۔

ہوں ——— ! اُس نے پھر ایک انگڑائی لی۔ ایک نامعلوم غم اُس کے دل میں کہیں سے رینگ کر آیا۔ اُف ——— !

اِتنے میں کیتھرین اُس کے سامنے آگئی، مسکراتی ہوئی۔ وہ ایک تازہ پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔

ناشتہ کر کے اُس نے کپڑے بدلے اور پہلی بار بزنس کے سلسلے میں نیو کالونی جانے کے لئے تیار تھا۔ معاً اُس کی نظر دروازے میں پڑے ایک لفافے پر پڑی، جو ڈاکیہ وہاں پھینک گیا تھا۔

کیتھرین کو کپڑے اور چیزیں سنبھالنے میں مصروف دیکھ کر اُس نے لفافہ جلدی سے چاک کیا اور خط کھولا۔

یہ لِلتا کا خط تھا ———

"جب سے آپ گئے ہیں گھر سونا سونا سا معلوم ہوتا ہے۔ کسی کام میں میرا جی نہیں لگتا۔ آپ نے ایک خط بھی نہیں لکھا اور اِدھر میری جان نکلی جا رہی ہے، خط جلد لکھئے اور ہاں میری چیزیں ———"

اچانک اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی رُوح سے مسرت اور تازگی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا۔ ایک ایک جملہ اُس کی رگ رگ میں زہر کی طرح پھیل گیا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کی کئی بُوندیں اُبھر آئیں، وہ فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ خط کو سامنے تپائی کے کاغذات پر گرا دیا۔ کیتھرین کمرے کے اندرونی حصّے میں قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی اور بالوں کو سنوار رہی تھی۔

وہ ایک عجیب سی اُلجھن کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور سڑک پر آیا۔ اُسے محسوس ہوا سڑکوں پر دُھول اُڑ رہی ہے اور اُس کی سانس گھُٹ رہی ہے۔ اُس نے سوچا وہ واپس کمرے میں جا کر دردِ سر کا بہانہ کر کے بستر میں لیٹ جائے لیکن وہ بے خیالی میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا۔ "کہاں جانا ہے صاحب؟"

"نیو کالونی"

اور ٹیکسی لوگوں کے بھاگتے ہوئے ہجوم کو چیر رہی تھی۔ وہ آل انڈیا ٹمبر فرم لمٹیڈ کے دفتر کی طرف فٹ پاتھ پر قدم اُٹھا رہا تھا لیکن اُس کا دماغ کہیں اور تھا۔ اچانک اُس کے سامنے ایک بس رُکی، وہ بھی رُک گیا۔ چند سواریاں اُتریں اور چند لوگ سوار ہوئے۔ وہ بھی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ شام تک پھرتا رہا۔ سڑک سڑک گھومتا رہا، بھٹکتا رہا۔ اُس کا جسم تھک کر چُور ہو گیا اور جب رات کے اندھیرے میں وہ رائل کیفے سے نکل کر ہوٹل پہنچا تو اُس کا ذہن آئینے کی طرح صاف تھا، سارا غُبار دُھل چکا تھا ——— وہ کیتھرین کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ کیتھرین اُس کی ہو چکی ہے۔ وہ زخم خوردہ ہے۔ اُس نے عہد کیا ہے کہ وہ اُس کے زخمی دل پر اپنے پیار کا پھاہا رکھ دے گا۔ کیتھرین اُس کی ہے، وہ اُس کی سنہری آنکھوں کو اُداس نہیں کر سکتا ——— اور لِلتا؟ وہ دُور کی آواز ہے، ڈوبتی آواز! ——— اور اُس کے ذہن میں پامسٹ کی زندہ آواز گونجتی رہی "دو شادیاں آپ کی قسمت میں لکھی ہیں، آپ کے ہاتھ کی لکیریں کہتی ہیں ———" یہ سب تقدیر کی باتیں ہیں اور تقدیر چانس بن کر زندگی کا دھارا بدلتی ہے۔

وہ کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ برآمدے میں مدّھم روشنی تھی۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دروازہ باہر سے مقفّل تھا۔ اُس نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا، کمرے میں لائٹ آن کی۔ کیتھرین اِس وقت کہاں گئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ باہر اُس کی تلاش میں نکلی ہو، کتنا عجیب ہے وہ بھی۔ ایک دم گدھا۔ سارا دن کس چکر میں رہا ——— ارے، یہاں سب چیزیں اُلٹ پلٹ ہو گئی ہیں، کمرے کا نقشہ ہی بگڑ چکا ہے اور ——— اور کیتھرین کا سوٹ کیس، اُس کے کپڑے، اُس کے سینڈل، میک اپ کا سامان سب غائب ———!!

"کیتھرین ———!" اُس کی آواز کمرے کی ویران خاموشی میں ایک گونج پیدا کر گئی۔

اُس کا دماغ چکرایا۔ اُسے کمرے کی ہر چیز کھڑکیاں، دیواریں، پلنگ، کرسیاں ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ معاً اُس کی نظر تپائی پر پڑی، وہاں ایک پرچی تھی ———

"میں واپس اپنے وطن جا رہی ہوں۔ میں دوبارہ اپنے آپ کو فریب نہیں دے سکتی۔ آپ کی یاد کو ساری عمر دل میں بسائے رکھوں گی!"

اچانک اُسے محسوس ہوا اُس کا دماغ ایک شکنجے میں کس گیا ہے اور ——— کیتھرین جا چکی ہے۔ اُس کی سنہری آنکھیں اُداس ہو گئی ہیں۔ وہ کیتھرین کے بغیر کیسے زندہ رہ سکے گا؟

وہ کیتھرین کے بغیر

اِتنے میں اُس کی نظر تپائی پر لِلتا کے کھُلے خط پر پڑی۔ اُس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کرسی پر بیٹھ گیا اور خط کو لرزتے ہاتھوں میں اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ جیسے وہ خط کو پہلی بار پڑھ رہا ہو!!

غزل

شبابؔ للت ایم اے

کہنے کو مرے حال سے انجان رہے ہیں
ہر حال میں وہ میرے نگہبان رہے ہیں

پہلے بھی کہیں تجھ سے ملاقات ہوئی ہے
ہم اے غمِ دوراں تجھے پہچان رہے ہیں

سنتا ہوں تغافل سے پریشاں مجھے کرکے
سرکار بھی تا دیر پریشان رہے ہیں

ہر چند کہ اِس میں نہیں ذکر آج ہمارا
ہم آپ کی روداد کا عنوان رہے ہیں

کچھ ہم کو ستم ہائے زمانہ نے مٹایا
کچھ آپ کی نظروں کے بھی احسان رہے ہیں

مے خانے کی رونق میں کبھی فرق نہ آیا
وہ تو حرم و دیر ہی ویران رہے ہیں

ہم رازِ دروں پردہ سے پردہ تو اٹھادیں
محفل کی ذرا نبض کو پہچان رہے ہیں

میں ڈوبنے والا نہ تھا امواجِ بلا سے
پنہاں مری کشتی ہی میں طوفان رہے ہیں

پرساں نہیں محفل میں کوئی آج ہمارا
ہم لوگ ہی محفل کی کبھی جان رہے ہیں

آنے نہ دیا حرف کبھی غیرتِ فن پر
ہم اہلِ قلم لاکھ پریشان رہے ہیں

کچھ ٹھیس ضرور اُن کو زمانے سے لگی ہے
وہ آج مجھے جانِ وفا مان رہے ہیں

شدّت سے کریں گے کبھی آپ اُس کی تمنّا
جس بات پر اب آپ بُرا مان رہے ہیں

کیا خوب وہ نقاد ہیں اب میرے چلن کے
بدنام بہت جن کے شبستان رہے ہیں

بدلا نہ شبابؔ اپنے مقدّر کا فسانہ
گو اِس کے بدلتے کئی عنوان رہے ہیں

افسانہ

سیاہ کینواس

شعیب شمس ایم۔ اے

صفدر منزل، کریم چک چھپرہ۔ بہار

بھائی جان! سلام خلوص

میں گزشتہ دو ماہ سے بہت زیادہ مصروف تھا۔ عدیم الفرصتی نے اس قابل بھی نہ رکھا تھا کہ "لذّت کام و دہن" کی آزمائشوں سے ہی گزر جاتا۔ حالانکہ آپ اپنے خلوص کی وجہ سے برابر یاد آتے۔ میں ہی خاموش رہا۔ شکر ہے فرصت نصیب ہوئی۔ "دیدِ کعبہ" وا ہوا اور اب میں آپ کی خدمت میں "سیاہ کینواس" لے کر حاضر ہوں۔ کہانی طویل ضرور ہے لیکن بُری نہیں۔ آپ پڑھیں گے تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ روشی ہمدردی کے قابل ہے یا نہیں؟ یہ ایک سوال ہے اور اس کا جواب میں اپنے قارئین سے چاہوں گا ——— "خواب" کی مبارکباد مجھے لندن سے Servants of India Library کے اراکین نے بھی دی ہے۔ ایک صاحب تو اُسے ہندی میں ترجمہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اجازت دے دی ہے۔ پتہ نہیں اُنھوں نے آپ سے اجازت لی ہے یا نہیں؟ حالانکہ آپ کی اجازت ضروری ہے . . .

آپ کا بھائی ——— شعیب شمس

یادوں کی اپنی دُنیا ہوتی ہے، اپنی ایک الگ بستی، لہراتی بل کھاتی پگڈنڈیوں اور شور مچاتی ہوئی کوہستانی ندیوں کی طرح پیچیدہ یادیں! اُن یادوں کا بھی اپنا وجود ہے۔ اُن کے وجود اور اُن کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ اِس لئے کہ ہر انسان کی زندگی میں یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی کبھی اِتنا طُول کھینچتا ہے کہ مختلف یادیں ایک زنجیر کی طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ زندگی کا ایک بھرپور تصوّر نظروں کے سامنے آجاتا ہے، مُسکراتی اور قہقہے لگاتی ہوئی، روتی اور سِسکتی ہوئی زندگی! ——— اور یادوں سے پیچھا بھی تو نہیں چھڑایا جاسکتا ہے۔ ان کی حقیقت تو اُس آئینے کی طرح ہے جس میں اپنی شکل دیکھنے کے بعد نہ جانے کیسے کیسے خیال ذہن میں سر اُبھارتے ہیں، ضدّی بچوں کی طرح اُن کی ہِمکیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ یادیں ہوں یا آئینے دونوں میں سے کسی کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کا کینواس ہی کچھ ایسا ہے کہ اِس پر مختلف تصویریں مختلف اوقات میں مختلف رنگ و آہنگ کے ساتھ اُبھرتی ہیں، مِٹتی ہیں، پھر اُبھرتی ہیں، پھر مِٹتی ہیں اور یہ اُبھرنے مِٹنے کا سلسلہ اُس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک زندگی کے کینواس میں ذرا بھی سفیدی باقی رہتی ہے۔ سیاہی آئی، یادیں، تصویریں، آئینے سب خاموش! کینواس پر لاکھ برش مارو، رنگ پھیرو لیکن کوئی تصویر واضح طور پر اُبھرتی ہی نہیں اور سفید رنگوں سے لکیریں کھینچ کر سفید دودھ جیسی تصویر کون بنائے؟ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر ابلیس آدم کے پیکر کو سجدہ ہی نہ کر لیتا، انسان فرشتہ ہی بنا رہتا، دُنیا میں آتا ہی کیوں، حوروں سے اٹکھیلیاں کرتا، ابدی زندگی کے لُطف حاصل کرتا۔

روشی کی زندگی بھی سیاہ کینواس میں تبدیل ہو چکی تھی اور اب اُسے اُس کی خواہش بھی نہ تھی کہ کوئی سفید رنگ سے دودھ جیسی تصویر بنائے جیسے زندگی نہ ہو فرہاد کی تیشہ زنی کا ردِ عمل ہو ——— لیکن روشی کی زندگی میں بھی یادوں کی اپنی ایک واضح حقیقت تھی ——— یادیں ——— اُس کی زندگی کے مختلف شیڈز ——— مختلف تصویریں ——— مختلف آئینے ——— اور یہ یادیں اُس کی زندگی کے حادثات تھے۔ جن حادثات نے اُس کی زندگی کی ایک عجیب سی تصویر پیش کی تھی جسے دیکھنے کے بعد کسی کو بھی اُس سے ہمدردی نہ ہوتی تھی، وہ جذبہ پیدا ہی نہ ہوتا تھا جسے لوگ ہمدردی کے نام سے منسوب کرتے ہیں، پتہ نہیں کیوں؟ ——— شاید اِس لئے کہ لوگوں کی نظروں میں اُس نے خود ہی

اپنی مانگ سے سُرخ لکیر نوچ دی تھی۔ اُسے سفیدی سے اِتنا پیار ہی تھا کہ اُسے اپنی مانگ میں افشاں کی چمکتی سی لکیر پسند نہ آئی، سیندور کا سُہاگ نہ بھایا اور وہ اپنے پتی ہی کو کھا گئی۔

لیکن ارشد کے مرنے کے بعد اُس نے سفید کپڑے ایک [illegible] نہ چھینے زندگی کا کینواس ہی جب سیاہ ہو چکا تھا تو سفید کپڑے کیوں پہنے؟ سیاہ لباس بھی تو ماتمی لباس ہے اور اُس کے گورے چِٹّے جِسم پر سیاہ لباس سجتا بھی تھا۔ لیکن ارشد کی موت اُس کی زندگی کا پہلا حادثہ تو تھا نہیں۔ ایسے ایسے کئی حادثات اُس کی زندگی میں پیش آئے تھے اور ہر بار اُسے ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اُس کے حُسن، اُس کی تعلیم اور اُس کی دولت سے متاثر ہو کر کئی خوش پوش اور خوش شکل نوجوانوں نے اُس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے کسی کو کوئی لفٹ نہ دی۔ ایک شانِ بے اعتنائی سے روزانہ شام کو کلب آتی، رمی کھیلتی، سگریٹ پیتی اور چلی جاتی۔ کلب کے ممبروں میں روشی ہی وہ واحد ممبر تھی جسے سگریٹ نوشی کا شوق ہی نہیں جنون تھا۔

"مغرور ہے۔"

"پوز کرتی ہے۔"

"پرائیویٹ بزنس کرتی ہے۔"

"خود کو بہت حسین سمجھتی ہے۔"

یہ سب باتیں وہ جانتی تھی۔ وہ سُنتی، مُسکراتی اور فضا میں سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بناتی رہتی۔

سگریٹ اُس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اُسے سگریٹ کے بغیر کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔ لیکن جدید فیشن کے تحت کسی کو حیرت بھی نہ ہوتی تھی۔ بعض قدامت پرست اصحاب اُس کی اِس سگریٹ نوشی کو بُری نظروں سے دیکھتے تھے لیکن کسی میں اُسے ٹوکنے کی ہمت نہ تھی اِس لئے کہ میجر دُرّانی کا واقعہ اب تک لوگوں کو یاد تھا۔

"آپ سگریٹ کیوں پیتی ہیں؟"

"آپ شراب کیوں پیتے ہیں؟"

"عادت ہے۔"

"میں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوں! اگر میں قابلِ نفرین ہوں تو مجھ سے پہلے آپ قابلِ نفرین ہیں۔"

اور روشی بھناتی ہوئی کوریڈور کی طرف چلی گئی تھی۔ لوگوں نے نظروں سے اُس کا تعاقب بھی کیا تھا۔ اُس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ کار کے نزدیک پہنچی، ایک سگریٹ سُلگایا اور دھول اُڑاتی ہوئی آسٹن کمپاؤنڈ سے باہر نکل گئی۔

آوارہ!

بے حیا!

بد چلن!

لوفر!

کوڑھ کا دھبّہ!

چوٹ کھائے ہوئے نوجوانوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی لیکن میجر دُرّانی خاموش تھے۔ بُت کی طرح جیسے اُنھیں سانپ سُونگھ گیا ہو۔ شاید وہ خود کو ملامت کر رہے تھے کہ اُنھوں نے ایک ناگن کو چھیڑا ہی کیوں؟

"مجھے افسوس ہے میجر کہ ایک خاتون ممبر نے آپ کے وقار کو صدمہ پہنچایا۔" کلب کے سکریٹری نے ازراہِ اخلاق ہمدردی دکھائی۔

"کوئی بات نہیں غلطی میری ہی تھی۔ کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ ہر انسان کے اپنے ذاتی مسائل ہوتے ہیں جنھیں ہر انسان خود ہی حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اجتماعیت کوئی بندھا ٹکا اور واضح اصول نہیں رہا۔"

پھر سب رمی کھیلنے میں مشغول ہو گئے۔ میجر دُرّانی متواتر ہارتا رہا۔ اُس کے ذہن کی یکسوئی ختم ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی اُٹھا اور کلب کمپاؤنڈ سے باہر نکل گیا اور ایسا گیا کہ پھر کبھی لوٹ کر نہ آسکا۔ اُسے اپنی ذلّت کا زبردست احساس تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اُس نے اپنا تبادلہ دوسری بٹالین میں کرا لیا اور اُس نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا جس شہر میں ایک خاتون نے اُسے ذلیل کیا تھا۔ روشی کے لئے جو ہمدردی کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں تھا اُس میں کمی آگئی تھی۔ اِس لئے کہ روشی ہی کی وجہ سے کلب کے ممبروں نے ایک اچھا ساتھی کھو دیا تھا۔ اِس واقعہ کے بعد سے کلب کی فضا کئی دنوں تک بوجھل سی رہی اور اب کسی میں اِتنی ہمّت نہ تھی کہ روشی کی سگریٹ نوشی پر نکتہ چینی کرتا۔ لیکن اکثریت ایسے ممبروں کی تھی جو اِس کے باوجود روشی سے قُربت کے خواہاں تھے۔ محض تفریح کی خاطر — چند گھڑی ہنسنے بولنے کے لئے۔ لیکن روشی کو تو ایسے ہم سفر کی تلاش تھی جو اُس کے دُکھ درد کا ساتھی ہو، اُس کے درد کا مداوا ہو۔ اُس کی زُلفوں میں اپنی اُنگلیاں پھنسا کر اُنھیں چُومے، اُسے تھپکیاں دے کر سُلائے۔ اُس کے خوابوں کی حسین تعبیر ہو۔ اُسے باغباں کی تلاش تھی بھونروں کی نہیں۔ اِسی لئے اب نوجوانوں نے اُس کے گرد چکّر لگانا چھوڑ دیا تھا پھر بھی موقع ملنے پر سب ہی ہنس بول لیتے تھے اور روشی اِس کا بُرا بھی نہ مانتی تھی۔ آخر سوسائٹی ہے۔ کسی کو روکا بھی کیسے جا سکتا ہے۔ ذرا سا ہنس بول لینے میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ کسی کی چُبھتی ہوئی نظریں جسم میں تھوڑے ہی اُتر جاتی ہیں۔

لیکن سانولا سلونا، خاموش اور گمبھیر پروفیسر رشید جب کلب کا نیا ممبر ہوا تو سبھوں نے اُسے خوش آمدید کہا۔ اُس کے اعزاز میں کلب کی رسم کے مطابق ایک پارٹی بھی دی گئی۔ پارٹی کے بعد رمی کی محفل جمی اور روشی نے رشید کی طرف سگریٹ کا پیکیٹ

ملتے ہوئے کہا۔

"سگریٹ پلیز!"

"نو تھینکس، میرے پاس موجود ہے!"

"مبارک ہو مس روشنی!" ورما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کس بات کی مبارکباد؟"

"آپ کو ایک ہم شوق تو ملا اِس محفل میں۔"

"خوش ذوق!" روشنی نے کارڈ پھینکتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہم سب بد ذوق ہیں؟" شرما نے احتجاج کیا۔

"میں نے صرف مسٹر رشید کے متعلق اپنے نظریہ کی وضاحت کی ہے آپ لوگوں کو تو کچھ بھی نہیں کہا۔"

"آئی ایم ساری!" شرما نے معذرت طلب کرلی۔ وہ بات کو طول دے کر ذلیل ہونے کے فیور میں بالکل نہ تھا۔

پھر سارے ممبروں کو یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ روشنی رشید کے قریب آتی جا رہی ہے۔ دونوں برابر ایک ہی میز پر ساتھ بیٹھ کر رمی کھیلتے ہیں۔ روشنی رشید کی باتوں کا ہنس کر جواب دیتی اور اس کے ایک ایک عمل پر تحسین و آفریں کے پھول نچھاور کرتی۔

"روشنی نے آخر اپنا پارٹنر منتخب کر ہی لیا!"

"رشید قسمت کا دھنی ہے!"

"لیکن اُس سانولے سے نوجوان میں روشنی کو کون سی کشش محسوس ہوئی؟"

"وہی جانے۔"

"کمبخت کی پسند بھی بالکل تھرڈ کلاس ہے۔ رشید جیسا بدصورت تو اِس کلب میں کوئی بھی نہیں۔"

"ہوسکتا ہے رشید کی بدصورتی ہی کو اُس نے ترجیح دی ہو۔"

"اِس میں بھلا کون سی تک ہے؟"

"اِس طرح ایک بدصورت شوہر خوبصورت اور حسین بیوی کا غلام بنا رہے گا۔"

"تب تو ہمیں بھی اپنے چہروں پر کالک پوت کر بدصورت بن جانا چاہئے۔"

اور شرما کی اِس بات پر سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

فقرے بازیاں ہوتی رہیں، کلب کی ہما ہمی بڑھتی رہی۔ جام کی کھنک میں کچھ اور بھی تیزی آگئی ——— اور روشنی اور رشید ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ روشنی نے دل ہی دل میں رشید کو اپنے من مندر کا دیوتا تصور کر لیا لیکن کھل کر کبھی گفتگو نہ ہو سکی۔ صرف احساسات واضح ہو چکے تھے۔

لیکن یہ کہانی بھی ایک دن مُردہ ہوگئی۔ رشید نے کلب کے سارے ممبروں کو شادی کے ڈنر پر مدعو کیا۔ روشنی موجود نہ تھی۔ جب کلب میں آئی تو رشید کی شادی کے چرچے تھے۔ اُسے زندگی میں پہلی بار شکست کا احساس ہوا۔ سپنوں کے شیش محل میں آگ سی دہک اُٹھی۔ سُرخ سُرخ انگارے۔ اُسے اپنا وجود سُلگتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ رشید سے مل کر بہت کچھ دریافت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن رشید موجود نہ تھا۔ وہ سگریٹ پھونکتی رہی۔ خاموش اور گُم سُم! اور جب ذہن کو یکسوئی محسوس نہ ہوئی تو ادھ جلے سگریٹ کو قدموں تلے مسل کر کلب کمپاؤنڈ سے باہر نکل گئی۔

"غرور کا سر نیچا ہوگیا۔" شرما نے کہا۔

"مجھے اُس سے ہمدردی ہے۔" ورما نے ہمدردی جتائی۔

"کیوں؟" شرما اپنی شکست ماننے پر تیار نہ تھا۔

"مظلوم ہے۔ اور کوئی خاص بات نہیں۔"

اِس واقعہ کے بعد روشنی عرصے تک نظر نہ آئی۔ رشید کے یہاں ڈنر میں بھی موجود نہ تھی۔

"آپ نے مس روشنی کو مدعو نہ کیا؟"

"ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ میں خود ہی گیا تھا معلوم ہوا دلّی گئی ہوئی ہیں۔"

"بہرحال آپ کو اُن کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ اِس لئے کہ کلب کے ممبروں میں وہ آپ سے بہت قریب تھیں۔"

"مس روشنی صرف سگریٹ کی حد تک میری ہم خیال تھیں اور کوئی مناسبت ہم دونوں میں نہ تھی۔"

لیکن ورما کو روشنی کے جذبات کا احساس تھا۔ اُسے ہمدردی تھی۔ وہ اُسے مظلوم سمجھتا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد روشنی کلب میں پھر نظر آئی۔ بیر بہوٹی کی طرح سُرخ کپڑوں میں ملبوس لیکن وہ تنہا نہ تھی۔ اُس کے ساتھ ایک دُبلا پتلا سا نوجوان بھی تھا۔

"آیئے آپ کا تعارف کراؤں۔" روشنی نے سب کو متوجّہ کیا۔

"میں پرکاش ورما ہوں سیمنٹ کا ڈیلر۔"

"مجھے رشید کہتے ہیں۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار ہوں۔"

"میں ستیہ نارائن شرما ہوں۔ ایگزیکٹیو انجینئر پی، ڈبلو، ڈی۔"

"اِندر دیو۔"

"منورما۔"

"چرنجیت۔"

[illegible]

کلب کے سارے ممبران نے جب اپنا تعارف خود ہی کرا دیا تو روشی نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھی کا تعارف کرایا۔

"آپ مسٹر ارشد ہیں، میرے لائف پارٹنر!"

چند لمحوں تک سب ساکت رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں بھی نہ آسکا کہ یہ کیسے اور کیوں ہوگیا؟ رشید سے انتقام کے طور پر تو اس نے ایسا نہیں کیا؟ اور جب سب کی حیرت کم ہوئی تو یکبارگی سب نے دونوں کو مبارکباد دی۔ جیسے سوئچ آن کر دیا گیا ہو۔ اس خوشی میں سب نے ایک دوسرے کی صحت کا جام پیا اور رمی کھیلنے بیٹھ گئے۔

"مسٹر ارشد آپ کا مشغلہ کیا ہے؟" رشید نے دریافت کیا۔ پتہ نہیں رشید کو ارشد اور روشی کے حالات سے اتنی دلچسپی کیوں تھی؟

"فی الحال ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کرتے ہیں" روشی نے خود ہی جواب دے دیا۔

"اور میرا ارادہ ہے کہ اپنی فیکٹری ٹیکسٹائل مل کا سارا انتظام ارشد ہی کے حوالے کر دوں"

"بہت ہی نیک ارادہ ہے آپ کا" یہ شرما نے کہا۔

رمی کھیلنے کے دوران رشید نے روشی کو سگریٹ آفر کیا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر پیکٹ ارشد کی طرف بڑھا دیا۔ ارشد نے تھوڑے توقف کے بعد سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بالکل اناڑی ہو اور زبردستی سگریٹ پینے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بالکل اناڑیوں کی طرح کش کھینچتا اور فضا میں دھوئیں بکھیر دیتا۔ اس دوران اسے ایک دو بار کھانسی بھی آئی لیکن اس نے اسے زبردستی ضبط کرنے کی کوشش کی۔ ارشد کی اس کسمپرسی پر رشید اور شرما مسکراتے رہے۔ دونوں نے نظروں میں ایک دوسرے سے باتیں کیں جیسے کہہ رہے ہوں "پھنس گیا غریب!" ارشد کو رمی کھیلنی بھی نہ آتی تھی۔ وہ متواتر غلطیاں کرتا رہا اور ہارتا رہا۔ روشی نے ارشد کی گھبراہٹ اور پریشانی کو محسوس کر لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ارشد کا ہاتھ پکڑا اور معذرت طلب کر کے کلب کپاؤنڈ سے باہر نکل گئی۔

"ایک مہذب اور شریف انسان کو مزید مہذب بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے" شرما نے کہا۔

"قسمت ہے بیچارے کی!" رشید نے دھیمے لہجے میں کہا اور وہ بھی کھیل چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"آپ کہاں چلے؟"

"نسرین کو پکچر لے جانا ہے، غریب انتظار کرتی ہوگی"

"نئی نئی شادی ہے ناز نخرے برداشت کر لو۔ پھر تو بھاگنے ہی کی نوبت آئے گی اور ساری ساری رات کلب میں پڑے رہو گے"

"ایسی بد دعائیں تو نہ دو۔ تم سب میرے دوست ہو، دشمن نہیں"

ارشد روشی کے ساتھ کلب میں آتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ اس نئے ماحول سے مانوس ہوتا گیا۔ اب اس کی پیشانی پر پسینوں کے قطرے کبھی ہی کبھی نظر آتے تھے۔ وہ رمی میں بھی اب کم غلطیاں کرتا تھا۔ لیکن سگریٹ کی عادت اس سے نہ ہو سکی تھی۔ پھر بھی روشی کے ساتھ یہاں سگریٹ سلگاتا اور پھونکتا رہتا۔ اس کے اس اناڑی پن سے لوگ اب مانوس ہو چلے تھے۔ اس کی حرکتوں پر اب کوئی معنی خیز مسکراہٹیں نہ بکھیرتا۔ رشید کو تو اس سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ اس کی کسمپرسی دیکھ کر اسے تکلیف ہوتی تھی لیکن اس کے اظہار کا کوئی ذریعہ تھا نہ ضرورت۔ وہ دیکھتا، خاموش رہتا اور کڑھتا رہتا۔ آخر کر بھی کیا سکتا تھا۔

ٹیکسٹائل مل کا انتظام سنبھالنے کے بعد ارشد کی مصروفیتیں کافی بڑھ گئی تھیں۔ وہ کلب سے واپسی میں بھی تھوڑی دیر کے لئے فیکٹری چلا جاتا تھا۔ اسے مزدوروں کے مسئلوں سے کافی دلچسپی تھی۔ وہ انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ انھیں کافی رعایت دے گا۔ وہ بھی تو انسان ہی ہیں۔ ان کے بھی بال بچے ہیں، زندگی ان کے لئے بھی بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لئے اگر کسی کی ہمدردیاں انھیں مل جائیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ روشی نے بھی ارشد کو اس معاملے میں پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اس لئے کہ وہ جانتی تھی ارشد مادیت کا مخالف ہے اور پابندیاں لگا کر وہ اپنی ازدواجی زندگی کا سکون کھونا نہ چاہتی تھی۔

لیکن ساری مصروفیتوں کے باوجود ارشد نے اپنے مطالعے کے اوقات میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی اور تخفیف مناسب نہ سمجھی۔ وہ اب بھی رات کے بارہ بجے تک ٹیبل لیمپ جلائے پڑھتا رہتا۔ اسے مطالعے کا جنون تھا۔ روشی کے احتجاج کے باوجود اس نے اپنی دلچسپیاں کم نہ کیں۔

"ڈارلنگ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے مطالعے کا وقت تبدیل کر لو؟"

"ممکن ہی نہیں"

"کیوں؟"

"اور کسی وقت ذہن کو یکسوئی نہیں رہتی۔ فیکٹری سے آنے کے بعد جب تم پر نظر پڑتی ہے تو میں کسی کام کا نہیں رہتا۔ بس جی چاہتا ہے صرف تمھیں ہی دیکھتا رہوں اور تم یہ جانتی ہی ہو کہ جب تم میرے سامنے رہتی ہو تو میں کچھ نہیں کر سکتا"

اور ارشد کے اس ذوق کی تسکین کے لئے روشی کی ذاتی لائبریری کافی تھی۔ پہلے ہی اسے پڑھنے کا شوق نہ ہو لیکن کتابیں یکجا کرنے کا اسے جنون تھا۔ اچھی اور معیاری کتابیں خریدنا اور سگریٹ پینا اس کی ہابی تھی اور اب ارشد دیمک کی طرح روشی کی کتابوں کو چاٹ رہا تھا۔

"تم نے کتابیں تو کافی یکجا کر رکھی ہیں لیکن مطالعے کا موقع شاید نصیب نہ ہو سکا اس لئے کہ ساری کتابیں ویسی ہی کوری ہیں"

"میں خوبصورت اور معیاری چیزوں کی دوشیزگی برقرار رکھنے کی قائل ہوں"

"تو پھر اپنے خوبصورت ہونٹوں کی دوشیزگی تم نے کثرتِ سگریٹ نوشی سے یوں تباہ کرلی؟"

"یہ میری نفسیاتی کمزوری ہے۔"

اور روشی کی اس نفسیاتی کمزوری کی وجہ ارشد کو اُس کی ذاتی ڈائری کے مطالعے سے معلوم ہوگئی۔

روشی کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ کتابوں کی الماری کا ایک کونہ ڈائریوں کے لئے وقف تھا۔ کئی سالوں کی ڈائریاں موجود تھیں اور کتابوں کی تلاش کے سلسلے میں ایک ڈائری ارشد کے ہاتھوں لگ گئی۔ پھر تو وہ مسلسل کئی رات تک اخلاقی گناہ کا مرتکب ہوتا رہا۔ اجازت کے بغیر روشی کی ڈائری پڑھتا رہا۔

"ابوجان کو سگریٹ نوشی کی عادت ہے، دادا جان بھی پیتے تھے اور امی جان بھی۔ بھائی جان بھی کثرت سے سگریٹ پیتے تھے اور اسی سگریٹ نے اُن کی جان لی۔ عورت؟ کینسر ہوا اور چٹ پٹ ہوگئے۔ پتہ نہیں کیوں ابوجان جب بھی سگریٹ سلگاتے ہیں میں اُن کے نزدیک جا بیٹھتی ہوں۔ خوشبودار سگریٹ کا خوشبودار دھواں سونگھنے کے لئے۔ عجیب لطف محسوس ہوتا ہے۔"

"ابوجان نے کہا کہ میں بچپن میں بھی سگریٹ کے دھوئیں سے بہت ہی فرحت محسوس کرتی تھی اور سگریٹ پیتے وقت میں اُن کی گود میں گھس کر بیٹھ جاتی تھی۔"

"آج میں نے ابوجان کے ڈبے سے ایک سگریٹ نکال کر پی لیا۔ کچھ چکر سا آیا۔ لیکن عجیب سا سُرور بھی محسوس ہوا۔ یقیناً سگریٹ اچھی چیز ہے۔"

"اب میں سگریٹ نوشی کی عادی ہوتی جارہی ہوں۔"

"ظہیر ایک خوبصورت اور وجیہہ نوجوان ہے۔ مردانہ حُسن کا دلنواز پیکر ہے۔ اُس کی مُسکراہٹ بھی بے حد دلآویز ہے۔ اُس کے ساتھ زندگی خوشگوار گزر سکتی ہے۔ لیکن عجیب آدمی ہے۔ سگریٹ بالکل نہیں پیتا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے ہی اُسے اُبکائی آتی ہے۔ اس لئے میں ظہیر میں کوئی کشش نہیں محسوس کرتی۔ میں ابوجان سے کہہ دوں گی کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"اب میں اس دُنیا میں تنہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ ابوجان تھے وہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اب مجھے شادی کر لینی چاہئے۔ اس لئے کہ سماج بہت گندہ ہے۔ لوگوں کی ذہنیت بھی بہت گندی ہے۔"

"رشید میرے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ میں رفتہ رفتہ اُس کی بانہوں میں گرتی جارہی ہوں۔ التفات بڑھ رہا ہے۔"

"لیکن رشید نے خود ہی دھوکا دے دیا۔ اُس نے شادی کرلی، کسی اور سے۔ میرا اس شہر سے کچھ دنوں کے لئے دُور چلا جانا ہی بہتر ہے۔ میں اپنے کانوں سے شہنائیوں کی آواز نہیں سن سکتی۔"

"ارشد ایک خاموش، گمبھیر اور سنجیدہ نوجوان ہے۔ ایک اچھے، شریف اور وفادار خاوند کی ساری خوبیاں اُس میں موجود ہیں۔ وقتاً فوقتاً سگریٹ بھی پی لیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی میری ہی طرح پینے لگے۔ ابھی تو بالکل اناڑیوں کی طرح پیتا ہے۔"

"ارشد شادی پر رضامند ہوگیا ہے۔ میں اب تنہائی سے گھبراہٹ بھی محسوس کرتی ہوں اور اب مجھے شادی کر لینی چاہئے۔ ارشد جیسی اٹوٹ محبت مجھے کوئی اور نوجوان نہ دے سکے گا۔"

روشی کی پُوری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ارشد کے سامنے پڑی تھی۔ رشید کی داستان پڑھتے وقت اُسے ذہنی جھٹکا بھی محسوس ہوا تھا لیکن اُسے اطمینان تھا کہ روشی کے دل میں اب رشید کا خیال تک نہیں۔ اُس نے ڈائریوں کو الماری میں مخصوص جگہوں پر رکھا اور روشی کی زلفوں میں اُنگلیاں پھنسا کر سوگیا۔ روشی ـــــ ایک خوبصورت خواب ـــــ اور اس خواب کی حسین تعبیر اُس کے سامنے تھی

روشی نے نیم باز آنکھوں سے دیکھا، مُسکرائی اور پھر سوگئی۔

زندگی اپنی پُرانی رفتار سے بھاگتی جارہی تھی۔ کلب، فیکٹری، لائبریری اور بیڈ رُوم ـــــ ارشد زندگی کی اس یکسانیت سے اُکتا بھی گیا تھا ـــــ اور اس اُکتاہٹ کو دُور کرنے کے لئے وہ فیکٹری کے کاموں میں اور بھی زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اب وہ مزدوروں کے لئے ایک کالونی بنانے کے منصوبے پر غور کر رہا تھا۔ زمین بھی الاٹ ہوگئی اور تعمیری کام بھی شروع ہوگیا۔ وہ سویرے ہی ناشتہ کرکے کالونی کی طرف نکل جاتا اور اُدھر ہی سے فیکٹری کو روانہ ہوجاتا۔ دوپہر کا کھانا اپنے چیمبر ہی میں کھاتا۔ روشی نے اُس کے لئے منع بھی کیا تھا لیکن ارشد نے مُسکرا کر ٹال دیا۔

"میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں برتنا چاہتا۔"

لیکن کام کی زیادتی اور مصروفیتوں نے ارشد کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اُس کی صحت روز بروز گرتی گئی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ خون تھوکنے لگا۔ اُسے ٹی بی ہوگئی تھی۔ اپنی اس کیفیت سے وہ خود بھی بہت زیادہ گھبرا گیا۔ لیکن اُس نے روشی کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اُس سے دُور ہی رہنے لگا اور جب بیماری نے طُول پکڑا اور روشی کو معلوم ہوا تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے ارشد کو علاج کی غرض سے سوئٹزر لینڈ بھیج دیا اور جس دن وہ جارہا تھا وہ اُس سے لپٹ کر خوب روئی۔

"اپنی صحت کا خیال رکھنا۔"

"شکریہ۔"

"ظفر [illegible]

[illegible] کے سامنے میر اسلم صاحب اپنا تعارف خود ہی کرا دیا تو روشی نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھی [illegible] کیا۔

"آپ مسٹر ارشد ہیں، میرے لائف پارٹنر!"

چند لمحوں تک سب ساکت رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں بھی نہ آسکا کہ یہ کیسے اور کیوں ہو گیا؟ رشید سے انتقام کے طور پر تو اس نے ایسا نہیں کیا؟ اور جب سب کی حیرت کم ہوئی تو یکبارگی سب نے دونوں کو مبارکباد دی۔ جیسے سونچ آن کر دیا گیا ہو۔ اس خوشی میں سب نے ایک دوسرے کی صحت کا جام پیا اور رمی کھیلنے بیٹھ گئے۔

"مسٹر ارشد آپ کا مشغلہ کیا ہے؟" رشید نے دریافت کیا۔ پتہ نہیں رشید کو ارشد اور روشی کے حالات سے اتنی دلچسپی کیوں تھی؟

"فی الحال ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کرتے ہیں" روشی نے خود ہی جواب دے دیا۔

"اور میرا ارادہ ہے کہ اپنی ٹیکسٹائل مل کا سارا انتظام ارشد ہی کے حوالے کر دوں"

"بہت ہی نیک ارادہ ہے آپ کا" شرما نے کہا۔

رمی کھیلنے کے دوران رشید نے روشی کو سگریٹ آفر کیا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر پیکٹ ارشد کی طرف بڑھا دیا۔ ارشد نے تھوڑے توقف کے بعد سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ اس کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بالکل اناڑی ہو اور زبردستی سگریٹ پینے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بالکل اناڑیوں کی طرح کش کھینچتا اور فضا میں دھوئیں بکھیر دیتا۔ اس دوران اسے ایک دو بار کھانسی بھی آئی لیکن اس نے اسے زبردستی ضبط کرنے کی کوشش کی۔ ارشد کی اس کسمپرسی پر رشید اور شرما مسکراتے رہے۔ دونوں نے نظروں میں ایک دوسرے سے باتیں کیں جیسے کہہ رہے ہوں "پھنس گیا غریب!" ارشد کو رمی کھیلنی بھی نہ آتی تھی۔ وہ متواتر غلطیاں کرتا رہا اور ہارتا رہا۔ روشی نے ارشد کی گھبراہٹ اور پریشانی کو محسوس کر لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ارشد کا ہاتھ پکڑا اور معذرت طلب کر کے کلب کیا وَنڈ سے باہر نکل گئی۔

"ایک مہذب اور شریف انسان کو مزید مہذب بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے" شرما نے کہا۔

"قسمت ہے بیچارے کی!" رشید نے دھیمے لہجے میں کہا اور وہ بھی کھیل چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"آپ کہاں چلے؟"

"نسرین کو پکچر لے جانا ہے، غریب انتظار کرتی ہوگی"

"نئی نئی شادی ہے ناز نخرے برداشت کر لو۔ پھر تو بھاگنے ہی کی نوبت آئے گی اور ساری ساری رات کلب میں پڑے رہو گے"

"ایسی بد دعائیں تو نہ دو۔ تم سب میرے دوست ہو، دشمن نہیں"

ارشد روشی کے ساتھ کلب میں آتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ اس نئے ماحول سے مانوس ہوتا گیا۔ اب اس کی پیشانی پر پسینوں کے قطرے کبھی ہی کبھی نظر آتے تھے۔ وہ رمی میں بھی اب کم غلطیاں کرتا تھا۔ لیکن سگریٹ کی عادت اسے نہ ہو سکی تھی پھر بھی روشی کے ساتھ ہی سگریٹ سلگاتا اور پھونکتا رہتا۔ اس کے اس اناڑی پن سے لوگ اب مانوس ہو چکے تھے۔ اس کی حرکتوں پر لب کوئی معنی خیز مسکراہٹیں نہ بکھیرتا۔ رشید کو تو اس سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ اس کی کسمپرسی دیکھ کر اسے تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن اس کے اظہار کا کوئی ذریعہ [illegible]۔ وہ دیکھتا، خاموش رہتا اور کڑھتا رہتا۔ آخر کر بھی کیا سکتا تھا۔

ٹیکسٹائل مل کا انتظام سنبھالنے کے بعد ارشد کی مصروفیتیں کافی بڑھ گئی تھیں۔ وہ کلب سے واپسی میں بھی تھوڑی دیر کے لئے فیکٹری چلا جاتا تھا۔ اسے مزدوروں کے مسئلوں سے کافی دلچسپی تھی۔ وہ انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ انھیں کافی رعایت دے گا۔ وہ بھی تو انسان ہی ہیں۔ ان کے بھی بال بچے ہیں، زندگی ان کے لئے بھی بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لئے اگر کسی کی ہمدردیاں انھیں مل جائیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ روشی نے بھی ارشد کو اس معاملے میں پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اس لئے کہ وہ جانتی تھی ارشد مادیت کا مخالف ہے اور پابندیاں لگا کر وہ اپنی ازدواجی زندگی کا سکون کھونا نہ چاہتی تھی۔

لیکن ساری مصروفیتوں کے باوجود ارشد نے اپنے مطالعے کے اوقات میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی اور تخفیف مناسب نہ سمجھی۔ وہ اب بھی رات کے بارہ بجے تک ٹیبل لیمپ جلائے پڑھتا رہتا۔ اسے مطالعے کا جنون تھا۔ روشی کے احتجاج کے باوجود اس نے اپنی دلچسپیاں کم نہ کیں۔

"ڈارلنگ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے مطالعے کا وقت تبدیل کر لو"

"ممکن ہی نہیں"

"کیوں؟"

"اور کسی وقت ذہن کو یکسوئی نہیں رہتی۔ فیکٹری سے آنے کے بعد جب تم پر نظر پڑتی ہے تو میں کسی کام کا نہیں رہتا۔ بس جی چاہتا ہے صرف تمھیں ہی دیکھتا رہوں اور تم یہ جانتی ہو کہ جب تم میرے سامنے رہتی ہو تو میں کچھ نہیں کر سکتا"

اور ارشد کے اس ذوق کی تسکین کے لئے روشی کی ذاتی لائبریری کافی تھی۔ جیسے [illegible] اسے پڑھنے کا شوق نہ ہو لیکن کتابیں یکجا کرنے کا اسے جنون تھا۔ اچھی اور معیاری کتابیں خریدنا اور سگریٹ پینا اس کی ہابی تھی اور ارشد دیمک کی طرح روشی کی کتابوں کو چاٹ رہا تھا۔

"تم نے کتابیں تو کافی یکجا کر رکھی ہیں لیکن مطالعے کا موقع شاید نصیب نہ ہوا۔ اس لئے کہ ساری کتابیں ویسی ہی کوری ہیں"

"میں خوبصورت اور معیاری چیزوں کی دوشیزگی برقرار رکھنے کی قائل ہوں"

"تو پھر اپنے خوبصورت ہونٹوں کی دوشیزگی تم نے کثرتِ سگریٹ نوشی سے کیوں تباہ کر لی؟"

"یہ میری نفسیاتی کمزوری ہے۔"

اور روشنی کی اِس نفسیاتی کمزوری کی وجہ ارشد کو اُس کی ذاتی ڈائری کے مطالعے سے معلوم ہو گئی۔

روشنی کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ کتابوں کی الماری کا ایک کونہ ڈائریوں کے لئے وقف تھا۔ کئی سالوں کی ڈائریاں موجود تھیں اور کتابوں کی تلاش کے سلسلے میں ایک ڈائری ارشد کے ہاتھوں لگ گئی۔ پھر تو وہ مسلسل کئی رات تک اخلاقی گناہ کا مرتکب ہوتا رہا۔ اجازت کے بغیر روشنی کی ڈائری پڑھتا رہا۔

"ابو جان کو سگریٹ نوشی کی عادت ہے، دادا جان بھی پیتے تھے اور امی جان بھی۔ بھائی جان بھی کثرت سے سگریٹ پیتے تھے اور اسی سگریٹ نے اُن کی جان لی۔ تھروٹ کینسر ہوا اور چٹ پٹ ہو گئے۔ پتہ نہیں کیوں ابو جان جب بھی سگریٹ سُلگاتے ہیں میں اُن کے نزدیک جا بیٹھتی ہوں۔ خوشبودار سگریٹ کا خوشبودار دُھواں سُونگھنے کے لئے۔ عجیب لُطف محسوس ہوتا ہے۔"

"ابو جان نے کہا کہ میں بچپن میں بھی سگریٹ کے دھوئیں سے بہت ہی فرحت محسوس کرتی تھی اور سگریٹ پیتے وقت میں اُن کی گود میں گھس کر بیٹھ جاتی تھی۔"

"آج میں نے ابو جان کے ڈبے سے ایک سگریٹ نکال کر پی لیا۔ کچھ چکر سا آیا۔ لیکن عجیب سا سُرور بھی محسوس ہوا۔ یقیناً سگریٹ اچھی چیز ہے۔"

"اب میں سگریٹ نوشی کی عادی ہوتی جا رہی ہوں۔"

"ظہیر ایک خوبصورت اور وجیہہ نوجوان ہے۔ مردانہ حُسن کا دلنواز پیکر ہے۔ اُس کی مُسکراہٹ بھی بے حد دلآویز ہے۔ اُس کے ساتھ زندگی خوشگوار گُزر سکتی ہے۔ لیکن عجیب آدمی ہے۔ سگریٹ بالکل نہیں پیتا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے ہی اُسے اُبکائی آتی ہے۔ اِس لئے میں ظہیر میں کوئی کشش نہیں محسوس کرتی۔ میں ابو جان سے کہہ دوں گی کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"اب میں اِس دُنیا میں تنہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ ابو جان تھے وہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اب مجھے شادی کر لینی چاہئے۔ اِس لئے کہ سماج بہت گندہ ہے۔ لوگوں کی ذہنیت بھی بہت گندی ہے۔"

"رشید میرے معیار پر پُورا اُترتا ہے۔ میں رفتہ رفتہ اُس کی بانہوں میں گِری جا رہی ہوں۔ التفات بڑھ رہا ہے۔"

"لیکن رشید نے خود ہی دھوکا دے دیا۔ اُس نے شادی کر لی، کسی اور سے۔ میرا اِس شہر سے کچھ دنوں کے لئے دُور چلا جانا ہی بہتر ہے۔ میں اپنے کانوں سے شہنائیوں کی آواز نہیں سُن سکتی۔"

"ارشد ایک خاموش، گمبھیر اور سنجیدہ نوجوان ہے۔ ایک اچھے، شریف اور وفادار خاوند کی ساری خوبیاں اُس میں موجود ہیں۔ وقتاً فوقتاً سگریٹ بھی پی لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی میری ہی طرح پینے لگے۔ ابھی تو بالکل اناڑیوں کی طرح پیتا ہے۔"

"ارشد شادی پر رضامند ہو گیا ہے۔ میں اب تنہائی سے گھبراہٹ بھی محسوس کرتی ہوں اور اب مجھے شادی کر لینی چاہئے۔ ارشد جیسی اٹوٹ محبت مجھے کوئی اور نوجوان نہ دے سکے گا۔"

روشنی کی پُوری زندگی ایک کھُلی کتاب کی طرح ارشد کے سامنے پڑی تھی۔ رشید کی داستان پڑھتے وقت اُسے ذہنی جھٹکا بھی محسوس ہوا تھا لیکن اُسے اطمینان تھا کہ روشنی کے دل میں اب رشید کا خیال تک نہیں۔ اُس نے ڈائریوں کو الماری میں مخصوص جگہوں پر رکھا اور روشنی کی زلفوں میں اُنگلیاں پھنسا کر سو گیا۔ روشنی ——— ایک خوبصورت خواب ——— اور اِس خواب کی حسین تعبیر اُس کے سامنے تھی۔ روشنی نے نیم باز آنکھوں سے دیکھا، مُسکرائی اور پھر سو گئی۔

زندگی اپنی پُرانی رفتار سے بھاگتی جا رہی تھی۔ کلب، فیکٹری، لائبریری اور بیڈ رُوم ——— ارشد زندگی کی اِس یکسانیت سے اُکتا بھی گیا تھا ——— اور اِس اُکتاہٹ کو دُور کرنے کے لئے وہ فیکٹری کے کاموں میں اور بھی زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اب وہ مزدوروں کے لئے ایک کالونی بنانے کے منصوبے پر غور کر رہا تھا۔ زمین بھی الاٹ ہو گئی اور تعمیری کام بھی شروع ہو گیا۔ وہ سویرے ہی ناشتہ کر کے کالونی کی طرف نکل جاتا اور اُدھر ہی سے فیکٹری کو روانہ ہو جاتا۔ دوپہر کا کھانا اپنے چیمبر ہی میں کھاتا۔ روشنی نے اُس کے لئے منع بھی کیا تھا لیکن ارشد نے مُسکرا کر ٹال دیا۔

"میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں برتنا چاہتا۔"

لیکن کام کی زیادتی اور مصروفیتوں نے ارشد کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اُس کی صحت روز بروز گِرتی گئی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ خون تھوکنے لگا۔ اُسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ اپنی اِس کیفیت سے وہ خود بھی بہت زیادہ گھبرا گیا۔ لیکن اُس نے روشنی کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اُس سے دُور ہی رہنے لگا اور جب بیماری نے طُول پکڑا اور روشنی کو معلوم ہوا تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے ارشد کو علاج کی غرض سے سوئٹزرلینڈ بھیج دیا اور جس دن وہ جا رہا تھا وہ اُس سے لپٹ کر خوب روئی۔

"اپنی صحت کا خیال رکھنا۔"

"شُکریہ۔"

"وِش یُو ہیپی ریٹرن (Wish you happy return)"
"گُڈ بائی ڈارلنگ!"
"گُڈ بائی!"

اور جب ارشد سوئٹزرلینڈ سے واپس آیا تو بالکل صحت یاب ہو چکا تھا۔ وہ پہلے جیسا "دُبلا پتلا" بھی نہ رہا تھا۔ روشنی ایئرپورٹ پر ہی ارشد سے لپٹ کر پھُوٹ پڑی۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمھیں دوبارہ زندہ دیکھ لیا۔"

"میری زندگی سے مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی۔"

"کیوں؟"

"ٹی بی اب لاعلاج مرض نہیں رہا۔"

"پھر بھی بہت موذی مرض ہے!"

ارشد کے صحت یاب ہو کر لوٹنے کی خوشی میں روشنی نے دوستوں کو پارٹی دی۔ ٹوسٹ کی محفلیں جمیں، شراب چلی، قہقہوں کے فوّارے پھُوٹ پڑے۔

"ڈیر میں نے تمھارے لئے تمھاری برانڈ کی سگریٹ کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے لو پیو۔"

"نو تھینکس!" ارشد نے سگریٹ کا پیکٹ واپس لَوٹا دیا۔

"وہاٹ؟" روشنی حیران تھی۔

"ڈاکٹروں نے سگریٹ نہ پینے کی سخت تاکید کی ہے۔"

"جاہل ہیں! گنوار ہیں! بھلا سگریٹ بھی ترک کرنے کی شے ہے؟"

"مسز ارشد! ڈاکٹروں نے کچھ سمجھ کر ہی سگریٹ نہ پینے کی تاکید کی ہوگی۔" ورما نے سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن روشنی حیران سی صرف ارشد کا مُنہ تکتی رہی۔

ارشد روشنی کی اِس کمزوری سے بخوبی واقف تھا، پھر بھی وہ مجبور تھا۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل کرنا اُس کا فرض تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ روشنی میں نمایاں تبدیلیاں آتی جا رہی تھیں۔ اُس کا التفات بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب اُس کا زیادہ وقت باہر ہی گُزرتا۔ شاید وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ پریشان تھی۔ ارشد یہ سب دیکھتا اور کُڑھتا رہتا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ روشنی کے رویّہ سے وہ بھی ذہنی کشمکش میں مُبتلا تھا۔

اور جب کافی رات گئے روشنی واپس آئی، ارشد جاگ رہا تھا۔

"تم اب تک سوئے نہیں ہو؟"

"نیند نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"آج سگریٹ کی خواہش بہت زیادہ ستا رہی ہے۔"

"کیا؟" روشنی نائٹ گاؤن کا ہُک لگانا بھُول گئی۔

"ہاں! اور جب تک میں سگریٹ نہ پیوں گا شاید میں سو نہ سکوں۔"

"لیکن ڈاکٹروں نے تمھیں منع کیا ہے؟"

"تم نے تو منع نہیں کیا۔"

"لیکن میرے منع نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"میری مسیحا تو تم ہی ہو۔ میں دُنیا کی ساری تکلیفیں برداشت کر سکتا لیکن تمھاری خفگی اور پریشانیاں میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں سگریٹ پیوں گا اور اُسی سے پیوں گا جس رفتار سے تم پیتی ہو خواہ میرا سینہ چھلنی ہی کیوں نہ ہو جائے!"

"لیکن..."

"نہیں ڈارلنگ! اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا!" اور ارشد نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگا لیا۔ ——— روشنی روکنے کی خواہش رکھنے کے باوجود نہ روک سکی۔

سارے گِلے شکوے سگریٹ کے دُھوئیں کے ساتھ ہی دُور ہو چکے تھے۔

"مسٹر ارشد! آپ نے سگریٹ پھر شروع کر دیا؟" رشید نے ٹوکا۔

"طبیعت نہیں مانتی۔ برسوں کا رفیق پل بھر میں چھُوٹ جائے یہ مجھے گوارہ نہیں۔" ارشد نے معنی خیز نظروں سے روشنی کی طرف دیکھا اور کارڈ بانٹنے لگا۔

"ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل کرنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے آپ کی صحت پر اِس کا اثر پڑے۔"

"زندگی کوئی خوبصورت کتاب تھوڑے ہی ہے جس کی حفاظت کی جائے۔ اِسے تو ایک دن ختم ہونا ہی ہے، کل نہیں آج ہی سہی۔"

اور جب ارشد روشنی کے ساتھ کلب سے باہر چلا گیا تو رشید نے کہا۔

"یہ ناگن اِس کی جان لے کر رہے گی!"

اور وہی ہوا۔ دو تین ماہ بعد ارشد کا مرض پھر عود کر آیا۔ بیٹھے بیٹھے خون کی اُبکائی آئی اور وہ دفتر ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ فیکٹری کا سارا عملہ پریشان ہو گیا۔ روشنی کو فون لیا گیا۔

"کیوں ڈارلنگ! کیا ہو گیا تمھیں؟"

"کچھ نہیں۔ اب اچھا ہوں میں۔"

اور سب کے مشورے کے مطابق روشنی نے ارشد کو پھر سینی ٹوریم میں داخل کر دیا۔

علاج ہوتا رہا لیکن بیماری کم نہ ہوئی بڑھتی ہی گئی۔

"مسٹر ارشد! سگریٹ آپ کے لئے بہت ہی مُضر ہے۔ آپ اِسے ترک کیوں نہیں کر دیتے؟"

"میں مجبور ہوں ڈاکٹر! میں دُنیا کی ساری نعمتیں ترک کر سکتا ہوں لیکن سگریٹ نہیں!"

"کیوں؟"

"ہے کچھ ایسی ہی مجبوری!"

"تو پھر آپ کی صحت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی!"

"اور میں کسی کے ہاتھوں اپنی ذِلّت برداشت نہیں کر سکتا!"

"آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"اور آپ کو سمجھنا بھی نہ چاہیئے۔"

اور کچھ ہی دنوں کے بعد ارشد نے سینی ٹوریم ہی میں دم توڑ دیا۔

روشنی پھر تنہا رہ گئی۔

"ڈیر! میں نے تمھاری جان نہیں لی سگریٹ نے لی ہے۔ میں اِس سے تمھارے خون کا انتقام لوں گی! اُسے جلا کر راکھ کر دوں گی، پیروں سے مسلوں گی لیکن . . ."

اور وہ تصویر پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود اُس کی زندگی کا کینوس سیاہ ہی رہا!!

غزل

جگن ناتھ آزاد ایم۔ اے

کچھ اِس ادا سے موجِ نسیمِ سحر چلی
یادیں جو سو رہی تھیں اُنھیں چھیڑ کر چلی

خوشبوئے زلفِ یار کو چلنے سے پیشتر
بے مدعا غرورِ حُسن نے روکا مگر چلی

وُہ جانِ آرزو تو مرے دل میں ہے مقیم
اے اُس کی یاد! تو مجھے لے کر کدھر چلی

اِک اجنبی نگاہ کے ملنے کی دیر تھی
دل کو متاعِ صبر و سکوں چھوڑ کر چلی

اُس آرزوئے دید کے صدقے کہ دل میں جو
لے کر ہزار مسبل کا شوقِ سفر چلی

آئی تھی بن کے مہرِ منوّر حیاتِ دل
لیکن چلی تو بن کے فروغِ شرر چلی

غزل

حقی حزیں ایم۔ اے

تُو نے یہ کیا اے نگاہِ یاس و حرماں کر دیا
اُن کے رُخ سے ظاہر اپنا دردِ پنہاں کر دیا

اپنے غم کے فیض سے ہر غم کا درماں کر دیا
عشق نے سچ پوچھیئے تو دل پہ احساں کر دیا

اُس نگاہِ فتنہ پرور کی فسوں سازی نہ پوچھ
میں نے یہ جانا سکونِ دل کا ساماں کر دیا

ظُلمت ویرانۂ دل کا کسے آتا خیال
وہ تو یہ کہیئے کہ داغوں نے چراغاں کر دیا

عشق تو اِک جذبۂ ایثار ہی کا نام ہے
جان بھی دیدی تو کیا کارِ نمایاں کر دیا

اِس کو کیا کہیئے کہ میرے شوقِ سجدہ نے حزیں
اُس نظر کو وجہِ تسکینِ دل و جاں کر دیا

سونے کی طرح پُرکشش گولڈن پلاسٹکس

آسائش و آرائش پسند زندگی کیلئے

گولڈن پلاسٹک کی طرف سے آپکے گھریلو استعمال و زیبائش کے لئے آپ کی حسب توفیق قیمتوں پر خوبصورت چیزوں کا بے نظیر سلسلہ —

بالٹیاں • چلمچیاں • ٹوکریاں • پیالے گلاس و چمچے • نہانے کے لئے ٹب • ڈبّے • پکنک کے لئے ٹوکریاں • مصالحہ و سرکہ دانیاں • لیمو نچوڑ وغیرہ۔

دیرتک چلنے والے گولڈن پلاسٹکس اعلیٰ معیار کے مطابق تیار کئے جاتے ہیں اور جدید طرز معاشرت کے شایانِ شان رنگوں میں ملتے ہیں۔





گولڈن پلاسٹکس

۶۹-۶۷ بازار گیٹ اسٹریٹ بمبئی ۱ بی آر

Criterion-GP-1510 Ur

اسٹیٹ ڈسٹری بیوٹر: میسرز آنند ایجنسیز، ۴۷۰۰، رام بھون، ۲۳، دریا گنج، دہلی

علاقائی ڈسٹری بیوٹر: راجستھان کمرشل کارپوریشن، ۶/جی، جواہر نگر، دہلی • امبر ایجنسیز، مدہن مارکٹ، پٹھان کوٹ

افسانہ

دل کی دولت

نور شاہ

معرفت شاردا کارنر، ریزیڈنسی روڈ۔ جموں (توی)

۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء

برادرِ محترم! تسلیم

"دل کی دولت" پیشِ خدمت ہے۔ کہانی کی تھیم اگرچہ نئی نہیں ہے لیکن میں نے اس کے لئے جو ٹریٹمنٹ اپنایا ہے، اُمید ہے وہ آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو پسند آئے گا۔ اُردو کہانی کو "بیسویں صدی" نے جو زندگی بخشی ہے اُس کے لئے آپ کی ذات پر ہم سب کو فخر ہے . . .

خیر اندیش ـــــــ نور شاہ

میں پہاڑی زندگی کا باسی اور یہ شہر جہاں کوئی پہاڑ نہیں ـــ بہت عجیب سا شہر ہے یہ، عجیب سا ماحول ہے اور کیسے کیسے لوگ رہتے ہیں یہاں بس جینے کے لئے جئے جاتے ہیں، انھیں زندگی سے کوئی پیار نہیں، کائنات سے کوئی لگاؤ نہیں شہری زندگی اور پہاڑی زندگی میں کتنا فرق ہے۔ یوں تو مجھے بھی اس شہر میں رہتے دو سال ہوگئے ہیں لیکن وہ پہاڑی پن اب بھی میرے شریر میں ہمک رہا ہے۔ ہائے میرا وطن جس کا آسمان بہت اونچا اور بہت کشادہ ہے، جہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور جہاں ڈل جھیل کی نیلگوں سطح پھیل پھیل کر ان پہاڑوں کے دامن سے جا ٹکراتی ہے، جہاں پہاڑوں کی چوٹیاں برفیلی پوشاکیں پہنے قطاروں میں کھڑی نظر آتی ہیں اور جہاں ان برفیلی چوٹیوں سے بہت اوپر نیلے آکاش سے ذرا نیچے بادلوں کی پریاں جھولے جھولتی ہیں اور جہاں . . . اور جہاں شیریں رہتی ہے!

دل کی بستی میں نا اُمیدی کے اندھیرے پلنے لگے ہیں۔ میں یہاں ہوں اس مشینی شہر میں اور شیریں وہاں، اُن گھاٹیوں میں جہاں جھرنے بہتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں!!

جب میں کشمیر میں پڑھ رہا تھا تو ہوسٹل لائف کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا لیکن یہاں میرے لئے ہوسٹل کی زندگی میں بھی کوئی کشش نہیں۔ دراصل ہوسٹل کا تصور لڑکوں سے ہے، ہنگاموں سے ہے اور یہ کم بخت ہیں سب کے سب کتابی کیڑے۔ بس پڑھتے رہتے ہیں۔ ارے کم بختو! زندگی میں اور بھی خوبصورتیاں ہیں۔ ان سے کیوں دامن چھڑائے ہوئے ہو۔ کیسا مشینی ذہن ہوگیا ہے ان سب کا انجینئرنگ پڑھتے پڑھتے۔ ایک بھی ایسا نہیں جو غالب کے اشعار پر سر دھنے، مجاز کی نظمیں سُن کر اُداس ہو جائے اور خیام کی رباعیاں پڑھ کر بیہوش ہو جائے ـــــ سچی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں کافی اُکتا چکا ہوں۔ فرض کا احساس نہ ہوتا اور پھر اس شہر میں انجینئرنگ کے دو سال مکمل نہ کئے ہوتے تو کب کا چلا گیا ہوتا میں یہاں سے اور پھر کچھ عجیب سے، انوکھے سے احساسات ہیں جنھوں نے باندھ کر رکھا ہے، اس ماحول سے، اس شہر سے اور اس زندگی سے۔ نہ جانے کیسے احساسات ہیں یہ لیکن ان احساسات پر ایک اور احساس حاوی ہے۔ احساسِ محبت اور محبت میں کتنی طاقت ہے۔ کتنے بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس نعمت سے محروم ہیں، جنھیں کسی کا پیار میسّر نہیں، جن کے لئے کوئی انتظار نہیں کرتا ـــــ!

شیریں کا خط میرے سامنے ہے۔

میرے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہیں۔ باہر تیز دھوپ ہے۔ کارخانوں کا کالا سیاہ دھواں دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ کوئی پہاڑ نہیں، کوئی پیڑ نہیں، کوئی پھول ہے اور نہ کہیں سبزہ۔ صرف دھواں ہی دھواں ـــــ مجھے شیریں بے اختیار یاد آرہی ہے۔

دو سال پہلے جب میں کشمیر سے چلا تھا تو شیریں روئی تھی ـــــ بہت روئی تھی!

وہ لمحے جیسے پلٹ کر آگئے ہیں۔

"نہ رو شیریں! تم روتی ہو تو میرے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، اُمیدوں کی نبض ڈوبنے لگتی ہے۔ بس چار ہی سال کی تو بات ہے۔ یہ عرصہ یوں گزر جائے گا۔ میں انجینئر بن کر آؤں گا اور پھر ہمارا بیاہ ہوگا۔ ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا جہاں تم ہوگی اور میں اور کتنی ہی چاندنی راتیں ہمیں گلے لگانے کے لئے بیتاب ہوں گی!"

آنسو تھم چکے ہیں لیکن سسکیاں اُبھر رہی ہیں۔

"مجھے ہنستے ہنستے الوداع کہو شیریں! مجھے تمہارا روتا بسورتا چہرہ نہیں تمہاری کنول کے پھول ایسی مسکراہٹ چاہیئے۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ میرے اور قریب آجاؤ۔ اس سے پہلے کہ یہ خوبصورت لمحے زندگی کے چور دروازے سے کھسک کر نکل جائیں آؤ ان لمحوں کو جاوداں کرلیں۔"

شیریں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"سوچتی ہوں یہ چار سال کیسے کٹ جائیں گے۔ پہاڑ ایسے چار سال! ایک ایک لمحہ مجھے ناگ کی طرح ڈستا رہے گا۔ زندگی بوجھ بن جائے گی۔ کیا میں یہ بوجھ سہار سکوں گی؟"

"پگلی! وہ پیار ہی کیا جو مشکل اور کٹھن آزمائشوں کے بیچ گزر جانے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو، اپنے پیار پر یقین رکھو۔ یہ چار برس تو ایسے بیت جائیں گے جیسے ہم نے کچھ دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کی ہوں ——— یہ تم ایسے گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہو؟"

"دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت تم میرے سامنے ہو، میرے قریب ہو۔ اتنے قریب کہ تمہاری سانسوں کی دھیمی دھیمی آنچ اپنے چہرے پر محسوس کرسکتی ہوں، تمہیں چھو سکتی ہوں، تمہاری آواز سن سکتی ہوں اور کل تم چلے جاؤ گے سینکڑوں میل دور ایک نئی منزل کی جانب!"

"تم نہیں جانتیں شیریں! فاصلے سمٹ رہے ہیں اور اس منزل پر ہم دونوں ایک ساتھ ہوں گے۔"

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟"

"تمہاری یاد ایک ایسا جلتا ہوا فروزاں چراغ ہے جس کی لو میری زندگی کے تاریک گوشوں کو روشنی بخشتی رہے گی۔"

لمحے بیت رہے ہیں۔

شیریں کا خط سامنے پڑا ہے۔

دھوپ میں شدت آگئی ہے۔ کارخانوں کا کالا دھواں پھیل رہا ہے۔ کاش یہ دھواں بادلوں میں تبدیل ہوتا۔ بارش برستی اور میں اپنے آپ کو کشمیر میں محسوس کرتا جہاں جھرنے بہتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، ہوائیں گاتی ہیں اور جہاں دیودار کے گنجان درختوں میں بادِ صبا کے تیز جھونکوں سے پہاڑی ندی کا سنگیت ابھرتا ہے۔ پانی کی بوندیں کہکشاں کا سا منظر پیش کرتی ہیں اور جہاں خنک ہواؤں اور پھولوں کی بھینی بھینی مہک سے لمحے پگھلنے لگتے ہیں ——— یہ شہر ان پہاڑوں سے کتنا مختلف ہے۔

ٹریننگ کا ایک اور سال ختم ہوگیا ہے۔ اب میں تھرڈ ایر میں آگیا ہوں۔ ایک سال اور . . . اور پھر میں ہوں گا، شیریں ہوگی اور میرے سربلند پہاڑ . . . !

اور میں شیریں سے کہوں گا ———

"میں نہ کہتا تھا یہ چار سال یوں بیت جائیں گے۔"

شیریں کی پلکیں جھک جائیں گی اور میں اپنی آنکھوں سے انہیں پیار کروں گا اور کہوں گا ———

"منزل تمہارے پاؤں چوم رہی ہے!"

اور شیریں شرما جائے گی ——— اور شرمائے ہوئے لہجے میں دھیمی دھیمی آواز میں بولے گی ———

"آؤ اس منزل کو ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ابدیت بخشیں!"

نہ جانے یہ کیا ہوگیا ہے۔ ایک مہینے سے مجھے شیریں کا کوئی خط نہیں ملا۔ کوئی نامہ نہیں آیا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خوف اور وسوسے جاگنے لگے ہیں۔ شاید وہ بیمار ہو یا پڑھنے میں مشغول ہو۔ ہوسکتا ہے وہ میری دوری سے اکتا چکی ہو ——— یہ پاگل من ایک سانس میں کچھ ڈراؤنے سے سوال کرتا ہے لیکن ذہن یہ سب کچھ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ دل کو تھپکی دے کر اسے سمجھاتا ہے۔ شیریں تمہارے بغیر کسی اور سے پیار نہیں کرسکتی۔ بھول گئے اس کے آنسو جو اس نے تم سے بچھڑتے سمے بہائے تھے۔ ان آنسوؤں میں دیکھا نہیں تم نے، پیار کی ایک جلتی ہوئی قندیل فروزاں تھی، پریم کا ایک امڈتا ہوا ساگر رقصاں تھا!

میرے دلِ بیتاب ذرا ٹھہر!!

بس ایک ہی سال کی تو بات ہے!!!

میرے کمرے کی ہر دیوار نقش فریادی ہے۔ مینٹل پیس پر شیریں کی ہنستی مسکراتی تصویر اس خبر کی تردید کر رہی ہے لیکن حسن کا خط میرے سامنے ہے میرا منہ چڑا رہا ہے شیریں کی شادی کسی ڈاکٹر کے ساتھ پچھلے ہفتے ہوگئی! تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے یہ شادی بالکل نارمل حالات میں ہوئی۔ کوئی شور نہ ہوا کسی ہنگامے کی اطلاع نہ ملی۔ ڈاکٹر دولہا اپنی چمکتی ہوئی شورلیٹ کار میں اپنی دلہن لے گیا ——— مجھ سے یہ تحریر پڑھی نہیں جاتی۔ یہ تحریر میرے دل و دماغ کے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا رہی ہے، میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل رہا ہے، تاریکی پھیل رہی ہے۔ میں اپنی آنکھیں مسل رہا ہوں روشنی کی ایک کرن کی خاطر لیکن میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہے۔ مجھے اپنی سوچوں پر کوئی قابو نہیں۔ خیالوں میں کوئی تسلسل نہیں۔ زندگی کی گاڑی پٹری سے اتر کر [illegible] سٹیشن پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ کیا سچ مچ وہ پیار کی شبنم لہریں طوفان کا روپ دھار چکی ہیں؟ اُف! یہ طوفانی لہریں میرے خرمنِ حیات کو بہا کر لے جا رہی ہیں ——— کیا میں اب جی سکوں گا؟ اپنے پہاڑوں میں لوٹ سکوں گا ——— ؟

میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں [illegible]

[illegible] پانچ سال [illegible]

پھیکے سے نظر آتے ہیں جیسے ڈگری نہ ملی ہو، پانچ سال کی محنت کا صلہ نہ ہو، ایک بھرپور طمانچہ ہو۔ کیونکہ اب اپنے پہاڑوں میں لوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔ اب وہاں پہاڑی ندیوں کا سنگیت سن کر دل گھبرا جائے گا میرا، قوسِ قزح کا رنگ دیکھ کر آنکھیں بند ہو جائیں گی میری، کشمیر کی ہریالی میرے من کو دہلائے گی ——— لیکن جینا ضروری ہے۔ اپنے لئے نہ سہی اپنی ماں کے لئے، اپنے بھائی بہنوں کے لئے، اپنے وطن کے لئے . . . !

میں آج ہی یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں !!

یہ مہیش بہار ہے۔ ڈاکٹر فیاض کی کوٹھی اور میں اس کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے مسز شیریں فیاض بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہیں۔ لیکن میرے من میں جو لاوا سُلگ رہا ہے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زبان پر نہ جانے کیسی مہر لگی ہے۔ شیریں اب ایک مکمل عورت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ایک ایسی عورت جس کا گھر دیکھ کر اُس کی پُرسکون زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے بازوؤں میں ایک ننھے مُنے بچے کو تھام رکھا ہے۔ بہت خوبصورت بچہ ہے۔ حیران حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

میں خاموشی توڑ دیتا ہوں۔

"آپ کو نئی زندگی مبارک ہو !"

"میرا بچہ بیمار ہو گیا ہے شاید بخار ہے اسے" وہ اپنے دائیں ہاتھ سے اُس کا گال سہلانے لگی ہے "بہت پریشان ہوں۔ انھیں فون کیا ہے وہ کسی آپریشن میں مصروف تھے۔ شاید اب آتے ہی ہوں گے۔ ویسے بھی ان کے بغیر یہ گھر سُونا سُونا سا لگتا ہے"

وہ خاموش ہو گئی ہے۔ میں کمرے کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ایک بڑے ریک میں موٹی موٹی خوبصورت کتابیں ہیں۔ ادھر سجا ہوا آتشدان ہے۔ دیوار پر ایک بڑی سی پینٹنگ آویزاں ہے۔

"بس اب تمھارا پاپا آتا ہی رہا ہو گا !"

خیالات کا دھارا ٹوٹ گیا ہے ——— یہ پتلا سا دھاگہ خیالات کا جب ٹوٹ گیا تو کتنی بھیانک آواز گونج اٹھی۔ میرے چاروں طرف اس گونج کی بازگشت پھیل گئی ہے جیسے اُمید کا دھاگہ ٹوٹ گیا ہو۔

اُمید ———!!

میرے سامنے شیریں گود میں اپنا بچہ لئے بیٹھی ہے جیسے مُجرم عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ مجھ سے اسے کس انصاف کی اُمید ہے ؟

یہ اُمید دے تو میں کا مجرم ——— اُف !

میری نظریں پوچھ رہی ہیں ——— کیوں ——— کیوں ایسا ہوا ؟

اور اُس کی نظریں چوری چھپے دروازے تک جا کے لوٹ آتی ہیں۔ وہ میری نظروں کی تاب نہیں لا سکتی !

یہ پہاڑ ——— جن سے میں پیار کرتا ہوں کتنے بلند ہیں۔ ایک پہاڑ تو اب میرے دل میں بھی موجود ہے ——— میں اس پہاڑ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں . . کہاں جا سکتا ہوں۔ میرے قریب ہی کہیں ایک سسکی اُبھری ہے۔ میں پھر شیریں کی طرف دیکھنے لگا ہوں۔ اُس کی نگاہیں اُسی طرح دروازے پر لگی ہیں۔

یکایک میں کھڑا ہو گیا ——— ہاں مجھے یہاں سے جانا چاہئے۔ مناسب نہ ہوگا کہ ڈاکٹر فیاض یہاں آجائیں اور مجھے یہاں بیٹھا ہوا پائیں ——— میں شیریں کی بے چینی، بے کلی، پریشانی سمجھ گیا ہوں !

مُنہ سے بغیر کوئی لفظ ادا کئے میں "مہیش بہار" سے چلا آ رہا ہوں۔ میرے قدم دھیرے دھیرے اُٹھ رہے ہیں۔ کوئی منزل نہیں، کوئی ساتھی نہیں !

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں ابھی ابھی اپنے دل کی دولت قبر میں دفن کر کے آیا ہوں !!

غزل

کرشن موہن ایم۔ اے

عمرِ انساں ایک رقصاں جام ہے | زندگی رقصندگی کا نام ہے
ابتدا کے پاس ہی انجام ہے | زندگی سے موت دو اک گام ہے
حسن اگر بے فکر ہے آغاز سے | عشق کو کب خدشۂ انجام ہے
شوخ آنکھوں میں کشش ہے کس قدر | دل سا آہوئے رمیدہ رام ہے
تیرا ملنا تو کوئی مشکل نہیں | میرا ذوقِ جستجو ہی خام ہے
وائے نادانی، دلِ ناکردہ کار | شکوہ سنجِ گردشِ ایام ہے
عقل کی حق آشنائی کیا کرے | دل فدائے طلعتِ اصنام ہے
ہر قدم پر مانتا ہے منتیں | آدمی پروردۂ اوہام ہے
کیا مری تدبیر سے مٹ جائے گا | جو مری تقدیر میں ارقام ہے
دل پہ طاری ہے سکوتِ بے حسی | کنجِ زنداں میں بہت آرام ہے
جب سے ہیں با اقتدار اہلِ ہوس | آرزو کی آبرو نیلام ہے
زندگی میں سکھ بھی ہیں دکھ ہی نہیں | بے عمل کیوں شاکیِ آلام ہے
پڑ گئے ہیں سرد میرے ولولے | اب یہ سمجھو زندگی کی شام ہے
حسن کے غمزوں سے ہے ناآشنا | کرشن موہن عاشقِ ناکام ہے

باوجودِ زخم، اہلِ شکر سا
کرشن موہن بندۂ بے دام ہے

سلامی منچ کے سامنے

پُشکر ناتھ بی۔ اے

تمام نواس، نئی سڑک، ڈھکی پیر مٹھا، جموں (توی)

برادرِ محترم! آداب و نیاز

میں ہفتہ دس دن کے لئے سری نگر چلا گیا تھا۔ واپسی پر آپ کا گرامی نامہ ملا۔ کیا بتاؤں دل پر کیا گزری۔ دلی آنے کا اتفاق ہوا تو اِس معاملے پر آپ سے بات کروں گا۔ —— ایک افسانہ بھیج رہا ہوں۔ عنوان ہے، "سلامی منچ کے سامنے" امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ . . .

خیر اندیش —— پُشکر ناتھ

"ہم سب اندھے ہیں —— عالم اندھا ہے، وہ اپنی جہالت نہیں دیکھتا۔
ایماندار اندھا ہے، وہ چور کو نہیں دیکھتا۔
چور اندھا ہے، وہ خدا کو نہیں دیکھتا۔
خدا اندھا ہے، کیونکہ جس دن اُس نے یہ کائنات بنائی، اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ شیطان بھی اِس میں کسی طور داخل ہو گیا ہے۔"

(وِکٹر ہیوگو)

ہوائیں سرد ہونے لگی ہیں۔ اوپر آسمان پر کپکپاتا ہوا موسمِ سرما کا چاند ایک افسردہ سی روشنی چاروں طرف پھیلا رہا ہے۔ میں اِس عالیشان عمارت کی بیسویں منزل پر بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے شاندار سلامی منچ ہے۔ سلامی منچ کے اوپر ایک تنہا روشنی اُس ملگجے اندھیرے کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سب لوگ جا چکے ہیں کتے بھی شاید حلوائیوں کی دُوکانوں کے نزدیک جھوٹے تلاش کرتے کرتے آخر تھک ہار کر اپنی ہی دُموں کو ٹانگوں کے اندر چھپا کر سو گئے ہیں۔ میرے سامنے سڑک چاندنی میں نہائی ہوئی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی شہر [illegible] کار پٹ [illegible] کے لئے ... اِن پر بچھا دیا گیا ہو۔

میرے [illegible] کچھ ... کی طرف نیم اندھیرے کے ... اب سلامی منچ کی طرف آنے لگی ہیں۔

آگے آگے کوئی بینڈ وغیرہ تو نہیں ہے۔ البتہ ہنسی کے چھنا کے فضا میں بکھر رہے ہیں۔

پہلی ٹکڑی کو میں اب اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہوں۔ اُس ٹکڑی میں جو آدمی شامل ہیں، اُنھوں نے بہترین سُوٹ زیبِ تن کئے ہیں۔ اُن کے بُوٹ آئینے کی طرح چمک رہے ہیں اور ہر ایک کے مُنہ میں یا تو سگار ہے یا پائپ۔ اُن کے ہاتھ ہِلا ہِلا کر چلنے سے جھلکوں سے دمکنے لگتے ہیں۔ یہ شاید اُن کی اُنگلیوں میں جڑی ہوئی ہیرے کی انگوٹھیوں کی لَو ہے۔

اِس ٹکڑی کے ساتھ ہی کچھ خوش پوش و خوش شکل عورتیں چہچہاتی ہوئی آ رہی ہیں۔ اِن عورتوں کی پوشاک کا کپڑا وِلایتی ہے۔ اِن کے جوتے پیرس کے بنے ہوئے ہیں۔ اِن کی گھڑیاں سوئٹزرلینڈ کی صناعی کے بہترین نمونے ہیں۔ اِن کے پرس شکاگو کی فرموں کے تیار کردہ ہیں۔ یہ عورتیں تمکنت سے اِن چیزوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

یہ ٹکڑی اُس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جس کے دم قدم سے مُلک کی اقتصادی و سماجی زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ اس طبقے کا کمال یہ ہے کہ یہ کسی طرح کی مزاحمت یا کسی طرح کی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مُلک کے اور بیرونِ مُلک کے لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ چرس اور افیون جیسی بیکار چیزوں سے کروڑوں روپیہ حاصل کرنا، سودیشی آبادی کے لئے بیش قیمت بدیشی چیزیں فراہم کرنا، سونے چاندی اور ہیرے جواہرات خفیہ طور پر لا کر مُلک میں ان کا ذخیرہ جمع کرنا، بڑھیا ولایتی ٹرانسسٹر اور عشرت کا سامان جان جوکھوں میں ڈال کر حاصل کرنا اور اِن کو مُلک میں

سستے داموں فروخت کرنا ان کے بے شمار کارناموں میں شامل ہے۔ اپنے اس نیک مقصد کے حصول کے لئے جیل جانے اور جان کی بازی تک لگانے میں یہ لوگ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ حق تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی امداد کے بغیر اقتصادی زندگی کی سطح ہرگز اتنی بلندی پر نہ جاتی، جتنی بلندی پر یہ اس وقت ہے اور وہ ہزاروں چھوٹے موٹے آدمی جو اس طبقے کے کاروبار کی بدولت روزگار کماتے ہیں، بے کار ہو جاتے اور ملک کے لئے ایک مشکل کھڑی کر دیتے۔

دُکھ کی بات یہ ہے کہ چند خود غرض اور وطن دُشمن لوگ اس طبقے کو اسمگلر جیسے غلط نام سے پکارتے ہیں اور اِن کے کاروبار میں رُکاوٹ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

یہ ٹکڑی سلامی منچ کے سامنے سے سلامی دیتی ہوئی گزر گئی ہے اور اُن کے پیچھے جو ٹکڑی سلامی منچ کی طرف مارچ کرتی ہوئی آ رہی ہے، اِس ٹکڑی میں مرد اور عورتیں شانہ بشانہ ایک شانِ بے نیازی سے چل رہے ہیں۔ اِن کے کپڑے کسی خاص ایک وضع کے نہیں ہیں۔ کسی نے انگریزی کوٹ پتلون پہن رکھی ہے، تو کسی نے کھدر کا کُرتہ اور پیجامہ، کوئی دھوتی باندھے چل رہا ہے تو کسی نے نیکر اور قمیص پہنی ہے، کسی کے پاؤں میں بیش قیمت چمڑے کے جوتے ہیں تو کوئی دیسی موچی کی بنائی ہوئی چپلیں پہن کر آ رہا ہے۔ عورتوں میں سے کسی نے ساڑی اور بلاؤز پہنا ہے، تو کوئی شلوار اور قمیص میں نظر آ رہی ہے۔

اِن مردوں اور عورتوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے۔ یہ سب کے سب سرکاری کرمچاری ہیں۔ یہ نہایت بے ضرر اور فرمانبردار قسم کے شہری ہیں۔ اِن کے دلوں میں بھی عام انسانوں کی طرح ارمان ہوتے ہیں، تمنائیں ہوتی ہیں اور اِن کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ لوگ سرکار کی طرف سے مقرر کی ہوئی اچھی یا بُری تنخواہیں لے کر کبھی شکایت کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ اِن لوگوں کے پاس جو عمدہ بنگلے اور خوبصورت کوٹھیاں ہیں یہ بڑھیا کپڑے اور موٹر کاریں ہیں، عمدہ بنک بیلنس اور ظاہری رکھ رکھاؤ ہے۔ اِن چیزوں کے لئے انھوں نے کبھی سرکار کو پریشان نہیں کیا ہے۔ اپنی اَن تھک محنت سے لوگوں کا بھلا کرکے حاصل کی ہوئی ہیں۔ وہ کام جو کسی طرح نہیں ہو سکتا یہ لوگ معمولی معاوضہ لے کر چٹکیوں میں کرا دیتے ہیں۔ اِن لوگوں کو حکومتی مشینری کے ہر کل پُرزے کی واقفیت ہے اور یہ جانتے ہیں کہ کون سا پُرزہ کتنی گریز دینے کے بعد چالو ہو سکتا ہے۔ اِس طبقے نے اپنے کام میں اِتنی مہارت حاصل کی ہے کہ اِس بات کی توقع پیدا ہو گئی ہے کہ باہر کے دیش اِن ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کے لئے اپنی سرکار سے خط و کتابت کرنے والے ہیں۔ دیش کو اِن لوگوں پر ناز ہے۔ آج کی ٹکڑی میں وہ ہستی بھی شامل ہے، جس نے صرف سات سو روپے تنخواہ پانے کے باوجود ایک ٹیکسٹائل مِل قائم کی ہے اور اِس طرح مُلک کی صنعتی زندگی مستحکم بنانے میں مدد کی ہے۔

دُکھ اِس بات کا ہے کہ کچھ جاہل اور اَن پڑھ قسم کے لوگ انھیں رشوت خور اور قوم فروش جیسے ناپاک لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور اِن کی پُرسکون زندگی میں رخنہ ڈالنے کی بے سُود کوشش کرتے ہیں۔

اب یہ ٹکڑی سلامی منچ کے سامنے پہنچ گئی ہے اور اِس میں شامل مرد اور عورتیں محتاط نظروں سے آگے پیچھے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں۔ اِس جماعت کے بعد جو جماعت تیزی کے ساتھ سلامی منچ کی طرف آ رہی ہے، اُس میں شامل سارے لوگ کافی صحت مند نظر آتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کوشش کے باوجود یہ لوگ اپنے چلنے کی رفتار میں تیزی نہیں لا سکتے۔ اس کی وجہ شاید اُن کے پھولے ہوئے پیٹ ہیں۔ شُدھ گھی، شُدھ آٹا، شُدھ دالیں اور شُدھ پھل کھانے والے یہ لوگ مُلک کے لئے ایک نیک فال ہیں۔ یہ لوگ خود گمنامی کی زندگی گزار کر فاقہ مست اور ننگ دھڑنگ جنتا کے لئے کام کرتے ہیں۔ بُرے وقت میں عوام کی خدمت کرنا اِن کا شیوہ ہے۔ اِن لوگوں کا اثاثہ وہ تہہ خانے اور گودام ہوتے ہیں، جہاں یہ چاول، آٹا، دالیں، کپڑا، دوائیاں، غرضیکہ ضرورت کی ہر چیز جمع کرتے رہتے ہیں۔ جب مُلک میں کسی چیز کی کمی پیدا ہو جاتی ہے، تو یہ گودام اور تہہ خانے ہی آڑے وقت کام آتے ہیں۔ ضرورت مند جنتا دام ادا کرکے چیز حاصل کر لیتی ہے۔ دام میں کمی بیشی ہونا تو قدرتی بات ہے۔ اِن کا دھندا اندھیرے ہی میں چلتا ہے۔ اِس لئے اِس ٹکڑی میں شامل لوگوں کے چہرے قدرے سانولے سانولے سے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ کسی احساسِ کمتری کے شکار نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اِس نیک کام میں انھیں قدم قدم پر رُکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اِن کی دُور اندیشی اور گھُل مِل کر رہنے کی عادت اِن رُکاوٹوں کو دُور کر دیتی ہے۔ یہ لوگ زبان کے میٹھے اور دھُن کے پکے ہوتے ہیں۔ اِن کے دل ہیرے کے ہوتے ہیں۔ ہیرے کو ہیرا ہی کاٹتا ہے، اِس لئے اِن کے دلوں میں پیار، ہمدردی، انسانیت اور رحم جیسے بے کار جذبوں کا فقدان ہوتا ہے۔

دیش کو اِن لوگوں پر بجا طور پر فخر ہے، کیونکہ یہ نہ ہوتے تو قحط اور خشک سالی کے دَوران لوگ چیزیں اور غلہ دستیاب کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ آخر کرسی لوٹ کھا کر کوئی آدمی اپنا پیٹ تو نہیں بھر سکتا ہے۔ اِن کا ماٹو ہے کیسہ کھولو اور ہریسہ کھاؤ!

جنتا کی کم عقلی کا اِس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اِن جیسے مہاپُرشوں کو بلیک مارکٹر اور ذخیرہ اندوز جیسے سستے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور اِن کے گوداموں اور تہہ خانوں کی کھوج لگانے کی ناکام کوششیں کی جاتی ہیں۔

یہ ٹکڑی سلامی منچ کے سامنے پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگی ہے۔ اِس لئے سلامی منچ

سے آگے اِن کے لئے گاڑیوں کا بندوبست کیا گیا ہے تاکہ انھیں زیادہ دُور تک پیدل نہ چلنا پڑے۔

اور اب ایک رنگا رنگ جھانکی سلامی منچ کی طرف بڑھنے لگی ہے۔ اِس ٹکڑی میں جو لوگ شامل ہیں وہ مختلف پیشوں اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اُنھوں نے ایک نئے طبقے کی داغ بیل ڈالی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اِن لوگوں میں تاجر، کلرک، شاعر، ادیب، فلمی ستارے اور سیاسی لیڈر شامل ہیں۔ اِن میں سے ہر آدمی اپنے پیشے میں ناکام رہا ہے۔ مختلف پوشاکوں، مختلف بولیوں، مختلف عادتوں اور مختلف شکلوں نے اِس جھانکی کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ سب کے سب بجی سجائی ٹرکوں پر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اِن لوگوں کا کمال یہ ہے کہ اِنھوں نے اپنی ناکامی ہی کو کامیابی کا زینہ بنا دیا ہے اور اِن لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اِن کی ایک آنکھ کانچ کی بنی ہے جس میں سے یہ کسی چیز کا بیک وقت ایک ہی Dimension دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری آنکھ سے دیکھنا اِنھوں نے ترک کر دیا ہے۔ اِن کی اِس قربانی کے پیشِ نظر حکومت اِن کا خاص خیال رکھتی ہے۔ وقتاً فوقتاً اِن کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ اور خطابات عطا کئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی انھیں سرکاری یا نیم سرکاری عہدوں پر بھی فائز کیا جاتا ہے۔ یہ بڑے کام کے لوگ ہیں۔ کسی فرقہ پرست یا کنبہ پرور وزیر کو نیشنلسٹ اور ترقی کا پتلا بنا کر پیش کرنا، رشوت خور افسر کو ایمان کا دیوتا بنا کر متعارف کرانا، کسی وطن دشمن نیتا کو دیش بھگت کا جامہ پہنا کر بانس پر چڑھانا اِن لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ابھی تک اِن لوگوں کو اپنا دایاں ہاتھ استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے اور یہ بجائے خود ایک کمال ہے۔ اپنی اِس خداداد لیاقت کی بدولت یہ لوگ مُلک میں اعتدال کی فضا قائم رکھنے کا لاجواب کارنامہ سرانجام دیتے ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ دوسرے شاعر اور ادیب، فلمی ستارے اور کلرک، لیڈر اور بار بار انھیں چاپلوس، خوشامدی اور ابن الوقت جیسے فرسودہ اور غیر جمہوری لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور اِن کا تمسخر اُڑانے کی بے سود کوشش کرتے ہیں۔

یہ ٹکڑی ہنستی گاتی اور چہچہاتی ہوئی سلامی منچ کے آگے سے گزر گئی ہے۔ آگے چوک پر انھیں اُس ہوٹل میں کھانا کھلایا جائے گا جو پہلے ہی اِن کے لئے ریزرو کرایا گیا ہے۔ کھانے کے علاوہ انھیں کچھ نقد روپیہ بھی ادا کیا جائے گا۔

اب جو ٹکڑی سلامی منچ کی طرف خراماں خراماں چلی آ رہی ہے، اِن میں وہ لوگ شامل ہیں جو صرف کھدر کے کپڑے کا استعمال کرتے ہیں۔ اِن کے سروں پر سفید کھدر کی نوکدار ٹوپیاں عجیب بہار دکھا رہی ہیں۔ یہ لوگ ایک شانِ بے نیازی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اِن کے ہونٹوں پر ایک سدا بہار مُسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ جیسے مُسکراہٹ کا خول اِن ہونٹوں پر چسپاں کر دیا گیا ہو۔ اِن میں سے بیشتر پان چبا رہے ہیں اور اپنے سر دھیرے دھیرے ہلاتے جاتے ہیں۔ اِن آدمیوں کا کُل اثاثہ اِن کی زبان ہے۔ تقریریں کرنے اور بیانات دینے میں اِن کا کوئی ثانی نہیں۔ اِس لئے اِن کے جسموں کے باقی اجزاء کوئی کام نہیں کرتے۔ اِن کا کام صرف باتوں کی خرید و فروخت ہے۔ اِن میں سے بیشتر آدمیوں نے چھوٹے چھوٹے گروہ قائم کئے ہیں اور اِن کا دعویٰ ہے کہ حکومت کرنے اور دیش میں خوشحالی لانے کے لئے اِن میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک فارمولا ہے۔ لیکن ایک آدمی دوسرے آدمی کے فارمولے میں یقین نہیں رکھتا۔ عوام کے جذبات بھڑکا کر اِن سے اندولن کرانے میں یہ ماہر مانے جاتے ہیں۔ حکومت اور عوام دونوں کی نیند حرام کرنا اِن کا خاص کام ہے۔ مُلک میں حرارت اور ہلچل قائم رکھنے کا کام اِنہی کے دم قدم سے ہے۔ یہ ہلچل اور حرارت نہ ہوتی تو دیش میں قبرستان کا سا سناٹا چھایا رہتا۔ اِس لئے ان کے کارناموں کو نہ سراہنا گُناہ کے مترادف ہے۔ اِن میں کچھ اخبار نویس بھی شامل ہیں، جن کا اخبار صرف اُس دن شائع ہوتا ہے جب کوئی سرکاری اشتہار مل جائے یا جب مالی ضرورت پُوری کرنے کے لئے کسی شخص یا کسی سرکاری افسر کی پگڑی اُچھالنا مقصود ہو۔ یہ کام بجائے خود کسی کارنامے سے کم نہیں۔ کیونکہ اِس طریقے سے یہ لوگ ساری دُنیا میں صحافت کا ایک نیا معیار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

شرم کی بات ہے کہ انھیں ٹٹ پونجئے اور بلیک میلر جیسے مکروہ ناموں سے نوازا جاتا ہے لیکن یہ لوگ اِن ناموں سے ہرگز نہیں گھبراتے۔

پان چباتی ہوئی یہ ٹکڑی سلامی منچ کے سامنے سے گزر گئی ہے اور اب جو ٹکڑی سلامی منچ کے پاس پہنچ رہی ہے، اِس میں سماج کے لوگ شامل ہیں یہ لوگ محتاط قدموں سے چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔ اِس جھانکی کی خاص بات یہ ہے کہ اِس میں شامل ہر شخص کے ساتھ اُس کا وکیل ہے۔ یہ لوگ سوال بھی وکیل کے ذریعے کرتے ہیں اور جواب بھی وکیل کے ذریعے سُنتے ہیں ـــــ یہ لوگ نہایت شان و شوکت سے زندگی گزارنے کے قائل ہیں اور اِن کا یہ کارنامہ رہتی دُنیا تک یاد رہے گا۔ کیونکہ ایک مفلس مُلک میں، جہاں افلاس اور کس مپرسی کا دَور دَورہ ہو، شان و شوکت سے زندگی گزارنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ یہ لوگ کسی شخص یا کسی حکومت کے محتاج نہیں ہیں۔ اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہیں اور اپنی ملوں کا کپڑا پہنتے ہیں۔ اِن میں کچھ بڑے بڑے فارسٹ لیسینر ہیں، گورنمنٹ ٹھیکیدار ہیں، ملوں کے مالک ہیں، بڑی بڑی فرموں کے پروپرائٹر ہیں۔ ہر انسان کی طرح یہ اپنی کمائی ہوئی دولت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ اِس چیز کے لئے انھوں نے بڑے بڑے ماہروں کی خدمات حاصل کی ہوئی ہیں جو ہر طرح اور ہر قسم کے ہیر پھیر کا بھید بھاؤ جانتے ہیں۔ اِس طرح یہ لوگ کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی حفاظت کرتے ہیں، جو بصورتِ دیگر اِن سے چھین لیا جاتا۔ اِن کا دعویٰ ہے کہ اپنے اِس کارنامے کی بدولت یہ مُلک اور قوم کی بہت بڑی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔

کیونکہ قوم کے پاس اگر یہ اربوں روپیہ چلا جائے تو قوم کو عیش پرستی کی لت پڑ جائے گی اور لنگوٹی کا رواج ختم ہو جائے گا۔ اس لئے وہ یہ اربوں روپیہ اپنے پاس رکھ کر خود ہی عیش پرستی کے مرض میں مبتلا ہو کر عوام کو اس موذی مرض سے بچا رہے ہیں۔ بھگوان شنکر نے بھی تو دنیا کو بچانے کے لئے خود زہر کا گھونٹ پی لیا تھا۔ عوام کو ان لوگوں کی اس قابلِ فخر قربانی پر فخر ہے۔

اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ کچھ مفلس قسم کے اور بھوکے قسم کے لوگ ان اربوں روپوں کی طرف اپنی للچائی نظریں جمائے انھیں انکم ٹیکس چور، ڈاکو، چار سو بیس اور نہ جانے کن کن گندے الفاظ و القاب سے یاد کرتے ہیں۔ شکر ہے کہ اس طبقے کے وکیلوں اور کھیل ماہروں کے آگے ان مفلسوں اور بھوکوں کی ایک نہیں چلتی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ ان بھانت بھانت کے لوگوں کی یہ ٹولی سلامی منچ کے آگے سے بہت شان سے گزر گئی ہے۔ سلامی منچ کو انھوں نے کوئی سلامی نہیں دی کیونکہ یہ لوگ سلامی دینے کے عادی نہیں ہیں۔

اور اب جو جھانکی سلامی منچ کی طرف بڑھ رہی ہے وہ بلاشبہ بھگوان شنکر کی برات کا سا منظر پیش کر رہی ہے۔ اس میں شامل لوگ عجیب عجیب سے چہروں اور پوشاکوں میں ملبوس ہیں۔ کسی نے تنگ موری والی پتلون، تنگ بنیان پہن رکھی ہے اور گلے میں رومال باندھ لیا ہے اور پتلون کی بیلٹ میں چھری اڑس لی ہے۔ کسی نے تہبند اور کرتا زیب تن کیا ہے اور گلے میں تعویذ لٹکا رکھا ہے۔ کسی نے نیکر اور سکاؤٹوں والی خاکی قمیص پہن لی ہے۔ کوئی بیڑی پی رہا ہے تو کوئی چلم کے دم لگا رہا ہے۔ کوئی پان چبا رہا ہے تو کوئی خالی بوتل ہاتھ میں لے کر جھوم رہا ہے۔ طرح طرح کے چھوٹے موٹے ہتھیاروں سے لیس یہ لوگ اپنی سرخ آنکھوں سے سلامی منچ کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ بہت کارآمد لوگ ہیں۔ یہ لوگ نہ ہوتے تو دیش میں امن و امان قائم رکھنا محال ہو جاتا۔ ہر دیش کی تاریخ میں ایسا وقت آتا ہے جب لوگ اپنی مانگیں منوانے کے لئے یا اپنی شکایتیں بیان کرنے کے لئے آندولن کرتے ہیں، ستیہ گرہ کرتے ہیں یا ہڑتال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان باتوں سے حکومت کو قدرتی پریشانی ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ عجیب و غریب میک اپ والے لوگ ہی کام آتے ہیں۔ یہ فوراً جائے واردات پر پہنچ کر دو ایک بم گرا دیتے ہیں۔ ایک آدھ ہاتھ چھری کا چلاتے ہیں۔ دس پانچ غلط قسم کے نعرے لگاتے ہیں۔ زیادہ حالات گمبھیر ہوئے تو ایک آدھ بس یا موٹر کو نذرِ آتش بھی کر دیتے ہیں یا ریل کی پٹری اکھاڑ دیتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد یہ لوگ وہاں سے کھسک آتے ہیں اور نزلہ بھوک ہڑتال کرنے والوں یا ستیہ گرہ کرنے والوں پر گرتا ہے۔ فوراً دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی جاتی ہے یا کرفیو لاگو کر دیا جاتا ہے اور اس طرح امن و امان قائم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اور سر ہتھیلی پر رکھ کر امن و امان قائم کرانے کے لئے میدان میں کودنا ایک ایسا کارنامہ ہے، جس کی جتنی سراہنا کی جائے کم ہے۔ امن و امان کی خواہش رکھنے والی جنتا کو ان لوگوں پر ناز ہے۔

کچھ بزدل اور بزعمِ خود شریف قسم کے لوگ ان کو سرکاری غنڈے یا پیشہ ور دنگے باز جیسے غیر شاعرانہ ناموں سے پکار کر اپنی کم عقلی بلکہ جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ جھانکی سلامی منچ کے سامنے سے گزر گئی ہے۔ اگلے موڑ پر انھیں بسوں میں سوار کرا کے ایک شاندار ہوٹل میں لے جایا جائے گا، جہاں ان کے منورنجن کا سامان پہلے ہی سے تیار رکھا گیا ہے۔

رات کافی سرد ہو گئی ہے اور میں اس عمارت کی بیسویں منزل پر بیٹھے بیٹھے اکڑ گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے آپ لوگوں سے اجازت لینی چاہئے کیونکہ یہ آخری جھانکی تھی جس کا آنکھوں دیکھا حال میں نے بیان کیا —— مگر ٹھہرئے !!

مجھے نیچے سڑک پر ایک آدمی نظر آ رہا ہے۔ اکیلا، بے یار و مددگار۔ شاید یہ بھی کوئی جھانکی ہو۔ لیکن پروگرام میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس نے صرف ایک لنگوٹی پہن رکھی ہے اور اس کا باقی جسم بالکل ننگا ہے۔ اتنا دبلا پتلا آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا ہے۔ اتنی بلندی پر بیٹھ کر بھی میں اس کی پسلیاں ایک ایک کر کے گن سکتا ہوں۔ اب یہ آدمی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا سلامی منچ کی طرف آ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی، ناامیدی، کس مپرسی اور ... کی لکیریں چھائی ہوئی ہیں۔

میں نہیں جانتا یہ آدمی کون ہے۔ اس کا سلامی منچ کے سامنے آنے کا مقصد کیا ہے۔ یہ اس بیس منزلہ عمارت کی طرف پُر اُمید نظروں سے دیکھنے لگا ہے جس کی بیسویں منزل پر میں بیٹھا ہوں۔ عمارت کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹوں پر ایک زہرخند پھیل گیا۔

اسے شاید پیاس لگی ہے، کیونکہ یہ بار بار اپنی خشک زبان اپنے خشک ہونٹوں پہ پھیر رہا ہے۔ اب اس نے سلامی منچ کے سامنے لگے ہوئے عارضی نلکے کی ٹونٹی کھول دی ہے۔ مگر ـــــ مگر اس میں سے پانی کی ایک بوند بھی نہیں نکل رہی۔ یاس کی ایک زخمی نظر اس نلکے پر ڈال کر اب یہ آدمی سلامی منچ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر پنڈال میں آگیا ہے اور پنڈال کے فرش پر بکھرے ہوئے مونگ پھلی کے چھلکوں میں کچھ تلاش کرنے لگا ہے۔ شاید کوئی سالم مونگ پھلی ڈھونڈ رہا ہو۔ لیکن اس چھلکوں کے انبار میں اسے کچھ ہاتھ نہیں آ رہا۔

بہت تلاش کے بعد تھک ہار کر اب یہ آدمی سلامی منچ کے پنڈال پر مونگ پھلی کے چھلکوں کے بیچ پاؤں پسار کر سو گیا ہے۔ اسے سونے دیجئے! کہیں یہ جاگ پڑا تو ـــــ

جے ہند ـــــ!!

غزل

منظر صدیقی اکبرآبادی

ہنسا کے یوں وہ فضاؤں کو مشکبار چلے
چمن میں جیسے کہیں بادِ خوشگوار چلے

بڑھا کے عشق کی دُنیا کا اعتبار چلے
ہمیں تھے جو تری محفل سے باوقار چلے

ہمیں ہی پینا پڑا زہرِ تلخیٔ ایام
ہمیں تو ہیں وہ جو ہنس ہنس کے سوئے دار چلے

مجھے یقیں نہ دلا اپنی دل نوازی کا
یہ وہ فریب نہیں ہے جو بار بار چلے

مری نظر کو ہے اب ایسے اِک جہاں کی تلاش
جہاں نہ کشمکشِ جبر و اختیار چلے

یہ ہے محال ہمیں کر سکے نظر انداز
نئی روِش پہ زمانہ ہزار بار چلے

عروجِ فکر بجا، ہم نے یہ بھی دیکھا ہے
نہ تھے جو اہلِ نظر وہ بھی شہکار چلے

تمام عمر تلاشِ حبیب میں گزری
نہ کوئے یار ہی دیکھا، نہ سوئے دار چلے

کچھ ایسے صابر و شاکر بھی تیری بزم میں تھے
جو بے قرار ہی آئے تھے، بے قرار چلے

گزر گئی بہر عنوان زندگی منظر
یہ کیا بتائیں رہے خوش، کہ سوگوار چلے

غزل

پروفیسر عبدالرب عرفان، ایم اے

مُدتوں سے جو اشکبار ہوں میں
اِک ہنسی کا گنہگار ہوں میں

جو اُجڑ کر نہ پھر ہوا آباد
آرزوؤں کا وہ دیار ہوں میں

اب تو جو لائقِ رفو بھی نہیں
وہ گریبانِ تار تار ہوں میں

جانتا ہوں فریبِ وعدۂ دوست
پھر بھی کیوں محوِ انتظار ہوں میں

کیا کیا دل پہ اعتبار کیا
اپنے ہی تیر کا شکار ہوں میں

میں ہوں اور ماتمِ دلِ مرحوم
آج کس درجہ سوگوار ہوں میں

تھا کبھی غم مرے گلے کا ہار
اب تو غم کے گلے کا ہار ہوں میں

جس کے دم سے ہے میکدے کی بہار
بادہ خوارو! وہ بادہ خوار ہوں میں

وہ گریزاں ہیں مجھ سے کیوں عرفان
جن کی یادوں سے ہمکنار ہوں میں


حسن کچھ اور نکھرتا ہے محبت پاکر...
...اور تب ہی تو حسن بہار پر آتا ہے۔ آپکے حسن کی بہاروں کو چار چاند لگانے کے لئے ہم نے بھی بڑے پیار اور محبت سے بہترین سوت کے اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے بنائے ہیں۔ انتہائی حسین اور دلفریب بناوٹ والے یہ کپڑے سینفورائزڈ، ٹیبی لائزڈ اور مرسرائزڈ بھی ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ کپڑے دھلنے پر سکڑ کر تنگ نہیں ہو جاتے، انتہائی ملائم اور خوشنما ہونے کے ساتھ ساتھ اینٹی کریز بھی ہوتے ہیں، اور انہیں استری بھی برائے نام ہی کرنی پڑتی ہے۔
انکے ڈیزائن بھی بالکل انوکھی قسم کے، نہایت خوشنما اور دیدہ زیب ہیں۔ یہ آتے بھی ایسے نئے نئے اور شاندار رنگوں میں ہیں جو بار بار دھلنے پر بھی جیسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔ انہی خوبیوں کی بدولت بامبے ڈائینگ کے کپڑوں کو ایک ہی نظر میں پہچانا جا سکتا ہے۔
تشریف لائیے اور دیکھئے کہ کیا ہی حسین کپڑے ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں!
بامبے ڈائینگ
BD.7191
مختلف رنگوں اور چھپے ہوئے ڈیزائنوں کے لان، ساٹین، وائل اور ۲x۲ پاپلن ملتے ہیں۔

افسانہ

کورے کاغذ

پرنسپل جوگندر پال ایم۔ اے
پارک وِلا، مقبرہ روڈ، یونیورسٹی کارنر۔ اورنگ آباد۔ مہاراشٹر

۷ مئی ۶۸ء

جناب خوشتر صاحب! آداب

آپ کا خط مل گیا تھا۔ ارشاد کی تعمیل کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ لیجئے "بیسویں صدی" کے خاص نمبر کے لئے میری نئی، غیر مطبوعہ کہانی "کورے کاغذ" حاضر ہے۔ نہایت عمدہ ایب سرڈ کہانی ہے۔ آج کی بہترین کہانیوں میں ایب سرڈ کہانیاں پیش پیش ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گہرائی تک ہماری رسائی صرف ایب سرڈٹی ہی سے ممکن ہے؟ بہرحال "کورے کاغذ" میری پسندیدہ کہانی ہے۔ آپ بھی پڑھ کر دیکھئے ——— مجھے معلوم ہے آپ اپنے چہیتے فنکاروں کو خبطی اچھا خاصہ بگاڑ دیتے ہیں۔ شاید مجھے بھی آپ نے کچھ کچھ بگاڑ دیا ہے۔ خوب جی کھول کر بگاڑیئے کہ یوں بگڑ بگڑ کر ہی فنکار میں فن کو سارا لہو دے دینے کی جرأت پیدا ہوتی ہے . . .

آپ کا ——— جوگندر پال

کئی عورتوں سے یکے بعد دیگرے اور کئی عورتوں سے بیک وقت محبت کرنے کے بعد مجھے اپنا گھر بسانے کا خیال آیا۔ مجھے خواہش ہونے لگی کہ دھرتی کا کوئی ایک ٹکڑا سنبھال لوں اور جی لگا کے یہیں کاشت کروں۔ زمین اُس کی ہوتی ہے جو اُس کی کاشت کا ذمّے دار ہو اور عورت اُس کی، جو اُس کے بچوں کا قانونی باپ بننے کی ذمّے داری قبول کرے۔ میں نے ہمیشہ اِس ذمّے داری کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا، اِس لئے کسی عورت کو میری چاہ نے صحیح معنوں میں متاثر نہ کیا۔

ایک دن میں نے قطعی فیصلہ کر کے پورنیما سے کہا "آؤ پورنی! شادی کر لیں"

اُس نے پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی جیسے میں نے اُسے کوئی بہت بے ساختہ لطیفہ سنایا ہو۔

"میں واقعی شادی کرنا چاہتا ہوں پورنی۔ تم سے یا کسی اور سے"

وہ چڑ گئی "تم سے شادی کون کرے گا؟"

"تم!"

اور وہ رام ہو گئی۔

"ٹھیک ہے! لیکن تم سے شادی کرنے سے پہلے مجھے اپنے شوہر سے طلاق لینی ہوگی"

ارے ہاں! وہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ پورنیما شادی شدہ ہے۔ ذہن پر زور ڈالے بغیر اُس کے شوہر کا خیال آ ہی نہ سکتا تھا۔

ہماری بات چیت کے بعد پورنیما اپنے شوہر سے نہایت محبت سے پیش آنے لگی تاکہ طلاق دینے میں وہ حیل حجت نہ کرے۔ وہ پورنیما سے اِتنا خوش معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں یقین ہونے لگا کہ طلاق کا مرحلہ اب بہت آسانی سے طے ہو جائے گا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اگلے اتوار کو ڈنر کے فوراً بعد پورنیما اپنے طلاق کا پرپوزل پیش کرے گی۔ ڈِنر پر میں بھی موجود رہوں گا تاکہ پورنیما کو اخلاقی سہارا ملے۔

اتوار میں ابھی پورے چار روز باقی تھے۔

بُدھ وار ———

"پورنیما!"

"کہو، رام!"

"کیا تمھیں شادی سے پہلے مجھ سے کچھ پوچھنا ہے؟ ——— یعنی ہو سکتا ہے تمھاری چند شرائط ہوں۔ جو کہنا ہے، صاف صاف کہہ دو پلیز!"

"صاف صاف؟

"ہاں۔"

"نمبر ایک، شادی سے پہلے میرے فیشنس کا سرٹیفکیٹ لاؤ، نمبر دو، تم سے کم ایک لاکھ کی لائف انشورنس کراؤ۔ نمبر تین، اپنی مونچھیں فوراً صاف کروادو۔"

"تمھاری تیسری شرط بڑی کڑوی ہے ڈارلنگ! شادی کر کے میرا حلیہ بگاڑ دینا چاہتی ہو؟"

"اگر تمھیں یہ شرط پسند نہیں تو شوہر کی بجائے دوست ہی بنے رہو۔"

"صرف دوست رہ کر میں اب بور ہو چکا ہوں پوری ڈیر! مجھے تمھاری سبھی شرطیں منظور ہیں۔" وفورِ محبت ——— نہیں بوفورِ شفقت سے دل چاہا اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کی پیشانی چوم لوں۔

"پھر بنیا! کیا تمھیں بچے پسند نہیں؟"

- ایمان کا ایک تہائی علم، دوسری تہائی حیا اور تیسری تہائی فیاضی ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- جس نے لوگوں کا حق نہ پہچانا اُس نے خدا کا حق بھی نہیں پہچانا۔ (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)
- پرہیز کرو، پرہیز نفع دیتا ہے۔ عمل کرو، عمل قبول کیا جاتا ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)
- ادائے فرض کے بعد قربِ الٰہی کے حصول کا سب سے افضل طریقہ علم ہے۔ (حضرت امام شافعیؒ)
- سب سے بہتر لقمہ وہ ہے جو اپنی جدوجہد سے حاصل کیا گیا ہو۔ (خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ)

"میں تو ڈھیر سارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں لیکن میرے پچھلے شوہروں کو بچوں سے چڑ تھی ——— مجھے بچوں سے بہت محبت ہے رام!"

"اور بچوں کے باپ سے؟"

"بڑے عجیب ہو بھئی۔ شادی بھی اور محبت بھی؟ کہیں تم یہ تو نہیں چاہتے کہ میں اپنے سب دوستوں کو چھوڑ دوں۔"

"نہیں بھئی، مجھے اتنا اولڈ فیشنڈ نہ سمجھو میں تو ———"

"میں تو دیپ تو چھوڑو۔ ہم شادی ضرور کریں گے لیکن فریقین کو ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا حق حاصل نہ ہوگا۔ منظور؟"

"مجھے تمھاری ہر بات منظور ہے مائی ڈیر! خفا کیوں ہوتی ہو؟ تمھیں شادی کا تیسرا چوتھا یا شاید اس سے بھی زیادہ تجربہ حاصل ہے لیکن میں اس معاملے میں صفر ہوں۔

ڈھیروں خانہ داری کے سبھی اہم نکتے میری سمجھ میں بھی آنے لگیں گے۔ آؤ اب کلب چلیں۔ ڈنر بھی وہیں کھائیں گے ——— چاہو تو اپنے شوہر کو بھی ساتھ لے لو، بیچارہ خوش ہو جائے گا۔"

"نہیں، آج وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ واپسی پر اُسے گرم گرم کافی پلا کر بہت دھیان سے اُس کے دن بھر کے کمرشل ایڈونچر سنوں گی تو اُسے پورا اطمینان ہو جائے گا ——— تم وہ کا میک دیکھو۔ وہ میز کے نیچے رکھے ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں تیار ہو کے آتی ہوں۔"

میں نے ایک کامیک اٹھالیا۔

پہلا صفحہ کھولا۔ پہلی تصویر میں ایک کنوارا بیوی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے، دوسری تصویر میں اُسے ایک لڑکی مل جاتی ہے، تیسری میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہیں، چوتھی میں کنوارے نے لڑکی سے شادی کرنے کو کہا ہے اور اُس نے جواب دیا ہے، لیکن میں تو شادی شدہ ہوں، پانچویں میں لڑکی کا شوہر وہاں آ پہنچا ہے اور لڑکے سے کہہ رہا ہے، اگر وہ چاہے تو بخوشی اُس کی بیوی سے شادی کر سکتا ہے اور چھٹی میں لڑکی لڑکے سے کہہ رہی ہے، نو پلیز! میرا شوہر اتنا فراخ دل ہے کہ اُسے بدلنا میں کبھی گوارا نہ کروں گی۔

دیروار کی صبح کو اچانک میری ایک کھوئی ہوئی پُرانی دوست مینا اتنی کہیں سے آگئی۔ میری اُن دنوں کی شناسا، جب میں لڑکیوں سے باتیں کرتے ہوئے لڑکیوں کی طرح شرما جاتا اور اُنھیں بڑا اچھا معلوم ہوتا۔

"ہائے، کتنے پیارے لگتے ہو رام! میں تمھاری طرح شرما سکوں تو چہرے کا میک اپ کرنا چھوڑ دوں۔"

"تم یہ سارا عرصہ کہاں رہیں مینا؟"

"اپنے شوہر کے اسٹوڈیو میں ——— میرا شوہر پینٹر تھا۔"

"تھا؟"

"ہاں، اُس نے خودکشی کر لی ہے رام! وہ اتنا ایبسٹریکٹ ہو گیا تھا کہ ہونا نہ ہونا اُسے اب یکساں معلوم ہونے لگا تھا۔"

پُور ڈیر! وہ اپنے مرحوم شوہر کی کھینچی ہوئی غم کی ایک تجریدی تصویر کی طرح بغیر موجود معلوم ہو رہی تھی۔ واقعی سارا دن اُس کے ساتھ رہ کر مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اُسے ڈھونڈ رہا ہوں اور رات کو دفعتاً ہمارا سامنا ہو گیا اور اُس نے میری طرف بغور دیکھا اور میں نے اُس کی طرف اور مجھے اُس پر اِس شدت سے ترس آنے لگا کہ میرا جی چاہا اُس سے شادی کر لوں ——— شادی! میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔ پورنیما کو تو میں بھول ہی چکا تھا۔

"مینا! کیا تم پورنیما کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔ کیوں؟"

"پورنیما اور میں شادی کر رہے ہیں ڈارلنگ! اور میری خواہش ہے کہ ہماری شادی پر تم ضرور آؤ ——— آؤ گی نا؟ ——— آؤ مینا! اب سو جائیں۔"

شکروار ———

مینا جا رہی تھی۔

"اب کہاں جاؤ گی مینا؟"

"آئی تو تمھارے پاس تھی رام! لیکن تم نہیں تو کوئی اور سہی ———"

"وہ خوش قسمت کون ہے؟"

"میرے مرحوم باپ کا ایک دوست۔"

"تمھیں شوہر کی تلاش ہے یا باپ کی ———؟"

"وہ جو بھی بن گیا رام! میں قبول کر لوں گی۔ اِس وقت مجھے کسی سے کوئی بھی رشتہ جوڑنے کی فوری ضرورت ہے۔ ورنہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری ڈِس اِن ٹیگریشن ہو جائے گی۔"

وہ چلی گئی تو میں جلدی جلدی تیار ہونے لگا کہ پورنیما سے مِل آؤں، لیکن گھر سے باہر قدم رکھا تو مجھے زکام کا شکار ہو جانے کا احساس ہوا۔ میں اُلٹے پاؤں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کیے، نصف گلاس برانڈی میں ایک چوتھائی پانی ملا کر تیز تیز پی گیا اور بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

سنیچر وار ———

"رام!"

"کہو، پوری!"

"آج سہ پہر کو میرا شوہر مجھ سے پیار کر کے باؤلا ہو رہا تھا کہ موقع مناسب جان کر میں نے طلاق کی بات چھیڑ دی ———"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ اولڈ مین بڑا کائیاں نکلا!"

- مُبارک وہ ہیں جو امن پسند ہیں۔ سعید ہیں وہ جو اپنے والدین کی خدمت کرتے ہیں۔ (مہاتما بُدھ)
- بداعمالیوں کا پھل ناگزیر طور پر بھگتنا پڑتا ہے۔ اِس سے بچنا ناممکن ہے۔ (ماتاریمانہ جی)
- بُرائی چاہتا ہے تو بخشش کر کیونکہ جب تک دانہ نہ بکھرے گا، نہ اُگے گا۔ (اُپنشد)
- باہمت افراد مسلسل کوشش اور جدوجہد سے منزل پا لیتے ہیں۔ (سوامی سدرشنانند جی)
- پربھو کا ذکر دہی اچھا جو دل میں بس جائے۔ (سوامی سارشبانند جی)

"کیا مطلب؟"

"اُس کا کہنا ہے کہ پیار محبت ایک طرف اور اصول ایک طرف۔ میں نے تم پر شادی کے بعد کم سے کم پچیس ہزار روپیہ خرچ کیا ہے۔ اگر کوئی بھلا مانس تمھیں مجھ سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو کم سے کم پچاس ہزار ہارڈ کیش لے کر آئے، دھندے کی بات ہے۔"

"مگر پوری! میرا بنک بیلنس تو نِل ہے۔"

"اوئی رام! تو کیا تم صرف جھک مارنے کے لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"لیکن پوری! میں تمھاری انشورنس کی شرط پوری کر دوں گا۔"

"نہ بابا، کیا پتہ، تم اپنی ساری زندگی زندہ رہو۔ پھر تمھاری انشورنس سے کیا فائدہ؟ ——— نہ بابا!"

اتوار ———

میں نے اپنی سب محبوباؤں کے پتے ڈھونڈ کر نکال لئے اور زکام کے بوجھل احساس سے سر جھکا کر سارا دن اُنھیں چٹھیاں لکھتا رہا۔ نہ جانے کیا کیا لکھا۔ بہت طویل خطوط تھے۔ اِتنے طویل کہ خلافِ عادت میں نے اپنی تحریر کو دوبارہ پڑھے بغیر ہر چٹھی کو لفافے میں بند کر دیا۔

میرا زکام بڑھ رہا تھا اور میں بے چین ہو ہو کر سوچ رہا تھا کہ اِن چٹھیوں میں میں نے کیا لکھا ہے۔ مجھے اپنی محبوباؤں سے کیا کہنا ہے؟ —— مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ مجھے اُن سے کیا کہنا ہے۔ نہ جانے میں نے اُن سے کیا کہا ہے۔

شاید میں نے ہر ایک کو لکھا ہو کہ میں صرف تم ہی سے محبت کرتا ہوں یا شاید میں نے ہر ایک سے شدید نفرت کا اظہار کیا ہو، یا شاید میں نے اپنی دانست میں اُن سے اپنی محبت یا نفرت کے اظہار کے لئے محض اپنا قلم ہلایا ہو، لیکن لکھا کچھ بھی نہ ہو اور میری سب چٹھیاں کوری رہ گئی ہوں۔

میں چاہ رہا تھا کہ اپنی ہر محبوبہ کو ایک ایک اور چٹھی لکھوں، اپنی گزشتہ چٹھیوں کی وضاحت کے لئے، یعنی صرف یہ کہنے کے لئے کہ مجھے تم سے کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ نہ محبت سے نہ نفرت سے!

ڈنر کا ٹائم ہو رہا تھا۔

پورنیما اور اُس کا شوہر کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہوں گے۔ اُنھیں بھوک نہیں، پھر بھی وہ عادتاً کھانے کے لئے باہم بیٹھ گئے ہیں۔ میں بھی یہاں بیٹھا اپنے زکام آمیز ذائقے سے اپنی سوچ کو عادتاً چبا چبا کر کھا رہا ہوں، حالانکہ مجھے بھی قطعاً بھوک نہیں!!

غزل

مس غزالہ اشفاق۔ شاہجہاںپوری

جام و مینا سے ملاقات کہاں تھی پہلے
زندگی نذرِ خرابات کہاں تھی پہلے

کتنی رنگین بنا دی مری خلوت تم نے
ورنہ تنہائی میں یہ بات کہاں تھی پہلے

تم جو آئے تو نظر آئے سر و انجم بھی
آج تک اتنی حسیں رات کہاں تھی پہلے

اب تو ہر سمت کھِلے ہیں تری یادوں کے گلاب
دل کے ویرانے میں یہ بات کہاں تھی پہلے

اے غمِ عشق یہ تیرا ہی کرم ہے ورنہ
میری اِن آنکھوں میں برسات کہاں تھی پہلے

کون اب تیری بدولت نہیں واقف مجھ سے
ورنہ ہر لب پہ مری بات کہاں تھی پہلے

اِس طرح نذرِ الم کب تھا غزالہ یہ دل
ہائے یہ صورتِ حالات کہاں تھی پہلے

بیسویں صدی دہلی

غزل

پریم کشپ سوز

بزمِ محبوب میں جاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
دل کو ویران بناتے ہوئے جی ڈرتا ہے

سوئے جذبات جگاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
آئینہ سامنے لاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

ہم نے گائے تھے قفس میں جو ترانے اکثر
اب چمن میں اُنھیں گاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

عام ہو جائے نہ اندازِ پرستش میرا
سر ترے در پہ جھکاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

اُن سے وابستہ ہزاروں ہی فسانے تھے کبھی
اب اُنھیں یاد دِلاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

اِس کو کم ظرفیِ اُلفت نہ سمجھ لے ڈربہ
حالِ غم اُن کو سناتے ہوئے جی ڈرتا ہے

گُم رہی دیکھ کے اِس دور کے فرزانوں کی
بخدا ہوش میں آتے ہوئے جی ڈرتا ہے

اِس قدر سوزؔ نوازا ہے ہمیں دنیا نے
دل کو ہمراز بناتے ہوئے جی ڈرتا ہے

عالمِ خیال میں ——

بہادر شاہ ظفر سے اِنٹرویو

—— نریش کمار شاد

۱۶۳۵ تیمار پور۔ دہلی
۲۴ مئی ۱۹۶۸ء

محترم خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

لیجئے حضرت! اب کی بار بہادر شاہ ظفر سے انٹرویو ملاحظہ فرمایئے۔ یاس یگانہ چنگیزی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اپنے اپنے حال میں اور اپنے اپنے رنگ میں — کوئی حیرانِ خزاں کوئی پریشانِ بہار

یعنی امیرِ شہر بہادر شاہ ظفر اپنے مقام پر دل فگار تھے اور یہ فقیرِ شہر اپنی جگہ سرگوار ہے۔ دونوں میں کوئی نسبت نہ سہی یہ رشتہ ضرور ہے کہ دونوں ماحول کے مارے ہوئے ہیں۔ ظفر کا دکھ سمجھنے کے لئے یہ انٹرویو اور میرا درد جاننے کیلئے میرا یہ سانیٹ پڑھئے جو عنوان ہے "سرکس کا شیر" عرض کیا ہے ——

شاعر کو اِک کلرک بنا کر ہی دم لیا
کر ہی دیا نا شیشۂ پندار پاش پاش
کتنا ستم ظریف ہے تُوئے غمِ معاش
کیسے حسین ذہن کو برباد کر دیا

——

اب تُو ہی یہ بتا مجھے اے میری بے بسی!
احساس ہو رہا ہے جو مجروح کیا کروں
مُرجھائے جا رہی ہے اگر روح کیا کروں
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے اب وہ شگفتگی؟

——

ہر چیز خندہ زن ہے مرے حال پر یہاں
اِک زہرخند جیسے ہے ٹائپ کے شور میں
ہنستی ہیں مجھ پہ جیسے یہ بے رنگ فائلیں
ہنستی ہیں مجھ پہ جیسے یہ میزیں یہ کرسیاں
ہنستی ہے مجھ پہ خود مری خودداریٔ جنوں
محسوس ہو رہا ہے کہ سرکس کا شیر ہوں

آپ کا ——— نریش کمار شاد

شاؔد: "ظلِ سبحانی قبلہ و کعبہ! آپ تیموری سلطنت کے ایسے آخری اور بدبخت تاجدار تھے جن کی گھائل شخصیت سے حقیقی غم ٹپکتا ہے۔ آپ کی زندگی کی دُکھ بھری کہانی یوں تو کئی بار پڑھ اور سُن چکا ہوں لیکن آج ـــــ"

ظفؔر: "سوا ہمارے نہ سُن ہماری حکایتِ غم سنی سُنائی
جو ہم پہ گزری وہ پوچھ ہم سے کہ جیسے عالم سُنی سُنائی"

شاؔد: "جی ہاں قبلۂ عالم! آپ کی زبانِ مبارک ہی سے آپ کے بارے میں کچھ سُننے کی تمنا ہے۔"

ظفؔر: "میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا مجھے سُن کے کوئی کریگا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں؟"

شاؔد: "بالکل صحیح فرما رہے ہیں آپ۔ آنکھ کھولی تو آپ نے سلطنت کا شیرازہ منتشر پایا۔ آپ کے والدِ محترم اکبر شاہ ثانی تک آپ سے ناخوش تھے۔ سالہا سال کے بعد تخت نشین ہونے لگے تو آپ کی تخت نشینی پر جھگڑا ہوا اور مصاحبوں کے ناروا سلوک نے آپ کا دل کھٹا کر دیا۔ قدم قدم پر اپنی لاچاری۔ مجبوری اور بے بسی کا احساس ستانے لگا۔ بادشاہ تو آپ برائے نام تھے۔ حقیقت میں انگریزوں کے ایک وظیفہ خوار تھے اور ستم ظریف تقدیر نے آپ کے سر پر مغلیہ حکومت کا تاج محض اس لئے رکھا تھا کہ آپ اپنی بدنصیب آنکھوں سے عظیم مغلیہ تاریخ کا دردناک انجام دیکھ سکیں۔ جاہ و حشم میں تو آپ کی زندگی کیا بسر ہوئی ہوگی۔"

ظفؔر: "خواب تھی جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی
ورنہ اپنی عمر ساری درد و غم میں کٹ گئی"

"پھر بھی یہ تو فرمائیے ۱۸۳۷ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد جب آپ تخت نشین ہوئے تو کیا محسوس کرتے رہے۔ وقتی طور پر تو اپنی سرفرازی کا احساس ضرور ہوا ہوگا؟"

ظفؔر: "بندۂ بادشاہِ مطلق ہوں
گرچہ رکھتا ہوں تاجِ زر، ہوں کون؟

کوئی پہچانتا بھی ہے مجھ کو
شاہ ہوں یا گدا ظفؔر ہوں کون؟"

شاؔد: "اس کا مطلب ہے تخت نشین ہو کر بھی آپ کا دل شادمانی سے ہمکنار نہ تھا۔"

ظفؔر: "دل ہے میرا داغِ دل کی یوں سیاہی کے تلے
بادشہ ہو جیسے چترِ بادشاہی کے تلے"

شاؔد: "مزاج تو واقعی آپ نے درویشانہ پایا تھا۔ سُنا ہے بہت سے لوگ تنگدستی کے اندھے بپھرے اور ایک آپ کے ملازم تھے اور اُن کی ماہانہ تنخواہ گھر بیٹھے اُنہیں پہنچتی تھی۔ کیا آپ کے پہلو میں اتنا نرم اور حساس دل تھا کہ آپ اپنے کسی ملازم کو برخاست کرنے کی ہمت نہ کر سکے؟"

ظفؔر: "بلبلے تپِ اندوہ محبت اُف رے گرمیِ داغِ فراق
دل تھا کیا پہلو میں ہمارے گویا آتش خانہ تھا"

شاؔد: "اپنے اسلاف کی طرح آپ کو جنگ و جدل سے لگاؤ کیوں نہیں ہوگا؟"

ظفؔر: "جوشنِ جنگ و جدل پہنیں تو کس کے واسطے
ہم تو بیٹھے ہیں ردائے صلح کُل اوڑھے ہوئے"

شاؔد: "ردائے صلح کُل اوڑھنے کا باعث غالباً یہ تھا کہ آپ کا خمیر مذہبیت سے اُٹھا تھا۔ سُنا ہے آپ کو امام حسینؓ سے تو بے حد عقیدت تھی۔ محرم میں آپ فقیر بنتے۔ سبز کپڑے پہنتے۔ گلے میں سبز جھولی ڈالتے اور لنگی باندھ کر کسی بہشتی کی طرح شربت کی بھری ہوئی مشک کاندھوں پر رکھ کر بچوں بوڑھوں کو شربت پلایا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کے بارے میں آپ نے کچھ شعر کہے ہوں تو ارشاد فرمائیے۔"

ظفؔر: "جو اِس امام کا ہمدوست ہے خدا کا دوست
قبول ہوتی ہے اِس کی علی الدّوام نماز
جو ہے حسینؓ کا دشمن اُسے کہاں ایمان
اگرچہ پڑھتا ہے وہ بھی برائے نام نماز"

شاؔد: "لال قلعہ کے اکثر لوگ حضرت شاہ فخر الدّین کے مُرید تھے۔ شاہ صاحب کا ۱۷۸۲ء میں وصال ہو گیا تھا اور آپ کا سالِ ولادت ۱۷۷۵ء ہے تاہم پھر بھی آپ نے بچپن میں شاہ صاحب کو ضرور دیکھا ہوگا۔ کوئی شعر اُن سے متعلق کہا ہو تو وہ بھی فرمائیے۔"

ظفؔر: "کیا خطر اُس کو راہِ دیں میں ظفؔر
رہنما جس کا فخرِ دیں ہو جائے"

شاؔد: "شاہ فخر الدّین کے سجّادہ نشین شاہ غلام قطب الدّین تو آپ کے پیر و مُرشد تھے اُن سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے کیا کچھ شعر کہے تھے؟"

ظفؔر: مُریدِ قطبِ دیں ہوں خاکپائے فخرِ دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں، اُن کا غلامِ کمتریں ہوں میں
مجھے تو خانقاہ و میکدہ [illegible]
ولیکن یہ تمنا ہے کہ اُن کا [illegible]
[illegible]

یہی عقدہ کشا میرے یہی ہیں رہنما میرے
سمجھتا اُن کو اپنا حامیِ دنیا و دیں ہوں میں

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
و لیکن بے شبہ اُن کا اک گدائے رہ نشیں ہوں میں"

شاد: "غلام قطب الدین کے تو ایک ہی بیٹے میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب تھے تا اور دہلی میں خواص و عوام سبھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُن سے متعلق بھی آپ نے کچھ اشعار تو ضرور کہے ہوں گے۔ زحمت نہ ہو تو وہ بھی فرمائیے!"

ظفر: "نظامِ خانۂ فخرِ جہاں تمہیں تو ہو
قیامِ سلسلہ و خانداں تمہیں تو ہو
نہ کیونکہ تم سے ہوں ظاہر صفاتِ قطب الدین
خدا رکھے تمہیں اُن کا نشاں تمہیں تو ہو

تمہارے در پہ جھکا کر سرِ ارادت خلق
کہے ہے کعبۂ امن و اماں تمہیں تو ہو

نثار تم پہ ہیں پروانہ ساں ہزاروں دل
کہ شمعِ محفلِ صاحب دلاں تمہیں تو ہو

تمہاری قوتِ باطن سے تقویت ہے مجھے
کہ میرے باعثِ تاب و تواں تمہیں تو ہو

بغیر آپ کے ہوں کیوں نہ جان و دل بے چین
کہ راحتِ دل و آرامِ جاں تمہیں تو ہو

ظفر کو چاہیے نصرت تری نصیر الدین
کہ اِس کے یار و مددگار یاں تمہیں تو ہو"

شاد: "اِن صوفیائے کرام کے جب آپ اتنے عقیدت مند تھے تو ظاہر ہے کہ آپ نے صوفیانہ شاعری بھی ضرور کی ہو گی۔ اِس ضمن میں جہاں پناہ! اپنے ارشادات سے بھی مستفید فرمائیے!"

ظفر: "اگر غفلت کا ہم پردہ اُٹھاتے اپنی آنکھوں سے
تو جو واں دیکھتے یاں دیکھ جاتے اپنی آنکھوں سے

چراغ و شمع میں کیا برق میں کیا اور شرر میں کیا
جہاں دیکھا وہاں اک جلوہ تیرے نور کا دیکھا

عالمِ صورت میں تو میں صورتِ آدم میں ہوں
عالمِ معنی میں ملین اور ہی عالم میں ہوں

نور تھا خیر البشر کا گو تھا ظاہر میں بشر
حق اگر پوچھو بشر ہی تھا بشر سے پیشتر

شاد: "اِس مقام پہ یہ بھی فرما دیجیے کہ آپ کا مذہبی نقطۂ نظر کیا تھا؟"

ظفر: "میری ملت ہے محبت، میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں، خواہ دیں داروں میں ہوں"

شاد: "عشق و محبت کے پرستار اور شاعر و تاجدار ہونے کی وجہ سے آپ نے بادہ آشامی تو خوب کی ہو گی حضورِ پُر نور!"

ظفر: "پیتے ہیں بادۂ گلرنگ اشکِ خوں سے ہم
کہ دل بجائے سبو، چشم ہے بجائے قدح"

شاد: "آپ کی حرماں نصیبی تو مسلم ہے لیکن کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی شراب نہیں پی؟"

ظفر: "خُم کے خُم پی گئے یارانِ سبُوکش لیکن
ہم کو اِس دَور میں ساقی نے نہ اک جام دیا"

شاد: "آپ طبعاً شراب کے خلاف تھے یا شراب نوشی کے اسباب ہی آپ کو میسر نہ آئے۔ اِس سلسلہ میں واضح طور پہ بتائیے کہ آپ کے جیتے جی صورتِ حال کیا تھی؟"

ظفر: "بجز خونِ دل، بجز دل بجز چشم و دلِ پُر خوں
نہ پاس اپنے سبُو گلگوں نہ ساغر ہے نہ مینا ہے
ظفر میخانۂ عالم میں ہم کو ایک مدت سے
نہ مستی کی ہوس، نے مے پرستی کی تمنا ہے"

شاد: "طوطیِ سخن امیر خسرو کے بھی تو آپ بہت متوالے تھے۔ اُن سے متعلق آپ نے کوئی شعر نہیں کہا؟"

ظفر: "اے ظفر ہیں [illegible] غلام طوطیِ ہندوستاں
کب مقابل ہوویں میرے عندلیبانِ چمن"

شاد: "آپ نے اپنے کلامِ بلاغت نظام میں اکثر ہندی بحروں کا جو استعمال کیا ہے غالباً وہ بھی امیر خسرو ہی کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اپنی ہندی شاعری میں آپ شوق رنگ تخلص فرماتے تھے نا؟ اپنی کسی ہندی غزل کے چند اشعار مرحمت فرمائیے اعلیٰ حضرت!"


پونڈز کے ۷ دن والے
حُسن افزا پلان کی بدولت
صرف ۷ دن میں انیتا کی جلد
کس طرح زیادہ صاف، نرم اور خوبصورت ہوگئی
۱
کالج کے سالانہ جلسہ میں ۷ ہی دن رہ گئے تھے۔ میں اپنی روکھی اور بے رونق جلد کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ اتنے میں بہن نے پونڈز کے ۷ دن والے حسن افزا پلان کی تعریف سُنی۔
۲
ہفتہ بھر ہر رات دو بار میں اپنے چہرے پر پونڈز کولڈ کریم لگاتی رہی۔ پہلی بار اوپری میل کچیل اور دن بھر کا میک اَپ صاف کرنے کے لئے۔
۳
پھر ایک ملائم ٹشو سے کریم کو پونچھ ڈالا۔
۴
اور دوسری بار کریم لگائی تاکہ مسامات کی اُن گہرائیوں میں جما ہوا میل صاف ہوجائے جہاں صابن کا جھاگ یا پانی نہیں پہنچ سکتا۔ یہی تو اس پلان میں افزائشِ حسن کا راز ہے!
Ponds
ساتویں دن، جلسہ میں میری جلد نہایت صاف اور ملائم ہوکر دمک رہی تھی!
اب میں پونڈز کولڈ کریم سے مسامات کی گہرائیوں تک جلد کو پابندی سے صاف کرتی رہتی ہوں تاکہ میری جلد ہمیشہ ملائم، صاف اور حسین بنی رہے!
پونڈز
کولڈ کریم
جلد کی صفائی کے لئے دُنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی کریم
چیسبرو پونڈز انکارپوریٹڈ
(محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے میں تشکیل شدہ)
P-7214

ظفر: "جن گلیوں میں پہلے دیکھیں لوگوں کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگوں پر سختی پڑی وہ گلیاں تھیں
ایسی انکھیاں میچے پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکتے
جن کی چالیں البیلی اور چلنے میں چھل بلیاں تھیں
خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس چاؤ سے پلیاں تھیں
تلخی اٹھائی موت کی چکھ کے خاک سب ان کر پاٹ گئی
جن کی باتیں میٹھی میٹھی مصری کی سی ڈلیاں تھیں
روز بہاراں لوٹتے تھے وہ جا جا کر جن باگن میں
شوق رنگ اب جو دیکھا واں نا پھول ہیں اور نہ کلیاں تھیں

شاد: "کبھی دوہے بھی تو آپ نے کہے تھے۔ کوئی دوہا بھی سنا دیجئے ؟"

ظفر: "میں کہتی تھی اپنے پیا کو راکھوں گی میں گھیر
وہ تو ایسے ہیں کو سدھا رے پل بھی لائی دیر"

شاد: "اچھا عالی جاہ! یہ بتائیے کہ جب آپ تخت و تاج کے مالک ہو گئے اُس وقت بھی بہت سے فریب کار لوگ آپ کے ارد گرد جمع تھے جو آپ کے خلاف نت نئی سازشوں کا کھیل دن رات کھیلتے رہتے تھے اور جن میں سے بیشتر لوگ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور ان کے باقاعدہ جاسوس تھے۔ آپ اُن خوشامدیوں کو پہچانتے تو یقیناً ہوں گے۔ اُن کے بارے میں آپ کا ردِ عمل کیا تھا ؟"

ظفر: "منہ کے میٹھے دل کے کڑوے اہلِ دنیا دیکھ لئے
جھوٹی موٹی کرتے خوشامد آگے ہماری منہ سے ہیں
دل میں بھرے ہیں اُن کے لاکھوں بغض و عداوت کین و نفاق
کرتے ظاہر اپنی اُلفت اور غم خواری منہ سے ہیں"

شاد: "یعنی آپ بخوبی سمجھتے تھے کہ اور تو اور آپ کے اکثر دوست بھی مارِ آستین ہیں"

ظفر: "مشہور بڑے دوست ہیں جو سب ہیں ہمارے
کرتے ہیں عداوت وہی مطلب ہیں ہمارے"

شاد: "۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا ولی عہد بہادر کی وفات کے بعد اپنی چہیتی بیگم نواب زینت محل کی تحریک پر جب آپ نے چاہا کہ شہزادہ جواں بخت کو ولی عہد مقرر کیا جائے لیکن آپ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قریش نے آپ کی خواہش کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ شرائط منظور کر لیں کہ آپ کے بعد لقبِ شاہی موقوف کر دیا جائے، صرف خطاب شہزادہ ہی باقی رہے اور زرِ پیشکش کی رقم بھی سوا لاکھ روپے سے گھٹا کر صرف پندرہ ہزار روپے کر دی جائے اور کمپنی نے مرزا قریش کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تو یہ افسوسناک خبر سُن کر آپ نے جو پُر درد نظم کہی تھی اور جو چند ہی گھنٹوں میں دلی کے کوچہ و بازار میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی اُس نظم کا کوئی شعر سنائیے۔"

ظفر: "اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نامِ سلطنت"

شاد: "بے شک قبلہ! آپ مغلیہ بادشاہت کے واقعی آخری چشم و چراغ ثابت ہوئے اور آپ کے ساتھ ہی نہ صرف ایک سلطنت کا بلکہ اُس نہایت خوب صورت تاریخی روایت کا بھی خاتمہ ہو گیا جسے اکبر، شاہجہاں اور جہانگیر ایسے عظیم شہریاروں نے آب و رنگ بخشا تھا۔"

ظفر: "مرے زوال سے جا کر کمال کو میرے
زوال یہ ہے تو ہوگا کمال کیا کیسا کہو!"

شاد: "بالکل بجا ارشاد فرمایا ظلِ اللہ۔ ہاں یاد آیا آپ نے دربارِ شاہی میں اپنے اجلاس کے لئے ایک گنگا جمنی ہشت پہل تخت بھی تو بنوایا تھا اور اس کا نام تخت ہوادار رکھا تھا لیکن تخت ہوادار پر آپ صرف ایک ہی بار رونق افروز ہو سکے۔ اُس کے بعد انگریزی سرکار کی طرف سے تخت پر بیٹھنے کی ممانعت ہو گئی کیونکہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کو آپ کے دربار میں کرسی نہیں ملی تھی اس لئے اُس نے اپنے دل کا غبار یوں نکالا علاوہ ازیں دہلی کے ریذیڈنٹ بھی کمپنی کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے بے حد زیادہ بے توقیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو براہِ راست حکومتِ برطانیہ سے رابطہ قائم کرنے کی بھی اجازت نہ دیتے تھے اور مجبور کرتے تھے کہ آپ ماتحت افسروں کے توسط ہی سے بات چیت کریں۔ اِن حالات میں آپ کے محسوسات کیا تھے ؟"

ظفر: "بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
چشمِ قاتل مری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسی اب ہو گئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی"

شاد: "اس حقیقت کا احساس تو آپ کو ہو گیا ہوگا کہ انگریز آپ کا تاج زمین پر جا رہتے ہیں۔ اس جبر و دستی کے بارے میں اُس وقت آپ نے کوئی شعر نہیں کہا ؟"

ظفر: "یہ کہہ دو شمع سے گُل گیر چھوڑنے کا نہیں
ارادہ اُس نے ترے تاجِ زر کا باندھ لیا"

شاد: "سبحان اللہ۔ اپنے آپ کو شمع اور انگریزوں کو گل گیر کہہ کر آپ نے بہت حسین وجمیل اور لاجواب اشاریت سے کام لیا ہے۔ آپ کے کلام میں دھیرے دھیرے جلنے سُلگنے اور پگھلنے کی جو کیفیت ملتی ہے اُس کے لحاظ سے شمع واقعی آپ کے کلام کی بہت واضح ترجمان ہے۔ اپنے کچھ اور ایسے اشعار سُنانے کی زحمت فرمائیے جس میں آپ نے شمع کے پردے میں اپنا حالِ زار بیان کیا ہو۔"

ظفر: "شمعِ محفل نے کہا رو رو کے شب گل گیر سے
کیا وبالِ سر یہ میرا تاجِ زر پیدا ہوا

جلا جلا کے کیا شمع ساں تمام مجھے
بس اور تو مرے سوزِ جگر سے کچھ نہ ہوا

ہوتے ہیں تیری بزم میں خوش کب شمع صفت ہم سوختہ جاں
جلنے شام کو آتے ہیں اور روتے سحر کو جاتے ہیں

شمع ساں لگ اُٹھے زباں کو آگ
گر کروں سوزِ دل بیان اپنا"

شاد: "انگریزوں کے ہاتھوں میں آپ اتنے بے بس تھے کہ تلخ نوائی سے کام لیتے ہوئے شہر آشوب ایسی کسی براہِ راست نظم کی تو آپ سے توقع ہی نہیں کی جا سکتی لیکن شمع کے علاوہ بعض دوسری علامتوں اور دوسرے اشاروں کا سہارا لے کر اپنی دلی کیفیت کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے بعض شعروں میں باہمی کوشش اور آزادی کے امکانات کی طرف اشارے تو یقیناً آپ نے کئے ہوں گے۔ اپنے ایسے شعروں سے کچھ اشعار سُنائیے۔"

ظفر: اگر باندھیں مُرغانِ پر بستہ ہمت
تو لیں کھول آپس میں سب مل کے پھندے

گر اسیروں کو یونہی صیاد تو پھڑکائے گا
تو نکل بھاگیں گے وہ اِک دن قفس کو توڑ کر

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غُل سے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

بہار آئی اسیرانِ قفس آپس میں کہتے ہیں
پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

پاسِ خاطر تھا اسیری میں ہمیں صیاد کا
ورنہ ہوتا دام سو ٹکڑے اگر پر مارتے

قفس کے ٹکڑے اُڑا دے جو پھڑک کے اے صیاد
اگرچہ دم نہیں مُرغِ شکستہ بال میں کچھ

قفس کے ٹکڑے اُڑا دوں تڑپ تڑپ کر آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم قفس یوں ہے

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے
خدا کبھی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

جو پھڑکے مُرغِ گرفتار اک ذرا صیاد
چمن میں توڑ کے یہ تیرے جال کر پہنچے

شاد: "علی الاعلان تو نہیں لیکن اپنی مخصوص محفلوں میں آپ انگریزوں کی بدگوئی تو ضرور کرتے ہوں گے؟"

ظفر: "بُرائی یا بھلائی گو ہے اپنے واسطے لیکن
کسی کو کیوں کہیں ہم بد کہ بدگوئی سے کیا حاصل"

شاد: "جب آپ پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ آپ افغانستان اور روس سے ساز باز رکھتے تھے اور انگریزوں کے خلاف اُن سے مدد کے طلبگار تھے اور آپ ہی کے ایما پر مولویوں نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا تو آپ نے اپنی کیفیتِ باطنی کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شعر بھی کہا؟"

ظفر: "حاسدوں نے ظفر مرے سر پر
پوچھ بہتان دھر کے کیا پایا"

شاد: "اور غدر کے بعد دہلی کا کیا حال تھا؟"

ظفر: "نہیں حالِ دلی سُنانے کے قابل
یہ قصہ ہے رونے رُلانے کے قابل
اُجاڑے لٹیروں نے وہ قصر اس کے
جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل"

شاد: "بالآخر آپ کو جب بغاوت کے جرم میں انگریزوں نے گرفتار کرلیا اور جواں بخت اور زینت محل کے ساتھ آپ کو رنگون بھیج دیا تو شہر بدر ہوتے ہوئے آپ نے کیا غزل فرمائی تھی؟"

ظفر: کہاں خلقت عزیزو! زیرِ چرخ پیر پھرتی ہے
یہ فانوسِ خیالی میں ہر اک تصویر پھرتی ہے
نہ چرخ آسیا ہوں نے بھنور ہوں نے بگولا ہوں
مجھے تو کیوں لئے اے گردشِ تقدیر پھرتی ہے
تمہیں آتا ہے زیرِ چرخ خواب اے غافلو! کیوں کر
کہ شب کو کہکشاں کھینچے ہوئے شمشیر پھرتی ہے
اُترتے ہیں گلے میں گھونٹ آبِ زندگانی کے
چھری جب حلق پر قاتل دمِ تکبیر پھرتی ہے
ظفر کو منزلِ مقصود پر تقدیر نے پہنچی
کدھر بھٹکی ہوئی یہ عقلِ بے تدبیر پھرتی ہے

شاد: "زمانۂ غدر کے بعد کی کہی ہوئی کسی اور غزل کے اشعار بھی یاد ہوں تو فرمایئے۔"

ظفر: "گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیا کیا اِن پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سُنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
وے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں اُن کے غبار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے
نہ دبایا زیرِ زمیں اُنہیں نہ دیا کسی نے کفن اُنہیں
نہ ہوا نصیب وطن اُنہیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے
سبھی جا وہ ماتم سخت ہے کہوں کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
یہ وبال تن پہ ہے سر مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا مجھے اپنی زندگی بار ہے
تجھے اے ظفر بھلا کس کا ڈر تو خدا کے فضل پہ رکھ نظر
تجھے ہے وسیلہ رسولؐ کا وہ جو تیرا حامیٔ کار ہے"

شاد: اور رنگون میں رہ کر آپ کیا محسوس کرتے رہے؟"

ظفر: "جو آگیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں"

شاد: "وہاں جب دہلی کی یاد آتی تھی تو آپ کیا سوچتے تھے؟"

ظفر: "اے وائے انقلابِ زمانہ کے جور سے
دِلّی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی"

شاد: "تو گویا آپ وہاں جب تک جئے دہلی کی یاد میں تڑپتے ہی رہے؟"

ظفر: "کیوں نہ تڑپے وہ ہما اب دام میں صیاد کے
بیٹھنا دو دو پہر جب تخت پر جاتا رہا"

شاد: "یعنی رنگون میں آپ کی بے چینی کا باعث محض تخت کی حسرت اور بادشاہت کا ارمان تھا"

ظفر: "یہی حسرت تھی کہ گھر پیرا مینے میں رہے
بنا رنگون میں ارماں مرے سینے میں رہے"

شاد: "اللہ اللہ! واقعی زندگی میں آپ کو خوشی تو مطلقاً نصیب نہیں ہوئی"

ظفر: "کھل کھلا کر ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے
دل ہمارا خوش و خرّم نہ ہوا پر نہ ہوا"

شاد: "آپ کی بدقسمتی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے سرکار! کہ جہاں انگریزوں نے آپ کو سلطنت سے محروم کیا وہاں اپنے آپ کی شاعری سے بھی منحرف ہو گئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے تو "آبِ حیات" میں یہاں تک لکھ دیا کہ۔

"آپ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سراپا ذوق دہلوی کے ہیں۔"

حالانکہ بقولِ سر سید احمد ذوق آپ کا کلام کیا لکھتے۔ قلعہ کے تعلق سے خود اُن کو اردو زبان آگئی اور مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ قلعے کے ایک مشاعرے میں توفی البدیہہ آپ نے پوری غزل کہہ دی تھی۔"

ظفر: "غزل یہ ایک کیا کتنی ہی ایسی پھینک دیں لکھ کر
ظفر ہم لے کے قرطاس و قلم پیچھے نہیں پڑتے"

شاد: "قبلہ! یہ تو حقیقت ہے کہ جو گداز اور درد بینی اور جو موسیقیت اور سلاست آپ کا طرۂ امتیاز ہے وہ ذوق کے کلام میں سرے سے مفقود ہے۔ اس طرح کے اشعار تو آپ اور صرف آپ ہی کہہ سکتے تھے کیونکہ اُن میں

آپ کی زندگی اور شخصیت کا سچا عکس ہے۔ یا یہیں کہنا ذوق یا کسی دوسرے اُستاد کے مذاقِ سخن کے بس کی بات نہ تھی۔

خود فراموش ہوں اتنا کہ اگر آپ کو بھی
دیکھ پاؤں تو یہ جانوں کہ کہیں دیکھا ہے

مجھ سے کیا پوچھتے ہو تم ہی سے پوچھو یہ
[illegible] ہوں کہ کوئی شہر اور بھی ہے

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

پھرتے ہیں اے دل دیدۂ پُر آب میں یوں
جلا کے چھوڑ دے جیسے کوئی بھنور میں چراغ

وصال بھی جو میسر ہوا تو خوش نہ ہوا
غمِ فراق کے ڈر سے یہ مبتلائے فراق

"بہرکیف یہ فرمائیے کہ ذوق دہلوی کے بارے میں ذاتی طور پر آپ کی کیا رائے تھی؟"

نقش: تیرا مذاقِ شعر ظفر جانتا ہے کون
اُستاد ذوق تھا ترا واقف مذاق سے

شاد: "[illegible] ذوق آپ کے مذاق سے واقف ہوں گے لیکن معاف کیجئے آپ کے ہم مذاق ہرگز نہ تھے۔ آپ کے اور اُن کے رنگِ سخن میں بہت فرق ہے۔ آپ کے دواوین میں ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے جن میں صرف لفظی بازیگری ہے لیکن وہ کسی طرح بھی آپ کے طرزِ سخن کے ترجمان نہیں ہیں۔"

ظفر: "طرزِ سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے
اُس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا"

شاد: "بے شک! لیکن اب ذرا یہ بھی فرما دیجئے کہ خود آپ کی نظر میں آپ کے کلام کا نمایاں وصف کیا ہے؟"

ظفر: "ظفر کلام میں تیرے عجیب صفائی ہے
کہ ہر سخن ترا ذوق خوش آپ سے اچھا"

شاد: "صفائی سے آپ کی مراد روانی سے ہے نا؟"

ظفر: "خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو
ترا ہر شعر تر ہر بحر میں بحر السانی ہے"

شاد: "روانی شعر کے حسن میں اضافہ ضرور کرتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ شعر کا معیار آپ صرف روانی ہی کو تو نہ سمجھتے ہوں گے حضور والا؟"

ظفر: اے ظفر چاہیئے ہاں لطفِ سخن میں ایسا
کہ جسے سُن کے ہوں سب اہلِ معانی محظوظ

شاد: "محظوظ ہی نہیں بلکہ بیک وقت محظوظ و مغموم۔ آپ کی تمام شاعری بالآخر اسی معیار پر پوری اترتی ہے۔ زحمت نہ ہو تو اپنی [illegible] پسندیدہ غزل کے چند اشعار عطا فرمائیے جو آپ کے حزن و ملال کے جذبات کی ترجمان ہو۔ یہ جذبات آپ کے مخصوص لب و لہجہ [illegible] کر یقیناً میری رائے کی تصدیق کر سکیں گے۔"

ظفر: "وہ وفا ہماں رہا سے ہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
تم کو کیا تنہائی میں ہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
وہ بے پروا اُن کی بلا سے کوئی جئے یا کوئی [illegible]
ظلم و ستم عشاق پہ ہر دم چاہتے ہیں سو کرتے [illegible]
کرتے کبھی ہیں جیب دری ہم کرتے کبھی [illegible]
گھر ہے جو تم بن خانۂ ماتم چاہتے ہیں سو کرتے [illegible]
ہم سے کسی کو کام ظفر [illegible]
پھرتے [illegible] ہیں"

شاد: "ایسا نظر آتا ہے حضور [illegible]
نباہ خوش اسلوبی کے ساتھ ہو سکتا [illegible]"

ظفر: "خوب [illegible]
[illegible] والم کے"

شاد: "جیتے جی آپ غم سے متعلق [illegible]"

ظفر: "غم مرا غم [illegible]
غم کا غم خوار ہوں [illegible]"

شاد: "اور اب مرنے کے بعد آپ کیا [illegible]"

ظفر: "اے ظفر سوچئے [illegible]
سو دنیا مست ہوئی [illegible]"

شاد: "اس دنیا اور اس دنیا کے [illegible]"

رائے ہے ؟"

ظفر: "صرصرِ حرص وہوا سے ہے مکدر عالم
اے ظفر سب کے پڑی ہے رُخِ ادراک پہ گرد"

شاد: "تو کیا آپ کو دنیا میں ایک بھی بے غرض انسان نہیں ملا ؟"

ظفر: "آشنا ہیں جتنے ہیں اپنی غرض کے آشنا
خوب دیکھا ہم نے اپنا آشنا کوئی نہیں"

شاد: "لاکھ خود غرض سہی لیکن پھر بھی اِس دنیا میں مزے تو ہیں نا۔"

ظفر: "دنیا کا ہے مزہ ظفر انجامِ کار زہر
میٹھا سمجھ کے لوگ اسے للچا گئے تو ہیں"

شاد: "آپ نے تجربے کا حاصل کیا ہے، انسان کو دنیا میں کیسے زندگی
بسر کرنی چاہیئے ؟"

ظفر: "انسانہ اپنے جامے سے باہر نکل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل"

شاد: "آخر میں بیاد رہ بتا دیجئے کہ آپ کے نزدیک بہترین انسان کی
تعریف کیا ہے ؟"

ظفر: "ظفر آدمی اُس کو نہ جانیئے ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا"

درد کی جکڑ سے چھٹکارا پائیے

جوڑوں کی اکڑن
سوجن اور جلن
موچ
پٹھوں کے درد
کے لئے

میتھل سیل سیلیٹ والی

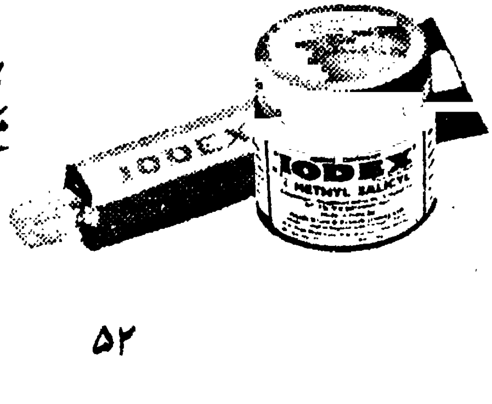
آئیوڈیکس*

استعمال کیجئے



آئیوڈیکس انتہائی ملائمت سے جلد کے اندر سرایت کرکے پٹھوں اور رگوں پر اثر کرتی ہے اور درد کو تیزی سے دور کرتی ہے۔ جوڑوں کی اکڑن یا سوجن اور جلن سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس آئیوڈیکس ملئے۔ آئیوڈیکس میں شامل خاص اجزاء کی وجہ سے درد جلد دور ہوجاتا ہے اور بڑا سکون ملتا ہے۔ کچے زخم اور گھاؤ کے لئے آئیوڈیکس بیلین استعمال کیجئے۔ آئیوڈیکس سے داغ دھبے نہیں پڑتے۔

ہو درد اور ٹیس جہاں
ملئے آئیوڈیکس وہاں



* رجسٹرڈ ٹریڈ مارک

اسمتھ کلائن اینڈ فرینچ کی تیار کردہ

ریہرسل

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم۔اے

شعبۂ سیاسیات، گورنمنٹ کالج، جاورہ (مدھیہ پردیش)

۲۶ مارچ ۶۸ء

برادرِ محترم! آداب و تسلیمات

اب تبدیل ہوکر جاورہ آپہنچا ہوں۔ اپنے خاندان کے تقریباً سبھی افراد کی قربت اور موجودگی نے پچھلے تمام حادثات کو فراموش کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ویسے ماضی کے تمام واقعات اب بھی پردۂ تصور پر فلم کی طرح نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں اور میں اُن یادوں میں گُم ہو کر رہ جاتا ہوں ـــــ جاورہ، رتلام کے پہلو میں کھنڈوہ، اجمیر ریلوے مین لائن پر قدیم تہذیبی، ادبی اور ثقافتی مرکز رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ادب یہاں کے لوگوں کا اوڑھنا بچھونا تھا، لیکن اب تو صرف یادوں کا سرمایہ ہے جو عہدِ رفتہ کی عظمتوں کا امین ہے۔ چند حضرات ہیں جو اُس عہد کی یادگار ہیں اور اِس دَور میں ادب کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ کچھ حضرات اِس دَور کی نمائندگی بھی کرتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی سُست گامی اُنھیں منزل میں دلچسپی نہ لینے دے گی۔ خیر! ـــــ مشہور حسین ٹیکری کے وجود نے اِسے ایک مذہبی مرکز بھی بنا دیا ہے ـــــ پچھلے دنوں دِلّی میں آپ کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ سونی پت جا چکے ہیں ـــــ ایک تازہ کہانی "ریہرسل" پیشِ خدمت ہے ...

آپ کا بھائی ـــــ ظفر احمد نظامی

پروفیسر کمار ساری رات نہ سو سکا تھا اور اب بھی بہت پریشان تھا۔ بار بار اپنی آنکھوں سے عینک اُتارتا، اُن کے شیشوں کو صاف کرتا اور پھر اُس کے فریم کے ہُکوں کو کانوں پر چڑھا لیتا۔ کبھی کسی کتاب کو شیلف سے اُٹھا کر یوں ہی پڑھنے لگتا اور پھر چند لمحوں کے بعد اُسے میز پر چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا۔ کبھی کھڑکی پر کُہنیاں ٹِکا کر باہر کی طرف جھانکتا اور دُور خلاؤں میں گھُور کر اُفق کے بے معنی نقوش پڑھنے کی کوشش کرتا اور پھر اچانک وہاں سے ہٹ کر بچھونے پر دراز ہو جاتا جیسے بہت تھک گیا ہو اور آرام کرنا چاہتا ہو۔ کبھی اُٹھ کر ہاتھوں پر سر رکھے سوچنے لگتا۔ جیسے کسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے پریشان ہو۔ صبح سے وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نِکلا تھا۔ اُس نے وہیں ناشتہ کر کے باہر جانے کی تیاری کی لیکن اچانک پروگرام تبدیل کر کے سلیپنگ گاؤن پہن لیا۔ اُس نے نہ جانے کتنے زاویے تبدیل کئے ہوں گے۔ کِسی انداز سے اُسے اطمینان و سکون حاصل نہ ہو سکا اور اب وہ بہت غمگین و تعجب خیز انداز میں بار بار جیب سے ایک رُقعہ نکال کر پڑھتا اور پھر کسی سوچ میں غرق ہو جاتا۔ وہ ایک ایک لفظ کو کئی کئی بار پڑھ رہا تھا

"میری زندگی کے مالک! میں بیمار ہوں۔ زندگی کا بھروسہ نہیں رہا۔ آخری وقت تم سے ملاقات کر کے معافی مانگنے کے لئے زندہ ہوں۔ اپنی مصروف زندگی میں سے چند لمحے مجھے دے کر میری نجات کا باعث بن جاؤ ورنہ میری رُوح ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔ میری پچھلی لغزشوں کا خیال صرف کچھ دیر کے لئے دل سے نکال دو اور محبت کی اُسی ایک نظر سے مجھے دیکھ لو جس سے تم نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں سخت اذیت میں مبتلا ہوں۔ کاش تمھارے دل تک میری آوازِ التجا بن کر پہنچ سکے!"

معافی کی طلب گار

تمھاری ـــــ شیلا

پروفیسر کمار نے پرچہ جیب میں رکھ لیا اور ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گیا جو اُس کے تصوّر کے پردے پر اُبھر آئے تھے اور واضح ہو کر اب اُس کی آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے ـــــــــــ

آج سے تین سال پہلے شیلا سے ملاقات ہوئی تھی جب اُس نے یونیورسٹی میں ایک چیرٹی شو رکھ کر سیلاب زدگان کی امداد کے لئے چندہ جمع کیا تھا۔ شیلا اُس وقت فلم انڈسٹری کا اُبھرتا ہوا ستارہ تھی۔ ہر طرف اُس کے حُسن اور اُس کی اداکاری کے تذکرے ہوتے۔ لوگ اُس کی فلمیں دیکھنے کے لئے سنیما کے ٹکٹ دو گنے داموں میں بلیک سے خرید کر بھی خوش ہوتے۔ وہ بہت اچھی رقاصہ بھی تھی۔ فلم میں نمایاں رول ادا کرتے کرتے ہیروئن بن چکی تھی۔ پروڈیوسر اُسے اِس لئے بھی زیادہ پسند کرتے کہ وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اداکارہ تو تھی ہی رقاصہ کے رول سے بھی انصاف کرتی۔ اِس سے فلم کے بہت سے مصارف کم ہو جاتے۔ وہ فن کی پرستار تھی اور اُس میں کھو جانا چاہتی تھی۔ وہ جس رول میں بھی آتی مکمل فن کار کے رُوپ میں اُس کی تکمیل کرتی۔ کوئی خامی اُس کی اداکاری میں محسوس نہ ہوتی اور کمار بھی ریلیف فنڈ کے لئے چیرٹی شو میں اُسے مدعو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ صرف شیلا کے نام ہی سے اِتنے ٹکٹ فروخت ہو گئے کہ منتظمین حیران رہ گئے۔ شو بہت کامیاب رہا۔ کامیابی کے ساتھ collection بھی تخمینہ سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کے عہدیداران نے کمار کی بہت تعریف کی تھی۔ شیلا کو اُس کے معاوضے کی رقم دی جانے لگی تو اُس نے سب کے سامنے کمار سے یوں ہی رسماً کہہ دیا۔

"اِس رقم کو بھی ریلیف فنڈ میں دے دیجئے۔ میں تو صرف آپ کی وجہ سے آگئی تھی۔"

اور اُس دن سے یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ شیلا اور کمار بہت قریب ہیں۔ حالانکہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن اُس رات کمار کو نیند نہیں آئی۔ وہ شیلا کے اِس رسمی جملے کو مفہوم و معانی کا ملبوس پہنانے میں مصروف رہا۔ اُس نے کئی بار قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنا عکس بھی دیکھا۔ وہ نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ قابل بھی تھا۔ معقول آمدنی رکھتا تھا۔ شہرت بھی کافی تھی۔ اُسے کبھی کبھی اپنے عکس سے طنزیہ آواز آتی۔

"وہ تمھیں بے وقوف بنا گئی ہے، اُس کے لئے تم سے بہتر ہزاروں آدمی موجود ہیں۔"

لیکن پھر دل کی آواز اِس پر غالب آتی اور وہ اِس آواز میں گُم ہو کر کھو گیا۔

دوسرے دن جب وہ یونیورسٹی پہنچا تو سب کی نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے دوست اُس کی خوش بختی پر اُسے مبارکباد دے رہے تھے۔ اُس کے ساتھی نازاں تھے۔ کچھ اُس پر رشک کر رہے تھے اور کچھ حسد۔ طلباء اُس کی طرف اشارہ کر کے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ لڑکیاں بھی کنکھیوں سے اُسے تک رہی تھیں۔ کچھ ایسی بھی تھے جن کے ہونٹوں پر معنی خیز مُسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ پڑھانے میں اُس کا دل نہیں لگا۔ اُس کی نظر بار بار دیوار پر چسپاں اُن پوسٹروں سے چپک کر رہ جاتی جو چیرٹی شو کے سلسلے میں لگائے گئے تھے اور جن پر شیلا کی تصویر بہت نمایاں تھی۔ اُس کے دل میں گُدگُدی ہونے لگی اور وہ شیلا سے ملاقات کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ فون پر شیلا کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شیلا کے سکریٹری نے فون ریسیو کیا۔ اُس نے شیلا سے ملنے کے لئے وقت مانگا تو فوراً ہی شیلا خود فون پر آپہنچی۔ اُس نے ریلیف فنڈ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے اُسے مبارکباد دی اور مزید امداد کے لئے شکریہ ادا کرنے کی غرض سے ملنے کا وقت طلب کیا۔ شیلا نے کہا کہ اُسے وقت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی وقت بھی آسکتا ہے لیکن پھر اصرار پر شام کا وقت طے ہوا۔

وہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ شیلا نے اپنے دربان کو غالباً پہلے سے ہدایت دے رکھی تھی اِس لئے اُس نے معمولی سی چھان بین کے بعد بنگلہ میں داخلے کی اجازت دے دی۔ شیلا نے مُسکراتے ہوئے اُس کا خیر مقدم کیا۔ چائے پر کوئی خاص بات نہیں ہوئی اُس نے اپنے بارے میں کچھ باتیں کیں۔ اِس طرح دونوں ایک دوسرے کو جاننے لگے۔

پھر ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کمار اُسے شوٹنگ کے لئے اسٹوڈیو تک چھوڑنے بھی جاتا اور لینے بھی۔ اِن کی ملاقاتوں کے چرچے عام ہو گئے تھے۔ فلمی رسالوں نے تو اِن کی شادی کی افواہ تک چھاپ دی۔ شیلا نے اِس کی تردید کر دی تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے اور شیلا تو کمار کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔ اُس نے شیلا سے شادی کے خواب دیکھے اور ایک درخشاں مستقبل کے تصوّر میں کھو گیا۔ وہ جب بھی شیلا کے آگے شادی کی پیشکش کرتا وہ ٹال جاتی۔ آخر ایک دن اُس نے صاف بات کر لی۔

"آخر یہ ڈرامہ کب تک چلے گا شیلا؟"

"جب تک ہم دونوں اِس کے کردار ہیں!" اُس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

"تو کیا میں نا اُمید ہو جاؤں؟"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"پھر کیا سمجھوں؟"

"جو تمھارا جی چاہے!"

"تم شادی سے اِتنا ڈرتی کیوں ہو؟"

"شادی فلمی زندگی کی ترقی کے راستوں میں ایک دیوار ہے!"

"پھر یہ زندگی کب تک چلے گی؟"

"جب تک چل سکے!"

"تم کبھی شادی نہ کروگی؟"

"یہ بھی میں نے نہیں کہا۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"کچھ بھی نہیں!!"

اِن باتوں کا سلسلہ چلتا رہا شیلا اُس کی پیشکش ٹھکراتی رہی۔ وہ اِس بات پر مُصر تھی کہ شادی ضروری نہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ شادی کے بعد اُس کی قدر کم ہوجائے گی۔ پروڈیوسر اور عوام شادی شُدہ اداکاراؤں کو ترجیح نہیں دیتے۔ اسی لئے اکثر کامیاب اداکارائیں بُوڑھی ہوجاتی ہیں لیکن شادی نہیں کرتیں۔ اُس کا یہ خیال بھی تھا کہ شادی کے بعد وہ فلمی دُنیا کو اِتنا وقت نہ دے سکے گی اور پھر وہ سوچتی تھی کہ صرف ایک شخص کے سہارے زندگی گُزارنا حماقت ہے۔ کمار پر حقیقت آشکار ہوگئی لیکن ہمت نہ ہارا۔ اُس نے اُس کی ہر فرمائش کی تکمیل کے وعدے کئے۔ حالانکہ اُسے شیلا کی دوستی بہت گراں پڑ رہی تھی۔ اُس کے والدین اُس سے ناراض تھے۔ یونیورسٹی کے طلباء بھی زیادہ متوجہ نہیں رہے تھے اور بیشتر اساتذہ تو اُس سے حسد رکھتے تھے۔ اُس کی اخلاقی پستی کا مذاق اُڑا کے اسے یونیورسٹی اسٹاف سے علیحدہ کرنے کی تجاویز رکھنے لگے لیکن اُس نے کوئی پروا نہ کی اور آخر ایک دن وہ کامیاب ہوگیا۔ شیلا شادی کی تجویز کے سامنے جھک گئی۔

اُس رات بھی کمار کو نیند نہ آئی۔ وہ خیالوں کے جال بُنتا رہا اور خوابوں کے نشے میں گُم رہا۔ وہ سوچتا کہ شادی کے بعد مُلک اور بیرونِ مُلک کا ہر شخص اُسے جاننے لگے گا۔ اب تک اُس کی عزت اور شہرت صرف طلباء اور یونیورسٹی کے اسٹاف تک محدود تھی۔ اب وہ دُنیا کے جانے پہچانے لوگوں کی صف میں ہوگا۔ شادی کی تصویریں دُنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوں گی۔ ہر شخص اِن پر رشک کرے گا۔ وہ شہرت کی اُس بلندی کو چھو لے گا جہاں تک اُس کی پہنچ ناممکن تھی۔

اور ایک دن شیلا نے کمار سے اپنی شادی کا اعلان کر دیا۔ اُس نے یہ سب کچھ اپنی سینئر اداکاراؤں کے مشورہ سے کیا تھا جنھوں نے اُسے رائے دی تھی کہ اُسے کمار سے ضرور شادی کر لینی چاہیئے کیونکہ فلمی دُنیا میں اداکارہ کی قدر اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک اُس نے حُسن اور جوانی کی دہلیز سے پاؤں باہر نہ رکھا ہو۔ اِس کے بعد اُسے کوئی پُوچھتا بھی نہیں۔ اِسی لئے وہ تیار ہوگئی اور اُس نے کمار کو اپنے مستقبل کے لئے اپنا لیا اور پھر شادی بھی ہوگئی۔ کئی دن تک زبانوں پر انھیں کے تذکرے رہے۔ کمار اِس شادی کو شیلا کا احسان سمجھ رہا تھا۔ وہ اُس کا احسانمند تھا اور شادی کی یہ سُنہری رسم اُس کے لئے اتنی مسرتیں لے آئی تھی کہ وہ اُن کا شمار نہیں کرسکتا تھا۔ عزت، شہرت، اطمینان اور غالباً سب کچھ!!

کچھ دن ڈھنگ سے بیتے۔ شیلا اور کمار اپنے مُلک سے باہر ہنی مون مناتے رہے۔ شیلا کمار کے اشاروں پر چلتی رہی اور کمار اُس کی ہر خواہش کی تکمیل کرتا رہا۔ واپسی کے بعد شیلا نے پھر اسٹوڈیو اور شوٹنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کمار اُس کی اِس مصروفیت کو اچھا ہی سمجھتا رہا۔ وہ اُس کے ساتھ پارٹیوں میں شریک ہوتا، شوٹنگ پر جاتا اور اسٹوڈیو کی سیر کرتا۔ لیکن پھر شیلا زیادہ تر مصروف رہنے لگی۔ وہ اپنا بیشتر وقت فلمی دُنیا کی نذر کر دیتی اور ہر شام کسی بار میں۔ رات گئے تھک ہار کر گھر پہنچتی اور پھر سو جاتی۔ کمار اُس کا برابر خیال رکھتا رہا۔ ایک دن کمار نے پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا لیکن شیلا نے مصروفیت کا بہانہ کر دیا۔ کمار اپنے احباب کے ساتھ جب پکنک پر پہنچا تو اُسے بے حد حیرت ہوئی کہ شیلا بھی کسی کے ساتھ پکنک منانے آئی ہوئی تھی۔ اُس نے کمار کو دیکھتے ہی کہا۔

"معاف کرنا ڈیر! میں اپنے دوستوں کے اصرار کو رد نہ کر سکی اور مجھے یہاں آنا پڑا۔ تمھیں فون کیا تھا لیکن تم ملے نہیں۔"

اور کمار نے اُسے ایک معمولی بات سمجھ کر ٹال دیا۔

ایک دن کمار نے شیلا کو بتایا کہ اُس کی سالگرہ کی پارٹی ہے۔ وہ اسٹوڈیو سے ذرا جلد ہی لوٹ آئے۔ اِس جشن میں اُس نے بطورِ خاص اپنے والدین کو بھی مدعو کر لیا تھا اور اُنھوں نے اُس کی خطاؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ دعوت منظور کر لی تھی۔ لیکن پارٹی میں شیلا شریک نہ ہوسکی۔ اُس نے فون پر بھی کوئی اطلاع نہ دی۔ پارٹی ختم ہوگئی۔ کمار کے والدین اور احباب بھی چلے گئے۔ سب نے شیلا کی عدم شرکت پر حیرت کا اظہار کیا۔ بہت رات گئے شیلا نشے میں چُور گھر میں داخل ہوئی۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھیں متورّم تھیں۔ اُس نے کمار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے تم اب تک جاگ رہے ہو! سوئے نہیں؟ مجھے راجن کے یہاں پارٹی میں دیر ہوگئی۔" اور وہ بستر پر گر گئی اور کمار کو محسوس ہوا کہ وہ تو جاگ رہا ہے لیکن اُس کی قسمت سو گئی ہے! شیلا نے اُسے اُس کی سالگرہ پر مبارکباد دی اور نہ پارٹی میں شریک نہ ہونے پر افسوس کا اظہار ہی کیا۔

وہ ساری رات جاگتا رہا۔ اُسے نیند نہ آئی۔ وہ سوچتا رہا اپنی تقدیر، اپنے مستقبل اور اپنی زندگی کے بارے میں۔ لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور پھر وہ سو گیا۔ صبح جب اُٹھا تو شیلا اسٹوڈیو جا چکی تھی۔ پھر تو یہ معمول ہوگیا کہ جب وہ اُٹھتا تو شیلا جا چکی ہوتی اور واپس اُس وقت ہوتی جب وہ سو جاتا۔ وہ جلد اُٹھ جاتا تو شیلا سوتی رہتی اور جب وہ شام کو واپس آتا تو شیلا نیند کی آغوش میں

جلوے

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں ——— داغ

طور پر حضرتِ موسیٰ جو گرے غش کھا کر
جلوۂ یار بچارا ابھی دیکھا کیا ہے ——— نامعلوم

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا
کیا کلیجہ ہے تماشائی کا ——— داغ

ٹھکرا کے بڑھ گئی نگہِ بے نیازِ عشق
جلوے ہزار بار وہ دکھلا کے رہ گئے ——— نامعلوم

ہے کتنی جلوہ ساز تری جلوہ گاہ بھی
اک موجِ حسن بن گئی میری نگاہ بھی ——— نامعلوم

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہنکاری ایم اے۔ آگرہ

جا چکی ہوتی۔ پھر شیلا سے ملاقات بھی کبھی ہی کبھی ہونے لگی۔ کبھی کبھی دن وہ ایک دوسرے سے نہ ملتے تھے۔ ایک دن ایک تقریب میں دونوں مل گئے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے لیکن شیلا کچھ کھنچی کھنچی سی تھی جیسے اُس سے ملتے ہوئے اُسے شرم محسوس ہو رہی ہو۔ اُس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ اُس نے یوں ہی کچھ باتیں کیں اور پھر اپنی سیٹ پر چلی گئی۔ کمار اپنی نشست پر تنہا تھا۔ اُس نے لوگوں کو کہتے ہوئے سُنا کہ "یہی شیلا جی کے پتی ہیں" اور وہ کسمسا کر رہ گیا۔ اُسے اپنی انفرادیت ختم ہوتی دکھائی دی۔ وہ پروفیسر کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا، یونیورسٹی کے ممبر آف دی اسٹاف کے لقب سے نہیں پکارا جاتا۔ اب وہ صرف شیلا کا پتی رہ گیا ہے۔ اُس نے اپنے گرد اندھیرا محسوس کیا اور گھر پہنچتے پہنچتے واقعی اندھیرا ہو چکا تھا۔

آہستہ آہستہ یہ خاموشی اختلافات کی حدوں تک جا پہنچی۔ شیلا کمار کو بات بات پر ڈانٹ دیتی اور اُس کا ذرا بھی خیال نہ کرتی۔ جب بھی وہ گھر کے ملازموں سے اُس کے بارے میں پوچھتا تو اطلاع ملتی کہ وہ کسی کے ساتھ ریہرسل کر رہی ہے۔ اب تو کمار کو اُس کی ہر ادا ریہرسل اور ہر بات مکالمہ ہی معلوم ہوتی۔ اُس نے اُس سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا اور علیحدہ رہائش اختیار کر لی۔ اخباروں نے پھر اِس خبر کو اُچھالا تھا لیکن وہ اب مطمئن ہو چلا تھا۔

اُس کی ذہنی کشمکش میں خدا کی ہوئی تھی کہ کیسے پھر شیلا کا پرچہ ملا۔ صبح اُس کا فون بھی آیا تھا لیکن اُس نے بات کرنا بھی پسند نہ کیا۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کو بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ بیتے ہوئے زمانے کو صرف ایک خواب کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی شُدہ کر کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا تھا —— وہ ایک ایسے گھر کا تصور کرتا تھا جہاں محبت کرنے والی پھولوں سی بیوی ہو، بچے ہوں اور شام کو وہ گھر پہنچے تو سب کو اپنا منتظر پائے لیکن اب پھر اُس کی خیالی دُنیا میں زلزلہ آگیا۔ وہ شیلا سے ملنے کے لئے جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اُسے اسی طرح کی اداکاری کر کے ستاتی رہی تھی اور اب کئی دنوں سے وہ مختلف بہانوں سے اُسے بلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت غور کرنے کے بعد وہ اُٹھا، گاڑی میں بیٹھا اور اُس کا رُخ شیلا کے بنگلے کی جانب موڑ دیا۔ بنگلے میں وہ سیدھا اُس کے کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ شیلا کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ سونے کی ایکٹنگ کر رہی ہو۔ قریبی کمرے سے کچھ آوازیں اُبھر رہی تھیں جو یقیناً فلم ڈائرکٹروں اور اداکاروں کی ہی ہوں گی۔ اُس نے سوچا ضرور شیلا انھیں میں مصروف رہی ہوگی اور اُس کی کار کی آواز سُنتے ہی لیٹ گئی ہوگی۔ وہ جب بہترین ریہرسل کرنا چاہتی تھی تو کمار ہی کا سہارا لیتی تھی۔ اُس وقت بھی غالباً اُسے بہانہ کر کے بلایا گیا تھا۔ ملازم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔ اُس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ اُسے یقیناً بیوقوف بنایا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی ایسا ہی کرتی رہی تھی۔ جب بھی اُسے کمار سے کوئی کام ہوتا تو اپنی اداکاری سے فائدہ اُٹھاتی تھی۔ جیسے ہی واپس ہونے کے لئے اُس نے قدم باہر رکھا شیلا کی آواز اُبھری ——

"ذرا ٹھہرو! تم تو جا رہے ہو، میری طبیعت بھی نہیں پوچھی؟" اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"خاموش کیوں ہو؟ مجھ سے بولو، دیکھو کب سے میں تمھاری راہ تک رہی ہوں؟" شیلا نے پھر کہا۔

"تم اب بھی خاموش ہو؟ دیکھو اگر تم اسی طرح مجھ سے ناراض رہے تو میں اپنی جان دے دوں گی!"

وہ طنزیہ مُسکرا اُٹھا۔ شیلا کی اداکاری میں کتنی جان تھی، کتنی حقیقت تھی، کتنی کامیاب ریہرسل تھی۔ پہلے جب بھی اُسے کسی بہت اچھی فلم میں کام کرنا ہوتا تھا تو وہ اپنے فن کی تکمیل کے لئے، حقیقت کا رنگ دینے کی خاطر، اسی رول میں کمار کے ساتھ گھنٹوں ریہرسل کرنے کے بعد شوٹنگ پر جاتی تھی اور واقعی اُس کی اداکاری فن کا بہترین نمونہ ثابت ہوئی۔ اِن دنوں بھی غالباً اُس کے پاس کوئی بہت معیاری فلم تھی اور اِسی لئے اُس نے اُسے بلا بھیجا تھا۔ اِس وقت بھی اُس کی اداکاری بے حد کامیاب تھی۔ کمار سب کچھ بھول گیا۔ وہ دل ہی دل میں اُس کے فن کی تعریف کرنے لگا۔ اُسے خاموش دیکھ کر شیلا نے کہا۔

"تم مُسکرا رہے ہو؟"

اور پھر تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکال کر کمار کو دیتے ہوئے بولی۔

"میں یہ خط تم تک پہنچانا چاہتی تھی۔ اِسے پھر پڑھنا پہلے مجھے پیار کر لو۔ دیکھو میں صرف تمھاری ہوں نا؟"

کمار کی مُسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ شیلا بستر سے ایک مریض کی طرح اُٹھی۔ واقعی وہ

بیمار معلوم ہو رہی تھی۔ کمار کو اُس کے بستر سے اٹھنے کی اداکاری بہت پسند آئی۔ شیلا نے اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اُس نے جھٹک کر الگ کر دیا۔ اُسے شیلا کا پچھلا سلوک یاد آگیا تھا جو اُس کے دل پر ناسور بن کر رِس رہا تھا۔ شیلا اُس کے پاؤں کی طرف جھکی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اب وہ ہنس رہا تھا، شیلا کی اداؤں پر جس نے اپنی اداکاری کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ شیلا نے اپنے بال بکھیر دیئے اور سر پیٹ پیٹ کر چیخنے لگی

"ہنسو، تم خوب ہنسو، مجھ پر ہنسو۔ میں تمھاری بیوی ہوں نا؟ تم سے پیار کرتی ہوں نا؟ تم اُس وقت تک ہنستے رہو۔۔ اُس وقت تک ہنستے رہو۔۔ جب تک۔۔ جب تک۔۔ جب تک۔۔"

یہ کہتے کہتے وہ گر پڑی اور کمار اُسی طرح ہنستا ہوا نیچے اُترتا چلا گیا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تو شیلا اُٹھنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ وہ ٹھہرا نہیں۔ نیچے ہی اُسے اسٹوڈیو کے کچھ کیمرہ مین مل گئے جو غالباً شیلا سے ملنے کے لئے آرہے تھے۔ اُس نے کہا۔

"آپ نے مِس کر دیا۔ بہترین ریہرسل کی ہے اُنھوں نے۔ اداکاری کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ کیا لیٹ ہو گئے ورنہ ابھی شاٹ لے لیتے؟"

یہ کہتے ہوئے کمار آگے بڑھ گیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اُس کے دل میں شیلا کے لئے نفرت کے جذبات اُمڈتے چلے آئے۔ وہ سوچتا رہا محض ریہرسل کے لئے اُسے بیوقوف بنایا گیا۔ دوسرے کمرے میں لوگ بھی موجود رہے ہوں گے اور پھر کیمرہ مین بھی تو آپہنچے تھے۔ کون جانے اُس کے خلاف کیا سازش تھی۔ لیکن وہ اُس کی بہترین اداکاری کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اُس کی اُنگلیاں لفافے سے مَس ہوئیں جو اُس نے بے خیالی میں شیلا سے لے کر جیب میں ڈال لیا تھا اور پھر بھول گیا تھا۔ اُس نے سوچا نہ جانے یہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی ریہرسل کا ایک حصّہ رہا ہو۔ اُس نے لفافہ کھول لیا۔ لکھا تھا ——

"میرے پیارے کمار! میں نے تم سے معافی چاہی لیکن تم نے معاف نہیں کیا۔ میں اب بھی شرمندہ ہوں۔ تم سے ملنا چاہتی ہوں کہ تمھارے قدموں پر سر رکھ کر رو سکوں۔ لیکن تم نہ آؤگے۔ اِسی لئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں۔ میں تم سے اور صرف تم سے پیار کرتی ہوں۔ مجھے بھی سچا پیار صرف تم ہی دے سکتے ہو میرے پتی ہو نا! اِسی لئے ہر انسان کو ایک سچے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جو پتی یا پتنی کی شکل میں ہو۔ میں نے بہت فریب کھائے اور اب کئی دنوں سے واقعی بیمار ہوں کثرتِ شراب نوشی سے پھیپھڑے تقریباً خراب ہو چکے ہیں۔ بات بات پر دل کا دَورہ پڑ جاتا ہے۔ کچھ دنوں کی مہمان ہوں۔ میں نے ملازموں کو ہدایت کر دی ہے کہ تمھیں میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ تاکہ تم سے تفصیل گفتگو کر سکوں۔ فلمی دُنیا کے لوگ مزاج پُرسی کو آتے ہیں، طبیعت پُوچھتے ہیں، مرض معلوم کرتے ہیں لیکن اُنھیں کیا بتاؤں کہ تمھاری بے رُخی ہی میری بیماری کا سبب ہے۔ میں بمشکل اُٹھ بیٹھ سکتی ہوں۔ اپنی بیماری کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتی ورنہ خواہ مخواہ اخبار والے اُچھالیں گے۔ تمھاری خیریت معلوم کرتی رہتی ہوں حالانکہ تمھیں کبھی خوش نہ رکھ سکی۔ اداکارہ صرف اداکارہ ہی نہیں ہوتی، عورت ہوتی ہے۔ وہ بھی پیار بھرا دل رکھتی ہے۔ سچے پیار کی پیاسی ہوتی ہے۔ صرف تمھارا پہلو ہی میرے سکون کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر اب بھی تم نے مجھے مایوس کر دیا تو یقین جانو میں اِس صدمے سے جانبر نہ ہو سکوں گی۔"

تمھاری منتظر —— شیلا

کمار کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ حقیقت کو اداکاری سمجھ رہا تھا۔ وہ اُٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا تو شیلا کا سکریٹری کہہ رہا تھا ——

"کمار صاحب! افسوس ہے کہ آپ کو پکارتے پکارتے شیلا جی ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہو گئیں!" کمار کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ اُس کی پلکوں پر آنسوؤں کے تارے جھلملانے لگے!!

"عشق"

عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے —— مرزا رُسوا

ترکِ اُلفت پہ اُس کو کر کے یاد
عشق میں نام کر لیا میں نے —— خدیجہ شہناز

جاودانی ہوا ہوں فانی سے
عشق کی مرگِ ناگہانی سے —— بسمل سعیدی

ہے ننگِ جنوں، ننگِ وفا، ننگِ محبت
وہ دل جو غمِ عشق سے معمور نہیں ہے —— نامعلوم

عشق ہے اُس طلب کا نام جو نہ ہو عمر بھر تمام
وہ بھی تھے کتنے بدنصیب جو تجھے پا کے رہ گئے —— نامعلوم

مرسلہ: خدیجہ شہناز خواجہ۔ ایم۔ ایس۔ سی (علیگ)

غزل

سیّد حبابؔ ترمذی

سرورِ آرزو ہیں یہ کیسے ہوش
کہ وہ جانِ محبت ہے در آغوش

تصور میں رہے اکثر ہم آغوش
کہوں کیونکر اُنھیں وعدہ فراموش

تقاضائے وفا ہے سر فروشی
ہم اس بارِ گراں سے ہیں سبکدوش

کہاں کی دید؟ کیا تابِ نظارہ؟
نظر ملتے ہی دل کے اُڑ گئے ہوش

تبسم اور پھر اُس پر تکلّم
وہ فردوسِ نظر، یہ جنتِ گوش

کہاں برسیں گی یہ کالی گھٹائیں
یہ کون آج آ رہا ہے زلف بر دوش

تمہیں ہو دشمنِ ایماں، کیا خوب!
تمہیں کو کہتے ہیں غارت گرِ ہوش

زمیں پر کتنے ہنگامے ہیں برپا
فضائے آسماں ہے کیسی خاموش

ہوا ہو جیسے اِک رسمی تعارف
مجھے یوں کر دیا تم نے فراموش

تجھے دریا کبھی مل جائے تو کم ہے
حبابؔ تشنہ لب، رندِ بلا نوش

نگاہیں

اخگرؔ مشتاق رحیم آبادی

خود دیکھ لے، جو دیکھے اُن کی حسیں نگاہیں
کس طرح لوٹتی ہیں دنیا و دیں نگاہیں

اُف شوخ انکھڑیوں کے مستی بھرے اشارے
ہوش آ سکا نہ اُس کو جس پر پڑیں نگاہیں

کیا کیا سپردگی کے پیغام دے رہی ہیں
اے دل نواز تیری یہ دلنشیں نگاہیں

وہ کیا ادا کریں گے سجدے نیاز دل کے
دیکھی گئیں نہ جن سے ناز آفریں نگاہیں

اے ناصحو نہ دیکھو اپنی نظر سے مجھ کو
میری نظر سے دیکھو اُن کی حسیں نگاہیں

کیا کیا نہ دے رہی ہیں فرمانِ بادہ خواری
خوش وضع و خوبصورت مے آفریں نگاہیں

سارا جہان جیسے افسردہ ہو گیا تھا
وقتِ وداع اُن کی اُف وہ حزیں نگاہیں

اِک جرمِ عشق پر اُف یہ برہمی عالم
اِک دل ہے اور اُس پر سو خشمگیں نگاہیں

اِک شانِ دلبری سے دیکھا جو اُس نے مجھ کو
محفل میں پھر تو مجھ پر کس کی نہ اٹھیں نگاہیں

اخگرؔ تجھے خبر ہے، تیری غزل یہ سُن کر
پڑنے لگی ہیں تجھ پہ کچھ نکتہ چیں نگاہیں

[redacted]

صنم آشنا

عظیم اقبال ایم۔ اے

ڈیپارٹمنٹ آف اکنامکس، نہرو کالج، شفقت نگر، بہادر گنج (پورنیہ)

برادرم! تسلیمات

یہ میری نئی تخلیق "صنم آشنا" ہے۔ اس کے نازک بنیادی خیال کی توضیح کو آپ کی اعلیٰ فنی نگاہیں ہی پرکھ سکتی ہیں۔ کامنی کا کردار Perverted نہیں بلکہ مخصوص دور کا غماز ہے۔ آج تمام قدریں بدل رہی ہیں، معیار میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں، مزاجِ حسن کیسے نہ متاثر ہوگا۔۔

نیاز کیش ــــــــــ عظیم اقبال

شام ڈھل گئی۔ فضا اب تک گرد آلود تھی۔ سارا دن تیز و تند ہوا چلتی رہی تھی۔ کامنی غسل خانے سے نکلی ـــــ دیر تک گلیسرین سوپ کے ملائم جھاگ کو پورے بدن پر ملتی رہی تھی۔ ہاتھوں کے لمس سے گداز جسم میں گدگدی پیدا ہو جاتی۔ کبھی انگڑائیاں لیتی، کبھی خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتی، ایک لمحہ کے لئے کانپ جاتی۔ تولیے میں جسم کی نمی جذب کرنے کے بعد تازہ دم ہوئی۔ لیکچے ٹالک سارے بدن پر چھڑک کر جلد کی چکناہٹ ہتھیلیوں سے محسوس کرتی رہی۔ کیسی مدہوش کن ترنگیں ابھرتیں۔ پلکیں بوجھل ہو جاتیں۔ سارے انگوں میں تھرکن سی ہوتی رہتی۔

فیشن کے رسالوں میں افزائشِ حسن کے طریقے سیکھنے آزمانے کا کامنی کو بہت چاؤ تھا۔ مختلف اقسام کے کاسمیٹکس، سینٹ اور دوسری مصنوعات کا ذخیرہ جمع کئے رہتی۔ ہر دم اس کی سانسوں سے ہلکی ہلکی خوشبو کی لپٹیں اٹھتی تھیں۔ مساج کرنے کے بعد حوض کے پانی میں ایوڈی کولون کی آدھی شیشی تحلیل کر کے نہاتی۔ اس سے اسے بہت فرحت ملتی تھی۔ کافی اہتمام سے اپنی نوک پلک سنوارتی۔ عضو عضو پر کریم، پاؤڈر کی تہیں چڑھتی رہتیں۔ کوزمارک کریم، این فرنچ ڈیپ کلینزنگ ملک، پونڈس اینجل فیس کے مادے اس کے چہرے کو گلنار کر دیتے۔ میکس فیکٹر کی لپ اسٹک اس کے ہونٹوں کو سرخ گلاب بنا دیتی۔ فطرتاً اس کے ہونٹ ذرا سے وا ہوتے۔ اس سے دہن کی دلکشی بڑھ جاتی۔ لبوں کی طراوٹ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے شبنم کی ملاوٹ سے گلاب کی پنکھڑیاں پھیل رہی ہوں۔ سفید سفید دانتوں کی لڑی ایک خاص تاثر چھوڑتی۔

معمول کے مطابق ریشمی ملبوسات زیبِ تن کرنے سے پہلے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے روبرو اپنے پیکر کا وہ جائزہ لے رہی تھی۔ الگ الگ زاویوں سے گھوم پھر کر اپنے سراپا کی کشش کا اندازہ کرتی۔ ڈائیٹنگ اور مخصوص ورزشوں سے اپنے جسم کو اس نے متناسب بنا لیا تھا۔ مستند اعداد و شمار کی بنیاد پر وہ ہمیشہ خود کو ناپتی تولتی رہتی۔ کمر پتلی تھی۔ کولھے انتہائی خمیدہ تھے۔ بانہیں گدرائی تھیں۔ جسم کا دلکش گداز بے حد دلفریب تھا۔ پنڈلیاں سڈول تھیں۔ وہ اپنی ٹانگوں کا موازنہ ریٹا فاریا کی ٹانگوں سے کرتی۔ اپنے دمکتے رخسار کا مقابلہ یاسمین داجی کے عارض سے کرتی۔ بازو لہرا کر محسوس کرتی پرمس کمبا ٹا کی بانہیں ایسی ہی تو ہیں۔ اس کی ناک کی تو میں ممتاز کی ناک سے مشابہ تھیں۔ آنکھیں نیرہ مرزا کی طرح نشیلی نشیلی تھیں۔ اس کے کولھوں پر ہیلن کے کولھوں کا گمان ہوتا۔ کچھ لچک کر، کچھ جھول کر اپنی رعنائی کا باریک بینی سے تجزیہ کرتی تھی۔ بال و ناخن تک کی آرائش پر خاص توجہ کرتی۔ بھویں پتلی اور کمان نما ہوں۔ پپوٹے بھاری بھاری محسوس ہوں۔ کاجل ذرا پھیل جائے۔ آنکھوں میں تری رہے۔ چال میں مستی اور لڑکھڑاہٹ! زیبائش سے متعلق موضوعات پر کتنی کتابیں اس نے پڑھی تھیں۔ بیوٹی ایکسپرٹ سے صلاح لی تھی۔ متعینہ اوقات میں میڈیکل چیک اپ بھی کراتی۔ بہت اعتماد سے وہ سوچتی: میری جلد پر کوئی مٹا مٹا سا نشان بھی نہیں۔ پورا جسم شیشے کی طرح چمک رہا ہے۔ ہاں وہ دائیں جانب گال پر ایک سیاہ تل ہے۔ وہ تو

بیوٹی اسپوٹ ہے۔ بالکل نیچرل۔ باؤ فیسم پینٹنگ۔ جاذبیت کے لئے عورتیں نقلی تل بناتی ہیں۔ فولس اگلیمر کہاں سے لائیں گی ؟"

سبز لیڈی ہیملٹن کا بلاؤز جس کا کنارا ریشم کے بارڈر سے تھوڑا ہی نیچے تھا، دھانی رنگ کے میسور سلک کی ساڑی پر خوب سج رہا تھا۔ گریبان کھلا تھا۔ گداز جسم پہ لباس منڈھ دیا گیا تھا۔ ساڑی کو وہ ناف سے بہت نیچے کولھوں کے ابھار پر لپیٹتی۔ پیٹ اور کمر کا یہ برہنہ حصہ کافی دلفریب بن جاتا۔ کمر کی خمیدگی سے کولھوں کے خطوط اور زیادہ دلکش معلوم ہوتے۔ ایک خاص ادا سے آنچل گرا گرا کر سنبھالنے کی مشق چابکدستی سے کر چکی تھی۔ جیسے ہی آنچل سرکتا اُس کے تن بدن سے شعاعیں پھوٹ جاتیں۔ فضا مہک اٹھتی۔ مقابل کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ خمار چھا جاتا۔ کامنی انداز دلربائی سے مسکراتی۔

"اوہ ! ویری ٹربل سم !"

ایک ہاتھ کمر پہ ٹکا کر دوسرے سے آنچل کاندھے پر سجاتی۔ ناخنوں پر کیوٹیکس انگاروں کی طرح دہکتے۔ فورفنگر میں پھنسی ہوئی طلائی انگوٹھی کا چاکلیٹی امیٹیشن جگمگا اٹھتا۔ اُس کی داہنی کلائی میں جگ مگ کرتے ہوئے چھوٹے نگینوں سے مزین ایک بریسلٹ تھی۔ بائیں میں سنہری زنجیر والی ایک چوکور گھڑی۔ کانوں میں جھولتے ہوئے آویزے گردن پر بکھرتے۔ گلابند پر بے حد خوبصورت نقاشی تھی۔ عموماً بالوں کو سامنے سے اٹھا کر کھینچ کر اوپر پیرامڈ کے اسٹائل میں لپیٹتی تھی۔ ایک دو لٹیں رخساروں پہ سایہ فگن رہتیں۔ ہونٹوں کو دبا دبا کر مسکراتی نگاہوں میں شوخیاں مچلتی تھیں۔

کریسٹن کیلر والے "دھکڑ دار" نے الزبیتھ ٹیلر کو جی سیلڈ بیوٹی اور صوفیالارین کو سوفسٹی کیٹیڈ بیوٹی کے نام سے موسوم کیا تھا۔ کامنی خود کو ایکس پلوزیو بیوٹی تصور کرتی تھی۔ اپنی اس اصطلاح پر اُسے بہت ناز تھا۔ اُس کا شباب کچھ ایسا ہی تھا۔ ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہوا، نس نس میں چنگاریاں سلگتی ہوئیں۔ بچپن ہی سے وہ موہنی سی تھی۔ پپا اُسے موم کی مورت کہتے تھے۔ ممی جاپانی گڑیا ! جبکہ وہ بہت چھوٹی سی تھی، انھیں دنوں سے آئینے کے سامنے بیٹھنے، کھڑا ہونے کا چسکا لگا تھا۔ اپنی صورت کو تکتی رہتی۔ ہنستی، مسکراتی۔ بار بار اپنے عکس کو چوم لیتی۔ سیانی ہوئی تو خد و خال کے بدلتے رنگ روپ اُسے اور بھی متحیر کرنے لگے۔ مبہوت ہو کر اپنے جسم کے ہر خم ہر گوشے کو دیکھتی، چھوتی، محسوس کرتی۔ کبھی فکر کی بھول بھلیوں میں کھو جاتی۔ کچھ دھڑکے اندیشے کلبلاتے۔ روئیں کھڑے ہو جاتے، کپکپی طاری ہو جاتی۔ پھر جھوم اٹھتی۔ جی چاہتا وارفتگی سے اپنے آپ کو بھینچ لے۔ خود پر بے اختیار پیار آ جاتا۔ اُس کے کومل کومل انگ اُسے گدگدا دیتے : اُف ! کتنی حسین ہوں میں ! کتنی تیکھی ! صندلیں بانہیں، ہونٹوں سے رس ٹپکے، آنکھوں میں ستارے جھلملائیں !

اُس کی رگ رگ میں طمانیت کی لہریں پھیلنے لگتیں۔ کامنی کی قربت مسرت لمس ہی سے نجیت کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے تھے۔ اُسے ڈرائیونگ اُسی نے سکھلائی تھی۔ اُس کی پنڈلیوں کا سجیلا پن اور بازوؤں کا گداز محسوس کر کے لرز لرز جاتا۔ شاہراہوں پر ٹیمرکس، یوکلپٹس، املیو اور پام کے درختوں کے سائے میں انجن سپ جھک جاتا۔ کامنی ذرا کسمساتی۔

"ایکسیڈنٹ کراؤگے کیا ؟ اونہہ ! ٹھیک سے بیٹھو نا !"

"ارے، ارے گیئر تو بدلو !"

"اسٹیرنگ سنبھالو !"

کامنی کو پھولوں سے بہت الفت تھی۔ خصوصاً فلاکز، بیینا، ڈیلیا اور سوسن اُسے بے حد اچھے لگتے۔ اپنے کمرے میں جگہ جگہ گلدستے سجاتی۔ پھولوں کی دلنواز رنگت اُس کی نظروں کو سرشاری بخشتی تھی۔ مینٹل پیس پر فریموں میں اُس کی بہت سی تصویریں لگی تھیں۔ گلاب کی شاخیں تھامے ہوئے، جھیل میں کشتی پر پانی سے کھیلتے ہوئے، برف پر اسکیٹنگ کرتے ہوئے، ٹینس ریکٹ سے گیند پر نشانہ لگاتے ہوئے ——— سب یادگار فوٹو تھے۔ متبسم چہرے کی صباحت ساری تصویروں میں برقرار تھی۔ اسی لئے تو ممی اُس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے کہتی تھیں۔

"مارویلس ! سو مچ فوٹوجینک !"

نہ جانے کیوں ممی کی اِس بات پر اُسے نجل کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ جب شانوں پہ کھلے بال بکھرائے سبزے پر اٹھلاتی پھرتی، ہاتھ اوپر اُٹھا کر بالوں میں اسکارف لپیٹتی ہوتی، لاؤنج میں بید کی کرسی پر غنودگی کی حالت میں نیم دراز ہوتی، نجل کیمرے کا اینگل ٹھیک کرنے لگتا۔

"پلیز ون اسنیپ !"

"تھوڑی ذرا اُدھر گھمایئے !"

"مسکرایئے نا !"

"تھینکس !"

اور ایک وہ تھا کملیش۔ اُس نے کامنی کو کافی متاثر کیا تھا۔ نائٹ گاؤن میں جب اُس کا مرمریں بدن جھل جھل کرتا ہوتا، اسکاچ کے دوسرے پیگ میں اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور چاندی کے پاپ میں گولڈ فلیک کے کش کھینچ کر وہ دھوئیں سے دائرے بناتی ہوتی کملیش اُسے سامنے بٹھائے کسی نئی پینٹنگ کے خاکے ذہن میں مرتب کرتا۔

"اب ختم بھی کرو اپنی یہ تصویر کشی۔ روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی۔ بتی بجھاؤ۔ گڈ نائٹ !"

کملیش نے اُس کے کتنے سارے اسکیچ بنائے تھے۔ اُس کی وہ لائف سائز

پورٹریٹ بھی جو ڈرائنگ روم کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی، کملیش کو اُس کی نقرئی ہنسی بہت بھاتی تھی۔ بس ایسے ہی اُسے چھیڑتا، قہقہے لگاتا، کامنی بھی کھل اٹھتی۔ اُس کی آنکھوں کی جنبش، ہونٹوں کی سلوٹیں، رخسار کی آنچ، جبیں کی تابندگی اور شفق سب کینوس پر منقش ہو جاتیں۔ سگار کا سُرمئی مٹیالا دُھواں اُس کی لہریے دار زُلفوں میں اُلجھا کر زور زور سے تالیاں بجاتا۔

"گلیمرس! گلیمرس!"

"یہ کیا حرکت ہے؟ نان سنس!"

"گُڈ گاڈ! سو پلیزنٹ، سو ایکسائٹنگ!"

پچھلی بار ویک اینڈ پر وہ سمندر کے کنارے ایبولائے کرتے رہے تھے۔ تیرا کئے۔ دھوپ غسل کرتے رہے۔ ریت سے، موجوں سے کھیل کھیل کر وہ کافی تھک گئے۔ کملیش کو

اُنھیں لمحوں میں ایک خیال سُوجھا تھا۔ تجویز سُن کر کامنی پہلے سٹپٹائی، نتھنے سُکیڑتی رہی، تیوریوں پر بَل ڈال کر کیا کیا سوچا۔ پھر راضی ہو گئی۔

"اسکن خراب نہیں کرو گے، ہاں!"

"گاڈ بلیس می! مجھ پر بھروسہ رکھو میڈم!"

بُت بنی وہ کھڑی رہی۔ کملیش نے اُس کے بازوؤں پر کئی خوشنما بوٹے پینٹ کئے جن سے منسلک بیل اوپر اور نیچے پھیلتی چلی گئی تھی۔ دیر تک اپنے انہماک پر وہ نظریں جمائے رہی۔ یکایک خوشی سے اُس کی چیخ نکل گئی۔

"یُو آر گریٹ آرٹسٹ! —— ویری ویری گریٹ!!"

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت انتخابات کا مہیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزلیں

محسن زیدی ایم۔ اے

شاید اب ہو نہ سکے ہم سے کوئی نظم و غزل
وہ گراں باریِ غم ہے کہ ہے تخئیل بھی شل
اِک اشارہ تو نہیں جذبِ محبت کا جواب
اِک تبسّم تو نہیں لطف و عنایت کا بدل
نقشِ بہزاد اُبھارے ہیں خراشِ دل سے
اور اشکوں سے بنائے ہیں کئی تاج محل
اب شبِ غم میں کوئی چاند کھلے یا نہ کھلے
ہم نے پلکوں پہ سجا رکھے ہیں اشکوں کے کنول
اپنا کاشانہ عشرت ہو مبارک تم کو
کیسے ٹوٹا ہے نہ پوچھو مرے سپنوں کا محل
اِس ملاقات میں اِک حرفِ شکایت سُن لو
اِس ملاقات میں تفصیل کا موقع نہ محل
زندگی کا کوئی عنوان تو محسن نہ ہوئی
وہ نظر بن گئی لیکن مرا موضوعِ غزل

دیپک چودھری ایم۔ اے

رُخ بہ رُخ رشکِ حُور ہے تیرا جمال
ایک رنگیں نُور ہے تیرا جمال
اِک سراپا حُسن ہے تیرا وجود
اِک مجسّم نُور ہے تیرا جمال
کون دیکھے کس کو ہے تابِ نظر
مثلِ برقِ طور ہے تیرا جمال
جس نے دیکھا ہو گیا مخمور وہ
بادۂ انگور ہے تیرا جمال
لالہ و گُل، مہر و مہ کے نام سے
کس قدر مشہور ہے تیرا جمال
اُس نشے کو رنگ بھی کہتے ہیں لوگ
جس نشے میں چُور ہے تیرا جمال
اب اضافہ کوئی ممکن ہی نہیں
اِس قدر بھرپور ہے تیرا جمال

مرزا شرّو

فضل رحمانی

۸۵۔ ڈبلیو۔ گریٹر کیلاش ۲ نئی دہلی

قبلہ خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

اپنے ایک نہایت ہی عزیز دوست جناب فضل رحمانی کا ایک مزاحیہ مضمون "مرزا شرّو" آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ یہ ایک مسلسل مضمون کی پہلی قسط ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ مضمون میں بے ساختہ پن اور روانی ہے۔ مزاح میں بھی ندرت ہے۔ اگر آپ ان کے اس مضمون کو شائع کریں تو مجھے ایک اچھے مزاح کار کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے کا فخر حاصل ہوگا۔ اگلی قسط کے لئے آپ خود ہی ان سے خط و کتابت کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ قبلہ فضل رحمانی عالی جناب نواب فخر الدین علی احمد صاحب وزیر مرکزی حکومت کے شاف میں ہیں۔ اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ . .

دُعاگو ——— کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

مرزا جی کا نام تو شہریار بیگ تھا لیکن لوگ اُنھیں "مرزا شرّو" کہتے تھے۔ اُن کے قریبی حلقوں کا بحلف بیان یہ ہے کہ اُنھیں شر و فساد سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا ہے۔ اس نام کی وجہ وہ لوگ یہ بتلاتے ہیں کہ مرزا جی کی نانی مرحومہ انھیں بچپنے ہی سے شرّو، شرّو کہتی تھیں۔ بڑی بی تو کچھ عرصے کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ لیکن بچارے مرزا شہریار بیگ "مرزا شرّو" ہو گئے۔

آج کل ہندوستان میں مغربی ملکوں کی جو نئی نئی ایجادیں رائج ہو رہی ہیں مثلاً تنگ پتلون، راک اینڈ رول، بیٹلس میوزک، مرزا جی اُن کے زبردست دلدادہ بن گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مرزا جی اُن کی خوبیوں سے متاثر تھے۔ بلکہ اُن کی سرشت میں یہ بات داخل تھی کہ ہر نئی چیز کو پہلے تو سر کا تاج بناتے اور کچھ دنوں کے بعد میلا کپڑا سمجھ کر بڑی بے مروّتی سے جدا کر دیتے۔ لوگ اُن کی اس بے مروّتی کو بہت بُری نظر سے دیکھتے لیکن مرزا شرّو ہنس کر کہتے: "ارے بھائی! یہ تو زندگی کی نشانی ہے۔ ہم کوئی لکیر کے فقیر تھوڑے ہی ہیں"

ایک دن مرزا شرّو اپنی بیگم صاحبہ سے یوں گویا ہوئے "جانِ من! گھر کی ہانڈیوں سے تو اب جی بھر ہی نہیں گیا ہے بلکہ اُکتا گیا ہے۔ کیوں نہ آج شام ہم چل کر ہوٹل میں ڈنر کھائیں اور ذرا تفریح فرمائیں" بیگم صاحبہ مرزا شرّو کی یہ تقریر دلپذیر سُن کر کباب کی طرح بُھن گئیں۔ تیوریوں پر ہزاروں بل ڈال کر بولیں "مرزا جی! تمھاری عمر تو ابھی خیر سے پچاس اور ایک سال کی ہے لیکن تم سٹھیا گئے ہو۔ سو بار تم سے کہہ چکی ہوں کہ بے تکی باتوں سے مجھے اختلاجِ قلب ہونے لگتا ہے لیکن تم ہو کہ عقل کی بات کرنے کی قسم کھا بیٹھے ہو۔ ہوٹلوں میں پتہ نہیں کون لوگ کھانا کھاتے ہیں۔ کیسے پکاتے ہیں۔ میں جب کھانا پکواتی ہوں تو ایک ملازمہ محض چونری سے مکھی بھگاتی ہے" مرزا شرّو بولے "بیگم اگر آج میں ولایت میں ہوتا تو اس فرسودہ خیالی کی بنا پر عدالت میں درخواست دے کر دو گھڑی میں تم سے عمر بھر کے لئے نجات حاصل کر لیتا"

بیگم صاحبہ نے جب یہ دھمکی سُنی تو غصّے میں بپھر کر بولیں ——— "جبھی تو اللہ نے گنجے کو ناخن نہیں دیے" غصّے کا اتنا شدید اثر تھا کہ منہ کا پان بھی اُن کی ہیبت کے باعث دورانِ گفتگو باہر آ رہا تھا۔ مرزا شرّو بیگم کے تیور دیکھ کر پسیج گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بیگم صاحبہ سے ضد کر کے کوئی کام کرانا اور جوئے شیر لانا برابر ہے۔ نگاہوں میں مصنوعی شرارت بھر کر بولے۔

"جانِ جہاں! جب تک محبت میں تکرار نہ ہو لُطف نہیں آتا۔ ابھی میں نے نجات والی بات تو محض تمھاری محبت کو پرکھنے کے لئے کہی تھی ورنہ جب تک دُنیا

قائم ہے تمھیں مجھ سے موت بھی نہیں چھین سکتی ؟" بیگم صاحبہ مرزا شرّو کی اِس چال میں نہایت معصومانہ انداز میں آن پھنسیں۔ نہایت شادماں ہوکر بولیں: "اگر یہ بات ہے تو سچ پوچھو میں تمھارے ساتھ جہنم میں بھی خوشی خوشی نہ جاؤں تو مجھ پر میری والے پیر جی کی سو بار لعنت ہو!"

مرزا شرّو اپنی شرارت کامیاب دیکھ کر فٹ بال کی طرح پھول گئے۔ یہ بات تھی دن کے گیارہ بجے کی۔ ہوٹل جانا تھا شام کو۔ پونے سات بجے مرزا شرّو سوچنے لگے۔ کیا پہن کر جاؤں؟ کیا کھاؤں؟ کیا ادائیں دکھاؤں؟ جو میری ہوٹل میں سینگ کٹی ہو جائے حالانکہ صبح ایک بار شیو کر چکے تھے لیکن بارہ بجے کے قریب ایک بار شیو کا سامان لے کر بیٹھے تو بیگم نے کہا: "مرزا صاحب! آج صبح کا شیو بھول گئے کیا؟"

مرزا جی جھلا کر بولے: "ارے نیک بخت! سو بار کہا کسی کام کو کرتے وقت ٹوکا مت کرو۔ مگر تم ہو کہ مٹھو میاں کی طرح دن بھر ٹائیں ٹائیں کرتی رہتی ہو۔ میری نانی

- کسی گھر کا پڑوسی خوش خو اور شیریں کلام ہے تو اُس سے اُس گھر کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ (حضرت عبداللہ بن عمرؓ)
- انسانوں کو ادب سکھانا حیوانوں کو ادب سکھانے سے دشوار تر ہے۔ (حضرت امام شافعیؒ)
- سچ کہو اگرچہ وہ تلخ ہی ہو۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جو ہوکر رہے گا اُسے سکون کے ساتھ برداشت کرنے کی کوشش کرو۔ (سقراط)
- خوش خوئی خدا کی ناراضی کو دُور کرتی ہے۔ (سفیان ثوریؒ)

مرحومہ جنّت مکانی فردوس آشیانی مرتے مرتے کہہ گئیں کہ مرزا شہریار بیگ کی یادداشت تو سانپ سے بھی زیادہ تیز ہے۔ دوبارہ شیو کر لیا تو کیا گناہ ہوگیا۔ ذرا چہرہ مہرہ سنوار کر جانا چاہئے۔"

بیگم بولیں: "تم سے تو بس اللہ کی پناہ! کھانا کھانے جا رہے ہو یا پھیرے کرنے جا رہے ہو؟"

الغرض وہ مبارک گھڑی آ پہنچی جس کا مرزا شرّو کو بے چینی سے انتظار تھا۔ مرزا نے لال رنگ کی اونچی سی بُش شرٹ پہنی جس پر پیلے پیلے بڑے پھول بنے تھے۔ چھوٹی مہری کی پتلون۔ اونچی ایڑی والی چپل کا جوتا۔ سینٹ اتنا جیسے نہائے ہوں۔ منہ میں سگار دبا رکھا تھا۔ بیگم صاحبہ نے بادامی جمپر، سفید غرارہ اور سُرمئی دوپٹہ زیب تن کیا۔ مرزا جی تو بانس کی طرح لمبے اور اتنے دُبلے جیسے تپ دق کا مریض۔ بیگم صاحبہ کا حلیہ اس کے بالکل برعکس۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے قریب سوا چار فٹ کا قد اور کم از کم تین من کا وزن! مرزا جی کا رنگ دودھ جیسا صاف و شفاف۔ بیگم صاحبہ کا رنگ لیلیٰ کے رنگ سے بیس نہیں تو اٹھائیس ضرور ہوگا۔

جب یہ جوڑی ہوٹل میں پہنچی تو کچھ منچلے نوجوانوں نے سیٹیاں بجائیں کسی نے آنکھوں کے اشارے کئے اور کسی نے میز پر تھپتھپائیں۔ مرزا جی سمجھے کہ یہ پہلا استقبال ہو رہا ہے۔ اِس لئے آداب عرض ہے، تسلیمات عرض ہے، کہہ کر اُن سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈانسر سٹیج پر آگئی۔ رقص و سرود کی بارش شروع ہوئی۔ مرزا شرّو ڈانسر کی طرف ایسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے جیسے آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔ بیگم کو اُن کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ اب سمجھیں کہ مرزا شرّو مکر و فریب کا پُتلا ہے۔ کھانے کا محض بہانہ تھا۔ دراصل اُسے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانی تھی۔ ڈانسر نے جب گانے کے یہ بول ادا کیے ______

ہم سے پیار کرو، پیار کرو!

تو مرزا شرّو اپنی کرسی سے دو فٹ اچھل کر بولے۔

"واللہ! ہمیں تو کب سے انتظار تھا!"

بیگم صاحبہ غصّے میں آکر بولیں: "باسی کڑھی میں اُبال! ارے مُوئے چل گھر۔ ایسا پیار کروں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا!"

ڈانسر نے جب گانے کے یہ بول ادا کئے ______

انتظار انتظار انتظار کرو!

تو مرزا شرّو سرد آہ بھر کر بولے: "قسم ہے اپنی بھری جوانی کی۔ تاقیامت تمھارا انتظار کروں گا! یقین جانو!"

بیگم صاحبہ اب تو آگ بگولہ ہوگئیں۔ تھرتھراتی ہوئی آواز میں گرجیں: "سینگ کٹا کر بچھڑے بنتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ قبر میں پیر لٹکا کر بیٹھے ہو اور عشق بازی میں چچا مجنوں کی ناک کان کاٹتے ہو!"

مرزا جی بولے: "اے بیگم کباب میں ہڈی نہ بنو۔ ذرا سمجھو تو۔" تھوڑی دیر تک رقص و سرود کی محفل گرم رہی۔ مرزا جی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔

اب کھانے کا نمبر تھا۔ بیرے نے آکر دریافت کیا "کیا چاہئے؟" مرزا جی بارعب آواز میں بولے: "بہترین کھانا لاؤ!"

بیرے نے ایک مینو کارڈ پیش کر دیا۔ مرزا شرّو بولے: "اے یہ اچھا مذاق ہے۔ میں کھانا طلب کر رہا ہوں اور تم مجھے کاغذ کا ٹکڑا دے رہے ہو! جاتا ہوں منیجر کے پاس!"

بیرا بولا: "حضورِ والا! یہ مینو کارڈ ہے۔ اس میں لکھا ہوا جو کھانا لانے کے لئے حضور حکم دیں گے، پیش کر دوں گا۔"

مرزا شرّو نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "ٹھیک کہتے ہو۔ ہاں بہترین کھانا لاؤ۔"

بیرا بولا: "حضورِ والا! ہندوستانی یا انگریزی؟"

مرزا اشرف نے بارعب آواز میں کہا: "اے میاں انگریزی اُلّو، انگریزی! کمبخت چھجو باورچی نے ساری عمر تو ہندوستانی کھلایا ہے تم بھی ہندوستانی کھلانا چاہتے ہو؟ عجب تماشا ہے!"

بیرا جب سوپ لایا تو مرزا جی نے سوپ میں توسٹ توڑ کر ڈال دیا اور مکھن ملا لیا اور جیسے دودھ بسکٹ کھاتے ہیں اس طرح سے نوش جان فرمایا۔ آس پاس کے لوگ اس منظر کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے لیکن مرزا جی گردوپیش سے بے نیاز کھانے میں مگن تھے۔ سوپ کے بعد بیرا مرغ لایا اور مرزا جی کے سامنے ڈش پیش کر کے نکال لینے کا اشارہ کیا۔ مرزا جی نے ڈش سامنے رکھ کر فرمایا: "ارے حضرت! ہم کھانے آتے ہیں کھیلنے نہیں! اوّل تو ایک مرغ ڈش میں ہے اور وہ بھی واپس لے جاتے ہو۔ بس کمال کر دیا!"

مرزا جی نے مرغ کی پوری ڈش صاف کر دی۔ اس کے بعد ایک پلیٹ آئس کریم بھی دیکھتے دیکھتے ختم کر گئے اور تین پیالی کافی سے بھی شوق فرمایا۔

گھر واپس آ کر مرزا جی بیگم سے بولے: "جانِ بہار! ہوٹل کا کھانا تو نہایت مزے دار تھا لیکن منہ کا مزہ بدلنا چاہتا ہوں؟"

بیگم نے کہا: "بجا ارشاد مرزا اشہر یار بیگ عرف مرزا اشرف! منہ کے مزے کے ساتھ ساتھ آپ سب کچھ بدلنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھئے کہ میں ہنسی خوشی یہ سب برداشت کر لوں گی۔ سن لو کان کھول کر! چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گی! ہم ہے بیوی والے پیر جی کی!"

مرزا جی پر سے عشق کا بھوت تو اُتر چکا تھا لیکن آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اس لئے بیگم سے طوعاً و کرہاً صلح کرنا ضروری تھا۔

مرزا جی بولے: "ارے بیگم! جواب نہیں تمہاری اداؤں کا! بس کمال کر دیا! ارے اتنے دن ہو گئے روٹھنا نہ گیا تمہارا! غصے میں تو آپ اور حسین ہو جاتی ہیں اور ہاں! ایک بات ذرا سن لو۔ نمک مرچ کی ذرا نظر تو اُتروا لو۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ وہاں سب کی نظریں بس تم پر تھیں!"

بیگم بولیں: "اے ہے مرزا جی! تمہاری طبیعت اب بھی باغ و بہار ہے۔ بلا کی ظرافت ہے!"

مرزا جی نے عرض کیا: "بیگم صاحبہ! کیا بتاؤں جب تک کمبخت چھجو کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھا لیتا ہوں، طبیعت نہیں بھرتی۔ ہوٹل کا کھانا کیا تھا محض آنکھوں کی تسلی تھی، پیٹ کی نہیں۔ میری اچھی بیگم! کچھ کھلاؤ۔ یہاں تو حالت قابلِ رحم ہے!"

بیگم صاحبہ نے چھجو کو آواز دے کر کھانا لانے کا حکم دیا۔

چھجو نے آنکھیں پھاڑ کر کہا: "حضور کھانا کیا۔ مرزا صاحب بہادر تو آج ہوٹل تسریف لے گئے تھے؟"

مرزا جی بولے: "ارے شریر میں تو تجھے ہمیشہ گاؤدی سمجھتا تھا لیکن آج تو تو دُکھتی رگ دبا رہا ہے۔ جا، کھانا لے کر آ!"

تھوڑی دیر میں چھجو کھانا لے کر آیا تو مرزا جی آپے سے باہر ہو گئے اور بولے۔ "ارے موذی یہ ہوائی روٹیاں ہیں یا ہاتھی کے کھانے کے روٹ! دور ہو میری آنکھوں سے نابکار!"

چھجو نے عرض کیا: "حضور جانت ہیں میرے مُنہ میں ایک بھی دانت ناہی ہے۔ میں باریک روٹی ناہی کھا پاوت ہوں۔"

مرزا جی پریشان ہو گئے اور مایوسی کے عالم میں فرمانے لگے: "ستیاناس ہو میر سجو کا جنھوں نے ہوٹل کے کھانے کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ کھانا بھی دو کوڑی کا اور اوپر سے اتنا کم جیسے صرف نمونہ ہو! یا صرف ذائقہ چکھنے پرکھنے کے لئے سامنے رکھا گیا ہو۔ میری توبہ! اب ہوٹل جانا تو درکنار اُس طرف سے نکلوں گا بھی نہیں! جو لوگ ہوٹلوں کو آباد کرتے ہیں وہ گھر کو برباد کرتے ہیں۔ سچ ہے بیگم! تم تو بہت دور کی کوڑی لاتی ہو۔ اگر تمہاری بات مانتا تو یہ حشر نہ ہوتا!"

بیگم صاحبہ بولیں: "مرزا جی نواب چھمن کے یہاں سے صبح شیرمال اور زردہ آیا تھا وہ کھا لو۔"

مرزا جی کی باچھیں کھل گئیں۔ بیگم زندہ باد! کے نعرے لگانے لگے!!

- خواہش کی موت، ہماری موت ہے۔ آرزو کی زندگی سے ہماری زندگی ہے۔ (نپولین ہل)
- جہاں تک ممکن ہو کسی کو اپنا دشمن نہ بناؤ۔ کسی مجبور و بیکس کو بھی۔ (سی۔ جی۔ ڈوکان)
- خدا ہمارے گناہ بخش سکتا ہے، لیکن اعصابی نظام کبھی معاف نہیں کرتا۔ (ولیم جیمز)
- اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ کو پسند کریں تو آپ پہلے خود اُن کے لئے پسندیدہ بن جایئے۔ (نپولین ہل)
- جیسا ہم سوچتے ہیں ویسا ہی ہم بن جاتے ہیں۔ (ڈاکٹر ہارڈن)

غزلیں

سید نیاز احسن شمیم فتحپوری

زندگی ہنستی ہے، صبح و شام تیرے شہر میں
عام ہے، اندر سے گلفام تیرے شہر میں

کس قدر مشہور ہیں، وہ لوگ جو ہیں بوالہوس
اور اک ہم ہیں، کہ ہیں گمنام تیرے شہر میں

کوئی سودائی، کوئی کہتا ہے دیوانہ مجھے
روز ملتا ہے، نیا اک نام تیرے شہر میں

ہم ممنونِ عشق کے، باوصف بھی ہشیار ہیں
صبح تیرے شہر میں ہیں شام تیرے شہر میں

زندگی مجھ کو ملے، یا موت کا ہو سامنا
جو کبھی ہونا ہو، وہ ہو انجام تیرے شہر میں

سحر فرما، تیری نظریں، حکمراں تیرا جمال
سانپتی ہے، گردشِ ایام تیرے شہر میں

ہر طرف عیش و مسرت، ہر طرف موجِ شمیم
[illegible] تیرے شہر میں

نیّر قریشی گنگوہی

میرے منہ پر یہ ملا کہتے ہیں لوگ
مجھ کو دیوانہ ترا کہتے ہیں لوگ

ہم نے سب کچھ اپنا قرباں کر دیا
پھر بھی ہم کو بے وفا کہتے ہیں لوگ

کانپنے لگتا ہے خود موجوں کا دل
ناخدا کو جب خدا کہتے ہیں لوگ

آپ کی معصوم ہر اک بھول کو
شوخی و ناز و ادا کہتے ہیں لوگ

سرپرستوں کی ضرورت ہے انھیں
خود جنھیں ظلِ ہما کہتے ہیں لوگ

یہ غزل نیّر کی سن کر بزم میں
مرحبا، صد مرحبا کہتے ہیں لوگ

سعادت حسین [illegible]

کیا کہیں ہم سمجھتے ہیں کیا آپ کو
ہو نہ کافر۔ تو کہتے خدا آپ کو

دیکھتے دیکھتے کیا ہوا آپ کو
لوگ کہنے لگے بے وفا آپ کو

کیا ضروری ہے یہ واعظِ محترم
ساری دنیا کہے پارسا آپ کو

بیکسوں پہ جفائیں مناسب نہیں
چاہیئے کچھ تو خوفِ خدا آپ کو

حسن کی انتہا پر ہے جس کی نظر
وہ نہ چاہے گا بے انتہا آپ کو

لوگ رہتے ہیں خود شوق میں [illegible]
کون کہتا ہے [illegible] آپ کو

اُن سے اب [illegible]
کیا ملا عرضِ غم کا صلہ آپ کو

ادھوری کہانی

مس صفیہ سلطانہ بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ

معرفت قاری عبدالخالق صاحب، محلہ شیرازہ لال سہارنپور

محترمی! آداب و خلوص

... پھر ایک چھوٹا سا تفریحی افسانہ پیش خدمت ہے۔ شریکِ اشاعت کرکے شکریہ کا موقع دیجئے۔ والسلام

مخلص ـــــ صفیہ سلطانہ

بہت دنوں کے بعد آج میں یہ کہانی لکھنے بیٹھی ہوں۔ یوں تو شادی کے بعد کئی بار کہانی لکھنے کا خیال ہوا لیکن ہر بار مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے قلم کو زنگ لگ گیا ہے۔ اب وہ پہلی سی بات ہی نہ رہی۔ جب ہر وقت دماغ میں کوئی نہ کوئی پلاٹ گھومتا رہتا تھا۔ جب تک کچھ لکھ نہ لیتی تھی ذہن کی خلش نہ مٹتی تھی۔

رات کا وقت ہے۔ میرے شوہر کھانا کھانے کے بعد اپنے کسی دوست کے ساتھ آوارہ گردی کرنے گئے ہیں۔ اس وقت میں پھر وہی ذہنی خلش محسوس کر رہی ہوں۔ آج اس خلش کو مٹانے کے لئے ایک اچھی سی کہانی ضرور لکھوں گی۔

میری کہانی کا ہیرو بہت حسین ہوگا۔ جیسے شفیق الرحمن کے افسانوی ہیرو ہوتے ہیں۔ گورا رنگ، اونچا قد، چوڑا سینہ، کسرتی جسم، نیلی آنکھیں، سنہرے بال... یا پھر کالی روشن آنکھیں، کالے چمک دار بال ـــــ اُس ہیرو کے لئے حجاب امتیاز علی کی افسانوی ہیروئن مناسب رہے گی۔ حسین اور پُراسرار ـــــ ویسے تو عصمت چغتائی کی ہیروئن بہت چلبلی ہوتی ہیں۔ لیکن خطرہ یہ ہے کہ کہیں وہ لپ جھپ چلتی ہوئی میری کہانی سے باہر نہ نکل جائے۔ اس لئے پہلا ہی انتخاب مناسب ہے۔

اب میرے سامنے پلاٹ کا مسئلہ ہے۔ مجھے الف لیلوی پلاٹ بالکل پسند نہیں ہیں۔ جن میں محض خیالی پلاؤ دم کیے جاتے ہیں۔ جنھیں پڑھ کر انسان کھو جاتا ہے لیکن پاتا کچھ نہیں۔ ایسی کہانیوں میں حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ کہانی وہی اچھی ہوتی ہے جس پر حقیقت کا گمان ہونے لگے۔ اس لئے میں اپنی کہانی کے لئے ایسا پلاٹ منتخب کرنا چاہتی ہوں جو صحیح معنوں میں زندگی کی عکاسی کرے۔ اگر اس نظریہ کو سامنے رکھ کر کہانی لکھی جائے گی تو اس میں کشش چندرہت پیدا ہوگی۔

مجھے اُن لوگوں کی زندگی سے کوئی پلاٹ منتخب کرنا چاہئے جنھیں میں نے قریب سے دیکھا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ میں نے ایک بار سمی کی زندگی پر کہانی لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ لڑکی ایم۔ اے میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ سمی کا پڑھنے کے سلسلے میں پہلا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اب بھی کلاس میں وہ بریلینٹ گرل سمجھی جاتی تھی۔ خالی اوقات میں وہ اکثر لائبریری میں بیٹھی نظر آتی تھی۔ کچھ لڑکیوں کا خیال تھا کہ وہ لائبریری میں مسٹر گوئل کو پسند کرتی ہے۔ مسٹر گوئل کی تعریف میں نے بھی کئی بار اس کے منہ سے سُنی لیکن کبھی اُسے اہمیت نہ دی۔ آج میں اُس تعریف کو خاطر خواہ رنگ دے سکتی ہوں۔ کہانی میں اثر کرنے کے لئے کوئی گرم پوائنٹ تو ہونا ہی چاہئے۔

سمی کی جس بات نے مجھے کہانی لکھنے پر اکسایا، وہ اُس کی خود پسندی تھی۔ وہ کلاس کی لڑکیوں سے برابری کا رابطہ ضبط رکھتی تھی۔ اس کے باوجود جب بھی کسی سے ملتی کسی نہ کسی بہانے سے اپنی تعریف ضرور کرتی تھی۔

فری پیریڈس میں لڑکیاں چار چار یا چھ چھ کے گروپ میں کالج کے لان میں آکر بیٹھ جاتی تھیں۔ وہاں کچھ اینٹیں پڑی ہوتی تھیں، جنہیں صوفہ کا نام دے کر اُن سے نشست کا کام لیا جاتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر ٹھنڈی دھوپ اور گرم ونگ پھلیاں بیک وقت کھائی جاتی تھیں۔ اس دوران بات چیت کا موضوع زیادہ تر کلاس کے لڑکے ہوتے تھے یا پھر اُن لڑکیوں پر ریمارکس کیے جاتے جو اُس وقت گروپ میں شامل نہ ہوتی تھیں۔

ایک دن ہمارے گروپ میں سنجے کی پرسنیلٹی کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ سنجے کلاس کا سب سے زیادہ بدتمیز لڑکا تھا لیکن دیکھنے میں بہت اسمارٹ معلوم ہوتا تھا۔ اُسی وقت اتفاق سے سمی وہاں چلی آئی۔ میں نے دیکھا اُس کے بیٹھنے کے لئے کوئی اینٹ نہیں ہے۔ میں نے

ستی سے مخاطب ہوکر کہا: "ہنگ یور صوفہ یور سیلف"

"آئی فیل ہنگ اِٹ فار یو" شیل نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں کیونکہ ستی نے اُسے اپنے بناتے ہوئے نوٹس دکھلانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

ترنم نے از سرِ نو بحث جاری کرتے ہوئے کہا: "سُنا ہے کہ انسان کی کامیابی یا ناکامی پر پرسنیلٹی کا بہت اثر پڑتا ہے۔ لیکن تیجے کا معاملہ اِس کے برعکس ہے بیچارہ نہ جانے کب سے ایم۔اے میں فیل ہوتا چلا آرہا ہے۔"

ستی کو اپنی تعریف کے لئے موقع مل گیا۔ اُس نے فوراً کہا۔

"اگر پرسنیلٹی ہی انسان کو کامیاب بنا سکتی ہے تو مجھے یقیناً کامیاب ہو جانا چاہئے۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تم تو ہمیشہ ہی اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتی رہی ہو" فیل نے تعریف کی۔

"ارے کہاں۔ اِس کے لئے تو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ۔۔۔ بی۔اے فرسٹ ڈویژن لانے کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کورس میں شیکسپیر کا ایک ڈرامہ "اوتھیلو" لگا ہوا تھا۔ لیکن میں نے شیکسپیر کے سب ہی ڈرامے پڑھ ڈالے۔ کنگ لیر، ہیملٹ، ٹیمپسٹ، انٹونی اینڈ کلیوپیٹرا سب اُسی زمانے کے پڑھے ہوئے ہیں" ستی نے اپنی اسٹڈی کی دھاک جمائی۔

"تمھیں پڑھنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔ یہاں تو گھر کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر ہے۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں اور ممی کی طبیعت خراب رہتی ہے" وِنود نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

ستی نے فوراً جواب دیا "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں گھر کا کوئی کام نہیں کرتی؟ تم چاہے یقین نہ کرو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرے گھر کے نوکر مفت کی تنخواہیں لیتے ہیں۔ جس کام میں میرا ہاتھ نہیں لگتا وہ یقیناً خراب ہو جاتا ہے۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے پروفیسر بھنڈاری ہمارے گھر آئے۔ اُس وقت میں ڈیڈی کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں سوئی دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے "ستی، جو ہاتھ قلم اٹھا سکتے ہیں کیا وہ سوئی بھی اٹھا سکتے ہیں" ستی نے داد طلب نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

میں نے کہا: "اِس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ سوئی تو قلم سے بہت ہلکی ہوتی ہے۔"

ستی نے گھور کر مجھے دیکھا اور لڑکیاں ہنس پڑیں۔

ایسے ہی ایک دن کی بات ہے۔

میں ایک لڑکی کے ساتھ کالج کے کینٹین میں پہنچی۔ دیکھا تو ستی اور شیل قریب ہی میز پر موجود تھیں۔ ستی اُس وقت اپنی رحم دلی کا کوئی قصہ سُنا رہی تھی۔ مسکراہٹ کے تبادلے کے بعد ہم چائے منگا کر پینے لگے۔ ہمارے آنے سے اُن کی گفتگو رک گئی تھی۔ شیل نے اُسے جاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

ستی نے کہا: "ہونا کیا۔ جس وقت میں روتی دھوتی گھر میں داخل ہوئی تو ممی گھبرا گئیں۔ اُنھوں نے پوچھا: خیر تو ہے۔ تو اس بُری طرح کیوں رو رہی ہے؟" میں نے جواب دیا "ممی میری کار کے نیچے ایک کُتّا دب کر مر گیا۔"

شیل کی آنکھوں میں کرب سمٹ آیا۔ ستی نے بات آگے بڑھائی۔

"مجھ سے اُس رات کچھ نہیں پڑھا گیا۔ دوسرے دن جب میں کلاس میں پہنچی تو بہت اُداس تھی۔ پروفیسر صاحب نے پوچھا: ستی کیا تمھاری طبیعت اچھی نہیں ہے؟' میں نے انھیں بتایا: سر! میری طبیعت ٹھیک ہے۔' اُنھوں نے پوچھا پھر کیا بات ہے؟'

میں نے انھیں بتایا: سر! کل گھر جاتے ہوئے میری کار کے نیچے ایک کُتّا دب کر مر گیا۔"

اُسی دن کینٹین میں بیٹھے بیٹھے میں نے ارادہ کیا تھا کہ ستی کا غیر معمولی کردار

اپنی کسی کہانی میں پیش کروں گی۔

آج اتنے دنوں کے بعد وہ کہانی لکھنے بیٹھی ہوں۔ میں ایک گھنٹے سے مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ لیکن ابھی تک میز پر کاغذ کی کوری شیٹ رکھی ہے۔ میں گھبرا کر سوچتی ہوں کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ میرے قلم کو زنگ لگ گیا ہے؟ میں لاشعوری طور پر کہانی کے عنوان کی جگہ 'زنگ' لکھ دیتی ہوں۔ اسی وقت میری پُشت پر آہٹ ہوتی ہے۔ میرے شوہر واپس آگئے ہیں۔ وہ کرسی کے پیچھے سے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ اُن کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے "رشمی! تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟ چلو مجھے بہت زور کی نیند آرہی ہے۔"

میرے شوہر کی آنکھوں میں پیار کی جو دعوت ہے اُسے نظرانداز کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ میں سحرزدہ سی اُٹھ کر اُن کے ساتھ چل دیتی ہوں ——— ہوسکتا ہے آپ کو یہ کہانی ادھوری معلوم ہو۔ لیکن یہ کہانی اتنی ہی ہے!!

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجیے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

غزل

باواکرشن گوپال مغموم بی۔اے

کیا گُل کھلے ہیں آپ کی دو دن کی چاہ میں
اب کٹ رہے ہیں عُمر کے دن اشک و آہ میں

بزمِ تصوّرات کی رنگینیاں نہ پوچھ
بیٹھا ہُوا ہُوں جیسے تری جلوہ گاہ میں

ماضی کے نقش، آج کی تصویر، کل کے رنگ
کیسے کہاں کہاں کے ہیں میری نگاہ میں

میری پُہنچ سے دُور، کہیں دُور تر ہو تُم
حالانکہ میرے دل میں ہو، میری نگاہ میں

اک بار ہی سہی، مگر آجایئے ضرور
پُرکیف روشنیٔ مہِ نیم ماہ میں

مغمُوم! باغِ زیست میں ہم نے کبھی کبھی
کانٹوں کے زخم کھائے ہیں پھُولوں کی چاہ میں

غزل

عرشؔ صہبائی

اُس اِک ادا کو کوئی خاک مُعتبر سمجھے
کبھی بگاڑ ہو جس میں کبھی ہو جس میں بناؤ

کہیں نہ تُم پہ اثر ہو مری وفاؤں کا
مرے قریب نہ بیٹھو مرے قریب نہ آؤ

حسیں لبوں پہ تبسّم کے جو جزیرے ہیں
اِنھیں میں ڈُوب گئی ہے مری حیات کی ناؤ

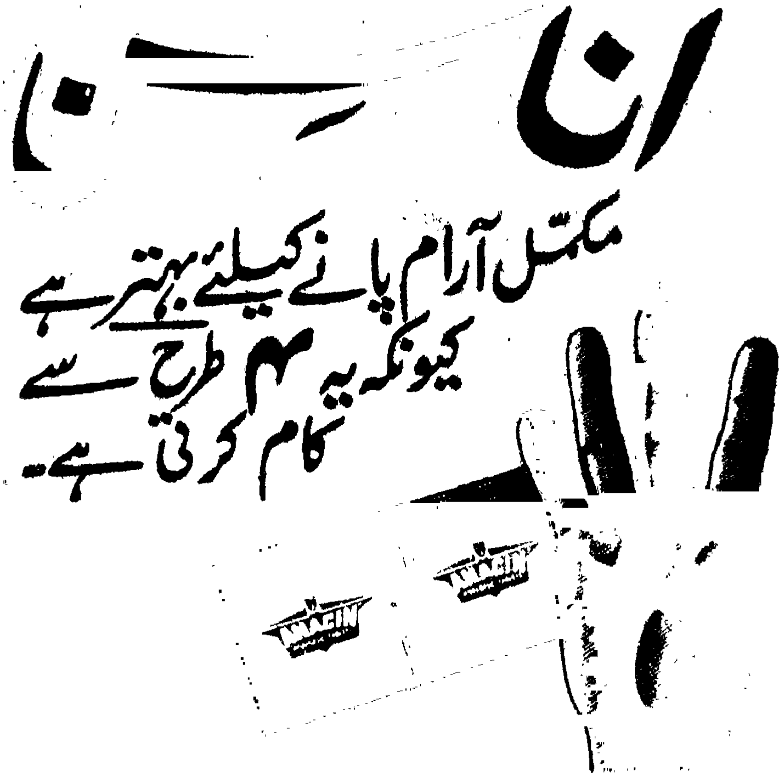
اُنھیں جو ضد ہے تو ہم کو بھی پاسِ غیرت ہے
یہ کون اُن سے کہے بار بار، مان بھی جاؤ

کسے پڑی ہے پریشان دل کا حال سُنے
کسی کی آس میں بیٹھے نہ اپنا وقت گنواؤ

تمام عُمر گزاری ہے اِس کے ساتھ مگر
سمجھ میں آ نہ سکا پھر بھی زندگی کا سبھاؤ

ستم ہے علم و اَدب کے وُہ سرپرست ہیں عرشؔ
نہیں ہے علم و اَدب سے جنہیں ذرا بھی لگاؤ

سردی ۔ زکام اور فلو؟



مکمل آرام پانے کیلئے بہتر ہے
کیونکہ یہ ۴ طرح سے
کام کرتی ہے۔



اناسن ڈاکٹر کے نسخے کی طرح دواؤں کا بے مثال مرکّب ہے۔ اِسی لئے یہ ۴ طریقوں سے جلد آرام دلاتی ہے۔

۱۔ اناسن سردی زکام اور اُسکے ساتھ ہونے والی بے چینی سے آرام دلاتی ہے — اور فوراً۔
۲۔ اناسن فلو کے دوران میں اعصابی تناؤ اور بدن کے درد کو کم کرتی ہے۔
۳۔ اناسن تھکاوٹ کو دُور کرتی ہے، جو سردی زکام اور فلو کے ساتھ اکثر ہو جاتی ہے۔
۴۔ اناسن افسردگی کو ختم کرتی ہے اور آپکے چہرے پر پھر مسکراہٹ آجاتی ہے۔

اناسن سر درد، دانت کے درد اور بدن کے درد سے بھی آرام دلاتی ہے۔

جھٹ پٹ آرام پانے کے لئے ۲ اناسن لیجئے۔

Regd. User . Geoffrey Manners & Co. Ltd

غالب کے افغان دوست اور شاگرد

خان غازی کابلی

کوچہ تمن چاندنی چوک، دہلی ۲

خوشتر گرامی قدر! سلام نیاز "باگاہ ناز" میں قبول ہو!

ایک دن جب آفتاب دن کا سفر ختم کرکے مغرب میں آرام فرمانے کی تیاریوں میں تھا۔ حوض قاضی کے چوک میں (پولیس سٹیشن کے قریب) "چاند" یعنی "حکیم ہمدرد" جناب کوثر "چاند" پوری نے نمودار ہو کر درشن دیئے علیک سلیک کے بعد اُنہوں نے "بیسویں صدی" کے محفلِ "شعر و ادب" میں غیر حاضری کا سبب دریافت کرکے فرمایا کیا خوشتر گرامی سے کچھ ناراضگی ہو گئی ہے؟ جواب میں "کابلی والے" نے عرض کیا کہ یہ خبر تو کسی دشمن نے اڑائی ہوگی ——— اور "محفلِ بیسویں صدی" میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا ——— اگرچہ انگلستان کے ایک سابق وزیر اعظم "مسٹر لائیڈ جارج" کے بقول "وعدے اس لئے کئے جاتے ہیں کہ وہ توڑے جائیں" —— وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا ——— لیکن "کابلی والے" کا وعدہ ایک "فرنگی" کا نہیں ایک سادہ دل "غازی افغان" کا وعدہ ہے اس لئے "میرزا غالب اور افغان" کے عنوان سے ایک مضمون پیش کرکے "ایفائے عہد" کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ مضمون میں چاہے اور کچھ نہ ہو لیکن اس کا عنوان یا کم از کم اچھوتا اور نرالا ہے۔ اور یقین ہے کہ "کل جدید لذیذ" کے تحت "بیسویں صدی" کے ناظرین اس سے لطف اندوز ہوں گے ——— میرزا غالب کی یہ عادت فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی کہ وہ ہر مذہب و ملت کے سرکاروں اور درباروں میں اپنا "کشکولِ شاعری" لے کر حاضر ہو جایا کرتے تھے اور اس قسم کی صدائیں لگاتے تھے کہ "آپ کا بندہ اور رہوں ننگا" "تم سلامت رہو ہزار برس" کیونکہ اُن کا پیشہ "خان غازی" اور حضرت مولانا اختر شیرانی افغانی کی طرح "عشق و آزادی" نہیں تھا ؎

عشق و آزادی ہی پیشہ ہے ہمارا "اختر" ہم کو سرکاروں سے مطلب ہے نہ درباروں سے

بلکہ اُن کا اس کے برعکس یہ طریقہ تھا کہ ؎

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

دروغ بر گردنِ اُستاد آغا لاہوری کہ ایک دن میرزا غالب اپنا "کشکولِ شاعری" لے کر شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار لاہور میں بھی حاضر ہوئے تھے اور شیر پنجاب نے اپنے تمام درباری "تک بندوں" کو جمع کرکے یہ "سمتیا" (مصرع طرح) دی تھی دیا دیا تھا، ؎

"گھو وچ لشکر آگیا ڈھول بجا، کیا ڈھول بجا"

اس پہ دوسرے درباری "تک بندوں" نے بھی مصرع لگائے تھے لیکن "شیر پنجاب" نے انعام و اکرام میرزا غالب ہی کے "کشکول" میں ڈال دیا تھا کیونکہ انہیں اُن کا یہ مصرع بہت ہی پسند آیا تھا ؎

"اس مجلسِ نامعقولاں سے لاحول ولا، لاحول ولا"

اسی طرح ایک شاعرِ نازک خیال رامپوری کی روایت ہے ایک بار میرزا غالبؔ رامپور میں افغان روہیلوں کی محفل میں بھی حاضر ہوتے تھے اُس محفل میں "مُلا تار خان" نے پشتو کا یہ شعر سُنایا ؎

"دِستانہ دِستا غم ڈیروفا دار دی ۔۔۔ نہ کلہ کلہ غم ۔۔۔ سرہ دیتہ"

"یعنی تم سے تمہارا غم زیادہ وفادار ہے ۔۔۔ کیونکہ تم تو کبھی کبھی میرے پاس ہوتے ہو لیکن تمہارا غم ہمیشہ میرے ساتھ رہا کرتا ہے۔"

یہ شعر سُن کر میرزا غالبؔ نے "افغان روہیلوں" سے کہا کہ مجھے پشتو تو نہیں آتی البتہ اگر اجازت ہو تو اسی شعر کو بزبانِ ہندی (اُردو) عرض کر دوں اِس پر "مُلا تار خان" اور دوسرے افغان روہیلوں" نے کہا "ڈیر شہ، ڈیر شہ وایا" "بہت خوب بہت اچھا! فرمائیے!" اور غالبؔ نے "افغانی چلم" کا کش لگا کر کہا ؎

روز آتا ہے، مرے دل کو تسلّی دینے ۔۔۔ تجھ سے اے دشمنِ جاں تیرا خیال اچھا ہے

اِس تمہید کے بعد (تکلف برطرف) اب اصل مضمون ملاحظہ ہو ——————— خان غازی کابلی

---

(۱) نواب تجمل حسین خاں بنگش

آخری مغلیہ دور کے شاہ فرخ سیر کے عہد میں ایک افغان جرنیل محمد خان بنگش نے وسط ہند میں "فرخ آباد" کے نام سے ایک افغان ریاست قائم کی تھی اُس ریاست کے ایک نواب تجمل حسین خان تھے "نصیرِ دولت و دیں" اور "معینِ ملک و ملت" اُن کے خطابات تھے۔ اُس نواب کے مرزا غالبؔ سے نہایت ہی گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور اُنہوں نے اُنھیں فرخ آباد آنے کی بھی دعوت دی تھی۔ یہ بات ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ مرزا غالبؔ نواب صاحب کی دعوت پر فرخ آباد گئے تھے یا نہیں لیکن نواب صاحب اور مرزا صاحب کی باہمی دوستی کے سلسلے میں غالبؔ کی ذیل کی غزل کو شہرۂ آفاق حیثیت حاصل ہے ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش "تجمل حسین خاں" کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش،
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

"ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے" اور نواب تجمل حسین خاں کے لئے "سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لئے" اِس لئے مرزا صاحب نے "ادائے خاص سے نکتہ سرا" ہونے کے بعد "در مدح نواب تجمل خاں می گوید" کی دعوت "یارانِ نکتہ داں" کو بھی دی ہے ؏

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے"

(۲) نواب تفضّل حسین خاں بنگش

نواب تجمل حسین خاں بنگش جب ۱۸۴۶ء میں قیدِ غمِ حیات سے آزاد ہوئے تو اُن کے بھائی نواب تفضّل حسین خاں بنگش ریاست فرخ آباد کے تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوئے۔ نواب تفضل حسین خاں کا "پیشہ عشق و آزادی" تھا اِس لئے جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کا بگل میرٹھ میں بجا تو افغانی جذبۂ حرّیت سے سرشار ہو کر "حریت طلب فوجوں" کا ساتھ دیا لیکن جب فرنگی سامراجیوں نے لکھنؤ کو دوبارہ سر کر لیا اور "آزادی طلب فوجوں" نے سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے فرزند برجیس قدر کی قیادت میں نیپال کا رُخ کیا تو نواب صاحب نانا دھندھو پنتھ کی فوجوں میں شامل ہو کر شجاعت کے جوہر دکھائے دو خونیں معرکوں کے بعد مجبور ہو کر نواب نے اس شرط کے ساتھ خود کو انگریزوں کے حوالے کیا کہ انہیں مکہ معظمہ بھجوا دیا جائے۔ اِس لئے انگریزوں نے فوجی حراست میں اُنھیں جدہ لے جا کر چھوڑ دیا حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے والدِ بزرگوار مولانا خیرالدین کی زبانی بیان کیا ہے کہ ...... "نواب تفضل حسین خاں بہت شوقین اور خوش پوشاک تھے لیکن جب مکہ معظمہ پہنچے تو اُن کے جسم پر چھینٹ کے ایک میلے کچیلے انگرکھے

کے سوا کچھ نہ تھا اُن کی اِس حالت کو دیکھ کر مولانا آزاد کے والد کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور جب مولانا نے اُن کی ضروریات کے انتظام کے لئے کہا تو نواب تفضّل حسین خاں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ "میں آپ کے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں میری جگہ نذر پیش کرنے کی ہے نہ کہ لینے کی" بہرحال جب مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین نے نواب صاحب کو شریف مکہ سے بلوایا تو بے نوائی کی حالت میں بھی انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ بغیر کسی تحفے کے شریف مکہ سے ملیں۔ ایک قیمتی تسبیح جو اُن کے پاس تھی، وہی بطور تحفہ پیش کر دی۔ مکہ معظمہ میں آخر دم تک اُن کا یہ معمول رہا کہ ظہر اوّل کے وقت حرم شریف میں آتے تھے پھر عشا پڑھ کر واپس جاتے تھے۔

نواب تفضّل حسین خاں (برادر نواب تجمّل حسین خان) کے مرزا غالب سے تعلقات کس درجے میں تھے۔ اِس کا پتہ اُن کی کسی نظم یا کسی غزل کے شعر سے تو نہیں ملتا۔ البتہ مرزا غالب اپنے ایک مکتوب میں اِس طرح رقمطراز ہیں

"مجھکو رشک آتا ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر یعنی ہندوستان کے قیدیوں پر عموماً اور خصوصاً زینب فرخ آباد (نواب تفضّل حسین خان) پر کہ جہاز سے اُتار کر سرزمین عرب پر چھوڑ دیا۔ آہا ہا ہا

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو"

(۳) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بنگش

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ آف جہانگیرآباد ضلع بلندشہر بھی بنگش افغان تھے پشتو لٹریچر سے اُنھیں عشق تھا۔ اِس کا ثبوت پشتو کی وہ کتابیں ہیں جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں موجود ہیں جنھیں راقم (خان غازی کابلی) بچشم خود پوہاند صدیق اللہ خان رشتین صدر افغان اکاڈیمی کی معیت میں دیکھا ہے افسوس اُن کی پشتو شاعری کا کوئی نمونہ محفوظ نہیں ہے لیکن اُردو اور فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ نواب تفضّل حسین خان بنگش کی طرح ۱۸۵۷ء میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ بھی اسیر فرنگ ہوئے تھے لیکن بعد میں "والا جاہ امیرالملک نواب صدیق حسن خان بہادر (بھوپال) کی سفارش پر رہا کر دیئے گئے تھے اور نصف جائداد کی واگزاشت ہوئی تھی اُن کے اُردو کے چند اشعار جو بطور ضرب المثل کے مشہور ہو گئے تھے ملاحظہ ہوں ۔

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

افسانہ نمبر اپنی خارجی اور داخلی خوبیوں کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ ایسی بلند پایہ نثر و نظم کا اجتماع آپ کا ذوقِ ادب ہی کر سکتا ہے۔
ڈاکٹر منوہر سہائے انور

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کیلئے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

جناب مالک رام صاحب جنھیں "غالب نویسی" پر اُن کے خیال میں شیفتہ مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے اپنی تالیف "تلامذہ غالب" میں اُن کا شمار غالب کے شاگردوں میں کیا ہے۔ لیکن میرے (غازی کے) خیال میں شیفتہ۔ غالب کے دوست قدردان، اور مربّی تھے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ غالب نے بھی اپنے کلام میں اِن کا ذکر بطور دوست اور شاعر کے کیا ہے۔ مرزا غالب نے جس فارسی غزل میں اپنے زمانے کے مشہور اور مستند شعرا کا ذکر کیا ہے اُس میں شیفتہ (حسرتی) کا نام بھی ہے ملاحظہ ہو

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی، شیفتہ، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شاں

مرزا غالب کو قمار بازی کا بھی شوق تھا۔ اِس لئے اُنھوں نے اپنے گھر میں قمار خانہ قائم کیا تھا اور اِس سلسلے میں جب گرفتار ہو کر جیل گئے تو اُن سے

اپنے خاندان کے لوگوں نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں لیکن شیفتہ نے ہر طرح سے حقِ دوستی ادا کیا۔ میرزا غالب نے اُس زمانے میں جیل میں جو نظم لکھی ہے اُس میں شیفتہ کی خدمات کا اعتراف اِس طرح کیا ہے ؎

خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غم خواریِ من
مصطفیٰ خاں بہ لباسِ بشر آمد گوئی

خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے
پایہ خویشتنم، در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوارِ من است
گر بمیرم، چہ غم از مرگ عزادارِ من است

اور نثر میں بھی میرزا غالب نے شیفتہ کے بارے میں لکھا ہے "اگر ایسا غم خوار عزاداری کے لئے موجود ہو تو مرنے کا بھی غم نہیں" جناب مالک رام صاحب نے اپنی تالیف "تلامذۂ غالب" (صفحہ ۲۰۶) پر ایک لطیفہ لکھا ہے۔

"ایک دن سردی کے موسم میں سرِ شام شیفتہ مرزا غالب سے ملنے گئے تو میرزا "ساغر و مینا" سے شوق کر رہے تھے۔ اُنہوں نے شیفتہ کو بھی دعوت دی۔ اُنھوں نے جواب دیا "حضرت میں نے توبہ کر لی ہے،" غالب بولے "ارے غضب کیا۔ کیا جاڑوں میں بھی؟" اُسی زمانے کا شعر ہے ؎

ما "حسرتی"! ز شیوۂ غالب گرفتہ ایم
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

(۴) نواب وزیر الدولہ

"افغانستان کے علاقہ بنیر کے ایک افغان امیر خان نے ۱۸۱۷ء میں فرنگیوں سے زبردست ٹکر لینے کے بعد "راجستھان" میں اسلام آباد (ٹونک) کے نام سے ایک افغان ریاست قائم کی اُن کے فرزند وزیر الدولہ بزمانۂ ولی عہدی دہلی میں قیام فرماتے تھے۔ اِس لئے دہلی کے اربابِ علم و فضل اور میرزا غالب سے اُن کے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے تھے اور جب نواب امیر خاں کی وفات کے بعد وزیر الدولہ مسند نشین ہوئے تو میرزا غالب نے اپنی مشہور تصنیف "دستنبو" بطورِ تحفہ ارسال کی اُس کے سرِ ورق کے صفحہ ۲ پر اپنے قلم سے ذیل کا قطعہ بھی لکھا ؎

نذرِ نوابِ وزیر الدولہ آں محیطِ کرم و دانش و داد
ہم بدیں حیلہ مگر یاد آید غالبِ خستہ کہ رفتست زیاد

نواب وزیر الدولہ کی مدح میں غالب نے دو قصیدے بھی کہے ہیں۔ پہلا قصیدہ ۱۸۶۱ء میں لکھ کر بھیجا جس میں ۱۵ شعر ہیں اُس کا مطلع یوں کیا ہے ؎

من وا ایزد جو ہیم دشہ معرفتِ من
رُخ جانب کشکولِ من است افسرِ جم را

ہنگامِ گدائی فتد از فرقِ سوالم
لعل و گہر از لرزہ ندستِ اہلِ کرم را

اِس کے بعد دوسرا قصیدہ مرزا غالب نے "عید الاضحیٰ" کے موقع پر بھیجا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پہلے قصیدے کا صلہ اُنہیں توقع سے زیادہ ملا۔ اِس لئے دوسرا قصیدہ کہہ کر روانہ کیا۔ اُس کے بھی دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

فہمِ ہر نکتۂ غامض کہ پیمبر فرمود
فیضِ ہر آیتِ رحمت کہ بہ قرآں آمد

یارب ایں پایہ تو بخشند و بر آں افزائد
دم آیے کہ ز سرچشمۂ حیواں آمد

(۵) نادر شاہ خان شوخی رام پوری

میرزا غالب کے افغان دوستوں اور مربیوں کے بعد اُن کے چند افغان شاگردوں کے دلچسپ حالات بھی ملاحظہ ہوں۔ نادر شاہ خان رام پور کے افغان تھے۔ اُن کے والد محمد ضامن علی خان فوج میں غالباً رسالدار تھے ۱۸۶۰ء میں جب مرزا غالب نواب یوسف علی خاں کی دعوت پر رامپور تشریف لے گئے تھے تو ایک دن نادر شاہ خان شوخی اُن کی خدمت میں اپنا کلام بغرضِ اصلاح لے کر حاضر ہوئے۔ لیکن مرزا غالب نے اصلاح دینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ وہ نواب صاحب کی دعوت پر رام پور آئے ہیں اور اُن کے وظیفہ خوار ہیں۔ اِس جواب سے نادر شاہ خان شوخی مایوس نہ ہوئے بلکہ چند دنوں کے بعد پھر ایک دن اُنکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس دن مرزا غالب کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا کیونکہ شراب کا ذخیرہ ختم تھا۔ نادر شاہ خان اِس حالت کو دیکھ کر فوراً مرادآباد گئے اور وہاں سے شراب کی پانچ بوتلیں لاکر غالب کو پیش کیں۔ شراب کی بوتلیں دیکھ کر غالب بھول گئے کہ وہ نواب کے وظیفہ خوار ہیں اور اُن کی دعوت پر رام پور آئے ہیں یہ مثل مشہور ہے کہ زر فولاد کو نرم کر دیتا ہے لیکن غالب کو شراب کی پانچ بوتلوں نے نرم کر دیا اور لہر میں آکر نادر شاہ خان شوخی کی غزل پر اصلاح دے دی۔ جب مرزا غالب رامپور سے واپس دہلی آ گئے تو شوخی دہلی میں بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ وسطِ عمر میں شوخی معاش کے سلسلے میں بنارس گئے اور وہاں کلکٹری میں

پہلے نائب ناظم پھر پیشکار ہوئے۔ پھر بنارس سے بسلسلۂ تجارت کلکتہ گئے۔ کلکتہ میں مولانا آزاد سے بھی ملاقات کی تھی اور بیسویں صدی کے اوائل میں وفات پائی بطورِ نمونہ اُن کے کلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

آج پھر پی کر شراب آئے ہیں اُن کی بزم میں
کل نکلوائے گئے تھے ہم اِسی تقصیر پر

ہر ہر سخن پہ جان نہ دینے کا ہے گلہ
اِک بات آگئی ہے بُتِ خود نما کے ہاتھ

بنا کروں کوئی میخانہ جی میں ہے شوخی
کہ بعدِ مرگ زمانے میں یادگار رہے

(۶) معشوق علی خان جوہرؔ شاہجہانپور

روہیل کھنڈ (وسطِ ہند) کے افغان تھے۔ اُن کے جدِّ اعلیٰ محمد عمر خان عرف عمر بابا افغانستان کے علاقہ "تھکنی" کے رہنے والے تھے۔ معشوق علی خان جوہرؔ ۱۸۵۲ء میں شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام اصغر علی خان تھا۔ بھوپال میں اردو زبان کو اُنہی کی کوششوں سے ترقی ہوئی ہے ۱۹۰۸ء میں بھوپال سے حیدرآباد دکن گئے اور وہاں کی ہائی کورٹ سے سندِ وکالت حاصل کی ۱۹۲۵ء میں اپنے وطن شاہجہان پور واپس آئے۔ اور اگست ۱۹۲۸ء میں وفات پائی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

غربت کی آفتوں کا گلہ کس لئے کریں!
اے ہم نشین! پائی تھی راحت وطن میں کیا

پیرِ مُغاں کا کس لئے ملتا نہیں دماغ
فصلِ بہار آ ہی گئی ہے چمن میں کیا

گردن پہ وہ رکھ رکھ کے اٹھا لیتے ہیں خنجر
کچھ کچھ ہے محبت کی جھلک طرزِ جفا میں

بربادیِ گلشن پہ ہیں گُل چاک گریباں
پیدا اثرِ درد ہے غنچوں کی صدا میں

تکلیف نہیں کوئی بھی ہر چند قفس میں
لیکن ہے یہ کہنے کو کہ ہیں بند قفس میں

دم گھٹتا ہے گھبراتا ہے دل، ہوش ہیں اُڑتے
دشمن کو بھی رکھے نہ خداوند قفس میں

...کیا خوب نمبر نکالا ہے۔ خوشتر گرامی اور "بیسویں صدی" کے خاص نمبر اپنا اپنا الگ الگ، کوئی روپ نہیں رکھتے۔ آپ کی شخصیت "بیسویں صدی" کے نمبروں میں اِس قدر تحلیل ہوگئی ہے کہ اب آپ کا اپنا الگ وجود کوئی نہیں۔ اب آپ خوشتر گرامی کی جگہ خوشتر بیسویں صدی لکھا کریں...

کشمیری لال ذاکر، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ہریانہ، چنڈی گڑھ

(۷) نوابؔ مردان علی خان نظامؔ

نواب مردان علی خان نظامؔ مُرادآباد (روہیل کھنڈ) کے رہنے والے تھے اور یوسف زئی قبیلے کے افغان تھے۔ اُن کے بزرگ شاہانِ دہلی اور اودھ میں بڑے بڑے منصبوں پر فائز رہے ہیں۔ خود نواب مردان علی خان نظامؔ ۱۸۵۰ء میں بمقام راولپنڈی کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں پیشکار رہے اور پھر ترقی کر کے تحصیل دار بنے، ۱۸۵۷ء میں یہ پنجہ صاحب (حسن ابدال) میں تحصیلدار تھے۔ ۱۸۵۸ء میں انگریزی کی ملازمت سے مستعفی ہوئے تو نواب مالیر کوٹلہ کے ہاں مدارالمہام مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۱ء میں ریاست کپورتھلہ میں کنور کرم سنگھ کے سیکرٹری ہوئے یہاں تین سال گزارنے کے بعد الور کے راجہ شیو دھیان سنگھ کے پاس آئے۔ ۱۸۶۷ء میں مارواڑ میں نائب دیوان مقرر ہوئے اور بعد میں دیوان بنے۔ مہاراجہ بہادر کی طرف سے نظام الدولہ منتظم الملک نواب محمد مردان علی خان بہادر قائم جنگ کے خطابات عطا ہوئے اور ساتھ ہی جاگیر اور نقارہ و نشان کا اعزاز بھی عنایت کیا گیا۔ میو کالج اجمیر میں گھنٹہ تین ہزار روپے کے خرچ سے اِنہی کی یادگار ہے۔ ۱۸۷۹ء میں ملازمت سے فارغ ہو کر بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ جون ۱۸۷۹ء میں سری نگر میں وفات پائی۔ ساری عمر مجرد رہے۔ اُن کی وضع قطع اور لباس بھی ہمیشہ ہی افغانی رہا۔ سر پر بھاری پگڑی باندھتے تھے اور چُغہ پہنتے تھے۔ ابتدا میں اُن کا تخلص مضطرؔ تھا۔ پھر رعناؔ رکھا اور جب نواب کا خطاب مہاراجہ مارواڑ نے عطا کیا تو نظامؔ تخلص کر لیا۔ اُنہوں نے اپنی ایک رُباعی میں تینوں تخلصوں کو اِس طرح باندھا ہے ؎

آغازِ سخن وری میں "مضطرؔ" تھا نام
رعناؔ تھا شبابِ شاعری کے ہنگام
ہے زیرِ نگیں جو کشورِ نظم تو اب!
نوابؔ خطاب اور تخلص ہے نظامؔ

گذرا ہے مرا نالۂ دل چرخِ کہن سے
تھا رشح کا ہمدم، نہ پھرا جا کے وطن سے
گھٹ گھٹ کے تم ہجر میں جی نکلا ہے تن سے
اب جانِ حزیں چھوڑ گئی رنج و محن سے

جلوہ ہر رنگ میں دیکھا ترا اے گلِ رو پیدا
ہر گلِ باغِ جہاں سے ہے تری بو پیدا

میں دل سے بے نیاز ہوں، دل مجھ سے بے نیاز
دل میرا آشنا ہے نہ میں آشنائے دل

کھو چکے پہلے ہی ناموس کو اور نام کو ہم
پہنچے آغازِ محبت میں ہی انجام کو ہم

(۸) نواب محمد یوسف علیخاں ناظم رامپوری

میرزا غالب کے کئی افغان دوست اور مربی تھے اُن میں رامپور کے نواب محمد یوسف علی خان ناظم ایک ایسی شخصیت ہیں جو نہ صرف غالب کے دوست و مربی تھے بلکہ آقا بھی تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ غالب کے شاگرد بھی تھے۔ اگرچہ مولانا نجم الغنی کا بیان ہے کہ نواب یوسف علی خان ناظم نسباً حسینی سید تھے لیکن چونکہ ہندوستان پر جن افغان خاندانوں نے حکومت کی ہے اُن میں ایک خاندان سادات کا بھی تھا جسے مورخوں نے افغانوں میں ہی شامل کیا ہے اسی طرح موجودہ زمانے کے مشہور مفکر سید جمال الدین افغانی ہی مشہور ہیں اور اُنہوں نے اپنے نام کے ساتھ فخریہ طور پر لفظ افغانی لکھا ہے خیر مولانا نجم الغنی کے نزدیک نواب یوسف علی خان ناظم کا سید حسینی ہونا چاہے کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو ایک افغان کے لئے وہ سند نہیں ہو سکتا ہے افغان کے لئے تو افغان کی بات ہی سند ہو سکتی ہے اور چونکہ ریاست رام پور کے بانی نواب علی محمد خاں تھے جو نواب محمد یوسف علی خان ناظم کے جدِ اعلیٰ گذرے ہیں۔ اُن کی وفات پر خوشحال خان خٹک کے پڑپوتے کاظم خاں شیدا نے تاریخِ وفات ——— کہی ہے اس لئے ایک افغان کی حیثیت میں میرے نزدیک نواب محمد یوسف علی خان ناظم افغان ہی تھے۔ اس بات کی اِس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ رامپور کی کلیتہً آبادی افغانوں کی ہے افغانوں کی عصبیت سے یہ بات بعید ہے کہ وہ ایک غیر افغان کی حکمرانی کو برداشت کریں اور چونکہ رام پور کی تمام آبادی رام پور کے نوابوں کی فدائی ہے اِس لئے نواب محمد یوسف علی خان ناظم اور رام پور کے تمام نواب افغان ہی تھے اور ہیں۔ نواب محمد یوسف علی خان ناظم میرزا غالب کے فروری ۱۸۵۷ء میں شاگرد ہوئے تھے اُن کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر بزم میں سب نے اُسے چلتے دیکھا

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں!
میں نے میخانے سے کس کس کو نکلتے دیکھا

جو کہئے دردِ دل سنئے تو کہتے ہیں کہ ہاں کہئے
اُسی کو دردِ دل کہتے ہیں جو گفتار میں آئے

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی
تم اچھے ہم بُرے، قدرت خدا کی

میری وفا کی داد، نہ جرم عدو کی بحث
کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے پر انصاف کرو
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

میں نے کہا کہ دعویٔ اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

محشر میں کھینچوں ترا دامن، بھلا دیکھوں کہ تو
واں بھی جھنجھلا کر کہے "یوسف علیخاں چھوڑئے"

نواب یوسف علیخان ناظم کے مندرجہ بالا اشعار کے [illegible] بھی بتانے میں کہ ناظم [illegible] ہیں۔ ناظم کے علاوہ ۱۵ اور بہت سے شعراء [illegible] غالب کے شاگرد تھے اُن کا ذکر صفحات کی تنگ دامانی کے باعث ممکن نہیں کیونکہ ع
"سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لئے"

غزلیں

مس رضیہ سلطانہ سہارنپوری

ہم جوانی میں پیار کو ترسے
فصلِ گُل میں بہار کو ترسے

دل تو یادوں سے ہم کنار رہے
آنکھ دیدارِ یار کو ترسے

سب پہ تیری نگاہِ لطف ہوئی
اِک ہمیں تیرے پیار کو ترسے

میری مژگاں سے ٹوٹتے آنسو
آج دامانِ یار کو ترسے

عشرتِ سرمدی کی حسرت میں
زندگی بھر قرار کو ترسے

گلستانِ حیات سلطانہ
آہ، فصلِ بہار کو ترسے

معین کوثر

رکھے ہوئے بھرم دلِ ناکام ہی تو ہے
ورنہ تری وفا کا فقط نام ہی تو ہے

آخر فریب خود کو بھی دینے کی حد بھی ہو
افسردہ کیوں نہ ہو دلِ ناکام ہی تو ہے

زخمِ جگر کی بات چمن کو کہاں نصیب
پھولوں کا رنگ خوب سہی خام ہی تو ہے

اُلفت کی اِس کو پختہ مزاجی کہاں نصیب
کیوں سرنگوں نہ ہو کہ ہوس خام ہی تو ہے

کہتا ہے بار بار مرا عزمِ اُستوار
منزل ہزار دُور ہو، دو گام ہی تو ہے

رُسوا ترا جنوں ہے جو کوثر تو کیا ہوا
اُنکی نگاہِ ناز بھی بدنام ہی تو ہے

معظم اشرفی۔ بی۔ اے آنرز

اُن سے نظر ملائے زمانہ گزر گیا
دل پہ یہ چوٹ کھائے زمانہ گزر گیا

اے اہلِ بزمِ غم کو مبارک یہ قہقہے
ہم کو تو مُسکرائے زمانہ گزر گیا

پھر ڈھونڈتی ہے دلبرِ طناز کو نگاہ!
دنیائے دل بسائے زمانہ گزر گیا

صدقہ نگاہِ مست کا ساقی بس ایک جام
دل کی لگی بجھائے زمانہ گزر گیا

پھر رہنمائے محفلِ جاناں ہے اضطراب
احوالِ دل سُناتے زمانہ گزر گیا

محشر ہے آج بھی دلِ دیوانہ کی تلاش
گرچہ اُسے گنوائے زمانہ گزر گیا

نیلوفر ناہید

آگ دل میں لگی، لو جگر سے اُٹھی آرزوؤں کا نام ونشاں جل گیا
شعلہ ہائے محبت بھڑکنے لگے اور کُل عالمِ جسم و جاں جل گیا

بارورِ شاخِ حسرت ہوئی بھی تو کیا نخلِ اُمید پھولا پھلا بھی تو کیا
میری خوشیاں کسی نے نہ دیکھی گئیں، آتشِ رشک سے اِک جہاں جل گیا

جس سے تھی زینتِ محفلِ زندگی جس سے تھی چشمِ اُمید میں روشنی
تو بھی خوش ہو لے اے گردشِ آسماں وہ بھی سامانِ تسکینِ جاں جل گیا

کون سمجھے یکایک یہ کیا ہو گیا غنچہ و گُل پہ رنگِ خزاں چھا گیا
آگ کیسی برسنے لگی چار سو، دیکھتے دیکھتے گلستاں جل گیا

باغباں کی نہ گلچیں کی اس میں خطا مجھ کو اپنوں کا بھی تجربہ ہو گیا
یہ بھی اکثر ہوا ہے کہ اے نیلوفر آتشِ گُل سے ہی آشیاں جل گیا

وصیّت

فکر تونسوی

اِس مرتبہ فکر تونسوی ہنتو پدیش نہیں دے رہا کیونکہ وہ فالج کے بستر پر پڑا موت و حیات کا مضحکہ خیز تماشا دیکھ رہا ہے۔ اُس بستر سے اُس نے ایک وصیت ارسال کی ہے۔ اس وصیت پر عمل ہوگا یا نہیں؟ یہ اُس مضحکہ خیز تماشے کے انجام پر منحصر ہے۔ لیکن موذی فالج سے لرزتے ہاتھوں سے لکھا ہوا یہ وصیت نامہ اُس تماشے کا منہ توڑ جواب ضرور ہے۔

میری وصیت

میں یہ وصیت نامہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میری جائداد جو ڈیڑھ کمرے کے مکان پر مشتمل ہے اُس پر جھگڑا کھڑا نہ ہو جائے اور میرے وارث ایک دوسرے کا خون نہ کر ڈالیں۔ کیونکہ گزشتہ دنوں ہمارے محلّے کے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا ایک گھٹنا اور ایک ٹانگ اس بات پر توڑ دی تھی کہ ان کا مرحوم باپ اپنے پیچھے جو اینٹیں چھوڑ گیا تھا، ان کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا تھا یعنی ایک بھائی نے ایک اینٹ زیادہ اُٹھالی تھی۔ اینٹ کا سائز چھ انچ ضرب دس انچ بتایا جاتا ہے۔

میں یہ وصیت پیشگی لکھ رہا ہوں کیونکہ میں یہ نہیں جانتا کہ میں اب مروں گا کبھی۔ جیوتشیوں نے میری عمر مختلف بتائی ہے۔ ایک نے پچاس سال، ایک نے پچپن اور ایک نے نوے۔ یہ تینوں اندازے صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی کیونکہ آج کل سب جیوتشی ناقص پلاسٹک کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ میری عمر اس وقت اٹھاون سال ہے۔ عین ممکن ہے میں ایک سو اڑتالیس سال تک بھی زندہ رہوں کیونکہ ساٹھ سال کی عمر کے بوڑھے بڑی بڑی عمر تک جیتے رہتے ہیں۔ لمبی عمر تک زندہ رہنے کی صرف دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک صبح کی سیر کا لطف اٹھاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کی خبر اخباروں میں شائع ہو سکے کہ فلاں صاحب ایک سو بیس سال کی عمر کے ہیں لیکن ابھی تک زندہ ہیں۔ (نہ جانے ان کے زندہ رہتے چلے جانے کی وجہ کیا ہے؟)

بہر کیف عین ممکن ہے، صرف اخبار میں خبر چھپوانے کی خاطر مجھے بھی ایک سو اڑتالیس سال تک زندہ رہنے کی حماقت کرنی پڑے۔ حماقت انسان کی مجبوری ہے، خواہش تو نہیں ہے۔

میرے گھر کے چھ افراد ہیں (ساتواں زیرِ تعمیر ہے)۔ میں نے زندگی میں جو کچھ کمایا، یہ افراد اسے اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر کھا گئے۔ میرا بڑا لڑکا جب خود کمانے لگا تو مجھے گالیاں وغیرہ دے کر مجھ سے الگ ہو گیا۔

چند سال پہلے ایک بیمہ ایجنٹ نے مجھے موت کا ہوّا دکھا کر گمراہ کر دیا تھا اور میں نے دو ہزار روپے کا بیمہ کروا لیا تھا۔ دو سال تک قسطیں ادا کرتا رہا۔ (اس دوران میں وہ بیمہ ایجنٹ خود مر گیا) اچانک ایک دن میں اپنے دو چھوٹے بچوں کی باتیں سن کر راہ راست پر آگیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"پپّو! ڈیڈی نے بیمہ کیوں کروا رکھا ہے؟"

"ہمارے لئے۔"

"ہمارے لئے کیسے؟"

"دیکھ بے وقوف! جب ڈیڈی مر جائیں گے تو یہ دو ہزار روپے ہمیں مل جائیں گے۔"

"نہ جانے ڈیڈی کب مریں گے؟"

"جب بھگوان چاہیں گے۔"

"نہ جانے بھگوان کب چاہے گا؟" (ٹھنڈی آہ!)

میں راہ راست پر آگیا اور بیمے کی قسطیں دینا بند کر دیں۔ کیونکہ میں نے سُنا تھا کہ بھگوان بچوں کی دعائیں جلدی قبول کر لیتا ہے ——— اس لئے میں وصیت کرتا ہوں کہ اگر میری موت کے بعد بیمہ کمپنی میری جمع شدہ قسطیں واپس کرے تو وہ روپے میرے بچوں کو نہ دیے جائیں بلکہ کسی یتیم خانے کو دے دیے جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بعد میرے بچے بھی یتیم کہلائیں گے۔ لیکن موت کے بعد میرے لئے سبھی یتیم بچے برابر ہیں۔

میرا جو ڈیڑھ کمرے کا مکان ہے، اُسے میرے گھر کے چھ افراد میں تقسیم کر دیا جائے۔ احتیاطاً عرض ہے کہ میں نے یہ مکان بھارت شدھ عار فنانس کمپنی سے قرض لے کر خریدا تھا اور میرے گھر والے نہیں جانتے کہ میں نے قرض کی قسطیں کن کن خفیہ طریقوں سے ادا کیں۔ مثلاً میں نے بچوں کی نیکروں میں سے کپڑا بچایا۔ انھیں ٹوٹے دیے، جرابیں نہ لے دیں، یعنی جرابیں بچائیں۔ ایک بار میں نے اپنے چھوٹے بچے سنتوش کو چھوٹے سائز کی سلیپر خرید کر دی۔ یعنی سائز بچایا۔ میں نے بچوں کے دودھ میں پانی ملا کر انھیں بتایا کہ پتلا دودھ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ میں نے

تینوں بچوں کو ایک چارپائی پر سُلا کر اُن میں برادرانہ اخوت پیدا کی۔ کانچ کی چوڑیاں پہنا کر میں نے بیوی کو زیادہ رومانٹک اور دلکش کہا اور اپنی تیوہ چوتھائی عمر بیوی کو یہ سمجھانے پر صرف کی، کہ تم چاند کی طرح حسین ہو۔ کیونکہ چاند گہنے اور ساڑیاں نہیں پہنتا۔

یعنی اس طرح میں قرض کی قسطیں ادا کیں اور یہ باتیں میرے کُنبے میں کسی کو معلوم نہیں۔ اگر میں اپنا غم نہ چُھپاتا تو گھر والے کبھی خوش نہ رہتے اور یہی میری ذہانت تھی۔ انسان غریب ہو تو ذہین ہو جاتا ہے اور صرف ذہانت ہی نے غریبی کا ساتھ دیا ہے، فنانس کمپنیوں نے نہیں۔

لیکن میری ذہانت کے باوجود فنانس کمپنیوں کی دو قسطیں ابھی تک باقی ہیں۔ اس لئے قانونی طور پر کمپنی ہی اس مکان کی مالک ہے۔ اگر میرے وارث میری دو قسطیں ادا نہ کر سکیں تو بلاشبہ اُسے قرق ہونے دیں۔ میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے اخلاق کو بلند دیکھنا چاہتا ہوں۔

میرے بعد میرے بچوں کا کیا مستقبل ہوگا؟ میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتا کیونکہ میری تھیوری یہ ہے کہ ہر بچہ اپنا مستقبل خود بناتا ہے۔ والدین تو بچوں کی بیکار کی کرتے ہیں، جسے ہر بچہ آسانی سے توڑ دیتا ہے اور توڑنے کے بعد کوئی خوانچہ لگا لیتا ہے کوئی کلرک بن جاتا ہے، کوئی سمگلر، کوئی بیرسٹر، کوئی غنڈہ اور کوئی تھانیدار ـــــ کبھی کبھی کسی خوانچہ فروش کا بچہ وزیر بھی بن جاتا ہے اور اُس وزیر کا بچہ جیب کاٹتے ہوئے بھی پکڑا جاتا ہے۔

اِس لئے بچوں کے بارے میں باپ کو وصیت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ البتہ فرداً فرداً میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا لڑکا پاشی تو فلم ایکٹر بننے کے لئے بھاگ جائے گا۔ آج کل وہ مقامی سینما میں بلیک کی ٹکٹیں بیچتا ہے۔ دوسرا لڑکا رام کمار کوئی نہ کوئی مٹھ چلائے گا۔ اگرچہ اُس بیچارے کو ابھی یہ علم نہیں کہ اُس کے اندر دھرم کے نام پر لُوٹ مچانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

آج کل وہ ایک دیوی کا بھگت ہے جو ہزاروں کماتی ہے۔ رام کمار بھی ہزاروں کمانے لگا۔ گورو بن کر کار پر چڑھے گا، کوٹھی میں رہنے لگا۔ بڑے بڑے انڈسٹریلسٹ اُس کے میلے پاؤں دھوئیں گے، حسینائیں اُس کے اردگرد رقص کریں گی اور رام کمار انھیں بتائیں گے کہ یہ رقص، یہ خوشبوئیں آتما اور پرماتما کے وصال کا ذریعہ ہیں۔

اور اگر رام کمار یہ سب چھ نہ کرے گا یعنی وہ ذرا سا بھی چوک گیا تو گنگا میں جا کر چھلانگ لگا دے گا کیونکہ آتم ہتیا بھی آتما اور پرماتما کے وصال کا ذریعہ ہے ـــ تیسرا لڑکا بھولے ناتھ چپراسی، قُلی، بس کنڈکٹر، اور ڈویژن کلرک ۔ ۔ ۔ اِن میں سے کوئی بھی عہدہ پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر سماج نے اُسے اِن میں سے کوئی چیز حاصل نہ کرنے دی تو وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جائے گا یا شاعر بن جائے گا۔ بھولے ناتھ بنیادی طور پر نیک ـــ اور مخلص آدمی ہے۔ اِس لئے اُس کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ کلرک بن جائے، پھر شادی کرے، پھر بچے پیدا کرے جیسا کہ ہر بے بس گرہستی میں رواج چلا آ رہا ہے۔ البتہ وہ مُنہ کا مزہ بدلنے کے لئے کلرکی کے ساتھ ساتھ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر بھی بن جائے اور شاعری وغیرہ بھی کرتا رہے تو کوئی ہرج نہیں۔ سوسائٹی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

میری دو لڑکیاں بھی ہیں، جنھیں میں لڑکوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ بڑی بالا عمر اٹھائیس سال ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔ وہ دوشیزگی میں بھی بیوہ سی معلوم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اُس نے دوشیزگی اور بیوگی کی درمیانی منزل خواب ہی خواب میں پار کر لی ہے۔ میں نے کئی بار جان بوجھ کر آنکھیں بند کیں تاکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے، وہ نہیں بھاگی۔ شاید اُس کا خیال ہے کہ عزت دار خاندانوں کی لڑکیاں کسی سے پیار نہیں کیا کرتیں بلکہ پیار اور شادی کے مراحل خواب میں طے کرنے کے بعد جوگن بن جاتی ہیں یا سماج سُدھار کا کام کرنے لگتی ہیں۔

بہرکیف بالا کا مستقبل طے شدہ ہے۔ یعنی بیوگی اور سماج سُدھار۔ جب اپنا سُدھار نہ ہو سکے تو سماج ہی کا سُدھار کرنا پڑتا ہے۔

دوسری لڑکی ونملا ہے۔ (عمر اکیس سال) اگر اُس کی زندگی میں کوئی غیر متوقع حادثہ نہ ہو گیا تو وہ اپنی بڑی بہن کے نقشِ قدم پر چلے گی۔ گزشتہ دو برس سے وہ اکثر خاموش رہنے لگی ہے۔ یہ خاموشی خطرناک ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ میری موت کا انتظار کر رہی ہے۔ کاش میں جلدی انتقال کر جاؤں تاکہ اُس کی خاموشی کے طوفان کو پھٹنے کا موقع مل سکے۔ مجھے اُس سے سچ مچ بڑی محبت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ پیار یا شادی سے پہلے اُس پر بھی بیوگی کا زمانہ آ جائے۔ بیوگی سے پہلے کم از کم شادی شدہ تو ہونا ہی چاہئے۔ شادی دو سچی

پیاری بہن !

ونملا کا خاموش طوفان اگر میری موت تک زندہ رہ سکا تو میری وصیت ہے کہ ضرور پہنچے۔ اس سے میری آتما کو تسکین ملے گی۔ سماج سدھار کے نئے میں صرف ایک لڑکی کی بھینٹ کر سکتا ہوں، دونوں نہیں۔

میرے خاندان کی سب سے بڑی ہستیا میری بیوی ہے۔ وہ ساری زندگی میرے ساتھ محبت اور نفرت کے درمیان لٹکتی رہی ہے۔ میرے بعد وہ دھاڑیں مار مار کر روئے گی کہ میرے سر سے سایہ اُٹھ گیا۔ حالانکہ میں اُس کے سر پر ہمیشہ چلچلاتی دھوپ کی طرح چمکتا رہا۔ وہ میرے سر پر بجلی کی طرح کڑکتی رہی۔ میرے بعد دھوپ اور بجلی دونوں کا رول ختم ہو جائے گا اور گہرا بھیانک اندھیرا چھا جائے گا۔ اسی اندھیرے سے بچنے کے لئے وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ "اے بھگوان! مجھے میرے پتی دیو سے پہلے اس دُنیا سے اُٹھا لے" اگر بھگوان ایسا نہ کر سکا تو مجبوراً میرے بعد وہی میری جانشین ہوگی۔ وہ ایک دلیر عورت ہے۔ لیکن صرف میرے جیسے بزدل کے سامنے جب بزدل درمیان سے نکل گیا تو اُس کی دلیری بیکار ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ میرے بعد وہ خاندان کے شیرازہ کو بکھرنے سے روک نہ سکے گی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ جب شیرازہ بکھر جائے تو وہ کسی ودھوا آشرم میں داخل ہو جائے۔ کیونکہ ہر ہندوستانی عورت کی دو منزلیں ہیں۔ گرہستی اور ودھوا آشرم۔ درمیان کی سبھی منزلیں دھوکا ہیں، فریب ہیں، چھلاوا ہیں۔

ان کے علاوہ میں اپنے پیچھے کچھ دشمن چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ سبھی دشمن کبھی میرے دوست تھے۔ جب ایک ایک کرکے میرے سبھی دوست میرے دشمن بن گئے تو میں نے مزید دوست بنانا چھوڑ دیئے۔ اس لئے اس وقت میرا کوئی دوست نہیں ہے اور بغیر دوست کے مر جانے میں مجھے بہت راحت مل رہی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ اب میرا کوئی دوست میرے بچوں سے ہمدردی کرنے نہ آئے گا۔ صرف دشمن ہی آئیں گے جو کہیں گے اب مرحوم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں رہی۔

میں نے زندگی میں کچھ لوگوں کے ساتھ نیکیاں کیں جن کا اعتراف زندگی میں کسی نے نہیں کیا۔ لیکن اب وہ انھیں اپنے دماغ کے قبرستان میں سے کھود کھود کر نکالیں گے۔ اور کہیں گے ـــــــ "مرحوم عظیم تھا، نیک تھا۔ جس کا پھل اُسے ضرور ملے گا۔ آہ! اُسے کچھ مزید نیکیاں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ وہ اور نیکیاں بھی کرتا"

میں نے کچھ لوگوں سے بُرائیاں بھی کی ہیں۔ جنھیں لوگوں نے میری زندگی میں ہمیشہ یاد رکھا ہے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد وہ انھیں بھول جانے کی کوشش کریں گے۔ یہ اُن کے اخلاق کی بلندی ہوگی۔ اخلاق ہمیشہ موت کے بعد بلند ہوتا ہے۔ لیکن انھیں یہ بھی جاننا چاہئے کہ انھوں نے بھی مجھ سے کافی بُرائیاں کی ہیں۔ اس لئے بُرائیوں کا حساب کتاب برابر سمجھا جائے اور اس سلسلے میں مزید تحقیقات بند کر دی جائے۔ اگرچہ مجھے شک ـــــ ہے کہ میں نے نسبتاً کم بُرائیاں کی ہیں۔

میرے گھر میں کچھ فرنیچر ہے، کچھ برتن ہیں، کچھ کپڑے ہیں جنھیں میرے گھر والے آپس میں تقسیم کریں یا دان کریں۔ ایک ایک کُرسی اور ایک ایک گلاس پر ایک دوسرے کے گھٹنے توڑیں یا نہ توڑیں مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سب چیزیں سائے ہیں۔ گلاس بھی، گھٹنا بھی۔ اس لئے مائے کی خاطر مائے کو توڑنا بے وقوفی ہے۔

اس کے علاوہ میرے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ ان میں اکثر مانگے کی ہیں کچھ چُرائی ہوئی ہیں۔ وہ کسی لائبریری کو دان کر دی جائیں۔ کچھ خطوط ہیں۔ جن میں کچھ اُن دوستوں کے ہیں، جو انھوں نے دشمن بننے سے پہلے لکھے تھے، کچھ رشتے داروں کے ہیں، جو زندگی میں بھی بے معنی تھے اور مرنے کے بعد بھی بے معنی ہوں گے اور کچھ خطوط وہ ہیں جو میری محبوبہ نے مجھے لکھے تھے۔ دُنیا کے ہر انسان کے پاس کم یا زیادہ ایسے پریم پتر ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن میری محبوبہ اب ایک شادی شدہ معزز خاتون ہے اس لئے میرے وارث اُن خطوط سے اُسے بلیک میل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ لیکن موت سے ایک دن پہلے میں ان محبت ناموں کو تلف کر دوں گا۔ میں اپنی محبوبہ کو بھی وصیت کروں گا کہ اگر اُس کے پاس بھی میرے کچھ خطوط ہوں تو انھیں تلف کر دے۔ رُسوا ہونے یا کرنے کا کیا فائدہ۔ رُسوائی صرف زندہ انسانوں کے لئے مناسب ہے۔

اپنا وصیت نامہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے وارثوں کو ایک ضروری اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک جیوتشی پنڈت رگھوبر دیال شاستری نے کہا تھا "تیری موت کسی اونچی جگہ سے گرنے سے ہوگی۔" اگر ایسا نہ ہوا تو میرے وارثوں کو چاہئے کہ اُس جیوتشی کو پکڑ کر کسی اونچی جگہ سے گرا دیں تاکہ اُس کا جیوتش اگر میرے حق میں صحیح ثابت نہ ہوا تو اُس کے حق میں تو صحیح ثابت ہو جائے!!

...افسانہ نمبر جیسا عظیم نمبر پیش کرنا کسی عظیم ہی انسان کا عظیم کارنامہ ہوسکتا ہے!! افسانہ نمبر بلا مبالغہ قابلِ رشک ہے اور قابلِ فخر بھی...

آسی رام نگری

افسانہ

آندھی

سُرجیت ایم۔ اے

سی ۴۴، سُدرشن پارک، موتی نگر۔ نئی دہلی ۵؛

قابلِ احترام بھائی!

ایک ہینگری کہانی "آندھی" لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہا ہوں۔ یقین ہے کہانی آپ کو اور "بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین کو پسند آئے گی۔ کہانی کا عنوان خشک ہے، لیکن انجام اتنا ہی رنگین ہے ــــــ "بیسویں صدی" اُردو کا سب سے بلند پایہ، سب سے مقبول اسٹوری میگزین ہے۔ میری رائے میں آپ اُردو افسانوں کے ساتھ اس میں دوسری زبانوں کی کہانیاں بھی پیش کیا کریں۔ "بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین اِس افسانے کو یقیناً پسند فرمائیں گے۔

خلوص کار ــــــ سُرجیت

ریتا کمرے میں یوں داخل ہوئی جیسے ہلکی سی ہوا آتی ہے۔ اُس کے قدم رقّم تھے۔ اُس کے پیروں میں بڑے سے بوٹ تھے۔ ہوسٹل کی ایک لڑکی سروج نے پُرمسرت چہرے سے اُس کی طرف دیکھا۔ ریتا نے بازوؤں میں سنبھالے ہوئے "کچھ" کو آہستہ سے بیڈ پر رکھا۔ یوں ادا کے ساتھ کہ کچھ فاصلے پر چُولہے کے اوپر پیاز بھونتی ہوئی پورنیما نے بھی پہلو بدل کر ریتا کی طرف دیکھا۔

"یہ میرا کوٹ ....." ریتا نے کوٹ پر لپیٹے ہوئے کاغذ کو دھیرے سے چھو کر کاغذ کی آواز سُنی اور پھر مُسکرا پڑی۔

"واقعی تُونے کوٹ خرید لیا؟" سروج نے اشتیاق سے پُوچھا۔

کاغذ پر باندھے ہوئے دھاگے کو ریتا نے اُنگلیوں کے پوروں سے چھُوا لیکن دھاگے کو توڑا نہیں۔ وہ شاید اِس لمحے کو کچھ طویل کرنا چاہتی تھی۔

"یہ ہرے رنگ کا ہے۔ نہیں ہرے رنگ کا نہیں۔ اچھا دیکھتی ہوں.." اور ریتا نے ایک کونے سے کاغذ پھاڑ کر کوٹ کا کنارہ دیکھا "کبوتری رنگ کا ہے!" اور پھر کہنے لگی۔

"اِس کے بٹن اوپر گریبان تک بند ہو جاتے ہیں"

"اِدھر ذرا دِکھلا تو مجھے!" سروج نے ریتا کے ہاتھ سے کوٹ لے لیا اور اُس پر لپیٹے ہوئے کاغذ کو کھولنے لگی۔

"سلوٹیں پڑ جائیں گی" ریتا نے پھر سروج کے ہاتھ سے کوٹ لے لیا اور ہتھیلی سے اُسے سہلانے لگی۔

"پہن کر دکھانا!" تھوڑے فاصلے پر بیٹھی ایک لڑکی گُل بانو نے قریب آکر کہا اور کوٹ کے ایک کنارے کو اپنی انگلیوں میں لے کر پھر کہنے لگی۔

"یہ کپڑا کتنا اچھا ہے!" اور پھر اُس نے کوٹ کو پکڑ کر اپنے شانوں پر رکھ لیا "سِلا ہوا بھی نئی قسم کا ہے" گُل بانو نے دو قدم ٹہل کر اور مٹک کر کہا۔

ریتا نے کوٹ کو لینے کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا دئے اور کہنے لگی۔

"میں اِس طرح نہیں پہنوں گی۔ پہلے اچھی طرح غسل کروں گی پھر اِس کے ساتھ جُرابیں پہنوں گی۔ اِسی رنگ کی۔ پھر نئی جوتی . . "

اور ریتا کو اِس کوٹ کے لئے ترس کر گزارے وہ دن یاد آگئے اور وہ سبھی پیسے بھی جو اُس نے اِس کوٹ کو خریدنے کے لئے ایک ایک کر کے جمع کئے تھے اور اُسے وہ دن بھی یاد آئے جب وہ اپنے گاؤں میں راتوں تک گندی سی ایک قمیص پہن کر ندی کے پانی میں اپنا سایہ دیکھتی تھی۔ شہر میں جاکر جھالر والی قمیص پہننے کے لئے وہ ترس رہی تھی اور اُس کی دادی جان اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیتی تھی۔

لیکن آخر کار وہ شہر آگئی تھی۔ سُوتی اور پتلی سی قمیص میں صبح کی سردی اُسے سرد کر دیتی تھی لیکن اُس نے ٹھٹھرے شانوں کے ساتھ بھی اپنی توجہ یکجا کر کے ایک کارخانے

میں کام سیکھ لیا تھا۔ پہلی تنخواہ کے روپے جب اُس نے اپنی صابن دانی میں سنبھال کر رکھے تھے، اُس نے یہ اُمید نہیں کی تھی کہ وہ کبھی ایک کوٹ خرید پائے گی۔

"کیا سوچ رہی ہے؟ کوٹ کیوں نہیں پہنتی؟" سروج نے یادوں میں ڈوبی ہوئی ریتا کو جھنجوڑا۔ ریتا نے چولھے پر پانی کا پتیلا رکھ دیا اور اپنے نہاتے ہوئے جسم پر اِس کوٹ کا تصور کر کے سوچنے لگی وہ یہ کوٹ پہن کر اپنے گاؤں جائے تو گاؤں میں اُسے کوئی نہ پہچان سکے گا . . . اور جب کوئی عورت پہچانے گی تو کہے گی۔

"ریتا کا بوائے فرینڈ کوئی بہت امیر آدمی ہوگا؟"

اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے گی۔

"ہاں وہ اِتنا لمبا، اونچا اور خوبصورت ہے کہ سر اونچا اٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔"

اور پھر وہ ہنستی ہنستی کہنے لگی۔

"شہر میں عمارتیں بنانے والا 'کرین' میرا بوائے فرینڈ ہے۔" اور پھر جو عورت اُس کی بات سُنے گی، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائے گی۔

ریتا نے پتھر کے ٹکڑے سے اپنی ایڑیاں رگڑیں اور پھر بالوں کو دھو کر جھٹک سے سُکھا کر اُس نے نئے کپڑے پہنے۔ کوٹ کھڑکی کی چٹکنی پر لٹکا ہوا تھا۔ چٹکنی پر سے کوٹ اُتارتے ہوئے ریتا نے دیکھا، باہر آسمان کے ایک کونے سے آندھی آ رہی تھی۔

پورنیما نے اُٹھ کر ساری کھڑکیاں بند کر دیں۔ بادل گھر کر آ گئے ہوئے جا رہے تھے کہیں کہیں بجلی کی چمک بھی اُن میں کوندنے لگی تھی۔ پھر ایک بار بادل گرجے اور بجلی اِتنے زور سے کڑکی کہ باہر اونچے کھمبوں میں لگے ہوئے تار جھنجھنا اُٹھے اور مکانوں کی روشنیاں گُل ہو گئیں۔

ریتا نے اندھیرے میں ٹٹول کر اپنا رومال تلاش کیا اور اُسے سر پر باندھتے ہوئے اُس نے ایک دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔ باہر تیز و تند آندھی چل رہی تھی اور کچھ بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہے؟ کہاں چلی ہے اِس وقت؟" سروج نے اُسے پیچھے سے آواز دی۔

لیکن ریتا کے لفظ "کرین" بادلوں کی گرج میں گُم ہو گئے۔ باہر بارش میں شرابور ہوتی اور آندھی کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہوئے ریتا سوچے جا رہی تھی۔

"تارکول پیپر اِس وقت کہاں سے ملے گا؟ دُکان بند ہوگی اور دُکان کا مالک جوڑوں کے درد سے اِس وقت اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہوگا۔"

اور پھر ریتا نے دوسرے موڑ پر دُکان کی پچھلی کوٹھری کو کھٹکھٹا کر سر پر بھیگے رومال کو نچوڑا اور کوٹھری میں سے باہر جھانکتے ہوئے دُکان کے مالک سے کہا۔

"آپ مجھے گالیاں تو دیں گے اِس بے وقت جگانے پر، لیکن بھلے مانس! چابی لے لیں اور اپنی دُکان کھول کر مجھے تارکول کا کاغذ نکال دیں۔"

ریتا نے دکان کے مالک کے بہت عذر سُنے لیکن آخر کار اُسے دکان کھولنے پر رضامند کر لیا۔ ریتا اُس سے عاجزی سے کہہ رہی تھی، اگر اُس نے کرین کو تارکول کے کاغذ سے نہ ڈھانپا تو پانی اُس کے اندر چلا جائے گا اور اُس کے پُرزوں کو بیکار کر دے گا۔

"تم ایک لڑکی ہو۔ تم کرین کو کس طرح ڈھانپو گی؟" دکان کے مالک نے کہا اور بتی جلا کر دکان میں سے تارکول پیپر تلاش کیا۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔ ریتا جب بارش اور آندھی سے زور آزمائی کرتی ہوئی کرین کے پاس پہنچی تو اُس نے دیکھا، کرین کے ماتھے پر کسی نے اُس کے آنے سے پہلے ہی تارکول باندھ دیا تھا۔

"کوئی مجھ سے پہلے پہنچ گیا۔۔۔" ریتا حیران ہو رہی تھی جب اُس کا نوجوان ماسٹر راجندر قریب کی دیوار کی اوٹ سے نکلا اور کہنے لگا۔

"یہ میں نے باندھا ہے۔ میں اپنے تکیے کے نیچے ہمیشہ یہ رکھتا ہوں کہ معلوم نہیں کس وقت اس کی ضرورت پڑ جائے۔ تم ریتا! اِس تیز آندھی میں کرین کو ڈھانپنے آئی تھیں؟"

اِس نازک سی ریتا کو راجندر نے کئی بار دیکھا تھا لیکن آج کی طرح کبھی نہ دیکھا تھا۔

"کیرین یہ ریتا نے ذرا شرما کر آہستہ سے کہا۔ شاید اب کچھ دیر پہلے کرین کو بوائے فرینڈ کی شکل میں تصوّر کر کے جو کچھ ریتا کے دل میں آیا تھا وہ اب کرین کو دیکھتے ہوئے اُس کے چہرے پر آ گیا تھا۔

"تم شام کو کیا کرتی ہو ریتا؟" راجندر نے دھیرے سے کہا۔

"کب۔۔۔ جب بارش نہیں ہوتی؟" ریتا نے بہت الھڑ اور معصوم سی آواز میں پوچھا اور پھر سوچنے لگی ہر روز شام کو اس کی سہیلیاں اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتی تھیں اور ریتا ہر روز اکیلی ہوتی تھی۔

ریتا راجندر کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اپنے ہوسٹل کی سڑک کی طرف مُڑ رہی تھی اور اُس نے مسرت سے دیکھا کہ راجندر اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔۔۔ اور پھر ریتا نے گھبرا کر اپنے نئے کوٹ کی طرف دیکھا۔ کوٹ بالکل شرابور ہو چکا تھا۔

"یہ کوٹ میں نے ابھی ابھی پہنا تھا۔" ریتا نے کہا اور پھر پَیروں کی جوتی کی طرف دیکھنے لگی۔ نئی جوتی بالکل کیچڑ میں لت پت ہو گئی تھی۔

"اب تم اسے جب پونچھ کر پھر پہنو گی میں اِس کا رنگ دیکھوں گا۔" راجندر کے لبوں کے قریب بارش کی بوند کی مانند دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی۔

ریتا کے سردی سے کانپتے ہوئے بدن میں گرمی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اُسے خیال آیا، اُس کی سہیلیاں اگر کبھی راجندر کو اس وقت اُس کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھ لیں تو انھیں اپنی آنکھوں پر بھی یقین نہ آئے گا۔

راجندر بہت خوبصورت اور بہت سنجیدہ نوجوان ماسٹر تھا۔ لڑکیاں اُسے دیکھتی تھیں اور ترس کر رہ جاتی تھیں۔ لیکن آج تک کسی لڑکی کو اُس نے اپنی دوستی نہیں دی تھی۔۔۔ اور اِس وقت۔۔۔ اِس وقت۔۔۔ وہ ریتا کے ساتھ برستی بارش میں چلا جا رہا تھا۔

وہ جب برآمدے میں پہنچے، سروج نے کمرے کا دروازہ کھولا اور سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی ریتا کو دیکھ کر ہنسنے لگی۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر ریتا نے سر کا رومال کھولا اور نچوڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔ ریتا کے بالوں کو راجندر نے ہاتھ کی ہتھیلی سے چھوا اور دھیرے سے کہا۔

"آج کی آندھی بہت اچھی تھی۔"

(ہنگرین کہانی کا آزاد ترجمہ)

غزل

پورن کمار ہوشؔ

کبھی دوست آ کر ملاقات کر
کوئی بھولی بسری ہوئی بات کر
روایت سہی بے وفائی مگر
خلافِ روایت کوئی بات کر
یونہی گفتگو تلخ ہو جائے گی
سنبھل کر ذرا اعتراضات کر
زمانہ مری جان مصروف ہے
ضروری جو ہو مختصر بات کر
جوابات دلچسپ مطلوب ہیں
تو پھر خوبصورت سوالات کر
اُٹھانا ہے جو بھی قدم، فیصلہ
بہ اندازۂ شکلِ حالات کر
مرے دل میں اک بات مدت سے ہے
مرے دل میں ہے جو وہی بات کر
لحاظِ تعلق بجا، جانِ من
مگر چارۂ اختلافات کر
پہیلی سہی اِک حُسنِ اظہار ہے
مگر ہوشؔ واضح اشارات کر

چل مُردے

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔ اے

۱۷۰۵، پہاڑی بھوجلہ۔ دلّی

۳۰ اپریل ۶۸ء

ڈیر خوشتر!

ایک سہ آتشہ مضمون بھیج رہا ہوں۔ یہ طنزیہ بھی ہے، انشائیہ بھی اور مزاحیہ بھی۔ اسی لئے کوئی شاعر کہہ گیا ہے ؎

مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو — سفیدی ہے سیاہی ہے شفق ہے ابرِ باراں ہے

تمھاری صورت سے نفرت اس وجہ سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ تم شریف اور وضع دار قسم کے انسان ہو۔ بڑھیا بڑھیا دعوتیں کرتے ہو اور مجھے نہیں بلاتے۔ یہ سمجھ کر کہ میرا تخلص فرقت ہے اور شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو کہ یہ شعر میرا ہے ؎

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را — افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

تم نے جو مضمون دستی واپس کیا تھا وہ آج تک مجھے نہ ملا۔ نہ جانے تمھارے قاصد نے کسے میری اولاد سمجھ کر دے دیا۔ موجودہ نسل بندی کا منہ توڑ جواب اگر کوئی دے سکتا ہے تو تمھارا بھیجا ہوا قاصد۔ ایسے یتیم العقلوں کو کیوں میرے پاس بھیجتے ہو جو باپ بیٹوں میں تمیز نہ کر سکیں۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ سے زیادہ کسی شخص کو میری اولاد سمجھ کر مضمون اسے دے آیا ہو۔ کیونکہ لڑکوں میں سے کسی کو تو وہ مضمون واپس نہ ملا۔ بہر حال تمھارا اور تمھارے قاصد کا دین و ایمان جانے۔ ایسے ایسے نہ جانے کتنے مضامین اسی لیل و نہار کا شکار ہو چکے ہیں۔ کس کس کی جان کو روؤں اور ان کا تیجہ، چالیسواں اور برسی کروں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے مضامین کی نقل نہیں رکھتا۔ چلو اسی بہانے میں تمھیں جہنم لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور روزِ محشر سے کہوں گا کہ حضور! یہ میرے کئی مضمون قتل کر چکا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ تم اتنے پارس پاور کے معصوم صورت ہو کہ اس کے بعد بھی بخش دیئے جاؤ گے اور میری ساری کوششیں ضائع ہو جائیں گی ——— میری رذالت کی اس سے زیادہ آبروریزی تم اور کیا کر سکتے تھے کہ میں نے تمھیں مضمون لکھنا بند کر دیا اور تم نے پرچہ بھیجنے میں پہلے سے زیادہ پابندی اختیار کی!

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

اس مضمون کو افسانہ نمبر میں شامل نہ کر سکو تو واپس کر دو۔ کیونکہ میں نے اسے کئی طلبہ کو بٹھا کر بولا ہے۔ اور اپنی زحمت سے زیادہ مجھے طلبہ کی زحمت کا خیال ہے۔ خط کی رسید اور تمھارے جواب کا اس وجہ سے منتظر رہوں گا کہ جن لوگوں سے میں نے وعدہ کیا ہے کہ اس مرتبہ افسانہ نمبر کے لئے مضمون ضرور لکھوں گا اور وہ

ضرور چھپے گا۔ اُن کے مُنہ مجھ ونا نہ ہوں۔ اِس سلسلے میں میں تمھیں اِس سے زیادہ کیا دعا دے سکتا ہوں کہ خدا کرے تم کسی صوبے یا مرکز کے وزیر ہو جاؤ۔ تاکہ اگر تمھاری دُنیا نہیں تو دین ہی خطرے میں پڑ جائے ——— ایک مضمون اور لکھ رہا ہوں۔ اگر مکمل ہو گیا تو اُسے لکھنؤ پہنچ کر بھیج دوں گا۔ میرا آئندہ پرچہ لکھنؤ بھیج دینا جہاں میرا پتہ یہ ہوگا ——— ۶۸۔ جگت نرائن روڈ۔ لکھنؤ ——— مگر دوسرا پرچہ گھر بھی بھیج دینا ورنہ میری بچی روتے روتے جان دے دے گی . . .

مخلص ——— غلام احمد فرقت کاکوروی

میر صاحب نے کہا: مرزا میں چاہتا ہوں کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے ے نام کا ڈنکا پٹ جائے اور میری شہرت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لوگوں کے دلوں میں ش ہو جائے اور آنے والی نسلیں مجھ کو فراموش کرنا چاہیں تو بھی آسانی سے موش نہ کر سکیں!"

مرزا نے سگرٹ کا ایک کش کھینچتے ہوئے میر صاحب کی بات سُنی کی اَن سُنی دی۔

میر صاحب:- مرزا! یار! میں کچھ کہہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی میری بات بھی سُن لیا کرو۔

مرزا:- تو کہو نا!

میر صاحب:- کہہ تو رہا ہوں کہ مرزا! دُنیا میں پیدا ہونے کے معنے یہ ہیں کہ انسان کوئی ایسا کام کر کے مرے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کی یادگار قائم ہو جائے ورنہ دُنیا میں پیدا ہونے سے کیا فائدہ؟

مرزا:- (سگرٹ کا دوسرا کش لیتے ہوئے) اور کیا؟

میر صاحب:- تو اِس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

مرزا:- ٹھیک ہے۔ مگر تمھارے دو بچے تو ہیں۔ پھر تمھیں جو کام کرنا تھا وہ کر چکے۔ شادی کے بعد اَولاد نہ ہونے سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں تمھاری طرف سے شکوک پیدا ہونے کے امکانات تھے۔ سو وہ خطرہ جاتا رہا۔

میر صاحب:- مرزا تم سمجھے نہیں۔

مرزا:- سمجھے کیا نہیں۔ بھئی اب تم اگر چاہتے ہو کہ اَولادوں کا یہ سلسلہ جاری رہے تو تمھیں روکتا کون ہے۔

میر صاحب:- نہیں مرزا! میرا مقصد یہ ہے کہ کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے زندۂ جاوید ہو جاؤں۔

مرزا:- اِس سے بڑھ کر زندۂ جاوید کیا بنو گے۔ اب انشاء اللہ تمھاری نسل بڑھے گی اور تمھارے بچے اور پوتوں نے اور زیادہ دل لگا کر تمھاری سُنّت پر عمل کیا تو دو تین نسلوں میں اچھے بڑے قبیلے کھڑے ہو جائیں گے اور اگر تم اپنے کام سے زندۂ جاوید ہونا چاہتے ہو تو اپنی اولاد کی تعداد اور زیادہ بڑھا دو۔ اِس سے زیادہ اِس گرانی میں زندۂ جاوید بننے کی کوئی اور شکل کیا ہو سکتی ہے۔ (مرزا نے سگرٹ کا گُل ایش ٹرے میں گراتے ہوئے پھر کہا) آخر کام سے تمھاری مُراد کیا ہے؟

میر صاحب:- مرزا! میرا مقصد کام سے کوئی ایسا اصلاحی کام ہے جس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے اور لوگ مجھے یاد رکھیں۔

مرزا:- تو موجودہ دَور میں کسی ہورڈنگ (ذخیرہ اندوزی) کرنے والے بنیے کا گلا گھونٹ دو!

میر صاحب:- لاحول ولاقوۃ! تم پھر نان سیریس ہو گئے۔

مرزا:- تو اِس میں مشکل کیا ہے؟ اگر صرف شہرت ہی مقصود ہے تو اُس کا سب سے بہتر اور آسان نسخہ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں جگہ جگہ گلی کوچوں میں جہاں یوری نل یعنی پیشاب خانے قائم ہیں اور جہاں بلا تخصیص مذہب و ملّت عام لوگوں کو استفادہ کا حق دیا گیا ہے وہاں تم دفتی کی ایک تختی بنوا کر دیوار پر چسپاں کرا دو کہ ازراہِ کرم ملٹنگ پوائنٹ یعنی لب بام پہنچنے سے پہلے پیشاب کر لیجیے یہ خادم میر مقصود احمد، ساکن محلہ چڑیا والان، مکان نمبر ۲-۱۸، لکھنؤ۔ اِس سے سستا اور مجرب نسخہ شہرت حاصل کرنے کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

میر صاحب:- مرزا! تم ابھی تک میری اِس بات کو مذاق سمجھ رہے ہو اور تمھاری اِس بات پر بوٹیاں نوچ ڈالنے کو دل چاہتا ہے۔

مرزا:- آخر اِس تجویز میں بُرائی کیا ہے؟

میر صاحب:- ارے صاحب! میں چاہتا ہوں کہ خواہ کتنی رقم کیوں نہ خرچ ہو جائے لیکن میرا نام آنے والی نسلوں کی زبان پر رہے۔ وہ میری بخشش کی دعا کریں۔ اِس سلسلے میں اگر کوئی یادگار اونی نشست کر دی جائے تو کیسا رہے گا؟

مرزا:- کیسی نشست؟

میر صاحب:۔ یعنی کوئی ایسی ادبی نشست کر دی جائے جس میں ملک کا کوئی شاعر، ادیب، سخن ور اور اہلِ قلم شریک ہونے سے نہ رہ جائے اور یہ ادبی نشست کئی حصوں پر مشتمل ہو۔ مثلاً پھبتی اور لطیفہ گوئی کی نشست، سنجیدہ مشاعرہ، مزاحیہ مشاعرہ، ریختی کا مشاعرہ، مرثیہ گوئی کی نشست، خواتین کا مشاعرہ، ترقی پسند خواتین کا مشاعرہ، بیت بازی، مناشرہ، تمثیلی، فلمی مشاعرہ وغیرہ وغیرہ اور ساری نشستیں آل انڈیا پیمانے پر کی جائیں جن کا سلسلہ کم و بیش ایک ماہ تک جاری رہے اور جن جن لوگوں کو اس میں شرکت کے لئے مدعو کیا جائے اُن کی انتہائی خاطر مدارات کی جائے اور ایسا معاوضہ دیا جائے جو یادگار رہے۔

مرزا:۔ (سگرٹ کا گل ایش ٹرے میں گراتے ہوئے) اُس کے بعد؟

میر صاحب:۔ اُس کے بعد ہندوستان کے مختلف قصبات اور شہروں سے ادباء اور شعراء کو لانے لے جانے کے لئے اسپیشل ٹرینوں اور بسوں کو چھوڑوانے کا انتظام کروں۔

مرزا:۔ ہوں۔ ہوں۔

میر صاحب:۔ اِس معاملے میں تم میری مدد کیا کر سکتے ہو؟

مرزا:۔ میں شریک ہو جاؤں گا۔

میر صاحب:۔ شریک ہونے سے کیا مُراد ہے؟

مرزا:۔ یہی کہ میں موجود رہوں گا۔

میر صاحب:۔ نہیں مرزا! میں چاہتا تھا کہ کھانے پینے کا انتظام تمھارے سپرد کر دوں تاکہ ایک طرف سے مجھے اطمینان ہو جائے۔

مرزا:۔ مگر یہ جو تم گھوڑا خریدنے سے پہلے گھاس خرید رہے ہو اِس کا کیا مطلب ہے۔ اِتنے بہت سے حرام خوروں کے لئے غلّہ وغیرہ کہاں سے فراہم ہوگا؟

میر صاحب:۔ خیر غلّہ تو گھر ہی کا ہے۔ البتہ سامان مثلاً شکر، چاول اور گھی وغیرہ بلیک سے آجائے گا (کان کے پاس منہ لے جاکر) اور یہ جو کچھ خرچ ہوگا وہ روپیہ بھی تو بلیک ہی کا ہے۔ میں ایک تیر سے دو ہرن مار رہا ہوں۔ مقصد یہ کہ دُنیا کی ادبی تاریخ میں میرا نام بھی ہو جائے گا اور شعراء اور ادباء کی امداد بھی ہو جائے گی اور پھر دُنیا پر اُردو ادب کی دھونس کھاتے میں پڑے گی۔

مرزا:۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔

میر صاحب:۔ مرزا! میں سوچتا ہوں کہ شعراء کے کھانے پینے کے سلسلے میں بھی ایک خاص قسم کا اہتمام کیا جائے اور ہر شاعر کو مشاعرہ کے درمیان کھانے کے اوقات میں ایک حسین ترین بکس میں اُس کے مزاج اور پسند کا کھانا پیش کیا جائے۔ مثلاً اگر کسی شاعر کو مُرغ پسند ہے تو اُس کے بکسے میں مُرغِ مسلّم پکوا کر رکھوا دوں، کسی کو زردہ پسند ہے تو اُس میں زردہ رکھوا دوں اور اِس سلسلے میں جو دعوت نامے شعراء اور ادباء کو بھیجے جائیں گے اُس میں اُن سے دریافت کیا جائے گا کہ دُنیا میں اُنھیں جو مرغوب ترین چیز ہو وہ لکھ کر بھیج دیں۔

مرزا:۔ مگر یہ شعراء اور ادباء کا معاملہ ہے اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے۔

میر صاحب:۔ جی ہاں۔ خوب سمجھ لیا ہے۔

مرزا:۔ اگر شعراء نے اپنی اپنی محبوباؤں کے نام لکھ کر بھیج دیئے تو آپ کہاں اُنھیں بکسوں میں بھروا بھروا کر بھیجتے پھریں گے اور اُن کی شادی بیاہ کے اخراجات کون برداشت کرے گا۔ اِس سلسلے میں صرف ایک شہرت کا ایک گوشہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ ختمِ مشاعرہ پر جب شعرائے کرام اپنا اپنا مطالبہ لینے کے لئے آئیں تو اُن سب کو ایک کیمپ میں جمع کر لو اور اُن سب پر اشک آور گیس چھڑوا کر لاٹھی چارج کرا دو۔ اِس سے ادبی دُنیا کی تاریخ میں تمھیں وہی شہرت حاصل ہو جائے گی جو جلیان والے باغ میں جنرل ڈائر کو



حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی شاعر بچ کر نہ جانے پائے۔ اس پر حکومت کی طرف سے بھی کوئی باز پرس نہ ہوگی کیونکہ حکومت خود اُردو زبان سے عاجز ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک انکوائری کمیٹی دکھانے کے لئے بٹھا دی جائے گی اور بعد میں اعلان کر دیا جائے گا کہ یہ سب کے سب مفت کی مرغوب غذائیں پاکر اتنی کھا گئے کہ سب ہیضے کا شکار ہوگئے۔ ممکن ہے کہ اس خدمتِ جلیلہ کے سلسلے میں دو چار سال بعد تم کو وزیر بھی بنا جاتے اور اگر تمہاری قسمت سے کہیں جن سنگھیوں کی حکومت آگئی اور مرکزی سرکار پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا تب تو ہر بڑے شہر میں چوراہوں پر تمہارے مجسمے نظر آئیں گے اور ہندی والے تمہاری جینتی اور برسی منائیں گے۔ دوسرا فائدہ اس سے یہ ہوگا کہ موجودہ نسل کے لوگوں میں تمہاری شہرت عام ہو جائے گی اور آئندہ دو تین نسلوں تک بہت سے یتیم بچے اور بیوہ عورتوں کی زبان پر تمہارا نام سہم آتا رہے گا۔ اور جب کوئی ان بچوں میں سے یا ان کے پوتوں پر پوتوں میں سے ان کا شجرۂ نسب پوچھے گا تو بڑے بوڑھے آسانی سے بتا سکیں گے کہ یہ فلاں فلاں شاعر کا پوتا یا پرپوتا ہے جو ہندوستان کے ایک میر صاحب والے مشاعرے میں اپنا کلام سنانے گئے تھے اور آخر میں معاوضہ حاصل کرتے وقت لاٹھی چارج میں کام آگئے۔

میر صاحب:۔ مگر میں اپنے قصبہ جیتا اس بار میں یہ نشست کروں گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قصبے کے رہنے والے تجارت پیشہ ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں ان کی تجارت پھیلی ہوئی ہے۔ ان لوگوں سے خاصہ چندہ وصول ہو جائے گا جس سے مشاعرے کے بہت سے اوپر کے اخراجات پورے ہو جائیں گے اور ان سے وعدہ لے لوں گا کہ تمام نشستوں میں وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک رہیں تاکہ کوئی نشست ناکام نہ ہو اور مرزا! میں سوچتا ہوں کھانے کے بکسوں کے بنوانے میں اس خیال کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ ہر وہ شخص جس کے پاس یہ بکس ہو وہ اس بکس کو ایک دولت محسوس کرے اور کوئی بکس سو سوا سو کی لاگت سے کم کا نہ ہو۔

مرزا:۔ ہاں شہرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے مگر سوال یہ ہے کہ سامعین کو اتنی تعداد میں کہاں سے لایا جائے گا جو ساری نشستوں میں پابندی سے شریک رہیں۔

میر صاحب:۔ اس کی طرف سے بے فکر رہو۔ اس کے لئے جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ہر صوبے سے بسیں اور اسپیشل چھوٹیں گے اور جہاں یہ مشاعرہ ہوگا وہاں تک آمد و رفت کا کرایہ سامعین کو بھی دیا جائے گا۔

مرزا:۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جس جگہ یہ مشاعرہ ہوگا اس کے اغل بغل کوئی بڑا میدان بھی ہے؟

میر صاحب:۔ ارے بھائی یوں سمجھ لو کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے اس وقت سے ماشاء اللہ یو۔پی کے بہت سے قصبات میدان بن کر رہ گئے ہیں۔ اس لئے میدانوں کی کمی کا سوال ہی نہیں۔ پھر ان بیس سال میں سینکڑوں ہزاروں فسادات ہوئے ہیں انھوں نے قصبات تو بڑی چیز بڑے بڑے شہروں کے آباد علاقوں کو میدانوں میں منتقل کر دیا ہے!

مرزا:۔ (مرزا نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے سگرٹ کا گل ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے کہا) بہر صورت اب بہتر ہے کہ یہ کام کر ہی ڈالو مگر مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے تم ایسا کرنا کہ مشاعرے کے گرد و پیش میدان میں پہلے ہی سے کئی بڑے بڑے اسٹال بنوا دینا جن میں کسی پر لکھا ہو کہ یہاں اطمینان بخش غسل میت دیا جاتا ہے۔ دوسرے پر لکھوا دینا کہ یہاں ہری ڈال کے بیری کے تختے مناسب قیمت پر ملتے ہیں کسی پر لکھا ہو کہ ہر قسم کے سستے اور مضبوط قبر کھپڑے یہاں ملتے ہیں۔ ایک پنڈال گورکنوں کا ہو۔ شعرائے کرام کے مقبرے تعمیر کرنے میں مراتب کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ قبرستان کے برابر ہی ان سامعین کا قبرستان ہو جو مشاعرے میں بیٹھے بیٹھے مر گئے ہوں۔

میر صاحب:۔ اچھا مرزا تو پھر ان نشستوں کے سلسلے میں مزید گفتگو کل ہوگی۔

(اندر سے ایک زنانی آواز)

اے چل مُرے شاعروں کا جلیان والا باغ بنانے والے!



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

چولائی کے معجزے

چولائی ہند و پاکستان کا مشہور و مقبول ساگ ہے۔ یہ سبز اور سرخ دو قسم کا ہوتا ہے۔ سرخ چولائی عموماً زیادہ پسند کی جاتی ہے اور یہی زیادہ مستعمل ہے۔ برسات کے موسم میں پیدا ہوتی ہے اور گرمیوں میں اسے بہت رغبت سے کھایا جاتا ہے۔ شہروں کی نسبت اس کا استعمال دیہات میں زیادہ ہے۔

طبی اعتبار سے چولائی کا مزاج گرم تر ہے، وید اسے معتدل کہتے ہیں۔ یہ ایک خوش ذائقہ اور مفید سبزی ہے۔ اس میں کئی طرح کے نمک اور معدنی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے بہت کم لوگ آشنا ہیں کہ دوائی اعتبار سے بھی اس میں بہت سے خواص اور خوبیاں ہیں۔

چولائی قبض کشا، ملین، زود ہضم اور ہلکی سبزی ہے۔ اسے تندرست اور مریض بھی بلا جھجک استعمال کر سکتے ہیں۔ دق کے مریضوں کے لئے تو چولائی ساگ خاص طور پر مفید ثابت ہوا ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے دق کے مریضوں کو حیرت انگیز طور پر فائدہ ہوتا ہے۔

چولائی قبض کشا اور ملین تاثیر رکھتی ہے۔ قبض کے مریضوں کے لئے اس کا استعمال بہت سود مند ہے۔ اس سے پاخانہ کھل کر آتا ہے اور آنتوں سے چپکا ہوا فضلہ خارج ہو جاتا ہے۔

چولائی پیشاب آور بھی ہے۔ اس کے استعمال سے پیشاب کھل کر آتا ہے۔ گردوں اور مثانہ میں جو زہریلے مادے جمع ہو جاتے ہیں، وہ بھی اس کے استعمال سے پیشاب کے راستے خارج ہو جاتے ہیں۔ اگر لگاتار اس کا استعمال کیا جائے تو گردے مثانہ کی پتھری بھی ٹوٹ کر خارج ہو جاتی ہے۔

چولائی صفرا، بلغم اور فسادِ خون کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ اس سے خون میں اخلاط کے بگاڑ سے پیدا ہونے والی شکایتیں دُور ہو جاتی ہیں۔

چولائی ذیابیطس اور دائمی قبض کی خاص دوا ہے۔ بہت زود ہضم اور اشتہا آور ہے۔ برسات کے موسم میں اس کا استعمال گوناگوں فوائد کا حامل ہے۔

چولائی کا پودا جڑ سمیت اکھاڑ کر، کوٹ کر اس کا رس نکال لیں۔ اس رس کے برابر کھانڈ ملا کر شربت تیار کریں۔ اس شربت کا استعمال موسم گرما میں پیاس کی شدت کو دُور کرتا ہے اور دل کو تسکین دیتا ہے۔

دو تولہ چولائی کے پتّوں کو کچل کر آدھ پاؤ پانی میں جوش دیں جب آدھا پانی باقی رہ جائے، ایک ماشہ نمک ملا کر صبح شام پینا دردِ قولنج کو بے حد مفید ہے۔

دو تولہ پتّوں کو کچل کر آدھ پاؤ پانی میں رگڑ چھان کر صبح، دوپہر، شام کو پینے سے پتھری دُور ہو جاتی ہے۔ جگر، مثانہ، گردے کی پتھری میں یکساں مفید ہے۔ اسی طرح ریگِ گردہ اور ریگِ مثانہ بھی دُور ہو جاتی ہے۔

چولائی کے دو تولہ پتّوں کو رگڑ چھان کر آدھ سیر پانی میں جوش دیں۔ آدھ پاؤ پانی باقی رہ جائے تو پلائیں۔ نزلہ، زکام، بلغمی کھانسی میں دن میں تین بار پلائیں۔ اگر خشک دمہ ہو تو ایک تولہ گائے کا گھی ملا کر پلائیں۔

سائے میں خشک کئے ہوئے چولائی کے پتے تین حصے، سیندھا نمک ایک حصہ۔ دونوں کو باریک پیس کر خوراک چھ ماشہ صبح شام بدہضمی، بھوک کی کمی، کھٹی ڈکاریں پیٹ کی تکلیفوں کے لئے بہترین ہاضمہ ہے۔

دو تولہ پتے، ایک ماشہ مرچ سیاہ رگڑ چھان کر آدھ پاؤ پانی میں صبح شام پلانا خونی بواسیر کو دُور کرتا ہے اور انہی پتّوں کو اتنا رگڑیں کہ لیس پیدا ہو جائے۔ دن میں دو تین بار بواسیر کے مسّوں پر لگائیں اور قدرت کی معجز نمائی دیکھیں۔

چولائی کے پتے سائے میں خشک کرکے پیس کر کپڑے میں چھان لیں۔ چھ چھ ماشے دن میں تین بار گائے کی چھاچھ سے پلانا، خونی دست اور پیچش میں نافع ہے۔

● اگر آپ ہر دلعزیز بننا چاہتے ہیں

دُنیا میں ایسا کون ہوگا جو ہر دلعزیز بننا نہ چاہتا ہو۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ہر دلعزیز بننے کا راز جانتے ہیں۔ جو لوگ جانتے بھی ہیں وہ اُن نکتوں پر عمل نہیں کرتے۔

مشہور مفکّر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــــــ "یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہر وہ آدمی جس سے آپ ملتے ہیں۔ اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح آپ سے بہتر سمجھتا ہے۔ اُن کے دل میں گھر کرنے کا یقینی طریقہ یہی ہے کہ اُسے بہت احتیاط سے یہ محسوس کرایا جائے کہ آپ اُسے اُن کی جگہ پر بڑی اہم شخصیت مانتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں۔"

ایمرسن کا قول یاد رکھئے ـــــــ "جس آدمی سے میں ملتا ہوں وہ کسی نہ کسی طرح مجھ سے برتر ہوتا ہے۔ اِس طرح میں اُس کی شخصیت کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہوں۔"

کتنی کربناک بات ہے جن لوگوں کے پاس اپنی بڑائی جتانے کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی وہ اپنی نااہلی کے احساس کو ظاہری شور و غوغا اور لاف زنی کے پردے میں چھپاتے پھرتے ہیں۔ اُن کی یہ حرکت نہایت نازیبا اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ جیسا کہ شیکسپیئر نے کہا ہے ـــــــ "انسان مغرور انسان، ادنیٰ سے اختیارات کا مالک ہو کر آسمان تلے ایسی چالیں چلتا ہے کہ فرشتوں کو بھی رونا آتا ہے۔"

آپ ہر دلعزیز بننا چاہتے ہیں تو آپ کو اِس سنہرے اصول کی پابندی کرنی چاہئے ـــــــ "دوسروں کو وہی کچھ دیں جس کی توقع ہم اُن سے رکھتے ہیں ـــــــ"

لیکن کب؟ کیسے؟ اور کہاں؟ ـــــــ ہر وقت اور ہر جگہ!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دُنیا کے سب سے اہم اصول کو صرف ایک فقرے میں سمو دیا ہے ـــــــ "دوسروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسے سلوک کی تم اُن سے توقع رکھتے ہو!"

یہی نکتہ ہر دلعزیزی کا راز ہے!

۳● ایک اچھی عادت

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــــ "غصّہ پی جانے کی عادت ایک اچھی عادت ہے۔ اگر تمھارے اندر آگ لگی ہوئی ہو تو بہتر یہی ہے کہ دھواں باہر نہ نکلنے دو۔ اپنی تکلیفیں دوسروں کے سامنے مت بیان کرو۔ جب اُن کا دھیان آئے تو اپنی طبیعت کو دوسری طرف متوجّہ کر دو اور اِس طرح اُن کا اثر دُور کر دو۔ سارے دن کی محنت و مشقت کے بعد اِس کے بجائے کہ آتے ہی چارپائی یا آرام کرسی پر دراز ہو جاؤ۔ اپنی ماندگی کا اظہار کرو اور کہو ـــــــ تم تھک کر چُور ہو گئے! اِس کے برعکس خیال اپنے دل میں لاؤ ـــــــ پھر یہ دیکھ کر تمھیں حیرانی ہوگی کہ تم کتنی جلد تازہ دم ہو جاتے ہو!

جو خیال تمھارے دل میں پہلے سے جاگزیں ہو چکا ہے کہ اگر تم ایسا کام کروگے تو تم بالکل تھک جاؤ گے۔ اِس کام میں تمھاری ساری طاقت صرف ہو جائے گی۔ اِس خیال کا تمھاری حالت کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ اگر تم یہ سمجھ لو کہ خیالات ہی قوت ہیں۔ جس خیال سے تمھیں تکلیف ہوتی ہے، فوراً اُس کے برعکس خیال اپنے ذہن میں لاؤ تو تمھاری تکلیف کا بہت جلد مداوا ہو جائے گا۔ فوراً تمھارا جسم تمھارے خیال کا ہم آہنگ ہو جائے گا۔ اِس لئے کہ طبیعت کا یہی خاصہ ہے۔

۴● مسرّت کا راز

ہر شخص خوش رہنا چاہتا ہے، ہر شخص مسرّت کا راز جاننا چاہتا ہے۔ آپ بھی یقیناً جاننا چاہتے ہوں گے۔ آیئے آپ کو مسرّت کا راز بتائیں۔

اگر آپ مسرّت بکنار زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہئے کہ اپنے ہم جنسوں پر اعتماد کیجئے اور نیک صفات مثلاً فیاضی، دوستی، محبت اور انسانیت کو اپنا دستور العمل بنائیے۔ جب تک کسی انسان کی بدی اچھی طرح پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ جائے اُسے نیک سمجھنا چاہئے اور بدی کی تحقیق کے بعد بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ اُس سے غلطی ہو گئی ہے اور وہ ہمارے رحم و ہمدردی کا مستحق ہے۔ اُس سے حقارت کا برتاؤ نہ کرنا چاہئے۔ اگر انسان جہالت، غلط خیالی اور غلط دلچسپیوں میں مبتلا نہ ہو تو اُس کی نیکی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اِس فلسفہ کو مانتے ہیں کہ کسی کو قابلِ اعتماد نہ سمجھنا چاہئے۔ اُن کی زندگی جھگڑوں سے کبھی خالی نہیں رہتی۔ کبھی اُنھیں اپنی حفاظت کے لئے لڑنا پڑتا ہے اور کبھی وہ خواہ مخواہ دوسروں سے اڑ جاتے ہیں، اُلجھ جاتے ہیں۔ خوش مزاجی اور اطمینانِ قلب کا اُنھیں کبھی مُنہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ انسان اپنے گرد و پیش والوں کو جتنا خوش رکھے گا، اُسے اُتنی ہی مسرّت و آسودگی نصیب ہوگی ـــــــ یہی مسرّت کا راز ہے!

۵● کوکو ـــــــ مقوّیِ دل و دماغ

کوکو بھی قہوہ یا کافی کی طرح پی جاتی ہے۔ کوکو کی ماہیت یا ترکیب کافی سے الگ ہوتی ہے۔ لیکن اِس کا جوہر اپنی کیمیائی ترکیب کیفین یا کافی سے مشابہ ہے۔ کوکو میں ۴۷ر۳۱ فیصدی نائٹروجن مادّہ، ۴۹ فیصدی روغن، ۱۲ر۳۱ فیصدی نشاستہ،

۱۵ تا ۲۰ فیصدی پانی اور باقی دوسرے اجزاء ہوتے ہیں۔ اس میں غذائیت زیادہ ہے اور اس میں روغن بہت ہوتا ہے اس لئے کمزور معدہ والے اسے بخوبی ہضم نہیں کر سکتے۔ اسے زود ہضم بنانے کے لئے یا تو اس کے روغن کی مقدار کم کرنی چاہئے یا اُمر کی تقویت کے لئے اس کے ہمراہ ہلکی پھلکی نرم اور زود ہضم غذائیں استعمال کرنی چاہئیں۔ یہ دل اور گردوں پر کافی اور چائے کی طرح محرک اثر پیدا کرتی ہے اور قلب کی حرکت تیز کرتی ہے۔ لیکن دماغ کے لئے مُسکّن ہے۔ اس لئے اسے رات میں پیا جائے تو مفید ہے۔ مقوی دل و دماغ اولٹین (Ovaltine) میں موثر جُز اسی کا ہوتا ہے۔

۶۹ ● انسان کی زندگی کا عظیم لمحہ

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــ "انسان کی زندگی میں وہ لمحہ اہم اور عظیم ہوتا ہے جس لمحے وہ اپنی عظیم شخصیت کی جھلک دیکھتا ہے۔ جب وہ اپنی خداداد خوبیوں اور صلاحیتوں سے واقف ہوتا ہے۔"

پروفیسر ولیم جیمز کہتے ہیں ــــ "ہم میں ہر شخص ایک غیر معمولی طاقت کا مالک ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کرتے۔ اگر ہم اپنے دل کا ایکسرے کرائیں تو پتہ چلے کہ ہمارے اندر کتنی غیر معمولی طاقتیں ہیں جو ابھی اُجاگر نہیں ہو سکی ہیں۔ دل کے اندر کی اس حیرت انگیز طاقت کو دیکھ کر کوئی بھی یہ کہہ اُٹھے گا ــــ یہ غیر معمولی طاقتیں تو کسی اور شخص کی ہوں گی جو زندگی میں کامیابی کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ میرے جیسے ناکام انسان کی یہ صلاحیتیں نہیں ہیں۔"

اپنے کو پہچاننا اپنے خدا ہی کو پہچاننا ہے۔ اُس نے ہمیں جو باطنی نظر عطا کی وہ زندگی کو بلند، عظیم اور شاندار بنانے میں بہت زیادہ ممد ثابت ہوتی ہے ــــ جو زندگی کی مشکلات سے ٹکراتے ہوئے، مصیبتوں کو زیر کرتے ہوئے اپنی بے شمار ... پہچان لیتا ہے۔

کوئی بھی انسان اپنے باپ دادا کی جائداد کے سہارے اپنی زندگی کامیاب نہیں بنا سکتا۔ اُسے سب سے پہلے اپنے اندر کی پونجی کو ڈھونڈنا ہوگا اور یہ پونجی اُسے وراثت میں نہیں ملتی۔ اُسے اپنے اندر پوشیدہ صلاحیت کو پہچان کر خود جدّ و جہد کرنی ہوتی ہے۔

جس دن، جس لمحہ انسان اپنے اندر کی پوشیدہ صلاحیت کو پہچان لیتا ہے، اُس کی زندگی کا وہی لمحہ عظیم ہوتا ہے۔

۷۰ ● اچھی گفتگو کرنا سیکھیے

زندگی کی بازی گاہ میں کامیابی حاصل کرنے یا ناکام رہنے میں گفتگو اور اندازِ گفتگو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر آپ بازی گاہِ حیات میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اچھی گفتگو کرنا سیکھیے۔

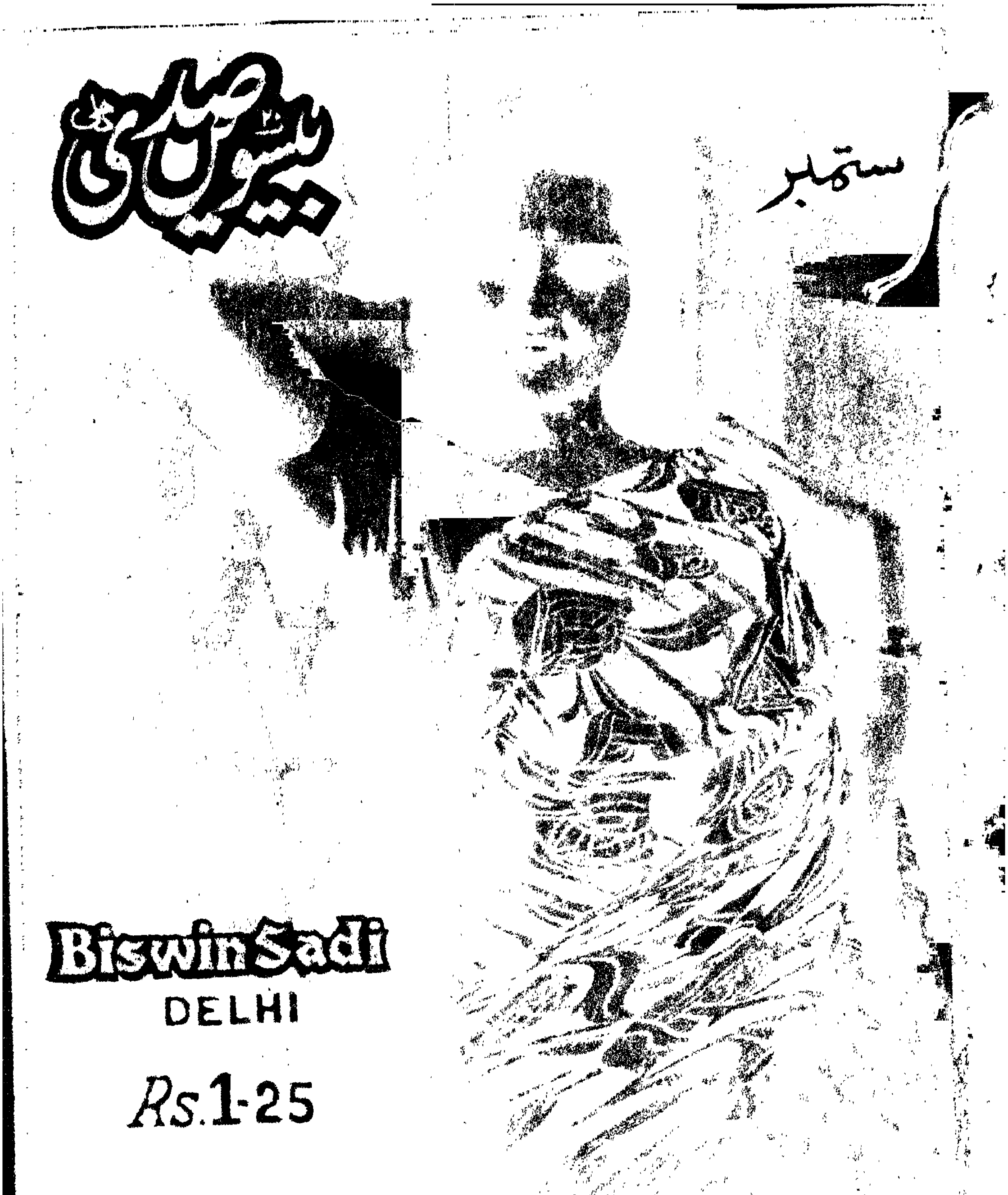
مشہور مفکر کے۔ نولس نے لکھا ہے ــــ "گفتگو کرنے اور بولنے میں بڑا فرق ہے۔ گفتگو کرنے میں ذہانت موجود ہو جس سے آپ دوسرے شخص یا بہت سے لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس عام بول چال سے دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتے۔ اندازِ گفتگو ایک تحفہ ہے یا محنت سے حاصل شدہ فن۔ اگر آپ کو یہ ورثے میں ملا ہے تو سمجھئے کہ آپ کی پیدائش کسی اچھے ستارے کے سائے میں ہوئی تھی۔ اگر آپ نے اسے روزانہ مشق کر کے حاصل کیا ہے تو اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اس فن میں ماہر ہونے کی کوشش کریں۔ آپ خوشامد کر کے کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس آپ کا اندازِ گفتگو ایسا ہو کہ لوگ آپ کی طرف متوجہ ہونے پر خود بخود مجبور ہو جائیں۔"

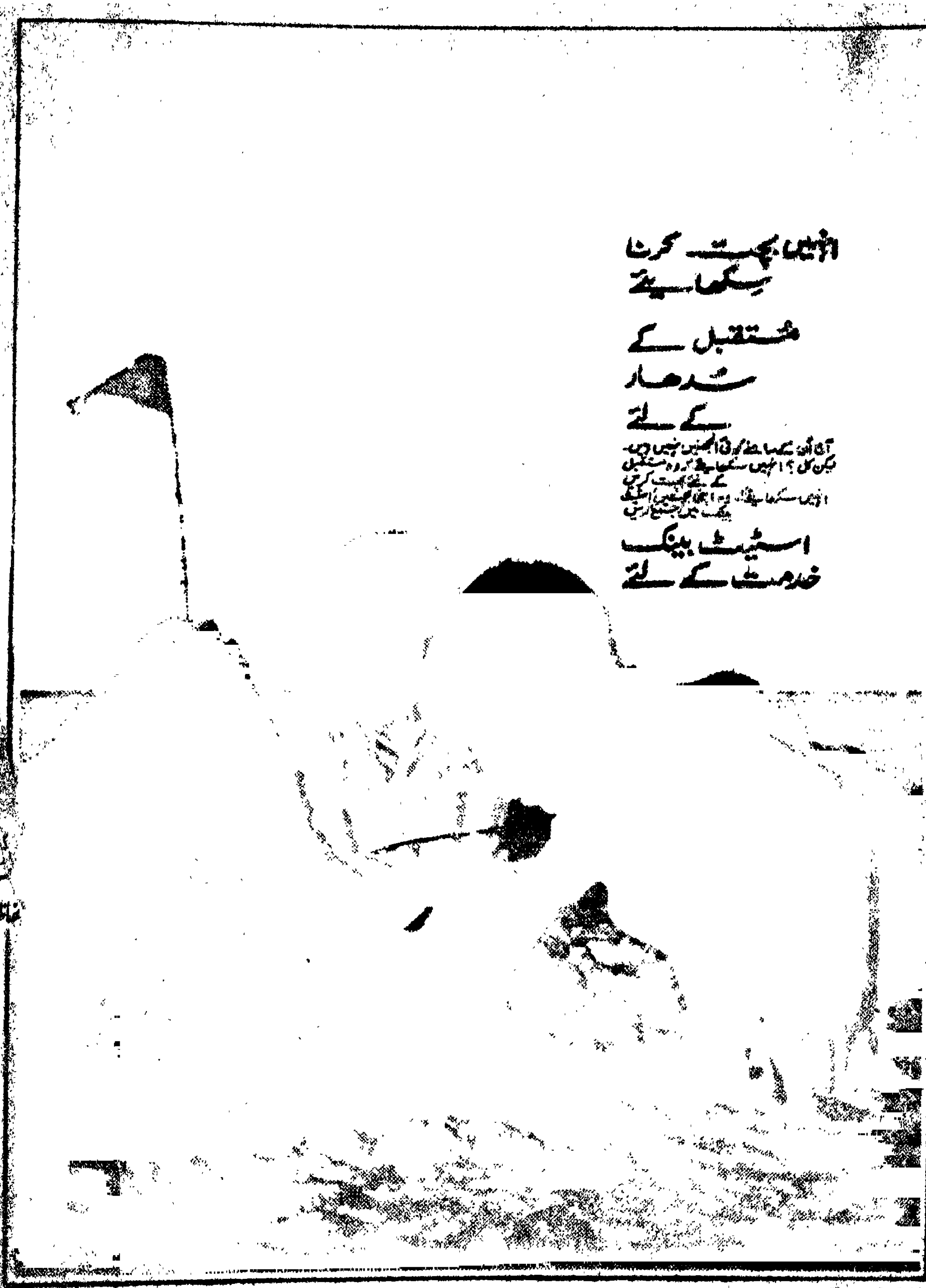
کوئی شخص اس لئے بھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام ہو سکتا ہے کہ اُس میں اپنے ذہنی رویّہ میں تھوڑا سا ردّ و بدل کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے اُمیدوار بہت ذہین ہو لیکن اچھی گفتگو کرنا اُس کے بس کی بات نہ ہو۔

اُردو کی بے لوث خدمت کرنے والوں میں خوشتر گرامی کا نام کسی سے پیچھے نہیں بلکہ بہت ہی آگے، بہت ہی نمایاں اور بہت ہی اہم ہے۔ خوشتر گرامی کے اس نیک جذبے اور خلوص کی جس قدر تعریف و ستائش کی جائے کم ہے ــــ "بیسویں صدی" ہندوستان کا ایک خوبصورت، معیاری اور دلکش رسالہ ہے جس میں مُلک کے بلند پایہ فنکار لکھتے ہیں ــــ یہ خوشتر گرامی کا ہی کمال ہے کہ وہ ایسا خوبصورت نمبر نکال کر دُنیائے ادب میں چکا چوند پیدا کرتے ہیں ــــ سچ پوچھئے تو خوشتر گرامی ایک جادوگر ہے جو اپنا جادو ہمیشہ اپنے عام اور خاص نمبروں میں پھونک دیتا ہے اور دوست دشمن سبھی کہہ اُٹھتے ہیں "جواب نہیں بیسویں صدی کا" ــــ اور یہ ہے بھی درست کہ "بیسویں صدی" کا جواب نہیں۔

موہن یاور ایڈیٹر "رفتار" جموں


انہیں بچت کرنا
سکھایئے
مستقبل کے
سدھار
کے لئے
اسٹیٹ بینک
خدمت کے لئے


بیسویں صدی دہلی
ستمبر
Biswin Sadi
DELHI
Rs.1-25


انہیں بچت کرنا
سکھائیے
مستقبل کے
سدھار
کے لئے
اسٹیٹ بینک
خدمت کے لئے

بیسویں صدی

ستمبر



Biswin Sadi

DELHI

Rs. 1-25



تجھے خبر نہ تھی یہ شوخ و شنگ ہنگامے ۔۔۔ مری جوان اُمنگوں کا حسن ۔۔۔

سنہرے خواب خزاں دیدہ پتیوں کی طرح ۔۔۔ اجڑ اجڑ کے بڑی حسرتوں سے ۔۔۔





ہماری آنکھوں میں آؤ تو ہم دِکھائیں تمھیں
ادا تمھاری جو تم بھی کہو کہ ہاں کچھ ہے ——— ریاض خیرآبادی

فوٹو: روشن لال وشِشٹ۔ جے پور



کیا طُرفہ لٹک ہے یار حیانی تیری　　لب سُرخ تو پوشاک ہے دھانی تیری
مُرلی کا تموّج ہے تبسّم تیرا　　رادھا کا لڑکپن ہے جوانی تیری



ایک بے تکلف اور مخصوص محفلِ شعر و ادب میں جناب ساغر نظامی اپنے برادرِ خورد کی بیگم کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ مرغن کھانوں سے زیادہ لذیذ یہ اشعار سنا رہے ہیں اور اہلِ محفل مسحور ہو کر "دست بر طعام" نہیں بلکہ "گوش بر آواز" ہیں ؎

مدد کہ ہمتِ بے چارگی نہیں ہوتی   وہ سامنے ہیں مگر بات ہی نہیں ہوتی
زر و جواہر و لعل و گہر لٹا کر بھی   ترے خزانۂ لب میں کمی نہیں ہوتی
کبھی کبھی تو چمن یوں بھی مسکراتا ہے   کہ رنگ ہوتے ہیں اور دلکشی نہیں ہوتی
کبھی کبھی تو محبت میں یوں بھی ہوتا ہے   کہ اُن سے مل کے بھی آسودگی نہیں ہوتی
کبھی فراق میں یوں بھی بہار آتی ہے   کہ پھول ہوتے ہیں اور تازگی نہیں ہوتی
وہ بات جس کے لئے خود ہے اُن کو بے تابی   ادا زبان سے وہ بات ہی نہیں ہوتی

جگر کے خون سے ہوتی ہے شاعری ساغر
عروض ہی سے فقط شاعری نہیں ہوتی



ایک آل انڈیا مشاعرے میں جناب جگن ناتھ آزاد رومانیت کی گلابی چھلکاتے ہوئے، اپنے محبت بھرے دل کی دھڑکنوں کو، شعروں میں سمو کر غزل سرا ہیں اور سامعین کے دلوں میں کیف و مستی کی کلیاں چٹک رہی ہیں۔ آزاد صاحب فرما رہے ہیں ؎

ظلمت کدے میں نور کا ساماں کب آئے گا — یارب: مرا وہ ماہِ درخشاں کب آئے گا
میری غزل کا ناز، مری نظم کا وقار — ہاں وہ مرا متاعِ دل و جاں کب آئے گا
آنکھوں میں لے کے ہجر کی اک داستانِ درد — میرے ہر ایک درد کا درماں کب آئے گا
حسنِ خموش لے کے بہ اندازِ خامشی — شرحِ درازیٔ شبِ ہجراں کب آئے گا
نورِ جبینِ صبحِ طرب کے لباس میں — اک دوست سوئے شامِ غریباں کب آئے گا

خود جان اپنی نذر میں دے میزباں جسے
اے دردِ انتظار وہ مہماں کب آئے گا

جلد — ۳۲
شمارہ — ۹
ٹیلیفون دفتر ——— ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ——— ۶۱۹۹۲۷

تیر و نشتر

فرقت کاکوری



شریمتی وجے لکشمی پنڈت نے پارلیمنٹ سے استعفےٰ دیتے ہوئے کہا کہ میں پارلیمنٹ سے ہم آہنگ نہیں تھی۔

"پارلیمنٹ کا مون سون سیشن شروع" ایک خبر ـــــ شروع ہوتے ہی اپوزیشن والے سرکار کی خارجہ پالیسی پر برسے۔

"پنجاب سرکار ہیلتھ فنڈ کھولے گی" ایک خبر ـــــ تاکہ سیاسی مریضوں کا علاج کر سکے۔

"یو۔پی میں غیر کانگرسی پارٹیوں کا متحدہ محاذ بنانے کے امکانات تاریک" ایک عنوان ـــــ حیرت ہے موم بتی نہیں بجلی کے زمانے میں۔

"پاکستان کے وزیر زراعت روس میں" ایک خبر ـــــ ہتھیاروں کے فارم دیکھیں گے اور اپنے ہاتھ سے فصل کاٹیں گے۔

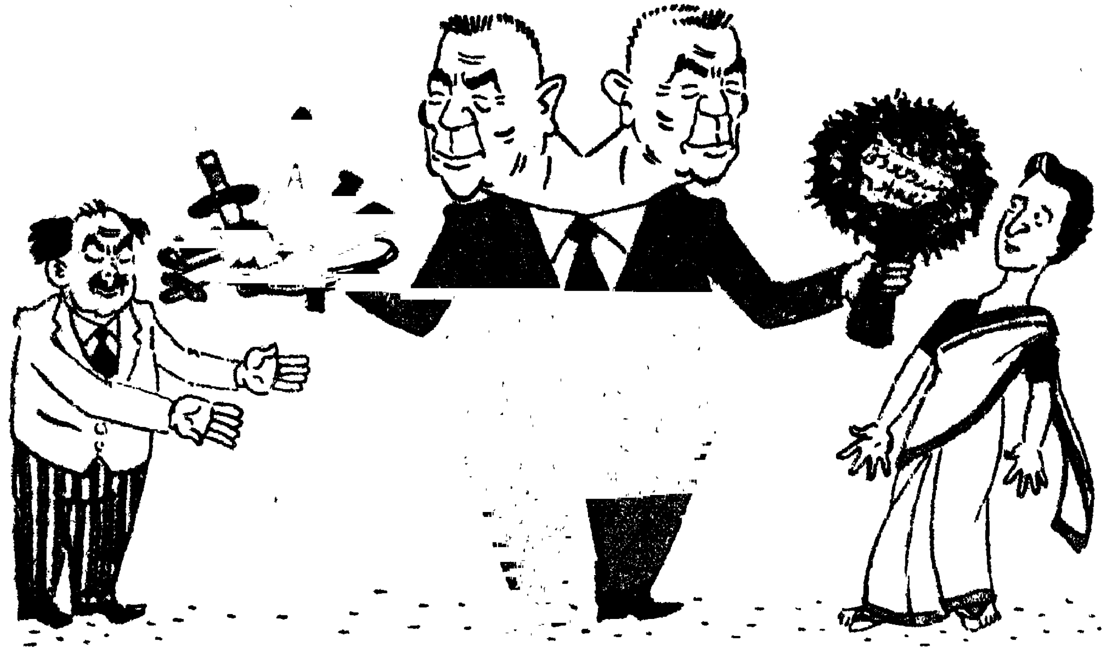
"سابق حکمرانوں کو راجہ جی کا مشورہ" ایک خبر ـــــ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے سوتنتر پارٹی میں شامل ہو جاؤ اور پریوی پرس بچانے کے لئے سوتنتر پارٹی کے لئے تھیلیوں کے مُنہ کھول دو۔

"دِلّی کے جوتا سازی کے ستر کارخانوں میں ہڑتال" ایک خبر ـــــ اب سیاستدانوں میں جُوت پیزار کیسے ہوگی؟

"دِلّی میں زبردست بارش۔ تمام کاروبار ٹھپ" ایک خبر ـــــ غنیمت ہے ٹھپ ہی ہوا۔ بہہ نہیں گیا۔

"نااہل اور کام چور افسران کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے گا" ایک اعلان ـــــ اور نااہل اور کام چور وزیروں کا درجہ بلند کیا جائے گا۔

"ہند سرکار کی خارجہ پالیسی" ایک عنوان ـــــ خارج از بحث۔



روسی ہندی بھائی بھائی

"بنگلور میں سفیدی کروانے پر بھی ٹیکس" ایک خبر ——— مُنہ پر پاؤڈر تھوپ کر نکلنے والی عورتیں ہوشیار ہو جائیں ——— اور اگلا قدم سونا لیٹنا ٹیکس، کھانا پینا ٹیکس، پیشاب پاخانہ ٹیکس ہوگا۔

"صفدر جنگ ہوائی اڈّہ بیگم پور تبدیل کرنے کا پروگرام" ایک خبر ——— بیگم کی سہولت کے لئے۔

"لدّاخ میں متوازی کانگرس کمیٹی قائم۔ فریقین میں جُوتم پیزار" ایک خبر ——— سیاحت کو جانے والے ٹورسٹوں کے لئے کانگرس کی طرف سے کلچرل پروگرام کا اہتمام۔

"صورت گڑھ (بیکانیر) فارم میں ہزاروں ٹن اناج سڑ رہا ہے" ایک خبر ——— اور اُسے اُٹھانے والی ایک بھی صورت نظر نہیں آتی ؏
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

"روس سرکار ظالم ترین سرکار ہے" امریکہ بھاگنے والے مصنّف کا خیال ——— ایسی ظالم کہ دوستوں کے مخالفوں کو بھی ہتھیار دیتی ہے۔

"مرکز کی تعلیمی پالیسی" ایک عنوان ——— نہ تیتر نہ بٹیر۔

"دِلّی کے کالجوں میں پانچ سَو سیٹیں بڑھا دی گئیں" ایک خبر ——— اب تو اَن پڑھ اور کم پڑھے لکھے سیاستداں داخلہ لے لیں۔

"بھٹنڈہ میں کانگرس کی مِٹّی پلید" ایک خبر ——— اور کانگرسیوں کے ہاتھوں ہو رہی ہوگی۔

"حسین چوروں کے حسین بیانات" ایک خبر ——— ؏
خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔

"کرانتی دَل کا پروگرام" ـــــــ سوتے لوگوں کو جگانا نہیں، جاگتوں کو سُلانا۔

"سمگلنگ اور بلیک میں پنجاب کے سابق وزیروں کا ہاتھ" سردار لچھمن سنگھ گِل کا الزام ـــــــ صرف الزام تراشی کافی نہیں۔ کوئی دا سس کمیشن مقرر کیجیے۔

"حصار میں حلوائیوں کی لوٹ" ایک خبر ـــــــ نہ ہوا حصار سردار لچھمن سنگھ گِل کی عملداری میں۔ حلوائی مٹھائی بنانا بھول جاتے۔

"ڈیرہ دون میں چوریاں" ایک خبر ـــــــ یعنی وہاں چوروں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

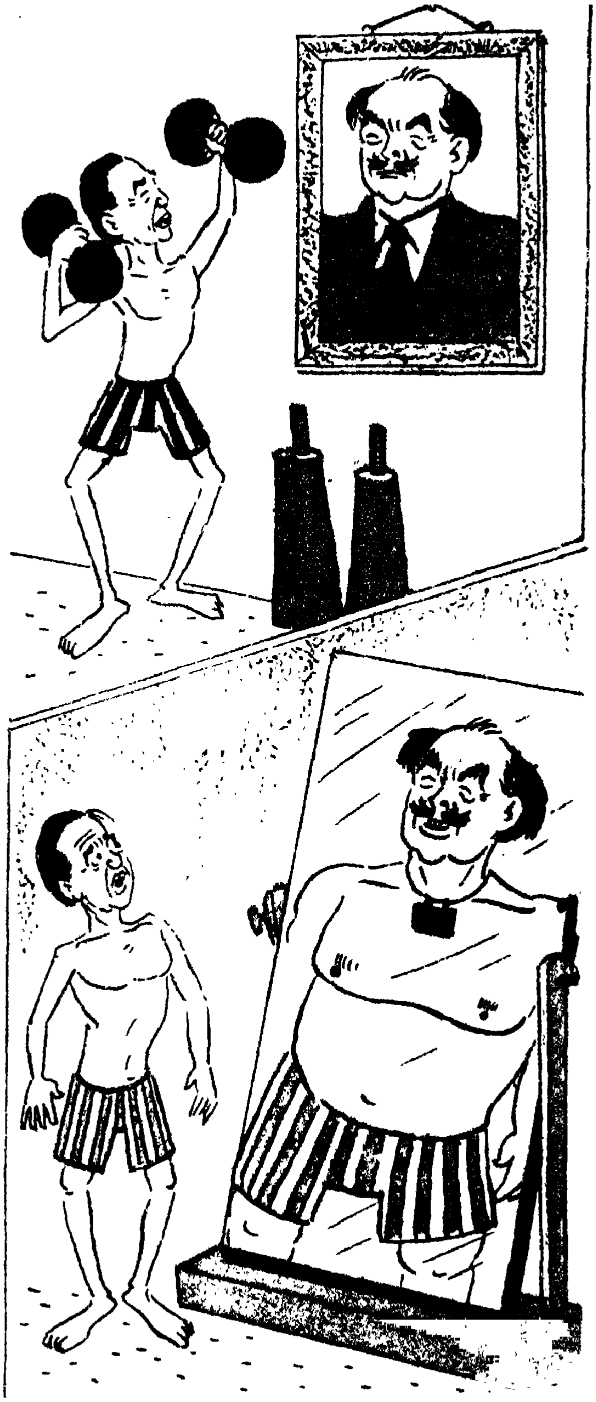
"خلا میں رہنے کا گھر" ایک عنوان ـــــــ غالبؔ مرحوم نے جس کی تمنا کی تھی ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

"عراق میں سیاستدانوں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں" ایک خبر ـــــــ ؎
مالِ حرام بود، بجائے حرام رفت

"ہریانہ کی بہبودی کے لئے" ایک عنوان ـــــــ چودھری بنسی لال کو وزیرِ اعلیٰ بنایا ہے۔ اب خوب بنسی بجاؤ۔

"ویت نام میں امریکی ہوا باز گرفتار" ایک خبر ـــــــ وہاں کیا ہوا کھانے گئے تھے۔



پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ مسٹر بھٹو پاکستان کے آئندہ صدارتی چناؤ کی تیاری کر رہے ہیں۔



پاکستان کو روسی اسلحہ کی سپلائی پر اپوزیشن کی سخت نکتہ چینی۔

"یو۔پی کی بیشتر پارٹیوں نے جن سنگھ کو متحدہ محاذ میں شامل کرنے سے انکار کر دیا" ایک خبر —— یعنی کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

گزشتہ ایک سال کی بداعمالیوں اور دھاندلیوں کا نتیجہ۔

"ہریانہ کے سرکاری ملازموں کا مہنگائی الاؤنس بڑھنے کا امکان" ایک خبر —— چودھری بنسی لال کا کارنامہ۔ ملازمین اب بنسی بجائیں۔

"موجودہ آئین عوام کی بہبودی کی راہ میں رکاوٹ ہے" اپوزیشن ممبران —— اس لئے کہ اس میں اپوزیشن کو وزارتیں نہیں ملتیں۔

"لیڈی ڈاکٹر غائب" ایک خبر —— مریض عشق کی دلداری کر رہی ہوگی۔

"مسافر ہوائی جہاز میں مر گیا" ایک خبر —— روح جسم سے ہوا ہو گئی۔

"دوکانوں سے مال چرانے والی حسین لڑکیاں" ایک خبر —— سینوں میں سے دل بھی چراتی ہیں۔

"ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونے والی حسینہ" ایک خبر —— وہ دل چراتی اور ڈاکو ڈکیتی ڈالتے۔

"نیویارک میں سر بازار ننگا ناچ" ایک خبر —— جانسن کے دور کا تاریخی کارنامہ۔

"پلول کی خستہ حال سڑک" ایک خبر —— بہت عمدہ۔ اچھا نام رکھا ہے۔

"مے خوروں پر جنت کے دروازے بند نہیں" ایک کانگرسی کا فتویٰ —— وہاں سے لوٹ کر یہ خبر سنانے آئے ہیں آپ۔

"ہریانہ کے دیہات میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا جائے گا" ایک خبر —— تو پھر شہر کے لوگوں کی جیب کاٹی جائے گی۔

"دِلّی میں مٹی کا تیل اور دیا سلائی سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ" ایک خبر —— دونوں کا چولی دامن کا ساتھ بھی ہے۔

"دِلّی میں ایک بہترین عشرت گاہ" نظام الدین کے ہمسایہ میں ایک ہوٹل کا اشتہار —— یعنی عیاشی کا اڈّہ" جہاں جدید طرز کے پرائیویٹ غسل خانے" کا اعلان اِس کی مزید تصدیق۔

"نئی دِلّی اور پُرانی دِلّی میں جابجا چھاپے" ایک خبر —— تب تو ہر طرف چھینٹ ہی چھینٹ ہوگی۔

"کرسی پر بیٹھے ہوئے موت" ایک خبر —— پھانسی کی کرسی ہوگی۔

"ایک ہریجن کی افسوس ناک موت" ایک عنوان —— کیڑے مار دوائی چھڑکتا ہوا ہلاک۔ دوسرا عنوان —— کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی کا انجام خود بھی کیڑے مکوڑوں میں شامل ہوگیا۔

"یو۔ پی کا مشہور ڈاکو چندربھان گرفتار" ایک خبر —— کتابت کی غلطی اور اتنی بھیانک۔ مشہور ڈاکو نہیں مشہور سیاستداں ہیں وہ تو۔

"ہندوستان میں امریکی ایجنٹ" ایک عنوان —— اِن دنوں خوب بَر آئی ہے۔

"پنجاب میں غنڈہ گردی کے خلاف مہم" ایک خبر —— جسے چلانے کا دَم صرف سردار لچھمن سنگھ گِل میں ہے۔

"ہائیکورٹ نے کریم مکھن پر پابندی جائز قرار دے دی" ایک خبر —— مگر خالص دودھ اب بھی نہ ملے گا۔



"حکومتِ ہند فرقہ پرستی کے خلاف حرکت میں آگئی" —— ایک خبر

لفظ میرے خیالات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور جب ریتا بولنے لگی، تو جیسے پہاڑی جھرنے پوری روانی اور تیزی سے بہنے لگے اور میں نے دیکھا کہ میری قوتِ گویائی جواب دے چکی ہے، ریتا بہت رواں اور شستہ انگریزی میں بول رہی تھی، الفاظ پھندوں ڈال ڈال کر۔ اُس کے لہجے میں عجیب خود آگہی تھی، ہر لفظ معنی کے شعور کے ساتھ جملے میں جُڑ جاتا، اتنی صفائی کے ساتھ کہ اُس کے بعض خیالات سے اختلاف کے باوجود اُس کی دلیل کا قائل ہونا پڑتا۔ اُس کی غیر معمولی ذہانت اور سوجھ بوجھ کا میں پہلے ہی قائل ہو چکا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ میں سبھی لوگ اُس کی غیر موجودگی میں اُس کی ذہانت اور وسعتِ مطالعہ کی تعریفیں کرتے تھے، پروفیسر رائٹ ہیڈ اور ڈاکٹر رمن کلاس میں اُس کے اکثر سوالوں پر بغلیں جھانکتے۔

میزوں پر کھانے کی پلیٹیں لگائی گئی تھیں، لیکن ابھی کوئی نہیں آیا تھا، دو بوائے سفید وردی پہنے برآمدے کے ستونوں سے لگے بیڑیاں پھونک رہے تھے۔

ریتا کی بڑی بڑی آنکھوں میں بجلی کی روشنی کی جگمگاہٹ تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اُس کی گھنی پلکوں کے لرزتے سایوں کو چیر کر روشنی کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں، میرا جسم روشنی کی دھاروں میں نہا رہا ہے ——— ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے!

اور ریتا ایک خوشگوار سنجیدہ فضا میں باتیں کر رہی تھی۔

"یہ انسٹی ٹیوٹ ایک خود کار فیکٹری ہے، جہاں روایتی ذہنوں کے کل پُرزے ٹھیک کئے جاتے ہیں، لیکن اِن گھِسے پِٹے پُرزوں کی کب تک مرمت کی جاتی، اِس ملک کی تہذیب کا مستقبل کیا ہوگا جہاں کا تعلیمی نظام مشینی اور میکانکی ہو کر رہ جائے۔ یہاں میری سانس گھٹتی ہے، روز وہی طویل کلاسوں کا چکر، وہی سیمینار، پروفیسروں کے رٹے ہوئے لیکچر، میں کہتی ہوں اِن سے بہتر تو کتابیں ہیں، کتاب زندگی کی حرارت رکھتی ہے، کتاب کا ایک امپیکٹ ہوتا ہے، لیکن یہ کالجوں سے آتے ہوئے اُستاد، یہ مٹی کے مادھو، جو یہاں بھی دن رات صرف نوٹس کی سرد لاشیں ڈھوتے ہیں، لیکن کسی تعلیمی مسئلے پر اوریجنل تھنکنگ نہیں رکھتے، میں کہتی ہوں اِن کی اوریجنلٹی کو کیا ہوا ہے؟"

اور میں نے بڑھتی ہوئی حیرت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی میرا عقیدہ ہے کہ انڈین مائنڈ اوسط درجے سے اوپر جا ہی نہیں سکتا"

"بالکل صحیح ہے!"

"تعلیمی قدروں کی روشنی پھیلانے سے تو یہ رہے، یہ انسانی قدروں سے اتنے عاری ہیں ——— خوب! ایک دلچسپ بات مجھے یاد آگئی!"

"کیا ——؟" ریتا کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"دو سال پہلے جبکہ میں میسور کے انسٹی ٹیوٹ میں فورتھ ٹرم کا کورس مکمل کر رہا تھا، تو وہاں کئی کالجوں کے اُستاد جمع ہو گئے تھے اور تین مہینے گذرنے کے باوجود ایک دوسرے سے کٹے کٹے سے رہتے، ایک دوسرے سے کنّی کتراتے اور ملتے بھی تو بہت تکلف اور ظاہرداری سے۔ میں اتفاق سے اُن سبھوں میں عمر کے لحاظ سے چھوٹا تھا اور وہ سبھی لوگ مجھے کوئی لفٹ نہیں دے رہے تھے۔ اُن کا یہ برتاؤ مجھے بہت کھلتا اور ایک دن مجھے ایک ترکیب سوجھی ——— ایک شرارت ——؟

"کیا؟" ریتا کے پتلے سے خمدار ہونٹ کھُل گئے، وہ ابھی ابھی بالغ نظر دانشور کی طرح ایک اہم مسئلے پر بول رہی تھی اور اب بچوں کے سے اشتیاق، تجسس اور بھولے پن کا مجسمہ بن گئی تھی۔

"میرے روم میٹ تھے گوری شنکر، نحیف و نزار سے آدمی، ہڈیوں کا ایک مختصر سا پنجر، جو ہمیشہ بیمار رہتے، ناشتے، لنچ اور ڈنر پر دو دو تین تین بڑی شیشیاں ساتھ لانا بھول نہ جاتے اور بلاناغہ دو دو تین تین ٹکیاں کھا لیتے، راتوں کو اکثر جاگتے رہتے اور عموماً اپنی کمزور یادداشت کو لعنت بھیجتے ہوئے تھوکوں سے بھاگتے۔ میں نے اتوار کو بیٹھے بیٹھے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہاتھ کی لکیروں کو ایک ماہر پامسٹ کی طرح دیکھنے لگا۔ پہلا انکشاف میں نے یہ کیا کہ جب سے اُن کی شادی ہوئی ہے، اُن کی صحت جواب دے چکی ہے اور دوسری بات یہ بتائی کہ اُن کی گھریلو زندگی پُرسکون نہیں اور آگے بیس سال تک کسی تبدیلی کا امکان نہیں ——— یہ سننا تھا کہ گوری شنکر چونک اُٹھے، تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا، اُن کے لمبوترے چہرے پر سیاہی مائل زردی چھا گئی اور اُنھوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اعتراف کر لیا کہ اُن کی بیوی بات بات پر جھگڑا کرتی ہے اور اُن کا جینا حرام کرتی ہے۔ پھر اُنھوں نے لنچ کے ٹائم پر اعلان کیا کہ مسٹر مدن انڈیا کے بہت بڑے پامسٹ ہیں۔ بس پھر کیا تھا، میرا ہر جگہ ذکر ہونے لگا اور سب لوگ میری بے حد عزت کرنے لگے، مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے رہے اور میں اتنے عرصے میں، دُور ہی سے سہی، اُن کے کردار کا جو تھوڑا سا مطالعہ کیا تھا، وہ کام آیا اور میں اُن کے ہاتھ دیکھتا رہا۔"

"تو آپ سچ مچ پامسٹ ہیں؟ ریلی؟ ——— آپ نے کہا بھی نہیں، کمال ہے۔ دیکھئے مسٹر مدن ذرا میرا ہاتھ تو دیکھئے، دیکھئے آپ کو ضرور دیکھنا پڑے گا ——— پلیز، پلیز مسٹر مدن!"

ریتا جھٹ سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اور ٹیبل کے اِس طرف کرسی کھینچ کر میرے پہلو میں بیٹھ گئی، اور اپنا چھوٹا سا گورا ہاتھ میرے سامنے کر دیا، یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ مجھے وضاحت کرنے کی بھی مہلت نہ ملی، میں حیرت کے عالم میں اُسے دیکھ رہا تھا جو سنجیدگی کی فضا کو توڑ کر میری بات کے پس منظر کو نظر انداز کر کے بچوں کی سی

چلبلاہٹ، ضد، اشتیاق اور التماس کا مجسمہ بنی ہوئی میرے پاس بیٹھی تھی، اور جس کا نرم و نازک گورا ہاتھ میرے پیہم احتجاج کے باوجود میرے ہاتھ میں تھا۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

"آپ کا ہاتھ —— یہ —— بہت اچھا ہے" میں ہکلا رہا تھا۔

"کس لحاظ سے؟ سٹرکچر کے لحاظ سے یا ——" وہ مسکرا رہی تھی، اور اُس کی آنکھوں کی وسعتوں میں سائے سے منڈلانے لگے۔

"سٹرکچر کے لحاظ سے بھی اور ——" میں اُس کے ہاتھ کی ریکھائیں محسوس کر رہا تھا، "یہ موئونٹ آف وینس ہے —— خوب —— بہ اُبھار —— آپ بے حد سینٹیمنٹل ہیں، اور آپ کی زندگی میں عموماً اِموشنل ڈسٹربنسیز ——"

"کوئٹ ٹرو ——" اُس کی آنکھوں میں اعتراف کی تحریر میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا،

اُس کے چہرے پر نوبیت، اضطراب اور تردد کی ملی جلی کیفیت تھی،

"یہ قسمت کی لکیر ہے —— بہت خوب! چانس آپ کی زندگی میں اہم رول ادا کر رہا ہے، اور قسمت آپ کی ساتھی ہے ——"

"وہ تو ذِکر ہی نہیں ——" اُسے یقین نہ آیا، وہ میرے اور زیادہ قریب آ چکی تھی، اُس کی آنکھوں میں مختلف بنتے، مٹتے اور بدلتے ہوئے رنگ تیر رہے تھے۔

"اور یہ ہارٹ لائن ہے —— اُف —— فو —— !"

"کیوں کیا بات ہے؟" وہ اپنے لہجے کا اضطراب چھپا نہ سکی۔

"بات —— بات یہ ہے کہ میں پہلے ذرا —— ہاں تو یہ لکیر کہہ رہی ہے کہ آپ کی دماغی قوت بے پناہ ہے، لیکن یہ ہارٹ لائن —— یہ لائن —— کتنی گہری ہے، آپ کا دل آپ کے دماغ پر حاوی رہے گا۔ اور دماغ کے فیصلے رد کرے گا، اور آپ ہمیشہ دل کے ہاتھوں ——" میری زبان لڑکھڑانے لگی، رینا کا جسم کانپ رہا تھا، اُس کے جسم کی کپکپاہٹ اُس کے ہاتھ کے ذریعے میرے جسم میں بھی سرایت کر رہی تھی۔

معاً اُس کی آنکھوں کی روشنی ماند سی پڑنے لگی، اُس نے آہستہ سے ہاتھ کھینچ لیا، اور مجبوب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی، اُس وقت اُس کی آنکھوں میں گریز اور سپردگی کی ایک ایسی متضاد کیفیت تھی، جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

ہال میں تھوڑی دیر پہلے کی خاموشی اب شور و غل، بے ہنگم قہقہوں اور چمچوں اور پلیٹوں کی ٹن ٹن کے شور میں بدل گئی تھی اور میں رینا کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔

اتوار کے دن صبح ہی سے آگ برس رہی تھی۔

میں اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا، پنکھا چل رہا تھا اور سامنے ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے رکھے کاغذات پھڑپھڑا رہے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا، سامنے رینا تھی، اپنے چوڑے شانوں پر خشک بالوں کا ہجوم لئے اُس کی آنکھوں میں نیندوں کا غبار سمٹا ہوا تھا، وہ شاید ابھی ابھی سو کر اُٹھی ہے، نیند کے خمار میں اُس کی بڑی بڑی آنکھیں کتنی سحرکار معلوم ہوتی ہیں۔

"آپ؟"

"ہاں، آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" وہ مسکرائی۔

"مجھے تو نہیں، البتہ وارڈن صاحب کو ——"

"مسٹر لال ——؟" وہ ہنس پڑی کمرے کی گھٹی ہوئی خاموشی میں نسوانی قہقہے کی شادابی بکھر گئی ——" ایک دم ایڈیٹ —— معلوم ہے آپ کو؟"

"کیا؟"

وہ میرے پلنگ پر بیٹھ گئی اور میں جلدی جلدی شیو کا سامان سمیٹنے لگا۔ میرے چہرے پر صابون کا جھاگ چپکا ہوا تھا۔

"مجھے کل اُنہوں نے آفس میں بلایا اور کہنے لگے، مِس رینا، لڑکیوں کا مردوں کے ساتھ مکس ہونا اچھا نہیں ہوتا، میں نے کہا —— وٹ ڈو یو مین سر؟ تو ہونٹ چبا کر رہ گئے، "Then I gave him a bit of my —— mind"

"کیا کہا آپ نے؟" میں نے کمرے پر نظر دوڑائی، چیزیں بکھری پڑی تھیں، سامنے تپائی پر میلی قمیص اور پاجامہ رکھا پڑا تھا، پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میرا کمرہ بہت گندہ ہے۔

"میں نے کہا، میں اپنا بُرا بھلا سب سمجھتی ہوں، اور پھر میری پرائیویٹ لائف میں کسی کو انٹرفیئر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کہنے لگے یہ تو ٹھیک ہے لیکن انسٹی ٹیوٹ کی ریپوٹیشن اِنوالو ہوتی ہے —— ریپوٹیشن —— اولڈ مین —— !"

"اور آج مینیز ہوسٹل میں آپ کو دیکھ کر اُنھیں چونٹیاں لگ جائیں گی۔"

"واقعی اُنھیں انفارم کرنا چاہیئے ——" اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی "پتہ نہیں یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں۔ میری روح تلملا اُٹھتی ہے، میرا دل بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان کتنا مصنوعی فاصلہ رکھا گیا ہے —— ایک بات کہوں، میں عورتوں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی، کتنی ہی

تعلیم یافتہ عورت کیوں دہو چند لمحوں کے بعد وہ میرے سینے کا بوجھ بن جاتی ہے، اُتھلی رومانیت، پھیکی اور سطحی باتیں ——— یہ ذہنی طور پر اپاہج مخلوق، اور مرد اگر کچھ بھی نہ ہو پھر بھی ایک دنیا ہے میرے سامنے مرد کتنا ہی گونگا کیوں نہ ہو، وہ —— [illegible] دیتی ہوں کہ محل اُٹھتا ہے، اور پھر ———"

"آپ تو سائیکالوجسٹ ہیں ———"

"یہ بات تو نہیں، البتہ چند کتابیں سائیکالوجی پر ضرور پڑھ چکی ہوں ———"

اُس نے انگڑائی لی ——— "خیر جانے دیجئے، کل ——— کل سیمنار اٹینڈ کرکے میں سیدھے ہوسٹل گئی، وہاں سبھی لیڈیز بازار جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں، مسز جوزف نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا، لیکن میں نہیں گئی۔ ہوسٹل کے کمرے میں اکیلی پڑی رہی رات کو کھانا کھائے بغیر ہی سو گئی، ابھی ابھی بستر سے نکلی ہوں، ابھی نہایا بھی نہیں سیدھے یہاں چلی آئی ———"

وہ بہت بے تکلفی اور اپنائیت سے میرے پلنگ پر بیٹھی تھی اور اتنا قریب بیٹھی تھی کہ اس کے عرق آلود جسم سے پھوٹتی ہوئی خوشبو میرے نتھنوں کو چھو رہی تھی، اُلجھے اُلجھے خشک بالوں اور شکن آلود ساڑی میں، بناؤ سنگھار سے بالکل عاری ہوتے ہوئے بھی وہ کتنی جاذبِ نظر تھی!

"انسان کتنا تنہا ہو گیا ہے مدن صاحب ——— اِس بھری دنیا میں اکیلا ——— ہر انسان اپنے حال میں گم ہے، اور کوئی کسی کو نہیں پوچھتا، جب سے میں یہاں آئی ہوں میرا رہا سہا سکون بھی لُٹ گیا ہے، میری راتوں کی نیندیں اُڑ گئی ہیں۔ کل رات میں کئی راتیں مسلسل جاگنے کے بعد سوئی ہوں، بہت سی سلیپنگ پلز کھا کر، جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں خود کو اکیلی محسوس کرتی رہی ہوں۔ گھر میں عجیب سی خاموشی اور [illegible] کا احساس مجھے پریشان کرتا رہا ہے۔ وہاں رہتا بھی کون ہے؟ صرف ممی ——— ڈیڈی تو ہمیشہ ٹرانسفر کے چکر میں رہے، اور ممی کبھی اُن کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوتی، وہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی ——— اور جب کالج میں میرا تقرر ہوا تو سارے گھر میں میں تنہا رہ گئی۔ ڈیڈی کی طبیعت خراب ہونے پر ممی کو اُن کے پاس جانا ہی پڑا۔ عجیب بات ہے مدن صاحب ——— میں جس چیز سے بھاگتی ہوں، وہی میرے پیچھے بھاگتی ہے ——— لیکن میں نے کب ہار مانی ہے؟ ہار ماننا میرے یہاں اٹیم ہی نہیں ——— گھر کو نوکر کے حوالے کرکے میں بھاگتی اور اپنے فرینڈس کے ساتھ شامیں باہر گذارتی، کیبری، کاسموا اور ریگل میں ——— موسیقی اور رنگ سے بھرپور وہی لمحے میری زندگی ہیں ——— لیکن جب رات کو پھر اپنے کمرے میں آجاتی ہوں تو زندگی ایک بوجھ بن جاتی ہے اور میں منوں بوجھ تلے دب جاتی ہوں ———" اُس کی آنکھوں میں خوابوں کی دُھند ڈھل چکی تھی اور اب اِن میں ایک شبنمی فضا جلوہ گر تھی،

ہم ہوسٹل روڈ پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہے تھے، سڑک کے دائیں بائیں دُور دُور تک ریتیلے میدان کے نشیب و فراز، خاردار جھاڑیاں اور سیاہ چٹانیں چاندنی میں عریاں پڑی تھیں، سامنے تارکول کی سڑک چمک رہی تھی، لیڈیز ہوسٹل کو جانے والی سڑک کے موڑ پر ٹھہرے ہوئے گندے پانی میں مینڈک ٹرّا رہے تھے۔ ریتا ہر چیز سے بے نیاز ترنم سے فلمی گیت سنا رہی تھی۔ اُس نے مہندی رنگ کا سکرٹ پہن لیا تھا اور بالوں کی لمبی سیاہ چوٹی اُس کے سینے پر جھول رہی تھی۔ سڑک کے موڑ پر وہ رُکی، اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی،

"مدن صاحب، سچ پوچھئے تو یہ بہکی ہوئی چاندنی راتیں مجھے پاگل بناتی ہیں۔"

میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں چاندنی ہے اور کئی کانپتے ہوئے سنہرے عکس جھلملا رہے ہیں۔

"آپ کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں!"

"بس بس، میری زیادہ تعریف نہ کیجئے، میں بے ہوش ہو جاؤں گی!" وہ ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔

میں ہنس پڑا، وہ بھی ہنس دی۔

"مدن صاحب:"

"جی؟"

"چلئے میرے ساتھ ———"

"کہاں؟"

"کہاں ——— ؟ آپ ——— آپ واپس جانے کے لئے پر تول رہے ہیں؟"

"نہیں، یہ بات تو نہیں ———"

"مسٹر لال سے آپ کو ڈر لگتا ہے کیا؟"

"مسٹر لال ——— وہ تو ایٹم ہی نہیں ———" میں نے ایٹم پر زور ڈالا، ہم دونوں ہنس پڑے۔

"سُنا ہے، لوگوں نے ہمارے خلاف اُن کے کان بھر دئے ہیں، یہ خود غرض لوگ ———"

"ہماری دوستی ایسی باتوں کا اثر نہیں لے سکتی ریتا ———"

"کوئٹ ٹرو ——— نہیں تو ———" اچانک اُس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی، اُس کے چہرے کا کُندنی رنگ ماند پڑ گیا اور اُس کی آنکھوں کے

سُنہرے عکس غائب ہوئے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"ارے آپ رونے لگیں ــــــ ؟ یہ آنسو! مائی گارڈ!!"

موٹے موٹے آنسو اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے اُبھرتے رہے اور سیاہ گھنی پلکوں کی نوکوں پر ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔

میں حیران و ششدر اُسے دیکھتا رہا۔

اور مجھے پہاڑوں میں گھری ہوئی اُس چھوٹی سی خوبصورت وادی کا خیال آرہا تھا، جہاں میں نے بیس دن قیام کیا تھا اور جو ہر آن بدلتے رنگوں کی ایک دنیا تھی ــــــ ابھی تازہ دھوپ نکلی ہے، اُجلی اُجلی سی، اور وادی کا چپہ چپہ نکھر اُٹھا ہے، ابھی نیلے آکاش پر کالے بادل دل کے دل جمع ہو گئے اور نشیبی میدان اور پہاڑیاں خوابوں کے سُرمئی غبار میں چھپ گئیں، ابھی رم جھم بارش ہونے لگی ہے اور آن کی آن میں ساری وادی جل تھل ہو گئی۔

میرے دل میں آیا کہ ریتا کے چمکتے ہوئے آنسوؤں کو چوم لوں ــــــ

"آپ کو نہیں معلوم مدن صاحب، میں اپنے دل میں کتنے گھاؤ چھپائے بیٹھی ہوں۔" اُس کا لہجہ کانپ رہا تھا "لوگ مجھے ہمیشہ مس انڈرسٹینڈ کرتے رہے ہیں۔ اِس میں میرا کوئی قصور نہیں، خود اُن کی خود غرضی کو دخل ہے اس میں، انسان پیدائشی خود غرض ہے، اور جب کبھی میں نے کسی کی غلط فہمی دُور کی تو وہ میرے لئے مصیبت بن گیا ــــــ جھوٹی باتیں، تہمتیں، خباثتیں ــــــ میں سچ کہتی ہوں انسان زہریلے جانوروں سانپ اور بچھو سے زیادہ تکلیف دِہ ہے ــــــ بظاہری تکلف، مروت اور Courtesy میں ڈھونگ ہے، جھوٹی تہذیب، ملمع کاری، انسان کے جسم سے یہ ملمع اُترتے دیر نہیں لگتی۔"

میں سنبھل چکا تھا، ریتا کو مس انڈرسٹینڈ کرنا دُشوار نہیں تھا۔

اُس کی آنکھوں کی سنہری چمک اب شعلے کی تیز لپیٹ میں بدل رہی تھی۔

اور پھر وہ اُس نورانی رات میں ایک بڑی کالی چٹان پر ٹیک لگائے مجھے زندگی کے کئی واقعات سُناتی رہی، رُک رُک کر، کھوئے کھوئے سے لہجے میں، جیسے وہ کسی حسین خواب میں بول رہی تھی، اور میں سحر زدہ اُسے دیکھتا رہا ــــــ شعلے کی لو اُس کی آنکھوں میں تھرتھراتی رہی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ایم اے کر رہی تھی، باہر تیز سی بارش ہو رہی تھی، اور میں راجندر کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اُس نے دو غزلیں گا کر سُنائیں، بہت ہی پُر تاثیر لہجے میں، راجندر گاتا ہے تو میں اپنے حواس میں نہیں رہتی، کتنا جادو ہے اُس کی آواز میں، میں مسحور ہو جاتی ہوں، اُس کی کلاکاروں کی سی ادا، یوں تو کافی رکھ رکھاؤ کا قائل ہے، عمدہ سوٹ پہنتا ہے، کمرہ اُس نے خوب سجایا تھا، کتابیں سلیقے سے رکھی تھیں اور تپائی پہ تازہ پھولوں کا گلدستہ ــــــ اور پھر جب میں نے اُس کے ٹیبل کے کھلے ڈرائر کو دیکھا، تو ایک البم پہ میری نظر پڑی ــــــ اور راجندر نے کرسی سے فوراً اُٹھ کر وہ البم میرے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی، لیکن میں کہاں چھوڑتی، وہ البم ہی نہ تھا ــــــ اور میں نے دیکھا ــــــ"

"کیا دیکھا؟"

"اُس میں چار پانچ تصویریں تھیں، خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں ــــــ ایک سے ایک بڑھ کر ــــــ اور پھر راجندر نے زخمی لہجے میں بتایا کہ اُس کی زندگی میں یہ سب لڑکیاں آئیں اور سبھوں نے اُسے ــــــ [illegible] کیا اور جب وہ اپنی داستان بیان کر چکا تھا تو میں بالکل متاثر نہیں ہوئی، اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، مجھے عجیب سا محسوس ہوا، عورتوں کے ہاتھوں ستایا ہوا یہ مرد عورتوں کی طرح رو رہا تھا ــــــ ہُنہ، میں فوراً وہاں سے اُٹھ کے چلی آئی، اور راجندر کی خوش فہمی ــــــ مائی لارڈ!

میں راجندر سے شادی کیسے کرتی ــــــ وہ تو ایٹم ہی نہیں، راجندر، جو ایم۔ اے کرنے کے بعد ٹیچرس ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہے ــــــ پروفیسر وہ اور کس لائق تھا؟ ــــــ راجندر میری منزل نہ تھا ــــــ لیکن وہ آج بھی مجھے خط لکھتا ہے بیچارہ، اور میرے خواب دیکھتا ہے ــــــ بہت سے لوگ ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں۔"

ہم لائبریری سے ملحق سیمینار روم سے نکل کر برآمدے پر آگئے۔

سورج، آگ کا سُلگتا ہوا انگارہ، سفید بلڈنگوں کے پیچھے تیزی سے ریتیلے میدان پہ آ رہا تھا۔

سورج کی آڑی ترچھی شعاعیں ریتا کی آنکھوں میں رنگوں کی پھوار برسا رہی تھیں۔

وہ اب بھی خاموش تھی اور جہان بھر کی اُداسی اُس کے چہرے سے مترشح تھی۔

سیمینار روم خالی ہو چکا تھا، کچھ لوگ لائبریری میں چلے گئے تھے، کچھ واپس ہوسٹل گئے تھے اور کچھ بازار چلے گئے تھے۔ میں بھی جلدی سے جانا چاہتا تھا۔ آج مجھے بیوی کا خط ملا تھا اور خط پڑھ کر گھر کی پوری تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ مسرت اور اضطراب کی عجیب ملی جُلی کیفیت تھی، جو میرے دل میں کسک بن کے موجود تھی، لیکن سیمینار میں آج ریتا کا جو حال ہوا اُس کا اثر بھی میرے دماغ پر

شینٹ تھا۔ وہ پروفیسر آر۔ کے داس کی موجودگی میں اپنے سبجیکٹ پر لیکچر دینے کے لئے اٹھی، آج اُس کی باری تھی، کمرے میں خاموشی تھی اور سبھی ہمہ تن گوش تھے، ریتا نے چاک ہاتھ میں لے کر بولنا شروع کیا۔ پہلے تو وہ روانی سے بولنے لگی، لیکن ابھی دس منٹ بھی نہ بولی تھی کہ اُس کی زبان رُکنے لگی، اُس کا لہجہ کپکپانے لگا، اُس کے چہرے پہ زردی چھا گئی۔ وہ رُک گئی اور تشنج کی کیفیت میں سٹینڈ کے قریب آئی، سٹینڈ کا سہارا لیا، اور فوراً چاک پھینک دیا۔ اُس کی آنکھیں جیسے دُھواں دُھواں ہو گئیں۔ میں گھبرا گیا ——— یہ ریتا کو اچانک کیا ہو گیا؟ کانا پھوسی شروع ہوئی، اور اتنے میں ریتا سہمے ہوئے لہجے میں بولی،

"آئی ایم ساری پروفیسر داس، [illegible]

[illegible] یہ کہہ کر وہ کانپتی ہوئی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے لئے ہوئے کمرے سے نکلی۔

سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

اور ریتا مجھ سے کہہ رہی تھی ———

"سُرِندر کا خط پڑھ کر میں بہت ڈسٹرب ہوئی ہوں، اُنھیں فارین سکالرشپ مل رہا ہے، ریسرچ کے سلسلے میں، لیکن ——— اُنھوں نے لکھا ہے کہ وہ شادی کر کے جانا چاہتے ہیں، اور ——— اور مجھے بھی ساتھ لینا چاہتے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے یہ معاملہ فوراً [illegible] ——— ہونا چاہیئے، نہیں تو یہ چانس بھی جاتا رہے گا، اور اب کے وہ یہ چانس مِس کرنا نہیں چاہتے، ٹھیک ہی لکھا ہے اُنھوں نے، لیکن ——— میں جانتی ہوں وہ کتنی سخت ذہنی اُلجھن میں ہوں گے، اُن کی طبیعت سے واقف ہوں نا؟ وہ زبردست ایمبیشش انسان ہیں، اور جو فیصلہ کرتے ہیں اُس پر قائم رہتے ہیں۔ اُن کی یہی خوبی مجھے پسند ہے، فارین جا کر اُنھوں نے اور بھی سکیمیں سوچ کر رکھی ہیں، مائی گارڈ، اُن کی ——— [illegible] ——— ہی اُن کی سب سے بڑی قوت ہے، ورنہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ایم۔ اے کر لیا، نوکر ہوئے، شادی ہوئی بچے ہوئے، اور پھر بوڑھاپا ——— اور پھر بے نام موت ——— چھی چھی! مجھے تو ایسی زندگی کا تصوّر ہی مارے ڈالتا ہے، میری سانس گھٹ جاتی ہے، میں ایسی زندگی پر تھوکتی ہوں، میں ——— لیکن ——— اب اِس خط کا کیا جواب دوں؟ کل سے میں ——— [illegible] ——— ہو رہی ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ڈیڈی اب تک [illegible] ——— نہیں ہوئے، جب بھی یہ ذکر چھڑتا ہے وہ ہاں کرتے ہیں نہ نہیں۔ پتھر بن گئے ہیں وہ۔ نہ جانے کیوں؟ اب میں زبردستی اُنھیں رضامند نہیں کر سکتی۔ اُف! یہ زنجیریں ——— لیکن میں اِن زنجیروں کو دُور جھٹک دوں گی ———"

وہ چُپ ہو گئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے اندرونی کشمکش کی شدت سے اُس کا نازک سا جسم چٹخ کر ٹوٹ جائے گا۔

سورج ڈوب چکا تھا، اور شاں شاں کرتی ہوئی تیز ہوا چل رہی تھی۔

ریتا دس روز کی لیو لے کر گئی تھی، اور انسٹی ٹیوٹ میں امن و سکون کی حالت بحال ہو گئی تھی، لوگوں کی چہ میگوئیاں، باتیں، شکایتیں ختم ہو چکی تھیں، سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، اور امتحان سر پہ آ رہا تھا، میں بھی اب اپنا خاصا وقت اپنے سبجیکٹ کی تیاری میں صرف کر رہا تھا، میں نے بہت سے نوٹس لے لئے، بہت سا مطالعہ کیا، گھر بھی دو تین طویل خطوط لکھے، پچھلے پانچ مہینوں میں تو ریتا میرے دل و دماغ پر بُری طرح چھائی رہی، اور میں بے بس ہو کر اُس کے اشاروں پہ چلتا رہا، واقعی عورت کتنی طاقت رکھتی ہے اور پھر ریتا تو مجسّم قیامت ہے! اُس کی آنکھوں میں ایک جیتا جاگتا سحر ہے، کئی بار اُس سے نہ ملنے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں اُس سے برابر ملتا رہا، اور اُس کی سحر کار آنکھوں سے مسحور ہوتا رہا۔ میں اُس سے دُور بھی رہتا، لیکن وہ مجھے کہاں [illegible] کرنے والی تھی، وہ بلا جھجک میرے کمرے میں چلی آتی، اور گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ ہر جگہ مجھ سے دوستی کا چرچا کرتی، اور انسٹی ٹیوٹ کے لوگ تھے کہ مجھ سے دل ہی دل میں جلتے تھے، لیکن جب سے وہ گئی تھی، سب لوگ پہلے ہی کی طرح مجھ سے ملتے رہے، جیسے اُنھوں نے اب مجھے معاف کیا تھا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ جلد آ رہی ہے، لیکن میرا خیال تھا کہ وہ اب لَوٹ کر نہ آئے گی، پچھلے دنوں اُسے ہر روز سریندر کا خط ملتا رہا، اور دو تار بھی ملے، وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی، اُس کی آنکھوں کے نیچے گہری لکیریں سی نمودار ہوئی تھیں، نازک سے ہونٹوں پہ سیاہ پپڑی جمی ہوئی تھی، لباس کی طرف سے بھی وہ بے پرواہ تھی، بناؤ سنگار سے بے نیاز، اُلجھے ہوئے آوارہ بال جو اُس کی شدید ذہنی اُلجھن کی علامت تھے، وہ کلاس بھی باقاعدگی سے اٹینڈ نہ کرتی، اور جانے سے پہلے جب وہ مجھ سے ملی تو اُس کی بھیگی بھیگی آنکھیں خاموش تھیں۔ اُس نے یہ بھی نہ بتایا وہ کہاں جا رہی ہے اور اُس کا پروگرام کیا ہے۔

ابھی اُس کی لیو ختم ہونے میں چار دن باقی تھے کہ وہ آ گئی چھم چھم کرتی ہوئی ایک نئی خوبصورت ساڑی میں ملبوس اُس کے بال خوبصورتی سے گندھے ہوئے تھے، وہ بہت بشاش نظر آ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں، وہ سب سے مُسکرا مُسکرا کر ملتی رہی۔ سارا دن کلاسوں کا چکّر رہا۔ ہم باتیں بھی نہ کر سکے، اُس دن سیمینار بھی لمبا ہوا، مسز جوزف کو پیپر پڑھنا تھا، میں تھکا ماندہ ہوسٹل پہنچا اور لیٹ گیا۔ میں سوچ رہا تھا ریتا پھولے نہیں سما رہی ہے، آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی، کتنی ——— [illegible] ہے۔ ——— ہے وہ اور خود بھی کتنی ———

ــــ اور یہ سوچ کر نہ جانے کیوں میں اُداس سا ہو گیا۔

ڈائننگ ہال میں رنیتا موجود تھی، وہ آج بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی، پہلی بار اُس کے گالوں پہ مجھے ہلکی سی سُرخی دکھائی دی، وہ چہکتی رہی، قہقہے لگاتی رہی اور زور زور سے باتیں کرتی رہی ـــ مجھے حیرت اس بات پہ ہو رہی تھی کہ وہ مجھ سے دُور دُور کیوں ہے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد میں وہاں سے چلا، تو رنیتا ہوا کے ایک سُبک جھونکے کی طرح میرے قریب آئی۔

"میں لیڈیز کے ساتھ ہوسٹل نہیں جا رہی ہوں"

"اچھا؟ ـــ تو کیا میں ساتھ چلوں؟"

"ہاں ہاں ـــ لیکن ابھی جلدی کیا ہے، چلئے آپ کے کمرے میں چلیں، آپ کو کوئی اعتراض ـــ"

"مجھے تو نہیں، البتہ مسٹر لال ـــ" میں ہنسا

"مسٹر لال ـــ ایڈیٹ!" اُس نے قہقہہ لگایا اور میرے ساتھ چلنے لگی۔

میرے پلنگ پہ وہ تکیہ پہ سر رکھے کہہ رہی تھی

"میں سُرِندر سے ملی ہوں ـــ"

"سرِندر سے؟"

"ہاں ہاں سُرِندر سے ـــ میں ڈیڈی کے پاس نہیں گئی، وہاں جانا بیکار تھا، پتھر سے سر پھوڑنے سے کیا حاصل؟ لیکن سُرِندر ـــ" اچانک اُس کا لہجہ بجھ سا گیا ـــ "اُس کے سامنے دو ہی راستے تھے اور ایک کی چوائس کرنی تھی، وہ بڑا ـــ ambitious ہے اور ـــ Man of decision ٹھیک ہے ـــ وہ فارین جانے کا چانس مِس کرنے پر راضی نہ تھا، اور میں ـــ میں رات کے دس بجے اُس کے کمرے سے چلی آئی۔ راستے میں نے ہوٹل میں کافی اور صبح کی گاڑی سے لوٹی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی محبت اتنی کمزور اور چھچھوری ہوتی ہے، محبت جسم و جاں کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں پھیلاتی ہے اور پھر جسم مٹی بن جاتا ہے، لیکن محبت کی جڑیں ہری رہتی ہیں، مٹی سے رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں ـــ"

میں حیرت میں ڈوبا، اُس کی فلسفیانہ باتیں سُن رہا تھا۔

مجھے اُس سے کوئی سوال کرنے کی جُرأت نہ ہوئی

میں نے دیکھا اُس کی آنکھیں خشک تھیں، ویران، اُن میں جیسے ریت کے صحرا سُلگ رہے تھے، اندر دُور دُور تند و تیز بگولے اُڑ رہے تھے ـــ وہ آنکھیں ـــ!

وہ خاموش ہو گئی۔

اُس کی جلتی پلکیں جُھک گئیں، پلکیں باہم پیوست ہو گئیں۔

اُس نے میرے بازو میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

شاید اُسے نیند آ رہی تھی۔

غزلیں

جمیلؔ مظہری ایم۔ اے

رُوٹھی ہوئی قسمت کی طرح رُوٹھنے والے
اِس دل میں تری یاد ہے اِس کو بھی بُلا لے

کیا دیں گے مرے ڈُوبتے دل کو یہ سہارا
ارمان تو خود جھوٹی اُمیدوں کے ہیں پالے

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے قسمت کی سیاہی
دنیا سے مری بھاگتے جاتے ہیں اُجالے

ٹھکراتے ہوئے دل کی گُنہ گار تمنّا
پاپی ترے قدموں پہ سسکتی ہے، اُٹھا لے

بکھرے ہیں سرِ خاک جمیلؔ آپ کے آنسو
ہے کوئی جو چُن کر انھیں دامن میں اُٹھا لے

نافعؔ رضوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

جب اپنے عنبریں گیسو وہ لہرایا نہیں کرتے
فضا میں رنگ و بُو کے ابر بھی چھایا نہیں کرتے

خدا جانے کہ اہلِ بزم اپنے دل میں کیا سمجھیں
سرِ محفل کبھی اِس طرح شرمایا نہیں کرتے

نظر اُن کی بھری محفل میں کہہ دیتی ہے رازِ دل
مگر اپنی زباں سے کچھ وہ فرمایا نہیں کرتے

کسی نازک سے لمحے پر یہ از خود اُٹھ ہی جاتے ہیں
حریمِ ناز کے پردوں کو سرکایا نہیں کرتے

نہ جانے کتنے مہ پاروں کو مجھ سے پیار تھا نافعؔ
مجھے اُن سب کے اب تو نام یاد آیا نہیں کرتے

ثبت تھا۔ وہ پروفیسر آر۔ کے داس کی موجودگی میں اپنے سبجیکٹ پر لیکچر دینے کے لئے اُٹھی، آج اُس کی باری تھی، کمرے میں خاموشی تھی اور سبھی ہمہ تن گوش تھے، رِیتا نے چاک ہاتھ میں لے کر بولنا شروع کیا۔ پہلے تو وہ روانی سے بولنے لگی، لیکن ابھی دس منٹ بھی نہ بولی تھی کہ اُس کی زبان رُکنے لگی، اُس کا لہجہ کپکپانے لگا، اُس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ وہ رُک گئی اور تشنج کی کیفیت میں سٹینڈ کے قریب آئی، سٹینڈ کا سہارا لیا، اور فوراً چاک پھینک دیا۔ اُس کی آنکھیں جیسے دُھواں دُھواں ہو گئیں۔ میں گھبرا گیا ——— یہ رِیتا کو اچانک کیا ہو گیا ہے کانا پھوسی شروع ہوئی اور اتنے میں رِیتا جھجکتے ہوئے لہجے میں بولی،

"آئی ایم ساری پروفیسر داس، [illegible] [illegible] یہ کہکر وہ کانپتی ہوئی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے لئے ہوئے کمرے سے نکلی۔

سب لوگ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہ گئے۔

اور رِیتا مجھ سے کہہ رہی تھی ———

"مسٹر نید کا خط پڑھ کر میں بہت ڈسٹرب ہوئی ہوں، اُنھیں فارین سکالرشپ مل رہا ہے، ریسرچ کے سلسلے میں، لیکن ——— اُنھوں نے لکھا ہے کہ وہ شادی کر کے جانا چاہتے ہیں، اور ——— اور مجھے بھی ساتھ لینا چاہتے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے یہ معاملہ فوراً [illegible] ——— ہونا چاہئے، نہیں تو یہ چانس بھی جاتا رہے گا، اور اب کے وہ یہ چانس مِس کرنا نہیں چاہتے، ٹھیک ہی لکھا ہے انھوں نے، لیکن .... میں جانتی ہوں وہ کتنی سخت ذہنی اُلجھن میں ہوں گے، اُن کی طبیعت سے واقف ہوں نا، وہ زبردست ایمبیشش انسان ہیں، اور جو فیصلہ کرتے ہیں اُس پہ قائم رہتے ہیں۔ اُن کی یہی خوبی مجھے پسند ہے، فارین جا کر اُنھوں نے اور بھی سکیمیں سوچ کر رکھی ہیں، مائی گاڈ، اُن کی ——— [illegible] ——— ہی اُن کی سب سے بڑی قوّت ہے، ورنہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ایم۔اے کر لیا، نوکر ہوئے، شادی ہوئی، بچے ہوئے، اور پھر بوڑھاپا ——— اور پھر بے نام موت ——— چھی چھی! مجھے تو ایسی زندگی کا تصور ہی مارے ڈالتا ہے، میری سانس گھُٹ جاتی ہے، میں ایسی زندگی پر تھوکتی ہوں، میں ——— لیکن ——— اب اِس خط کا کیا جواب دوں؟ کل سے میں ——— [illegible] ——— ہو رہی ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ڈیڈی ابتک ——— [illegible] ——— نہیں ہوئے، جب بھی یہ ذکر چھڑتا ہے وہ ہاں کرتے ہیں نہ نہیں۔ پتھر بن گئے ہیں وہ۔ نہ جانے کیوں، اب میں زبردستی اُنھیں رضامند نہیں کر سکتی۔ اُف! یہ زنجیریں ——— لیکن میں اِن زنجیروں کو دُور جھٹک دوں گی ———"

وہ چُپ ہو گئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے اندرونی کشمکش کی شدت سے اُس کا نازک سا جسم چٹخ کر ٹوٹ جائے گا۔

سورج ڈوب چکا تھا، اور شی شی کرتی ہوئی تیز ہوا چل رہی تھی۔

رِیتا دس روز کی لیو لے کر گئی تھی، اور انسٹی ٹیوٹ میں امن و سکون کی حالت بحال ہو گئی تھی، لوگوں کی چہ میگوئیاں، باتیں، شکایتیں ختم ہو چکی تھیں، سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، اور امتحان سر پہ آ رہا تھا، میں بھی اب اپنا خاصا وقت اپنے سبجیکٹ کی تیاری میں صرف کر رہا تھا، میں نے بہت سے نوٹس لے لئے، بہت سا مطالعہ کیا، گھر بھی دو تین طویل خطوط لکھے، پچھلے پانچ مہینوں میں تو رِیتا میرے دل و دماغ پر بُری طرح چھائی رہی، اور میں بے بس ہو کر اُس کے اشاروں پہ چلتا رہا، واقعی عورت کتنی طاقت رکھتی ہے اور پھر رِیتا تو مجسّم قیامت ہے! اُس کی آنکھوں میں ایک جیتا جاگتا سحر ہے، کئی بار اُس سے نہ ملنے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں اُس سے برابر ملتا رہا، اور اُس کی سحرکار آنکھوں سے مسحور ہوتا رہا۔ میں اُس سے دُور بھی رہتا، لیکن وہ مجھے کہاں [illegible] کرنے والی تھی، وہ بلا جھجک میرے کمرے میں چلی آتی، اور گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ ہر جگہ مجھ سے دوستی کا چرچا کرتی، اور انسٹی ٹیوٹ کے لوگ تھے کہ مجھ سے دل ہی دل میں جلتے تھے، لیکن جب سے وہ گئی تھی، سب لوگ پہلے ہی کی طرح مجھ سے ملتے رہے، جیسے اُنھوں نے اب مجھے معاف کیا تھا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ جلد آ رہی ہے، لیکن میرا خیال تھا کہ وہ اب لَوٹ کر نہ آئے گی، پچھلے دنوں اُسے ہر روز سرنید کا خط ملتا رہا، اور دو تار بھی ملے، وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی اُس کی آنکھوں کے نیچے گہری لکیریں سی نمودار ہوئی تھیں، نازک سے ہونٹوں پر سیاہ پپڑی جمی ہوئی تھی، لباس کی طرف سے بھی وہ بے پرواہ تھی، بناؤ سنگار سے بے نیاز، اُلجھے ہوئے آوارہ بال جو اُس کی شدید ذہنی اُلجھن کی علامت تھے، وہ کلاس بھی باقاعدگی سے اٹینڈ نہ کرتی، اور جانے سے پہلے جب وہ مجھ سے ملی تو اُس کی بھیگی بھیگی آنکھیں خاموش تھیں۔ اُس نے یہ بھی نہ بتایا وہ کہاں جا رہی ہے اور اُس کا پروگرام کیا ہے

ابھی اُس کی لیو ختم ہونے میں چار دن باقی تھے کہ وہ آ گئی چھم چھم کرتی ہوئی ایک نئی خوبصورت ساڑی میں ملبوس اُس کے بال خوبصورتی سے گندھے ہوئے تھے، وہ بہت بشاش نظر آ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں، وہ سب سے مُسکرا مُسکرا کر ملتی رہی۔ سارا دن کلاسوں کا چکر رہا۔ ہم باتیں بھی نہ کر سکے، اُس دن سیمینار بھی لمبا ہوا مسز جوزف کو پیپر پڑھنا تھا، میں تھکا ماندہ ہوسٹل پہنچا اور لیٹ گیا۔ میں سوچ رہا تھا رِیتا پھولے نہیں سما رہی ہے، آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی، کتنی ——— [illegible] ہے ——— وہ اور خود بھی کتنی ———

[redacted] اور یہ سوچ کر نہ جانے کیوں میں اُداس سا ہو گیا۔

"ڈائننگ ہال میں ریتا موجود تھی، وہ آج بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی، پہلی بار اُس کے گالوں پر مجھے ہلکی سی سُرخی دکھائی دی، وہ چہکتی رہی، قہقہے لگاتی رہی اور زور زور سے باتیں کرتی رہی —— مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ مجھ سے دُور دُور کیوں ہے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد میں وہاں سے چلا، تو ریتا ہوا کے ایک سُبک جھونکے کی طرح میرے قریب آئی۔

"میں لیڈیز کے ساتھ ہوسٹل نہیں جا رہی ہوں۔"

"اچھا؟ —— تو کیا میں ساتھ چلوں؟"

"ہاں ہاں —— لیکن ابھی جلدی کیا ہے، چلئے آپ کے کمرے میں چلیں، آپ کو کوئی اعتراض ——"

"مجھے تو نہیں، البتہ مسٹر لال ——" میں ہنسا

"مسٹر لال —— ایڈیٹ!" اُس نے قہقہہ لگایا اور میرے ساتھ چلنے لگی۔

میرے پلنگ پر وہ تکیہ پر سر رکھے کہہ رہی تھی

"میں سُریندر سے ملی ہوں ——"

"سُریندر سے؟"

"ہاں ہاں سُریندر سے —— میں ڈیڈی کے پاس نہیں گئی، وہاں جانا بیکار تھا، پتھر سے سر پھوڑنے سے کیا حاصل؟ لیکن سُریندر ——" اچانک اُس کا لہجہ بجھ سا گیا —— "اُس کے سامنے دو ہی راستے تھے اور ایک کی چوئس کرنی تھی، وہ بڑا —— Man of decision ہے اور —— ambitions ٹھیک ہے —— وہ فارین جانے کا چانس مس کرنے پر راضی نہ تھا، اور میں —— میں رات کے دس بجے اُس کے کمرے سے چلی آئی۔ راستہ میں نے ہوٹل میں کاٹی اور صبح کی گاڑی سے لوٹی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی محبت اتنی کمزور اور چھچھوری ہوتی ہے، محبت جسم و جاں کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں پھیلاتی ہے اور پھر جسم مٹی بن جاتا ہے، لیکن محبت کی جڑیں ہری رہتی ہیں، مٹی سے رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں ——"

میں حیرت میں ڈوبا، اُس کی فلسفیانہ باتیں سُن رہا تھا۔

مجھے اُس سے کوئی سوال کرنے کی جُرأت نہ ہوئی

میں نے دیکھا اُس کی آنکھیں خشک تھیں، ویران، اُن میں جیسے ریت کے صحرا سُلگ رہے تھے، اور دُور دُور تند و تیز بگولے اُڑ رہے تھے —— وہ آنکھیں ——!

وہ خاموش ہو گئی۔

اُس کی جلتی پلکیں جُھک گئیں، پلکیں باہم پیوست ہو گئیں۔

اُس نے میرے بازو میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

شاید اُسے نیند آ رہی تھی۔

غزلیں

جمیلؔ مظہری ایم۔ اے

رُوٹھی ہوئی قسمت کی طرح رُوٹھنے والے
اِس دل میں تری یاد ہے اِس کو بھی بُلا لے

کیا دیں گے مرے ڈُوبتے دل کو یہ سہارا
ارمان تو خود چھوٹی اُمیدوں کے ہیں پالے

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے قسمت کی سیاہی
دنیا سے مری بھاگتے جاتے ہیں اُجالے

ٹھکرائے ہوئے دل کی گنہگار تمنّا
پا پی ترے قدموں پہ سسکتی ہے، اُٹھا لے

بکھرے ہیں سرِ خاک جمیلؔ آپ کے آنسو
ہے کوئی جو چُن کر انھیں دامن میں اُٹھا لے

نافعؔ رضوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

جب اپنے عنبریں گیسو وہ لہرایا نہیں کرتے
فضا میں رنگ و بُو کے ابر بھی چھایا نہیں کرتے

خدا جانے کہ اہلِ بزم اپنے دل میں کیا سمجھیں
سرِ محفل کبھی اِس طرح شرمایا نہیں کرتے

نظر اُن کی بھری محفل میں کہہ دیتی ہے رازِ دل
مگر اپنی زباں سے کچھ وہ فرمایا نہیں کرتے

کسی نازک سے لمحے پر یہ از خود اُٹھ ہی جاتے ہیں
حریمِ ناز کے پردوں کو سرکایا نہیں کرتے

نہ جانے کتنے مہ پاروں کو مجھ سے پیار تھا نافعؔ
مجھے اُن سب کے اب تو نام یاد آیا نہیں کرتے

گندہ رُومال

پروفیسر شفیقہ فرحت ایم۔ اے
گرلز کالج۔ بھوپال

محترم بھائی تسلیم

"بیسویں صدی" کے لئے ایک تازہ ترین تخلیق "گندہ رومال" بھیج رہی ہوں ——— عنوان جتنا مَیلا ہے کہانی اتنی ہی اُجلی ہے! ——— آپ اس کہانی میں عورت کے دل کی دھڑکنیں ہر مقام، ہر موڑ پر محسوس کریں گے۔ یہ کہانی لکھتے ہوئے میں خود تاثر میں ڈوب گئی تھی ——— یقین ہے یہ آپ کو اور ——— قارئین کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہے گی...

آپ کی بہن ——— شفیقہ فرحت

آپ نے میرے ہاتھ سے رُومال لیا۔ احتیاط سے کوٹ کی اوپر والی جیب میں رکھا اور آہستہ آہستہ نپے تُلے قدم رکھتے ہوئے زینے سے اُتر گئے۔ پھر گاڑی رینگتی ہوئی پھاٹک سے نکلی اور بل کھاتی سڑک پر لہرانے لگی۔

لیکن آج یہ دل میں ٹیس سی کیوں اُٹھی؟

میری آنکھیں کیوں چھلکنے لگیں ———؟

یہ تو آپ کا معمول ہے۔ دفتر سے آکے آپ چائے پیتے ہیں۔ پھر ذرا دیر آرام کرکے تیار ہوکے اسی طرح چلے جاتے ہیں۔ روزانہ اِسی وقت جب دن کا اُجالا کونے کونوں میں چھپتا پھرتا ہے اور رات کی سیاہی اُس کی تلاش میں اُداس اُداس سی دبے پاؤں گھومتی رہتی ہے!

ہاں ہر روز شام کے اِسی دُھندلکے میں آپ ایسے ہی پُروقار پُرتمکین انداز میں زینے سے نیچے اُترتے ہیں۔ امّی سے پان لے کے کھاتے ہیں اور گھومنے نکل جاتے ہیں۔

میں تو آپ کے اِس پروگرام کی عادی ہوں اور پھر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کہیں نہیں جاتے۔ صرف ویرانوں میں تنہا گاڑی لئے گھومتے رہتے ہیں۔

پھر آج آپ کے چلے جانے پر میری آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے ———؟

آپ کے جانے پر تو میں اُس دن بھی نہیں روئی تھی جب ہماری شادی کے بیس یا شاید پچیس دن بعد میں رہنے کے لئے پہلی بار سسرال آئی تھی۔ میرے ساتھ شام کی سیاہی بھی آگئی اور آپ مجھے اُس اندھیرے میں تنہا چھوڑ کر روشنی کی تلاش میں نکل گئے۔

رونا تو مجھے اُس دن چاہئے تھا۔

لیکن میں نہیں روئی۔

شاید اِس لئے کہ میں شادی سے پہلے ہی آپ کے متعلق بہت کچھ جانتی تھی۔

اُس دن بھی آپ نے مجھ سے ساتھ چلنے کے لئے نہیں کہا۔ اپنے جانے کے لئے معذرت نہیں کی۔ اُس دن تو آپ نے مجھ سے رُومال بھی نہیں مانگا۔ بس اِسی طرح تیار ہوئے۔ مجھ پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی اور صرف اتنا کہا ——— "ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گا ———" اور چلے گئے۔

اُس شام میں آپ کو روکنا چاہتی تھی ——— میری اُن نگاہوں میں جنہیں آپ نے نہ اُٹھتے دیکھا تھا نہ جھکتے وہی التجا تھی۔ میری زبان جو شرم اور ایک انجانے خوف سے بند تھی یہی کہنا چاہتی تھی۔

لیکن میں اُس دن بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ آپ کو روک نہ سکوں گی ——— کیونکہ مجھے یہ حق ملا ہی نہ تھا ——— یا یوں سمجھ لیجئے کہ میں خود اِس حق کو نہیں لے پائی تھی۔ حق کو لینے کے لئے حُسن کی جو طاقت چاہئے ۔ وہ مجھ میں کہاں ———!!

اور پھر اس دن کی بات میں بھول گئی تھی جب مُنّے کی پیدائش کے بعد میری طبیعت کچھ خراب تھی [illegible] آپ نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ میرے پاس بیٹھے [illegible] کچھ دیر تک آپ [illegible]۔ [illegible] آپ اپنے وقت پر ہی آئے۔ مجھے لیٹے دیکھ کر میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئے میں نے اُٹھنے کی کوشش کی آپ نے منع کیا۔ بلکہ مجھے پھر لٹانے کے لئے خود جھک گئے ——

اُس وقت آپ کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ مجھے آپ کی وہ نگاہیں آج کتنے سالوں بعد بھی یاد ہیں۔ جو پیار جو اپنائیت اُس لمحے آپ کی آنکھوں میں تھی۔ وہ مجھے پھر کبھی نہ مل سکی۔ اُس پیار کو پاکر میں اُس لمحے ایسی خوش ہوئی ایسی خوش ہوئی کہ میرے آنسو نکل آئے۔

پیار گھبرا ہٹ میں بدل گیا کیا ڈاکٹر کو بلاؤں۔ زیادہ تکلیف ہے۔ — میں جو ہر گھڑی اجنبی خوف سے لرزتی رہتی تھی۔ ڈرتی رہتی ہوں۔ جھجکتی رہتی ہوں۔ آپ کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہہ سکی کہ مجھے ڈاکٹر کی نہیں آپ کی ضرورت ہے —— آپ تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھے رہئے۔ میرا ہر دُکھ دُور ہو جائے گا۔

میں نے لالٹین جلا کر کہا —— "تمہارا بھی دل گھبرا رہا تھا —"

"تمہاری امّی کو بُلا دوں —— ؟"

دعا دیتے ہوئے میں نے سر ہلا دیا۔

امّی آگئیں —— اور آپ حسب معمول چلے گئے —— !!

پھر آج جب زندگی کے کتنے ہی سال اُسی روش پر اُسی انداز میں چلتے چلتے بیت گئے تو آپ کے جانے پر مجھے اتنا دُکھ کیوں ہوا —— جیسے میرا سارا وجود کُچل گیا ہو!

مجھے دُکھ اِس بات کا نہیں کہ آپ چلے گئے —— دُکھ اِس بات کا ہے کہ آج میری طرف دیکھنے کے باوجود آپ نے مجھے نہیں دیکھا —— !! آج کتنے جتن سے سنگھار کیا تھا ——

بڑے سلیقے سے وہ ساڑی باندھی تھی جو آپ جاپان سے لائے تھے۔ مگر جو اب تک یونہی رکھی تھی۔

آپ جب بھی کہیں باہر جاتے ہیں میرے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لاتے ہیں، شوق اور ضرورت کی وہ کون سی چیز ہے جو آپ نہیں لاتے اور وہ بھی بلا کہے!

لیکن شاید فرض سمجھ کر —— !

شادی کی پہلی رات آپ بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ برائے نام میرا گھونگھٹ بھی اُلٹنے کی تمنّا آپ کے دل میں پیدا نہ ہوئی۔ بہت دیر بعد بہت دھیمے لہجے میں صرف اتنا کہا آپ نے کہا ——

"تم مجھے باتیں —— میرے [illegible] [illegible] کوشش کروں گا کہ تمہیں [illegible] [illegible] لیکن اُس کے بعد بھی میں تم سے [illegible] [illegible] [illegible] خود کو تیار نہیں کر [illegible] اپنے فرض سے اور تمہارے [illegible] [illegible] دکھ دوں گا —— ۔"

واقعی فرض سے آپ نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

میں نے جب جیسا چاہا جتنا چاہا آپ نے دیا۔ کبھی اُس کا احساس نہ دلایا۔ میری ضرورت کی چھوٹی سے چھوٹی چیز آپ خود لاتے رہے۔ میرے آرام کے لئے نوکر رکھا۔ ڈرائیور رکھا۔ بچوں کے لئے آیا رکھی۔ میں نے جب جیسے چاہا آپ نے فوراً انتظام کر دیا۔ مجھے کہیں آنے جانے اور کسی سے ملنے جلنے سے نہیں روکا۔ کبھی حکم دے کر اپنا کوئی کام نہیں کروایا۔ کبھی مجھ سے نہیں بلکہ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کبھی اونچی آواز میں کچھ کہا ہو اور لڑائی تو ہم میں آج تک نہ ہوئی۔

آپ تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ کبھی کبھی مجھے ڈر سا لگنے لگتا ہے —

آپ کو یاد ہے جب ہم اپنے کچھ مہمانوں کے ساتھ کہیں پکنک پر جا رہے تھے۔ سردیوں کی صبح تھی۔ کھلی جیپ کی تیز ہوا کے تھپیڑوں سے مجھے کھانسی آنے لگی۔ کھانسی کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن آپ بہت بے چین ہو گئے تھے۔ آپ ڈرائیو کر رہے تھے۔ راستے کے پیچ و خم خاصے خطرناک تھے اور اِس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ صرف ایک ہاتھ استعمال کیا جائے۔ پھر بھی آپ نے سامنے رکھے ہوئے ڈبّے سے ڈھونڈ کے گولی نکالی اور مجھے دی —— ابھی پچھلے دنوں جب میں بیمار تھی تو آپ کس پابندی سے دوائیں اور پھل لاتے تھے اور اپنے ہاتھ سے رس نکال کر پلاتے تھے اور ذرا سا بخار تیز ہو جانے پر خود دوڑے ہوئے ڈاکٹر کے پاس جاتے تھے۔

لیکن یہ سب تو اُس فرض کی ادائیگی ہے جس کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ کاش آپ فرض کو یوں اپنی زندگی نہ بناتے۔ اُس کے تانے بانے میں آپ بھی اُلجھ گئے اور میں بھی۔ اُس میں آپ نے اپنے آپ کو اِس طرح چھپا لیا گم کر لیا کہ میں لاکھ ڈھونڈتی ہوں لیکن آپ کو نہیں پاتی —— میں جو بظاہر آپ سے اتنی قریب ہوں —— لیکن آپ مجھ سے کتنی دُور ہیں یہ میں ہی جانتی ہوں!!

آپ میرے لئے خوبصورت ساڑی تو لے آتے تھے لیکن اُسے کبھی میرے بدن پر بھی دیکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی —— میں اُسے پہنوں یا واڈروب میں لٹکا دوں اِس سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ شاید آپ کے نزدیک دونوں میں کوئی

[illegible] !!

آپ کے لفظ بولنے چاہئے تھے سے لگر کسی کسی آرزو کو دم بھر کے لئے میری [illegible] ... آپ کی آنکھوں ... کی بوڑھی فرض کی چمک نے کبھی بند کیا [illegible] ... پر رو دیتی تھی کہ دم گھٹ رہے ہیں یہ بھی آپ نے نہ دیکھا [illegible]

فرض اور آرزو کے بیچ جو کھائی ہے اُسے میری اُبھرتی مچلتی تمنائیں پار کر [illegible] ... خواہشیں!

آپ نے اپنے ماضی کے صفحے بند کر دئے لیکن زندگی کا وہ صفحہ جو آج آپ کے سامنے کھلا ہے — جسے آپ پلٹنا تک بھول گئے، وہ کیوں سادہ پڑا ہے۔ خدا [illegible] پر کچھ تو لکھئے ——— میرا نہ سہی کسی اور کا نام ——— ورنہ آپ زندگی کی ساری حرارت کھو کے فرض کی چٹان بن کے رہ جائیں گے!

میرا ہم ——— !

جسے لکھنے کے لئے جذبات کا قلم نہ کبھی آپ نے اُٹھایا نہ میں نے۔ کوشش تو مجھے کرنی چاہئے تھی۔ لیکن میں اپنے وجود تک سے تو ڈری ڈری سہمی سہمی رہتی [illegible] انجانے خوف سے سوکھے پتے کی طرح لرزتی رہتی ہوں۔ راہوں کی دھول بھلا کیسے کسی کے دل پر نقش و نگار بن کے چھا سکتی ہے!

یہ کیسا خوف تھا جو روزِ ازل سے مجھ پر طاری تھا ———؟ شاید اس لئے کہ میں گھر کی ساتویں لڑکی تھی۔ جس کی طرف توجہ دینے کی نہ کسی کو فرصت تھی نہ ضرورت ——— میں سارا دن اپنے کمرے میں گھسی اکیلی گڑیاں کھیلا کرتی۔

بے جان مٹی کی مورتیں میری دوست تھیں۔ میری ہمدم۔ میری ہمراز اور میری ساتھی تھیں۔ میری ماں تھیں۔ میری بہنیں تھیں ——— میں اُنھیں اپنا ہر دُکھ بتایا کرتی، ہر خوشی میں شریک کرتی۔

میری وہ گڑیاں اب تک رکھی ہیں۔ جی چاہتا ہے اب پھر اُن سے باتیں کروں اور کبھی جب آپ میرے قریب بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ کچھ سوچتے ہوئے ساکت سے، تو ذرا دیر کے لئے مجھے محسوس ہوتا ہے آپ بھی گڈا سا گڑیا ہیں۔ اور بت میرا جی چاہتا ہے میں اپنا وہ دُکھ جسے کوئی بھی نہیں دیکھ پایا آپ ہی سے کہہ دوں ——— مگر دوسرے ہی لمحے آپ کی آنکھیں ماضی کے کسی سپنے سے جھلکتی ہیں اور ہونٹ کچھ کہنے کو پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ تب مجھے احساس ہوتا ہے کہ آپ تو مٹی کی مورت کبھی نہیں!

اور انسانوں سے باتیں کرنا میں نے کب سیکھا ہے ——— !!

اس ساتویں لڑکی کا نصیب کھلنے ہی میں نہ آتا تھا۔ پھر آپ نے میری قسمت کا

[illegible]

ورنہ تو کہکشاں میرے لئے بس ایک خواب تھا ——— میں اُس خواب کی تعبیر بھی جانتی تھی!!

پہلی ہی رات مجھ میں اور آپ میں ایک خاموش سمجھوتہ ہو گیا۔ جو کچھ آپ مجھے نہیں دے سکتے تھے نہ دیتے۔ لیکن اُسے مانگنے کا حق تو مجھ سے نہ چھینا ہوتا!

لیکن آپ نے چھینا کب ——— آپ کو اتنا بے بس دیکھ کر وہ حق تو میں نے خود دے دیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ حق میرے پاس تھا ہی نہیں!

پتہ نہیں کیوں میں نے اپنے نئے گھر کے ہر کونے میں۔ ہر آنکھ میں۔ ہر نگاہ میں۔ ہر جنبش میں مسرت کے بجائے اپنے لئے ایک رحم کا جذبہ محسوس کیا۔ شاید یہ میرا خوف ہی ہو۔ لیکن اُس خوف نے تو مجھے تباہ کر دیا۔ میں جو اُمنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ آگے بڑھی تھی جھجک کے پیچھے ہٹ گئی۔ کچھوے کی طرح اپنے خول میں مُنہ چھپا لیا۔

مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میں خزاں رسیدہ پھول ہوں جس کے آنے سے گھر کی رونق ختم ہو گئی۔ دُلہنیں تو بہار بن کے آتی ہیں۔ دُھنک کے شوخ چمکیلے رنگ فضا میں بکھیرتی ہیں۔ بن گھنگھرو کے نغمے برساتی ہیں۔ میرے آنے سے ماحول جوں کا توں خاموش تھا۔ اُداس تھا! میں مُسکرانا تک تو جانتی نہ تھی، قہقہے کیسے لگا لیتی ——— ؟ اور کسی نے مجھے قہقہے لگانا سکھایا بھی تو نہیں ——— کوئی ذرا مجھے سہارا دے دیتا۔ میرے خوف کا ہاتھ تھام لیتا تو میں بھی رقص کر سکتی تھی لیکن کوئی آگے نہ بڑھا۔ شاید یہی دستور ہو کہ پہل مجھے کرنی چاہئے ——— مگر میں تو سہم سہم کے مفلوج ہو چکی تھی۔ میں اجنبی سی بنی انتظار کرتی رہی ——— اور اب تک کر رہی ہوں۔

جسے ساری زندگی کے لئے ہاتھ تھامنا تھا جب وہ تمناؤں کو رقص کرنا نہ سکھا سکا تو اور کون سکھا سکتا ہے۔ میں آپ کو [illegible] نہیں دے رہی۔ آپ تو سچ مچ بے بس ہیں۔ آپ کے ولولے۔ تلاطم ہیجان سب کسی کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے اور میں انگڑائی لے کر نظر میں وہ ریشمی گرہیں نہ لگا سکی جو آپ کے ولولے ہیجانات اور ارمان کی چنگاریاں پھر مُسکرائیں!

شروع کے وہ چند دن جب رسماً دُلہن کا سنگھار کیا جاتا ہے میرا سنگھار بھی کیا گیا۔ جسے کبھی آپ نے دیکھا اور کبھی دیکھا تک نہیں ——— اور جب دیکھا بھی تو محسوس نہیں کیا۔ میرے ارمانوں کی چنگاریاں جو برسوں سے احساسِ کمتری کی راکھ میں دبی تھیں ذرا سی مسکرائیں اور پھر بجھ گئیں۔

میرے قیمتی بھاری جھلملاتے جوڑوں کی تہیں نہ کھل پائیں اور وہ جہازی صندوقوں کی نچلی تہوں میں ڈوب گئے لیکن آپ کو کبھی احساس بھی نہ ہوا۔

اور اُن حسین لمحوں میں وقت کا بھاری قفل لگ گیا ـــــــ !!

لپ اسٹک پاؤڈر میک اپ کا ہر سامان میرے پاس تھا۔ لیکن جس سُرخی کو دیکھنے کی تمنا آپ کی آنکھوں میں نہ ہو وہ میرے ہونٹوں پر کیسے رنگ لاتی۔

وفا کے غازے اور خاموشی کے پاؤڈر کے سوا کسی چیز کا ارمان آپ نے نہ کیا ـــــ پھر انگریزی پاؤڈر کے ڈبے اور فرانسیسی عطر کی شیشیاں کھلتیں تو کیونکر!

یہ چیزیں تو خیر میں پہلے بھی استعمال نہیں کرتی تھی۔ میرا سارا سنگھار سارے ارمان چوڑیوں پر ختم تھے۔ ہر ہفتے ہاتھ بھر بھر کے جھلملاتی کھنکتی رنگا رنگ چوڑیاں پہنتی۔ شاید اس لئے کہ میرے ہاتھ بے حد سڈول تھے ـــــ نہیں اب بھی ہیں۔ یہی میرا حُسن تھا۔ یہی سرمایہ! اور اسی کو میں سجاتی سنوارتی۔

لیکن یہ کھنک کبھی تو آپ کے کانوں تک نہ پہنچ پائی۔ ٹکرا ٹکرا کے واپس آ گئی۔ سسک سسک کے مدھم پڑ گئی۔ ہاں جب دن رات ساتھ رہنے کے باوجود میری تمناؤں کی سسکیاں آپ نہ سُن سکے تو چوڑیاں تو پھر بے جان ہیں! یہ کیسی قربتیں ہیں ـــــ یہ کیسے فاصلے ہیں۔ جو وقت کے اتنے سفر کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے ـــــ ؟

شاید دلوں کے فاصلے ایسے ہی ہوتے ہوں۔ چاہیں تو لمحہ بھر میں ختم ہو جائیں۔ نہ چاہیں تو عمر بھر یوں ہی قائم رہیں ـــــ !

یہ فاصلہ شاید اُسی دن ختم ہو سکتا تھا۔ جس شام پہلی بار مجھے چھوڑ کر آپ باہر جا رہے تھے۔ اگر میں آپ کا ہاتھ پکڑ کے پوچھ لیتی کہ "آپ کہاں جا رہے ہیں ـــــ ؟"

اُس وقت تک آپ اور میں قریب تھے ایک ساتھ تھے۔

لیکن میں نے نہیں پوچھا ـــــ آپ ایک قدم پیچھے ہو گئے۔

رات جب آپ واپس آئے تو آپ نے مجھے نہیں بتایا کہ آپ کہاں گئے تھے ـــــ اور تب میں ایک قدم پیچھے ہو گئی ـــــ !

اور پھر ہم اسی طرح ہر لمحہ ہر روز ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے۔

تکلف کی ایک دیوار ہم دونوں کے بیچ حائل ہو گئی۔ یوں تکلف صابن کے بلبلے سے زیادہ نہیں ذرا سا ہاتھ لگایا اور ختم ـــــ لیکن جو ہاتھ نہ لگایا تو پتھر کی وہ دیوار جس سے ٹکرا ٹکرا کر وقت کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں!

ہم نے کبھی ایک دوسرے کو اپنے چھوٹے چھوٹے رازوں میں شریک نہیں کیا۔ کبھی اپنی اپنی دنیاؤں میں آنے کی دعوت نہیں دی۔ ہماری دنیائیں کچھ ایسی پُراسرار نہیں تھیں کہ انہیں ایک دوسرے کی نگاہوں سے بچایا جاتا۔ چھپایا جاتا۔ بس یونہی بے وجہ تکلف کے پردے دبیز ہوتے رہے یوں ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ لیکن کچھ ایسی جس سے دل کی اندرونی تہیں کُھرچ نہیں پاتی تھیں۔

ہم نے کوئی خواب ساتھ نہیں دیکھا۔ کوئی گھروندہ مل کے نہیں بنایا۔ ہم ایک دوسرے کی ضرورت تو بن گئے مگر ارمان نہ بن سکے! مُنّے اور گڑّی کے ننھے مُنّے وجود بھی فاصلہ کو کم نہ کر سکے اور تب ایک ایک کر کے میری آس کے سارے دھاگے ٹوٹنے لگے۔ لیکن ہر دھاگے کے ساتھ یہ میری روح کیوں ٹوٹتی ہے۔ آس نہیں ٹوٹتی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ایک کر کے دل کے سارے دیئے بجھ رہے ہوں۔

اُس اندھیرے میں میرا دم گھُٹ رہا تھا۔ مجھے کوئی راستہ سُجھائی نہ دیا تو گھبرا کر میں نے اپنے بچوں میں پناہ لے لی۔

اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ فاصلہ اور بڑھ گیا!

احساس تو اب ہوا ہے جب مُنّا میری گود سے زیادہ گیند اور جھولے سے بلّے میں خوشی پاتا ہے اور گڑّی میرے ہاتھوں سے نوالے کھانے کے بجائے اپنے ہاتھوں سے اپنی گڑیا کو چاکلیٹ کھلاتی ہے۔

بچّے اپنے راستے پر چل رہے ہیں اور آپ اپنے راستے پر ـــــ اور میں سُونی سُونی آنکھوں سے اُن قدموں کو دیکھ رہی ہوں جو مجھ سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔

بچّوں کو اپنے راستے پر چلنے دیجئے ـــــ لیکن میرا اور آپ کا راستہ تو ایک ہے۔ کوئی خاک ہو کے آپ کے نقشِ پا سے لگا چلا آ رہا ہے۔ دم بھر کو رُک کر اُسے ساتھ لے لیجئے۔ زندگی کا سفر کٹنے کو تو یوں بھی کٹ جائے گا۔ لیکن ساتھ چلنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ میرے دل کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے اور آپ نے مجھے نہیں بتلایا لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ کا دل بھی بوجھل ہے۔

آج میں نے چاہا تھا کہ آپ کو پکاروں۔ آپ کو روکوں۔ پیار کی وہ میری خواہش اتنی تیز ہو گئی کہ اُس نے اُچھل اُچھل کر ضد اور خوف اور ندامت کی ساری دیواریں توڑ دیں اور تب میں نے محسوس کیا کہ میں ڈری ڈری سہمی سہمی عورت نہیں ہوں جو اپنے وجود کو دھرتی پر ایک بوجھ سمجھ کر اپنا سر اُٹھانا بھی نہیں جانتی ـــــ ہمّت نے دل میں انگڑائی لی اور آنکھوں میں نئے خواب لہرانے لگے۔ خوابوں کی الف لیلوی فضا میں مجھے پتہ چلا کہ میرے پاس بھی حُسن ہے جو آپ کی بے تعلقی کی گرد میں چھپ گیا تھا۔ آپ کی نگاہوں نے تقاضا نہیں کیا۔ اس لئے وہ کبھی سامنے نہ آیا ـــــ لیکن آج میں اُسے سنوار کے سجا کے اِس قابل بنا دوں گی کہ آپ کی نگاہیں خود بخود رُک کے اُسے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں اور آپ کے بڑھتے ہوئے قدم رُک جائیں۔

میں نے اپنے وہ سارے بکس جو ایک مدت سے بند پڑے تھے کھول ڈالے

ریشم و کمخواب کی تہیں جو میرے ہاتھوں کے لمس کی تمنا میں جاگ جاگ کے مانند پھیلی تھیں پھونک کے سرسرانے لگیں ——— رنگ کھلتے رہے بکھرتے رہے اور میں فیصلہ نہ کر سکی تب مجھے یاد آیا کہ پچھلے مہینے آپ جو ساڑی لائے ہیں وہ بے حد خوبصورت ہے!!

گاڑی کی آواز سن کر میرا دل اچھلنے لگا۔ میں نئی دلہن کی طرح حیا سے دوہری ہو گئی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

چائے پی کر آپ اوپر آئے۔ میں جب بھی سامنے نہ آئی۔ آپ میز پر خط دیکھنے لگے۔ پھر نہانے کے لئے اٹھے۔ حسبِ معمول کپڑے پلنگ پر نکلے رکھے تھے وہ اُٹھا کے آپ غسلخانے میں چلے گئے۔ تب میں جھجکتی ہوئی آئی اور ایک آدھ بیلا بلاؤز اُٹھا کر ترپائی کرنے لگی۔ یہ دکھانے کے لئے کہ سلائی میں بے حد مصروف ہوں آپ غسلخانے سے نکلے۔ سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو گئے؛ سٹول پر بیٹھ کر بال بنانے لگے۔ میں اِس زاویئے سے بیٹھی تھی کہ فوراً آپ کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ شاید اُس لمحے کے لئے کہ جس میں میری زندگی کا فیصلہ ہو سکتا تھا میں پوری طرح تیار نہ تھی!

میں چور نگاہوں سے آپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

آپ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا گھوم کے جوتا اُٹھایا اور جھک کے پہننے لگے۔

دل کمبخت اور زور سے دھڑکنے لگا۔

کیونکہ اب آپ مجھے دیکھ سکتے تھے۔

مگر شاید آپ نے دیکھا نہیں۔

پھر آپ اُٹھے اور ہینگر سے کوٹ نکالا ——— اب میں پوری طرح آپ کے سامنے تھی!

لیکن آپ کے چہرے کے پُرسکون تاثر میں ذرا ہلچل نہ پیدا ہوئی اور میرے چہرے پر سارا خون سمٹ کر آ گیا۔

آپ نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اُس میں سے میلا رومال نکالا اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرا دل آپ کی مٹھی میں ہو!

"ذرا دوسرا رُومال دینا ———"

دُھلا رُومال میرے پاس تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج میرا دُھلا دُھلایا وجود میرے پاس تھا اور میں چاہتی تھی کہ دُھلے رُومال کی طرح میرے نکھرے سنورے وجود کو بھی آپ قبول کر لیں۔ رُومال کو اُس جیب میں رکھتے ہیں جو دل کے قریب ہے ——— مجھے بھی اپنے وجود کے کسی ایسے خانے میں ایسی جیب میں رکھ لیجئے جو دل کی گہرائیوں سے قریب ہو۔

قیامت کی گھڑی آ گئی ——— میں رُومال لے کے آپ کے پاس پہنچی۔ آپ کے بالکل مقابل۔ آپ سے بالکل قریب!

نگاہیں سانس تھامے تھیں کہ نہ جانے کس دم آپ پلٹ آئیں گذر جائیں کہ مُڑ کے دیکھیں۔

آپ نے ہاتھ بڑھا کے دُھلا رومال تو لے لیا۔ مگر نظر اُٹھا کے دُھلا وجود نہ دیکھا۔

رومال جیب میں رکھا اور گندہ رُومال فرش پر پھینک کے مُڑ گئے اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک گندہ رُومال ہوں جسے آپ نے اپنے گھر کے فرش پر اسی طرح ڈال رکھا ہے۔

اور تب میری آنکھیں چھلکنے لگیں۔

آپ مجھے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ پاتے!

سب کچھ دیتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیتے۔

کچھ نہیں لیتے ———!

مدیرِ بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزل

پروفیسر عبدالرب عرفان، ایم اے

کس بام کی تلاش ہے کس در کی جستجو
پھرتا ہے شہر میں کوئی آوارہ کُو بہ کُو

منزل غبارِ راہ میں گُم ہو کے رہ گئی
اب اُس مقام پر ہے مرا ذوقِ جستجو

ہرچند پاسِ عشق ہے زنجیرِ پائے شوق
لیکن بھٹک رہے ہیں خیالات چار سُو

دامانِ زندگی ہے جب اس درجہ تار تار
کیوں میرے غمگسار کریں زحمتِ رفو

تکمیلِ شوق ہو نہ سکی، خوب ہی ہوا
منظور یوں بھی کب تھی مجھے مرگِ آرزو

عرصہ ہوا کسی کی نظر سے نظر ملے
مدت ہوئی کہ توڑ دیے شیشہ و سبو

یہ رنگِ انقلابِ چمن کچھ نہ پوچھیے
کانٹوں نے مل کے لوٹ لی پھولوں کی آبرو

اُٹھے ہیں میکدے سے جو اب اُس گلی کے ہم
دیکھیے اب آئے گردشِ ایام رُوبرُو

احباب کیا سمجھ کے مجھے دیکھنے لگے
نام آ گیا کسی کا جو دورانِ گفتگو

تعبیر اس کی دیکھیے عرفان کیا ملے
دیکھا تو ہے حسین سا اک خوابِ آرزو

غزل

صغیر احمد صوفی، بی اے، ایل ایل بی

کون ہے شہر میں ہم زباں دوستو
جس سے دل کی کہیں داستاں دوستو

کامراں دوستو، شادماں دوستو
ہم ہیں اب وقفِ غم دو جہاں دوستو

چشمِ نم بن گئی کہکشاں دوستو
زخمِ دل ہے تبسم فشاں دوستو

اُن کے جلوے تھے [illegible]
دل میں بجتی تھیں شہنائیاں دوستو

اب ہیں مایوسیاں ظلمتِ ہجر کی
زندگی ہے کہ اندھا کنواں دوستو

میری بربادیوں پہ نہ اتنا ہنسو
میں تمہارا بھی ہوں رازداں دوستو

کوچۂ یار سے سرحدِ دار تک
عشق پہنچا کہاں سے کہاں دوستو

مجھ کو اپنے پہ بھی اب بھروسہ نہیں
تم سے کب تک رہوں بدگماں دوستو

کیوں سجاتے ہو جنسِ وفا کی جگہ
شہر میں پتھروں کی دکاں دوستو

دامنِ دل پہ صوفی کے چھالے ہوئے
ایک مہتاب جلوہ فشاں دوستو

پتھروں کا نینی تال

اختر ملیح آبادی بی۔اے، بی۔ٹی

۲۷۔ چھوٹا چاند روڈ۔ لکھنؤ

اختر کے خوشتر! ہدیۂ سلام

افسانہ نمبر کا اعلان دیکھا، آپ یاد آئے۔ بیتے دن یاد آئے اور پھر یاد آتے چلے گئے ——— ۱۹۴۸ء کا موسم سرما تھا۔ بہن لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز آرہی تھی۔ میں اُسے دہلی لینے گیا تھا۔ آپ تازہ بتازہ رفیوجی بن کر آئے تھے۔ دہلی اسٹیشن پر کھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ دہلی میں میرا کوئی نہیں۔ دل آپ کا نام یاد دلاتا۔ ذہن کہتا ——— خوشتر گرامی کو لاہور ہی سے لاہور جانا نصیب نہ ہوا۔ وہ سینے پر پتھر رکھ کر وطن سے دُور بیٹھے۔ اس لئے میرا جانا زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہوگا ——— تیر و نشتر یاد آئے۔ تیر و نشتر کا خوشتر اُبھر آیا۔ وہ تو انسانیت کا بانی ہے اور ہاں۔ پھر کیوں نہ چلوں؟ ناوقت گھر پہنچا۔ مجھے اپنی بدتہذیبی پر آج بھی ندامت ہے۔ آپ سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ لیکن بیٹھتے ہی آپ اُچھل پڑے کہ "اختر ملیح آبادی آئے ہیں" اور جس تڑپ سے دوڑ کر آئے کہ موزے میں کوٹ تک نہ پہنا۔ باچھیں کھلی تھیں ——— اور اپنے بھائی کو پھر آپ نے سینے سے لگا لیا ——— پھر تو دہلی میرا شہر ہو گیا اور آپ کا گھر میرا اپنا گھر۔ یہ پوچھئے کون اُٹھاتا ہے، کون دُھلاتا ہے؟ بستر صبح و شام کون اُٹھاتا ہے کون بچھاتا ہے۔ سگریٹ کی ڈبیا پان صبح کون رکھ جاتا ہے۔ لسّی پینے والے گھر میں میرے لئے چائے کون بناتا ہے اور کس کے حکم سے بنتی ہے؟ اور چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال کون رکھتا ہے؟ یہ سب مجھے نہیں معلوم تھا۔ کیا وہ خوشتر کا خلوص نہ تھا؟ کیا خوشتر کی محبت نہ تھی!؟ یہی وجہ تھی کہ مہینوں لکھنؤ کو بھول جاتا تھا! ——— پُرانی یادوں کے دیئے جلتے چلے گئے اور میرا خیال اُڑتے اُڑتے افسانہ نمبر کی طرف گیا۔ کہانی کی طرف! اور اُسی تصوری پرواز میں نینی تال کی پہاڑیوں سے جا کر ٹکرا کر چور چور ہو گیا ——— اور افسانہ نمبر کے افسانے کا عنوان بن گیا ——— پتھروں کا نینی تال ——— بھیا خوشتر! یہ مت لو کہ میں کبھی نینی تال نہیں گیا۔ مجھے ہنسی آرہی ہے اور میری آنکھوں میں آپ کا مسکراتا چہرہ اُبھر آیا ہے۔ جو دوستوں کی یاس و ناکامی پر اُداس و ملول ہو جاتا ہے۔ اگر یہ انکشاف میں بالمشافہ کرتا تو آپ تڑپ کر کہتے اور ضرور کہتے "ہم اپنے بھائی کو نینی تال لے چلیں گے"؟ اور پھر وعدہ پختہ ہوتا، اصرار ہوتا، یہاں تک کہ نئے کپڑے بھی سل جاتے۔ خیر! تو میں نے نینی تال نہیں دیکھا۔ بس ایک بار دیکھتے دیکھتے رہ گیا! ——— ایک عیسائی دوست نے نینی تال چلنے کی دعوت دی تھی۔ اُن دنوں میں بی۔اے فائنل کے امتحان میں مصروف تھا۔ پھر اُس کا اصرار شدید ہو گیا۔ میں تیار ہو گیا۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تنہا جائے گی گھر والوں کے بغیر۔ لیکن اُن کی اجازت سے۔ تو میں حیران رہ گیا اور

میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اُس عیسائی لڑکی کی گالی آج بھی دل پر نقش ہے: COWARD ۔ اُس نے حقارت اور غصے سے کہا تھا۔ میں لڑکیوں کی طرح تلملا کر رہ گیا تھا اور بس! اب وہ کہاں ہے معلوم نہیں۔ اُس کا گھرانہ ریلوے میں تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ لوگ چٹاگانگ منتقل ہو گئے تھے لیکن آج میں سوچتا ہوں تو خود کو "COWARD" (بزدل) نہیں پاتا۔ میرا خیال ہے کہ آج وہ ملتی تو معافی مانگتی۔ اُس کا ذکر اِس لئے بھی کیا کہ کہانی لکھتے وقت وہ بھی میرے شعور میں تھی اور اُس عیسائی لڑکی نے "نینی تال" کے لئے جو تاثر دیا تھا وہ کہانی میں دوسرا روپ لے کر نمودار ہوا۔ نینی تال کو نشاط کا اڈّہ تو نہیں بنا سکتا تھا لیکن ——

خیر چھوڑئے ریتا کو۔ ہم لوگ تو اپنی راہ ہٹ کر بنائیں گے! —— ایک مبارکباد دینی ہے۔ جی ہاں مبارکباد! چار ماہ سے مسلسل "بیسویں صدی" چوری ہو رہا تھا۔ لیکن اِس ماہ مجھے مل گیا۔ آیئے ہم دونوں مل کر اور باادب ہو کر "رہزن" کا شکریہ ادا کریں! —— اپنے لئے نہیں۔ آپ کے لئے صحت و زندگی کی دعا کرتا رہتا ہوں —— آپ دعا کیجئے کہ اللہ ملاقات کرائے۔ کیسا اچھا ہوتا کہ آپ لکھنؤ بھی تشریف لاتے۔ یہاں کی فضائیں آپ کے لئے چشم براہ ہیں . . .

خوشتر کا —— اختر ملیح آبادی

نینی تال کی شام تھی۔ دلربا رعنائیوں سے بھرپور تھی!

نوشابہ اُن دلربا رعنائیوں کو آج پہلی بار قریب سے دیکھنے گئی تھی اور وہ اپنے کمرے میں تنہا بستر پر بیٹھا شام کے نفسیاتی مد و جزر کو دل کے پیمانے سے ناپ رہا تھا۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں لیکن دل کے دریچے سے دھڑکنیں برس رہی تھیں۔ نینی تال کی ہر شام اُسے نفسیاتی کچوکے لگاتی آتی تھی اور بیت جاتی تھی۔ اِسی لئے وہ کسی طرح یہاں آنے کے لئے تیار نہ تھا!

ڈاکٹر نے بار بار نینی تال آنے کی ہدایت کی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ آب و ہوا کی تبدیلی ضروری ہے۔ میدان کی تپش سے خطرہ تھا کہ پھر بخار لوٹ نہ آئے۔ اِس لئے نینی تال جانے کے لئے بضد تھا۔ وہ ٹسی آن ٹسی کرتا رہا لیکن اُسے نوشابہ کی ضد بھی یاد تھی۔ وہ ڈاکٹر سے زیادہ بضد تھی۔ اکثر نینی تال کے مسئلے پر نوشابہ سے اَن بَن بھی ہو جاتی تھی۔ اُس کا چہرہ سُت جاتا تھا۔ آنکھوں کے زاویے بدل جاتے تھے۔ لیکن وہ پھر بھی یہاں آنے کے لئے تیار نہ تھا۔

یہ سوچ کر وہ زیرِ لب مسکرایا کہ نینی تال کے لئے نوشابہ نے اُسے بچوں کی طرح پھسلایا اور اُکسایا بھی تھا۔ ایک دن نوشابہ نے کہا۔

"آپ کو وہاں کہانیوں اور ناولوں کے پلاٹ ملیں گے" اِس طرح نوشابہ نے اُسے راضی کرنے کی کوشش کی تھی، ترغیب دی تھی۔ وہ نوشابہ کی بات پر ہنس دیا تھا۔ اِس لئے کہ نوشابہ کو علم نہ تھا کہ نینی تال پر وہ کوئی کہانی لکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ صرف ایک کہانی وہ لکھ سکتا تھا۔ اُس کا جی بھی چاہتا تھا کہ وہ واحد کہانی لکھ ڈالے جو اُس کے ذہن میں چھپی تھی۔ لیکن وہ اُسے لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر کیوں؟

اُس نے خیال کو ہمیشہ اِس سوال کے جواب سے بچایا تھا۔ اِس وقت خیال کا دامن بچا لے گیا اور یہ سوچنے لگا کہ نوشابہ کے اصرار میں بیوی کی وفا زیادہ یا عورت کی خود غرضی!؟ فکری تقابل پر وہ خود ہی مسکرا دیا۔ اِس لئے کہ نوشابہ عورت تھی۔ مخلص بیوی! وہ نوشابہ کا قدر داں تھا محض اُس کے جمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کی سیرت کی وجہ سے بھی! اب رہا یہ سوال کہ نوشابہ کی ضد ...؟ وہ باوفا بیوی تھی وہیں جسمانی و نفسیاتی طور پر حسین عورت بھی تھی جو ایسے مقامات کی دلدادہ ہوتی ہے۔ اِسی لئے اُسے اُس وقت دُکھ ہوتا ... کے لئے نہ سہی نوشابہ کی خوشی کے لئے بھی وہ نینی تال آنے پر آمادہ نہ ... وہ نوشابہ کو کشمیر سیر کرانے لے گیا تھا۔ نینی تال کشمیر کے مقابلے میں کوئی ... نہ تھی۔ پھر بھی وہ تیار نہ تھا۔ پھر یہ کہ اُس کے انکار کی وجہ بھی نوشابہ کو معلوم نہ ... اِسی وجہ سے نوشابہ ضد کرنے لگی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ ایک دن نوشابہ نے سوال بھی کیا "نہ جانے کی وجہ بتا دیجئے۔ معقول وجہ؟" وہ ہنس دیا تھا۔ نوشابہ کو مطمئن کرنے کے لئے اُس نے کہا تھا۔

"تم نینی تال سے زیادہ حسین ہو نوشابہ! تمہاری آنکھوں میں نینی تال جھیل سے زیادہ نیلگوں حسن ہے، تمہارے موتیوں کی طرح چمکتے دانت وہاں کی برف پوش چوٹیوں سے زیادہ سپید ہیں، تمہاری زلفوں میں نینی تال کے ساونی بادلوں سے زیادہ سیاہی ہے۔ تمہارے کردار میں وہاں کی اونچی پہاڑیوں سے زیادہ بلندی ہے تمہارے جوان خوبصورت جسم میں . . ."

"بس! خدا کے لئے بس!" نوشابہ نے جلدی سے بڑھ کر اُس کے ہونٹوں پہ

نرم و گرم ہاتھ رکھ دیا تھا اور جب نوشابہ کی نیلی آنکھوں سے اُس کی آنکھیں ملیں تو اُسے محسوس ہوا جیسے واقعی وہ نینی تال کی جھیل کی نیلی سطح پر بجرے میں بیٹھا سیر کر رہا تھا۔ اُس وقت ایک لمحے کے لئے نینی تال کا خیال آیا لیکن اِس خیال کو اُس نے خاموشی کی تُند ہوا سے اُڑا دیا۔

"کیا بات ہے؟" نوشابہ کی ضد پھر اُبھر آئی "آپ کو نینی تال سے نفرت کیوں ہے؟"

"حُسن دل میں پیار پیدا کرتا ہے نہ کہ نفرت!" نوشابہ نے کہا "پھر پیار ہی کے سہارے چلیئے" لیکن اُس کے انکار پر نوشابہ رُوٹھ کر ہٹ گئی۔ جب وہ دوا پلانے آئی تو نوشابہ کی آنکھیں دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اُس کے "نینی تال" کی پہاڑیوں پر گھٹائیں برس گئی ہیں! اُس کا دل ڈول گیا۔

تیسرے دن اُسے حرارت تھی۔ ڈاکٹر آیا۔ اُس نے نوشابہ سے صاف کہہ دیا کہ نینی تال جائیے ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو لیجئے۔ . . "ڈاکٹر نے اُس کا دل لرزا دیا۔ وہ فکرمند تھی اور پھر تیسرے دن جب گہری نیند سے اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے نوشابہ کو سامنے کھڑی اور ذو معنی انداز سے ہنستے دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اُسے نوشابہ کے راز فاش کرنے والے الفاظ یاد آئے۔ وہ کہہ رہی تھی "میں آپ کو نینی تال کل رات لے آئی" لیکن وہ سوچنے لگا۔ صرف اِتنا اُسے یاد آیا کہ پرسوں رات نوشابہ نے اُسے کوئی سفید گولی دی، پھر وہ سو گیا تھا اور اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ نوشابہ ہی نے اُسے بتایا کہ وہ لکھنؤ میں ال میں ہے اور وہ حیران رہ گیا۔

نوشابہ حیران نہیں تھی۔ اپنے اقدام پر نازاں تھی۔ نسوانی فخر سے کہنے لگی —
"آپ کے لئے نیند آور گولی لی۔ اگر آپ کو سُلا نہ دیتی تب بھلا آپ آتے؟"

اُس کے دل میں اضطراب تھا اور شاید کچھ غصّہ بھی جس کا اُس نے اظہار بلکہ بات ٹالنے کے لئے اُس نے کہا تھا "کہیں ایسا نہ کرنا نوشابہ! کہ ڈاکٹر سے مل کر کوئی دوسری گولی کھلا دینا۔ . . !؟"

"اللہ نہ کرے!" نوشابہ نے تنک کر کہا "میں بیوی ہوں دشمن نہیں!" یہ وہ جانتا تھا۔ نوشابہ کو چھیڑنے کے لئے اُس نے چٹکی لی تھی۔ نوشابہ نے کہا "خدا نے چاہا یہاں سے آپ تندرست ہو کر جائیں گے۔"

"کون جانے — نوشابہ!" اُسے یاد تھا نوشابہ نے مایوسی دیکھ کر گلے میں ہاتھ ڈال دئے تھے۔

نینی تال آنے کے بعد بھی وہ نینی تال سے دُور رہنا چاہتا تھا اِسی لئے دروازے اور کھڑکیاں بند رکھتا تھا۔ نوشابہ اُسے احتیاط سے تعبیر کرتی رہی۔ ایک دن اُس نے نوشابہ سے نینی تال کی سیر کرنے کے لئے کہا۔ پھر وہ روز اُس سے کہنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرض کی ادائیگی کے ساتھ نوشابہ کچھ سیر بھی کر لے۔ یہاں آنے پر وہ بضد تھی۔ سیر و تفریح کا جذبہ بھی تو تھا اُس کے دل میں، تب اُس نے کہا "آپ اچھے ہو جائیے۔ آپ کے ساتھ چلوں گی۔ اکیلے کیا لُطف آئے گا۔"

"میرا انتظار نہ کرو نوشابہ!" وہ چُپ ہو گئی اور اُسے یہ بات کہہ کر رنج ہوا۔

لیکن آج وہ سیر کے لئے گئی تھی، پہلی بار اُس کے اصرار پر اور یہ دیکھ کر کہ وہ رو بہ صحت ہے، نوشابہ نے سوچا اب سیر کر لینا نامناسب بات نہ ہوگی — نینی تال کی شام کی ملاحت، اب گہری سیاہی میں بدل گئی تھی۔ اُس کا جی گھبرا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ اُٹھا، لڑکھڑا گیا، میز کا سہارا لیا، پھر کھڑکی تک پہنچ گیا۔ کھڑکی کھولی تو نینی تال کی نوخیز رات اُسے دیکھ کر مُسکرا دی! — "تم آگئے!؟ تم نے تو نہ آنے کی قسم کھائی تھی!" دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے کھڑکی بند کر دی۔ گرتا پڑتا پلنگ پر آ کر لیٹ گیا اور زبردستی نیند کو بُلانے کی کوشش کرنے لگا۔

نوشابہ مُسکراتی آئی اور جوں ہی اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو سہم گئی اور اُس کی زبان سے نکلا "بخار!؟" وہ پیکرِ ندامت بن گئی۔ سوچنے لگی، اُسے سیر کے لئے نہیں جانا چاہئے تھا۔ اُس کا جانا نقصان دہ ثابت ہوا۔ یہ سوچا تو نوشابہ کی سانس رُک گئی۔ قدرتی مناظر کی رعنائیوں نے اُس کے دل میں جو پھول کھلائے تھے وہ پتھر بن گئے۔ جنھیں اُس کے دل کی دھڑکنیں پاش پاش کر دینا چاہتی تھیں لیکن وہ پتھر ٹوٹ نہ سکے۔

صبح اُس نے گھبرا کر سول سرجن کو بُلا لیا۔ سول سرجن نے سمجھا دیا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں، تب دل کے پتھر ٹوٹے۔ شام کو واقعی بخار نہ تھا۔ نوشابہ خوش تھی اُس نے پوچھا "کیا دیکھا نوشابہ؟"

"حُسن، خوبصورتی، دلکشی، رعنائی اور جمالِ بے حجاب!" نوشابہ نے ہنسی نہ روکتے ہوئے کہا۔

"کہاں — نوشابہ!؟" نوشابہ نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے دیکھا اور کہا۔ "کہاں؟ ہر جگہ — زمین پر، پہاڑیوں پر۔"

"ہاں پتھروں پر!" اُس نے زیرِ لب مُسکراتے ہوئے پوچھا "نہ کہ آدمیوں پر۔ کیوں؟" نوشابہ مُسکرا کر چُپ ہو گئی۔ سوچنے لگی "بیماری کا اثر ہے!" اچانک اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "پہاڑی غریب اور بیمار ہیں، عورتیں زرد اور بچے لاغر! لیکن نینی تال کے پہاڑ، پہاڑیاں، گھاٹیاں، چٹانیں، جھرنے، آبشار اور زمین حسین و جمیل ہے۔ . . نوشابہ! حُسن کیا ہے؟ جمال کسے کہتے ہیں؟ دُنیا رعنائی کے معنی کیا لیتی ہے — بولو نوشابہ!؟" نوشابہ نے سنجیدہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھا، پھر ہاتھوں کی مدد سے لٹاتے ہوئے کہا "آپ لیٹ جائیے۔" نوشابہ شوہر کی اُلٹی سیدھی باتوں سے ڈر گئی تھی کہ کہیں بخار تو نہیں شروع ہو رہا ہے جو وہ ایسی باتیں کر رہا ہے۔ نینی تال کا حُسن

پہاڑوں پہ نہ ہوگا تو اور کہاں ہوگا؟ اپنے شوہر کی متعلق وہ سمجھ نہ سکی تھی شوہر کو لیٹا کر وہ جانے کیسے چلی گئی اور وہ اُس پہاڑی لڑکی کے متعلق سوچنے لگا جو اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ قلی گیری کر رہی تھی۔ جب وہ لڑکی سامان اُٹھانے لگی تو اُس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"تم سامان اُٹھاؤ گی؟" سیدھی سادی لڑکی ہنس دی تھی۔ اُسے اس سوال پر تعجب ہوا تھا۔ لڑکی نے گھبرا کر پوچھا تھا: "بابو! تم ہمارے پہاڑ پہلی بار آئے ہو؟" جب اُس نے ہاں کہا تب وہ پھر ہنس دی اور کہا: "جب ہی تمھیں تعجب ہوا۔ اپنے پہاڑ آنے والے مہمانوں کا سامان ہم ہی ڈھوتے ہیں بابو!" بہت سہانی شام تھی وہ۔ اُسے یاد تھا۔ نینی تال کی وہ پہلی شام تھی جس سے وہ آشنا ہو رہا تھا لیکن پہاڑی لڑکی کو سامان ڈھوتے دیکھ کر اُسے نینی تال کی شام سے نفرت ہو گئی تھی۔ اُس وقت یہ نفرت اور گہری ہو گئی جب پہاڑی لڑکی کے سر کے بوجھ نے اُس کی کمر کو کمان کی طرح لچکا دیا تھا۔ وہ لڑکی کی لچکتی کمر دیکھتا رہا اور اُس کے خیالات بغاوت کرتے رہے۔ وہ سوچ رہا تھا صنفِ نازک کی یہ بے عزتی اور ہتک نہیں تو اور کیا ہے؟ —— کچھ عورتیں کاروں پر چلیں اور کچھ پتھریلی ناہموار زمین پر ننگے پاؤں وزنی سامان اُٹھائیں اور دِق کو گلے لگائیں! —— اُس کا مُلک کتنا غریب اور کتنا تنگ دل ہے!؟ اُسے قدرت کی ناانصافی پر بھی ملال تھا۔ پتھروں کو اُس نے جمال دیا اور پہاڑی لڑکی کو غربت و افلاس کا ملال! معلوم نہیں نینی تال پھر حُسن و خوبصورتی کا مخزن کیوں کر ہوا اور لوگ نینی تال کے حُسن کے مدّاح اور پرستار کیسے بن گئے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ پتھر اور انسان کے حُسن اور بدصورتی کا تقابل کسی اور نے نہ کیا ہو؟ لیکن پھر زبان کیوں نہیں کھُلی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اِس پہلو کو اُجاگر کرے گا۔

جب وہ اُس پہاڑی لڑکی کو ایک کے بجائے پانچ نوٹ دینے لگا تو لڑکی نے خشمگیں آنکھوں سے گھورا اور بڑی نفرت سے کہا: "بابو! تم بڑے آدمی معلوم ہوتے ہو۔" اُس نے حیران ہو کر پوچھا: "تم نے میری کون سی بُرائی دیکھی؟" لڑکی نے غصّے سے کہا: "سب بابو ایک روپیہ دیتے ہیں، تم پانچ دے رہے ہو۔ ہم نے مزدوری کی ہے آبرو نہیں بیچی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک روپیہ لیا اور چار نوٹ غصّے سے پھینک کر چلی گئی۔ نوٹ پتھر کی زمین پر پڑے رہے اور وہ برف پوش چوٹیوں کو گھورتا اور کچھ سوچتا رہا —— بڑے لوگ، دولت والے جہاں جاتے ہیں اپنے بھلے کی بات سوچتے ہیں۔ اُنھوں نے مزدوری بھی ارزاں مقرر کی تھی۔ یہ خود غرضی نہیں تو اور کیا تھی کہ تفریح پر ہزاروں روپے خرچ کریں اور غریبوں کو مزدوری کم دیں تاکہ پہاڑی غریب ہی رہیں۔ اُس وقت اُسے احساس ہوا کہ نینی تال سو رہا ہے۔ اِس کا حُسن بیدار نہیں ہے۔ آخر وہ کب نیند سے چونکے گا!؟

اُسے یقین تھا کہ آج رات اُسے پھر بخار آجائے گا۔ نوشابہ بدحواس ہو جائے گی۔

اسی لیے وہ نینی تال نہیں آنا چاہتا تھا کہ اُس کی وہ تلخ یادیں اور بیتی باتیں اُس کا دل مسوسنے لگیں گی جنھیں وہ آج تک بھُلا نہیں سکا ہے۔ بھلا وہ پیلے چہرے والی لڑکی کو کیسے بھُول سکتا تھا جس کی کمر بوجھ سے دوہری ہو گئی تھی اور جس نے اُس کی ہمدردی کو بُری نظر سے دیکھا تھا جسے اپنی غربت کا احساس نہ تھا، وہ نینی تال کے حُسن پر نازاں تھی اور اُسے اپنا پہاڑ کہتی تھی جبکہ "اپنا پہاڑ" اپنائیت سے بیگانہ اور اپنوں کا دشمن تھا!

صبح اُسے بہت تیز بخار تھا۔ سول سرجن اُسے دیکھ رہا تھا۔ نوشابہ کے چہرے پر اُس پہاڑی لڑکی کے چہرے جیسی زردی تھی:

"نینی تال لوگ دُور دُور سے صحت کے لئے آتے ہیں" سول سرجن کہہ رہا تھا۔ "لیکن یہ کیس عجیب ہے۔ بیماری کے بغیر بیماری!؟" جب سول سرجن نسخہ لکھ کر جانے لگا تو نوشابہ سے پوچھا: "آپ کے شوہر کو کوئی غم ہے؟" نوشابہ نے چونک کر پوچھا: "غم!؟"

"مجھے شک ہوتا ہے" سول سرجن نے کہا: "ورنہ بخار کی وجہ کیا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ موٹر کی طرف بڑھ گیا۔ نوشابہ ششدر تھی لیکن اُس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ جب ڈاکٹر مرض پہچان نہیں پاتے تب عقلی گدے مارتے ہیں!

تین دن بعد بخار اُتر گیا۔ نوشابہ نے مُسکرا کر کہا: "اب صحت کامل حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔" وہ ہنس دیا اور کہا: "نوشابہ! نینی تال مجھے اچھا ہونے نہ دے گا۔"

نوشابہ نے سنجیدگی سے پُوچھا: "کیا نینی تال کا کوئی راز ہے؟"

نوشابہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی شوہر کو۔ خاموشی جوں جوں بڑھتی جاتی تھی اُس کا دل دھڑکتا جاتا تھا۔ آخر اُس نے لمبی سانس لی اور کہا: "ہاں نوشابہ!" نوشابہ کے دل پر نینی تال کی پُوری پہاڑی پھٹ پڑی۔ اُس کی سانس رُکنے لگی۔ سول سرجن کا مقلی گدہ حقیقت بننے لگا اور نوشابہ کو آنچل اندھیرے میں اُڑتا نظر آیا۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گھبرا کر پُوچھا: "وہ راز کیا ہے؟"

"پتھر جوان ہوتے جاتے ہیں۔ انسان بُوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ . . !" ایک لمحہ رُک کر نوشابہ کھلکھلا کر اس طرح ہنسنے لگی کہ وہ بھونچکا رہ گیا۔ نوشابہ کو جو آنچل اندھیرے میں چھپا نظر آیا وہ خود اپنے دوپٹے کا آنچل ثابت ہوا۔ اسی لئے وہ ہنس رہی تھی۔

نوشابہ تین ہفتوں سے بہت خوش تھی۔ اس لئے کہ اُس کا شوہر اب تندرست ہی نہیں تھا، چل پھر بھی لیتا تھا۔ لیکن نوشابہ حیران تھی کہ وہ اُس کے ساتھ جھیل تک سیر کو کبھی نہیں جاتا۔ حالانکہ جھیل چند سو قدم پر تھی اور جب وہ پُوچھتی تو وہ کہتا "میری بات سُن کر تم کھلکھلا کر ہنس دو گی۔ مجھے دُکھ ہوگا۔"

"پھر ایسی باتیں آپ کہتے کیوں ہیں؟" نوشابہ نے پُوچھا۔ اُس نے کہا: "نوشابہ! میں نہیں کہتا۔ کوئی اندر سے کہلواتا ہے۔"

"کون چھپا بیٹھا ہے آپ کے دل میں؟" اور جب اُس نے بتایا تب پھر وہ کھلکھلا پڑی اور اسی حالت میں کہا: "نینی تال کہلواتا ہے آپ سے نا۔"

"ہاں نوشابہ!" وہ لوٹ پوٹ ہوگئی۔ اُس رات وہ پھر تنہا جھیل تک سیر کے لئے گئی۔ اُسے تنہا جاتے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن اپنے شوہر کے اصرار پر وہ چلی گئی تھی ______ نینی تال کی رات تھی۔ جھیل کا کنارا تھا۔ سیاحوں کا جمگھٹا تھا۔ رات بہت سُہانی تھی۔ نیلی جھیل میں نیلے بلبوں کی روشنی اس طرح غوطے کھا رہی تھی جیسے نیلے کپڑے پہنے کوئی کافر ادا نہا رہی ہو جھیل میں۔ دیکھنے والوں کے یہی تاثرات تھے لیکن نوشابہ کے شوہر کا تاثر کچھ اور تھا۔ اُسے وہ بیتی ہوئی نینی تال کی شام یاد آ رہی تھی جب اُس کی نگاہوں میں نینی تال کے حُسن کا جنازہ نکلنے والا تھا۔ وہ شام بھی سُہانی تھی جب وہ پھر نینی تال آیا تھا۔ اُس پہاڑی لڑکی کی یاد کو زندہ کرتا ہوا جب نینی تال بناؤ سنگھار کیے مغرور کافر جمال کی طرح آئینہ دیکھ رہا تھا اور دوسری پہاڑی لڑکی اُس کا سامان ڈھو رہی تھی۔ اُس کی کمر بھی دوہری ہو کر لچک رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا نینی تال اگر بدصورت ہوتا، ویران اور خشک ہوتا، یہاں نیلے پانی کی جھیل نہ ہوتی، یہاں کے پہاڑ اور وادیاں حسین نہ ہوتیں تو کیسا اچھا ہوتا۔ پتھروں کے حُسن نے یہاں کے باسیوں کو جو تحقیر دی ہے، اس پستی سے اُنھیں نجات مل جاتی۔ پھر پہاڑی لڑکیوں کی کمریں دوہری ہوتیں نہ لچکتیں۔ جب وہ فلیٹ پہنچا تو پانچ نوٹ اُسے یاد آئے جو پیلے چہرے والی پہاڑی لڑکی کو اُس نے مزدوری میں دینے چاہے تھے تو اُس کی غیرت کو چوٹ لگی تھی۔ اُسے پہاڑی لڑکی کی نگاہوں نے بڑے آدمی کا درجہ دیا تھا۔ اِس لئے اِس بار اُس نے ایک روپیہ دیا تو پہاڑی لڑکی مُسکرائی اور للچا کر بولی: "اور بابو بخشش!؟" یہ سوال سن کر چونک پڑا تو اُس نے پُوچھا: "تم بخشش بھی لوگی؟" لڑکی پھر مُسکرائی اور کہا۔ "ہاں بابو!"

"لیکن چند سال پہلے تو کسی مزدور لڑکی نے بخشش کا سوال نہیں کیا تھا!"

"بابو!" لڑکی نے کمیں میں نکال کر کہا: "وہ کل تھا بابو! آج ہر لڑکی ہاتھ پکڑ کر بخشش لیتی ہے۔ اب مہنگائی جو ہے!"

اُس کے کان سنسنانے لگے۔ اب ہر لڑکی ہاتھ پکڑ کر بخشش وصول کرتی ہے۔ نینی تال کا حُسن کیا جلنے لگا ہے!؟'

بخشش لے کر وہ لڑکی دلبرانہ مُسکراہٹ کے پھول بکھیرتی چلی گئی اور وہ دیر تک کسی خیال میں ڈوبا رہا ______ اور دوسری شام کو جب وہ جھیل کے کنارے کھڑا نیلے قمقموں کو نیلی جھیل کی سطح پر آگ لگاتے دیکھ رہا تھا، اچانک اُسے محسوس ہوا کہ آگ کے یہ شعلے جھیل ہی کو نہیں مغرور پہاڑیوں کو بھی جلانے کے لئے بھڑک رہے ہیں اور وہ لڑکی بھی اُن کی لپیٹ میں ہے جس نے زیادہ مزدوری کی پُرخلوص کوشش کو بے آبروئی سمجھا تھا۔ اُسے بڑا آدمی تصوّر کیا تھا۔ لیکن آج وہ بنی سنوری ہنستی مُسکراتی ایک ایسے شخص کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہی تھی جو پھولوں کو اپنے جوتوں سے مسل دینے کا عادی تھا اور یہ دیکھ کر وہ اپنے فلیٹ آ گیا۔ نینی تال کی سُہانی رات سے دامن بچا کر ساری رات وہ نفسیاتی کشاکش میں مبتلا صبح بھاگ گیا نینی تال سے یہ کہتا ہوا کہ اب وہ کبھی نہ آئے گا ______ کبھی نہ آئے گا!

"تم آ گئے؟ تم نے کہا تھا کبھی نہ آؤ گے!" نینی تال کی فضائیں اُسے کچوکے دینے لگیں اور اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ جب نوشابہ آئی اور شوہر کو بخار میں دیکھا تو کہہ اُٹھی: "اب میں آپ کو تنہا چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گی۔" نوشابہ کو یقین ہو گیا تھا کہ جب بھی وہ جاتی ہے اُس کا شوہر اِس کے لئے کُڑھتا ہے!

صبح سول سرجن نے کہا کہ وہ بخار کو روک نہ سکے گا۔ نوشابہ نے لکھنؤ تار دیا اور اپنے ڈاکٹر کو طلب کیا جس نے کہا تھا کہ "نینی تال جائے بغیر صحت ممکن نہیں۔"

تیسرے دن ڈاکٹر لکھنؤ سے پہنچ گیا۔ صبح اُس نے نوشابہ سے پُوچھا: "آپ کے شوہر نے کبھی محبت کی تھی؟"

"محبت!؟" نوشابہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ڈاکٹر نے کہا: "مجھے کیا معلوم تھا کہ نینی تال میں دل کی پامال دھڑکنوں کی قبر ہے!"

"ڈاکٹر! کیا آپ کو یقین ہے؟" ڈاکٹر فوراً چونکا اور کہا: "کل واپس چلئے۔ ورنہ ـــــــ"

لکھنؤ آکر بخار جاتا رہا اور پھر کبھی بخار نہ آیا۔ نوشابہ خوش تھی، بہت خوش تھی۔ اُس کا سہاگ بچ گیا تھا لیکن پھر بھی اُس کے دل میں کسک اور کھٹک ہوتی رہتی تھی۔ وہ کبھی کبھی نوشابہ کی آنکھوں سے اُبھرتی شکایت کو دیکھ لیتا تھا۔ ایک دن جب نوشابہ بہت خوش تھی۔ دونوں چائے پی رہے تھے۔ وہ نوشابہ کو گُدگُداتا تھا۔ نوشابہ لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔ تب نوشابہ نے اچانک پُوچھا: "ایک بات پُوچھوں۔ نینی تال میں آپ بیمار کیوں ہو جاتے تھے؟" وہ چند لمحے چُپ رہا پھر اُس نے کہا: "نوشابہ! تمہیں شکایت ہے کہ میں نے نینی تال پر کوئی کہانی نہیں لکھی۔ اب میں نہ لکھی گئی کہانی کو لکھوں گا۔"

"سچ ـــــ کب؟" نوشابہ نے دھڑکتے دل سے پُوچھا اس لئے کہ وہ کہانی پڑھنے کی مشتاق تھی۔ اُس نے نوشابہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ مسکرانے لگی۔ اُس نے نوشابہ کی نیلی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالیں اور کہا: "میں پہلے نینی تال کی جھیلوں میں سیر کروں گا اُس کی فضاؤں کے نغمے سُنوں گا پھر سُہانی شام کی رعنائیوں میں کہانی لکھوں گا نینی تال کی کہانی! پھر کہانیاں لکھتا رہوں گا اور اپنے نینی تال کی دلربائیوں کو چھوڑ کر پتھروں کے نینی تال کبھی نہ جاؤں گا جہاں حسین پتھر قیمت رکھتے ہیں اور گوشت پوست کے پتھر بکتے ہیں۔ ٹوٹتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔ . . میری نوشابہ خود نینی تال ہے اور پتھروں کے نینی تال سے زیادہ حسین، پاک اور عظیم . . .!!" جب وہ نوشابہ کے خوبصورت ہاتھوں کو چوم رہا تھا تو نوشابہ کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو پھسل رہے تھے ـــــ کیا پتھروں کا نینی تال بھی رو دیا تھا ـــــ کیا پتھروں کی آنکھوں سے نوشابہ کی آنکھوں کی طرح آنسو نکل سکتے ہیں!!؟؟

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔
(ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

غزلیں

بابو اکرشن گوپال مغموم بی۔ اے

اربابِ ہوس کی محفل میں اُس شوخ کا چرچا کون کرے
تقدیسِ محبت کو یعنی بازار میں رُسوا کون کرے

آنکھوں میں جلن آہوں میں شرر جلتے میں مسلسل قلب و جگر
جو عشق نے خود بھڑکائی ہے اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

یہ جانِ محبت سے دُوری یہ لذتِ دردِ مجبوری
جو غم کہ نشاطِ رُوح بھی ہو اُس غم کا مداوا کون کرے

جو نامِ تمنا سُنتے ہی پُوچھے کہ تمنا کیا شے ہے
اُس جانِ تمنا کے آگے اظہارِ تمنا کون کرے

یہ حرص و ہوا کی تاریکی جس میں کہ بھٹکتے ہیں راہی
جب دل ہی چراغِ [illegible] ظلمت میں اُجالا کون کرے

یہ جنسِ گرانِ اُلفت ہے قیمت ہے متاعِ جاں اِس کی
اِس سُود و زیاں کی دُنیا میں اِس جنس کا سودا کون کرے

کہتی ہے یہ کچھ کرتی ہے یہ کچھ ظاہر کچھ ہے باطن کچھ ہے
دُنیا تو بڑی ہی پُرفن ہے دُنیا پہ بھروسہ کون کرے

مغموم آ بتا سے جس کے دل اور جگر کو دے اُٹھیں
جُز عشق وہ سوزِ رُوحانی ہر شعر میں پیدا کون کرے

غزالہ اشفاق

حریمِ دل سے خیالِ بُتاں نہیں جاتا
یہاں ٹھہر کے کوئی مہماں نہیں جاتا

ہزار حوصلہ افزا سہی نویدِ بہار
میں کیا کروں کہ خیالِ خزاں نہیں جاتا

ہر ایک لمحہ تری یاد میں گذرتا ہے
کوئی بھی میرا نفس رائیگاں نہیں جاتا

یہ دل ہمارا گذرگاہ تیری یاد کی ہے
اِدھر سے اور کوئی کارواں نہیں جاتا

زمانہ اُس کی تباہی کو ہو گیا لیکن
ہمارے دل سے غمِ آشیاں نہیں جاتا

مرے خلوص کا حامل ہے میرا ہر سجدہ
کوئی بھی سجدہ مرا رائیگاں نہیں جاتا

مرا خیال تری جستجو میں شام و سحر
حدودِ دل سے گذر کر کہاں نہیں جاتا

مری رسائی وہاں ہو یہ کیسے ممکن ہے
مرا خیال غزالہ جہاں نہیں جاتا

شمع کی صورت...!

موسیٰ مجروح ایم۔ اے۔ بی۔ کام

۸۰ بی، غوث پور، قمر اقبال نرسری اسکول۔ گورکھپور

محترم خوشتر صاحب! آداب

ایک کہانی "شمع کی صورت" یونیورسٹی کے احول سے جُڑا کر بھیج رہا ہوں۔ یونیورسٹی کے اندر ہمہ وقت زندگی رقصاں رہتی ہے اور نقرئی قہقہے بلند ہوتے رہتے ہیں۔ آنچلوں کی سرسراہٹ اور گداز جسموں کی کسمساہٹ سے وہاں دل ہمیشہ گرم رہتے ہیں۔ ٹھیک اُسی وقت اُنھیں درود میں آہیں اور آنسو بھی بکھرتے ہیں لیکن بہت کم لوگ اُن کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ میں نے اِس کہانی میں اُنھیں آنسوؤں اور آہوں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کہانی "بیسویں صدی" کے معیار پر پوری اُترے گی اور آپ کو پسند آئے گی۔ آپ کی ذات "بیسویں صدی" کے لئے نیک فال ہے...

نیازمند ——— موسیٰ مجروح

ظفر کے سامنے آٹوگراف بکس کا انبار لگا ہوا تھا۔

وہ یونیورسٹی میں (Moderation) کے لئے بُلایا گیا تھا۔ اِسی سلسلہ میں اُسے وہاں کی بزمِ ادب کا افتتاح بھی کرنے کا موقع ملا۔ افتتاحی تقریر کے فوراً بعد سیکڑوں طلبا اور طالبات نے اُسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ ظفر نے سبھی آٹوگراف بکس جمع کرلیں وہ ایک ایک ڈائری اُٹھاتا، نام، کلاس اور پتہ دیکھتا، اُن میں پہلے سے موجود آٹوگراف دینے والوں کی تحریروں کا سرسری جائزہ لیتا... اور پھر اِن تحریروں کی روشنی میں خود بھی کوئی مناسب شعر لکھ کر آٹوگراف دیتا جا رہا تھا۔ ایک طرف اُس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا دوسری طرف وہ یہ سوچ رہا تھا ... آج سے دس سال پہلے وہ اِس یونیورسٹی کا طالبعلم تھا۔ اُس وقت وہ صرف یہاں کا ایک ہردلعزیز طالبعلم شاعر تھا۔ لیکن آج پورے مُلک کا مایۂ ناز فنکار اور ایک مرکزی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کا صدر۔ دونوں حیثیتوں سے اہم اور معروف۔ وہ بے حد مسرور تھا۔ اِنھیں خیالات میں محو وہ آٹوگراف دیتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک جگہ ٹھٹک سا گیا۔ اُس کے ہاتھ میں آخری آٹوگراف بک تھی جو پہلے کی تمام بکس سے سائز کے اعتبار سے بالکل منفرد تھی۔ اُس کے پہلے ورق پر آرٹ کا ایک ایسا نمونہ بنا ہوا تھا۔ جس نے ظفر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

ایک جلتی اور پگھلتی ہوئی شمع جو نصف سے زیادہ جل چکی تھی اور روشنی بے حد مدھم، اِردگرد کسی پتنگے کا وجود نہ تھا۔ پسِ منظر میں کسی دوشیزہ کا دُھندلا سا چہرہ پینٹ کیا گیا تھا۔ آنکھیں بے نور اور اندر کو دھنسی ہوئی، چہرہ پہ بے پناہ اُداسی، رخسار پچکے ہوئے، ہونٹ پژمُردہ، گیسو پریشان، جو شانوں پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اِن تمام باتوں کے باوجود خط و خال، جو لکیروں کی مدد سے اُجاگر کئے گئے تھے، پُر وقار ماضی کی نشاندہی کر رہے تھے۔

ظفر تصویر دیکھتے دیکھتے خیالوں کی نہ جانے کن وادیوں میں کھو گیا۔ بظاہر اُس کی نگاہیں آٹوگراف بک اور پس منظر کی تصویر پر مرکوز تھیں لیکن اُس کا دماغ ماضی کے کھنڈروں میں بھٹک رہا تھا۔

جہانگیر آرٹ گیلری شائقین سے بھری پڑی تھی۔

شہر میں ہابیز (HOBIES) کی نمائش لگی ہوئی تھی، دستکاری، فوٹو گرافی، اسٹیمپس، ڈرائنگ اور پینٹنگ کے بے شمار پورٹریٹ ڈسپلے کئے گئے تھے۔

"بے وفا"

تری اس بے وفائی پر فدا ہوتی ہے جاں اپنی
خدا جانے اگر تجھ میں وفا ہوتی تو کیا ہوتا ——— ظفر

شبِ فرقت میں یاد اُس بے وفا کی بار بار آئی
بھلانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی ——— لقی

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نبا ہی ہو ——— میر درد

آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیس
اک بے وفا کی یاد میں سب کچھ بھلا دیا ——— جلیس

کام آسکیں نہ اپنی وفا میں تو کیا کریں
اک بے وفا کو بھول نہ جائیں تو کیا کریں ——— نامعلوم

مرسلہ: محمد عبدالودود سرفراز، تا این پٹنہ

انھیں مناسب جگہوں پر بہت قرینے سے لگایا گیا تھا۔ سب سے پہلے دستکاری کے بہترین نمونے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے اسٹول پر لگائے گئے تھے۔ دوسرے نمبر پر مختلف ممالک کے ([illegible]) شیشے کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت بکسوں میں آویزاں بہت خوش سلیقگی سے رکھے ہوئے تھے۔ آخر میں فوٹو گرافی اور پینٹنگ کے ایک سے ایک، فنکارانہ صلاحیتوں سے معمور پورٹریٹ دیواروں پر آویزاں کیے گئے تھے۔

ہجوم کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جیسے پورا شہر ہی اُمڈ کر چلا آیا ہو۔ قدم قدم پر والینٹرس موجود تھے جو ([illegible]) کو گائڈ کر رہے تھے۔ اُس بھیڑ میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی دستکاریاں ([illegible]) اور پورٹریٹ نمائش میں پیش کیے گئے تھے۔ یہ لوگ کبھی دور اور کبھی بالکل قریب سے اپنی اپنی کاوش کے متعلق شائقین کی رائے اور تعریفی جملوں کو سن رہے تھے۔ ماڈرن آرٹ کے فنکار اپنی تخلیق کی خوبیوں کو بذاتِ خود شائقین کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ظفر پینٹنگ کے نمونوں کو بغور دیکھتا جا رہا تھا۔ دفعتاً اُس کی نگاہ ایک پورٹریٹ پر جم کے رہ گئی۔ پینٹنگ کیا تھی داغ کے مشہور شعر

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

کی مکمل تفسیر تھی۔ ایک طرف ایک حسین و جمیل دوشیزہ آنکھوں میں انتظار کی مشعل جلائے، اپنے آتشیں رُخساروں پر ہاتھ رکھے) افسردہ پریشان خاطر بیٹھی تھی اور دوسری جانب ٹھیک سامنے، "داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی" شمع اپنی قسمت پر زار و قطار آنسو بہا رہی تھی۔ شمع کی مدھم روشنی دوشیزہ کے افسردہ چہرہ کو اور بھی افسردہ بنا رہی تھی۔ وسط میں اوپر کی سمت ایک پروانہ پرواز کی حالت میں دکھایا گیا تھا جس کی دوری شمع اور دوشیزہ دونوں سے برابر تھی۔ پینٹنگ کو ایک عنوان بھی دیا گیا تھا "کدھر جاتا ہے پروانہ" ظفر کو پینٹنگ اتنی پسند آئی کہ وہ آس پاس سے بالکل بے نیاز ہو کر اسی میں ڈوب گیا۔ عالمِ محویت میں اُس کے منہ سے بیساختہ قدرے اونچی آواز میں نکل پڑا "واہ۔ خوب!" پاس ہی ایک لڑکی جو اُسے دیر سے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی پوچھ بیٹھی۔

"کیا آپ کو تصویر پسند آئی؟" جیسے کہیں دور گھنگرو بج اُٹھے ہوں۔

"جی!.... وہ چونک پڑا۔ "صرف پسند نہیں محترمہ بہت پسند آئی.... بے حد پسند آئی!" پھر جیسے اُسے کچھ یکایک خیال آگیا.... "لیکن.... آپ.... آپ.... آپ کی تعریف؟"

"ناچیز کو فریدہ فردوس کہتے ہیں۔ یہ پینٹنگ میری ہی ہے۔"

ظفر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ ہونٹوں پر مُہرِ سکوت لگ گئی۔ وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ سرو قد، متناسب بدن، میدہ کی طرح ڈھلا ہوا رنگ، سیمیں کلائیاں، سیاہ گھنی گھنی پلکوں کے درمیان کالی کالی آنکھیں ریشم کی طرح نرم و نازک بالوں والی یہ لڑکی بجائے خود دستِ قدرت کا تراشا ہوا عظیم شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔ وہ محیّر زدہ اُس کی آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا جیسے اُن زینوں سے دل کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"خالق اور تخلیق دونوں کا جواب نہیں!" ظفر نے کافی دیر کے بعد اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں سرگوشی کی۔

"شکریہ" ایک ہلکی سی مترنم آواز ہوئی جیسے منہ بند کلی چٹک جائے۔

"خالق کی تعریف کا یا تخلیق کی؟"

"خالق کی اور نہ تخلیق کی بلکہ تخلیق کی تعریف کا" پتلے پتلے سُرخ ہونٹوں سے پھول کی پنکھڑیاں بکھر گئیں۔

"بہت حسین ذوق پایا ہے آپ نے۔ آرٹ کے ساتھ ساتھ ادب کا اتنا اچھا شعور قابلِ مبارکباد و ستائش ہے!"

"ذرہ نوازی کا مزید شکریہ! ویسے ناچیز کے خیال میں ادب اور آرٹ بنیادی طور پر ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ ادب میں شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات

کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے اور آرٹسٹ لکیروں اور رنگوں کا۔" پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اب ظفر کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

"بجا فرما رہی ہیں آپ۔ ہر تخلیق براہِ راست اپنے خالق کے اوصاف کی آئینہ دار ہوتی ہے چاہے وہ کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر ہو یا سنگ تراش کا تراشا ہوا بُت۔ کسی ادیب کا تصنیف شدہ پارا ہو یا شاعر کا کلام۔ اِن تمام چیزوں میں اُن کے صانع کا کردار اور شخصیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مجھے آپ کے اِس پورٹریٹ میں آپکی شخصیت کی جھلک اور ادب اور آرٹ کا تحسین سے بالاتر امتزاج نظر آرہا ہے۔" ظفر اتنا کہہ کر دوسری طرف بڑھ گیا۔ فردوس اُسے بھیڑ میں گم ہوتے دیکھتی رہی۔

یونیورسٹی آڈیٹوریم میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔

سال کے آخر میں بزمِ ادب کا اختتامیہ فنکشن ہو رہا تھا۔ ہال کی اگلی سیٹوں پر یونیورسٹی کے پروفیسر اور دوسرے VIPS بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک طرف طلبا اور دوسری جانب طالبات کا ہجوم تھا۔ ہال کے پہلے سرے پر بڑی میز کے ایک کنارے مہمانِ خصوصی، صدرِ بزمِ ادب اور دوسرے عہدہ دار بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے قریب ہی کھڑا ظفر اپنی ایک پسندیدہ نظم "یہ وفا کی سخت راہیں" دردانگیز آواز میں پڑھ رہا تھا۔ ہال میں رہ رہ کر "آہ" اور "واہ" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ماحول سے بے نیاز ایک "نگاہِ مانوس" اُسے بے حد حیرت و استعجاب سے دیکھ رہی تھی جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ ظفر کی نگاہوں نے اُس عالم کو بھانپ لیا تھا۔ نظم ختم ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ باہر نکلنے پر کئی لوگوں نے اُس کی تعریف کی۔ وہ سب کا اپنی دلفریب مُسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتا رہا۔

"سُنیئے" ایک جھنکار ہوئی جیسے بینا کے تار اُنگلیوں کے لمس سے بج اُٹھے ہوں۔

"فرمایئے"

"آپ شاعر ہیں؟" تاروں سے اب نغمہ پھوٹ رہا تھا۔

"جی! میرے شاعر ہونے پر آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں تو..... بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے..... لیکن!" بینا کے تار خاموش ہو گئے جیسے کسی نے یکایک نغمے کا گلا گھونٹ دیا۔

"لیکن کیا؟"

"آپ مجھے کسی ادا، کسی انداز سے شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ نہ شیروانی، نہ چوڑی دار پاجامہ، نہ پاؤں میں ہاتھی کے سونڈ والا بناگرد، نہ گردن تک لٹکی ہوئی تراشیدہ زلفیں ہی، نہ آنکھوں پر سنہری کمانی دار عینک..... اور نہ ہاتھ میں چھڑی.....!"

"تو آپ کے خیال میں شاعر ہونے کے لئے اچھا خاصہ کارٹون ہونا ضروری ہے؟" ظفر مسکراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"قطعی نہیں! فائن آرٹ کی طالبہ ہونے کے ناطے میرے ذہن میں ہمہ وقت آرٹسٹ، ادیب، شاعر، سیاستداں اور فلسفی سب کی ایک تصویر رقصاں رہتی ہے اور جب میں اُن میں سے کسی کو اپنی خیالی تصویر سے مختلف پاتی ہوں تو بہت مایوسی ہوتی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں ایک ہونہار فنکار کے لئے مایوسی کا باعث بنا" ظفر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپ تو بُرا مان گئے مسٹر ظفر! میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک شاعر کو ٹیڈی بننا زیب نہیں دیتا۔ میرے سامنے جب بھی شاعر کا ذکر آتا ہے تو میری تخیل میں میر و غالب کی تصویر اُبھر جاتی ہے ـــــ پُر عظمت و پُر وقار ـــــ اور سر نیاز عقیدت سے خود بخود خم ہو جاتا ہے۔ اُنھیں برگزیدہ ہستیوں کی مماثلت میں اِس دور کے شعرا میں بھی دیکھنے کی متمنی رہتی ہوں۔"

زندگی و موت

موت، اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر ـــــ میر تقی میر

ترے لئے ہی نہ ہو زندگی و موت اگر
تو زندگی ہی نہیں موت بھی نصیب نہ ہو ـــــ نامعلوم

بے تعلق زندگی اچھی نہیں
زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں ـــــ حفیظ جالندھری

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے اِنھیں اجزا کا پریشاں ہونا ـــــ چکبست

زندگی ضبطِ مصائب ہے، بقدرِ برداشت
موت ہے کثرتِ اندوہ سے گھبرا جانا ـــــ نامعلوم

مُرسلہ: اے۔ ایس۔ ایس۔ مہنکاری۔ ایم۔ اے۔ آگرہ



یہ ہے
میجک
سفید ترین دھلائی کا ذریعہ
TATA'S
Wonder Washing Powder
BLUE
Magic
WITH ULTRA WHITENING POWER
CMTM-10-203 UR
دھلائی کتنی سفید
کپڑے کتنے شگفتہ
جی ہاں! یہی تو میجک کی خوبی ہے۔ اس میں دُھل کر آپ کے سفید
کپڑے جگمگانے لگتے ہیں اور اس کی خوشبو سے آپ کے سبھی کپڑے
کھِل اٹھتے ہیں۔ میجک کا بھرپور جھاگ کپڑے کے ریشوں میں
گھُس کر میل کو کھینچ لیتا ہے اور آپ کے کپڑے صاف شفاف
نکلتے ہیں۔ اور مزا یہ ہے کہ اس سے گھر میں کپڑوں کی دھلائی کافی
کم خرچ اور آسان ثابت ہوتی ہے۔ اپنے سبھی کپڑے، سوتی ہوں یا ریشمی، نائیلان،
ٹیرین اور اونی، سفید ترین دھلائی کے پاوڈر میجک سے دھویئے۔ اور
پھر دیکھئے اس کا حیرت انگیز کرشمہ! جیسا نام... ویسا کام!
میجک سفید، میجک اُجلے، میجک شگفتہ!
ٹاٹا کا
تیار کردہ

فردوس نے ایک مختصر لیکن جامع تقریر کر ڈالی۔ ظفر کچھ خفیف سا ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ فردوس ماڈرن ہوتے ہوئے بھی اتنی ماضی پرست ہو سکتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہنے کے بعد فردوس نے خود ہی سکوت توڑا۔

"اچھا سنیے"

"سنائیے"

"آپ شاعر ہیں؟"

"یہ تو آپ پہلے بھی دریافت کر چکی ہیں"

"آپ میرا ایک کام کر دیں گے؟"

"ایک نہیں ... ایک سو ایک!"

"آپ مجھے آٹوگراف دے سکتے ہیں؟"

"آٹوگراف؟" آٹوگراف کے نام پر ظفر جیسے چونک پڑا۔ "آپ کو معلوم بھی ہے آٹوگراف کس سے لیا جاتا ہے؟ بڑے بڑے ادیب اور شاعر، عظیم فلسفی، سیاستداں، سائنٹسٹ اور آرٹسٹ وغیرہ سے۔ میں تو بالکل "فدوی" قسم کا شاعر ہوں۔ بھلا مجھے بیوقوف بنانے پر کیوں آمادہ ہیں؟"

"آج نہیں تو کل آپ بھی عظیم ہو جائیں گے!" فردوس نے ظفر کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دلیل پیش کی۔

"پیشن گوئی کا بہت بہت شکریہ! میں آپ سے پھر عرض کروں گا کہ نا چیز اس قابل نہیں کہ اس سے آٹوگراف لیا جائے۔"

"یہ فیصلہ تو دوسرے ہی کر سکتے ہیں، آپ خود نہیں"۔

"اچھا تو پھر سرِ تسلیم خم ہے"۔ ظفر نے بہت ڈرامائی انداز میں سر جھکا دیا۔

"معاف کیجئے! مجھے آپ کا سر نہیں آٹوگراف چاہئے!" ظفر کو اپنے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے دیکھ کر فردوس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اچھا تو لائیے!"

"لیکن ایک شرط ہے!"

"وہ کیا؟" ظفر ہمہ تن سوال بن گیا۔

"یہی کہ آپ اسے ایک مقدس راز کی طرح راز رکھیں گے۔ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی۔ یہاں آئے دن نئی نئی کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ کچھ حقیقی — کچھ تخیلی۔ ہر آن شگوفے کھلا کرتے ہیں —— رنگ برنگے —— اور میں ان شگوفوں سے اپنے دامن کو رنگین نہیں بنانا چاہتی۔" فردوس کی آواز میں بلا کی سنجیدگی اور نگاہوں میں ناقابلِ تشریح التجا تھی۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر!"

"کرم فرمائی کا شکریہ!" فردوس اپنی آٹوگراف بک ظفر کے ہاتھ میں دیکر آگے بڑھ گئی۔

ظفر آٹوگراف بک کے پہلے ہی ورق سے الجھ کے رہ گیا۔ جس پر شمع کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ جلتی پگھلتی سی، روشنی مدھم، پس منظر بالکل سادہ، نیچے اقبال کا یہ مصرعہ بہت فنکارانہ انداز میں تحریر تھا۔

"زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری"

دوسری طرف آٹوگراف بک کے پلاسٹک خول میں ایک تصویر ... جو بظاہر اس طرح رکھی گئی تھی جیسے اس عمل میں ارادہ کو کوئی دخل نہ ہو۔ ظفر کبھی فردوس کی تصویر کو دیکھتا اور کبھی جلتی پگھلتی ہوئی شمع کو ... اور کبھی نیچے لکھے ہوئے مصرعہ کو ... وہ قلم کو ہونٹوں سے لگائے کافی دیر تک نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نے ایک سادہ ورق پر یہ شعر ؂

"شمع کی صورت پگھل کر زندگی کیجے تمام
یا پتنگوں کی طرح جل کر فنا ہو جائیے"

لکھ کر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔

دوسرے دن فردوس نے آٹوگراف بک واپس لیتے وقت جب ظفر کا شکریہ ادا کیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک بہت پھیکی اور شکست خوردہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گھنی پلکوں کے درمیان صاف شفاف آنکھوں کی چمک یکسر غائب ہو گئی۔ آتشیں رخسار سفید پڑ گئے۔ اس لئے کہ اس نے ظفر کا آٹوگراف دیکھتے وقت یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کی رکھی ہوئی تصویر اس طرح واپس آگئی ہے جیسے چھوئی بھی نہ گئی ہو۔ اس کی انا کو شدید ٹھیس لگی اور وہ تڑپ کے رہ گئی لیکن اس نے اس درد کو ظاہر نہ ہونے دیا، وہ ان آنسوؤں کو پی لینے میں کامیاب ہو گئی جو مژہ پر آ کر بکھرنے کیلئے بیتاب تھے۔ کاش اسے اس راز کا علم ہوتا کہ ظفر، جس کی پہلی نظر میں وہ گرویدہ ہو گئی اور جس پر وہ جان چھڑک رہی ہے، اس کی خاص دوست حنا کی گھنیری زلفوں اور مخمور آنکھوں کا شیدائی ہے۔ جس کی محبت نے اسے شاعر بننے پر مجبور کیا جس کے پیار میں سرشار ہو کر وہ نظمیں اور گیت لکھتا ہے۔ جس کے ساحرانہ پیکر کو وہ بندش والفاظ میں ڈھالتا رہتا ہے .... اور جسے وہ مختلف شاعرانہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔

اگلے سال ظفر اور فردوس دونوں کنووکیشن پنڈال میں ملے۔ دونوں کو ساتھ ساتھ ڈگری ملی۔

"شاندار کامیابی پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔" ظفر نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"شکریہ ــــ آپ کو بھی مبارک ہو" فردوس نے مختصر سا جواب دیا۔ شگفتہ چہرہ پہ حزن و ملال کے بے شمار نقوش اُبھر آئے۔

"کیا شغل ہے اِن دنوں آپ کا؟"

"یونیورسٹی میں پینٹنگ کی لکچرار ہوں۔ تصویریں بناتی اور سجاتی ہوں" ایک بہت ہی سرد جواب تھا جیسے سارا درد سمٹ کر ہونٹوں پہ آگیا ہو۔

"بہت خوب ..... تب تو دوبارہ مبارکباد قبول کیجیے۔"

"شکریہ ..... اور آپ کے کیا شغل ہیں؟" کرب میں ڈوبی ہوئی ایک خفیف آواز اُبھری۔

"خالص علمی لائبریریوں سے سند حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میں مطلب نہیں سمجھی۔"

"یعنی ..... ریسرچ کر رہا ہوں اس یونیورسٹی نے بھیجا ہے۔ مکمل ہونے کے بعد شاید وہیں پہ ملازمت کے لئے درخواست پیش کی۔"

"خدا کامیاب کرے ــــ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔"

"اچھا اب اجازت دیجئے ..... خدا حافظ" ظفر نے بہت ہی بے باک انداز میں رخصت طلب کی۔

"خدا حافظ!" درد کے سوتے پھوٹ پڑے۔ فردوس ضبط کے باوجود اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو نہ روک سکی ... لیکن اُنھیں دیکھنے والا وہاں موجود نہ تھا۔

ظفر ماضی کے کھنڈرات میں بھٹکتے بھٹکتے جب حال کی دنیا میں واپس آیا تو اُس کے روبرو وہ آٹوگراف بُک تھی جو اپنی سائز اور پہلے ورق پر پینٹنگ کے اعتبار سے بالکل منفرد تھی۔ وہ شمع کی دھندلی روشنی میں اُجاگر کئے چہرہ کے نقوش کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اُس میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ کافی دیر بعد اُس نے آٹوگراف دینے کے لئے جب ورق اُلٹنا شروع کیا تو اُس کے ہونٹوں پہ وہ شعر رقص کر رہا تھا جسے اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار آٹوگراف دیتے وقت لکھا تھا۔ ابھی اُس کے اشہبِ قلم نے "شمع کی صورت ....." ہی تک کی مختصر سی مسافت طے کی تھی کہ اُسے رُک جانا پڑا۔

"کیا دس سال بعد بھی وہی سزا تجویز کی جائے گی جو دس سال پہلے دی جا چکی ہے؟"

"کیا مطلب!" ظفر جیسے سوتے میں چونک پڑا۔

"مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ سزا تو آپ اس گنہگار کے لئے پہلے بھی تجویز کر چکے ہیں۔"

ظفر نے جب سر اوپر اُٹھایا تو اُس کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھیل گئیں۔

فردوس اُس کے سامنے حسرت و یاس کی سراپا تصویر بنی کھڑی تھی۔ شگفتہ ہونٹوں کے گلاب اور آتشیں رخساروں کے کنول مرجھا گئے تھے۔ آنکھوں کی جھیل بالکل خشک نظر آ رہی تھی۔ شیشے کی طرح چکنے اور چمکتے ہوئے چہرہ پہ غم و اندوہ کی لکیریں نمایاں تھیں۔ سیاہ زلفوں کی گھنگھور گھٹائیں بالکل بے رنگ ہو چکی تھیں جیسے برس کر کھل گئی ہوں۔ فردوس سفید لباس میں اپنے سن سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ اور قبل از وقت بیوہ نظر آ رہی تھی۔ گھبراہٹ میں ظفر کھڑا ہو گیا۔

"فردوس! تم نے یہ کیا شکل بنا رکھی ہے؟" ظفر نے پہلی بار اُسے اتنی اپنائیت کے انداز میں مخاطب کیا۔

"شکل تو خدا کی بنائی ہوئی ہے ظفر صاحب! میں تو صرف کینوس پہ تصویریں بناتی ہوں۔ بے جان ... اور بے رنگ!" فردوس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

"میرا مطلب ہے یہ کیسی حالت بنا رکھی ہے تم نے؟" ظفر نے محبت اور ہمدردی سے معمور لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا" پژمردہ ہونٹ طائرِ قفس کی طرح پھڑپھڑائے۔

"میں نے؟" ظفر سراپا سوالیہ نشان بن گیا۔

"جی ہاں! آپ نے کہا تھا ؎

"شمع کی صورت پگھل کر زندگی کیجیے تمام
یا پتنگوں کی طرح جل کر فنا ہو جائیے"

شاید آپ بھول گئے ہوں .... لیکن میں نے اسے اپنا مقدر سمجھ لیا .... میں پتنگوں کی طرح جل کر فنا تو نہیں ہو سکی۔ لیکن آپ کے حکم کے احترام میں شمع کی طرح پگھل پگھل کر زندگی تمام کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" کاش میں اس کوشش میں کامیاب ہو سکتی۔" اتنا کہتے کہتے فردوس کا گلا رُندھ گیا۔ جذبات کی شدت سے آواز حلق میں پھنس کے رہ گئی۔ جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان اُسے کمرہ کی ہر شے دھندلی اور گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔

اس سے پہلے کہ فردوس غش کھا کر کمرہ کے ننگے فرش پہ گر پڑتی۔ ظفر نے اُسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

غزل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

مرا حُسنِ بیاں ہے اور میں ہوں
متاعِ جاوداں ہے اور میں ہوں

کہاں جاؤں گا اب اُٹھ کر یہاں سے
تمہارا آستاں ہے اور میں ہوں

خبر ملتی نہیں ہے کارواں کی
غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں

نہیں موسیقیت اب زندگی میں
سکوتِ بیکراں ہے اور میں ہوں

وہی عالم ہے اُن کا اور وہ ہیں
وہی میرا جہاں ہے اور میں ہوں

ابھی کامل نہیں ہے جذبۂ عشق
غمِ سود و زیاں ہے اور میں ہوں

بہے جاتے ہیں پیہم اشکِ خونیں
بہارِ گُل فشاں ہے اور میں ہوں

لبوں پر ہے رواں موجِ تبسّم
یہ اندازِ فغاں ہے اور میں ہوں

سُنے کوئی جو سن سکتا ہو مجھ کو
خموشی کی زباں ہے اور میں ہوں

بھڑک کر بجھ گئی ہے آتشِ دل
فقط اب تو دھواں ہے اور میں ہوں

قیامت ہے یہ دورِ زندگی بھی
مسلسل امتحاں ہے اور میں ہوں

مجھے پرویز اب ڈھونڈے نہ کوئی
خیالِ رفتگاں ہے اور میں ہوں

غزل

بشیر فاروقی لکھنوی بی۔ اے

ہم اِک سوال جو نظمِ چمن پہ کر جائیں
ابھی گلاب سے چہروں کے رنگ اُتر جائیں

نظر ملا کے تری دلکشی نکھر جاتے
قریب آ کے مری اُلجھنیں سنور جائیں

ہمارے بس میں نہیں ہے کہ غم کی راہوں سے
بغیر تم کو پکارے ہوئے گزر جائیں

بڑی تھکن ہے رہو تم ہمارے ساتھ کہ ہم
نہ جانے کس گلی کس موڑ پر ٹھہر جائیں

خزاں کے جور تو برداشت کر لیتے تھے مگر
اب اِس بہار سے تنگ آ کے ہم کدھر جائیں

ہمیں کو ہے یہ سلیقہ کہ ذکرے کی طرح
مسائلِ غمِ ہستی بیان کر جائیں

ترے کرم کو تو ٹھکرا کے ہم چلے آئے
یہ سوچتے ہیں کہ اب کس حسیں کے گھر جائیں

مہِ تمام سے پیغام بھیجنے والو!
ہمارے گھر تو اندھیرا ہے ہم کدھر جائیں

گزرتے وقت کی رفتار روک سکتی ہے
حضور آپ کی یہ ضد کہ ہم ٹھہر جائیں

کسی حسین کے وعدوں پہ شام وقف کریں
کسی خیال کی چھاؤں میں دن گزر جائیں

سوال اب مری چاہت کی آبرو کا ہے
جو زخم ہنس نہیں سکتے وہ زخم بھر جائیں

میں اپنی فکر کے خاکے میں رنگ بھر لوں بشیر
بس اتنی دیر مرے پاس وہ ٹھہر جائیں

نکہت

سرتاج بانو شبنم بی۔ اے

آر۔ پی۔ اُتر دار ہاسپٹل، عمرکھیڑ ضلع ایوت محل

اچھے چچا جان — آداب و احترام

نکہت کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جرأت کر رہی ہوں۔ کامیاب ہو جاؤں تو میری خوش قسمتی —!
آپ کی ذرّہ نوازی!! ایک عرصہ سے آرزو تھی کہ "بیسویں صدی" کی بزم میں شرکت کروں۔ آج وہ آرزو پوری ہوتی نظر آتی ہے
اس لئے کہ آپ نے کتنے ذرّوں کو آفتاب بنایا ہے!... مخلص — سرتاج بانو شبنم

نکہت آج بھی مجھے لفٹ دے کر کالج تک لے گئی تھی۔ مجھے کار سے اُتر کر اندر جانے کے لئے راہ نہ ملی۔ گیٹ پر طلبا کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ میں اُن کی طرف بڑھا ہی تھا کہ نکہت کی کار ریک ہوتے ہوئے گیٹ سے آلگی۔ اشارے سے اس نے مجھے بلایا۔ میں نزدیک گیا تو کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ میں گھبرا گیا۔ سارے لڑکے ہمیں ہی دیکھ رہے تھے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں۔

"نکہت! ذرا ان طالب علموں کا خیال کیجئے۔ آخر بات کیا ہے؟"

وہ ہنسی دباتی ہوئی بولی "ان کا خیال ہی کر کے تو واپس آئی ہوں۔ آپ نے سُنا یہ کیا کہہ رہے تھے؟"

"نہیں" میں نے دھیمے سے کہا۔

وہ پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی "وہ کہہ رہے تھے، آپ نے مجھے پھانس لیا ہے"۔

ایں! میں حواس باختہ سا کھڑا رہ گیا اور نکہت کار اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا...

اُس وقت سے کالج میں میرا دل نہ لگ سکا۔ میں نے ایک بھی پیریڈ نہ لیا۔ اسٹاف روم میں لکچرر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں اس قدر بیزار کیوں ہوں۔ میں انہیں کچھ بتا بھی نہ سکا اور آخر جلدی گھر لوٹ آیا۔

نکہت! نکہت!! میرا جی چاہ رہا تھا۔ اپنے بال نوچ ڈالوں، کپڑے پھاڑ کر سڑک پر نکل جاؤں اور چیخ چیخ کر سب کو بتا دوں کہ اس لڑکی نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ وہ مجھے جینے نہیں دیتی۔ مجھے ہر دم احساسِ کمتری میں مبتلا کئے رہتی ہے لیکن اکبر صاحب کا لحاظ کر کے میں خاموش ہو جاتا۔ اکبر صاحب میرے محسن تھے اور انہیں کی کوششوں سے یہاں سٹی کالج میں مجھے لکچررشپ مل سکی تھی۔ میں پہلی بار جب ان کے گھر پہنچا تھا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے اور نکہت ریڈیو کے نزدیک بیٹھی تین تال سن رہی تھی۔ اکبر صاحب بہت تپاک سے ملے۔ چائے پیتے ہوئے میری نظریں اچانک نکہت کی طرف چلی گئیں۔ وہ دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹیکے بغور مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں جیسے کوئی عجوبہ نظر آگیا ہو۔ میں ان آنکھوں میں صرف تجسس کی ایک لہر دیکھ سکا۔ چائے کے بعد اکبر صاحب دوسرے کمرے میں فون کی طرف گئے تو نکہت نے ریڈیو کی آواز اونچی کر دی۔ سارا کمرہ گونج اٹھا۔ میرے کان پھٹنے لگے لیکن نکہت اسی طرح اطمینان سے بیٹھی رہی۔ اچانک اکبر صاحب چیخ اٹھے۔

"نکہت! پھر وہی بدتمیزی؟ کتنی بار کہا آواز اونچی نہ کیا کرو!"

نکہت نے آواز کم کر دی۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا "کیسا رہا طبلے پر تین تال؟"

میں گھبرا گیا۔ احمقوں کی طرح گردن ہلا کر کہا "اچھا... بہت اچھا.."

"کیا بہت اچھا؟" نکہت نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی طبلے پر تین تال" میں نے وضاحت کی۔

"واہ واہ! یہ تو کچھ بھی اچھا نہ تھا" کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

جب میں رخصت ہو کر چلا تو گیٹ پر نکہت کھڑی تھی۔ مجھے پکار کر کہا۔

"سُنئے؟"

میں رُک گیا تو بے حد سنجیدگی سے بولی "کالج میں پڑھانے جانے سے پہلے مجھ سے پڑھ جایا کیجئے"

میں جھنجھلا گیا۔ سوچا بے حد مغرور لڑکی ہے۔ لیکن آج سوچتا ہوں اگر پہلے ہی دن سے
اس کی باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے لگتا تو آج اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

یہ تھی میری پہلی ملاقات ـــــــ شام کو میں اکبر صاحب کے ساتھ گھومنے نکلا
تو چائے پیتے ہوئے مجھ سے بہت دیر تک باتیں کیں۔ میں کچھ نہ پوچھ سکا۔ ہاں وہ ہنستے ہنستے ایک بار کہہ گئے۔
"شکر ہے کہ ناہید ہو اور وہ سائنس کالج میں" ورنہ کچھ نہ ہو سکے۔
روز صبح کالج جانے والی بس پکڑنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ جب
کی کار آکر رک گئی۔

"پروفیسر صاحب! بیٹھئے آپ کے کالج ہوتے ہوئے چلیں۔"
میں انکار نہ کر سکا اور بیٹھ گیا۔ دس پندرہ دنوں تک وہ مجھے کوئی لفٹ دیتی
رہی۔ ایک دن اس نے پوچھا۔

"پروفیسر صاحب آپ فلسفہ پڑھاتے ہیں؟"

"ہاں ... لیکن کیوں؟"

"آپ غائب دماغ تو معلوم نہیں ہوتے؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"تب جیسے ... کیا لڑتی ہیں آپ بھی۔ کیا فلسفے کے پروفیسر کا غائب دماغ ہونا
ضروری ہے اور پھر میں تو ابھی"

"ابھی آپ ابھی نوجوان ہیں۔ بوڑھے ہو کر آپ کا دماغ بھی غائب ہو جائے گا۔
اب دیکھئے نا آپ کے کالج کے سامنے کار رکی ہے اور آپ اترنا بھول گئے ہیں۔"

میرا چہرہ تاریک ہو گیا۔ خاموشی سے اتر گیا۔

ایک دن خلاف معمول اس کی کار نہ آئی تو میں لاکھ چاہتے ہوئے بھی پیدل قدموں
کو پیدل گھسیٹنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ وہیں کالج کے لان پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا
پون گھنٹہ بعد نکہت آئی تو مجھے انتظار کرتے دیکھ کر بے اختیار مسکرا دی۔ راستے میں چہک
چہک کر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ وہ اس دن یکسر بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

آج وہی نکہت مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"پروفیسر صاحب! آپ کے فلسفہ کی کلاس میں کتنی لڑکیاں ہیں؟"

"یہی کوئی پانچ سات" میں نے جواب دیا۔

"جب آپ پڑھاتے ہیں تو آپ کو تکتی بھی ہوں گی؟" نکہت نے عجیب سے لہجے
میں پوچھا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایک پل کو سامنے لگے آئینے میں نظر ڈالی۔ کچھ
مسکرا کر کہا۔

"سب تو نہیں ہاں کچھ ضرور دیکھتی ہیں۔"

نکہت ایک لمحے کے لئے بجھ سی گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ بولی

"ویسے تو آپ کی صورت اس قابل نہیں" اور آئینہ کا رخ بدل دیا

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میرا بس چلتا تو اسے کار سے دھکا دے دیتا۔
وہ کیا حق رکھتی ہے میری ہنسی اڑانے کا۔ آج مجھے نکہت پر بے حد غصہ آیا۔ میں نے سوچ لیا
اب اس سے کبھی نہ ملوں گا۔ کسی دن آدھ گھنٹہ پہلے ہی کالج پہنچ جاتا کسی دن دوسرے
پیریڈ میں جاتا۔ چار دنوں سے نکہت کی صورت نہ دکھائی دی تھی۔

پانچویں شام کو کمرے میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا کہ اکبر صاحب کی آواز سنائی دی۔

"ارے بھئی عمران کہاں ہو؟"

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اکبر صاحب اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"ارے یہ کیا؟ تم تو اچھے خاصے دکھائی دے رہے ہو۔ صورت پر بیماری کے
دور دور تک آثار نظر نہیں آتے؟"

"لیکن آپ سے کس نے کہا کہ میں بیمار ہوں؟"

"ارے بھئی یہ نکہت بھی عجیب لڑکی ہے۔ آج چائے پر تمہارا ذکر نکلا تو کہنے
لگی۔ پروفیسر صاحب تو بے حد بیمار ہیں۔ چار دن سے کالج نہیں گئے۔ میں نے کہا اسے
دیکھنے جانا چاہیے تو کہنے لگی۔ جانا کیا چاہیے ابھی جائیے اور چائے پی کر میں ادھر نکل آیا۔"

میرے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ کیا نکہت اسی طرح جاننا چاہتی تھی کہ میں
کالج جاتے ہوئے اس سے کیوں نہیں ملا۔ رات میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

دوسرے دن اکبر صاحب کے گھر پہنچا تو وہ لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ شام
کی ڈاک دیکھتے ہوئے اکبر صاحب نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور ایک لفافہ نکہت
کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"عمران کے والدہ کا خط ہے۔ عمران کے لئے کسی لڑکی کی تلاش کرنے کو لکھا ہے
تو بھئی یہ کام میرے بس کا نہیں۔ تم ہی اپنی سہیلیوں میں سے کسی کو منتخب کرو۔"

"نکہت نے بے حد سنجیدگی سے کہا "آپ کی بات وہ مان جائیں گے؟"

"جسے تم لڑکی پسند کرو۔ وہ میرے عزیز دوستوں میں سے ہے۔ نامنظور کرتا
ہوتا تو مجھے لکھتا ہی کیوں؟"

"تو ابو جان! میری سہیلی ناہید ان کے لئے بے حد موزوں رہے گی!" نکہت کہتے کہتے مسکرا دی

"ناہید!" میرے ہاتھوں میں کپ تھرتھرا گیا۔ نکہت کی سہیلی ناہید کو میں نے
دیکھا تھا بے حد بھدی اور موٹی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ ٹیڈی فیشن کی دلدادہ! میں نے
عاجزانہ نظروں سے نکہت کی طرف دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں التجا کی۔ کیوں میری
زندگی برباد کر رہی ہو؟

لیکن نکہت اکبر صاحب سے مخاطب ہو کر بولی۔

"بس ابّو ناہید ہی رہی۔ میں لیٹر پیڈ لاتی ہوں۔ آپ ابھی لکھ دیجئے۔ صبح کی ڈاک سے نکل جائے گا۔"

میں وہاں اور نہ ٹھہر سکا۔ تین دن تک بے حد پریشان رہا۔ آخر تیسرے دن ابّو جان کو میں نے صاف لکھ دیا کہ میں ناہید سے شادی نہیں کر سکتا! جلد ہی اُن کا جواب آیا۔ تم کس ناہید کا ذکر کر رہے ہو؟ میں نہیں جانتا۔ اکبر صاحب نے تمہارے لئے اپنی بیٹی کا نام بھیجا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ فیصلہ انہوں نے نکہت کی اپنی مرضی سے کیا ہے۔ تم فوراً لکھو کیا تمہیں یہ رشتہ پسند ہے؟۔

"پسند!" میں زیرِ لب بڑبڑا اُٹھا اور دوڑتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ نکہت کے گھر پہنچا تو وہ لباس تبدیل کر رہی تھی۔ کار نکالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے پروفیسر صاحب؟"

"پوسٹ آفس! ابّو جان کو تار کرنا ہے۔ پوچھو گی نہیں کیوں؟"

"نہیں" نکہت نے ہولے سے کہہ کر میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ اُس کے چہرے کی وہ شرمیلی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا ساری کائنات مسکرا رہی ہے مسکرا کر مجھے مبارکباد دے رہی ہے!

غزل

سیّد حباب ترمذی

تبسم زیرِ لب محشر بآغوش
عیاں فتنے مگر اندازِ خاموش

حضورِ دوست ہیں حیران و خاموش
سُنائیں حالِ غم اتنا کہاں ہوش

سمجھتے ہی نہیں رندانِ مے نوش
نگاہِ مست ہے غارت گرِ ہوش

مُبارک ہو اسیری کا زمانہ
وہ زُلفیں اِن دنوں ہیں دام بردوش

ترے حُسنِ چمن آرا کے صدقے!
نگاہِ شوق ہے جنت بآغوش

بہارِ لالہ و گُل، اللہ اللہ
فضائے گُلستاں ہے خُلد بردوش

مُسلسل آندھیوں میں جل رہی ہے
محبت کی نہ ہوگی شمع خاموش

مجھے سرشار کرنے آ رہا ہے
کوئی ساغر بکف، مینا در آغوش

جگر کے بعد اب ہندوستاں میں
حباب اِک رہ گئی ہے ہستیٔ جوش[1]

[1] حضرت جوش ملسیانی

غزل

مسعودہ حیات ایم۔اے، بی۔ایڈ

یہ دیوانہ پن کیوں نہ ہو مجھکو پیارا
یہ تیرا کرم ہے یہ تیرا اشارا

یہ ہے تیری چشمِ فسوں کا اشارا
کوئی شادماں ہے کوئی غم کا مارا

کبھی میری خوشیوں کی دنیا نہ بستی
نہ ملتا اگر تیرے غم کا سہارا

وہ خوابیدہ خوابیدہ نظروں کی مستی
جواں بن گیا میکدے کا نظارا

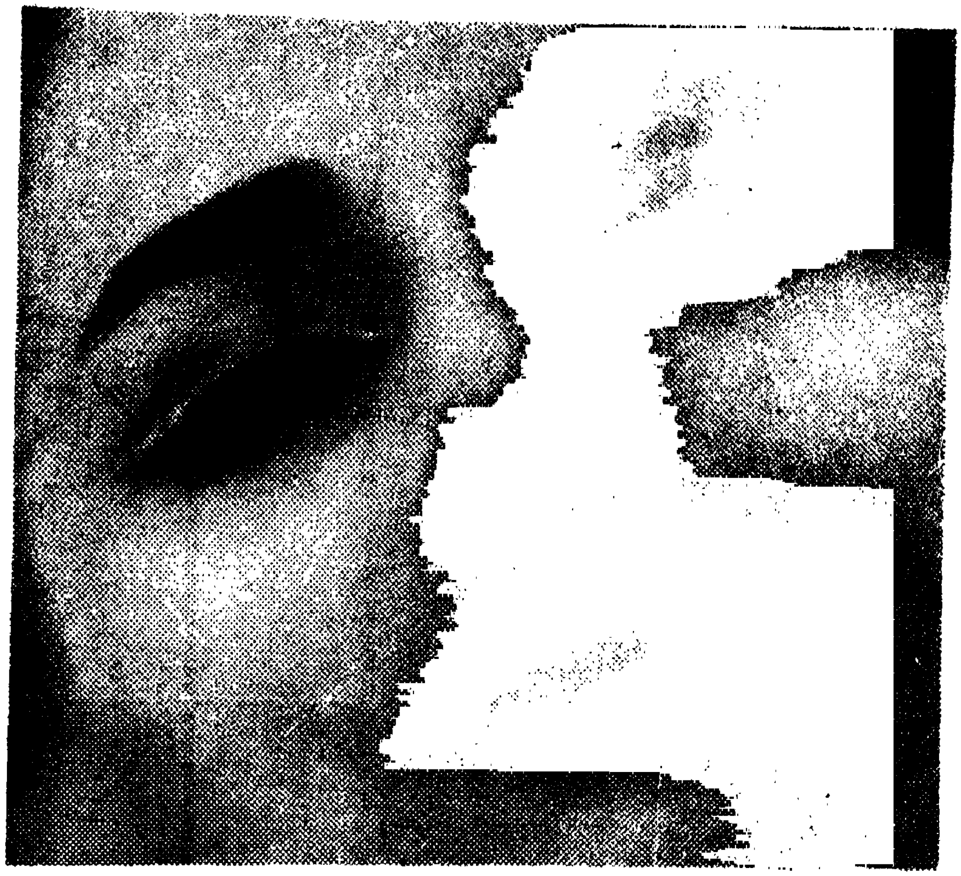
نہ چھینو مری خلوتِ غم نہ چھینو
کوئی تو ہے زندگی کا سہارا

تری زیست خوشیوں سے آراستہ ہے
تجھے کیا غرض ہو کوئی غم کا مارا

نظر میں بہارِ محبت بسا کر
ہمیں نے جہانِ محبت سنوارا

مری بندگی پر ہے الزام بیجا
مجھے خود ترے نقشِ پا نے پکارا

حیات اب تو لڑنا ہے طوفاں سے ہم کو
نہیں ہے نہ ہو ناخدا کا سہارا



شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۴۳۵ تیمار پور، دہلی

محبِ محترم! تسلیمات

اس بار محض آپ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے "شانِ نزول" بھیج رہا ہوں ورنہ آج کل میرے خیال کی انجمن کی رونق تو بہت سے عظیم المرتبت مرحوم شاعروں الاکئے ہوئے ہیں اور میری تنہائیاں انھیں سے ہم کلام رہتی ہیں۔ شراب چھوڑنے کے بعد آں جہانی شاعروں یا اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ خدا خیر کرے۔ میری موجودہ ذہنی کیفیت کو جاننے کے لئے میرا ہی ایک "سانیٹ" سُنیئے:

بتا پھر اے دلِ پُر یاس کیا کیا جائے

نہ ہم صفیر کوئی ہے نہ دست گیر کوئی
نہیں ہے تیرے سوا دوسرا مشیر کوئی
مگر تو آپ ہے بے آس کیا کیا جائے

بتا پھر اے دلِ پُر یاس کیا کیا جائے

شراب کہتے ہیں جس کو وہ ایک تلخ سی شے
سُنا تھا تلخیٔ غم کا علاج ہوتی ہے
ہمیں تو آ نہ سکی راس کیا کیا جائے

بتا پھر اے دلِ پُر یاس کیا کیا جائے

نظر نظر ہے فسردہ نفس نفس ہے دھواں
جہاں ہو ایک جہاں مبتلائے دردِ وہاں
خود اپنے درد کا احساس کیا کیا جائے

یہ بے کسی تو حقیقت میں اے بجھے ہوئے دل!
ہمارے اپنے لئے بھی ہے رحم کے قابل

تیمار پور کا سب سے بڑا بیمار ——— نریش کمار شاد

ایک شام کو جب اکبر الٰہ آبادی کے یہاں حسبِ معمول بے تکلف دوست جمع تھے ایک صاحب سوٹ پہنے اور ہاتھوں میں خریدا ہوا سامان لئے تشریف لائے۔ سامان میں

...لٹکا ہے وارث علی نے بتایا کہ یہ دودھ کا لوٹا ہے۔ بچے کو ڈبے کا دودھ پلایا جاتا ہے۔ یہ سُن کر اکبر نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ؎

طفل میں بُو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

اختر شیرانی کے ایک بے تکلف دوست اُن سے ایک خوبصورت امیرزادی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک شام اُسی دوست کے ساتھ میکدے میں بیٹھے بیٹھے اختر صاحب کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ ساغر و مینا سے منہ موڑ کر اُس لڑکی کو دیکھنے کے لئے بضد ہو گئے۔ آخر اختر صاحب کا وہ دوست اُسی عالم میں جب اُنہیں اُس نازنین کی کوٹھی کے دروازے تک لے کر آیا تو اتفاق سے ایک عورت باہر آ رہی تھی۔ اختر صاحب کے دوست نے بتایا کہ یہ اُن کی والدہ ہیں۔ اختر صاحب چند لمحوں تک سراپا اشتیاق بن کر اُس ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھتے رہے اور پھر بے اختیار اُن کی زبان سے نکلا ــــ "ماں کے حُسن کا یہ عالم ہے تو بیٹی کو آنکھ بھر کر دیکھنا بھی ممکن نہ ہوگا!" اور پھر اُسی عالم میں یہ شعر کہہ دیا ؎

گلِ فسردہ بھی یک طرفہ حسن رکھتا ہے
خزاں یہ ہے تو مجھے خواہشِ بہار نہیں

جامع مسجد دہلی کے قریب ایک قہوہ خانے میں کچھ شاعر بے خود دہلوی اور سائل دہلوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے ایک شعر بنایا جس میں ان دونوں اُستادوں کے تخلص نظم کئے۔ شعرا میں حیدر دہلوی بھی موجود تھے۔ شعر سُن کر کہنے لگے ـــــ "اس شعر میں بے خود اور سائل کے الفاظ صرف تخلص معلوم ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ شعر میں دونوں کے تخلص بھی نظر ہوتے اور اس کے باوجود محض تخلص معلوم نہ ہوتے۔"

"یہ کیوں کر ممکن ہے؟" کسی شاعر نے جھلا کر کہا۔

"یہ اس طرح ممکن ہے ــــــــــ" اتنا کہہ کر حیدر دہلوی نے چند لمحوں کے تامّل کے بعد یہ شعر موزوں کر دیا ؎

پڑا ہوں میکدے کے در پہ اس انداز سے حیدر
کوئی سمجھا کہ بے خود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے

۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران میں جب شورش...

...میری ... خلاف دل کے پھپھولے پھوڑے گئے تھے تو سرور صاحب نے بہت خلوص اور کرب کے ساتھ شورش سے خطاب کرتے ہوئے یہ دو شعر کہہ دئے ؎

وہ قلم کس لئے تلوار ہوا جاتا ہے
جس کا سررشتہ محبت کی حکایات سے ہے
وادیٔ گنگ و جمن سے یہ کدورت کیسی
تیرا ساغر بھی تو اِس موجِ خرابات سے ہے

اور بعد میں اپنے انہیں دو شعروں کی بُنیاد پہ اُنھوں نے پوری نظم کہی۔

بسمل سعیدی ایک طرحی مشاعرے کے لئے اِس مصرعۂ طرح میں غزل کہنے کی فکر کر رہے تھے ؎

کوئی مینا لے کے باہر کون میخانے میں ہے

اچانک تذکرۂ آتشکدۂ آذر میں پڑھے ہوئے اِس فارسی شعر کا اُنھیں خیال آ گیا ؎

نشاطِ بادہ پرستاں بہ انتہا نرسید
ہنوز ساقیٔ ما بادہ در سبو دارد

اُنھوں نے اپنی طرحی غزل کا مطلع اِس شعر سے متاثر ہو کر کہہ دیا ؎

کون ہے محروم جو ساقی کے میخانے میں ہے
اور جتنی تھی ابھی اُتنی ہی پیمانے میں ہے

تقسیمِ وطن سے کئی سال پہلے ایبٹ آباد میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں راولپنڈی کے دوسرے شعرا کے علاوہ تلوک چند محروم اور رہبر نالوی بھی شامل ہوئے۔ رات کے دو بجے جب مشاعرہ ختم ہوا تو محروم صاحب کی تجویز پر شعرا آرام کرنے کی بجائے سیر و تفریح کی غرض سے ایک پہاڑی کی طرف چل پڑے۔ چلنے سے پہلے محروم صاحب نے ایک مصرع ماحول کے مطابق موزوں فرمایا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ہر کوئی اس پر کچھ نہ کچھ کہے۔ مصرع یہ تھا ؎

ایبٹ آباد کی یہ رات یہ نورانی رات

تھوڑی دیر کے بعد چلتے چلتے رہبر نے یہ تین شعر سُنا کر تمام حضرات سے دل کھول کر داد حاصل کی ؎

یہ اُترتی ہوئی شبنم یہ ہوا کے جھونکے
یہ جھکتے ہوئے باغات، یہ نورانی رات

اللہ اللہ رے اِس کی یہ شعاعی مقراض
قاطعِ پردۂ ظلمات، یہ نورانی رات
آج بھی تم نہ اگر آسکے تو کب آؤ گے
یہ مرا شوقِ ملاقات، یہ نورانی رات!

مولانا شبلی نعمانی کو بمبئی کی ایک خاتون عطیہ بیگم سے غیر معمولی ذہنی مناسبت تھی۔ جب عطیہ بیگم کی شادی ایک نومسلم یہودی نقاش سے ہوئی تو مولانا نے بزبان عطیہ بیگم یہ قطعہ کہہ کر تحفے کے طور پر بھیجا ؎

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اِس لئے ننگِ قرابت سے مجھے دُوری تھی
آپ نقاش ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے مجھ کو جو کھینچا تو یہ مجبوری تھی

---

۱۴ جون ۱۹۴۸ء کی رات کو جب جوش ملیح آبادی بمبئی میں سمندر میں کود کر اپنی محبوبہ کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے اُس خوفناک حادثے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "نیا امرت" کے عنوان سے یہ تین شعر لکھے ؎

زبانِ وید کہتی ہے کہ طوفانی سمندر سے
جلال انگیز دیوتاؤں نے سات امرت نکالے تھے
وہ امرت جن کے اندر شُبہ ہے انفاسِ مسیحا کی
وہ امرت جوت سے جن کی جبیں روشن ہے دنیا کی
سمندر سے مگر شاعر نے وہ "امرت" نکالا ہے
جبینِ کبریا پر جس کے پرتو سے اُجالا ہے

ایک دن اسرار الحق مجاز صبح سویرے لکھنؤ سے دہلی پہنچے۔ جہاں قیام کرنا تھا وہاں پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو وہی خاتون دروازہ کھولنے آئیں جن سے مجاز کا رُومان چل رہا تھا۔ مجاز نے یہ اشعار اُسی واقعے کی یادگار کے طور پر کہے ؎

رخصت اے ہم سفرو! شہرِ نگار آ ہی گیا
خُلد بھی جس پہ ہو قرباں وہ دیار آ ہی گیا

یہ جنوں زار مرا یہ غزالوں کا جہاں
میرا نجد آ ہی گیا میرا تتار آ ہی گیا

آج پھر تابہ چمن در پئے گلہائے چمن
گنگناتا ہوا زنبورِ بہار آ ہی گیا

گیسوؤں والوں میں، ابرو کے کماں داروں میں
ایک صید آ ہی گیا ایک شکار آ ہی گیا

باغبانوں کو بتاؤ، گل و نسریں سے کہو
اِک خرابِ گل و نسرینِ بہار آ ہی گیا

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگامِ سحر
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آ ہی گیا

زلف کا ابرِ سیہ، بازوئے سیمیں پہ لئے
پھر کوئی نغمہ زنِ سازِ بہار آ ہی گیا

ہو گئی تشنہ لبی آج رہینِ کوثر
میرے لب پر لبِ لعلینِ نگار آ ہی گیا

سید عبدالسلام خیال ہیڈ ماسٹر دربار ہائی اسکول ٹونک کا شمار وہاں کے برگزیدہ شعراء میں ہوتا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں نواب ابراہیم علی خاں والئی ٹونک نے اُن کے نام اِس مضمون کا ایک حکم صادر کیا کہ وہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ریاست کی حدود سے باہر نکل جائیں ورنہ اُنھیں گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا جائے گا! اِس حکم میں اُن کے خلاف کوئی الزام نہیں لگایا گیا تھا۔ جب خیال صاحب کو یہ حکم ملا اُس وقت موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے اُسی حالت میں ایک یکہ منگایا اور جے پور جانے کے لئے نوائی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ نوائی میں بھی بارش کا وہی حال تھا اِس لئے اُنھوں نے سرائے کے دروازے پر یہ شعر کہہ کر لکھ دیا ؎

مرے سرکار کا ہو بول بالا
بھری برسات میں گھر سے نکالا

۱۹۴۷ء کے بعد جب اُتر پردیش میں فسادات کے ایک دوسرے دور کا آغاز ہو چکا تھا، رام پور میں ایک مشاعرہ ہوا۔ رام پور کے گرد و نواح کی فضا مکدر تھی۔ عرش ملسیانی بھی اُس مشاعرے میں مدعو تھے اور وہاں کی سہمی ہوئی مخلوق کا تصور اُن کے ذہن پر محیط تھا۔ اِس لئے مشاعرے میں پوری غزل اُسی پس منظر کے پیشِ نظر کہہ دی جس کا یہ شعر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

---

۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو دنیا کے پہلے خلاباز یوری گاگرن کی تاریخی پرواز سے متاثر ہو کر عزیز تمنائی نے "مراجعت" کے عنوان سے یہ قطعہ کہا ؎

بے کراں وسعتِ آفاق میں محوِ پرواز
دیکھتا کیا ہوں کہ اک پیکرِ حسن و وقار
تھیا فلاک سیہ پوش، تجلّی بکنار
نیلی چادر میں چھپائے ہوئے اک دخترِ راز
گھومتی جاتی ہے تاروں کی حسیں چھاؤں تلے
گردشِ رقص میں ہو جیسے کوئی زہرہ جمال
اِحجاباتِ کثیر میں عروسِ مہ وِصال
جیسے تقدیر کے سائے میں مسلسل ناچے
دیکھتا کیا ہوں کہ ناصیہ گیتی کے بغیر
آتشِ سینہ مستی میں کھو یا ہوا ہوں
یعنی پہلو میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں
اِس آن نہ مقاماتِ تہہ عرش کی سیر
چھوڑ کر بزمِ افلاک کو واپس آیا
تجھ کو پایا مری دلدار تو سب کچھ پایا

کسی نے ظریف لکھنوی کی موجودگی میں داغ دہلوی کا یہ شعر پڑھا سہ

مرے مزار کو وہ ٹھوکروں سے ٹھکرا کر
فلک سے کہتے ہیں یوں پائمال کرتے ہیں

اہلِ محفل زور شور سے اِس کی تعریف کرنے لگے۔ ظریف صاحب چند لمحوں تک خاموشی سے سنتے رہے اور پھر یہ شعر کہہ کر سنا دیا سہ

ایک ٹھوکر سے اُڑا دے جو مزارِ عاشق
وہ تو معشوق نہ ہوگا کوئی ہاتھی ہوگا

عندلیب شادانی نے جب کسی شخص سے حسرت موہانی کے یہ تین غزلیہ اشعار سنے سہ

کامرانی تجھے مبارک ہو   جاودانی تجھے مبارک ہو
لے ترا غم دلوں کو دے سرور   شادمانی تجھے مبارک ہو
مرقدِ عاشقاں پہ آخرکار   گلفشانی تجھے مبارک ہو

تو فرمانے لگے "تجھے مبارک ہو" سے پہلے ایک لفظ رکھ دیجئے۔ لیجئے مطلع تیار ہوگیا۔ باقی اشعار بھی زحمت طلب نہیں۔ قلم اُٹھایا اور غزل تیار! اور اپنی بات کی تائید میں عندلیب صاحب نے قلم برداشتہ یہ شعر موزوں کر دئے سہ

کھیر کھانی تجھے مبارک ہو   سرد پانی تجھے مبارک ہو
تجھ پہ قرباں کوٹ اور پتلون   شیروانی تجھے مبارک ہو
ہوگیا تو تو اور بھی نازک   ناتوانی تجھے مبارک ہو
تجھ کو بھیجا ہے یار نے تحفہ   ناسدانی تجھے مبارک ہو
ہیں یہ راز و نیاز کی باتیں   لن ترانی تجھے مبارک ہو
مجھ کو اُردو ہے عشق پیارے   دیوبانی تجھے مبارک ہو
حسرت لعنتی کی یہ غزل
گنگنانی تجھے مبارک ہو

کسی شخص نے منور سہائے انور کو اپنی پہلی غزل سناتے ہوئے ان کی توجہ اِس شعر پر خاص طور سے مبذول کرانی چاہی سہ

آپ نے دیکھا نہ ہو تو آپ کی بدقسمتی
ہم نے دیکھا ہے بیابانوں میں سمندر بیٹھتے

اور آخر میں کہا کہ مطلع ابھی نہیں ہوا ہے۔ انور صاحب پہلے تو خاموش رہے لیکن جب اُس شخص نے صاف الفاظ میں ایک مطلع کہہ دینے کی درخواست کی تو وہ ذرا تامّل کرنے کے بعد کہنے لگے لیجئے مطلع حاضر ہے۔ لیکن یہ آپ کی اِس پُر معنویت غزل میں کھپے گا نہیں سہ

تم نے کیوں تکلیف کی آرام سے گھر بیٹھتے
خون اپنا ہم اگر کر بیٹھتے کر بیٹھتے

برج نرائن ارمان دہلوی جو داغ کے شاگرد تھے اور بول چال میں گھٹیا کی بجائے گھٹیا کہنا جن کا تکیہ کلام تھا، اپنی شاعرانہ فضیلت ظاہر کرنے کے لئے ایکبار کہہ رہے تھے کہ "ارے! اِن کل کے شاعروں کو کیا گھٹیا ہے۔ ہم داغ کے شاگرد ہیں داغ کے! ہمارے مقابلے میں کوئی کیا شعر کہہ سکتا ہے"

پنڈت ہری چند اختر نے یہ الفاظ سنے تو اُسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا سہ

تو داغ کا شاگرد ہے یا داغ کا اُستاد
داغی ہیں مگر سب ترے اشعار گھٹیا

مولانا ظفر علی خاں نے یہ شعر کہہ کر نہایت جلی حروف سے اپنے اخبار روزنامہ "زمیندار" میں شائع کیا سہ

سنگھٹنے کہ جو ہیں دشمنِ جانِ اُردو
مٹنا چاہتے ہیں نام و نشانِ اُردو

تو پنڈت راج نارائن ارمان نے اِس کے جواب میں یہ شعر کہا ؎

جو شانے کی جگہ میٹنا لکھ دیتے ہیں
روئے گی اُن کی اِس اُردو کو زبانِ اُردو

معین احسن جذبی جب اپنی یہ غزل کہہ رہے تھے جس کا مطلع ہے ؎

جفا کی طرز بدلی خسروِ شیریں سخن بدلا
مگر اُس سے بھی کچھ بڑھ کر مزاجِ کوہکن بدلا

تو اُسی زمانے میں جوش ملیح آبادی نے ہندوستان کو مستقل طور پر خیرباد کہہ کر پاکستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جذبی نے اپنی اِس غزل کا مقطع اُس سانحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ؎

محبانِ وطن کی آنکھ نیچی ہو گئی جذبی
ہمارے شاعرِ ہندوستاں نے جب وطن بدلا

ایک دن صبح کے وقت ذوق دہلوی اپنے شاگردانِ رشید میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور کمرے میں جا بجا انگیٹھیاں روشن تھیں۔ ایک دم ذوق صاحب نے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؏

مہر تو مشعل نما اِک روشنی والوں میں ہے

اِس مصرعے پر جو مصرعہ لگائے گا وہ شعر اُسی کو دے دیا جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ مطلع ہو۔ سب شاگرد فکر کرنے لگے اور سب سے پہلے داغ دہلوی نے یہ شعر سنا کر اُستاد کو شاد کام کیا ؎

وہ بھبھوکا ایک ہی آتش کے پرکالوں میں ہے
مہر تو مشعل نما اِک روشنی والوں میں ہے

نواب کلب علی خاں کے عہد میں اُنہیں کی فرمائش پر امیر اللہ تسلیم لکھنوی رامپور چلے گئے تھے۔ نواب صاحب جب تک زندہ رہے تسلیم صاحب بھی آسودہ حال رہے لیکن اُن کی وفات کے بعد تسلیم کی تنخواہ آدھی رہ گئی اور وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ اُس زمانے میں اُنہوں نے ٹونک اور مانگرول میں قسمت آزمائی کرنے کے علاوہ حیدرآباد جانے کا ارادہ بھی کیا۔ لیکن امیر مینائی کی مثال جب یاد آئی تو یہ شعر کہہ کر اِس ارادے کو دل سے نکال دیا ؎

مرے دل سے تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے
مگر مرگِ امیرِ بے وطن کچھ اور کہتی ہے

جب لکھنؤ کے شاعروں نے میرزا یاس یگانہ چنگیزی کا بائیکاٹ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ لکھنؤ کے اب کسی مشاعرے میں اُنہیں اپنے شعر پڑھنے کا موقع ہی نہ دیا جائے تو میرزا نے یہ شعر کہا ؎

لکھنؤ میں غزل اب یاس کو پڑھنے ہی نہ دو
ذرّے نے پہلوئے خورشید دبانا چاہا

کسی مشاعرے میں ایک صاحب اعجاز بھرتپوری نے جب اپنی غزل میں یہ مصرعہ بھی پڑھ دیا ؏

چاند گویا آ گیا پیشِ نظر کے سامنے

تو سیماب اکبرآبادی اِس لغویت کو برداشت نہ کر سکے اور غزل ختم ہونے کے فوراً بعد ہی اُنہوں نے یہ شعر سرِ مشاعرہ سنا دیا ؎

کھل گیا سیماب اعجازِ بھرتپوری کا بھرم
لکھ گیا مردِ خدا پیشِ نظر کے سامنے

شاد عارفی کے پڑوس میں کوئی صاحب ناجائز شراب کشید کرنے اور بیچنے لگے اور جب وہ خانہ ساز شراب خُم سے بوتلوں میں بھرتے تو دُور دُور تک بدبُو پھیل جاتی اور اُس وقت شاد صاحب شدید ذہنی کوفت محسوس کرتے اور اُن کا دماغ پریشان ہو کر جیسے اُبکائیاں لینے لگتا۔ ایک دن ایسے ہی عالم میں شاد صاحب نے قلم برداشتہ اپنے محسوسات کو اِس قطعے میں نظم کر دیا ؎

ایک تانتا بندھا ہے رندوں کا
بوتلوں کی صفیں، ہجوم ایاغ!
خشتِ خُم بار بار اُٹھتی ہے
چوٹ پر چوٹ کھا رہا ہے دماغ

میرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی کے صاحبزادے کے ختنے کی تقریب تھی۔ تمام عمائدینِ شہر جمع تھے جیسے ہی حجام نے ختنہ کیا آپ نے برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

حجام نے یہ کام کیا ہے نمود کا
گُل لے گیا تراش کے شمعِ وجود کا

۱۹۱۴ء میں جے پور کے ایک رئیس نے اپنے مکان پر مشاعرے کا اہتمام کیا اور خود میرِ مشاعرہ بن بیٹھے۔ میرزا غالب کا مصرع ؏

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

طرح تھی۔ جو شاعر مدعو کئے گئے تھے اُن میں شعر گوئی اور شعر فہمی کا ذوق بہت ہی کم تھا۔ منشی عظمت اللہ خاں ناز جو ٹونک کے ایک سربرآوردہ شاعر تھے سامعین کی آخری صف کے پیچھے جا بیٹھے۔ جب دیر تک مشاعرے پر بے کیفی کا عالم طاری رہا تو وہ غصے سے اُٹھ گئے اور یہ شعر پڑھ کر ہنستے ہوئے باہر نکل گئے؎

اُداسی چھا گئی ہے بیٹھے بیٹھے
تری محفل میں کوئی مر گیا کیا؟

ایمرسن (Emerson) کا یہ جملہ جب میری نظر سے گزرا
Beauty is God's hand writing.
تو اس کے جواب میں یہ قطعہ موزوں ہو گیا؎

فکر تیری بہت حسین سہی
یہ بھی سوچا ہے تو نے مردِ جلیل
کس کی تحریر ہے یہ بدشکلی
حُسن اگر ہے خدا کا خطِ جمیل

کنول پرشاد کنول ایک ایسی محفل میں موجود تھے، جس میں ایک صاحب اقتدار کے گرد خوشامدی حضرات کا خاصا جمگھٹ تھا۔ جن میں کئی قابل افراد بھی تھے۔ موصوف اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اکثر قابلِ احترام شخصیتوں کا مذاق اُڑا رہے تھے اور کوفت کی بات یہ تھی کہ وہ حضرات خاموشی سے سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر کنول صاحب نے یہ قطعہ کہا؎

کیا زمانہ ہے علم کی دیوی
جہل کو آج سر جھکاتی ہے!
نشۂ اقتدار دیکھ کنول
پاؤں کی دُھول سر پہ آتی ہے!

تقسیمِ وطن سے پہلے پٹیالے میں ایک انجمن 'حلقۂ ادب' کے نام سے قائم تھی۔ تقسیم کے بعد اُس بزم کا نام "انجمنِ اردو" رکھ دیا گیا اور کرپال سنگھ بیدار کی صدارت میں اُس انجمن نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری کر دیں۔ چند سال پہلے ساحر سامی صاحب نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر "انجمن ترقی اردو" کی بنیاد رکھی۔ اُس کے پہلے اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ پٹیالہ میں صرف یہی انجمن اردو ادیبوں کی نمائندہ انجمن ہے اس لئے "انجمنِ اردو" کو اسی انجمن میں شامل ہو جانا چاہیے اور اپنے فنڈز وغیرہ بھی اس انجمن کے سپرد کر دینے چاہئیں۔ "انجمنِ اردو" کے جنرل سیکریٹری مہر کشن اختر بھی اُس اجلاس میں شامل تھے۔ اُنھیں خطاب کرتے ہوئے ساحر صاحب نے دریافت کیا کہ آپ میری بات سن رہے ہیں نا؟ اختر صاحب اُس وقت تو چپ رہے لیکن بعد میں ساحر صاحب کی اِس بات کے جواب میں اُنہوں نے یہ قطعہ کہا؎

کل اِک نوچی بولی نائکہ سے
کرو اب ختم مری حلقہ بگوشی
جہاندیدہ تھی سُن کر مسکرا دی
"جوابِ جاہلاں باشد خموشی"

روح کی وادی سُونی سُونی

شفق سہسرامی

کبیر گنج سہسرام (بہار)

برادرم خوشتر صاحب! خلوص و احترام

ایک کہانی "روح کی وادی سونی سونی" ارسالِ خدمت ہے۔ ہوسکتا ہے قارئین کو اس کا اختتام نامکمل معلوم ہو لیکن یہ کہانی جتنی مجھے معلوم تھی لکھ دیا۔ اس کے بعد کی کہانی مجھے معلوم نہیں، نہ جانے رخسار کیسے زندگی گزار رہی ہے؟ ——— میرے خیال سے کہانی مکمل ہے ویسے تو ساری کہانیاں جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں سے پھر ایک نئی کہانی کا آغاز ہوتا ہے —— اگر آپ کو اور قارئینِ "بیسویں صدی" کو یہ سچی کہانی پسند آئی تو مجھے مسرت ہوگی۔ نیازمند ——— شفق سہسرامی

درختوں کے پیچھے چاند پگھل رہا تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی، چاند روز ہی پگھلتا ہے۔ کائنات ہر رات ٹھنڈی چاندنی میں جلتی ہے لیکن آج کی رات اور راتوں سے مختلف کیوں ہے، آج چاند کی چاندنی میں رومانیت، روح کو مسرور کردینے والا انبساط کیوں نہیں ہے! تارے اُداس کیوں ہیں؟ ہوائیں سرگوشیاں کیوں نہیں کرتیں؟ ان کی سرگوشیاں سسکیوں میں کیوں بدل گئی ہیں؟

اُداس تو صرف میں ہوں، ہیجان تو میرے دل میں برپا ہے۔ روح کی وادی تو میری سُونی ہوگئی ہے، تمنا تو میری پامال ہوئی ہے، پھر میرے غم میں چاند تارے کیوں شریک ہیں؟ ہوا کو میرے غم سے کیا غرض؟ تاروں کی رعنائیاں کیوں پھیکی ہیں؟ اس نے ایک بار پھر چاند کو دیکھا۔ وہ بہت تھکے قدموں سے ناکامی کی لاش اپنے کاندھے پر اُٹھائے منزل کی طرف جا رہا تھا۔ چاند کی بھی ایک منزل ہے۔ اس نے سوچا لیکن میری کوئی منزل نہیں ہے، کوئی ساحل نہیں، میری کشتی ہوا کے رحم و کرم پر بہہ رہی ہے۔ اِس کا رُخ کدھر ہے؟ کیا اسے کنارہ ملے گا؟ کبھی منزل ملے گی؟

کنارا تو اس کے قریب ہی ہے۔ اتنا قریب کہ اُس کی سسکیاں وہ صاف سُن رہا تھا، منزل خود اُس کی باہوں میں آنے کو بے چین تھی۔ ساحل سے اُس کی کشتی کا فاصلہ ہی کتنا ہے؟

صرف ایک دیوار کا!!

دیوار کے پیچھے رخسار ہے اُس کی تمنا۔ اُس کی آرزو، اُس کا خواب، کوئی لمحہ ایسی نہ تھی جب وہ اُس کی زلفوں کی چھاؤں میں گنگناتا نہ ہو، ہر تصور اُس کے بغیر پھیکا تھا۔ اُس نے کوئی خواب اُس کے بغیر نہیں دیکھا۔ وہ ہر جگہ، ہر منزل پر اُس کی ساتھی تھی۔ اُس نے آئندہ زندگی کا جو خاکہ بنایا تھا اُس میں ہر جگہ وہ اُس کی ہمراہی تھی۔

کیا ہوا وہ رخسار سے سینکڑوں میل دُور رہتا تھا، محبت میں دُوری کی اہمیت ہی کب ہے؟ دل کی منزل ایک ہو تو دوری خود بخود سمٹ جاتی ہے۔ اُسے اس کا یقین تھا کہ رخسار اُسے چاہتی ہے۔ روح کی گہرائیوں سے اُسے چاہتی ہے اُس کے لئے وہ اپنا سب کچھ تج دینے کو تیار ہے۔ جب اُسے رخسار کی محبت کا اتنا بھروسہ تھا تو وہ دوری سے کیوں خوفزدہ ہوتا؟ اُس کے اپنے دل میں بھی چور نہ تھا۔ زندگی کی راہوں میں اسے کئی لڑکیاں ملی تھیں۔ ایک سے ایک خوبصورت، تعلیم یافتہ، دولت مند، فیشن ایبل، لیکن وہ صرف آنکھوں تک محدود رہیں۔ دل میں کوئی نہ جھانک سکی، دل کے آئینہ میں کسی کا عکس نہ بن سکا۔ سب آنکھوں ہی سے رخصت ہوگئیں اور اُس کے دل میں اُن کے لئے کوئی تڑپ، تلاش، جستجو کچھ بھی نہ ہوئی لیکن یہ رخسار . . . .

ایک معمولی صورت شکل کی لڑکی جس کے پاس نہ اعلیٰ تعلیم کی دولت تھی نہ شہر کی اور نہ لازوال حُسن ہی کی، بہت چھوٹی سی لڑکی تھی قد اتنا کم تھا کہ دُور سے دیکھنے پر وہ بچی ہی معلوم ہوتی تھی۔

رخسار نے اس کا تصور بھی نہ کیا تھا کہ جھولوں کا شہزادہ کا نٹے کے لئے اپنے دل میں کبھی نہ مٹنے والا نقش بنا رہا ہے!

اُس کی آنکھوں میں ایک ہی خواب انگڑائیاں لے رہا تھا۔

وہ رخسار کو جیون ساتھی بنالے!

اُس کے دل میں صرف ایک ہی خیال آیا تھا شادی کا۔ نہ اُس نے رخسار سے محبت کرنے کی کوشش کی نہ اس سے کھیلنا چاہا۔ حالانکہ خوبصورت لڑکیوں پر اُس نے ہمیشہ جان دی تھی، لیکن اس معمولی لڑکی کو وہ اتنی اہمیت کیسے دینے لگا۔ یہ خود اُسے بھی معلوم نہ تھا۔

بس وہ رخسار کو چاہنے لگا۔ دل کی گہرائیوں سے! اور رخسار بھی اُسے ٹھکرا نہ سکی۔ ٹھکراتی بھی کیسے۔ وہ تو خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی تھی لیکن اُس کی چاہت پر کبھی کبھی اسے شک ہونے لگتا۔ اسی لئے اُس نے پوچھا بھی۔

"آپ مجھے جس مقام پر دے رہے ہیں وہاں سے اس طرح نہ گرا دیجئے گا کہ میں پھر اُٹھ ہی نہ سکوں۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ میرے پاس کوئی خوبی نہیں۔ میں بہت معمولی لڑکی ہوں۔ آپ کے قابل نہیں۔"

"تم میرے لئے کیا ہو یہ میرا دل ہی جانتا ہے!" اُس نے رخسار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "رہی گرنے کی بات، تو زندگی میں تو یہ ممکن نہیں، اگر خود کھڑا ہونے کی پیروں میں طاقت رہی تو تمہیں سہارا دیئے رہوں گا لیکن ایسا خیال تمہارے دل میں کیسے آجاتا ہے۔ تمہیں میری محبت پر یقین نہیں ہے کیا۔ تم میری ہو صرف میری۔"

اور رخسار کے دل میں امنگوں اور خوشیوں کے ہزاروں دیپ جل اُٹھے۔ آرزوں کے ہزاروں کنول دل کی انجمن میں کھل جاتے۔ آنکھیں چمکنے لگتیں اور اُس کا دل چاہتا وہ اُس کی آغوش میں سمٹ جائے۔ اور ساری دنیا کو بھول جائے۔ اُس کی آنکھیں نشیلی ہو جاتیں لیکن وہ اُس کے جذبات سے بے خبر کسی اور طرف دیکھتا رہتا۔

کبھی کبھی رخسار اُس کی عادت پر جھلا جاتی۔ عجیب پتھر کا انسان ہے۔ اس کے دل میں ارمان کی لہر اٹھتی ہے کہ نہیں؟ اس کے دل میں صنفِ نازک کے لئے جذبات ہیں کہ نہیں؟ اگر نہیں تو شادی کے بعد . . . کہیں ساری زندگی پیار کو ترسنا نہ پڑے اور گزرتے دنوں کے ساتھ یہ خیال اُس کے دل میں جڑ پکڑتا گیا۔ کیونکہ اُس نے بہت کوشش کی۔ وارفتگی کے عالم میں اُس کے شانے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیتی لیکن اس میں کوئی احساس نہ جاگتا۔ وہ آہستہ سے اُس کا سر اپنے شانے سے ہٹا دیتا۔

رخسار یہ کب تک برداشت کرتی؟ کب تک اپنے جذبات کا خون کرتی؟ کب تک الجھن میں رہتی۔ ایک دن اُس نے ہمت کی۔

"میں سمجھ گئی آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اگر محبت ہے تو پھر مجھے پیار کیوں نہیں کرتے ـــ؟"

کہنے کو تو وہ کہہ گئی لیکن شرم سے اُس کے رخسار گلنار ہوگئے دراز پلکوں نے گالوں پر چلمن کھینچ دی۔ وہ دوپٹہ کا آنچل انگلی میں لپیٹنے لگی۔

وہ کچھ دیر تک خاموش رہا۔ جیسے جواب دینے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ آخر گلا صاف کرکے بولا "میں نے زندہ رہنے کا ایک اصول بنایا ہے رخسار اور اُس اصول کو توڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جسے نہ میں نے کبھی دیکھا ہو نہ اس کی آواز سنی ہو نہ اُسے جانتا ہی ہوں جس کے بدن سے میری سانس بھی مس نہ ہوئی ہو۔ لیکن تم سے ملنے کے بعد میرا وہ اصول ٹوٹ گیا۔ لیکن اب بھی میں تمہارے بدن کو چھونے کی اس لئے جرأت نہیں کرتا کہ چھوتا بدن کہیں میری انگلیوں کے لمس سے میلا نہ ہو جائے۔ میں اس نازک بدن کو اُس وقت چھوؤں گا جب اس پر میرا اختیار ہو جائے گا۔"

رخسار کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور وہ شرما کر بھاگ گئی۔

اور وہ رخسار کو اس کا یقین دلا کر گھر آیا تھا کہ گھر پہنچتے ہی شادی کی بات چھیڑے گا

لیکن . . . آج وہ اُس کی شادی میں آیا تھا!

رخسار کی شادی میں اپنی بربادی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے اُسے اس ایک ہی خواہش کھینچ لائی تھی ـــــ وہ رخسار کو دلہن بنی دیکھے!

سُرخ جوڑے میں ملبوس، پھولوں سے لدی ہوئی، اس کی پیشانی افشاں سے چمک رہی ہوگی۔

اُس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس کے لئے اُسے کتنی روحانی اذیتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ اس کا سکون تو اُس دن ختم ہوگیا تھا۔

جب اُس نے سنا۔ رخسار کی شادی کلیم سے طے ہوگئی۔ برات ۱۰ اکتوبر کو آئے گی۔

اس خبر کو اس نے بہت سکون سے سنا۔ اس کی پیشانی پر ایک شکن بھی نہ تھی بالکل اُس سمندر کی طرح جس کے سینے میں ہزاروں طوفان مچلتے رہتے ہیں لیکن اوپر سے وہ پُرسکون رہتا ہے۔

اُس دن کے بعد۔ وہ راتوں کو نہ سو سکا۔ دن بے کیف ہوگئے۔ راتیں ناگن بن گئیں۔ تصور کی دنیا میں آگ لگ گئی لیکن اُس کے لب خاموش تھے ـــ ہاں اُس کی نظریں ضرور ویران ہوگئی تھیں۔ ان میں محبت کا کھنڈر صاف نظر آتا تھا۔ تھکی تھکی بجھی بجھی نظریں۔

اور پھر وہ اُس کی شادی میں شریک ہونے آیا سب کے منع کرنے کے باوجود!

اُسے تو صرف ایک تمنا تھی ــــــ رخسار کو دلہن بنے دیکھے۔ اپنی نہ بنا سکا۔ کسی کی سہی، دلہن تو بنے گی۔ سُرخ جوڑا تو پہنے گی۔ اس کی مانگ میں سیندور تو پڑے گا۔ اُسے رخسار کے

جسم سے نہیں اُس کی روح سے پیار تھا لیکن اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، روح کا اختیار بھی چھن رہا ہے۔

"آج چودہ اکتوبر کی رات ہے نا؟"

کل رخسار کی برات آئے گی؟ شہنائیاں بجیں گی، رخسار دلہن بنے گی، بابُل کے گیت گائے جائیں گے اور کلیم اُسے اپنی بنا کر لے جائے گا۔ وہ اپنی آنکھوں سے سب دیکھے گا کانوں سے سب سنے گا۔ برات بھی، شہنائیاں بھی اور میراثنوں کے گیت بھی۔ اچانک کسی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گرفت نرم تھی۔ فضا میں کسی کی معطر سانسوں کی خوشبو بھی پھیل گئی۔ لیکن وہ مڑا نہیں۔ آسمان پر چمکتی ہنسی ہنستے ستاروں کو دیکھتا رہا کیونکہ وہ اس لمس سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لمس کا اُسے سیکڑوں بار تجربہ ہو چکا تھا۔ سانسوں کی اس خوشبو سے وہ مدہوش ہو جاتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ رخسار کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال ہوگا۔

تم نے جو کچھ کیا، کیا اسی کو محبت کہتے ہیں؟ اسی محبت کا تم دعویٰ کرتے تھے؟ بتاؤ گھر جا کر تم کیوں خاموش ہو گئے؟ میری شادی کا ذکر سن کر بھی تم نے کچھ نہیں کہا۔ کیوں، کیوں؟ آخر کیوں؟!

اور وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔

اس لئے وہ نہیں مڑا۔ رخسار سے نظر ملانے کی اُس میں ہمت بھی نہیں تھی۔ رخسار کا بھیگا ہوا چہرہ۔ بکھری ہوئی زلفیں، سرخ ڈبڈبائی آنکھیں، کانپتے لب۔ کیا وہ اُس کی طرف دیکھنے کی ہمت رکھتا ہے؟

لیکن اب رخسار اُس کے پاس کیوں آئی ہے۔ رات کے وقت تنہائی میں ایک غیر کے پاس۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ......؟

"سنئے"۔ رخسار کی آواز میں سکڑوں ٹوٹے ستاروں کی کراہ تھی۔ اُسے رُخ بدلنا پڑا۔ رخسار اُس کے سامنے کھڑی تھی، لیکن کیا وہی رخسار ہے جس سے وہ محبت کرتا تھا جسے پوجتا تھا۔ یہ تو صرف سایہ تھا رخسار کا سایہ! زرد پھیکا چہرہ، ڈبڈبائی ہوئی بے نور آنکھیں، کانپتے ہوئے خشک لب۔ اُس نے سفید غرارہ اور جمپر پہن رکھا تھا۔ گلے میں سیاہ دوپٹہ تھا جس نے سوگواری کو اور نکھار دیا تھا۔ رخسار کی یہ حالت دیکھ کر اُس کا دل تڑپ اٹھا۔ روح لرز گئی۔ اس کا دل چاہا رخسار کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کی آنکھوں کے سارے موتی پلکوں سے چُن لے ... لیکن اُس نے جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ سر جھکائے مجرم بنا اُس کے سامنے کھڑا رہا۔

"اب وقت تو نہیں ہے کل برات آ رہی ہے مگر ..." رخسار پل بھر کے لئے رُکی پھر بولی: "اگر آپ اب بھی شادی کے لئے ہاں کہہ دیجئے تو خدا کی قسم میں شادی سے انکار کر دوں گی چاہے اس کے لئے جو ہو۔ بولئے خدا کے لئے بولئے۔ آپ کو میری محبت کی قسم بولئے!

"میں انکار کر دوں؟" اُس کی آنکھوں نے موتی گالوں پر ڈھلکا دئے۔ لیکن وہ پھر بھی نہ بولا! نظریں جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

"آپ دنیا میں اپنی ماں کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں، میں ماں کی قسم دیتی ہوں بتا یئے کون سی بات ہے کہ آپ نے مجھے ٹھکرا دیا؟" رخسار نے ... آگے ہاتھ جوڑ لئے خدا کے لئے بتا دیجئے میں باور نہیں کر سکتی کہ آپ مجھے دھوکا دے ... آپ کے متعلق میں نے بہت کچھ سنا ہے لڑکیوں سے دل بہلانا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ نے دھوکا نہیں دیا۔ کسی مجبوری نے آپ کو ... رکھا ہے آپ کی زبان جکڑ رکھی ہے۔ بتا یئے آپ کو اپنی ماں کی قسم!"

اور اُس پر تشنجی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں موند لیں مٹھیاں بھنچ گئیں جسم میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اُس نے دانت پر دانت اس سختی سے رکھے کہ جبڑے اُبھر آئے۔

کچھ دیر تک وہ اعصابی کشمکش میں مبتلا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ پُرسکون ہو گیا جسم کا تناؤ کم ہوتے ہی اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سُرخ سُرخ ڈراؤنی آنکھیں!

تم نے ٹھیک سمجھا کہ ماں سے زیادہ میں نے کسی کو نہیں چاہا۔ اُس کا لہجہ بہت پُرسکون تھا۔ میری ماں نے میرے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ کون کون سی تکلیفیں نہیں اٹھائیں۔ میں اُن کی خوشی پر اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا ہوں لیکن ...... اس معاملے میں اُن کی قسم نہ دو۔ ایک مقدس ہستی کو درمیان میں نہ لاؤ۔ میں گنہگار ہوں تمہارا۔ خدا کا ... تم نے سچ کہا تھا کہ میں لڑکیوں سے دل بہلاتا ہوں اور سن لو کہ میں تم سے دل بہلاتا رہا ہوں تم سے مجھے کبھی محبت نہیں رہی تھی۔ وہ سب تو کھیل تھا میری محبوب تفریح!

وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں خاموش تھے۔

دونوں کی سانسوں کی آوازیں فضا میں گھل رہی تھیں۔ تیز تیز چڑھتی سانسیں!!

دونوں کے دلوں میں ہیجان برپا تھا

اور اچانک ہی رخسار کی بھیگی آنکھوں میں بجلیاں بھر گئیں۔ زرد رخسار غصے سے تمتما اٹھے ......!

"درندے اگر تو نے میرے ساتھ یہ کھیل نہ کھیلا ہوتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا؟" وہ زخمی ناگن کی طرح بپھر گئی۔ "تجھے کیا معلوم کہ تیرے اس کھیل نے میری زندگی میں کون سا انقلاب لا دیا ہے، ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جسے تیری نفرت سے بھی پُر نہیں کر سکتی میں نے زندگی میں بہت سارے غم سہے ہیں۔ کاش تجھے اپنا کلیجہ دکھا سکتی! بچپن سے غم سہتے سہتے چھلنی ہو گیا ہے چھلنی! اور تو نے اس کے سوراخوں میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مگر کیا بگڑ جاتا تیرا۔ اگر میرے ساتھ ایک کمتر حقیر لڑکی کے ساتھ فریب نہ کرتا۔

"بتا اس نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟"

اس نے گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا لیکن وہ پتھر کی مورت کی طرح کھڑا رہا۔ اس نے اس کا گریبان بھی نہیں چھوڑا۔

رخسار کہتی گئی، جو کچھ اس کے منہ میں آیا۔ پھر وہ رو پڑی۔ پھوٹ پھوٹ کر ایک معصوم بچی کی طرح جس کا سارا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر روتی رہی۔

اس نے بھی رخسار کو رونے سے نہیں روکا۔ چپ چاپ کھڑا اسے اپنی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بڑا ادھ بھاری قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

جب رخسار کے آنسو تھمے تو اس نے نفرت سے اس بند دروازے کو دیکھا جس میں ایک انسان نما درندہ بند تھا۔ پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے زینے کی طرف بڑھی۔

لیکن کمرے کے دروازے پر اس کے قدم رک گئے۔

کمرے میں وہ سسک رہا تھا۔

"ماں! کاش تو نے میرے لئے تکلیفیں نہ اٹھائی ہوتیں؟ وہ مجھے نہ پالا ہوتا، کاش تو نے جنم نہ دیا ہوتا! کاش رخسار تجھے ناپسند نہ ہوتی؟؟"

غزلیں

سید یزدانی جالندھری

اک سمت صدا دیتے ہیں پتھر کے صنم بھی
اک سمت عناں گیر ہے محرابِ حرم بھی

دیکھیں کہ ملے دیتے ہیں یاں دولتِ غم بھی
بیٹھے ہیں تری بزم میں کچھ سوچ کے ہم بھی

اسرارِ دو عالم ہیں اسی کوزۂ دل میں
اس جام سے ٹکرا نہ سکا ساغرِ جم بھی

ہر رنگ ہے سب باعثِ تسکینِ دل و جاں
اندازِ ستم بھی، ترا اندازِ کرم بھی

دعوے تو بہت تھا رفاقت کا جنہیں دشتِ وفا میں
وہ چل نہ سکے ساتھ مرے چار قدم بھی

کچھ سوچ کے اے منزلِ جاناں کے مسافر
اس راہ میں دیکھیں گے تجھے دیر و حرم بھی

وہ مغفلِ دنیا ہو کہ ہو عرصۂ محشر
جو لوگ بچھڑتے ہیں وہ ہوتے ہیں بہم بھی

یزدانی ملا تجھ کو جو اس دشتِ طلب سے
وہ اپنی امیدوں سے زیادہ بھی ہے کم بھی

رشی پٹیالوی

اشکوں میں خونِ دل کو سلیقے سے ڈھالیے
مسرت سمجھ کے حسرتِ گریہ نکالیے

دامن بچائیے کہ یہاں "اپنے لوگ" ہیں
"اپنوں" میں احتیاط سے دامن سنبھالیے

بیٹھے ہیں زندگی کے تقاضوں کو ٹال کر
کیوں کر محبتوں کے تقاضوں کو ٹالیے

اُن کی نظر کا وار ہے غارت گرِ تمام
دل کو بچائیے کہ نظر کو سنبھالیے

دل بجھ گیا ہوا کے ارادے کچھ اور ہیں
نکلے تھے ہم خلوص و وفا کا دیا لیے

جو بھی ملا ہمیں وہ قتیلِ وفا ملا
کس کس کے دل سے خارِ الم کے نکالیے

اے ذوقِ انتظار یہاں کون آئے گا
کس کا خیال یاد کے دامن میں پالیے

بڑھتا گیا ہمارے سوالوں کا سلسلہ
بنتے گئے جواب کسی کے "سوا لیے"

تھا انحصار جن پہ بیان و کلام کا
وہ لفظ داستاں کے ہمیں نے چھپا لیے

جاتے کہاں وہ ہم کے تصور سے اے رشی
دل سے نکل گئے تو خیالوں نے جا لیے

صُوفی اور قلندر

_______ بلدیو شانت ایم۔اے

۴/۵۹۲۔ نیتاجی نگر۔ نئی دہلی

قبلہ خورشید صاحب!

آپ کو شاید یاد ہو کہ ٹیلیفون پر آپ سے کئی بار گفتگو ہو چکی ہے۔ کبھی گھر پر، کبھی دفتر میں، کبھی پریم وار برٹنی کے سلسلے میں، کبھی ایسے، کبھی ویسے۔ لیجئے حضور! اب بذریعہ خط بھی گفتگو کیجئے _______ کہانی پیش خدمت ہے۔ اگر آپ کو پسند آگئی تو میں خوش قسمت ہوں گا _______ کہانی کیسی ہے؟ اس کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ آپ اردو ادب کے لئے کیا کر رہے ہیں اس کے متعلق بھی کچھ نہ کہوں گا۔ کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کر لیجئے گا . .

نیازمند _______ بلدیو شانت

کار کے شارٹ ہوتے اور پروفیسر رام آسرے کی پتنی تھا، دونوں کی آواز ساتھ ہی ہوا میں اُبھری۔ کار کی صرف آواز تھی کوئی لفظ یا الفاظ نہ تھے۔ پہلو والی آواز کہہ رہی تھی۔

"سنو، سنو تو۔ ایکا ایکی کہاں چلے۔ چل دئے؟" لیکن رام آسرے نے ان الفاظ کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس زنانہ الفاظ کا طوفان ہی بند کیا اور تیزی سے باہر نکل آیا ایکا ایک۔ نہ جانے کیسے اُس کے ذہن میں 'غبارِ خاطر' کا باب 'چڑیا چڑے کی کہانی' گھس آیا۔ ایک چڑا تھا 'صوفی' دوسرا 'قلندر'۔ پہلا چڑا آنکھیں مُوندے اپنی ہی دُنیا میں مست پڑا رہتا جیسے مسجد میں کوئی مولوی پُجاری۔ آزاد نے اُس کا نام صوفی رکھ دیا۔ قلندر ادھر سے اُدھر پُھدکتا رہتا۔ کبھی روزن میں، کبھی دریچے پہ، کبھی اِس طاق پہ، کبھی اُس طاق پہ۔ جو چڑی راستے میں ملتی اُس کی کمر پہ ٹھونگے لگاتا۔ پھر دیں گھُس گھُس جاتا۔

کوٹھی سے ٹھیک ایک فرلانگ دُور کار رُکی۔ پروفیسر نے چشمہ لگایا، بال کھُجائے۔ کار شارٹ تھی لیکن کھڑی تھی۔ وہ جھنجلاہٹ میں بڑبڑانے لگا _______ یہ گھر کتنی ویران ہے اور زندگی کس قدر بے کل ہے۔ شوبھا تو ماں بیوی تو یہ چاہتی ہے کہ وہ بس اُس کی لٹ کا بال بن کر رہ جائے۔ نہ کسی سے ملے نہ کہیں جائے صرف اُس کے رشتے داروں میں گھرا رہے۔ آج فلاں کی سالگرہ ہے، کبھی دی جائے آج ڈھماکے کی پارٹی ہے، نرالی سائیکل لے دو۔ یہ کرو وہ نہ کرو۔ یہ کھاؤ وہ نہ کھاؤ۔ مانا کہ اُس کی آمدنی اچھی ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب تو نہیں۔ وہ محنت کرتا ہے، کماتا ہے، کہانیاں اور ڈرامے لکھتا ہے لیکن ایک ایک لفظ کے لئے ایک ایک بُوند خون کی تو درکار ہے۔

کار چل دی۔ اُس کے خیالات بھی کار کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ [illegible] سے تو وہ کنوارا ہی اچھا تھا۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ اب شوبھا بیوی ہی کو لو۔ اُس نے خوب دیکھ بھال کے شادی کی تھی۔ [illegible] آزادی ہی کو چھین لینا چاہتی ہے، مجھے قیدی بنانا چاہتی ہے۔ پھر [illegible] آگیا۔ وہ گھوڑی پر دُولھا بنا جا رہا ہے۔ وہ خوش ہے۔ [illegible] اُس کے بیاہتا دوستوں نے کہا تھا: دوست! اب [illegible] مُسکراہٹ ہوتی ہے۔ اُس نے پوچھا تھا [illegible]؟ [illegible]

ہوسکتا ہے؟

[illegible] ٹشکا [illegible] اُس نے [illegible] _______ پینتیس برس کی عمر میں بھی اُس کا چہرہ کتنا صاف ہے۔ بغیر جھُرّیوں کے۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے۔ اُس کے جبڑے اب بھی مضبوط ہیں۔ اُس نے تیسری بار شیشے میں دیکھا۔ اُسے اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کتنا خوبصورت معلوم ہوا۔ اسے چاہِ ذقن کہتے ہیں۔ کئی شاعروں نے چاہِ ذقن کی تعریف میں شعر کہے ہیں۔ اگر یہ گڑھا کسی عورت کے ہو تو کئی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

لہذا سمجھتی ہے اب اُس کی عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ اُسے کیا معلوم اب بھی کئی لڑکیاں اُس سے پیار کرنے کے لئے بیقرار ہیں۔

رنجنا ہی کو لو اُس کی کلاس فیلو خوبصورت یوں۔ کتنی بار اُس سے کار میں سیر کرنے کی فرمائش کر چکی ہے۔ لیکن اُس نے کبھی اسے لفٹ دی ہی نہیں۔ یونہی ٹالتا رہا کل ہی اُس نے کہا تھا [illegible] یونیورسٹی کی اُس چڑھائی پر وہ اُس کا انتظار کرے گی اور [illegible] دیکھنا پروفیسر زیادہ انتظار نہ کرانا دیر [illegible]

آج [illegible] آخر اُس نے جانے کا ارادہ کینسل ہی کر دیا [illegible] کے تعلقات قائم نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ سب [illegible] جھگڑا [illegible] کے اوپر [illegible] وہ [illegible] کتنی شدت سے [illegible]

- [illegible] کو تلاش [illegible] حضرت حوث پاک
- [illegible] رہنے کی کوشش کرو۔
  (حضرت حوث پاک)
- [illegible] لیکن بے اعتدالی سے بچو [illegible] مصیبت کا [illegible] دنیا کا بے اعتدالی سے استعمال ہے۔
  (قرآن پاک)
- [illegible] روحانی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت [illegible] نہیں کر سکتی۔ (قرآن پاک)

[illegible]

[illegible] لیکن اُس کے خیالات کا سلسلہ ابھی ٹوٹا نہ تھا اور [illegible] اگر [illegible] عورتوں کی مسکراہٹ دل بہلانے [illegible]

[illegible] اُس کا دھیان پڑ گیا۔ اُس نے اپنے آپ ہی سے کہا۔ [illegible] وہ تو لڑکی ہے [illegible]

[illegible] لیکن رنجنا [illegible] کوئی [illegible] لڑکی نہیں پھر بھی [illegible] ہے۔ چہرے کے نقوش میں [illegible] بال بھی خوبصورت ہیں۔ [illegible]

اور پھر اُس میں شوخی کتنی ہے جو خواہ مخواہ صوفی منش تک کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اُس دن کلاس میں جب وہ لیکچر دے رہا تھا اور جہانگیر اور نور جہاں کا ذکر کیا تھا اور اُس کی خوبصورتی کو سراہا تھا تو اُس نے فوراً سوال کر دیا تھا۔

"پروفیسر صاحب، آپ تک بستوریتر نور جہاں کی تعریف کرتے ہیں کیا آپ سمجھا سکتے ہیں کہ وہ واقعی کتنی خوبصورت تھی؟ کیا ہماری اِس کلاس میں کوئی ایسی لڑکی ہے؟" اس سے کوئی مناسب جواب نہ بن پڑا تھا۔ پھر جس دن اُس نے شاہجہاں اور ممتاز کی محبت کے متعلق لیکچر دیا تھا تو کلاس سے نکلتے ہی رنجنا نے اکیلے میں سرگوشی میں پوچھا تھا "پروفیسر صاحب! کیا آپ اپنی محبوبہ کے لئے کوئی ایسا کام کر سکیں گے جو اُسے ہمیشہ زندہ رکھے؟" اُس نے مسکراہٹ دبانے کے لئے جواب دیا تھا "پھر کبھی بتاؤں گا۔" ابھی مجھے کام ہے۔" آج وہ سب کچھ اُسے بتا دے گا۔ اُس کے ہاتھ میں پھول دے کر کہے گا۔ "تم میری نور جہاں ہو رنجنا!"

وہ ساڑھے چار بجے منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ رنجنا ابھی تک نہ آئی تھی۔ وہ خیالوں میں گم اُس کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اُس نے اپنی ہی لکھی ہوئی گائیڈ اُٹھالی۔ اُسے پڑھتا جاتا۔ بیچ میں کہیں کہیں نشان لگاتا جاتا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس طرح نشان لگانا بے معنی ہے۔ پھر بھی وہ نشان لگاتا رہا۔ کتاب کا ورق اُلٹتے وقت ذرا سی بھی کھڑکھڑاہٹ ہوتی اُسے محسوس ہوا رنجنا آگئی ہے!

لیکن پانچ بجے تک بھی نہ آئی۔ اُس نے سوچا چلو رام آسرے ڈیپو آج رنجنا کو ایک ساڑی کا تحفہ ہی دے ڈالو۔ مستقبل کے لئے یہ تحفہ مہنگا نہ رہے گا لیکن اگر وہ بعد میں آگئی تو؟ تو کوئی بات نہیں۔ چھ بجے تک تو وہ انتظار کرے گی ہی۔ اُس نے خود ہی تو کہا تھا۔ ایک دوسرے کا چھ بجے تک انتظار کرنا تھا اور اُسے دیر ہی کتنی لگے گی پچیس تیس منٹ میں تو وہ چاندنی چوک سے لوٹ کر آہی جائے گا۔

پروگرام کوئی طے شدہ نہیں تھا۔ کہاں جانا تھا۔ اُسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ کہیں گھومنے کے لئے جانا ہے۔ اُس نے راستے میں سے بیس لیٹر پٹرول ڈلوا لیا۔ لِنگ ریسٹورنٹ کے سامنے ایک چھوٹا سا کار پارک ہے۔ وہیں پر اُس نے کار پارک کی۔ آگے کا راستہ اُس نے پیدل ہی طے کیا۔ ساڑیوں کی دُکان تک پہنچتے پہنچتے اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رنجنا کے گندمی رنگ پر پیازی رنگ کی ساڑی بہت میچ کرے گی۔ اُس نے لکھنؤ چکن ورک کی ساڑی خریدی جو بیاسی روپے میں آئی۔ وہ پلٹا۔ رنجنا کو وِنگ ریسٹورنٹ کی کچوریاں کھانے کا بھی تو شوق ہے۔ کہیں یہیں نہ گھسی بیٹھی ہو۔ بے پروا بھی تو ہے۔ اُس نے اسی خیال سے ریسٹورنٹ کے اندر اور باہر جھانکا لیکن اُس کی نظریں خالی لوٹ آئیں۔ اُسی ریسٹورنٹ کے سامنے پھول والوں کی کچھ دُکانیں ہیں۔ وہاں سے اُس نے رنجنا کے بالوں میں ٹانکنے کے لئے ایک خوبصورت پھول خریدا۔ اُسے کیلے کے پتے میں بندھوایا اور

تیزی سے پلٹ پڑا۔ اُس نے سوچا تھا رنجنا اب تک ضرور آگئی ہوگی لیکن وہ ابھی تک نہ آئی تھی۔ آئی ہوتی تو ضرور ہی اُس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ ساڑھے پانچ بج گئے تھے۔ اب تو صرف آدھا ہی گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ کہیں نزدیک ہی آتی ہوگی۔ لیکن وہ طے تک آگئی ہوتی تو سیر و تفریح کے لئے ذرا زیادہ وقت ملتا۔ پھر وہ اپنے آپ ہی پروگرام بنانے لگا۔ وہ اُسے سیر کے لئے کہاں لے جائے گا؟

پہلے تو کہیں کافی یا چائے پئیں گے۔ کتنے اچھے ریسٹورانٹ ہیں۔ کشمیری گیٹ پر ٹیک کیفیٹیریا ہے یا پھر وینگر یا ایمبیسی میں بھی تو جایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اُسے کہاں لے جائے؟ کار تو اُس کے پاس ہے ہی۔ وہ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ ذرا ذرا اندھیرا ابھی پھیل چکا ہوگا۔ گاڑی اپنی اور دُھندلکا! وہ ذرا بھی جلدی نہ کرے گا۔ دھیرے دھیرے اُس کی طرف جھکے گا۔ کہیں وہ یہ نہ سوچے پروفیسر یکدم بیتی ہے۔ لیکن آخر اُسے کدھر لے جایا جا سکتا ہے؟ وہ خود ہی سوال کرتا تھا اور خود ہی جواب دیتا تھا۔ کبھی رام آسرے تو ترکیب ہے۔ یہاں گاؤں کے آگے چھوٹے چھوٹے کھنڈر ہیں وہاں چلا جائے گا یا مہرولی تک۔ ادھر گرد کافی کھنڈرات پڑے ہیں۔ سنا ہے وہاں بھی تو شوقین مزاج لوگ جایا کرتے ہیں۔ یہاں روڈ پر یا واپا ڈرینک کے نزدیک بھی تو جگہ ویران سی پڑی ہے۔ صرف کسی مدراسی بابو کا ایک مرغی خانہ ہے۔ مرغی کے نام سے اُسے یاد آیا کہ اُس کی مرغی تو ابھی آئی ہی نہیں۔ جس کے گھنے اور ریشمی بالوں میں اُسے گلاب کا پھول ٹانکنا ہے۔ جیسے اُسے پیازی رنگ کی ساڑی تحفتہً دینا ہے۔ آہا! مزہ ہی مزہ ہے!! اور اوما وہ جیسا کرتی ہے دیا جھے۔ گھر میں مرے رہے۔ اُس نے رنجنا کے لئے دائیں ہاتھ سے ایک بوسہ ہوا میں اُچھال دیا اور اوما کے لئے بائیں آنکھ بند کر لی۔

اچانک اُس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ چھ بج چکے تھے۔ وہ ابھی تک مایوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب جو بھی لمحہ گزرتا اُس کی اُداسی اور مایوسی میں اضافہ کرتا جاتا۔ پھر بھی اُس نے پانچ دس منٹ کا مزید انتظار احتیاطاً ضروری خیال کیا۔ دیر ہونے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ جو بھی سکوٹر گزرتا وہ بے چینی سے اُدھر نظریں گھما دیتا۔ اگر کوئی ٹیکسی آتی تو گھور گھور اندر جھانکتا جیسے اُس کی نگاہیں شیشوں کو چیر کر اندر کی تصویر کھینچ لیں گی۔ لیکن اُس کا یہ سارا پروگرام سارا انتظار اکارت گیا۔ اب سوا چھ بج چکے تھے اور رنجنا ابھی تک نہ آئی تھی اور اُس کے ذہن نے خود ہی کہا: اب آنے کی اُمید بھی نہیں۔ وہ اسٹیرنگ پر آبیٹھا اور کار کو سٹارٹ کئے بغیر اسٹیرنگ کو اِدھر اُدھر گھمانے لگا۔ آخر وہ چل ہی دیا۔ مایوس سا، بے دل سا، ہارا ہوا سا۔ اپنی ہی پیدا کی ہوئی سجاوٹوں میں گھِرا ہوا سا۔

وہ مایوسی سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ڈھلان سے اُترتے اُترتے کار کی رفتار اپنے آپ ہی تیز ہو گئی۔ یونیورسٹی کے بڑے گیٹ سے مُڑتے ہوئے اُسے دُور ہی سے رنجنا نظر آگئی لیکن کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ۔ وہ اُس نوجوان کو نہیں جانتا تھا۔ ایک آواز کے ساتھ پاؤں زور سے ایکسیلیٹر پر پڑا۔ کار کی رفتار اور تیز ہو گئی لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ رنجنا نے بھی اُسے دیکھ لیا اور ہاتھ کے اشارے اور اونچی آواز سے اُسے رُکنے کو کہا۔ کار ایک لمبی چیختی ہوئی آواز پیدا کر کے رُک گئی۔ رنجنا دوڑتی ہوئی اِدھر ہی طرف ہی آرہی تھی۔

"I am so sorry professor" اُس نے کار کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی کہا۔ نوجوان بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہی آ رہا تھا۔ رنجنا نے اپنی بات پھر دُہرائی۔
"I am so sorry professor" میں لیٹ ہو گئی۔

اب نوجوان بھی اُن کے نزدیک آچکا تھا۔ رام آسرے نے ایک ہی نظر میں اُسے دیکھا۔ رنجنا نے اب اُن کا تعارف ضروری سمجھا۔

- محض اشنان سے کیا ہوتا ہے جب دل میلا ہے۔ مچھلی سدا پانی میں رہتی ہے لیکن اُس کی بُو باس نہیں جاتی۔ (کبیر داس)
- جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اُسے مانگنے پر بھی رحم نہیں ملتا۔ (مہاتما بدھ)
- دوستی کا چراغ خود غرضی کی آندھی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ (ٹھاکر سری چند جی)
- تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں بھلائی سے یاد کریں تو دوسروں کو بُرا نہ کہو۔ تم خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش دیکھ کر حسد نہ کرو۔ (بھگت کبیر داس)

"بکرم! یہ ہیں پروفیسر رام آسرے میرے ہسٹری کے [illegible] پروفیسر صاحب! یہ بکرم ہیں۔ کافی دنوں سے کہیں باہر تھے۔ آج اچانک یونیورسٹی میں [illegible] آ گئے۔"
"He is dear to me professor"

رام آسرے نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا ہاتھ اُس کی طرف [illegible] پھر اُس نے اُن دونوں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اپنا ہاتھ جو ابھی [illegible] 'Good Luck' رنجنا کہتے ہوئے کار کو فوراً گیئر ہی سے پورا ایکسیلیٹر دے کر آگے بڑھا لیا۔ گاڑی نے یکدم سپیڈ پکڑ لی۔ تیز اور تیز! اُس کا پاؤں مضبوطی سے ایکسیلیٹر پر جمتا گیا۔ وہ گھر کو لوٹنے کی بجائے سیدھا کشمیری گیٹ چلا گیا۔ جلدی جلدی میں پرانی سائیکل خریدا اور تیزی سے گھر کی طرف پلٹ پڑا۔

وہ اُسی تیز رفتاری سے کار کو سیدھا گیراج تک لے گیا۔ اوما جو بے چینی سے

[illegible] اُس کی آواز [illegible]

[illegible] ساری شام بور ہوتی رہی۔ میں نے [illegible]

رام آسرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے اوما کو بہت ہی پہلے دیکھا جو اب [illegible] ہو گئی تھی۔

"نہیں۔ [illegible] تو ہوتا ہی رہتا ہے۔" [illegible] اپنا ہاتھ پیار سے رکھتے ہوئے [illegible]

رام آسرے کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا سارا جسم [illegible] رہا تھا۔ جیسے [illegible] کے اندر گوشت نہ ہو، ہڈیاں نہ ہوں، خون، آنتیں اور دل نہ ہو [illegible] ہوئے کپڑے بھرے ہوں۔ [illegible] اُس نے چھوٹی کار کی بیرونی بتّیاں گُل کیں پھر اندر کی [illegible] میں ابھر آیا۔ گھبراہٹ میں بالوں کی [illegible] اپنی صورت

بھیانک سی محسوس ہوئی۔ اوما کی آنکھیں کتنی نشیلی تھیں۔ اُس کے [illegible] مدّھم سا گلابی پھول کتنا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ رام آسرے نے [illegible] نکالتے ہوئے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"اوما! میں گھبرا گیا ہوں۔ مجھے سخت پیاس لگی ہے۔"

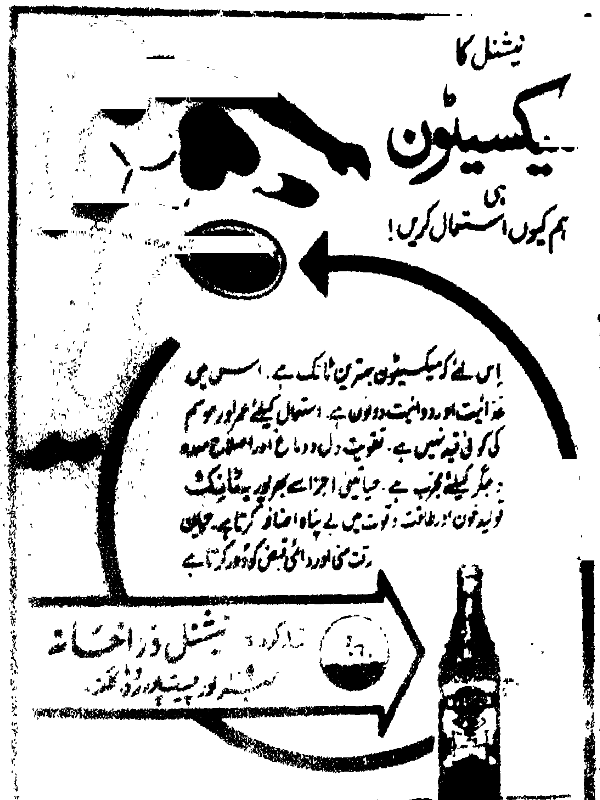
اوما نے فوراً اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا: "ہاں تم تو تپ رہے ہو! [illegible] پانی لائی یہیں!"

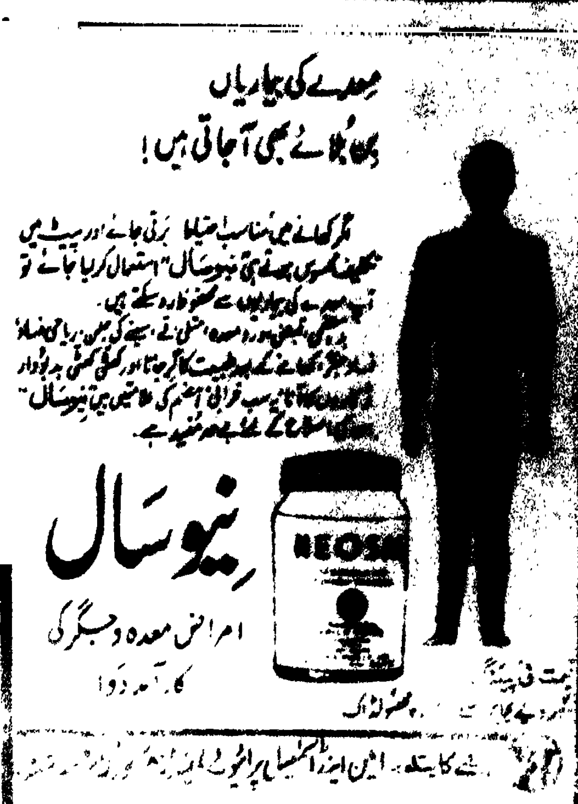
"نہیں۔ رُکو!" رام آسرے نے اوما کی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "تم اپنا چہرہ اندر کر دو۔" اوما نے اپنا چہرہ اندر کر لیا۔ "اپنا منہ میرے نزدیک لاؤ" [illegible] اُس کے نزدیک لے گئی۔ "اور نزدیک! اور نزدیک!" اور پھر ——

پھر اُس نے اندر کی بتّی جلا دی۔ پیپل کے پتّوں میں لپٹا ہوا ایک خوبصورت پھول نکالا۔ اُسے اوما کے بالوں میں سجا دیا۔

"میں تمہارے سندر سے کہ بغیر چل سکوں گا اوما! چلو آؤ تھوڑی دیر [illegible] میں چلیں گے۔ دیکھو میں تمہاری سائز کے لے آیا ہوں۔ تمہیں پسند ہے نا! یہ دیکھو!" اُس نے اپنی گردن کو پیچھے موڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں نے سارا کینسل کر دیا ہے۔ جب کام سے [illegible]





[illegible]

وسیم آہستہ غسل خانے کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے اور باہر آتے ہوئے کہا: ہاں خالہ سے لکھنؤ چکن ورک کی ایک ساڑی بھی لیا ہوں، پیازی رنگ کی۔ تمہارے پاس تھی بھی تو نہیں۔"

"ارے کتنی پیاری ہے!" [illegible] کاغذ کو ہٹاتے ہوئے کہا، وسیم آہستہ سے [illegible] کے بازو جیسے [illegible] باز و ڈال کر اس نے پہلے اندر کی طرف چلتا چلا گیا۔

"میں تو کہتا ہوں تھوڑی دیر میں چل ہی دیں گے پھر پرانی سائیکل ہی تو ہے۔ یہ کس کام آئے گی؟"

"ابھی پڑی رہنے دو، ذرا سستی اور دن تو کام آ ہی سکتی ہے" [illegible] کے کسی پہلے [illegible] مسکرا دی۔ اس بات سے [illegible] کے [illegible] میں جو [illegible] پیازی رنگ کی ساڑی [illegible] کیا ہے!!

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

غزل

نیّر قریشی گنگوہی

خود کو عکسِ نگہِ ناز بنا لیتے ہیں
جب وہ پردہ رُخِ روشن سے ہٹا لیتے ہیں

عمر بھر راس اُنھیں آتی ہے گلشن کی فضا
آشیاں برق پر اپنا جو بنا لیتے ہیں

ہم تو بیٹھے ہیں سرِ راہ مسافر کی طرح
ہم کو کیوں چھیڑتے ہو آپ کا کیا لیتے ہیں

یہ تو ہے اُن کی اِک ادنیٰ سی فسوں سازی
جس کو چاہیں اُسے دیوانہ بنا لیتے ہیں

جب تصور پہ گراں ہوتی ہے تنہائیِ غم
تیری تصویر کو سینے سے لگا لیتے ہیں

حسنِ معصوم کی پلکوں پہ لرزتے آنسو
بزم کو انجمنِ طور بنا لیتے ہیں

رشک کرتا ہے مقدر پہ زمانہ اُن کے
جو ترے دامنِ رنگیں کی ہوا لیتے ہیں

ہم کو منظور نہیں ہے ترے غم کی توہین
اشک بہتے ہیں تو پلکوں میں چھپا لیتے ہیں

زندگانی کے ہر اِک خوابِ پریشاں کو ندیم
ہم تو بیگانۂ تعبیر بنا لیتے ہیں

پھول تو پھول ہیں اے روحِ چمن، جانِ بہار
ہم تو کانٹوں کو بھی سینے سے لگا لیتے ہیں

پھول چننے کی تمنا میں ہم اکثر نیّر
راہِ پُر خار کو گلزار بنا لیتے ہیں

غزل

محبوب راہی بلیکانوی

کچھ ایسے گزاری ہے ہم نے شبِ تنہائی
چاہا تو بہت لیکن نیند آئی نہ موت آئی

کیا کام تمہیں آخر ہم دشت نوردوں سے
تم کرتے رہو بیٹھے بس انجمن آرائی

اے رشکِ چمن تیرے اِس عارضِ گلگوں پر
غنچوں سی ہے شادابی پھولوں سی ہے رعنائی

ایک آن میں گر جاتی ہیں ضبط کی دیواریں
جس وقت کہ لیتے ہیں وہ جھوم کر انگڑائی

دستور نہ کچھ پوچھو دنیا سے محبت کا
جیتے ہیں تو بدنامی مرتے ہیں تو رسوائی

وہ سامنے آکر جب نظروں سے ہوئے اوجھل
کوندا سا کوئی لپکا اک برق سی لہرائی

جو عزم نہیں رکھتے حالات بدلنے کا
وہ وقت کی چوکھٹ پہ کرتے ہیں جبیں سائی

ہر درد کے سہنے کو ہر غم کے اُٹھانے کو
زندہ ہے ابھی دل میں احساسِ توانائی

اے جذبۂ حق گوئی تو دل میں رہا جبتک
غیروں سے تو کیا اپنی اپنوں سے نہ بن پائی

میدانِ سخن میں کچھ کرنا ہے اگر راہی
افکار میں پیدا کر آفاق کی گیرائی

لبِ یار کی خوشبو

شمیم سیفی ایم۔ اے۔ بی۔ ایل

بنگالی ٹولہ، لہریا سرائے۔ دربھنگہ

محترم بھائی! تسلیم

"مسیحا" کو لوگوں نے پسند بھی کیا اور کچھ لوگ اُس پر ناراض بھی ہوئے۔ بہرحال میں سب کا ممنون ہوں ؎

دُشنامِ دوست طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا

لیجئے! اِس بار بہت پیاری کہانی بھیج رہا ہوں۔ پتہ نہ آئے اِس کی کوئی وجہ نہیں — تیر کا یہ شعر ؎

کس کی مسجد کیسے میخانے کہاں کے شیخ و شاب — ایک گردش میں تری چشمِ سیہ کی سب خراب

بہت دنوں تک ذہن پر چھایا رہا اور پھر میں نے یہ کہانی شروع کر دی اور پھر جب یہ کہانی مکمل ہو گئی تو میں نے اِسے پڑھا، بار بار پڑھا اور یہ فیصلہ کیا کہ اِسے آپ کو بھیج دوں — میرا ایک عزیز دوست ہے شوکت خلیل افسانہ نگار ہے۔ اُس نے مجھ سے پُوچھا: "آپ جب کوئی نئی کہانی لکھتے ہیں تو سب سے پہلے "بیسویں صدی" اور خوشتر صاحب کو بھیجتے ہیں۔ کیوں؟" — میں نے کہا "یہ ایک جادُو کا اثر ہے۔ خدا کرے وہ جادُو تمھارے سر بھی چڑھ کر بولے!"

شاید افسانہ نمبر کے لئے یہ کہانی کچھ دیر سے پہنچے۔ پھر بھی اگر کچھ بھی گنجائش ہو تو اُسی میں شامل کر لیجئے . . .

آپ کا — شمیم سیفی

اور اُسے یہاں بھی شانتی نہ ملی۔ جس چیز سے وہ دُور بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ اُس نے اُس کا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا تھا۔ مندر کی پاک اور پُرسکون فضاؤں میں وہ خیال اُس کے گرد منڈلاتا رہا تھا۔ گھنٹوں کی آواز کی بازگشت میں اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی جانی پہچانی نغمہ ریز آواز اُس کا پیچھا کر رہی ہو۔ دُھوپ اور عود کی خوشبو اور بھگوان پر چڑھائے ہوئے پھلوں اور پھُولوں کی تیز بُو کے دبیز پردے کو چاک کر کے وہ جانی پہچانی خوشبو اُس کے سارے وجود پر چھائے جاتی محسوس ہوتی اور اُس کا جسم کانپنے لگتا۔ اُس کی آنکھیں جلنے لگتیں۔ کرشن کی مُورتی اُسے نظر نہ آتی۔ اُس کی آنکھوں میں صرف رادھا سمائی رہتی۔ بھگوان شیو اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے اور وہ صرف پاربتی کو اپنے سامنے پاتا۔

ہر روز کی طرح اُس روز بھی جب اُس نے پُوجا ختم کر کے اپنی آنکھیں کھولیں تو نیلما کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے پایا۔ اِس بار اُس نے اُسے جھنجھلا کر ٹوک دیا۔

"نیلما! بھگوان یہاں میری آنکھوں میں نہیں براجتے۔"

"بھگوان کہاں نہیں براجتے۔ یہ تو تلاش کرنے والے کی قسمت ہے۔ اُسے پربھو جہاں مِل جائیں۔"

نیلما نے اپنی آنکھیں جھپکائے بغیر کہا۔

اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی ساری بھگتی، ساری تپسیا نیلما کی نیلی آنکھوں کی گہری جھیل میں بہہ جائے گی۔

نیلما نے پھلوں اور مٹھائیوں سے بھری تھال اُس کی طرف بڑھا دی۔

"کنول جی! کبھی تو داسی کی بھینٹ سویکار کر لیجئے۔"

"نیل . . . !" نہ جانے کیوں وہ اُس کا پُورا نام نہ ادا کر سکا۔

"بھینٹ تو بھگوان سویکار کرتے ہیں۔ میں انسان ہوں ـــــ انسان انسان کی بھینٹ کیا سویکار کرے گا؟"

نیلما نے کہا "کنول جی! میں اور تو کچھ نہیں جانتی۔ لیکن اِس سے تو آپ بھی انکار نہ کریں گے کہ انسان انسان کا دل تو نہیں توڑتا!"

"دل کی بات تو ڈاکٹر جانیں یا شاعر۔ میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ ایک معمولی پجاری!"

نیلما ہنس پڑی اور کنول کو ایسا محسوس ہوا جیسے مندر کی ساری گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

"تم کیسے بھگت ہو کنول! یہ بھی نہیں جانتے کہ دل ہی وہ مندر ہے جس میں بھگوان براجتے ہیں ـــــ میرے دل کا مندر بہت دنوں سے سونا تھا لیکن میرا کو پربھو مل گئے ہیں۔"

نیلما آنکھیں بند کر کے بھجن گانے لگی۔

اور کنول اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُسے دیکھتا رہا اور نیلما کے لب ہِلتے رہے اور اُس کے لب کی ہر جنبش پر کنول کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے جسم سے اُس کی خود لادی ہوئی پاکیزگی، پوترتا اور بھگتی کی ساری پرتیں اُکھڑنے لگی ہیں۔ اور گیروے رنگ کے کپڑے میں لپٹے ہوئے کنول سے دُور کوئی اور کنول کھڑا مُسکرا رہا ہو۔

"تم کنول نہیں ہو سکتے۔ تم تو وہی تاج ہو اور یہ نیلما نہیں۔ یہ مونی ہے اور یہ لب مشکبو مونی ہی کے لب ہیں جنھیں تم ایک بار چُوم چکے ہو۔"

اور تاج اپنے ہمزاد کنول کو اُسی مندر کی چہار دیواری میں گُم کر کے وہاں سے بھاگ لیا۔ ٹرین میں بیٹھا ہوا وہ سوچ رہا تھا۔

نیلما کا من مندر پھر سُونا ہو گیا ہو گا۔

کون جانے میرا کو پھر پربھو ملیں گے یا نہیں؟

نیلما کی تھال کا پرشاد کون سویکار کرے گا۔

"نیلما... نیلما... نیلما..."

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

"نیلما کا چکر۔ مونی کا چکر اور نہ جانے کس کس کا چکر۔ اِن چکروں سے تم کبھی نکل بھی سکو گے۔ نیلما مونی ہے اور مونی نیلما ـــــ سارا چکر ایک ہی ہے۔"

اور ٹرین بھاگتی جا رہی تھی اور وہ بھاگا جا رہا تھا۔ بھاگتا جا رہا تھا۔ نجات کی تلاش میں۔ شانتی کی جستجو میں!

"اور پھر یوں ہوا کہ خداوند خدا نے ایک کبوتر آسمان سے کنواری مریم کے پاس بھیجا اور وہ رُوح القدس سے بھر گئی۔" تاج کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی اور اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا، اُس کے کمپارٹمنٹ کے ایک گوشے میں مسیحی راہبوں اور راہباؤں کے گروہ کی ایک راہبہ سفید بے داغ لبادہ میں ملبوس، گلے سے نقرئی صلیب کی زنجیر لٹکائے اپنے سارے وجود پر ایک ملکوتی وقار ڈالے، اپنی گوری پیشانی پر فرشتوں کی تقدیس کا نور لئے کہہ رہی تھی۔

"خداوند خدا کے مقدّس بیٹے نے فرمایا کہ اِس زمین پر رہنے والے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے نجات کا ایک ہی راستہ ہے..."

اور تاج کے دل میں جیسے اُس راہبہ کی بات گھر کر گئی۔ وہ نجات کا راستہ تو ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس نے اِس کے لئے گھر چھوڑا بن اپنایا۔ گوتم بنا۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی۔ لیکن کسی سے اُسے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ نہ مل سکا۔ اتنے دنوں تک کاوش اور کتنی راہوں پر بھٹکنے کے بعد اُسے نیلما ملی جو مایا کا ایک اور پُرکشش رُوپ تھی اور ترغیبِ گُناہ کی دوسری شکل!

وہ جہاں سے بھاگا تھا پھر وہیں آکر پھنس گیا تھا۔

اور وہ مسیحی راہبوں کے اُس گروہ میں شامل ہو گیا۔

بپتسمہ کے بعد ایزا بیلا نے تاج سے کہا۔

"تاج جیکب! اِس سے پہلے کہ تم خداوند خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے قابل بن سکو تمھیں چاہئے کہ تم اپنے گناہوں کو اُس کے سامنے confess کر لو کنفیشن کے بعد تمھاری روح مقدّس کبوتر کے پروں کی طرح دُھل کر صاف و شفّاف ہو جائے گی۔"

تاج پہلے ایزا بیلا ہی کی باتیں سُن کر متاثر ہوا تھا اور تاج جیکب بن گیا تھا اِس لئے اُس نے ایزا بیلا کے اِس مشورہ کو بہت غور سے سُنا۔

وہ کنفیشن کے نفسیاتی ردِّ عمل اور سکون بخشنے والے اثرات کے متعلق پہلے پڑھ چکا تھا اور تاج جیکب جبکہ محمد تاج تھا، اُس نے جنوری کی ایک یخ بستہ رات اپنے محلّے کی اندھیری مسجد میں تنہا کھڑے ہو کر نمازِ توبہ پڑھی تھی اور یہ دعا مانگی تھی کہ اے خدا! میرے گناہ معاف کر دے۔ میں نے جان بُوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ نہ معلوم کون سی ایسی طاقت تھی۔ کیسے کہوں خدائی سے بھی بڑی۔ جس نے مجھے بالکل بے ہوش کر دیا اور میرے لب...

اور پھر تاج جیکب نے اُس وقت بھی اپنے اِرد گرد اُسی جانی پہچانی خوشبو کی لپٹیں محسوس کیں، اور اُس نے جلدی سے ہاتھوں سے صلیب کا نشان بنا کر آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے لب آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے۔

"میں ایک مُلّا کا بیٹا داڑھی اور تسبیح کے سائے میں پلا پروان چڑھا۔ ہوش سنبھالا تو قرآن شریف کا حافظ ہو چکا تھا۔ حدیث اور فقہ کی تعلیم کے بعد انگریزی پڑھی تو بس اِس تصوّر کے ساتھ کہ علم حاصل کرنا گُناہ نہیں۔ پھر گھر کا ماحول کچھ ایسا سخت قسم کا مذہبی تھا کہ

ہر طرف مسجد کے منبر اور محراب ہی نظر آتے تھے اور ہر جگہ لوبان کی مقدس خوشبو فضا میں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی۔

لیکن اس کے ابرو کے محرابوں کے نیچے میرا دل جو گلے میں ڈالے ہوئے سیاہ سے تعویذ کے نیچے ہمیشہ سے دبا رہتا تھا، سجدہ کرنے کے لئے بے قرار رہنے لگا۔

اور پھر میں اُس کی محبت پر پُوری طرح ایمان لے آیا۔ اُس کی آنکھوں کے مسحور کن اشاروں نے مجھے بیخود کر ڈالا اور میں اُس کی طرف کھنچتا گیا اور کھنچتا گیا اور پھر اُس کے لبوں کو ایک سرد سی رات میں . . .

تاج جیکب نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے سوچا یہ من واقعی بہت پاپی ہے کسی لمحہ دُور نہیں ہوتی اُس لبِ مشکبو کی یاد!

"مجھے معاف کر میرے خدا! میرے خیال کی رَو پھر بہک گئی تھی۔ ہاں تو اُس رات جب میں اُس کی محبت پر پُوری طرح ایمان لا کر گھر واپس آیا تو اپنی بوڑھی ماں کو نماز میں غرق پایا۔ اِس قدر غرق کہ اُسے میرے آنے تک کی خبر نہ ہوئی تھی اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اِس کافر دل نے بغاوت کر دی۔

"یہ گناہ ہے!"

میں نے نمازِ توبہ پڑھی۔ دل ہی نے دل سے کہا۔ ترا دل تو ہے صنم آشنا . . . اور دوسری صبح محلے والوں کے تیور کچھ بگڑے بگڑے نظر آئے۔ عشق ہمیشہ کی طرح رُسوا ہو چکا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ محلے کی پنچایت میرے لئے کوئی سزا تجویز کرتی میں گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر چھوٹ گیا۔ باپ ماں چھوٹ گئے۔ لیکن ایک یاد تھی اُس لبِ مشکبو کی جو دل کا دامن چھوڑتی ہی نہ تھی۔

شہر شہر مارا پھرا۔ دُنیا کے جھمیلوں میں گھرا۔ لیکن ایک خیال تھا کہ جاتا ہی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرا سارا وجود اُس خوشبو میں نہایا ہوا ہے۔

پھر شاید میں ہونی کو بھول گیا۔ اُس کے خدوخال بھی اب تصوّر کے پردے پر نہیں آتے لیکن وہ عجیب دلفریب خوشبو اُسی طرح دل کا دامن نہیں چھوڑتی۔

پھر شہر چھوڑا بن اپنایا اور وہاں جو تھوڑی سی شانتی ملی تو میں تاج سے کنول ہو گیا۔

اور پھر عرصے کی تپسیا کے بعد بھی جب سکون نہ ملا اور میں نے محسوس کیا کہ میں وہیں پر ہوں جہاں سے چلا تھا۔ تو میں اب تاج جیکب ہو گیا ہوں۔

"میں تاج جیکب۔ ایک کمزور و ناتواں انسان! یسوع مسیح مجھے اتنی طاقت دیجئے کہ میں . . ."

تاج جیکب نے آنکھیں کھول دیں۔ صلیب کے نیچے نقرئی شمع دان میں رکھی شمع اُس کی داستان سنتے سنتے تھک چکی تھی اور دیوار سے آویزاں صلیب انسان کی ازلی کمزوری پر مُسکرا رہی تھی۔

اور تاج جیکب کا خود مختار دل اپنی مجبوری پر رو رہا تھا۔

"جو چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں"

پانچ کرسمس گزر گئے تھے اور چھٹے کرسمس کی تیاریوں میں مسیحی راہبوں کا پُورا گروہ مشغول تھا۔

بڑے پادری نے پُوچھا "تاج اور ایزابیلا نظر نہیں آتے؟"

کسی نے جواب دیا "دونوں صبح سے نظر نہیں آئے۔"

"ہوں!" بڑے پادری کی خاموشی بہت معنی خیز تھی۔

لیکن اسی شام ایزابیلا بہت ہی گھبرائی ہوئی بڑے پادری کے پاس آئی۔

بہت ادب سے اُس کے قریب بیٹھ کر ایزابیلا نے کہا۔

"مقدس باپ کی قسم! میں اِدھر کچھ دنوں سے ایک عجیب بات دیکھ رہی ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا اِس کا کیا مطلب ہے اور کیا ہونے والا ہے؟"

"کیا؟"

ایزابیلا نے اپنے دل کے پاس آویزاں طلائی صلیب کو اُٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"میری آنکھوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ میں یہ دیکھتی ہوں کہ تاج جیکب میری اِس صلیب سے جکڑ دیا گیا ہے . . . اور . . . اُس کے خون کے قطروں سے میں نہا گئی ہوں۔"

بڑے پادری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے صرف یہ کہہ کر ایزابیلا کو رخصت کر دیا۔

"تم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ ابھی جاؤ۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

اور ایزابیلا کے وہاں سے جانے کے بعد ہی تاج جیکب وہاں آ گیا۔

بڑے پادری نے پوچھا "کہاں تھے تم؟"

"میں اور ایزابیلا . . ."

بڑے پادری کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے تاج جیکب کو اپنی بات بھی پوری نہ کرنے دی۔

"مجھے سب معلوم ہے۔ تم جس راستے پر جا رہے ہو وہ ہمارے لئے ممنوع ہے۔"

"میں جانتا ہوں" جیکب پھر بول پڑا "لیکن اس کے باوجود ——— میں کیا کروں آخر؟"

بڑے پادری نے کہا "میں خود سوچ رہا ہوں کہ میں تم دونوں کے متعلق کیا کروں۔ تمہارے اطوار اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تم دونوں کو اس مقدس چہار دیواری میں رہنے دیا جائے۔"

اور اس سے پہلے کہ کرسمس کی صبح کا آفتاب طلوع ہو کر بے آراستہ چرچ اور اس سے متعلق عمارتوں پر اپنی اوّلین کرنیں نچھاور کرتا، تاج اور ایزابیلا دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس پہاڑی سے نیچے اتر گئے جس پر وہ مقدس عمارت تھی اور اس مقدس عمارت کی کھڑکیوں سے بہت سی آنکھوں نے آدم اور حوّا کو ایک بار پھر جنّت کو ٹھکرا کر جاتے ہوئے دیکھا!!

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔ منیجر

غزل

ساجد حسین شمس سیوہاروی ایم۔اے

ساقی تری محفل کا کیا راز کوئی جانے
ترسا کئے ہم پیہم، چھلکا کئے پیمانے
رندوں کو نہیں خواہش دنیا انھیں پہچانے
ناصح تو مگر سب کو خود جاتے ہیں سمجھانے
جب دورِ شراب آیا ساقی تری محفل میں
غیروں نے مزے لوٹے اپنے ہوئے بیگانے
اے کاش حقیقت کی کچھ ان میں جھلک ہوتی
واعظ تری تقریریں، افسانے ہی افسانے
جب آگ بھڑکتی ہے سینہ میں محبت کی
جل جاتے ہیں گر گر کر خود شمع پہ پروانے
اے شمس گلستاں میں ساقی ہی کے جلوے ہیں
مے خانے ہی مے خانے پیمانے ہی پیمانے

غزل

سعیدہ سلطانہ شمّہ لکھنوی

کندن کی طرح اور بھی نغمے نکھر گئے
ہم تو غموں کی آگ میں تپ کر سنور گئے
اُس چشمِ بادہ بار کے اٹھنے کی دیر تھی
مدت سے جتنے جام تھے خالی وہ بھر گئے
اس خوف سے کہ شمع کی رسوائیاں نہ ہوں
پروانے صبح ہونے سے پہلے ہی مر گئے
حیاتِ عشق کا ہے بس اتنا ہی تجزیہ
برباد کرنے آئے تھے برباد کر گئے
یہ ربط اور ترکِ تعلق کے بعد بھی
کیوں میرے غم میں آپ کے گیسو بکھر گئے
لمحے خوشی کے ہم نے بھی پائے مگر یونہی
جھونکے ہوا کے تھے اِدھر آئے اُدھر گئے
شمّہ ترے کلام میں یہ کیا درد ہے
آواز سن کے اہلِ محبت ٹھہر گئے

افسانہ

پھول مُرجھا گیا

روشن آرا نیّر

حبیب پور (بھاگل پور) بہار

بھائی جان! تسلیم

ایک طویل عرصے کے بعد آپ سے ہمکلام ہو رہی ہوں۔ شاید آپ کے دماغ سے میری یاد محو ہو گئی ہو لیکن ہم نے آپ کو ہر حال میں یاد رکھا ہے۔ ہاں یہ غلطی ہوئی کہ آپ کو کبھی خط نہ لکھ سکی۔ لیکن آپ نے بھی تو کبھی بھولے سے بھی مجھ غریب بہن کو یاد نہ کیا؟ کیا راکھی بار بار باندھ کر بھائی بنایا جاتا ہے؟ میرے خیال میں تو ایسی بات نہیں۔ بھائی بہن کا رشتہ ایک بار ہوتا ہے تو تا زندگی قائم رہتا ہے۔ آپ بہت مشغول ہیں یہ میں جانتی ہوں۔ پھر بھی شکایت ہو ہی جاتی ہے۔ بہرکیف بڑی اُمید کے ساتھ ایک تازہ ترین افسانہ بھیج رہی ہوں۔ اس افسانے میں ایک سوال ہے جسے آپ اچھی طرح محسوس کریں گے۔ بہت محنت کر کے میں نے افسانے کے کسی حصے کو بھی کمزور نہیں ہونے دیا ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی رہی تو آگے قدم بڑھانے میں سہولت ہوگی . . .

دعاؤں کی طالب

آپ کی بہن ——— روشن آرا نیّر

صبیحہ باجی جیسے ہی کالج گراؤنڈ میں داخل ہوئیں لڑکیوں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ آگئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہونے لگے۔ صبیحہ باجی اُن پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالے دوپٹہ درست کرتی اسٹاف رُوم میں داخل ہو گئیں۔ اُن کے جاتے ہی لڑکیوں کے جھرمٹ میں نگار نے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا صبیحہ باجی نے یک بیک خود کو اتنا اسمارٹ کیوں کر لیا؟"

"بھئی۔ میرا تو کچھ اور ہی خیال ہے۔" ناہید نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہے تمھارا؟" بیک وقت کئی لڑکیوں نے پوچھا۔

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے صبیحہ باجی کو کسی سے پیار ہو گیا ہے۔" ناہید نے کہا۔ "اِس لیے کہ اتنی جلدی کسی خشک مزاج لڑکی میں اتنی تبدیلی آجائے تو اُس کی دوسری وجہ اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"تم لوگوں کا دماغ چل گیا ہے۔" شیریں نے کہا۔ "بھلا صبیحہ باجی جیسی خشک مزاج لڑکی سے کون پیار کرنے کی غلطی کرے گا؟"

"یہ بات نہیں شیریں آپا!" قمر بانو نے مُسکرا کر کہا۔ "دل کا سودا کب کسی سے ہو جائے یہ کون کہہ سکتا ہے!"

"ہو گا۔" شیریں نے بے اعتنائی سے کہا اور کامن رُوم کی طرف چلی گئی۔

صبیحہ باجی اگلے تین سال سے مقامی زنانہ کالج میں انگریزی کی لکچرار تھیں۔ اُن کی عمر پچیس سے تجاوز کر رہی تھی۔ وہ حد درجہ سنجیدہ اور خاموش خیال کی جاتی تھیں۔ کسی سے زیادہ گفتگو کرنا انھیں پسند نہیں تھا اور یہی خاص وجہ تھی کہ اُن کی ہم عصر لکچرار انھیں مغرور کہا کرتی تھیں۔ اِس کے برعکس صبیحہ باجی سے لڑکیاں ڈرتی بھی اور اُن کا ادب بھی کرتی تھیں۔ کیونکہ صبیحہ باجی لڑکیوں کو بہت توجہ سے پڑھاتی سمجھاتی تھیں۔ لیکن چند دن پہلے جب [illegible]

[illegible]

صبیحہ [illegible] نگاہوں سے اس اچانک اور انوکھی تبدیلی کی وجہ پوچھی تو جواباً صبیحہ [illegible] کے ہونٹ مسکرا کر رہ گئے۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ شیریں کی نگاہ صبیحہ باجی پر جا پڑی جو کسی نوجوان کے ساتھ ہوٹل جل پان سے نکل رہی تھیں۔ شیریں بغور اُس مرد کو دیکھ رہی تھی بھرے بھرے چہرے اور گورے رنگ والے جوان مرد کو وہ خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ حال ہی میں شہر کے محلے میں آیا تھا۔ کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔ سفید قمیص اور پینٹ میں وہ نوجوان مرد بہت ہی خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ اُن کے بغل میں صبیحہ باجی ٹیڑی شلوار اور جمپر میں ملبوس حُسن و نسائیت کی دیوی معلوم ہو رہی تھیں۔ شیریں کو آج دونوں کی مُسکراہٹوں میں وہ سبھی باتیں مل گئیں جنھیں پانے کے لئے لڑکیاں پریشان تھیں۔ شیریں دُکان سے اُتر کر اُن کی جانب بڑھی اور بولی ۔۔۔ "آپ شاپنگ کر رہی ہیں ؟"

صبیحہ باجی نے مُڑ کر دیکھا اور بولیں "ارے شیریں تم ہو۔ ہاں میں شہاب صاحب کے ساتھ شاپنگ کے لئے آگئی ہوں" پھر وہ جلدی سے بولیں "ان سے ملو یہ شہاب صاحب ہیں۔ سٹی کالج میں لکچرار ہو کر آئے ہیں"

"آداب عرض" شیریں نے خوش اخلاقی سے کہا "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر !"

"ان سے ملئے" صبیحہ باجی نے شہاب سے کہا "میری طالبہ شیریں خانم !"

"اچھا تو آپ شیریں ہیں ؟" شہاب نے کہا "واقعی آپ کو اس لباس میں دیکھ کر میٹھے میٹھے گنے کی چھڑی یاد آ رہی ہے شیریں شیریں !!"

شیریں کٹ سی گئی۔ وہ واقعی قابلِ اعتراض لباس میں تھی اور اُسے زندگی میں پہلی بار لباس کے معاملے میں شرمندگی ہوئی۔ اس لئے کہ شہاب کی آنکھوں میں طنز تھا اور شیریں مارے شرم کے نگاہیں نیچی کئے ہوئے تھی۔ تینوں بہت دیر تک شاپنگ کرتے رہے۔ راستے میں جُدا ہوتے وقت شہاب نے کہا "شیریں صاحبہ ! اُمید کہ پھر آپ سے ملاقات ہوگی ؟"

"جی ہاں" شیریں بولی "صبیحہ باجی کے ساتھ ملنے کی کوشش کروں گی" اور وہ آگے بڑھ گئی۔

لیکن اُس رات شیریں کو بے چینی رہی۔ اُس کے دل و دماغ پر شہاب کی طنز بھری نگاہوں کے ڈنک پڑ رہے تھے اور درد کی شدت سے شیریں کا دماغ بے چین ہو رہا تھا۔ اُسے اپنی آزادی میں اپنا دَم گھُٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اُس رات شیریں کے شعور میں یہ بات جم سی گئی کہ مرد ہی محبت کا بھوکا نہیں ہوتا عورت بھی کئی رُوپ سے مرد کو پیار کرتی ہے کبھی ماں، کبھی بہن، کبھی بیٹی اور کبھی محبوبہ بن کر جو بیوی بن جاتی ہے۔

صبیحہ باجی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ اُنھوں نے انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اپنے خوابوں میں ایک شہزادہ بسا رکھا تھا۔ لیکن آج تک اُن کے خوابوں کا شہزادہ نہ آیا تھا۔ کوئی بھی مرد اُن کی نگاہوں میں شہزادے کا درجہ نہ پا سکا تھا اور یونہی جوانی کے دن گزرتے گئے۔ وادی کے پھول برف کے تودوں میں دبتے گئے۔ بہار آتی اور جاتی رہی۔ ایک صبح اپنے لان میں ایک پہلے پہل مرد کو گلاب کے پھول پر جھکے ہوئے دیکھ کر اُنھیں بہت حیرت ہوئی۔ وہ کھڑکی سے لگی غور سے اُس اجنبی جوان مرد کو دیکھ رہی تھیں۔ مردانہ حُسن اور پرکشش چہرہ دیکھ کر مدت سے سویا ہوا اُن کا دل انگڑائی لے اُٹھا اور اُنھیں محسوس ہوا جیسے گلاب کا پھول وہ خود ہیں اور اُس پھول پر جھکا ہوا مرد اُن کے خوابوں کا شہزادہ ہے

شیریں اپنے نام ہی کی طرح میٹھی تھی، پیاری تھی۔ وہ ایک تاجر کی بیٹی تھی۔ لاکھوں کی دولت اُس کے حصے میں تھی۔ زمین، جائداد کے علاوہ بنک میں ایک بڑی رقم اُس کے نام پر جمع تھی۔ شہاب سے ملنے کے بعد اُس کے اندر کوئی سا ایسا جذبہ جاگا کہ اُس نے سارے چُست عُریاں لباس ٹرنک میں بند کر دئیے۔ غیر مردوں سے ملنا جُلنا ترک کر دیا۔ کلبوں اور ریستورانوں کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مشرقی تہذیب میں ڈھالنے لگی۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد وہ بالکل ہی بدل گئی۔

شہاب کے سامنے ایک صبیحہ باجی تھیں اور دوسری شیریں !

صبیحہ باجی مشرقی تہذیب سے نکل کر مغربی تہذیب کی دیوانی ہوتی جا رہی تھیں اور شیریں جو مغربی تہذیب کی بدنما کھال کو جسم سے جُدا کر کے مشرقی تہذیب کا لباس پہن چکی تھیں۔ رنگ دونوں نے بدلا تھا اور شہاب سوچ رہا تھا کسے جیون ساتھی بنائے ؟

اُس دن صبیحہ باجی بے حد مسرور تھیں۔ لڑکیوں نے اُنھیں گھیر لیا۔ قمر بانو نے مُسکرا کر کہا "ہم لوگوں کی مٹھائی !"

"کس بات کی ؟"

"شہاب صاحب . . . !"

"اُف ! تم لوگ حد سے زیادہ شریر ہو گئی ہو ! چلو ابھی کلاس لینا ہے"



گھر کی مالکن
کیا آپ اپنے بجٹ (اخراجات) پر
قابو پانے میں
دشواری محسوس کرتی ہیں؟
نیشنل اینڈ گرینڈلیز بینک میں
ایک سیونگز اکاؤنٹ کھولنے سے
آسانی ہوگی۔
کیونکہ:
نیشنل اینڈ گرینڈلیز
آپ کے خرچ کی رفتار کو قائم رکھنے میں
مدد دیتا ہے
پابندی کے ساتھ جمع اور خرچ کا
حساب ہم ہوتا ہے آپ کی مدد کرتا ہے
بل کی ادائیگی میں جیسے کرایہ انشورنس وغیرہ
آج سے زیادہ عورتیں سیونگ اکاؤنٹ نیشنل اینڈ گرینڈلیز کے ساتھ
کھول رہی ہیں ان کا کہنا ہے کہ کتنی آسان اور سادہ زندگی ہے
آیئے اور اسی ہفتہ ہم سے ملیے۔
شروع کرنے کے لیے صرف ۵/۰ روپے کی ضرورت ہے
نیشنل اینڈ گرینڈلیز
بینک لمیٹڈ
(برطانیہ عظمیٰ میں قائم شدہ، ممبر کی ذمہ داری محدود ہے)
بڑے چھوٹے سبھوں کا بینک
مفت کتابچے کے لیے
"فکر کیسے دور کرنا چاہیے اور بچت کیسے کرنی چاہیے"
اپنے قریبی نیشنل اینڈ گرینڈلیز بینک کی شاخ کو لکھیے
BILL
BILL

HGB-39A/180 U

نغمگی

—منظری مصطفےٰ آبادی

بہار ہو کہ خزاں مسکرائے جاتے ہیں
...ے پھول بھی گلشن میں جلائے جاتے ہیں

بہت گراں ہیں وہ لعل و زر و جواہر سے
کسی کے غم میں جو آنسو بہائے جاتے ہیں

...ہیں جہاں میں جو دل سے بھلائے بیٹھے ہیں
...ستم ہے وہی یاد آئے جاتے ہیں

ہوا خلافِ جہاں منحرف، فلک دشمن
مگر یہ ہم کہ نشیمن بنائے جاتے ہیں

عجیب چیز ہے دستور تیری محفل کا
کہ بات کرنے پہ الزام آئے جاتے ہیں

غمِ حیات کے مارے سہی مگر ہم لوگ
تمام عالمِ امکاں پہ چھائے جاتے ہیں

یہ بزمِ عیش نہیں بزمِ عشق ہے محشر
یہاں چراغ نہیں دل جلائے جاتے ہیں

—چندر پرکاش جوہر بجنوری

غم کی آغوش میں جو پلتے ہیں
وہی دنیا کا رُخ بدلتے ہیں

میرے سینے میں کہکشاں کی طرح
تیری یادوں کے دیپ جلتے ہیں

خار تو کیا ہیں ہم گلوں سے بھی
اپنا دامن بچا کے چلتے ہیں

منزلیں چومتی ہیں اُن کے قدم
آپ جو اپنی راہ چلتے ہیں

گر گئے جو تری نگاہوں سے
وہ کہیں عمر بھر سنبھلتے ہیں

خوف سے رہزنوں کے اے جوہر
ہم کہیں راستہ بدلتے ہیں

—خزان چند نسیم

دیکھ اے تیغ آبروئے خواہشِ قاتل کو دیکھ
یہ نہیں تو اقتضائے حسرتِ بسمل کو دیکھ

ذکرِ ماضی چھوڑ دے، یہ فکرِ ماضی چھوڑ دے
مست اپنے حال میں رہ اور مستقبل کو دیکھ

ہر قدم ہے عین منزل اے مذاقِ جستجو
ہر قدم پر اے مذاقِ جستجو، منزل کو دیکھ

انجمن در انجمن ہے تیرے دل کی کائنات
گوشۂ خلوت میں اپنے قلب کی محفل کو دیکھ

بعدِ منزل ایک منزل اور ہے درپیش ابھی
اے مرے ذوقِ سفر منزل پسِ منزل کو دیکھ

شوق ہے محدود تیرا، حُسن لامحدود ہے
ہوش میں آ اے نسیم اپنی بساطِ دل کو دیکھ

یہ سُن کر مہاراج جنتا جنار دھن طیش میں آگئے اور جیسے مظاہرین کی طرح مٹھی ہوا میں لہراتے ہوئے نعرہ لگا کر بولے: "اے سنجے! تجھے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تیرا کام صرف میدانِ جنگ کی کومنٹری کرنا ہے، جنگ کی پالیسی پر تبصرہ کرنا نہیں۔ بس تو ہمیں صرف اتنا بتا کہ فوجوں کے لیڈر اِس وقت کاروں میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ عیش کر رہے ہیں مہاراج!"

"مگر کیسے، بتاتے چلے جاؤ۔"

"دونوں فوجوں کے کچھ بڑے بڑے لیڈر کاروں سے باہر نکل آئے ہیں اور ایک دوسرے سے جام ٹکرا کر ایک دوسرے کی فتح کے جام نوش فرما رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی محبوبائیں بھی ہیں جو میدانِ جنگ میں اپنے [illegible] سپہ سالاروں کے لڑکھڑاتے قدموں کو کمالِ عشوہ طرازی کے ساتھ یوں سہارا دے رہی ہیں جیسے سہارا نہ دے رہی ہوں، بال رُوم ڈانس کر رہی ہوں۔ وہ دیکھئے، ایک محبوبہ نے اپنے عاشق لیڈر کے ماتھے پر وہسکی کے پیگ میں اُنگلی ڈبو کر تلک لگایا ہے۔ جس کا جواب لیڈر نے ایک "ہاٹ کِس" میں دیا ہے اور چاروں طرف میدانِ جنگ میں "ہپ ہپ ہُرّے" کا شور مچ گیا ہے اور ہر طرف نصب کئے ہوئے لاؤڈ سپیکروں میں سے پے بہ پے "ہاٹ کِسوں" کی سنسنی خیز آوازیں آنے لگیں۔ مہاراج جنتا جنار دھن! کیا آپ اِن ہاٹ کِسوں کی آوازیں سُن رہے ہیں؟ کیونکہ آپ صرف آنکھ سے اندھے ہیں، کان کے بہرے نہیں ہیں۔"

مہاراج اپنے ہونٹ چاٹ کر بولے: "سنجے! میں سب سُن رہا ہوں۔ اب مجھے یہ بتاؤ یہ ہاٹ کِس کیا ہوتا ہے؟ تم یہ کون سی بھاشا کا لفظ بول رہے ہو؟"

سنجے بولے: "ہائے مہاراج! آپ کے بیٹوں اور بھتیجوں میں جو ابھی یدھ چھڑنے والا ہے، اُس کی بنیاد "ہاٹ کِس" پر ہی رکھی گئی ہے۔ میرا مطلب ہے چندر بنسی اور سورج بنسی خاندان کا ہر یودھا اپنا ہتھیار اُٹھانے سے پہلے ایک "ہاٹ کِس" لیتا ہے۔ جو یودھا ذرا کمزور ہیں، وہ دو یا تین ہاٹ کِس بھی لے سکتے ہیں۔ اِس سے اُن کے رگ پٹھوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور وہ خون کی اِس حرارت کے بل بوتے پر میدانِ جنگ میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔"

مہاراج جنتا جنار دھن بولے: "سنجے! تم ہمیں اصل بات کیوں نہیں بتاتے کہ "ہاٹ کِس" کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

سنجے نے کہا: "گرم گرم بوسہ۔"

"تو یہ یودھا تیروں سے نہیں لڑتے، گرم بوسوں سے لڑتے ہیں؟"

"ہاں مہاراج! گرم بوسہ ایک ایسا تیر ہے جو کلیجے کو چیرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ آپ ابھی ابھی پوچھ رہے تھے کہ یہ "ہاٹ کِس" کون سی بھاشا کا لفظ ہے۔ ہائے مہاراج! اب میں کس منہ سے بتاؤں کہ آپ صرف اندھے ہی نہیں ہیں، اَن پڑھ بھی ہیں۔ کیونکہ "ہاٹ کِس" انگریزی بھاشا کا شبد ہے اور آپ یہ بھاشا نہیں جانتے۔ ہمارے دیش میں جو آدمی یہ بھاشا نہیں جانتا وہ اَن پڑھ ہے، اَن کلچرڈ ہے، جنگلی ہے، بدتمیز ہے! اور معاف کیجئے، گدھا ہے!"

مہاراج جنتا جنار دھن ایک دم آگ بگولا ہو گئے اور بولے: "سنجے! کیا یہ سارے خطاب تم ہمارے متعلق استعمال کر رہے ہو؟ ہم تمہیں نوکری سے علیحدہ کر دیں گے!"

سنجے بولا: "مہاراج! بیشک نکال دیجئے لیکن اتنے لوئر گریڈ پر میرے ایسا گریجویٹ اور وہ بھی فرسٹ کلاس گریجویٹ کہیں نہ ملے گا۔ میں تو صرف یہ بتا رہا تھا کہ آپ کے بیٹے اور بھتیجے جو کل تک فرنگی کے غلام تھے، آج اُسی فرنگی کی بھاشا سیکھ کر ایک دوسرے سے مہابھارت کر رہے ہیں، فرنگی وہسکی نوش فرمانے اور ہاٹ کِس کی گرینڈ ریہرسل کے بعد وہ ایک دوسرے پر پل پڑیں گے۔ ایک دوسرے کے خلاف انگریزی بھاشا میں بڑے تیر بہدف بھاشن پھینکیں گے اور ایک دوسرے کو گھائل کرنے کے جتن کریں گے اور جو اِن بھاشنوں سے گھائل نہ ہوں گے، انہیں راشن سسٹم سے تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔"

مہاراج جنتا جنار دھن بولے: "اے سنجے! ہم تجھے اپنی ملازمت سے الگ نہ کریں گے۔ کیونکہ تو بے حد ذہین انسان ہے۔"

سنجے نے مُسکرا کر کہا: "مہاراج! ذہین نہ ہوتا تو اِتنے لوئر گریڈ پر نوکری کرتا اور وہ بھی ایک اندھے کے پاس!"

مہاراج بولے: "اچھا اچھا، ہمیں بار بار اندھا کہہ کر بار بار غصّہ نہ دلا اور یہ بتا کہ اِس وقت میدانِ جنگ کی کیا پوزیشن ہے۔ ہمارے بیٹوں کا سپہ سالارِ اعظم

...سپاہی کون ہے اور وہ کیا کر رہا ہے؟"

سنجے نے کہا "مہاراج! آپ کے بیٹوں کا سپہ سالارِ اعظم اِس وقت ... ناتھ جی ہے اور وہ میدانِ جنگ میں اپنے رتھ پر بیٹھا ٹرانسسٹر سن رہا ہے۔"

مہاراج نے پوچھا "اِس کا مطلب ہے ابھی جنگ کا بگل نہیں بجا۔ آخر بجنے میں کیوں دیر ہو گئی ہے؟"

سنجے بولا "مہاراج! معلوم ہوتا ہے بگل بجانے والی بینڈ پارٹی نے ہڑتال کر دی ہے۔"

مہاراج بولے "سنجے! ہڑتالیوں کے مطالبات کیا ہیں؟"

سنجے کہنے لگے "مہاراج! وہ یہی مانگ کر رہے ہیں کہ اگر میدان میں سوشلزم کی جنگ ہونی ہے تو ہم بگل اور طبل بجانے والوں کو بھی وہسکی کا ایک ایک پیگ دیا جائے، ایک ایک انڈے کا آملیٹ اور سو سو گرام مچھلی ہر بگل بجانے والے کو دی جائے۔ ورنہ ہم نہ بگل بجائیں گے نہ جنگ شروع ہوگی۔"

مہاراج بولے "سنجے! یہ تو بہت بری بات ہے۔ جنگ تو ضرور شروع ہونی چاہئے ورنہ اِس دھرتی سے پاپ کیسے ختم ہوں گے۔ تم ذرا ٹیلیفون کرکے ہمارے بیٹوں کے سپہ سالارِ اعظم سے پوچھو کہ بگل بجانے والوں کے اِن مطالبات کے متعلق اُن کا کیا رویّہ ہے اور ہمارے بھتیجوں کا کیا رویّہ ہے؟"

سنجے بولے۔ مہاراج! دونوں کا رویّہ صاف صاف سامنے نظر آ رہا ہے۔ بگل نہ بجنے کی وجہ سے دونوں طرف کے فوجی تھک ہار کر جماہیاں لے رہے ہیں۔ بگل بجانے والے ہڑتالیوں کو گرفتار کرکے ایک ٹرک میں بھر کر جیل کی طرف لے جایا جا رہا ہے اور دونوں فوجوں کے سپہ سالارِ اعظم مائکروفون پر بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ بگل بجانے والوں کی ہڑتال کے پیشِ نظر آج کی جنگ ملتوی کر دی گئی ہے۔ سبھی فوجی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور کل صبح مسلح ہو کر دس بجے پھر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائیں گے۔ جو فوجی حاضر نہ ہوگا اُس کے کوارٹر کی الاٹمنٹ منسوخ کر دی جائے گی۔"

مہاراج جنتا جنار دھن نے بھی جماہی لے کر کہا "سنجے! اِس کا مطلب ہے اِس وقت میدانِ جنگ خالی ہو رہا ہے۔ کیا دونوں طرف کے بڑے بڑے لیڈر دون کی کاریں بھی واپس جا رہی ہیں؟"

سنجے بولا "نہیں مہاراج! دونوں طرف کے بڑے بڑے فوجی یودھا آج کی جنگ کے کامیاب خاتمے پر ایک دوسرے سے گلے مِل رہے ہیں اور ایک دوسرے کو بدھائیاں دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ چلو اب کسی کلب میں ایک دوسرے کی صحت کے جام نوش فرمائیں اور رمی کھیلیں۔"

مہاراج بولے "تو سنجے! اب ہم کیا کریں؟"

سنجے نے مسکرا کر کہا "چلو مہاراج! ہم کسی سستے سے شراب خانے میں ٹھرّے کا ایک ایک پیگ پی کر بھارت دیش اور سوشلزم کی صحت کا جام پئیں۔"



یہ خوش ہیں —
اور آپ ؟

افسانہ

حُسنِ سوگوار

صالح منیر

صیدنہ منزل۔ ۱۰ پارک روڈ، تاسکر ٹاؤن، بنگلور نمبر ۱

محترمی و مکرمی خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

آپ اور آپ کے موقر جریدہ "بیسویں صدی" نے اُردو کے فروغ کے لئے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، اُن کا میں بصدق دل سے معترف ہوں ۔۔۔۔ ایک افسانہ "حُسنِ سوگوار" پیشِ خدمت ہے۔ شاید پسند آجائے۔ افسانہ کا مرکزی کردار ہمارے نوجوان ادیب کے اُس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو نفسیات کے کتابی مطالعہ کے بعد خود کو انسانی تعلقات کے علم کے ماہر سمجھنے لگتے ہیں۔ افسانے کا اسلوب بیان سیدھا سادہ ضرور ہے۔ پھر بھی میں نے اسے عام روایات سے ہٹ کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی اِس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں، اِس کا اندازہ آپ اور "بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین ہی کر سکتے ہیں . . .

آپ کا مخلص ۔۔۔۔۔ صالح منیر

خلیل احمد نے گولڈ فلیک کا سگریٹ سُلگایا اور دھوئیں کے مرغولے بناتا ہوا بیتے ہوئے دنوں کی یادوں میں کھو گیا۔ اِسی عالم میں وہ یہ سوچ کر مُسکرا پڑا کہ چند برسوں پہلے وہ اِن رشتے داروں کے وجود سے بھی واقف نہ تھا جو آج اس سے ملتے ہوئے خوشی سے پھُولے نہیں سماتے تھے۔

صرف تھوڑی دیر پہلے حیدر آباد کے ایک معزز رئیس، خان بہادر عبدالرحیم خاں اُس سے مِل کر گئے تھے۔ خلیل احمد مشہور تجارتی فرم "واٹسن سمپسن" کا برانچ منیجر تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ پہلے وہ اپنے کیبن میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ چپراسی نے ایک ملاقاتی کارڈ لا کر میز پر رکھا جس پر خان بہادر عبدالرحیم خاں سابق ایم۔ ایل۔ سی کا نام جلی حروف میں چھپا ہوا تھا۔ خلیل نے چپراسی کو اشارہ دیا کہ وہ ملاقاتی کو اندر بھیج دے۔ وہ ابھی کارڈ کا معائنہ کر ہی رہا تھا کہ ایک بھاری بھرکم شخصیت والے ادھیڑ عمر کے بزرگ جو قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے، وندناتے ہوئے کیبن میں داخل ہوئے۔ خلیل نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن خان صاحب نے آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے اُسے گلے لگا لیا اور خیریت پُوچھنے کے فوراً بعد ہی شفقت آمیز لہجے میں خلیل کو ڈانٹنے لگے کہ یہاں اُن کا گھر ہوتے ہوئے بھی وہ ہوٹل میں کیوں ٹھہرا ہے۔

"تمھیں آج ہی شام کو میرے گھر چلنا ہوگا!" خان صاحب نے تحکمانہ لہجے میں اپنا فیصلہ صادر کیا۔ خلیل نے اپنی کوتاہی پر معذرت پیش کی اور وعدہ کر لیا کہ وہ اُسی شام کو اُن کے گھر پہنچ جائے گا۔ خان صاحب کا چہرہ مسرت سے کھِل گیا اور اُنھوں نے خلیل کو اپنے گھر کا محلِ وقوع سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے سارے محلے کا جغرافیہ اُس کے ذہن نشین کرا دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے تک خلیل کی جان چھوٹی تھی۔

اُس زمانے میں جبکہ خلیل، اُس کی والدہ اور ایک نوجوان بہن تنگی تُرشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور خلیل کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے راتوں کو کسی دُوکان میں کام کرنا پڑتا تھا تو اُن دنوں اُنھیں کوئی پُوچھنے والا بھی نہ تھا لیکن جب خلیل نے بی۔ اے کے بعد ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن کی اعلیٰ سند حاصل کی اور ایک بڑی فرم میں اعلیٰ تنخواہ پانے والا ایگزیکٹو بن گیا تو نئے نئے رشتے دار دریافت ہونے لگے۔ خلیل نے صرف نفسیات ہی نہیں پڑھی تھی، وہ ایک اچھا سیلس مین بھی تھا۔ اُس نے اپنے نو دریافت رشتے داروں کو کبھی شرمندہ نہ ہونے دیا۔ وہ سب سے خندہ پیشانی سے ملتا اور اُن کی خاطر مُدارات کرتا۔ نئی خوشحالی نے اُسے مغرور نہیں بنایا

بلکہ اس کے برعکس وہ اور بھی خوش اخلاق بن گیا۔ اُس کی بات چیت میں تلخی کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ اونچے عہدے پر فائز ہونے کے بعد ایک سال کے اندر ہی اُس نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں اپنی بہن کا بیاہ کر دیا لیکن اپنی شادی کی بات کو وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے ٹال جاتا۔ وہ اپنے شہر میں بمشکل ایک سال ہی رہ سکا تھا کہ اُس کا تبادلہ حیدرآباد کو ہو گیا جہاں اسے کمپنی کے برانچ منیجر کے عہدے پر ترقی دی گئی تھی۔ حیدرآباد آنے کے ایک ہفتہ بعد خان بہادر عبدالرحیم خان صاحب نے اُسے جا پکڑا تھا۔ خان صاحب خلیل کے والد کے بہت گہرے دوست ہوتے تھے۔

خان صاحب کا شاندار بنگلہ "گل بہار" شہر کے فیشن ایبل علاقے میں تھا۔ خلیل اُسی شام کو ساڑھے سات بجے وہاں پہنچ گیا۔ خان صاحب کی بھاری بھرکم بیگم صاحبہ نے خلیل کو دیکھ کر گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ خان صاحب سے ملنے کے بعد ان کے

- اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا اس لئے زمین پر فساد نہ کرو۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- لوگوں کے ساتھ انصاف اور احسان کرو۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- کم کھانا صحت ہے، کم بولنا حکمت اور کم سونا عبادت میں داخل ہے۔
(حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)
- گھر لینے سے پہلے اُس گھر کے پڑوسیوں سے متعلق معلومات حاصل کرو۔
(حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ)
- گناہ کسی نہ کسی عنوان دل کو بے چین رکھتا ہے۔ (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)

گہرے خلوص کو دیکھتے ہوئے خلیل نے اندازہ لگایا تھا خان صاحب کی ایک جوان بیٹی بھی ضرور ہوگی جو یقیناً خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ خان صاحب کی جوان بیٹی رُوحی صرف خوبصورت ہی نہ تھی حسین بھی تھی۔ قیمتی لیکن اچھے ذوق کی ترجمانی کرنے والے لباس میں وہ بے حد اسمارٹ معلوم ہو رہی تھی۔ خلیل نے اُسے پُرتحسین نظروں سے دیکھا جس کا جواب اُسے ایک لطیف سی مُسکراہٹ کی صورت میں ملا۔ خان صاحب نے رُوحی سے خلیل کا تعارف کرایا جس کے بعد رُوحی خلیل کے ساتھ اس بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی جیسے وہ اُسے برسوں سے جانتی رہی ہو۔ چند لمحوں بعد ایک اور نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور خان صاحب کے بُلانے پر شرماتی لجاتی ہوئی وہ بھی آ کر خان صاحب کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ رُوحی نے خلیل کو نئی لڑکی فوزیہ سے متعارف کرایا۔ خان صاحب نے بتایا کہ فوزیہ اُن کے ایک مرحوم دوست کی نشانی ہے۔

وہ بچپن ہی میں اپنے ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئی تھی اور تب سے انھیں کے ساتھ رہتی تھی۔ رُوحی کے ساتھ ہی اُس نے بھی بی۔ اے کی ڈگری لی تھی۔ خلیل کو خان صاحب کی باتوں میں فوزیہ کے لئے سچا پیار نظر آیا۔ اُس نے بھرپور نگاہوں سے فوزیہ کی طرف جو دیکھا تو شرم و حیا سے اُس کا ملیح چہرہ گلنار ہو چکا تھا۔ وہ رُوحی کی طرح سُرخ و سپید رنگت تو نہیں رکھتی تھی لیکن اُس کے تیکھے نقوش دیکھنے والے کے لئے بے پناہ کشش رکھتے تھے۔ رُوحی ہر ایک سے گھل مل جانے والی بنداس سی لڑکی تھی تو فوزیہ شرم و حیا کی پُتلی اور ایک سنجیدہ سی لڑکی تھی۔ خلیل نے دل ہی دل میں دونوں کا موازنہ کیا تو اُس نے یہ بات زیادہ محسوس کی کہ ان لڑکیوں کی فطرتوں کا یہ تضاد اس کی دلچسپی کا سامان بن گیا ہے۔

دوسرے ہی دن خلیل ہوٹل سے "گل بہار" منتقل ہو گیا جہاں اس کے لئے بالائی منزل پر ایک آراستہ ہوادار کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔

"اُٹھئے بھائی جان آٹھ بج رہے ہیں" رُوحی خلیل کو جگا رہی تھی۔ خلیل ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور اپنے سامنے گلاب کے پھول کی طرح کھلے ہوئے رُوحی کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا اُٹھا۔

"تھینکس آپ نے کیوں تکلیف کی؟" چائے کی ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے خلیل نے کہا۔

"نیور مائنڈ (Never Mind)" رُوحی نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور ٹرے میز پر رکھ کر چلی گئی۔ خلیل اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد خلیل کے تصور میں فوزیہ کا چہرہ اُبھر آیا اور وہ اس گھر کی دونوں لڑکیوں کا موازنہ کرنے لگا۔

ناشتے پر صرف بیگم اور رُوحی اُس کے منتظر تھے۔ فوزیہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن خواہش کے باوجود خلیل کو اُسے پُوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دفتر جاتے ہوئے خلیل کی نظر فوزیہ پر پڑی جو جلدی میں ہال سے گزر رہی تھی۔ وہ سادہ لیکن دیدہ زیب لباس پہنے ہوئے تھی۔ خلیل کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ لطیف سی مُسکراہٹ کے ساتھ اُس نے خلیل کو سلام کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ خلیل نے محسوس کیا کہ اُس کی مُسکراہٹ میں سوگواری کی سی کیفیت تھی کیا وہ اِس گھر میں خوش نہیں ہے؟ خلیل نے سوچا۔ وہ ایک عجیب سی لڑکی تھی۔ اُس کے لئے خلیل کے دل میں ہمدردی کا جذبہ سا پیدا ہوا۔

فوزیہ خلیل کی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہو چکی تھی؟ اس کا احساس خلیل کو ان دنوں ہوا جبکہ اُسے "گل بہار" میں سکونت پذیر ہوئے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ اس دوران میں وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ [illegible] طریقے پر وہ فوزیہ سے بے حد متاثر ہو چکا تھا۔ کم سخن سنجیدہ اور [illegible]

جس نے کبھی خلیل سے کھل کر بات نہیں کی تھی، اُس کے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ فوزیہ نے اپنی باتوں سے اشارۃً بھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ خلیل کو چاہتی ہے پھر بھی فوزیہ کی گہری اور رُوح میں اُتر جانے والی سوگوار سی آنکھوں میں خلیل کو بیکراں خلوص اور پیار نظر آتا۔ خلیل جس نے نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور جس نے خود زندگی کا ایک طویل حصّہ تشنگی و بے مائیگی کی حالت میں گزارا تھا۔ فوزیہ کو "گُل بہار" کی گھٹن سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ لیکن کس طرح؟ یہی سوال اُسے کھائے جا رہا تھا۔

یہ سوال ایک رات اُس کے لئے ایک اہم مسئلہ کی صورت اختیار کر گیا۔ اُس رات خان صاحب نے کھانے کے بعد خلیل کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں آنے کو کہا۔ خان صاحب نے کافی پر خلیل کو بتایا کہ رُوحی کے لئے کئی پیغامات آئے ہوئے ہیں اور پھر اُنھوں نے سبھی اُمیدواروں کے متعلّق تفصیل بتاتے ہوئے خلیل کی رائے پُوچھی۔ اُنھوں نے خلیل پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ اُنھیں ان اُمیدواروں میں سے کوئی بھی خاص طور پر پسند نہیں ہے۔ خلیل نے خان صاحب کا عندیہ سمجھ نہ رہ سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ خان صاحب کیا چاہتے ہیں۔ خلیل کے تصوّر میں فوزیہ کا معصوم چہرہ اُبھرا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خان صاحب کے وجود سے بھی غافل ہو گیا لیکن فوراً ہی اُس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور خان صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اُنھیں کچھ عرصہ تک اور کسی اچھے سے رشتے کے لئے انتظار کرنے کی رائے دی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں جس کے بعد خلیل نے خان صاحب سے اجازت لی اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اُس رات نیند خلیل کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ کیا وہ خان صاحب سے صاف کہدے کہ وہ رُوحی کو نہیں، فوزیہ کو اپنانا چاہتا ہے؟ اُس نے سوچا۔ لیکن کیا یہی اِس کا قطعی فیصلہ ہے۔ کیا اِس کا یہ اندازہ صحیح ہے کہ فوزیہ اِسے دل سے چاہتی ہے۔ آخر رُوحی میں کیا کمی ہے۔ دولت مند ماں باپ کی بیٹی ہے پھر بھی اُس میں غرور نہیں۔ وہ بھی تو اُسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اُف! فوزیہ کی کنول جیسی آنکھیں کتنی گہری، کتنی خوبصورت ہیں، حُسنِ سوگوار۔ وہ کتنی معصوم اور بے بس ہے۔ وہ مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے۔ رُوحی کو مجھ جیسے ہزاروں مل سکتے ہیں ... رُوحی کتنی خوبصورت ہے ——— خلیل کا دماغ متضاد خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ چہرے، نام اور واقعات باہم خلط ملط ہو رہے تھے۔ خیالات بھٹک رہے تھے۔ اِسی عالم میں کچھ دیر بعد اُس کی آنکھ لگ گئی۔

ایک دن خلیل کا دفتر دوپہر ہی کو بند کر دیا گیا۔ کمپنی کا کوئی ڈائرکٹر چل بسا تھا جس کی وجہ سے دفتر کے عملے کو آدھے دن کی چھٹی دی گئی تھی۔ خلیل دوپہر ہی کو گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا کوئی پکچر ہی دیکھ لی جائے۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ قریب ہی ایک تھیٹر میں انگریزی فلم لگی ہوئی تھی۔ خلیل جب تھیٹر میں داخل ہوا تو انڈین نیوز دکھائی جا رہی تھی۔ بالکنی میں بہت کم تماشائی بیٹھے ہوئے تھے۔ خلیل سے کچھ آگے ایک نوجوان ایک لڑکی کو ساتھ لئے بیٹھا تھا۔ خلیل کی توجہ اِس جوڑے کی طرف چلی گئی۔ وہ اِس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی دلچسپ گفتگو میں کھوئے ہوئے ہوں۔ ایک ثانیہ کے لئے خلیل نے سوچا، کاش فوزیہ اِس کے ساتھ ہوتی! پھر وہ فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔ اِنٹرول میں روشنی ہونے پر سامنے والی لڑکی نے مُڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ "اوہ یہ تو رُوحی ہے!" خلیل کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ غصّے کی ایک لہر اُس کے سراپا میں دوڑ گئی اور بمشکل وہ اپنے جذبات پر قابو رکھ سکا۔ رُوحی خلیل کو دیکھ کر مسکرائی اور اپنے ساتھی کو پیچھے آنے کے لئے اشارہ کرتی ہوئی ہال سے باہر آ گئی۔

•••~~~~~~•••~~~~~~•••~~~~~~•••

- اپنا کام خود کرنے والا اُس شخص کی بہ نسبت بہت زیادہ کامیاب رہتا ہے جو کسی دوسرے کے بھروسے پر چھوڑ دے۔ (بیکن)
- کامیابی کی راہ کو دوڑ کر طے کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔ آہستہ آہستہ لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ مناسب ہے۔ رفتار کا یہ اعتدال انسان کو دولت، عظمت اور دانشمندی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ پاؤنڈ پاؤنڈ سے نہیں بنتے، اُنھیں پنس بناتے ہیں۔ (چارلس ڈکنس)
- نہ قرض خواہ بنو نہ قرض دار۔ کیونکہ وہ اکثر خود بھی ضائع ہو جاتا ہے اور دوستوں میں بھی جُدائی ڈال دیتا ہے۔ (شیکسپیئر)

•••~~~~~~•••~~~~~~•••~~~~~~•••

خلیل بھی باہر آ چکا تھا۔ وہ رُوحی کے چہرے پر ندامت کے آثار دیکھنے کا متوقّع تھا لیکن اُس نے بہت حیرت سے دیکھا کہ رُوحی ویسی ہی مسرور و مطمئن نظر آ رہی تھی جیسے وہ ہمیشہ ہوتی تھی۔ رُوحی نے بڑی متانت و خوش اخلاقی سے خلیل کو سلام کیا اور اپنے ساتھی سلیم کا تعارف کرایا۔ تینوں نے چائے پی اور کچھ دیر فلموں کی باتیں ہوتی رہیں۔ گھنٹی بجنے پر وہ تھیٹر میں داخل ہوئے اور اب رُوحی اور سلیم بھی خلیل کے ساتھ ہی بیٹھے۔

خلیل ایک ہیجانی کیفیت میں تھا۔ اُس کی آنکھیں پردۂ فلم پر لگی ہوئی تھیں لیکن خیالات کہیں اور بھٹک رہے تھے۔ دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کیا رُوحی اِس قدر گر سکتی ہے؟ اُس نے سوچا۔ گھر میں اتنی پارسا بنتی ہے اور باہر یار دوستوں کے ساتھ گلچھرّے اُڑاتی پھرتی ہے۔ یہ جو اِس کے ساتھ آیا ہے ضرور کوئی

اوباش نوجوان ہوگا کس طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ دونوں ہی ذہنی اعتبار سے پست ہیں۔ کتنی [illegible] ہے یہ رُوحی۔ اپنی کرتوت پر پشیمان بھی نہیں؟

"لیکن تم کیوں اس [illegible] غصے [illegible] رہے ہو؟" منطق [illegible] حیات کے طالب علم خلیل احمد [illegible] نے [illegible] خلیل سے سوال کیا۔ [illegible] کرتے ہو۔ [illegible] فوزیہ [illegible] تو کیا ہوا۔ وہ میرے لئے آئیڈیل [illegible] ہو سکتی ہے۔ [illegible] خیالات کے [illegible] اُلجھتے رہے۔

"[illegible] بھائی جان!" خلیل کو [illegible] آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ [illegible] تماشائی [illegible] کھڑے ہوتے تھے۔ [illegible] آئے تو [illegible] میں چائے پینے کی تجویز پیش کی۔ رُوحی نے بڑی خوشی سے [illegible] چاہتے ہوئے بھی اُن کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا۔ چائے کے دوران میں [illegible] باتوں میں بہت کم حصہ لیا۔ یہاں اُسے معلوم ہوا کہ سلیم فوزیہ [illegible] خلیل کو سلیم [illegible] نظر آنے لگا۔

"خلیل صاحب! آپ تو بالکل نہیں بول رہے ہیں؟" سلیم [illegible] مخاطب ہوا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔" خلیل نے [illegible] چہرے پر [illegible] طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جی نہیں ضرور کوئی بات ہے۔" سلیم نے اصرار کیا۔

اس سے پہلے کہ خلیل کوئی جواب [illegible] رُوحی نے سلیم سے کہا "خلیل صاحب کی خاموشی کا غلط مطلب [illegible]۔

"خلیل صاحب ایک بڑے افسر ہیں، اکثر سوچتے رہتے [illegible]"

نہ جانے کیوں خلیل کو رُوحی کی یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوئی پھر بھی وہ مسکراتا رہا۔

چائے کے بعد سلیم نے رُوحی سے اجازت لی اور خلیل سے ملاقات پر دوبارہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ چلا گیا۔ رُوحی اپنی کار میں آئی تھی اُس نے خلیل کو ساتھ ہی گھر چلنے کو کہا۔ اُس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ خلیل کو طبیعت کچھ بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے گھر جانا ہی مناسب سمجھا۔

جب وہ دونوں ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے انھیں فوزیہ ہی ملی جو ڈرائنگ روم میں بیٹھی کسی رسالے کا مطالعہ کر رہی تھی۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر فوزیہ کے چہرے پر ناگواری یا غصے کا شائبہ بھی نظر نہ آیا۔ مسکراتے ہوئے اُس نے آنے والوں کا استقبال کیا اور پُوچھا کیا وہ ان کے لئے چائے بنواتے؟

"نو تھینکس، ہم [illegible] کر آ رہے ہیں" رُوحی نے اُس کی پیشکش مسترد کر دی۔

فوزیہ پھر رسالے کے مطالعے میں محو ہو گئی۔ خلیل فوزیہ کے اس رویے پر شپٹا گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اُسے رُوحی کے ساتھ دیکھ کر فوزیہ جل جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

خلیل اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سوچتے ہوئے خود ہی مسکرا پڑا [illegible] وہ [illegible] بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ فوزیہ کوئی عام لڑکی تھوڑی ہے جو اپنا راز یوں فاش کر دے گی۔ اُسے اپنے جذبات پر قابو حاصل ہے۔ وہ کتنی پُروقار ہے۔ خلیل دل ہی دل میں فوزیہ کو سراہنے لگا۔ اُس کی نظروں میں فوزیہ کی وقعت اور بڑھ گئی۔

خلیل کو پورا یقین تھا کہ فوزیہ اُسے چاہتی ہے اور صرف اپنی فطری شرم و حیا کے باعث وہ اس کے قریب نہیں آ سکی تھی۔ اُس نے سوچا ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ ہے [illegible] حد تک وہ خود ذمے دار ہے۔ وہ اکثر گھر سے باہر ہی تو رہتا ہے۔ خلیل نے فیصلہ کیا کہ اب وہ ہر روز جلد گھر آ جایا کرے گا اور فوزیہ اور اس کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اسے پاٹ کر ہی رہے گا۔

دوسرے دن وہ دفتر سے سیدھا گھر آ گیا لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی [illegible] سا لگا۔ مرقانی کمرے میں [illegible] صاحب [illegible] خلیل کو [illegible] سلیم نے مسرت کا اظہار کیا اور [illegible] ہونے کو کہا [illegible] کسی ضروری کام کا عذر پیش کرتے ہوئے [illegible] آ رہی تھی۔ بیزاری [illegible] کے عالم میں [illegible]

خلیل نے دفتر سے سیدھا [illegible] کو بہت کم [illegible] سلیم اکثر وہاں دکھائی [illegible] اُن کی بیگم کو بھی [illegible] کرتا تھا۔ ایک [illegible] تعریف بھی [illegible] انھیں کی زبانی [illegible] معلوم ہوا کہ سلیم نے [illegible] کوئی خط [illegible] خلیل کو شک گزرا کہ [illegible] کرے [illegible] کہیں فوزیہ سے [illegible] سلیم [illegible] خلیل کو [illegible] آتا تھا۔

خلیل زیادہ وقت [illegible] لگا تو اُسے فوزیہ سے [illegible] مواقع بھی زیادہ ملے۔ کئی دنوں [illegible] کوششوں کے بعد [illegible] ان دونوں کے درمیان حائل [illegible] فوزیہ اس سے [illegible] وہ اسے [illegible] پیدا [illegible] فوزیہ [illegible]

آگے اپنا دل کھول کر رکھ دے!

ایک دن کمپنی میٹنگ کی وجہ سے خلیل دیر سے گھر لوٹا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اس لئے سیدھا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور صرف خان صاحب کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ خان صاحب کسی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ خلیل دبے پاؤں اُس کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ یہ فیصلہ بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اندر جائے یا واپس لوٹ جائے، اُسے رُوحی کی آواز سُنائی دی جو غصّے کے عالم میں کچھ کہہ رہی تھی۔ خلیل کے قدم وہیں رُک گئے۔

"[illegible] جان! میں خلیل صاحب سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی!" رُوحی نے چیخ کر کہا۔

"بکواس بند کرو!" خان صاحب نے گرجدار آواز میں رُوحی کو ڈانٹا۔

یہ سُن کر خلیل اپنے کمرے کی طرف لوٹ پڑا۔ وہ کچھ اور سُننا نہیں چاہتا تھا۔ خان صاحب اب بھی گرج رہے تھے۔

خلیل کے دل و دماغ میں طوفان اُٹھ رہا تھا۔ وہ خود بھی رُوحی سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے باوجود رُوحی کے انکار سے اُس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل ہی خان صاحب سے کہہ دے گا کہ وہ فوزیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا جو رُوحی نے خود ہی شادی سے انکار کر دیا۔ شاید اُس آوارہ سلیم نے اُسے پھانس لیا ہے۔ رُوحی نے اُسے شوہر نہ بنایا ہوگا دونوں جہنم میں جائیں۔ مجھے کیا۔ بھلا فوزیہ اور رُوحی کا کیا مقابلہ! مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ رُوحی کس قماش کی لڑکی ہے۔ اس میں کتنی سطحیت ہے لیکن فوزیہ... کتنی بلند لڑکی ہے۔ فوزیہ سے شادی کر کے رُوحی کے منہ پر طمانچہ لگاؤں گا۔ یہ رُوحی اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ جہنم میں جائے رُوحی... اسی طرح سوچتے سوچتے اُسے نیند آ گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر سبھی جمع تھے۔ صرف فوزیہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر دن کی طرح خلیل کو دیکھ کر رُوحی آج بھی مسکرائی تھی۔ وہ اُسی بے تکلّفی سے باتیں کرنے لگی۔ اس لڑکی میں کتنی سطحیت ہے۔ خلیل نے سوچا۔ ناشتے کے بعد وہ اُٹھ کر ڈرائنگ رُوم میں جا بیٹھا۔ خلیل کے پیچھے ہی رُوحی بھی آ گئی۔

"بھائی جان! آپ کو ایک خوشی کی خبر سُنانا چاہتی ہوں۔" رُوحی نے کہا۔

"تو سُنایئے۔" خلیل نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک اچھا کام کیا ہے۔ آخر کار فوزیہ کی زندگی سنور گئی۔"

خلیل چونک پڑا۔ "صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے۔" خلیل پر جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔

"مجھے یہ کہتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ میں فوزیہ کی کچھ مدد کر سکی۔ کل فوزیہ نے سلیم کے ساتھ شادی کر لی سِول میرج۔ دونوں کی محبت آخر کار کامیاب ہو گئی۔"

ماہرِ نفسیات خلیل رُوحی کا مُنہ تکتا رہ گیا۔ وہ ہر روز کی طرح مُسکرا رہی تھی!!

غزل

ڈاکٹر امرت لعل عشرت ایم۔ اے۔ ڈی لٹ

تیری زلفوں سے یہ قائم ہے بھرم
ورنہ دنیا میں کبھی شام نہ ہو

جام سے پی لوں مگر ڈرتا ہوں
چشمِ ساقی کہیں بدنام نہ ہو

جامِ دبادہ سے بہلنے والو
آگ میں گردشِ ایام نہ ہو

شعر کی جان ہے جدت عشرت
کوئی مضمون ہو مگر عام نہ ہو

اوباش نوجوان ہوگا کس طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ دونوں ہی ذہنی اعتبار سے پست ہیں۔ کتنی گری ہوئی ہے یہ رُوحی۔ اپنی کرتوت پر پشیمان بھی نہیں۔"

"لیکن تم ... پوچھتے ہیں آپ ہے ہو؟" منطق و نفسیات کے طالب علم خلیل احمد ... نے دل جلے خلیل سے سوال کیا۔ کیا تم رُوحی سے محبت کرتے ہو؟ ... جھوٹ۔ ... ہوئی تو کیا ہوا۔ وہ میرے لئے آئیڈیل ... بن سکتی ہے ... خیالات کے تانے بانے اُلجھتے رہے۔

"... بھائی جان!" انھیں کسی نے رُوحی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ... اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ... سے باہر آئے تو سلیم نے ... جانے پینے کی تجویز پیش کی۔ رُوحی نے بڑی ... سے ہامی بھری ... نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا۔ ... اُس نے باتوں میں بہت کم حصہ لیا۔ یہاں اُسے معلوم ہوا کہ سلیم فوزیہ سے بھی ... خلیل کو سلیم ... بُرا نظر آنے لگا۔

"خلیل صاحب! آپ تو بالکل نہیں بول رہے ہیں؟" سلیم ایکا ایکی خلیل سے مخاطب ہوا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔" خلیل نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جی نہیں ضرور کوئی بات ہے۔" سلیم نے اصرار کیا۔

اس سے پہلے کہ خلیل کوئی جواب دیتا رُوحی نے سلیم سے کہا کہ وہ خلیل صاحب کی خاموشی کا غلط مطلب نہ نکالے۔

"خلیل صاحب ایک بڑے افسر ہیں، اکثر سوچتے رہتے ہیں۔" اُس نے کہا۔

نہ جانے کیوں خلیل کو رُوحی کی یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ پھر بھی وہ مسکرا دیا۔ ... جانے کے بعد سلیم نے رُوحی سے اجازت لی اور خلیل سے ملاقات پر دوبارہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ چلا گیا۔ رُوحی اپنی کار میں آئی تھی اُس نے خلیل کو ساتھ ہی گھر چلنے کو کہا۔ اُس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ خلیل کو طبیعت کچھ بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے گھر جانا ہی مناسب سمجھا۔

جب وہ دونوں ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے انھیں فوزیہ ہی نظر آئی جو ڈرائنگ رُوم میں بیٹھی کسی رسالے کا مطالعہ کر رہی تھی۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر فوزیہ کے چہرے پر ناگواری یا غصے کا تاثر بھی نظر نہ آیا۔ مسکراتے ہوئے اُس نے آنے والوں کا استقبال کیا اور پوچھا کیا وہ ان کے لئے چائے بنوائے؟

"نو تھینکس! ہم باہر پی کر آرہے ہیں۔" رُوحی نے اُس کی پیشکش مسترد کر دی۔

فوزیہ پھر پرچے کے مطالعے میں محو ہو گئی۔ خلیل فوزیہ کے اس رویے پر ٹھٹک گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اُسے رُوحی کے ساتھ دیکھ کر فوزیہ جل جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ خلیل اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سوچتے ہوئے خود ہی مسکرا پڑا۔ "وہ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ فوزیہ کوئی عام لڑکی تھوڑی ہے جو اپنا راز یوں فاش کرے گی۔ اُسے اپنے جذبات پر قابو حاصل ہے۔ وہ کتنی پُر وقار ہے" خلیل دل ہی دل میں فوزیہ کو سراہنے لگا۔ اُس کی نظروں میں فوزیہ کی وقعت اور بڑھ گئی۔

خلیل کو پورا یقین تھا کہ فوزیہ اُسے چاہتی ہے اور صرف اپنی فطری شرم و حیا کے باعث وہ اس کے قریب نہیں آسکی تھی۔ اُس نے سوچا ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کا ... وہ خود ذمے دار ہے۔ وہ اکثر گھر سے باہر ہی تو رہتا ہے۔ خلیل نے فیصلہ کیا کہ اب وہ ہر روز جلد گھر آجایا کرے گا اور فوزیہ اور اس کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اسے پاٹ کر ہی دم لے گا۔

دوسرے دن وہ دفتر سے سیدھا گھر آگیا لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی اُسے شاک سا لگا۔ ملاقاتی کمرے میں رُوحی کے ساتھ سلیم صاحب براجمان تھے خلیل کو دیکھ کر سلیم نے مسرت کا اظہار کیا اور اُسے اُن کے ساتھ شریک ہونے کو کہا۔ لیکن خلیل نے کسی ضروری کام کا عذر پیش کرتے ہوئے اپنے کمرے کی راہ لی۔ فوزیہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ بیزاری و مایوسی کے عالم میں وہ پھر گھر سے نکل پڑا۔

خلیل نے دفتر سے سیدھا گھر واپس ہونا اپنا معمول بنا لیا تھا لیکن وہ فوزیہ کو بہت کم دیکھ پاتا۔ سلیم اکثر وہاں دکھائی دینے لگا تھا۔ اُس نے خان صاحب اور اُن کی بیگم کو بھی رام کر لیا تھا۔ ایک موقع پر خان صاحب نے سلیم کے اخلاق کی بہت تعریف بھی کی اور انھیں کی زبانی خلیل کو معلوم ہوا کہ سلیم نے ایم۔ اے کیا ہے لیکن اُسے کوئی خاطر خواہ ملازمت نہیں مل سکی تھی۔ خلیل کو شک گزرا کہ چکنی چپڑی باتیں کرنے والا سلیم کہیں فوزیہ سے دوستی نہ بڑھا لے۔ سلیم اب خلیل کو رقیب نظر آنے لگا تھا۔

خلیل زیادہ وقت گھر میں گزارنے لگا تو اُسے فوزیہ سے بات کرنے کے مواقع بھی زیادہ ملے۔ کئی دنوں کی کوششوں کے بعد اجنبیت کی وہ دیوار بھی ٹوٹنے لگی جو اُن دونوں کے درمیان حائل تھی۔ اب فوزیہ اس سے بہت دیر باتیں بھی کر لیتی لیکن ان میں وہ بے تکلفی پیدا نہ ہو سکی جو خلیل کا مدعا تھی۔ فوزیہ کی شخصیت کا ایک حصہ اب بھی برف کی طرح سرد و منجمد تھا۔ خلیل کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ برف پگھل کر رہے گی۔ خلیل اُس دن کا منتظر تھا جبکہ یہ برف پگھل جائے اور وہ فوزیہ کے

آگے اپنا دل کھول کر رکھ دے!

ایک دن کمپنی میٹنگ کی وجہ سے خلیل دیر سے گھر لوٹا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اس لئے سیدھا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور صرف خان صاحب کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ خان صاحب کسی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے خلیل دبے پاؤں اُس کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ یہ فیصلہ بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اندر جائے یا واپس لوٹ جائے۔ روحی کی آواز سنائی دی جو غصے کے عالم میں کچھ کہہ رہی تھی۔ خلیل کے قدم وہیں رک گئے۔

"ابا جان! میں خلیل صاحب سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی!" روحی نے جیسے چیخ کر کہا۔

"بکواس بند کرو!" خان صاحب نے گرجدار آواز میں روحی کو ڈانٹا۔

یہ سُن کر خلیل اپنے کمرے کی طرف لوٹ پڑا۔ وہ کچھ اور سُننا نہیں چاہتا تھا۔ خان صاحب اب بھی گرج رہے تھے۔

خلیل کے دل و دماغ میں طوفان سا برپا تھا۔ وہ خود بھی روحی سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے باوجود روحی کے انکار سے اُس کے جذبات کو شدید چوٹ پہنچی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل ہی خان صاحب سے کہہ دے گا کہ وہ فوزیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا جو روحی نے خود ہی شادی سے انکار کر دیا۔ شاید اُس آوارہ سلیم نے اُسے پھانس لیا ہے۔ روحی نے اُسے شہہ دی ہوگی۔ دونوں جہنم میں جائیں۔ مجھے کیا۔ بھلا فوزیہ اور روحی کا کیا مقابلہ! مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ روحی کس قماش کی لڑکی ہے۔ اِس میں کتنی سطحیت ہے۔ لیکن فوزیہ . . . کتنی بلند لڑکی ہے۔ فوزیہ سے شادی کر کے روحی کے مُنہ پر طمانچہ لگاؤں گا۔ یہ روحی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ جہنم میں جائے روحی . . . اسی طرح سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر سبھی جمع تھے۔ صرف فوزیہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر دن کی طرح خلیل کو دیکھ کر روحی آج بھی مُسکرائی تھی۔ وہ اُسی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ اِس لڑکی میں کتنی سطحیت ہے۔ خلیل نے سوچا ناشتے کے بعد وہ اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ خلیل کے پیچھے ہی روحی بھی آ گئی۔

"بھائی جان! آپ کو ایک خوشی کی خبر سُنانا چاہتی ہوں۔" روحی نے کہا۔

"تو سُنایئے۔" خلیل نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک اچھا کام کیا ہے۔ آخرکار فوزیہ کی زندگی سُدھر گئی۔"

خلیل چونک پڑا۔ "صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے۔" خلیل پر جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔

"مجھے یہ کہتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ میں فوزیہ کی کچھ مدد کر سکی۔ کل فوزیہ نے سلیم کے ساتھ شادی کر لی۔ سول میرج۔ دونوں کی محبت آخرکار کامیاب ہو گئی۔"

ماہرِ نفسیات خلیل روحی کا مُنہ تکتا رہ گیا۔ وہ ہر روز کی طرح مُسکرا رہی تھی!!

غزل

ڈاکٹر امرت لعل عشرت ایم۔اے۔ڈی لٹ

تیری زلفوں سے یہ قائم ہے بھرم
ورنہ دنیا میں کبھی شام نہ ہو

جام سے پی لوں مگر ڈرتا ہوں
چشمِ ساقی کہیں بدنام نہ ہو

جام و بادہ سے بہلنے والو
تاک میں گردشِ ایام نہ ہو

شعر کی جان ہے جدت عشرت
کوئی مضموں ہو مگر عام نہ ہو


انہیں بچت کرنا
سکھا دیجئے
مستقبل کے
سدھار
کے لئے
اسٹیٹ بینک
خدمت کے لئے



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱● کریلا ــــــ موسمِ برسات کی ایک مفید سبزی

کریلا ایک لذیذ اور مرغوب ترکاری ہے۔ اس کا مزاج گرم و خشک ہے۔ یونانی اطباء اسے قابض اور ویدملین بتاتے ہیں۔ ہمارے ذاتی تجربے میں کریلا قبض کشا اور پیشاب آور ہے۔

برسات کے موسم کی سبزیوں میں کریلا سب سے زیادہ فائدہ بخش ہے۔ برسات کے موسم میں معدہ مختلف عوارض کا شکار ہوتا ہے۔ معدے کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے قدرت نے اس موسم میں کریلا پیدا کیا۔ کریلا معدے کے لئے ایک مفید غذا ہے۔ اس کا خصوصی فعل معدے میں مضر جراثیم اور کیڑوں کو ہلاک کرنا ہے۔ کریلا معدے کو قوت اور طاقت دیتا ہے۔

معدے کے علاوہ کریلا اعصاب اور پتّے کے امراض میں بھی مفید ہے۔ بادی اور بلغم کو خارج کرتا ہے، بھوک لگاتا ہے۔ بلغمی مزاج والوں کے لئے موثر غذا ہے۔ ذائقہ کی خرابی میں بہت مفید ہے۔

یہ پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتا ہے۔ پیٹ کے کیڑوں کے لئے حفظ ماتقدم کا بھی کام کرتا ہے۔ پیشاب لاتا ہے، ہیضہ میں فائدہ بخش ہے۔ استسقا، یرقان، تلی کے ورم، جوڑوں کے درد، لقوہ اور گٹھیا میں فائدہ بخش ہے۔ پتھری کو رفع کرتا ہے۔ اپھارے اور پیچش میں مفید ہے۔ ریاح اور بلغم کو تحلیل کرتا ہے۔ قوت باہ اور اعصاب کو تقویت دیتا ہے۔ کریلے کا رس قبض کشا ہے۔ بادی بواسیر کے لئے مفید ہے۔

کریلا ذیابیطس (ڈائبیٹز) کے مریضوں کے لئے تو ایک نعمت ہے۔ قدیم یونانی اطبا ہی کی رائے میں نہیں، جدید سائنسی تحقیق سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ کریلا ذیابیطس کے لئے بے حد مفید ہے۔ ایک مشہور سائنسداں نے کریلے سے ایسا جوہر نکالا ہے جو ذیابیطس کے لئے موثر ہے۔ ڈاکٹر ذیابیطس کے مریضوں کو گولڈ کلورائیڈ کے مرکبات اور قیمتی انجکشن لگاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں کریلا زیادہ مفید ہے۔

کریلا گوناگوں خصوصیات و خواص کا حامل ہے۔ غذائی اجزاء سے بھی بھرپور ہے۔ اس میں پروٹین، چکنائی، نشاستہ دار اجزاء، چونا اور فاسفورس ہے۔ اس میں فولاد کی نمایاں مقدار پائی جاتی ہے۔ ایک چھٹانک کریلے میں چودہ غذائی حرارے (کیلوریز) قوت ہوتی ہے۔

کریلے کی تلخی دور کرنے کے لئے اسے پکاتے وقت اس کا چھلکا دور کر دیتے ہیں۔ ایسا نہ کرنا چاہئے۔ کریلے کے چھلکے میں نہایت مفید غذائی اجزاء ہوتے ہیں۔ اس لئے تلخی دور کرنے کے لئے چھلکا الگ کرنے کی بجائے خوب اچھی طرح سے دھو دینا چاہئے۔ تاکہ مفید اجزاء ضائع نہ ہوں۔

۲● اپنی غذا پر توجہ کیجئے

کتنی تلخ حقیقت ہے کہ آپ ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں۔ مکان کی آرائش و زیبائش پر توجہ کرتے ہیں۔ اپنے لباس و پوشاک کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برتتے۔ لیکن آپ کی غذا، آپ کی خوراک آپ کی توجہ سے محروم ہے۔ حالانکہ یہ روشن حقیقت ہے کہ آپ اپنی غذا کی طرف مناسب توجہ کریں تو اپنی عمر اور جوانی کی مدت میں یقیناً اضافہ کر سکتے ہیں۔

ممتاز ماہر غذائیات کیلارڈ کارڈیل نے مشورہ دیا ہے ــــــ کیا آپ اپنی عمر دراز کرنا چاہتے ہیں؟ اپنی جوانی کی مدت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں؟ اپنی جسمانی اور نفسیاتی قوت، اپنی مردانہ طاقت، ذوقِ حیات، حوصلہ مندی، جرأت و

ہمت کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ ضرور حاصل کر سکتے ہیں، یقین رکھئے، حوصلہ نہ ہاریئے۔

ماہرینِ غذائیات سائنس دان روز بروز زیادہ وثوق کے ساتھ ثابت کر رہے ہیں کہ ہماری بہت سی بیماریاں ناقص غذا اور غلط خوراک کی عادتوں کی وجہ سے شروع ہوتی ہیں۔

اگر آپ طویل اور صحت مند زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ سستی، ہونٹ، معدے کی تیزابیت اور وقت سے پہلے بڑھاپا لانے والی زندگی آپ کو موت کی طرف نہ لے جائے تو مستقل طور پر اپنی خوراک، اس کی نوعیت اور اپنی غذائی عادتوں کا جائزہ لیجیے۔

اعلیٰ توانائی بخش غذائیں نشاستہ، شکر جنھیں آپ اب سے پہلے ابتدائی نوجوانی میں بغیر کسی نقصان کے برداشت کر سکتے تھے، وہ اب آپ کو ضعیف، سست اور کام چور بنا دیں گی اور آپ کے خطرناک مقامات پر چربی کا جماؤ پیدا کر دیں گی۔

تیس سال کی عمر کو پہنچنے پر اور چالیس سال کی عمر ہونے پر ضرور اپنی غذا اور خوراک کا جائزہ لیجیے۔ اس عمر میں آپ کو پروٹین غذائیں (گوشت، مچھلی، انڈے وغیرہ) زیادہ کھانی چاہئیں اور وٹامن سے بھرپور پھل اور سبزی ترکاریاں بھی کافی مقدار میں استعمال کرنی چاہئیں اور زیادہ نشاستہ آمیز غذائیں (سفید چاول، چینی، میدہ، بسکٹ، پیسٹری وغیرہ) اور چربی پیدا کرنے والی مٹھائیاں، مشروبات اور شراب وغیرہ کے استعمال میں نہ صرف کمی بلکہ بالکل پرہیز کرنا چاہئے۔ کھانے کے بعد مٹھائیوں کی بجائے پھل استعمال کیجئے۔

بچپن، لڑکپن اور ابتدائی نوجوانی کے زمانے میں تو آپ غذائی بے اعتدالیوں اور بے احتیاطیوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن چالیس سال کی عمر گزرنے کے بعد بھی غیر محتاط غذائی عادت کو بدستور جاری رکھیں گے تو بلاشبہ اس کا خمیازہ آپ کو ضرور بھگتنا پڑے گا۔

۳ • مقدر کا ستارہ

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "جیسا ہم سوچتے ہیں ویسا ہی بن جاتے ہیں۔ ہماری زندگی ہمارے خیالات سے عبارت ہے۔ اپنی امید سے بڑھ کر آپ کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگ اپنی مایوسیوں ہی کے باعث اپنی خداداد صلاحیتوں کو ناکارہ کر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے ہمیشہ اپنی غریبی، دوستوں کی کمی وغیرہ ان گنت مایوسیوں کا تصور کر کے وہ خود اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں"۔

ایک دوسرے مفکر نے ان الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے ـــــ "اپنی امیدوں سے زیادہ آپ نہیں بن سکتے"۔

خدا نے ہمارے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں پیدا کی ہے جسے ہم پورا نہ کر سکیں۔ انسان کا خوبصورت صحت مند جسم اور روشن دماغ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا نے ہمیں زندگی کو عظیم بنانے کے لئے بھیجا ہے۔ اگر آج آپ کی زندگی پر مایوسیوں اور مصیبتوں کی تاریکی چھائی ہوئی ہے تو فکر نہ کیجئے۔ بس اپنی منزل کی طرف ہمت سے گامزن رہیئے۔ پروا نہیں اگر آپ کے راستے میں ہزاروں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ لوگ آپ کو سودائی اور خبطی کہتے ہیں۔ عیسیٰ اور بدھ کی عظیم شخصیت ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ اپنی روح کی آواز سنتے ہوئے آگے بڑھتے رہو۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کے لئے تمھیں بہت قربانیاں کرنی پڑیں گی، لیکن استقلال سے اپنے مقصد پر قائم رہیں اور ایک لمحے کے لئے بھی اُسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ کیونکہ وہی آپ کا سنہرا مستقبل ہے، وہی آپ کے مقدر کا ستارہ ہے، جس کی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے آپ بہت جلد تاریکیوں کو چیر کر حسن اور کامرانی کی دھرتی پر قدم رکھیں گے۔ آج آپ یہ نہ سمجھ پائیں کہ وہ تابندہ ستارہ اتنی دور کیوں چمکتا ہے۔ اس کے راستے میں مشکلات کے اتنے کوہِ گراں کیوں کھڑے ہیں، لیکن یقین رکھیے اگر آپ اسی کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں گے تو ایک دن وہاں ضرور پہنچ جائیں گے۔

۴ • کامیابی کی محبوبہ

ہر انسان کامیابی کی محبوبہ کو رام کرنا چاہتا ہے، لیکن کامیابی کی محبوبہ کس طرح رام ہوتی ہے، یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں ـــــ مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے۔ "کامیابی کی محبوبہ کو رام کرنا چاہتے ہو تو مایوسی، بزدلی اور رنج کو اپنی ذات تک اپنے پاس تک نہ آنے دو۔ انھیں دل و دماغ سے نکال ڈالو کیونکہ یہ انسان کی ہمت اور حوصلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں ـــــ تمھاری راہ میں مشکلات کے کوہِ گراں ہوں تو کوئی فکر کوئی اندیشہ نہ کرو، مشکل سے مشکل کام درپیش آئے تو ہمت کبھی نہ ہارو۔ اپنا کام کرتے جاؤ۔ مشکلات سے ہراساں ہونا مردوں کا شیوہ نہیں۔

کامیابی کی محبوبہ کو رام کرنا چاہتے ہو تو خود فراموشی اساسِ زندگی ہے۔ کم ہمت، بے حوصلہ لوگوں کے سائے سے بھی دور رہو"۔

۵ • خار دار جولائی

بظاہر حقیر گھاس ہے لیکن درحقیقت قدرت کا بڑا عطیہ ہے۔ یہ بہ مسافت

میں خودرو ہوتی ہے۔ اس کا ساگ نہیں کھایا جاتا بلکہ اس میں دوائی افادیت بہت زیادہ ہے۔ بچھو اور سانپ کا زہر رفع کرنے کے لئے اسے قوی الاثر بتایا جاتا ہے۔ اس کی جڑ پانی میں پیس چھان کر پلائی جاتی ہے۔ بعض تجربہ کرنے والوں کا بیان ہے کہ کوئی پارہ کا خام کشتہ کھانے اور فساد خون اور دوسرے عوارض میں مبتلا ہو جائے تو اُسے بلا مرچوں کا خسارہ دار چولائی کا ساگ صرف نمک ڈال کر کھلایا جائے اور پانی کی جگہ اسی چولائی کا جوشاندہ پلایا جائے تو پارے کا سارا خام کشتہ پیشاب کے ساتھ خارج ہو جاتا ہے۔

٦ • کتنی بڑی حرماں نصیبی ہے!

کتنی بڑی حرماں نصیبی ہے کہ اُس مُلک کے بالغ تو درکنار ابتدائی اور ثانوی اسکول کے بچے بھی تمباکو نوشی کی بدعادت میں مُبتلا ہوں جس کی آبادی کی اکثریت کو متوازن غذا میسّر نہیں ہوتی اور جو اپنی روکھی سوکھی روٹی کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج ہے۔ یہ روٹی بھی اُسے پیٹ بھر کر نہیں ملتی اور جس اناج سے یہ روٹی تیار ہوتی ہے، دولت مند ممالک اُسے ناقص سمجھ کر ضائع کر دیتے ہیں یا غریب ممالک کے ہاتھوں اُسے فروخت کر دیتے ہیں۔ اس پر چائے اور تمباکو کی گرم بازاری عذاب بالائے عذاب ہے! تمباکو سے سرطان ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قلب، پھیپھڑے اور ہوا کی نالیوں کے دوسرے مہلک امراض بھی پیدا ہوتے ہیں۔ تمباکو اعصاب و دماغ کے لئے بھی بہت مضر ہے۔

ضرورت ہے کہ تمباکو، چائے، کافی، شراب، اسپرین اور خواب آور گولیوں جیسی مضر چیزوں کے نقصانات اور صحت مند زندگی کے اصول ہر چھوٹے بڑے اور ادنیٰ و اعلیٰ کو بتائے اور سکھلائے جائیں۔ ہماری زندگی قابلِ رشک زندگی نہیں بن سکتی اگر عورتوں اور مردوں کی اکثریت صحت مند زندگی کے اصولوں سے ناواقف یا بے خبر ہو۔

۷ • یقین کی طاقت

ایک امریکی مفکّر نے لکھا ہے ـــــ "یقین کی طاقت اور بصیرت کے تناسب سے ہماری زندگی شاندار یا معمولی عظیم یا کمتر ہو جاتی ہے۔ یقین ہی ہے جو زندگی کے حقیقی سرچشمے کے بند دروازے کھول دیتا ہے۔ اپنے یقین کے ذریعے ہم اُس لامحدود ہستی، اُس مالکِ کُل کی بارگاہ تک پہنچ سکتے ہیں جس کا تصوّر ہی حیات بخش ہے۔ اُس کی ذات پر یقین ہمیں اپنی ذات پر بھی اعتماد بخش دیتا ہے۔ تب ہماری زندگی راہ میں حائل ہونے والی مشکلات کو خاطر میں نہ لاتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود کی جانب فتح مند لشکر کے ٹولیوں کی طرح بن جاتی ہے۔"

ایک دوسرے مشرقی مفکّر نے لکھا ہے "مشاہدات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جب انسانی جسم طبی خرابیوں یا بیماریوں میں مبتلا ہو تو دماغ کے صحت افزا، حیات بخش اور تخلیقی قوی کو مرکوز کر کے طبی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ خدائی ضوابط کا ہم جتنا گہرا مطالعہ کریں اُسی قدر ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی جائے گی کہ خدا نے ہمیں اُس سے زیادہ طاقتیں ودیعت کی ہیں جتنی کہ ہم میں سے کسی نے استعمال کی ہیں۔

خدا نے انسان کو غور و فکر کی طاقت، یقین کی توانائی بخشی ہے۔ اس طرح اُس نے ہمیں اپنی تخلیقی طاقتوں میں تصرّف کا ملکہ عطا فرمایا ہے جس سے بڑی دُنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ اگر تم خدا سے اُمید اور یقین کی استدعا اور التجا کرو تو وہ تمہارے اندر نئی رُوح ڈال دے گا۔ جو زندگی کی ہر منزل، ہر مرحلے پر تمہارا ساتھ دے گی۔ تم اس یقین کی مدد سے زندگی میں حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتے ہو ـــــ بشرطیکہ تم دل سے ایسا چاہو۔"

۸ • اپنے کو پہچانئے

فرینک کرین کا قول ہے ـــــ "عظیم مرشد وہ ہوتے ہیں جو آپ کو ایسی فہم و بصیرت عطا کرتے ہیں جس سے آپ اپنے کو پہچان سکیں۔"

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "بیرونی مدد کے سہارے ہم اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ مصیبتیں جھیلتے اور مشکلات پر فتح حاصل کرتے ہوئے ہم جس ہمّت اور قابلیت سے کام لیتے ہیں وہی صحیح معنی میں ہماری شخصیت کا ارتقا ہے۔ حیرت ہے کہ لوگ پھر بھی دوسروں کا منہ دیکھتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ یہی شکایت رہتی ہے کہ انھیں کامیابی کی راہ میں مدد دینے والا کوئی نہ ملا" ـــــ کاش! وہ جان سکتے کہ اپنے سچے بہی خواہ وہ خود ہیں! اُن کا سچا ساتھی اپنی قابلیت ہے جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتی ہے۔

آج ہمارے چاروں طرف جو لوگ ہیں وہ ادھوری اور نامکمل زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زندگی کے وسیع ریگستان میں چند خود شناس لوگوں نے کہیں کہیں کچھ نخلستان بنا دئے ہیں۔ باقی سب بنجر ہی بنجر نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ یہ نہیں سمجھ سکے کہ دُنیا کی بازی گاہ میں ایک اہم کردار انھیں بھی ادا کرنا ہے۔ آج کے نوجوانوں کو اپنی صلاحیتوں کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہے۔ ہماری درسگاہیں بھی اپنے آپ کو پہچاننے میں انھیں پوری مدد نہیں دیتیں۔

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سکول آف نرسنگ

صفدر جنگ ہسپتال نئی دہلی - 16

جنرل نرسنگ / مڈوائیفری میں ٹریننگ

مطبوعہ فارموں پر جنہیں اُمیدواروں کو اپنے ہاتھ سے پُر کرنا ہوگا درخواستیں طلب کی جاتی ہیں جو ۱۹ اگست ۱۹۶۸ء تک اس آفس میں پہنچ جانی چاہئیں۔ غیر شادی شدہ یا بیوہ مستورات جن پر اولاد کی ذمہ داری نہیں ہونی چاہئے کی جانب سے مندرجہ ذیل کورسز کے لئے طلب کی جاتی ہیں۔

۱۔ جنرل نرسنگ (15 سیٹیں)

ٹریننگ کی میعاد : تین سال

قابلیت : میٹرکولیشن یا ہائر سیکنڈری، انٹرمیڈیٹ یا گریجویٹس کو ترجیح دی جائے گی۔

عمر : ۱۷ سال سے کم نہیں ہونی چاہئے۔

اُمیدواروں کو انگریزی اور جنرل نالج کے تحریری ٹیسٹ میں بیٹھنا ہوگا اور کامیاب اُمیدواروں کو قطعی انتخاب کے لئے انٹرویو دینا ہوگا۔

۲۔ مڈوائیفری، ٹریننگ کی میعاد 6 مہینے

قابلیت : اے گریڈ رجسٹرڈ نرس۔ اُمیدواروں کو انٹرویو کے لئے حاضر ہونا پڑے گا جس کے متعلق انہیں الگ اطلاعات دی جائیں گی۔

یہ سیٹیں شیڈولڈ کاسٹس / ٹرائبس اُمیدواروں کے لئے ریزرو ہیں۔ اگر ان میں سے موزوں اُمیدوار نہ مل سکے تو ان آسامیوں کو دوسری جاتیوں سے پُر کیا جائے گا۔

وظیفہ : مذکورہ بالا کورسز جن میں میس، وردی، دھوبی چارجز شامل ہیں کے واسطے -/100 روپیہ ماہوار ہے اور فری فرنشڈ ایک چارپائی والا کمرہ مہیا کیا جائے گا۔ نرس کو ہوسٹل میں سکونت رکھنا ضروری ہے۔

درخواست فارم میٹرنز آفس سے کسی کاروباری یوم کو صبح 9 بجے سے شام کے 4 بجے تک ماسوائے سنیچر وار حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

نامکمل درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ٹیسٹ / انٹرویو کے لئے کوئی سفر خرچ نہیں دیا جائے گا۔

DAVP 550(72)IV/68

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین سے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب لکھنے کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سوال و جواب

خورشید انور بی۔ اے۔ جگتل۔ ۲۴ پرگنہ

س۔ زندگی کی اُلجھنوں کا علاج؟

ج۔ زندگی کی اُلجھنوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا۔

س۔ جب تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی ہے تو اُن میں حق اور باطل، اچھے اور بُرے کا سوال کیوں پیدا ہوتا ہے؟

ج۔ اس کی وجہ لوگوں کی کم بینی و بصیرت سے محرومی ہے۔

س۔ اکبر الہ آبادی کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

مونا نوید۔ حیدر آباد

س۔ خوشتر بھیا! سہیلی کے بھائی کو بھائی سمجھ کر بے تکلف ہونا کہاں تک دُرست ہے؟

ج۔ سہیلی کے بھائی کو بھائی سمجھ کر بے تکلف ہونا درست نہیں۔

س۔ "ہندو ہے ایک آنکھ مسلمان دوسری"! آپ کے اس مخصوص جواب پر میری ایک سہیلی کہتی ہے، آپ کی ایک آنکھ یقیناً جہنم کے شعلوں کی نذر ہوگی۔ بتایئے اُسے کیا جواب دوں؟

ج۔ اپنی سہیلی سے کہئے، خدا کے رحیم و کریم ہونے پر ہمارا ایمان ہے۔

محمد مصطفٰے علی۔ عمر اسٹریٹ۔ بمبئی

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ زندگی ہے غم و مسرت کا مختصر اور طویل افسانہ

س۔ اگر صبر کا دامن چھوٹ گیا ہو تو؟

ج۔ پھر پکڑ لینا چاہئے۔

میمونہ داؤد۔ مالیگاؤں۔ قلابہ

س۔ کیا مفلسی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟

ج۔ جی نہیں۔ عروسِ ترقی سے ہمکنار ہونے کے لئے دولت سے زیادہ بلند حوصلہ اور ہمت ضروری ہے۔

س۔ جب عورت رُوٹھ جاتی ہے تو میکے چلی جاتی ہے۔ جب مرد کو غصہ آجائے تو کدھر چلا جاتا ہے؟

ج۔ اپنی ہی آگ میں جلے!

محفوظ الرحمٰن۔ دہلی

س۔ آج کی بڑھتی ہوئی گرانی کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟

ج۔ ذخیرہ اندوزوں کو من مانی کرنے کے لئے چھوٹ دے کر!

س۔ اگر دُنیا میں موت نہ ہوتی تو؟

ج۔ لوگ بے موت مرجاتے!

حبیب عبداللہ الکاف۔ نظام آباد

س۔ غم اگر زندگی کا ساتھ نہ چھوڑے تو؟

ج۔ زندگی کو غم کا ساتھ چھوڑ دینا چاہئے۔

س۔ دیش کی بدحالی دُور کرنے کے لئے کیسے لوگوں کا تعاون بہت ضروری ہے؟

ج۔ ایسے لیڈروں کا جو عمل سے یکسر عاری ہوں تو ہوں لیکن اسٹیج پر دیش کو خوشحال بنانے کے موضوع پر دھواں دھار تقریریں کرسکیں!

سید قدرت علی۔ جلگاؤں

س۔ خوشتر بھیا! یہ ایٹمی تجربے کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے!

س۔ نئی نئی ایجادات کے باوجود انسان بدحال کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ [illegible] کے طفیل انسان کی ضروریات زندگی میں ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا ہے۔

س۔ کسی خاتون کا شعر سنائیے۔

ج۔ زیب النساء زیب کا ایک شعر سنئے ؎

ہر وقت کا [illegible] سہارا ہے
جو حوصلہ ہو تو ہر موج میں کنارا ہے

مظفر حسین۔ آسنسول

س۔ خوشتر بھائی! زندگی میں کامیابی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟

ج۔ کامیاب انسانوں کے نقش قدم پر چل کر!

س۔ کامیابی کے لئے کیا کیا شرائط ضروری ہیں؟

ج۔ عزم محکم، جہد پیہم!

قاضی سعید الدین۔ بدنیرہ گنگائی

س۔ خوشگوار زندگی کس طرح گزاری جا سکتی ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر، نیکی کی راہ پر چل کر۔

س۔ انسان اداس کب ہوتا ہے؟

ج۔ جب اس کے دل کے حرم میں امید کی شمع بجھ جاتی ہے۔

شبیر احمد بیدل۔ ٹھاکر گنج

س۔ ہندوستان میں فرقہ پرستی کس کے بل بوتے پر قائم ہے؟

ج۔ حکومت کے فرض ناشناس حکام کے طفیل!

س۔ زندگی کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہو تو؟

ج۔ تب بھی حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے — جو حوصلہ ہو تو ہر موج میں کنارا ہے!

اے۔ رشید۔ بشری پور

س۔ انسان کس چیز سے بگڑتا ہے؟

ج۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں، بہت سی ایسی باتیں ہیں — بری عادت، بری صحبت، بری طینت!

س۔ شعلہ اور شبنم؟

ج۔ حالات عورت کو کبھی شعلہ بنا دیتے ہیں، کبھی شبنم!

س۔ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

مظہر الحق۔ بوا کلیانی

س۔ دوست کی وفاداری کا ٹھوس ثبوت کیا ہے؟

ج۔ سچا دوست پریشان حالی میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا، منہ نہیں موڑتا، آنکھیں نہیں پھیرتا۔

س۔ بعض لوگ خوشیوں کے اسباب کی موجودگی میں بھی آزردہ اور ملول رہنے کے عادی کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ ایسے لوگ [illegible] عالم وجود میں آتے ہوں گے۔

قدیر محمد خاں۔ تاریخ بھیٹر۔ آندھرا

س۔ طالب علم کی کامیابی کا راز؟

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر صرف کرنا۔

س۔ علم کے لئے عمل ضروری ہے یا عمل کے لئے علم؟

ج۔ دونوں کے لئے دونوں ضروری ہیں۔

اشرف علی۔ بنارس

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اردو نثر کی پہلی کتاب کس نے لکھی اور کب لکھی؟

ج۔ خواجہ اشرف جہانگیری نے [illegible]ھ میں لکھی۔

ابوالوری خاں۔ حسین پورہ۔ سارن

س۔ بھیا! واردات قلبیہ کا بیان عموماً اردو ادب کی کس صنف شاعری میں زیادہ ہوتا ہے؟

ج۔ غزل میں۔

س۔ وجدانی کیفیات میں مستی گفتار کا کیا نام ہے؟

ج۔ تاثر بکنار اشعار!

س۔ زندگی کی ہماہمی اور رونق کس چیز کی بدولت ہے؟

ج۔ دل کی بدولت!

محمد نجم الدین [illegible] پور [illegible]

س۔ کیا عورت مردوں [illegible]

ج۔ [illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

شہاب الدین بیدل۔ رامپور منہاراں

س۔ اُردو مسلمانوں کی، ہندی ہندوؤں کی، تو پھر جو ہمارے مُنہ میں زبان ہے، یہ کس کی ہے؟

ج۔ یہ تو اُنھیں لوگوں سے پوچھیے جو کہتے ہیں، اُردو مسلمانوں کی، ہندی ہندوؤں کی ہے۔

س۔ وہ کون سی بات ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب نہیں ہونے دیتی؟

ج۔ تعصب اور تنگ دلی!

رفیعہ بانو۔ سیتاپور

س۔ کیا دس میں مسلمان ہیں؟

ج۔ دس پانچ، سو دو سو نہیں۔ تقریباً ایک کروڑ ۵۰ لاکھ مسلمان ہیں۔

سی۔ ایم۔ ہارون۔ نیولی

س۔ زندگی کب حسین معلوم ہوتی ہے؟ —— شادی سے پہلے، شادی کے بعد؟

ج۔ شادی کے بعد۔

س۔ بھیا! مہذب بننے کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے یا اچھے ماحول کی؟"

ج۔ دونوں کی۔

مس ذکیہ زیدی۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ ایک قطعہ سنیئے ؎

رہبر کے گو ٹنٹ پی رہا ہوں میں
دل کے زخموں کو سی رہا ہوں میں
غم کا بار گراں ہے کاندھوں پر
پھر بھی خوش ہو کے جی رہا ہوں میں

ابو طاہر عرب۔ امری عرب۔ اکولہ

س۔ خوشتر بھیا! ہندوستان اُردو زبان کے نعرہ "انقلاب زندہ باد" کی گونج سے آزاد ہوا پھر بھی اُردو کے بدخواہ اُردو سے اتنی دشمنی کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ تعصب نے انھیں انصاف سے دُور کر دیا ہے۔

س۔ غالب کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ضیاء الدین قریشی۔ اعظم گڑھ

س۔ بھائی جان! کوئی خوبصورت شعر سنائیے۔

ج۔ سنیئے ؎

مہرباں ہے وہ تو راہِ زندگی میں دُور تک
دُھوپ کیا ہے سایۂ سروِ چمن ہے دوستو!

س۔ آپ بتا سکتے ہیں یہ شعر کس کا ہے؟

اجل خود کانپتی ہے زندگی سے
اجل کی زندگی پر دسترس کیا

ج۔ یہ شعر حضرت جگر مرادآبادی کا ہے۔

نثار احمد مؤمن۔ بھیونڈی

س۔ لاؤڈ اسپیکر کی اُردو کیا ہے؟

ج۔ اُردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ لاؤڈ اسپیکر اُردو میں آکر اُردو بن گیا ہے۔

س۔ کیا انسان کالج کی ڈگری ہی سے بڑا آدمی بنتا ہے؟

ج۔ یہ ضروری نہیں۔

عبدالحق انصاری الہ آبادی۔ الہ آباد

س۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ آپ الہ آبادی ہیں۔ آپ کو حضرت اکبر الہ آبادی کا شعر سنانا چاہیئے۔ خیر ہم سے ایک شعر سنیئے ؎

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

قُدسیہ بیگم۔ دھولیہ

س۔ اُردو زبان کے موضوع پر کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ایک ہی کیوں کئی اشعار سنیئے ؎

کتنی میٹھی زباں، کیسی پیاری زباں
میری اُردو زباں، فخرِ ہندوستاں
اِس میں رادھا کے پائل کی جھنکار ہے
زُلفِ زیب النساء کی بھی مہکار ہے
اِس میں جھانسی کی رانی کی للکار ہے
اس کے دامن میں ہیں کتنی رنگینیاں
میری اُردو زباں، فخرِ ہندوستاں

عصمت بانو۔ پٹنہ

س۔ کیا غربت ایک بلا ہے؟

ج۔ جی ہاں، خوفناک بلا!

س۔ غالب کا ایک اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ غالب کے سارے اشعار اچھے ہیں۔ ایک شعر سنیئے ؎

نہ گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اقبال راہی تماپوری

س۔ آخر کب تک ہندوستان، چین اور پاکستان کا خطرہ برقرار رہے گا؟

ج۔ جب تک فرقہ پرست اپنے تعصب اور تنگ دلی سے مُلک کی یکجہتی کا شیرازہ بکھیرتے رہیں گے۔

ثروت حسین۔ حیدر آباد

س۔ دُنیا میں سب سے زیادہ کس قوم کے لوگ ہیں؟ میرا ایک ہندو دوست کہتا ہے، دُنیا میں سب سے زیادہ ہندو ہیں۔

ج۔ دُنیا میں سب سے زیادہ عیسائی ہیں۔

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دُنیا کی آبادی میں کس تناسب سے اضافہ ہو رہا ہے؟

ج۔ تناسب نہیں بلکہ رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے پوچھیئے۔۔۔ ماہرین کے بیان کے مطابق انسانی آبادی میں سالانہ سات کروڑ کا اضافہ ہو رہا ہے۔

نجمہ جمیل۔ عادل آباد۔ دکن

س۔ بیسویں صدی کے ایک سالنامہ میں آپ نے جناب آسی رام نگری کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔۔۔ آسی رام نگری کا دوسرا نام خوشتر گرامی ہے۔۔۔ کیا آپ اپنے اس بیان کی وضاحت فرمائیں گے؟

ج۔ حیرت ہے کہ اتنی واضح بات آپ کو وضاحت طلب معلوم ہوتی۔

محمد عبد الباری صدیقی۔ ربت نگر۔ پربھنی

س۔ انسانیت کا پلنگ، ایمان کا بستر، ضمیر کا تکیہ، دولت کی چادر، شیطانیت کے خواب اور تعبیر؟

ج۔ ایسے خواب کی تعبیر بھی آپ ہی کا ذہن رسا بتا سکتا ہے!

محمد لئیق اختر۔ بسرا (اڑیسہ)

س۔ خوشتر بھیا اپنے استاد اور شاگرد میں گرو اور چیلے کا رشتہ قائم تھا کیا آپ کے خیال میں یہ رشتہ کبھی قائم ہے؟

ج۔ اب تو چیلے گرو کو اپنے پاؤں کی گرد بھی نہیں سمجھتے۔

رشید الظفر خاں شاہجہانپوری۔ کانپور

س۔ محبت میں مسلسل ناکامی کے بعد انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اس پاگل پن سے توبہ کر لینا چاہئے۔

س۔ محبت کرنے والوں کو خوشی زیادہ ملتی ہے یا رنج و ملال؟

ج۔ محبت کا دوسرا نام ہی رنج و ملال ہے!

آفتاب احمد۔ آسنسول

س۔ چین میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ ۵ کروڑ۔

عبدالرشید۔ جمونیاں۔ چمپارن

س۔ میں نے ایک افسانہ "کسک" لکھا ہے۔ کیا آپ اُسے بیسویں صدی میں جگہ دیں گے؟

ج۔ بیسویں صدی کے معیار کے مطابق ہوگا تو ضرور جگہ پائے گا۔

س۔ افسانہ نگار بننے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ یہ جاننے کے لئے جناب آسی رام نگری سے رجوع فرمایئے۔ اُن کا پتہ یہ ہے:۔
جناب آسی رام نگری، مغل سرائے (بنارس)

مُسلم آزاد۔ رمضان پور

س۔ عورت اور مرد میں سب سے زیادہ فرق کیا ہوتا ہے؟

ج۔ اپنے شوہر کے ساتھ اُس کی چتا پر جل جانے والی عورت کو مرد بے وفا کہتا ہے۔ عورت مرد کی طرح منکر وفا نہیں ہوتی۔

س۔ خوشتر بھیا! فسادات کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ سیاسی مفاد کی خاطر عوام کو دھرم اور مذہب کے نام پر اشتعال دلانے اور حسین فریب دینے سے۔

س۔ آج کے لیڈر دیش کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

ج۔ دیش کی تعمیر کے نام پر دیش کی تخریب کے درپے ہیں۔

نجم الحسن لاری۔ شفیع آباد۔ کانپور

س۔ آج ہندوستان کے فرقہ پرست اور مذہبی پارٹیوں کے برسرِ اقتدار لیڈر اقلیت سے اُس کے کلچر اور زبان کو چھیننے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اگر اقلیت اپنے کلچر اور زبان کے تحفظ کے لئے اُردو کا حق مانگتی ہے تو اُسے پاکستانی ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ خوشتر بھیا! کیا یہی جمہوریت ہے؟

ج۔ کاش ایسے انصافی کرنے والوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہوتا!

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ انسان پر ماحول کا اثر پڑتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ملٹن کا یہ قول غلط ثابت ہوتا ہے ——— "انسانی ذہن خود اپنا مقام ہے، وہ بہشت کو دوزخ اور دوزخ کو بہشت بنا سکتا ہے"

ج۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ ملٹن نے یہ کہا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان پر ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔

حارث نعمانی۔ رُدولی شریف

س۔ "بیسویں صدی" میں ہر ماہ بزرگانِ دین اور دانشوروں کے جو زرّیں اقوال شائع ہوتے ہیں۔ کیا وہ کتابی شکل میں مل سکتے ہیں؟

ج۔ ہمارے ہاں برائے فروخت ایسی کوئی کتاب نہیں ہے۔

س۔ کیا دوست سے محبوب کی طرح پاک محبت کی جا سکتی ہے؟

ج۔ کیوں نہیں؟

س۔ کیا اس دُنیا میں وفادار دوست عنقا ہوگئے ہیں؟

ج۔ عنقا نہیں ہوگئے۔ چین چلے گئے!

قیصر صدیقی۔ اریہ کورٹ۔ پورنیہ

س۔ عزت، عظمت اور شہرت ان تینوں میں کیا تعلق ہے؟

ج۔ عزت و عظمت میں چولی دامن کا تعلق ہے۔ شہرت عزت و عظمت کھو کر بھی مل جاتی ہے۔

س۔ بھائی جان افکر تونسوی، کنھیا لال کپور، غلام احمد فرقت کاکوروی اور نریش کمار شاد ان چاروں میں زیادہ مزاحیہ اور طنزیہ لکھنے والے کون ہیں؟

ج۔ شاد مزاح نگار نہیں ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر فوقیت دینا مناسب نہیں ——— جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے!

شاہ ناز شاز نقوی۔ کاسگنج۔ ایٹہ

س۔ کیا شخصیت کے کالم میں کبھی آپ اپنے ہی قلم سے اپنے بارے میں بھی روشنی ڈالنا گوارا کریں گے؟

ج۔ شخصیت کے کالم میں اُن لوگوں کی شخصیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے، جن کی شخصیت میں کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور ہم ——— جن کی صورت ہے دیدنی نہ ہیں احوال گفتنی!

کاغذ کی قیمت میں تقریباً ۲۵ فیصدی اضافہ ہوگیا ہے۔ محصول ڈاک تین گنا بڑھ گیا ہے۔ وی۔ پی خرچ، رجسٹری خرچ، کارڈ اور لفافے کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے ——— ان دنوں حالات "بیسویں صدی" کی قیمت بڑھائی جائے یا صفحات کم کئے جائیں؟ اس کا فیصلہ قارئین "بیسویں صدی" کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ "بیسویں صدی" آپ کا پرچہ ہے۔ آپ کے تعاون ہی سے "بیسویں صدی" مضبوط چٹانوں پر قائم ہے اور اسے کوئی نہیں ہلا سکتا ——— آپ ہماری رہنمائی کریں ہم آپ کے مفید مشوروں پر عمل کریں گے۔ اگر آپ کو "بیسویں صدی" پسند ہے تو آپ اپنے حلقۂ اثر اور احباب کو "بیسویں صدی" کی سالانہ خریداری کی طرف مائل کریں اور اس کے سالانہ خریدار بنائیں ——— "بیسویں صدی کی ۳۵ سالہ زندگی میں ہم نے حالات سے مجبور ہو کر پہلی مرتبہ آپ سے سالانہ خریدار بنانے کی اپیل کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ رائیگاں نہیں جائے گی۔

منیجر رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

باقر علی پرواز۔ رام گڑھ کینٹ

س۔ باطن کی آنکھیں بے نور ہو جائیں تو؟

ج۔ ظاہری آنکھیں بھی جادۂ حیات پر انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتیں

س۔ ایک ہی حماقت کے دو نام؟

ج۔ عشق اور ۔۔۔۔ شرارت!

شاہدہ پروین۔ دیوگلی

س۔ بھائی جان! لوگ کہتے ہیں عورتوں کو پردہ ضروری ہے، لیکن کتنی عورتیں باہر کام کرتی ہیں کیا ان کے لئے پردہ نہیں ہے؟

ج۔ ضروری کاموں کے لئے عورت کا باہر نکلنا برا نہیں، عورت کا شمع محفل بننا برا ہے۔

س۔ آخر تیری کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنیئے:

کبھی کو تیرا دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو تیرے خدائی میں تمہیں معلوم ہوتی ہے

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ہوائی جہاز کس نے ایجاد کیا؟

ج۔ امریکہ کے رائٹ برادران نے۔

محمد علی ضیاء۔ اندور

س۔ ملک کی موجودہ ہلچل اور فسادات کو دیکھتے ہوئے کل کا ہندوستان ۔۔۔۔؟

ج۔ زبان بے زبانی سے کب کا چکا

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

س۔ خوشتر بھائی! آپ کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا دن یا ایسی گھڑی آئی ہے جب آپ نے مایوسی کا منہ دیکھا ہو؟

ج۔ ایسا وقت کئی بار آیا لیکن ۔۔۔۔ حد سے بڑھا

ملال تو ہم مسکرا دیئے اور گنگنانے لگے ؎

تیرگی ہی تیرگی زندگی میں تھی مگر
حادثے کہیں کہیں مشعلیں جلا گئے

س۔ ہندوستان میں جمہوریت اور اہنسا کا مستقبل؟

ج۔ تنگ دل اور تنگ نظر سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں تاریک نظر آتا ہے۔

محمد عبد البشیر۔ رائچور

س۔ غالب کا درد بھرا شعر سنائیے۔

ج۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

س۔ خوشتر بھائی! دنیا سمندر ہے اسے پار کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ لمبے حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔

نصرت آرا۔ امروہہ

س۔ بھائی جان! داغ کس کے شاگرد تھے؟

ج۔ ذوق کے۔

شمس الدین صدیقی۔ الہ آباد

س۔ کوئی مزاحیہ شعر سنائیے۔

ج۔ ایک موسمی شعر سنئے ترنم سے پڑھئے تو موسم کا راگ بھی ؎

وزیر دل کی کیا بات یہ تو خزاں میں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ایم۔ ایم ناصر دربھنگوی۔ آرہ

س۔ کیا انسان آلام و مصائب کا مجموعہ ہے؟

ج۔ یہ تو اپنے اپنے حوصلہ و عزم کی بات ہے۔ کوئی اپنی زندگی آلام و مصائب کی آماجگاہ بنالے یا مسرتوں سے معمور کرلے۔

س۔ مجاہد روزگار کسے کہا جا سکتا ہے؟

ج۔ جو آلام روزگار کے خلاف جہاد کرے۔

س۔ طالب علم کو "بیسویں صدی" کا مطالعہ چاہیئے یا نہیں؟

ج۔ "بیسویں صدی" میں ایسی کوئی تحریر نہیں ہوتی جو طالب علم کے لئے غیر افادہ بخش ہو؟

ایم۔ ایس عالم بسرا (اڑیسہ)

س۔ ہندوستان کا ہر رسالہ اپنی تعریف کا پل کیوں باندھتا ہے، جو ہرگز قابل تعریف نہیں ہوتا۔

ج۔ خود ستائی کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔

س۔ ان شعروں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

اولیا رکھتے ہیں عزت سے
اور فرشتے کلام کرتے ہیں
کیا بتاؤں وقار عورت کا
انبیاء تک سلام کرتے ہیں

ج۔ عورت بیشک عزت و افتخار کی سزاوار ہے۔ لیکن ان اشعار میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا ہے

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ۔۔۔۔ مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس جاوڑی بازار دلی، ٹائیٹل و تصاویر: برائٹ پریس صدر بازار دلی ۔۔۔۔ پتہ: دفتر بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

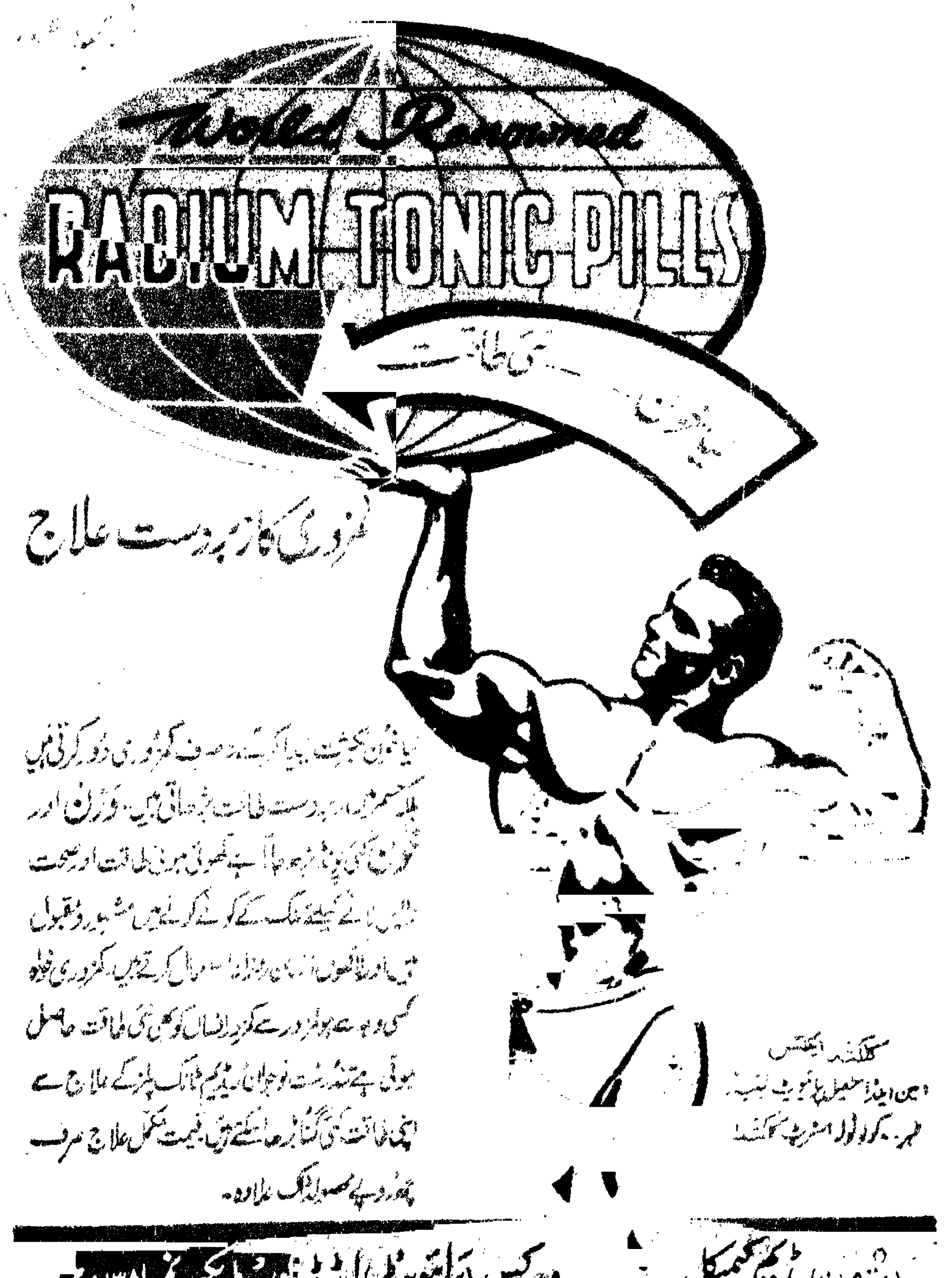
ڈکشنریاں صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و گلشنیاں	صنعت وحرفت	خانہ داری
[illegible]	[illegible]	[illegible]

Registered with the Registrar of Newspapers

BISWIN SADI

Telephones Office 27163? Residence 619927




بیسویں صدی
اکتوبر
Rs.1.25
۹
Biswin Sadi
DELHI



نرمی و آہستگی سے پاؤں رکھنے کی ادا
سیکھ لیں شبنم کے قطرے آپ کی رفتار سے ۔ ۔ جوش ملیح آبادی

فوٹو جیتی لال رستوگی دلی



بسی ہوتی ہے جن آنکھوں میں شوخیوں کی بہار

اداے شرم انھیں کیوں سکھائی جاتی ہے ——— حسرت موہانی

فوٹو: ہیش کمار سرنا دہلی



برمنگھم سے شائع ہونے والے ہفت وار اخبار "ایشیا" کے رکن ادارہ جناب بشیر احمد ریاض کے اعزاز میں ادارہ "بیسویں صدی" کی طرف سے ایک استقبالیہ دیا گیا جس میں پچاس سے زیادہ برگزیدہ ادیبوں، سرکردہ اخبار نویسوں اور ممتاز سیاسی رہنماؤں نے شرکت کی اور جناب بشیر احمد ریاض کو قومی و ملی خدمات کے لئے خراجِ تحسین پیش کیا اور اس بلند مرتبت صحافی کی گلپوشی کی۔



اُردو کے نامور اور کہنہ مشق افسانہ نگار حضرت کوثر چاند پوری نے اس تقریب کی صدارت فرمائی اور جناب بشیر احمد ریاض کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "ممالکِ غیر میں اردو کے سلسلے میں آپ کی خدمات بہت طویل و عظیم ہیں۔ جناب خوشتر گرامی کا مذہب انسانیت ہے۔ وہ ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اُردو ادیب کو حقیقی بھائی کا درجہ دیتے ہیں ...."



اُردو کے ممتاز شاعر حضرت ساغر نظامی نے فرمایا کہ "مسرت حاصل ہے تمام تر مادی اور رُوحانی جد وجہد کا۔ اگر یک لحظہ مسرت بھی خلافِ توقع کسی کو مل گیا ہے تو وہ سب سے بڑا خوش قسمت انسان ہے۔ میں بھی خوش قسمت انسان ہوں کہ میں نے اچانک "ایشیا" دیکھی دیکھا اور اُس کے معاون مدیر جناب بشیر احمد ریاض سے ملا۔ اُردو زبان میں لندن سے ایسا حسین اور جامع اخبار . . . . زندہ باد۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نیلے سمندر کے کنارے سرد ہوا میں اُڑا جا رہا ہوں۔



نوشتہ گرامی نے جناب بشیر احمد ریاض کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ "وہ ایک نیکدل۔ پُر خلوص اور انسانیت دوست ادیب ہیں۔ جنہوں نے ادب کی تعمیری اور صحت مند روایات کو آگے بڑھایا ہے اور ممالکِ غیر میں اُردو کی جڑیں مضبوط کی ہیں۔ ہمارے ملک میں لاکھوں



جناب بشیر احمد ریاض نے دورانِ تقریر کہتے ہوئے فرمایا کہ "انگلستان کی سرزمین میں اردو مرکز کی شکل میں" کا جو پودا لگایا گیا ہے اس کے اصل ہیرو ملک کے تمام اہلِ علم حضرات کی مجلس کی خدمات کا اعتراف سمجھنا چاہیے جو اجتماعی یا انفرادی طور پر انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے کیں اور کر رہے ہیں انگلینڈ میں اردو کے فروغ کا سہرا کسی ایک فردِ واحد کا حصہ نہیں بلکہ وہاں مقیم اردو زبان جاننے والے ہزاروں لوگ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔۔۔



نامور صحافی جناب بشیر احمد ریاض کے اعزاز میں ادارہ "بیسویں صدی" نے جو عصرانہ دیا اُس کا ایک منظر۔ دائیں سے بائیں: دلّی میں تحریک کے ایک سرگرم رکن جناب تہامی ری۔ صوفی شاعر جناب صغیر احمد صوفی۔ جناب بشیر احمد ریاض۔ شیرِ پنجاب کے ایڈیٹر

ماہنامہ بیسویں صدی

ایڈیٹر خوشتر گرامی

جلد ـــ ۳۲ ـــ شمارہ ـــ ۱۰

ـــ ۲۷۱۶۳۷

ـــ ۶۱۹۹۲۷

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی ۶ دریا گنج دہلی نمبر ۶

[illegible] ۔۔۔

ہندوستان میں ــــــ چودہ روپے

ممالک غیر سے ــــــ بائیس شلنگ

مستقل خریداروں کو چودہ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو عظیم الشان قیمتی خاص نمبر بھی دئیے جاتے ہیں جن کی قیمت دو روپے فی پرچہ ہوتی ہے



جناب بشیر احمد ریاض نے اپنی تقریر کرتے ہوئے فرمایا: انگلستان کی سرزمین میں اُردو دیکلی نبیا کا جو پودا لگایا گیا ہے اسے دراصل بیرونِ ملک کے تمام اہلِ علم حضرات کی مسلسل خدمات کا اعتراف سمجھنا چاہیئے جو اجتماعی یا انفرادی طور پر اُنھوں نے اُردو کے فروغ کے لئے کیں اور کرتے ہیں۔ انگلینڈ میں اُردو کے فروغ کا سہرا کسی ایک فردِ واحد کا حصہ نہیں بلکہ وہاں مقیم اُردو زبان جاننے والے ہزاروں لوگ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔



نامور صحافی جناب بشیر احمد ریاض کے اعزاز میں ادارۂ "بیسویں صدی" نے جو عصرانہ دیا اُس کا ایک منظر۔ دائیں سے بائیں: دلّی میں اُ تحریک کے ایک سرگرم رکن جناب بہار برنی۔ صوفی شاعر جناب صغیر احمد صوفی۔ جناب بشیر احمد ریاض۔ شیرِ پنجاب کے ایڈیٹر ... آغا ... جناب کوثر چاندپوری۔

جلد — ۳۲
شمارہ — ۱۰

۲۷۱۶۳۷ —
۶۱۹۹۲۷ —

مستقل خریداروں کو چودہ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ دو عظیم الشان قیمتی خاص نمبر بھی بھیجے جاتے ہیں جن کی قیمت دو روپے فی پرچہ ہوتی ہے

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے
پتہ: رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۲

تیر و نشتر

"وزراء کی تعداد مقرر کی جائے" ایک خبر ——— پھر سیاست میں کیا مزہ رہ جائے گا۔

"میرا بیٹا ایک فرم کا مالک ہے" پارلیمنٹ میں مرارجی ڈیسائی کا اعتراف ایک خبر ——— آپ بھی یہی کام کرتے تو اچھے رہتے۔

"کانگریس سرکار [illegible] جن سنگھی لیڈر کی لڑائی" ——— اور یہ جن سنگھی کنارے کھڑے دیکھتے رہے۔ انہوں نے اسے ڈوبنے دیا۔

"مرارجی ڈیسائی ٹیکس بڑھانے کی فکر میں" ایک خبر ——— تو کیا آپ نے ان سے کچھ نیک توقعات قائم رکھی تھیں؟

"نیویارک میں بھارتی رقص ناچ" ایک خبر ——— [illegible] بھارت کے [illegible] سمجھ لیں گے۔

"بینکوں کو بالواسطہ طور پر قومی ملکیت میں لینے کا کوئی ارادہ نہیں" مرارجی ڈیسائی ——— اور قانون کا [illegible] سہارا لینا آپ کا [illegible]

"[illegible] کچھ شرافت ہے تو مستعفی ہو جائیے" مسٹر مرارجی [illegible] سے ایک مطالبہ ——— اس کے بعد بھی مستعفی نہیں ہوتے تو کیا سمجھا جائے؟

"بھارت سیوک سماج بری نہیں۔ سرکار میں بھی خامیاں ہیں" گلزاری لال نندہ ——— اور سرکار میں بھی خامیاں شری نندہ کے نکلنے کے بعد پیدا ہوئی ہیں۔



"ہندوستان بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے بھی نہیں جھکے گا" وزیر اعظم کی تقریر ——— بالکل نہیں جھکے گا بلکہ بڑی بڑی طاقتیں ہند کو سلام کریں گی

تیر و نشتر

خوشتر گرامی



"ہندوستان بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے بھی نہیں جھکے گا" وزیر اعظم کی تقریر
—— بالکل نہیں جھکے گا بلکہ بڑی بڑی طاقتیں ہند کو سلام کریں گی

"وزراء کی تعداد مقرر کی جائے" : ایک خبر —— پھر سیاست میں کیا مزہ رہ جائے گا۔

"میرا بیٹا ایک فرم کا مالک ہے۔ پارلیمنٹ میں مرارجی ڈیسائی کا اعتراف"
ایک خبر —— آپ بھی یہی کام کرتے تو اچھے رہتے۔

"کانگریس سرکار نے لٹیا ڈبو دی" : ایک جن سنگھی لیڈر کی تقریر ——
اور بے حس جن سنگھی کنارے کھڑے دیکھتے رہے۔ انھوں نے اُسے ڈوبنے دیا۔

"مرارجی ڈیسائی ٹیکس بڑھانے کی فکر میں" : ایک خبر —— تو کیا آپ نے اُن سے کچھ نیک توقعات قائم رکھی تھیں؟

"نیو یارک میں بھارتی لوک ناچ" : ایک خبر —— جس میں بھارت کے لوک سیاستداں حصہ لیں گے۔

"بنکوں کو بالواسطہ طور پر قومی ملکیت میں لینے کا کوئی ارادہ نہیں" : مرارجی ڈیسائی —— اور قانون کا واسطہ اور سہارا لینا آپ کا وزارتی حق ہے۔

"آپ میں کچھ شرافت ہے تو مستعفی ہو جائیے" : مسٹر مرارجی ڈیسائی سے ایک مطالبہ —— اِس کے بعد بھی مستعفی نہیں ہوتے تو کیا سمجھنا چاہئے؟

"بھارت سیوک سماج بُری نہیں۔ سرکار میں بھی خامیاں ہیں" : گلزاری لال نندہ —— اور سرکار میں بھی خامیاں شری نندہ کے نکلنے کے بعد پیدا ہوئی ہیں۔



"جن سنگھ کو یو-پی میں انتخاب لڑنے کے لئے ایک کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی" ایک خبر

" سادھوؤں کے بھیس میں جیب کترے" ایک خبر —— کیا فرماتے ہیں سادھو سماج کے سنچالک شری گلزاری لال نندہ جی اِس مسئلے پر ؟

" پنجاب میں اسمبلی توڑ دی گئی اور صدر راج قائم کر دیا گیا"

خبر سُن کر ——

شری گِل نے کہا: میرے سر سے بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب میں سکون محسوس کرتا ہوں۔

گیانی ذیل سنگھ نے کہا: اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا۔

گیان سنگھ راڑیوالے نے کہا: نہ خدا ہی مِلا نہ وصالِ صنم۔

شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے ایک آواز ہو کر کہا:

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس گُل پہ ناز تھا مجھے وہ گُل نہیں رہا

مزدوروں اور کسانوں کی آواز بلند ہوئی ع

بہ سلامت روی و باز آئی

" سیلاب کا پانی سورت میں داخل" ایک خبر —— بڑی سنگین صورت ہے۔

" جودھ پور میڈیکل کالج بند ہو گیا" ایک خبر —— ڈاکٹروں کی پیداوار میں اضافے کے باعث۔

" لوک سبھا میں شور و شر" ایک عنوان —— اِس شور و شر پہ موقوف ہے ایوان کی رونق۔

" کاریں چرانے والے ٹیڈی بوائز" ایک عنوان —— اور دل چرانے والی ٹیڈی لڑکیاں۔ اِس دَور کی کلچرل پیداوار۔

" ہند اور روس کی دوستی" ایک عنوان —— ہم اِن کے راگ الاپتے رہے اور اُس نے پاکستان کو ہتھیار دینے کا وعدہ کر لیا۔

"موجودہ سیاسی نظام عوام کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہو چکا ہے" پاکستان عوامی لیگ ——— ہندوستانی اپوزیشن پارٹیاں بھی یہی زبان بولتی ہیں۔ ہند پاک دوستی زندہ باد۔

"چین شیطان سے بھی بُرا ہے۔ مگر اس سے بات ضرور کرنی چاہیے" چاگلہ ——— مگر آپ کو یہ الہام وزارتِ خارجہ چھوڑنے کے بعد ہوا ہے۔ شیطان ہے تو لاحول پڑھو بھاگ جائے گا۔

"ہندوستان میں گائے کا احترام ہوتا ہے مگر دیکھ بھال نہیں" وزیرِ خوراک کا بیان ——— اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں گائے کے نام پر ہنگامہ ہوتا ہے دیکھ بھال نہیں۔

"مرار جی ڈیسائی کے فرزند اُن کے پرائیویٹ سکریٹری نہیں" وزیرِ خزانہ کا بیان ——— بالکل بجا کیونکہ وہ اُن کے فرزند ہیں۔ پرائیویٹ کام کرتے ہیں تو مصلحتہ پیری ہونے کے ناطے۔

"پارلیمنٹ کی طرف مارچ" ایک خبر ——— ان شور ماؤں کو نیفا اور لداخ بھیجو۔

"ہندو دھرم کو ہندو ازم سے بچاؤ" ایک عنوان ——— بلکہ یوں کہو کہ ہندو دھرم کو ہندو دھرم کے ٹھیکیداروں سے بچاؤ۔

"دِلّی میں پولیس کے افسر جیوتشی بننے کی فکر میں" ایک خبر ——— علمِ جیوتش کے ذریعے مجرموں کا کھوج لگانے کے لئے۔

"گولڈ کنٹرول بل میں تبدیلیاں" ایک خبر ——— اور مرار جی ڈیسائی کے دور میں۔ سمجھ سے بالاتر ہے۔

"کمیونسٹوں میں سر پھٹول" ایک خبر ——— یہ سرمایہ داروں کے کام مزدوروں کے غم خوار بھی کرتے ہیں۔



"راؤ بیریندر سنگھ (ہریانہ) کو اناج سے پابندی اٹھانے کا اختیار نہ تھا۔ محکمہ سراغ رسانی گول مال کی تحقیقات کر رہا ہے" وزیرِ خوراک کا



صدر کانگریس شری نجلنگپا کے دورۂ جاپان پر پیکنگ ریڈیو کی یاوہ گوئی۔

"گانجہ پکڑا گیا" ایک خبر —— کہاں بھاگ رہا تھا۔

"دِلّی کے ہسپتالوں میں بہتر سہولتیں نہیں دی جاسکیں" وزیر صحت کا اعتراف —— بہتر مریض نہ ہونے کا نتیجہ۔

"پیکنگ ریڈیو کی یاوہ گوئی" ایک خبر —— پُرانی خبریں چھاپتے ہو۔ کوئی نئی سناؤ۔

"گریٹر کیلاش دِلّی کے بیوٹی سیلون پر جُرمانہ" ایک خبر —— بیوٹی فُل نیوز۔

"ہندی ابھی قومی زبان بننے کی منزلوں سے کوسوں دُور ہے" ایک تبصرہ —— اُردو جو عملاً قومی زبان تھی اور کئی صوبوں میں سرکاری کام کاج کی زبان تھی اُسے دیس نکالا دے دیا گیا ہے۔

"امرتسر میں بناسپتی کا بلیک" ایک خبر —— گھی سستا ٹوٹنے کا نتیجہ۔

"راج دھانی میں مکانوں کے گرنے کی کارپوریشن میں گونج" ایک خبر —— اتنا زوردار دھماکہ تھا کہ وہاں تک سُنا گیا؟

"ٹیکسوں میں چھوٹ دینے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے" وزیر خزانہ کا سوال —— یہ ٹکسالیں کس مقصد کے لئے ہیں۔ وہ دھڑا دھڑ بنالیں۔

"چین کی پاکستان کو یقین دہانی" ایک خبر —— دھوکے کی کھُلی ٹٹی۔ جو یقین کرے سو پچھتائے۔

"ایشیائی ممالک میں سائنسدانوں کی تعداد بڑھانے کی اسکیم" ایک خبر —— لوپ سسٹم ختم کرنے کی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔

"کوریا میں ٹیچروں کو داڑھی رکھنے کی ممانعت" ایک خبر ——
"پٹیالہ میں داڑھی منڈوانے والے سکھ طلبا کے داخلے کی ممانعت"
دوسری خبر ——
کیا خوب سودا نقد ہے۔ اِس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے۔

"اردو گھر فنڈ کے لئے انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی اپیل" ——
سرکار سے علاقہ مانگتے مانگتے تھک کر اب بات چیت صرف گھر پر آگئی ہے —— اور
اُس کے لئے بھی فنڈ مانگنے کی نوبت ہے۔

"دِلّی کی فضا سُونی سُونی سی ہوگئی" ایک خبر —— شری جنا داس جی
اکثر ساکن مرزا سوریا "دِلّی کے بغیر"۔

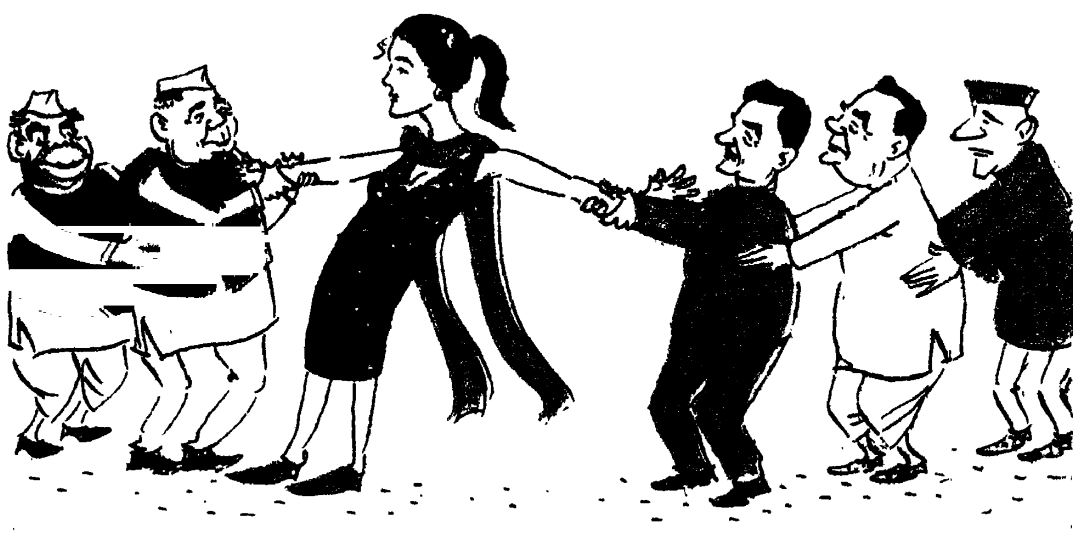
"سردار گرمکھ سنگھ گل اپنی جنتا پارٹی کی تنظیم کریں گے" ایک خبر ——
تاکہ آئندہ کسی پارٹی کے دست نگر نہ بنیں۔

"مہرانوں کو مرارجی ڈیسائی کا کورا جواب" ایک خبر —— بس پھر
انھیں چھٹی ہے۔ کورے پر وہ جو چاہے لکھ لیں۔

"یو۔پی میں امراضِ دماغی میں ساٹھ فیصد اضافہ" ایک خبر ——
اب معلوم ہوا کہ چرن سنگھ کی کھچڑی وزارت کیوں ٹوٹی تھی۔

"یو۔پی کانگریس، الیکشن فنڈ کے لئے دروازے پھر کر
چندہ کرے گی" ایک خبر —— اور آواز لگائے گی۔ راہ مولا الیکشن
فنڈ میں دیتے جاؤ اور —— جو دے اُس کا بھی بھلا، جو نہ دے اُس کا
بھی بھلا۔

"عورتوں کو اُن کی طاقت کا احساس کراؤ" مرارجی ڈیسائی
—— آپ کو یہی احساس تھا کہ ایک عورت کا نائب بننا منظور
کرلیا۔



نئی دِلّی میونسپل کمیٹی کے سوال پر مرکزی حکومت اور دِلّی ایڈمنسٹریشن میں رسّہ کشی۔

جی۔ ایم۔ صادق

خوشتر گرامی

گول چہرہ، بڑی اونچی ناک، ٹی ناتپ مونچھیں، رنگ نکھرا ہوا گندمی، کشادہ پیشانی، آنکھوں پر سیاہ چشمے کا غلاف سر پر کشمیری ٹوپی۔ یہ ہے قلمی چہرہ جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ

خواجہ غلام محمد صادق



کا جو جی۔ ایم۔ صادق کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ عام طور سے کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ سنجیدہ اور متین طبیعت۔ عملی اور نظریاتی آدمی ہیں۔ کبھی "نیا کشمیر" کا خواب دیکھا تھا۔ پھر اُس کا خاکہ بنایا۔ اب اُس میں رنگ بھر رہے ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے پہلے صدر رہیں۔ کشمیر کا آئین آپ کی صدارت میں بنا۔ کشمیر اسمبلی کے اسپیکر اور وزیرِ تعلیم رہ چکے ہیں ـــــ موئے مقدس کی چوری کے بعد بازیابی اپنے ساتھ آپ کے لئے وزارتِ اعلیٰ کا مژدہ لے کر آئی۔ آپ خیالات و نظریات کے اعتبار سے سرخ مشہور ہیں مگر عملاً نیشنلسٹ سرخ ثابت ہوئے۔ اونچ نیچ کے مخالف۔ مساوات کے دلدادہ، عوام سے رابطہ کم۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے عادی ـــــ سیاست اور ایمان داری ایک ساتھ مشکل ہی سے اکٹھی ہوتی ہیں۔ لیکن صادق صاحب اسم با مسمّیٰ ہیں ؏

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

افسانہ

وہ ایک ہی خط

اقبال صدیقی ایم۔اے

ڈی۔۱۹، گرین پارک۔ نئی دہلی

مکرمی و محترمی! تسلیم

مجھے احساس ہے کہ افسانہ نمبر کے لئے کافی تاخیر ہو چکی ہے۔ حالانکہ آپ نے بہت پہلے ہی شرکت کی دعوت دی تھی۔ پھر بھی رآبی (بیگم) کا اصرار ہے کہ میں تاخیر کی ندامت کو بالائے طاق رکھ کر افسانہ آپ کی نذر کر ہی دوں ——— تو لیجئے پڑھئے "وہ ایک ہی خط" جس میں بند ہے ایک ایسی عورت جس نے خوش فہمیوں کا ایک حسین جال بنا جس کے ریشمی دھاگوں سے بندھ کر بھی وہ اس خیال پر ہی اتراتی رہی کہ وہ چاہتوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان ہے...

آپ کا اپنا ——— اقبال صدیقی

وہ ایک ہی خط ساری زندگی میں ——— سادہ، خشک، قطعی غیر رومانی جیسے اس کی گنجی کھوپڑی ——— وہ ایک ہی خط، صرف ایک ہی!

بلقیس کی چالیس سال کی طویل زندگی میں صرف ایک ہی خط۔ کتنا مختصر، کتنا مختلف!

ایک رسیلی، سجیلی عورت کی جلترنگ کی سی زندگی میں ایک سوکھے پتے کی طرح اُڑتا ہوا وہ ایک ہی خط! ———

ڈیر مس!

تم تنہا ہو، میں بھی اکیلا ہوں۔ تم چاہو تو ہم اپنا گھر بسالیں۔ غور کرلو۔

——— سہیل

مس بلقیس نے اُسے ایک بار پڑھا، دو بار پڑھا، تین بار پڑھا اور پھر کئی بار پڑھا۔

"تم تنہا ہو، میں بھی اکیلا ہوں..."

وھاٹ نان سنس!

"آیہ"

"یس مس صاحب!"

"یہ خط..."

"وہ فلیٹ نمبر سی۔۴۴ کے صاحب نے دیا ہے۔"

"اور کچھ کہا بھی؟"

"اُنھوں نے کہا میم صاحب کو خط دے دینا اور میں کل صبح کی چائے تمھارے گھر پیوں گا۔"

"و... ھا... ٹ؟"

آیہ سہمی سہمی سی اندر چلی گئی اور مس بلقیس نے گنجے مصور کا خط ایک بار پھر پڑھا اور اُسے اِس خط میں اور اُس کی گنجی کھوپڑی میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ دونوں ہی سپاٹ تھے۔

چالیس کو پہنچی ہوئی مرمریں جسم والی مس بلقیس، چاند سلطانہ گرلز ہائی سکول کی ہیڈ مسٹرس اور پچاس کو لگتا ہوا سہیل ایک غیر شادی شدہ مصور!

"تم تنہا ہو، میں بھی اکیلا ہوں..."

"سلی!"

مس بلقیس نے کاغذ کا وہ پُرزہ اپنے وارڈ روب میں بنارسی گلابی ساڑی کی تہوں میں غیر شعوری طور پہ دفن کرتے ہوئے زیرِ لب کہا اور ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے مقابل اپنی ہمراز سے ہمکلام ہوئی۔

"میں سیتی کوئین ہوں نا؟"

اور شیشے کے اندر سے مرکیوری لیمپ کی سی رنگت والی اس کی ہمراز نے بادام جیسی اپنی بڑی بڑی آنکھیں مٹکا کر ایک بار پھر اس کے احساسِ حسن و غرور کو چمکارا۔

"اس میں کیا شک؟ دیکھ لو اپنے ہونٹوں کی رس بھری قاشوں کو!"

اور بلقیس نے خاص انداز میں اُن قاشوں کو نوکِ زبان سے چکھا۔ اس کا سارا وجود نشے میں تحلیل ہونے لگا۔ وہ تن کر بیٹھ گئی اور بڑے انداز سے اس نے اپنی ہمراز کو دیکھا۔ کٹے ناریل کی طرح جیسے اس کے سینے جن میں ذرا بھی نرمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ سیتھن کی طرح چکنے اس کے گال جن میں کہیں کوئی نشان تک نہ اُبھرا تھا۔ بلور کی طرح شفاف اس کی پیشانی جس پر ہر وقت ایک ناگن کھیلتی رہتی۔

ایک رس کا گاگر بلقیس۔ ایک مرقعِ حسن!

جبھی تو اس نے شملہ کے مقابلۂ حسن میں "مس ہل سٹیشن" کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ صرف سولہ کے سن میں! اور تب سے اب تک وہ ویسی کی ویسی تھی ——— کوئی نشان نہیں، کوئی فرق نہیں۔ کسی کا سایہ بھی اس پر نہ پڑا تھا۔

"ڈارلنگ! تم تو ازل سے کوئین ہو!"

اس کی ہمراز نے بہت تمکنت سے سرگوشی کی۔

"ہو...ں"

بلقیس نے بڑے ڈرامائی انداز میں زیرِ لب کہا اور اترا کر ہلکی سی چپت رسید کر دی اُسے۔ اس نے کتنا سچ کہا تھا۔ کوئین ہی تو کہلاتی تھی وہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ می، ڈیڈی، نرس سبھی اُسے کوئین کہتی تھیں۔ پھر جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو سوئیٹ، کیوٹ اور ڈارلنگ کہلانے لگی اور جب کچھ اور بڑی ہو کر اس کے دلفریب کرزو (Curves) ڈانس فلور پر لہرانے لگے تو تنہائیوں کی ہلکی ہلکی سرگوشیوں نے اُسے احساسِ غرور میں سرشار کر دیا۔

"مائی لو، مائی ڈارلنگ، مائی ہارٹ"

اور اس طرح بلقیس کی شخصیت میں غیر معمولی حسن و نخوت کے احساسات جذب ہو گئے۔ اُن احساسات کی جلا اس کی شیشے والی ہمراز نے کی جس سے وہ دیر دیر تک ہمکلام ہوتی۔ اپنے ہونٹوں کی، رخساروں کی، گیسوؤں کی، گردن کے خم کی، پلکوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی تعریفیں سنتی اور پھر ایک نشے کے عالم میں اُسے چوم چوم کر تھکتی۔ بلقیس کی ہمراز کتنی عظیم تھی اور کتنا اوچھا تھا وہ گندہ مصور!

"تم تنہا ہو، میں بھی اکیلا ہوں..." ہُنہہ، گنجا کہیں کا!

بلقیس ہنس پڑی۔ ریڈیم کے ڈائل کی طرح ایک تیز روشنی اس کے دانتوں کے موتیوں سے لہرائی اور پھر وہ اپنی ہمراز کے ساتھ دیر تک ہنستی رہی۔ بلقیس اپنے گداز بستر پر منہ کے بل لیٹ گئی اور نرم تکیے کو [illegible] اور ایک ناقابلِ بیان احساس سے اس کی آنکھیں نیم واسی ہو گئیں۔ پھر نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں سے سی سی کی ہلکی ہلکی موسیقی پیدا ہونے لگی۔ جیسے اس نے مرچوں کا سالن کھا لیا ہو۔ معاً اس کا گلا خشک ہو گیا۔ وہ اٹھی۔ [illegible] بہکی سی اور کبرڈ سے بیئر کی بوتل نکال کر گلاس بھر لیا۔ پھر [illegible] اس نے ریڈیوگرام پر کم سیپٹمبر کی دھنیں لگا دیں اور آنکھ موند کر [illegible] وہ خود بھی فرش پر تھرکنے لگی۔

زندگی ایک رقصِ جاوداں کے سوا کچھ بھی نہیں ڈارلنگ! اور پھر محسوس ہوا جیسے حسین، متمول، طاقتور، وجیہہ و شکیل مردوں کا ایک غول [illegible] رقص کر رہا تھا اور وہ ایک ماہر مداری کی طرح ان سب کو نچا رہی تھی [illegible] بلقیس۔ ایک شعلہ ایک قیامت! جس نے کتنے مردوں کو دلیو دیا تھا۔

"تم تنہا ہو، میں بھی اکیلا ہوں..."

کم سیپٹمبر کی دھنوں کے ساتھ گنجے، کلوٹے مصور کی بھونڈی آواز مدغم ہونے لگی اور بلقیس نے زور سے چیخ کر کہنا چاہا۔

"شٹ اپ! میں تنہا نہیں ہوں! میرا گھر ہے، میری آیا ہے، میرا [illegible] بیلنس ہے اور میری آواز پر دُم ہلاتا ہوا میرا السیشن ہے اور راز و نیاز کی کرنے کے لئے میری ہمراز بھی تو ہے جس کے پاس میرے لئے صرف خوبصورت الفاظ [illegible] بھاگ جاؤ، میں تنہا نہیں ہوں!"

جبھی اس نے اپنے وارڈروب سے بنارسی گلابی ساڑی کی تہوں میں [illegible] وہ گندہ سا پرزہ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے ایک بار پھر پڑھا۔

"تم تنہا ہو، میں بھی اکیلا ہوں۔ تم چاہو تو ہم اپنا گھر بسا لیں؟"

بات کیا تھی بھلا؟ نہ محبت، نہ آہیں، نہ نغمہ نہ ترنم! اور پھر اس نے پرستاروں کے وہ معطر خطوط نکالے جو اُس نے اپنی اٹیچی میں محفوظ کر رکھے ہوئے وہ خطوط چاہت اور محبت بھرے خطوط ——— جن کا ایک ایک لفظ [illegible] رنگین شعر تھا۔ حسین و جمیل، ترشا ترشایا ہوا۔ کتنی عظیم تھی مس بلقیس جس نے [illegible] تمام چاہتوں کو اپنی پُرکشش شخصیت میں سمیٹ لیا تھا۔ یہ تو عورت کی سب سے بڑی ظفر مندی ہوتی ہے۔

بیئر کے ہلکے نشے میں لہراتی ہوئی مس بلقیس اپنے محفوظ خطوط کے اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی اور اس کی نظروں کے سامنے سنیما کے فلیش بیک کی

رہے تھے ماضی کے رنگین لمحات متحرک رہے تھے۔ شراب و شباب کی پارٹیاں، تیز رقصوں کے جھکولے، پکنک کی دھما چوکڑی، ہنٹنگ، سکیٹنگ، تن باتھ۔

فلیش بیک کے یہ حسین مناظر ہر بار اُسے یہی یقین دلاتے کہ اُس کی زندگی میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ اُس رنگین فلیش بیک میں بوڑھے مصوّر کی یاد دہانی۔

"تم تنہا ہو۔۔" اُسے بالکل اُسی طرح بھونڈی معلوم ہوئی جیسے حسین چاندنی رات میں کسی بوڑھے مینڈک کی ٹرٹر۔

ڈنر کے بعد نائٹ گاؤن پہن کر بلقیس اپنے کمرے ہی میں چہل قدمی کرنے لگی۔ اُسے بار بار اُس گنجے مصوّر کی خر دماغی پر ہنسی آ رہی تھی۔ بے چارہ، ساری عمر تو تصویروں سے کھیلتا رہا اور اب جو عورت اُسے نظر آئی تو وہ بلقیس تھی شکل بھی دیکھی تھی اُس نے اپنی شیشے میں؛ بلقیس کے لئے شوہر کی کیا کمی ہو سکتی تھی بھلا؟ وہ چاہتی تو کسی بہت ہی دولت مند خوبرو نوجوان سے شادی کر سکتی تھی لیکن بہت دنوں تک تو وہ شادی کے متعلق کچھ خیال بھی نہ کرتی رہی۔ وہ اِس خیال ہی میں مگن رہی کہ ابھی ابھی تو جوان ہوئی ہے وہ۔ ابھی سے شادی کر لے؟ اور پھر شادی ہوتی کیا شے ہے؟ چاہت کی موت! مردوں کی چاہتوں کی وہ کچھ اِس طرح خوگر ہوئی کہ وہ کسی قیمت پر اُن کی موت برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اُس چاہت پر ایسی مری کہ پھر کبھی شادی کا خیال بھی نہ ہوا اُسے ——— اور چاہتوں کے پالنے ہی میں وہ جھولتی رہی، جھولتی رہی کہ اس گنجے مصوّر نے جیسے اُسے چھیڑ دیا۔

سنکی کہیں کا!

ایک بار پھر بلقیس نے وہ خط پڑھنا چاہا۔ لیکن کیوں؟ دیکھوں تو سہی اُس کی حماقت! جو چیز اُسے بار بار اُکسا رہی تھی وہ یہ تھی کہ یہ خط اُس کے پرستاروں کے سارے خطوط سے یکسر مختلف تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ ایک مصوّر کا خط تھا جو رنگوں کی دُنیا میں تخیّل کے پروں پر اُڑتا پھرتا ہے اور اپنی تخلیقات میں ہزاروں چاہتوں کو سمیٹ لیتا ہے، ہزاروں ارمانوں کو پرو دیتا ہے۔ وہ چاہت، وہ ارمان کہاں تھے اُن سپاٹ، کھُردرے الفاظ میں؟ کیا وہ ایک فنکار کے الفاظ تھے؟

بلقیس مزے لے کر ہنستی رہی، مصوّر سہیل کے خط پر، اُس کی جرأت پر، اُس کی حماقت پر! اور بالآخر نیند کے ایک جھٹکے نے اُسے نہ جانے کہاں غائب کر دیا۔

علی الصبح چڑیوں کی چہکار کے ساتھ ہی اُس نے نیم گرم پانی میں یو ڈی کولون کی شیشی گھول کر غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے ڈرائنگ رُوم میں آ بیٹھی۔ ریڈیو گرام پر ہلکی مغربی دھُن کے ساتھ وہ چائے کا پہلا پیالہ پینے لگی۔

غزل

جگن ناتھ آزاد ایم۔ اے

کچھ اِس قدر اِسے غمِ جاناں کا پاس ہے
ہنگامِ وصال میں بھی مرا دل اُداس ہے

غم ہی نہیں خوشی بھی یہاں بے قیاس ہے
لیکن مرا یہ دل کہ جسے غم ہی راس ہے

تیرا کرم کہ تُو نے دیا دل دُکھا ہُوا
ایک ایک سانس میرا سراپا سپاس ہے

سرِ دارِ و عرش و بسمل و تاباں کی یاد میں
کشمیر کی بہار! مرا دل اُداس ہے

آخر یہ کیا مقام ہے اے دل، جہاں تُجھے
جینے کی ہے اُمید نہ مرنے کی آس ہے

"میم صاحب!"

"ہاں؟"

"ناشتہ رو کے لئے نا؟"

"کیوں؟"

"وہ خط والے صاحب۔۔"

"ہوں؟"

بلقیس نے مختصر سا جواب دیا۔ آیا اُسے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی اور دبی دبی مُسکرا رہی تھی بلقیس تاڑ گئی۔

"مُسکراتی کیوں ہے تُو؟"

"آج آپ بہت پیاری معلوم ہو رہی ہیں میم صاحب!"

"پھل بھاگ!"

"قسم لے لیجئے سرکار! یہ گلابی بنارسی ساڑی تو بس غضب ڈھا رہی ہے!"

بلقیس کی نظریں اپنی گلابی ساڑی سے پھسلنے لگیں۔ بالکل نئی ساڑی تھی وہ جسے اُس نے آج پہلی بار قطعی غیر ارادی طور پر باندھ لیا تھا۔ اُسے کچھ حجاب سا آرہا تھا۔ آپ کیا سوچتی ہوگی بھلا!

آٹھ بجے دروازے کی کال بیل ٹرن ٹرن بول اُٹھی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اُٹھی جیسے دروازے پر کوئی غیر متوقع فقیر آگیا ہو جسے وہ ابھی پھٹکار کر بھگا دے گی۔ اُس نے پردہ سرکایا۔

"تشریف لائیے۔"

بلقیس نے نہ جانے کیسے کہہ دیا اور پچاس سال کا گنجا مصور اپنی جھرّیوں میں مسکراہٹ کا رنگ بھر کر نہایت ہی پُر اعتماد قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اُس کے موٹے ہونٹوں سے سگار لٹک رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا۔ کل میں نے آپ کے غائبانے ہی میں خود کو اِس وقت کے لئے مدعو کر لیا تھا۔ کوئی دِقّت تو نہیں ہوئی آپ کو؟"

"جی نہیں، بالکل نہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔"

"شکریہ!"

نشست کی میز پر اُس کے مقابل بیٹھی ایک ثانیے کے لئے بلقیس کو خیال گزرا۔ کیا وہ اِس کالے کلوٹے، موٹے ہونٹوں اور گنجے سر والے بڈّھے کا انتظار کرتی رہی تھی؟

دوسرے لمحے وہی کریہہ صورت گنجا اُسے ہٹا کٹا مرد نظر آنے لگا۔ اُس کی گنجی کھوپڑی شیشے کی طرح چمکنے بھی لگی۔ اُس کی آنکھیں تو یقینی طور پر ذہین تھیں اور اِس میں تو کوئی شک ہی نہ تھا کہ اب تک بلقیس سے ملنے والے تمام مردوں سے وہ مختلف و منفرد تھا

تیسرے لمحے خوبصورت، بادامی آنکھوں والی، ازل سے حسین بلقیس اُس سیاہ فام سہیل سے نظریں چُرا رہی تھی۔ وہ اپنی تبدیلی پر حیران و شرمسار ہو رہی تھی۔ جبھی سہیل کہنے لگا۔

"معاف کیجئے گا۔ کل مجھ سے ایک بڑی گستاخی سرزد ہوگئی۔"

"جی!"

بلقیس جیسے چونک اُٹھی۔

"بات یہ تھی کہ کل میں نے کچھ زیادہ پی لی تھی اِس لئے وہ خط لکھ دیا۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ آپ نے تنہا رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ معذرت خواہ ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ میرا خط مجھے واپس کر دیں۔"

بالکل میکانکی طور پر بلقیس اُٹھی اور بھاری بھاری قدموں سے اندر چلی گئی۔ اپنے بلاؤز کے اندر سے سہیل کا خط نکالتے وقت اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک سیپ تھی جس کے پیٹ میں ایک بیش قیمت موتی تھا کاغذ کا وہ ایک حقیر پرزہ جو اُس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا اور وہ ایک خط کھو کر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے ہاتھوں سے اُس کا اپنا نوزائیدہ بچہ پھسل کر گر گیا ہو!!

افسانہ

سات القاب

ع۔ حفیظ ایم۔ اے

حسن منزل، پورب سرائے۔ مونگھیر (بہار)

برادرِ مکرم! ہدیۂ خلوص و نیاز

"بیسویں صدی" کی محفلِ ناز میں شریک ہونے کی کسے آرزو نہیں۔ مگر پروانۂ اجازت حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ سنگ و تیشہ کی محنتِ شاقہ کا کم از کم مجھے تو تجربہ ضرور ہے۔ پھر بھی سنگ و فولاد سے سر ٹکرانے کا حوصلہ باقی ہے۔ جنونِ شوق کا ایک ہدیہ لے کر حاضرِ خدمت ہوں، اس اُمید و یقین کے ساتھ کہ "بیسویں صدی" کی مایۂ ناز محفل میں متعارف ہونے کا شرف ضرور بخشیں گے ـــــــ اگر فن میں "خونِ جگر" کوئی حقیقت ہے تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اِس افسانے میں میں نے خونِ جگر کی حدّت اور خلوصِ دل کی گرمی کی آمیزش کی ہے اور اسے پوری محنت اور خلوص سے سنوارا ہے۔ یہ میرا ایمان و یقین ہے کہ بغیر خلوص کے کسی فن میں حقیقت زندہ کی جھلک نہیں آسکتی اور کوئی فن شاہکار کا درجہ نہیں پا سکتا، کوئی "تاج" فن کا سرتاج نہیں ہو سکتا ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

خدا کرے افسانہ آپ کو پسند آجائے اور میری محنت اکارت نہ جائے! ـــــ افسانے کا عنوان "سات القاب" ہے۔ دیکھئے یہ بدلتے القاب کس حد تک اپنے وارداتِ قلب کو بیان کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ اُمید کہ یہ نیا انداز قارئین اور آپ کو پسند آئے گا . . .

بصد احترام و عقیدت ـــــــــ ع۔ حفیظ

جانِ جاں زرّیں!

اب کی بہار پانچویں بہار ہے جو ہماری چار خزاں آلود مفارقتوں کے بعد آئی ہے۔ اِس بہار کی مہکتی ہوئی ہواؤں سے پوچھو تو ذرا کہ چٹکتی ہوئی کلیوں میں مہک بھی ہے کھِلتے ہوئے شگوفوں میں دمک بھی ہے اور ہنستے ہوئے پھولوں میں چمک بھی ہے، آبشار کے گنگناتے ہوئے جھرنوں میں کھنک بھی ہے؟ نہیں جانِ جاں! اِن سب میں یقیناً یہ زندگی نہیں۔ یہ سب نظر فریب دھوکے ہیں، رُوح سے خالی بے جان جسم ہیں ـــــ بالکل ہماری طرح! ہم دونوں تو ایک دوسرے کی رُوح زندگی ہیں، لیکن دونوں ایک دوسرے سے دُور ـــــ بے جان اور بے رُوح! اِسی طرح چار خزائیں بیت گئیں، چار بہاریں گزر گئیں اور ہمارے دل کی کلیاں نہ چٹکیں، شگوفے نہ کھلے، محبت کے تار نہ گنگنائے۔

تمھیں یاد ہے وہ دن زرّیں! جب ہماری محبت کا پہلا حادثہ ہوا تھا؟ سخت گرمیوں کی ایک صبح تھی نا وہ؟ اور اُس جانسوز تپش میں پیاس کی شدّت سے مجبور ہو کر مجھے تم سے مخاطب ہونا ہی پڑا تھا۔ کیا کرتا کوئی اور تھا بھی تو نہیں اور میں پیاس سے بے چین ہو رہا تھا۔ اگر کوئی ہوتا تو نہ میں اِتنا بے چین ہوتا اور نہ دستک دے کر تمھیں بُلاتا۔ لیکن شاید یہ تنہائی قدرت ہی کی مرہونِ منت تھی۔ ہماری ملاقات کا ایک سنہرا موقع خود قدرت نے مہیا کر دیا تھا۔ صرف قدرت ہی تو محبت کی مہربان ہوتی ہے نا۔

پہلی بار ـــــــ

ہاں پہلی بار تمھاری پُرکشش آواز اتنے قریب سے سُنی تھی۔ دروازے کے
پاس آئیں اور اُس کی اوٹ سے تم نے پوچھا تھا۔

"آپ نے مجھے بلایا؟"

اور تھوڑی دیر تک تو بس اُس پُرفسوں آواز کے سحر سے مسحور رہا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ خوشی سے لرز رہا تھا کہ کہیں تم بُرا تو نہیں مان گئیں۔ آخر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے دھک دھک کرتے دل کو تھام کر کہا تھا۔

"بڑی پیاس لگی ہے۔ ایک گلاس پانی پلائیے تو بڑی عنایت ہوگی۔" میں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کئے تھے۔ تمھاری قُربت نے میری پیاس میں اور اضافہ کر دیا تھا اور میرے ہونٹ کانٹے سے پڑ گئے تھے۔

اور پھر تم نے کہا تھا۔

"اچھی بات ہے، ابھی لائی!"

تمھاری آواز میں ایک خوشی کی جھلک تھی، ایک اُمنگ تھی، ایسا جذبہ تھا جیسے بہت دنوں بعد تمھاری کوئی خواہش پوری ہوئی ہو۔ تمھارے اُن حوصلہ افزا الفاظ سے مجھے بھی ایک انتہائی خوشی کا احساس ہوا تھا اور میرے دل کی لرزش بتدریج پُرسکون ہو کر ایک انبساط آمیز کیفیت میں تبدیل ہو گئی

چند ہی لمحے بعد پھر تمھاری آواز آئی

"گلاس شاید اسی کمرے میں ہے، ذرا سے دیجئے گا!"

اور پھر میں نے دروازے کو نیم وا کر کے گلاس تمھارے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ ایک خفیف سا لمس تمھاری انگلیوں کا محسوس ہوا تھا لیکن اتنے ہی سے ایک بجلی کی سی رَو میرے بدن میں دوڑ گئی تھی۔ ابھی میں اُس مدہوشی سے بیدار بھی نہ ہو پایا تھا کہ پھر تمھاری آواز آئی۔

"لیجئے!"

میں نے دروازے کو تھوڑا نیم وا کیا اور تھوڑا تم نے ——— اور پھر تمھارے ہاتھ میں تمھاری انگلیوں کے درمیان گلاس دبا ہوا آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ گلاس کے اندر شفاف پانی بے قرار موجوں کی طرح مچل رہا تھا، لہریں مار رہا تھا جیسے میرے سینے میں میرا دل لرز رہا تھا۔ اُف! تمھارے ہاتھ کی خوبصورتی کی کیفیت کیا بتاؤں۔ تمھاری مخروطی شکل و نازک انگلیوں کی رعنائی کیسے بیان کروں۔ تمھارے ہاتھ کی خوبصورت جھلک ہی نے میرے پہلو سے میرے دل کو چھین لیا۔

اور مجھے یاد ہے ——— وہ کیفیت اب بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ٹھنڈا اور شیریں پانی کا پورا گلاس پی جانے کے باوجود میرے سینے میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔

اور میں کرسی پر نڈھال سا گر کر بے تحاشا ہانپنے لگا تھا۔

یہ تھا ہماری محبت کا پہلا حادثہ ——— تمھیں یاد ہے نا؟

میرے دل میں اُس کیفیت کی یاد اب بھی تازہ ہے، اُس کا احساس اب بھی جوان ہے۔ پانچ سال ہو گئے ——— ایک طویل عرصہ۔ مگر اب بھی بالکل ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو اور یہ احساس، سچ جانو زرّین، میری زندگی کی سب سے عزیز متاع ہے۔ میں اِسے ہر وقت سینے سے لگائے رہتا ہوں ——— میری زندگی میری خلوتوں کی جلیس ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

. . تمھاری شکایت سر آنکھوں پر۔ ہاں کوشش کروں گا کہ تمھیں اِس جذباتی انداز میں مخاطب نہ کروں، اِتنے ہیجان آمیز طور پر خطاب نہ کروں بلکہ حقیقت کے سرد، بے کیف اور پھیکے الفاظ استعمال کروں جو تمھاری پردہ داری کر سکیں۔ ہاں تمھارا وقار مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر ع

اے دلِ بے تاب ذرا دم تو لینے دے!

ہمیشہ تمھارا ——— عارف جمال

زرّین! جانِ حیات

اور دوسرے دن ———!

پھر اُسی وقت ———!!

قدرت نے تنہائی کا موقع عطا کر دیا ———!!!

تم آئیں اور زنجیر ہلا کر مجھ سے دروازہ کھولنے کو کہا اور جب میں نے دروازہ کھولا تو تم بالکل بے نقاب سامنے آ گئیں۔ میں تو دم بخود رہ گیا۔ کل تو صرف تمھارے ہاتھوں کی جھلک ہی دیکھ کر از خود رفتہ ہو گیا تھا لیکن آج تمھارے بے نقاب سراپا نے مجھ پر بجلی ہی گرا دی۔

لالہ گوں سیب جیسی تمھاری سُرخ و سپید رنگت مجھے کیف و سُرور میں مدہوش کئے دے رہی تھی۔ تمھاری حسین اور سیاہ آنکھوں کی چمک مجھے اپنے ساتھ اُڑائے لئے جا رہی تھی۔ کاجل کے موٹے ڈورے نے میرے دل میں گرہ ڈال دی تھی۔ گلاب کی پتیوں کی طرح تمھارے نازک عنابی ہونٹ میرے دل کی طرح لرز رہے تھے اور اُن کے درمیان جھانکتے ہوئے موتی جیسے دانت سُرخ بادلوں کے پیچھے سے چمکتی ہوئی بجلی کی طرح مجھ پر برق پاشی کر رہے تھے اور شانے سے ہوتی تمھارے سینے پر دو کالی گھٹائیں جھوم رہی تھیں ——— میں تو تمھارے جلوؤں کی بارش میں سر اپا ور ہو گیا۔

میں سوچنے لگا ــــــ

تم میرے پاس کیسے آگئیں ــــ؟

کس جذبے سے متاثر ہوکر ــــ؟؟

کون سی کشش سے مجبور ہوکر ــــ؟؟؟

ایسی کوئی بات تو ہمارے درمیان کبھی نہ ہو پائی تھی۔ پانچ سال کے طویل عرصے میں بھی نہیں۔ لیکن جیسے وہ گزرے ہوئے دن میری آنکھوں میں تصویریں بن کر رقص کرنے لگے۔

میں نے محسوس کیا ــــــ

تمہارے یہاں میں آیا تو جیسے تمہاری نگاہوں میں چمک سی جاگ ــ اٹھی۔ تمہاری افسردگی کی جگہ ایک انجانی سی خوشی نے لے لی۔ تمہارا دل گنگنانے لگا، تمہارے پاؤں بے چین سے ہونے لگے ــــ اور میرے دسترخوان پر انواع و اقسام کی چیزیں نظر آنے لگتیں۔ بالکل گرم اور تازہ!

پھر کبھی میں نے سُنا ــــــ

تمہاری گنگناہٹ۔ اُف! کتنی پُرکشش اور رسیلی آواز تھی کتنی نغمگی تھی تمہاری آواز میں۔ میرے ہونٹ تو بند ہوگئے۔ میرے نغمے جو تم نے چُرا لئے تھے ــــ چور کہیں کی!!

اور کبھی میں نے یہ بھی دیکھا ــــــ

دروازے کی درز سے تمہاری پُرشوق آنکھیں میرے کمرے میں جھانک رہی ہیں، مجھے دیکھ رہی ہیں اور تمہارے کان میری باتوں پر متوجہ ہیں۔ میری نظریں تو دوسروں پر مرکوز ہیں لیکن آنکھ کے گوشے تمہاری حرکتوں کے نگراں رہے۔ دل میں تو آیا کہہ دوں ــ ـــ یوں چوری چوری چھپ کر کسی کو دیکھنے اور اس کی باتیں سُننے میں کیا لطف آتا ہے؟ مگر میری عدم تنہائی تمہاری مددگار رہی۔ ورنہ خدا کی قسم اچانک ــ دروازہ کھول کر تمہاری چوری پکڑ لیتا اور پوچھتا ــــ "کیوں جی! یہ کیا حرکت ہے؟" اُس وقت تمہاری کیفیت دیکھنے کی ہوتی۔ افشائے راز کے باعث تو شاید تم عرقِ ندامت سے بھیگ جاتیں۔ اُس منظر کی تصویر جب بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے تو اب بھی لُطف آجاتا ہے۔

اور جب تم میرے رخصت ہونے کی آواز سُنتیں ــــــ

تو تم بے چین ہوجاتیں اور پھر بیرونی دروازے سے آکر لگ جاتیں۔ اُس وقت تک لگی کھڑی رہتیں جب تک میں باہر نہ آجاتا۔ اُف! کتنی حسرت سے مجھے تم دیکھتیں ــ!! تمہاری آنکھیں کتنی اُداس ہوجاتیں اور جیسے التجا کرتی معلوم ہوتیں ــــ "پھر کب آیئے گا؟ مجھے بھول تو نہ جایئے گا؟ لِلّٰہ جلد آیئے گا۔ آپ کے جانے کے بعد تو کسی کام میں میرا دل نہ لگے گا!"

اور میں بھی تمہاری بے قرار اور تڑپتی نگاہوں کی التجا سے مجبور ہوکر رُک جاتا اور دروازے پر کھڑے ہوکر لوگوں سے باتیں کرنے میں دیر کر دیتا لیکن آخرکار ــ جب میں چلنے لگتا تو تمہاری مضطرب آنکھیں راستے کی آخری حد تک میرے تعاقب میں لگی رہتیں اور میں بھی اپنا دل تمہاری نگاہوں میں اُلجھتا ہوا چھوڑ آتا۔

اور شاید آج کی یہ بے نقابی اُنھیں جذبوں کی پروردہ تھی۔

لیکن جانِ جاں!

اب پانچ سال بعد ــــ!!

یہ سب باتیں خواب و خیال ہی ہیں نا ــــ!!!

مگر ــــ میری نگاہوں میں تو وہ خواب و خیال اب بھی تازہ ہے، حقیقت سے زیادہ شیریں ہے۔ تمہارا خیال ہی میری زندگی ہے۔ جب اُس خواب کی خیال آفرینی ہوتی ہے تو وقت کے یہ طویل عرصے سمٹ جاتے ہیں اور تم اُسی طرح میرے پاس آموجود ہوتی ہو۔ تم نہیں تو تمہارا تصوّر تو ہر لمحہ میرے پاس ہوتا ہے ؎

روز آتا ہے مرے دل کو تسلّی دینے
تجھ سے اے دشمنِ جاں تیرا خیال اچھّا ہے

اِس بار میرے اندازِ تخاطب سے تم چونک تو نہیں گئیں؟ ہاں، اِس بار تمہارے مخصوص القاب میں تحریف ہوگئی۔ شاید تمھیں دُکھ بھی ہو اور تمہاری تسکین بھی۔ دُکھ اِس لئے کہ تمہارے دل پر سے اپنی گرفت چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں اور تسکین اِس باعث کہ تمہارے ناموس و وقار کے حجاب کے مختلف رنگ تبدیل ہو رہے ہیں۔ ابھی تو شوخی باقی ہے لیکن شاید آخرکار بالکل پھیکے اور بے کیف ہوجائیں ــــ یہی چاہتی ہو نا تم؟

اچھا اب اجازت دو۔ دل کی یہ اُجڑتی محفل پھر سجاؤں گا!

تمہارا ہی ــــ عارف جمال

زرّین:

اپنے خوبصورت نام کو تنہا دیکھ کر چونک تو نہ جاؤ گی؟ لیکن یہ تو تمہاری ہی خواہش ہے نا! اب تمہارے نام کے ساتھ جذبات کی برات کیسے سجاؤں؟ اب تو تنہا مجھے ہی نوحۂ غم کو اپنے سینے سے لگانا ہوگا۔ تمھیں اپنے سوزِ غم اور سوزشِ زخمِ جگر میں کیوں شریک کروں۔ تم اِس تلخیٔ جام کا سُرور کیا جانو۔ اب تو خود تمھیں اپنے پُرکیف دن نصیب ہیں، اب تو خود تمہاری دید آفریں شبِ دراز تمھیں مسحور کرنے آتی ہے۔ پھر میں تمھیں اپنی بیداریٔ نیم شب کے نشہ آور کیف و سرور میں کیوں شامل کروں۔ میرے پاس تو اب اُس شبِ آخر کی سیاہی ہی رہ گئی ہے، اب تو اُس برستی ہوئی رات کے موتی ہی میرے

دامن میں باقی رہ گئے ہیں ـــــ یہی تو بس اب کُل میری دولت ہے، میری متاعِ عزیز ہے ـــــ اس کا شریک میں تمھیں کیوں بناؤں؟

کیوں، تمھیں برسات کی وہ رات یاد ہے زرّین ـــــ؟

اُس رات کتنی مُرادوں اور کتنے طویل انتظار کے بعد آئی تھیں تم۔ میں تو راہ تکتے تکتے تھک گیا تھا۔ آسمان کے سارے ستارے گن گن کر ختم کر چکے تھے اور میری آنکھیں تو بیداریٔ شب سے جلنے لگی تھیں اور آہوں کی ٹھنڈی سانس سے اُن میں نمی آ گئی تھی۔

مگر تمھاری زُلفیں تو جیسے سر جھٹکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں ؎

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال

یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

شاید اس بار تم میرے گزشتہ خوابِ غفلت کا بدلہ لے رہی تھیں۔ کئی راتیں ایسی بھی تو آئی تھیں ناجب کہ تم میرے کمرے کے دریچے کے پاس آئیں اور مجھے جگانے کے لیے ننھی ننھی کنکریاں بھی مجھ پر برسائیں لیکن اپنی محبوب نیند کے باعث تم سے بے اعتنائی برتی تھی اور صبح کے اُجالے میں جب یہ محبوب شرما کر چلی جاتی تو صاف و شفاف بستر پر پڑی یہ کنکریاں تمھارے فسانۂ شب کی ناکامی کی داستان سنانے لگتیں۔ میں تو سر پکڑ کر رہ جاتا۔ اُف! میری غفلت نے تم پر کیا کیا ستم ڈھائے ہوں گے! اور پھر میں جھنجلا کر اپنے اوپر لعنت بھیجتا اور اُن کنکریوں کو فوراً کھڑکی سے باہر پھینک دیتا تاکہ اس داستانِ شب کا ایک لفظ بھی کسی اور کی آنکھیں نہ پڑھ پائیں۔

لیکن اُس رات تمھاری باری تھی ـــــ مجھے تڑپانے کی!

مگر خیر ـــــ انتظار کی تکلیف دہ گھڑیاں آخر ختم ہو ہی گئیں۔ برسات کی رات میں بھی تم اپنے آنچل میں بہارِ دید کی خوشبوئیں بھر کر لائی تھیں۔ تمھارے آنے سے وہ اُداس اور روتی ہوئی رات کتنی مہک اُٹھی تھی زرّین! اس برستی ہوئی رات کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے ہوئے آنسوؤں کی لڑیوں سے کتنی شیریں نغمگی بکھرنے لگی تھی۔ جیسے وہ روتے روتے یکایک ہنس پڑی ہو ـــــ یاد ہے نا!

میرا دل بھی جھوم اُٹھا لیکن میری تڑپتی محبت نے تم سے شکایت کر ہی ڈالی۔

"بہت دیر کی تم نے زرّین!"

"کیا کروں، میں بھی بے چین تھی۔ لوگ بیدار تھے۔ موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔"

"آج کی رات بڑی قیمتی ہے زرّین! شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔"

"کیوں؟ ایسی بات نہ کرو میرے عارف! تمھارے بغیر میرا فسانۂ حیات بے عنوان ہے۔"

"میرے جسم میں بھی تو تمھاری ہی رُوح ہے، جانِ زندگی! لیکن میرا دل دھڑک دھڑک کر جیسے یہی کہہ رہا ہے، آج کے بعد سے کوئی تمھیں مجھ سے چھین کر الگ کر دے گا۔ ہم دونوں پھر کبھی نہ مل سکیں گے۔"

"نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میری رُوح ہمیشہ تمھاری رہے گی جانِ زندگی! مجھے اپنے سینے میں چھپا لو میرے عارف! مجھے اپنے دل کی دھڑکن بنا لو میرے جیا،!! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں مر جاؤں گی، میں مر جاؤں گی؟"

"کاش! ایسا ہو سکتا میری زرّین!! لیکن ایسا نہ ہوگا، مجھے یقین ہے۔"

"کیوں نہ ہوگا؟"

"میں تمھاری رُسوائی نہیں چاہتا۔ تمھارے دامن پر بدنامی کے داغ نہیں لگ سکتے۔"

"یعنی مجھ سے محبت نہیں؟"

"اپنے دل سے بھی تو پوچھو، کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے؟ نہیں میری رُوح! میں تمھارے ناموس کی قبر پر اپنی آرزوؤں کا محل نہ بناؤں گا!"

"تو پھر میری آرزوؤں کا جنازہ تم اپنے کاندھے پر اُٹھا سکتے ہو؟"

"تم تو میرا ایمان ہو، تمھاری محبت تو میرا مذہب ہے۔ میرا ایمان نہ ڈگمگاؤ، مجھے لامذہب نہ بناؤ جانِ روح!"

"اور مجھے بے دین کر کے دُنیا کے جہنم میں دھکیل دینا چاہتے ہو؟"

"طنز و تشنیع سے اس قیمتی رات کو برباد نہ کرو زرّین! ہماری ملاقات کی یہ ایک ساعت آخر ہماری زندگی کا حاصل ہے۔ آج کی ملاقات کی اس حسین ساعت کے لئے میں نے کتنے دن تک دعائیں مانگی ہیں کہ تم سے جی بھر کے باتیں کر لوں، تمھیں نظر بھر کر اتنا دیکھ لوں کہ تمھاری تصویر یہ دل پر نقش ہو جائے۔ تم میری نظروں سے دُور ہو جاؤ لیکن دل سے نہ جا سکو۔ آج کی رات بڑی مُرادوں کی رات ہے۔ تمھاری یہ رُونمائی ہماری تمام زندگی کی ناکامیٔ ملاقات کا بدلہ ہے۔ یہ صرف ایک ساعت ساری زندگی کا صلہ ہے۔ تمھیں ساری زندگی کھو دینے کے لئے یہ گھڑی پائی ہے۔ تم سے ملنے کے لئے کتنی بڑی قیمت چکائی ہے میں نے جانِ من ـــــ!"

اور پھر تم کچھ نہ بولیں۔ صرف تمھاری سسکیاں برستی ہوئی رات کے آنسوؤں میں گھلتی رہیں، میرا سینہ بھگوتی رہیں۔

اور اب ـــــ

... اب تو شاید تمھاری یادوں کے اُجالے میں اس شبِ ناکام کی سیاہی کا گزر بھی نہ ہوگا۔ لیکن میری یادوں کے اندھیرے میں یہ رات اب بھی روزِ روشن کی طرح چمک رہی ہے۔ ابھی تو ایک لمحہ بھی نہیں گزرا کہ تمھارے آنچل میں میری پُرنم آنکھوں کے موتی خشک ہو گئے ہوں، ابھی تو اتنا وقت بھی نہیں سرکا کہ تمھاری چوڑیوں کی کھنکتی آواز معدوم ہو گئی ہو، ابھی تو اتنی ساعت بھی نہیں گزری کہ تمھارے ہلتے ہوئے آویزے رُک گئے ہوں ـــــ میرے لئے تو کچھ بھی وقت نہیں گزرا۔ تمھارے لئے تو شاید ایک زمانہ بیت گیا۔ وقت کے مرہم نے تو تمھارے زخم بھر دیئے ہوں گے۔ خدا کرے تمھارا دل

صحت و مسرت سے مہکتا ہو جائے ــــــ!!

تمھارا ــــــ عارف جمال

راقعہ زرّین !

اور آخر کار سرحد آہی گئی ــــــ!

وہ سرحد جہاں سے ہمارے جذبات ایک دوسرے سے جدا ہونے کو ہیں، ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانے کو ہیں۔ زرّین کی جذباتی اور رُومانی سرحد اب پار ہو گئی اور راقعہ کی پُرحقیقت اور بے کیف دُنیا میرے سامنے ہے۔ حقیقت، جہاں حقائق کی تلخیاں ہیں، جہاں شناسائی تو ہوتی ہے لیکن جذباتیت بھری دیوانگی نہیں، جہاں پہلے میرے لئے محبت تھی اور اب جہاں اجنبیت ہے ــــــ وہ دُنیا تو راس نہ آئی، پتہ نہیں یہ نئی دُنیا مجھے جینے بھی دے گی ــــــ؟

زرّین! تمھارا یہ والہانہ اور خوبصورت نام جس کی میں پرستش کرتا ہوں، جس سے مجھے پیار ہے، آج میری زبان سے آخری بار ادا ہو رہا ہے، میری نوکِ قلم سے آخری بار اُبھر رہا ہے۔ آج کے بعد کبھی یہ نام میرے ہونٹوں پر نہ آئے گا۔ آج سے ہمیشہ کے لئے دل کی اتھاہ گہرائیوں کے نہاں خانے میں چھپ جائے گا، جس کی محبت دل کے سوا اور کوئی محسوس نہ کر سکے گا ــــــ تم بھی نہیں!

یہی چاہتی تھیں نا تم!

اچھا زرّین رخصت ــــــ ہمیشہ کے لئے!

بس آخری بار!

تمھارا ــــــ عارف جمال

رافعہ!

آج اجنبیت کی سرحد کے اُس پار تم اکیلی کھڑی ہو۔

اور اِس پار میں اکیلا کھڑا ہوں۔ لیکن نہیں ــــــ

تم اکیلی نہیں۔ وہاں سے تو تمھاری وہ زندگی شروع ہونے والی ہے جہاں تمھاری زُلفوں کی مدہوش کُن خوشبو کسی اور کے مشامِ جان کو معطر کرنے والی ہے، جہاں تمھارے گیسو کسی اور کے شانے پر بکھرنے والے ہیں اور اُس کی گہری سیاہ راتوں میں کسی اور کا خوابِ شیریں مدہوش ہونے والا ہے۔

آج کے بعد تم اُدھر لوٹ جاؤ گی اور میں اِدھر واپس آجاؤں گا لیکن نہیں ــــــ میں نہ لوٹوں گا، اپنی محبت کی سرحد پر کھڑا تمھیں کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اجنبیت کے دیس کی طرف لوٹتے ہوئے دیکھوں گا۔ دُور، بہت دُور... حدِ نظر تک... اُفق کے اُس پار بھی، جہاں سے تمھارے قہقہے شفق کی پھوٹتی ہوئی کرنوں کے ساتھ مجھ تک پہنچا کریں گے اور میں اُن کرنوں کی گرمی سے اپنے دل کے زخموں کو سینکتا رہوں گا۔

ہاں رافعہ! میری طرف سے اجازت ہے تمھیں۔ اب نیا سفر شروع کر دو!

خیر طلب ــــــ عارف جمال

راقعہ سلیم!

نئی زندگی مُبارک!

نیا ساتھی مُبارک!!

اور زندگی کے نئے اُجالے مُبارک!!!

آج سے تم غیر ہو گئیں، میرے لئے اجنبی بن گئیں۔ تم اُس دُنیا میں چلی گئیں جہاں جذبات کی گرمی نہیں، حقیقت کی سرد مہری ہے، بے تعلقی ہے اور اجنبیت ہے اور یہ ضروری بھی ہے۔ تمھارے ناموس کے لئے، تمھاری عزّت کے لئے، تمھارے وقار کے لئے۔ ہمارے دل ہماری محبت کے خون کے چھینٹے سے داغدار تو ہوں لیکن تمھارا دامن بے داغ رہے ــــــ یہی میری آرزو ہے، یہی میری محبت کا ایثار ہے!

خیر اندیش ــــــ عارف جمال

مِسز سلیم!

ہاں، اب تو اِسی طرح مخاطب کرنے کی اجازت دے دو۔ تمھارے نام سے تو پھر بھی درد جاگ ہی جاتا ہے اور اب تو اُسے نوکِ قلم سے ادا ہوتے پانچ سال ہو گئے ــــــ پانچ بہاریں گزر گئیں۔ لیکن میرے لئے تو اِن بہار کی مہکتی ہواؤں سے چٹکتی کلیوں میں ذرا بھی مہک نہیں، کھِلتے ہوئے شگوفوں میں ذرا بھی دمک نہیں، کھِلکھلاتے ہوئے پھُولوں میں ذرا بھی چمک نہیں اور آبشار کے گنگناتے ہوئے جھرنوں میں ذرا بھی کھنک نہیں...

پتہ نہیں تمھارے لئے یہ بہار کیا پیغام لائی ہے ــــــ؟

زندگی کی مسرت کا پیغام یا خونِ دل کا ــــــ؟؟

خلوص آگیں ــــــ عارف جمال

پیار

شباب للت ایم-اے

ہم بھی مجبورِ مے گساری ہیں — ہم بھی ساقی ترے بھکاری ہیں
زندگی کے قمار خانے میں — ہم بھی ہارے ہوئے جواری ہیں

ایک پیغام ہے ذرا سنیئے — آپ کے نام ہے، ذرا سنیئے
حسن اتنا غلط نواز ہے کیوں؟ — شکوہ عام ہے، ذرا سنیئے

آپ کو پا سکوں کہاں ممکن — میں کہاں اور بھلا کہاں سرکار
آپ منزل ہیں کاروانوں کی — اور میں راستوں کا گردو غبار

ظلمتوں سے حیات اُبھرتی ہے — روح میں روشنی اُترتی ہے
عشق سے محض زندگی ہی نہیں — عشق سے عاقبت سنورتی ہے

میرے احساس کی فضاؤں پر — آج تک اِک نشہ سا طاری ہے
آپ کے گیسوؤں کے سائے میں — میں نے اِک رات کیا گزاری ہے

دل ہے وہ لاجواب شہر، جسے — شہر کے حکمراں نے لُوٹ لیا
آہ تقدیر اُس گلستاں کی — جس کو خود باغباں نے لُوٹ لیا

مار ڈالے نہ اُن کی ٹیس کہیں — دِل پہ جو رنج وغم کے چھالے ہیں
چل مرے غمگسار، دیر نہ کر — مے کدے بند ہونے والے ہیں

میرے دل میں فریب کا خنجر — دشمنوں نے نہیں اُتارا ہے
میرا دشمن بنا ہے میرا خلوص — سادہ لوحی نے مجھ کو مارا ہے

اپنے خادم کو یوں نہ ٹھکراؤ — جاں نثاری ہی اس کی خو بو ہے
وقت پر کام آئے یہ شاید — آدمی آدمی کی دارو ہے

افسانہ

دل کا پودا

عليم مسرور

اسمٰعیل منزل۔ پاندے حویلی۔ وارانسی

محترم خوشتر گرامی! تسلیم

ہارٹ ٹرانسپلانٹیشن کے متعدد واقعات سے متاثر ہو کر میں نے بھی ایک کہانی لکھی تھی لیکن اشاعت کی غرض سے اِس لئے نہ بھیجی کہ اُس کا پلاٹ قبل از وقت محسوس ہوتا تھا کیونکہ مریض کے زیادہ دیر تک زندہ رہنے کے امکانات واضح نہ تھے۔ میں نے کہانی ڈاکٹر امرت لعل عشرت کو سنائی تھی جو اُنھوں نے پسند کی تھی ——

اب جبکہ جناب بشیشر پردیپ نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر پروفیسر مانک کو اُس کا اہل بنا دیا کہ وہ ایک نارمل زندگی گزار سکیں، تو میری کہانی کے لئے راستہ ہموار نظر آ رہا ہے۔ برادرم بشیشر پردیپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے اِس موضوع کو اِتنے سائنٹفک انداز سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا اُس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر تھوڑی دیر فکر کر سکتا ہے۔ میری کہانی کا تعلق صرف اِن موضوع کے جذباتی پہلو سے ہے —— اگر ہارٹ ٹرانسپلانٹیشن کامیابی کے ساتھ عام ہوتا تو میں کہانی کے لئے کسی نئی تکنیک کو پسند کرتا لیکن ابھی ایسا نہیں ہے۔ اِس لئے میں نے جو اندازِ بیان اختیار کیا اُسی کو بہتر سمجھتا ہوں —— میں نے زیادہ کہانیاں نہیں لکھی ہیں۔ آغازِ شوق میں کچھ کہانیاں شائع ہوئیں۔ اُس کے بعد جو کہانیاں لکھیں وہ ضائع ہو گئیں۔ دوستوں نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے اب اُس کے فیصلے کا منتظر ہوں جس کے سائے میں ہمیشہ افسانے لکھنے والوں کا بہت بڑا طبقہ تربیت پاتا رہتا ہے۔ آپ نے اگر میری کہانی شائع کر کے ہمّت افزائی کی تو "بیسویں صدی" کے معزز قارئین کی رائے کا انتظار کروں گا۔ کہانی کا عنوان "دل کا پودا" ہے جو آپ کے سامنے ہے —— خوشتر گرامی زندہ ہیں تو اُردو زندہ ہے! اِس سے آگے ابھی کچھ اور سوچنے کی ضرورت ہو تو کہئے —— جہاں لاکھوں دستِ دعا آپ کی عمرِ ابد کے طالب ہیں انھیں میں کہیں میں بھی کھڑا ہوں . . .

نیاز مند —— علیم مسرور

چاندنی کو اسپتال میں داخل ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اُس کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ بہترین تدبیریں اور بیش قیمت دوائیں ناکام ہوتی گئیں۔ چاندنی جس رفتار سے ڈھل رہی تھی چمن کی زندگی میں اُس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ چمن لال کی زندگی میں چاندنی اپنے بھرپور شباب کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ چمن لال بھی کم دلکش نہ تھا۔ جب کبھی پڑوسی چاندنی اور چمن کو گھل مل کر باتیں کرتے دیکھتے تو کہتے چمن میں چاندنی چھٹک رہی ہے۔ ایسی باتیں سُن کر دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا پیار اور اُمڈ آتا اور دونوں پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگتے۔

آج جب ڈاکٹر شہاب چاندنی کے بِڈ کے پاس پہنچے تو چاندنی نے نہ سر اُٹھایا نہ اُنھیں سلام ہی کیا۔ شہاب نے حسبِ معمول اُس کی نبض دیکھی۔ اُس کے سینے پر آلہ لگایا اور

پہلے سے بھی زیادہ تشویشناک انداز میں آکر ہٹا لیا۔

"کیسا ہے میرا دل؟" چاندنی نے ڈاکٹر شہاب سے نظر ملائے بغیر نہایت بے کیف آواز میں پوچھا۔ ڈاکٹر شہاب اس سوال کے لئے تیار نہ تھے، کیا جواب دیتے۔ پچھلے علاج کی ناکامیوں کی پشیمانی میں وہ پہلے کی بہ نسبت خاموش ہوتے جا رہے تھے۔ پھر بھی انھوں نے کہا۔

"تم بتاؤ؟"

"میرا دل کہتا ہے کہ چمن پاگل ہو گیا ہے میرے پیار میں۔ ڈاکٹر! اس سے کہو چاندنی کے ڈھلنے سے اتنا کیوں دیوانہ ہے۔ اس کے گھر میں دوسرا چاند نکل سکتا ہے!" چاندنی نے رُک رُک کر کہا۔

"تم نے اداس چاندنی دیکھی ہے؟" ڈاکٹر شہاب نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ اداس محبوبہ کی طرح!"

اس سے پہلے کہ چاندنی کچھ جواب دیتی چمن لال آ گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں دواؤں کے بہت سے پیکٹ تھے۔ اس نے کہا "ڈاکٹر صاحب! بہت مشکل سے دوائیں ملی ہیں۔ سارا شہر چھان مارا تب کامیابی ہوئی۔"

چاندنی اسی طرح پڑی رہی۔ اس نے پھر بھی سر نہ اُٹھایا۔ چمن لال چاندنی کے بڈ پر ہی بیٹھ گیا اور پوچھا۔

"طبیعت کیسی ہے چاندنی؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر شہاب دواؤں سے متعلق نرس کو ہدایت دے کر دوسرے بڈ کی طرف چل دئے۔ لیکن ان کی توجہ پھر بھی چاندنی کی طرف سے نہ ہٹی۔ چاندنی کو خاموش پاکر چمن کی طبیعت بیٹھنے لگی۔ اُس نے رُندھی ہوئی آواز میں پھر پوچھا۔

"چاندنی تمھارا جی کیسا ہے؟"

چاندنی نے سر اُٹھایا۔ چمن سے آنکھیں ملیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چاندنی نے بھرائی ہوئی کمزور میں کہا۔

"تم میرے لئے کہاں تک قرض کرو گے۔ مجھے بھگوان کی مرضی معلوم ہے۔ میں تمھارے اس پیار کو بھی جانتی ہوں جو میرے لئے تمھارے دل میں ہے۔ لیکن تم اُس پیار کو نہیں جانتے جو تمھارے لئے میرے دل میں ہے۔ بھگوان کے لئے اب صبر کرلو۔ میرا علاج ہو چکا۔ مجھے بھگوان کی مرضی پر چھوڑ دو۔ نہیں تو میرے بعد یہ قرض کا بوجھ تمھیں مار ڈالے گا اور... اور..."

چاندنی کی سانس پھولنے لگی۔ چمن نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ زبان سے کچھ کہنے کے قابل ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر شہاب چاندنی کی باتیں سُن ہی نہیں رہے تھے، کنکھیوں سے چمن کی حالت بھی دیکھ رہے تھے۔ جو کہ کرب سے ناقابلِ بیان ہو رہی تھی۔ جب ڈاکٹر شہاب اسپتال سے رخصت ہونے لگے تو چمن اُن کے پاس آیا اور اُس نے نہایت مایوس انداز میں پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! چاندنی کی حالت کیسی ہے؟"

"اچھی نہیں ہے چمن!"

"ڈاکٹر صاحب! کوئی صورت نہیں ــــــ؟"

ڈاکٹر شہاب خاموش رہے۔

"ڈاکٹر صاحب!" چمن نے پھر کہنا شروع کیا "سُنا ہے آپ تو بیمار دل کی جگہ تندرست انسانوں کے دل لگا دیتے ہیں۔ اگر چاندنی..."

"وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا" ڈاکٹر شہاب نے کہا۔

"کب وقت آئے گا۔ اگر چاندنی مر گئی تو..."

"ڈاکٹر کوشش کرتا ہے۔ کوشش بھگوان سے التجا کا دوسرا نام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی دل مل سکا تو میں چاندنی کو بچا لوں گا!"

"ڈاکٹر صاحب! میرا دل لے لیجئے!" چمن نے ڈاکٹر شہاب کے پاؤں پکڑ لئے۔ "میں چاندنی کے لئے مرجانا اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ چاندنی زندہ رہے۔ میرا دل اس کے سینے میں دھڑکے گا۔ یہ میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ ہم دونوں کی آتما ایک جسم میں آرام سے رہے گی۔" چمن بے اختیار رونے لگا۔

"چاندنی ٹھیک ہی کہتی ہے کہ چمن اس کے پیار میں پاگل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا کام ایک کو مار کر دوسرے کو جلانا نہیں ہے۔ یہ بات بھگوان کو بھی پسند نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہو۔ چاندنی سچ مچ تمھارے پیار کے قابل ہے۔ لیکن کیا تم جانتے ہو کہ وہ تمھارا دل اپنے سینے میں رکھ کر زندہ رہ سکے گی؟"

"پھر کیا ہوگا ڈاکٹر؟" چمن روتے ہوئے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں اگر کسی کی موت چاندنی کی زندگی کا سبب بن سکی تو میں دیر نہ کروں گا۔ مرنے والے کی آتما بھی سپھل ہو جائے گی اور چاندنی کا جیون بھی!"

"اگر چاندنی مر گئی تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔ پھر آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میرا مرنا بھی اس کے کام نہ آ سکے؟" چمن نے سسکتے ہوئے کہا۔

"چمن دھیرج رکھو۔ بھگوان کی مرضی کا انتظار کرو۔ یہ عبادت ہے اور عبادت کا پھل ملتا ہے۔"

ڈاکٹر شہاب اپنی کار میں بیٹھ کر اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ وہ دل کے ماہرین میں بہت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ وہ دل کی بیماری اور صحت سے جس قدر آشنا تھے

اتنا خوبصورت بھی نہ تھے. لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ چمن کے دل کے جس گوشے سے اُن کی حسرتیں آوازیں دے رہی ہیں وہ کہاں ہے؟ دل کے سینکڑوں مریض اُن کے علاج سے شفایاب بھی ہوئے مرے بھی لیکن چاندنی سے انھیں جتنا جذباتی لگاؤ ہو گیا تھا اتنا کسی مریض سے نہ تھا۔ شاید چاندنی کے حسن اور چمن کی محبت نے اُن کے دل سے غیر محسوس طریقے پر کوئی رشتہ جوڑ لیا تھا۔ کوئی جذبہ بار بار انھیں ایک ڈاکٹر سے ایک شاعر بنا دیتا تھا اور وہ دل کی اس رومانی فضا میں پہنچ جاتے تھے جس کے بارے میں ہیومن اناٹومی اور ہیومن فیزیالوجی کی بڑی سے بڑی کتابوں میں بھی کوئی باب نہ تھا۔ انھیں دونوں کا پیار مجبور کر رہا تھا کہ کہیں سے بھی زندگی کی کرن مستعار لے کر تاریک ہوتی ہوئی چاندنی کو پھر روشن کر دیں اور چمن کے دل کے گوشے گوشے میں بکھیر دیں۔

جب گاڑی شہاب کے بنگلے کے پورٹیکو میں ایک دھچکے کے ساتھ رُکی تو وہ خیالات کی دنیا سے باہر آئے اور گاڑی سے نکل کر اپنے بنگلے میں داخل ہو گئے۔ سلمیٰ نے انھیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"خیریت تو ہے آج بہت دیر کر دی"

شہاب پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ انھوں نے سلمیٰ کو جواب نہ دے کر اُسے اپنے پاس کھینچ لیا۔ سلمیٰ سٹپٹا گئی اور اُس سے دُور ہٹتے ہوئے کہا۔

"پاگل ہوئے ہو کیا۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"سلمیٰ! آج میں پاگل ہو رہا ہوں!"

"ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"میں مر جاؤں گا جس دن یہ جان لوں گا کہ کسی نے اپنی بیوی سے اتنا پیار کیا ہے جتنا پیار میں نے تم سے کیا ہے۔ میں تمھیں اتنا پیار دینا چاہتا ہوں جتنا کسی نے کسی کو نہ دیا ہو!"

سلمیٰ جو شہاب سے دُور آ بیٹھی تھی۔ کسی کے دیکھ لینے کے خوف سے بے نیاز ہو کر ایک عالمِ سرخوشی میں شہاب کے سینے سے لگ گئی۔ اُس کی آنکھیں سرشاری کے عالم میں بند ہو گئیں، اُس کے رخسار سُرخ ہو گئے۔ شہاب نے سلمیٰ کے کاندھوں کو پکڑ کر اُس کے خوبصورت چہرے کو اپنے سامنے کر لیا۔ سلمیٰ کے لبوں پر ایک دلنواز تبسم کھیل رہا تھا۔

شہاب کا جی چاہا وہ سلمیٰ کو اسی طرح قیامت تک دیکھتا رہے!

"آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" سلمیٰ نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں سلمیٰ! ایک مریض میرے زیرِ علاج ہے کم عمر اور نہایت ہی خوبصورت وہ مائٹرل اسٹینوسس کا شکار تھی۔ اب دل نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اِس مرض کا شکار عموماً جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ یہ بھی خاص بات ہے کہ یہ مرض تھوڑی دیر کے لئے مریضہ کو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیتا ہے۔ ایک ہلکی سی سُرخی اُن کے رخساروں میں عجیب سی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ مریضہ کا شوہر ایک غریب ملازم ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ غریب شوہر کے پاس محبت کے سوا کوئی سرمایہ نہیں۔ کاش میں اُن کی محبت کو موت کے ہاتھوں سے بچا سکتا!"

"بچا لیجئے بے چاری کی جان!" سلمیٰ کے دل میں انتہائی ہمدردی کروٹیں لینے لگی۔

"کاش میں ایسا کر سکتا! مجھے اُن کی محبت پر رشک آتا ہے۔ آج کچھ ایسا احساس ہونے لگا کہ میں تمھاری محبت میں اُن سے بہت پیچھے ہوں"

سلمیٰ مُسکرا دی۔ اُس نے کہا "کسی دن گریباں پھاڑ کر نکل جایئے گا۔ ورنہ مجھے کہنا پڑے گا ——— کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو!"

شہاب ہنس پڑا۔ سلمیٰ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "میں تمھاری بے پناہ محبت کا جواب نہیں دے پاتی۔ کہیں تم اِس سے تو بدگمان نہیں ہو؟"

شہاب نے سلمیٰ کے رخسار پر ایک ہلکی سی چپت لگا دی۔

"نہیں میں سچ کہتی ہوں۔ کبھی کبھی دل میں مچلتی ہوئی آرزو کو اِس لئے سُلا دیتی ہوں کہ کہیں تمھارے کاموں میں حارج نہ ہو جاؤں۔ میری محبت کی معراج میری یہ تمنّا ہے کہ ایک دن تم دُنیا کے عظیم ڈاکٹر بن جاؤ! جب میں اپنی اِس تمنّا کی تکمیل کے لئے کوئی کوشش کرنی چاہتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے میں ایک ناکارہ شے ہوں جو تمھارے کام کبھی نہ آ سکے گی"

"میرے لئے تمھاری مُسکراہٹ ہی کافی ہے"

ملازم نے چائے لا کر رکھ دی۔ دونوں نے ساتھ چائے پی۔ شب کے کھانے کے بعد عموماً شہاب کئی گھنٹے مطالعے میں گزارتا تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنے کام میں لگ گیا۔

دوسری صبح جب وہ اسپتال پہنچا تو سب سے پہلے چاندنی کے پاس گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اُس کے رخساروں پر زردی پہلے سے بھی زیادہ تھی اور آنکھیں اندر کو اور زیادہ دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ انھوں نے چاندنی کی نبض دیکھی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا حال ہے چاندنی؟"

چاندنی کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اُس نے دوسری کروٹ لینے کی کوشش کی لیکن شہاب نے روک دیا۔

"تم اتنی اُداس کیوں ہو۔ ابھی علاج کے راستے بند نہیں ہوتے ہیں"

پھر بھی چاندنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نرس نے بتایا کل چمن اِس کے پاس بیٹھ کر بہت رویا ہے۔ سب لوگوں نے سمجھایا لیکن وہ روتا ہی رہا۔ وہ کہتا تھا کہ چاندنی

اُس سے ناراض ہے۔

"کیوں۔ کیا سچ مچ تم اُس سے ناراض ہو؟" ڈاکٹر شہاب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر! وہ بہت لُٹ چکے ہیں ابھی اور لُٹنے کا ارادہ ہے۔ انھیں سمجھائیے ورنہ میرا دَم نہ نکل سکے گا۔ وہ میری محبت میں ناستک ہو رہے ہیں۔ وہ میرے لئے بھگوان سے لڑیں گے۔"

"اُسے لڑنے دو۔ کبھی کبھی بھگوان اپنے بھگتوں کی لڑائی سے خوش ہوتا ہے۔ وہ ناستک نہیں ہے۔"

چاندنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر شہاب آوٹ ڈور کی طرف روانہ ہو گئے اور مریضوں کے ہجوم میں اُلجھ گئے۔ ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ یک بیک اسپتال میں ایک شور برپا ہوا۔ سارا اسٹاف اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر شہاب کے کمرے کی طرف بھاگا آرہا تھا۔

مسز شہاب سیویر الیکٹرک شاک سے بیہوش ہو گئیں۔ ابھی ابھی اُن کے بنگلے سے ٹیلیفون ملا تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے حواس گُم ہو گئے۔ وہ بیقراری کے عالم میں کار میں بیٹھ گئے۔ اُن کے ساتھ ڈاکٹر رتناکر، ڈاکٹر خورشید اور ڈاکٹر دت بھی روانہ ہوگئے۔ پیچھے پیچھے اسپتال کی ایمبولینس بھی چل پڑی۔ آناً فاناً سارے ڈاکٹر مسز شہاب کو لے کر اسپتال واپس آگئے۔

ملازم نے بتایا کہ سلمیٰ چلتے ہوئے ٹیبل فین کو اپنی طرف گھمانے کی کوشش کر رہی تھیں، انھیں معلوم نہ تھا کہ اِس پر کرنٹ ہے۔ اُس نے اِس زور سے انھیں پھینکا کہ سامنے کی دیوار سے اُن کا سر ٹکرا گیا اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑیں۔ ڈاکٹروں نے دیکھا تو دماغ میں انٹرنل ہیمرج ہو رہا تھا۔ سر بہت تیزی سے ورم کر رہا تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ تمام ڈاکٹر جی جان سے لگ گئے۔ بہترین تدبیروں کے بعد بھی سلمیٰ کو ہوش نہ آیا اور ۲۴ گھنٹے کے بعد عالمِ بیہوشی میں اُن کے قلب کی حرکت بند ہوگئی۔

ڈاکٹر شہاب شدّتِ ضبط سے دیوانے سے نظر آرہے تھے۔ چمن لال اُن کی یہ حالت دیکھ کر بالکل مایوس ہو گیا۔ چاندنی کے لئے رہی سہی اُمیدیں بھی جاتی رہیں۔ چاندنی اِس حادثے کی تاب نہ لا سکی۔ اُس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ سارے ڈاکٹر اور اسٹاف کے تمام لوگ ڈاکٹر شہاب کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی تھیں۔ ایک شدید خاموشی نے اِس غمناک منظر کو اور بھی حسرتناک بنا دیا تھا۔ آخر کار ڈاکٹر رتناکر بڑھے اور شہاب کو مخاطب کر کے بولے۔

"اسپتال میں روز ہی ہم لوگ حادثوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمیں ہر روز خدا کی مرضی کے سامنے جھک جانا پڑتا ہے۔ ہم ہمیشہ دوسروں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن آج ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیا کہیں۔ ہمیں خود ضرورت ہے کہ کوئی ہمیں دلاسا دے اور ہمارے بیٹھتے ہوئے دل کو سنبھالے۔" شاید رتناکر اِس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکتے تھے اِس لئے انھوں نے رُومال سے اپنا مُنہ ڈھانک لیا۔

مریضوں کا ہجوم یہ سب دیکھ رہا تھا۔ سب کے چہرے پر رنج و غم کے گہرے آثار تھے۔ ڈاکٹر شہاب نے سب پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور ڈاکٹر رتناکر کے کاندھے کو تھپتھپایا۔ وہ بغیر کچھ کہے آپریشن تھیٹر کی طرف چل دئے جہاں سلمیٰ کی لاش ایک چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اُن کے پیچھے ہو لئے۔ شہاب نے سلمیٰ کے مُنہ پر سے چادر ہٹا دی۔ وہ جیسے گہری نیند سو رہی تھی۔ مر جانے کے بعد بھی اُس کے خوبصورت چہرے پر موت کا سایہ نظر نہ آتا تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے دل کا جو بھی عالم رہا ہو لیکن وہ نہایت سکون سے سلمیٰ کی ابدی نیند کو دیکھ رہے تھے۔ چند ہی لمحے بعد انھوں نے کہا۔

"چاندنی کو لاؤ۔"

ڈاکٹر سہم گئے۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے۔

ڈاکٹر خورشید نے کہا۔ "ہم سب لوگ آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن . . ."

"چاندنی کو فوراً لاؤ!" ڈاکٹر شہاب نے ڈاکٹر خورشید کی بات کاٹتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

چاندنی فوراً لائی گئی۔ اُس کی حالت بے حد نازک ہو چکی تھی۔ دل بدلنے کے سارے انتظامات چشم زدن میں درست ہو گئے۔ شہاب نے نشتر زنی کا آغاز کیا۔ تمام ڈاکٹر خائف تھے۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک غلط قدم تھا۔ لیکن اُس کے جذباتی اور ڈرامائی پس منظر میں خاموش رہنے کے سوا دوسرا چارہ کار نہ تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے فوری عمل نے دوسرے سارے ڈاکٹروں کی ذمّے داریاں اور بڑھا دیں۔ انھیں مریض سے زیادہ ڈاکٹر شہاب کو سنبھالنا مشکل نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر شہاب بظاہر بڑی یکسوئی اور ہوشیاری سے اپنا کام کر رہے تھے لیکن بیچ بیچ میں اُن کے اوپر ہلکی سی غشی طاری ہو جاتی اور وہ خود کو سنبھالنے کے لئے ایک لمحہ کے لئے رُک جاتے اور اُن کے سب ساتھی نہایت ہوشیاری سے اُن کی مدد کرتے رہے۔ چھ گھنٹے کی مسلسل جدّوجہد کے بعد ہارٹ ٹرانسپلانٹیشن کا کام مکمّل ہو گیا۔ ڈاکٹر رتناکر اور ڈاکٹر خورشید چاندنی کی نگرانی پر مقرّر ہوئے۔ سلمیٰ کی تجہیز و تکفین کا کام شروع ہوا۔ اُس کی لاش شہاب کے بنگلے پر لائی گئی۔ دوست، متعلقین اور دوسرے جان پہچان

سے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ شہاب کی حالت اب پہلے سے زیادہ خراب ہوتی جارہی تھی۔ شہاب اور سلمیٰ کے والدین بالکل خاموش تھے لیکن اُن کی دِلی کیفیت شہاب سے کم خراب نہ تھی۔ آنے والوں کے لئے سخت مشکل صورتِ حال تھی۔ وہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ انھیں شہاب کو اِس عظیم کارنامے کی مبارکباد دینی چاہئے یا اِس جان کاہ حادثے پر اظہارِ غم کرنا چاہئے۔ سلمیٰ کا جنازہ اُٹھایا گیا۔ تمام فرقے کے لوگ شہاب کے غم میں برابر کے شریک ہوئے۔ حدِ نگاہ تک غم گساروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سلمیٰ اور ڈاکٹر شہاب کو خراجِ عقیدت پیش کررہا تھا۔ سلمیٰ کی تجہیز و تکفین ہوگئی لیکن شہاب کی حالت کچھ بہتر نہ ہوئی۔ اُن کا دماغی توازن بگڑتا جارہا تھا۔ سب کے دلوں میں شہاب کے لئے تشویش بڑھ رہی تھی۔

چاندنی کو دوسرے ڈاکٹروں کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رتناکر اور خورشید شہاب کی دیکھ بھال کررہے تھے۔ شہاب چاندنی سے ملنے کے لئے بیقرار تھے۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے میں شہاب اور چاندنی کی ملاقات دونوں ہی کے لئے نقصان دہ تھی۔ شہاب اگر پُورے طور پر ہوش میں ہوتے تو وہ خود بھی اِس بات کو سمجھ سکتے تھے لیکن اُن کے اندر ایک ہِسٹریائی کیفیت پیدا ہوچکی تھی۔ وہ بار بار اسپتال جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ انھیں روکنا بہت مشکل ہورہا تھا۔ اُنھیں کئی انجکشن دئے جاچکے تھے لیکن وہ سنبھل نہیں رہے تھے۔ بڑی کوششوں کے بعد ڈاکٹر اُن پر نیند طاری کرنے میں کامیاب ہوئے۔

چاندنی ہوش میں آچکی تھی۔ چمن لال اُس کے قریب بیٹھا تھا لیکن دونوں خاموش تھے۔ اب تک سارا اسپتال غمزدہ تھا۔

اخباروں نے بڑی بڑی سُرخیوں سے ڈاکٹر شہاب کی بے مثال قربانی کو سراہا۔ ڈاکٹر شہاب کے بنگلے پر اور اسپتال میں شہاب اور چاندنی کو دیکھنے کے لئے مشتاق لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی گیا۔ دونوں جگہ پولیس کا سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ قریب اور دُور سے خطوط، تار اور ٹیلیفون کا تانتا لگا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ شہاب کے حواس بجا ہونے لگے اور چاندنی روز بروز صحتمند نظر آنے لگی۔ اُس کے تمام سسٹم کی سختی سے نگرانی ہوتی رہی اور مناسب دوائیں دی جاتی رہیں۔

اِس طرح ڈھائی ماہ گزر گئے۔ ڈاکٹر شہاب ہوش میں آنے کے بعد قصداً اسپتال سے غیر حاضر رہے اور چاندنی سے ملاقات کی آرزو اپنے دل میں دبائے بیٹھے رہے۔ اِسی طرح چار ماہ گزر گئے۔ ڈاکٹروں نے شہاب اور چاندنی کا معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ دے دیا کہ اب دونوں کے ملنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

ایک صبح جب چاندنی شہاب کے پاس لائی جانے والی تھی شہاب نے اپنی ماں سے کہا۔

- ماں! اِس گھر کو سجادو۔ ویسے ہی جیسے اُس روز سجایا تھا جب سلمیٰ اِس گھر میں آنے والی تھی۔ اور ماں! چاندنی کو اپنے ہاتھوں سے سنگار کرکے میرے پاس لاؤ۔ ویسا ہی سنگار کرکے جیسا سلمیٰ کا سنگار اُس دن کیا گیا تھا، جب وہ پہلی بار اِس گھر میں آئی تھی۔ سلمیٰ کے سارے زیورات اُسے پہنادو۔

ماں کی آنکھوں میں غم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن ایک قطرہ بھی چھلک کر باہر نہ آیا۔ شاید یہ عالمِ انتہائے غم تھا۔ وہ بھی چاندنی سے نہیں ملی تھی لیکن دل میں بھی چاندنی کو ایک نظر دیکھنے کی بڑی حسرت تھی۔

ماں کے حکم سے سارا گھر سجا دیا گیا اور وہ خود اسپتال چلی گئیں۔ شہاب نہایت بیتابی سے چاندنی کا منتظر تھا۔ اُس کے دل میں عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ نہ وہ خوش ہی تھا نہ افسردہ ہی۔ اُس کے گھر میں دوست احباب اور رشتہ داروں کا مجمع تھا۔ ساس، سُسر اور اُس کے والدین سب ہی ایک عجیب سے خاموش عالم میں چاندنی کے منتظر تھے۔ کچھ دیر کے بعد موٹر پورٹیکو میں رُکی۔ سب ہمہ تن انتظار ہوگئے۔ شہاب کی ماں نے چاندنی کا ہاتھ تھام کر اُسے موٹر سے اُتارا۔ چمن لال اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔

چاندنی آدھا گھونگھٹ کاڑھے ہوئے گڑیا سی بنی، بنارسی ساڑی میں ملبوس، سر سے پاؤں تک زیوروں سے آراستہ، نیچی نگاہ کئے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی شہاب کی طرف چلی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ بابل کا گھر چھوڑ کر جانے والی سکھیوں کی طرح ڈاکٹر شہاب اُس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ سب اُن کے ساتھ ہی کھڑے ہوگئے۔ چاندنی شہاب کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ چمن لال اُس کے پیچھے تھا۔ شہاب نے چاندنی کو یوں دیکھا جیسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اُس کے گورے گورے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی۔ ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ پلکیں حیا اور دُکھ کے ملے جُلے بوجھ سے جُھکی جارہی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ ڈاکٹر شہاب کچھ کہیں چاندنی نے جُھک کر شہاب کے پاؤں پکڑ لئے اور بے اختیار رونے لگی۔ شہاب نے اُس کا بازو تھام کر اُسے اُٹھایا۔ وہ روتی جارہی تھی۔ شہاب پر ایک ہیبت ناک اضطراری کیفیت طاری تھی۔ چاندنی کو سینے سے لگالینے کا بیقرار جذبہ اُن کے دل سے اُٹھا۔ اُنھوں نے جلدی سے چاندنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔

چمن! یہ میری سلمیٰ ہے! سلمیٰ آج سے تمھاری ہے۔ اِس کا دل بہت نازک ہے۔ اِس کا بہت خیال رکھنا۔ انتہائے محبت میں اِسے بدگمان ہوجانے کی عادت ہے لیکن تم کبھی بدگمان نہ ہونا۔ اِسے انتظار کی گھڑیاں نہیں سہی جاتی تھیں۔ تم کبھی اِس سے انتظار نہ کرانا۔ کبھی اِس کے دل میں

میں چاہتا تھا کہ اب ماں کے دل میں تم ہو جیسے دل میں دھڑکن ہو۔ اُس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ خواب دیکھتی ہے۔ اس کے خواب کبھی جھوٹے نہیں ہوتے۔ کبھی اس کے خوابوں کا مذاق مت اُڑانا۔ اسے گلاب کے پھول بہت پسند ہیں۔ ہر صبح اسے گلاب کا ایک پھول چاہئے۔ وہ گلاب کا پھول اسے ہمیشہ میں دوں گا۔"

گملوں سے گلاب کا ایک پھول لے کر شہاب نے چاندنی کے خوبصورت جوڑے میں لگا دیا۔ چاندنی کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ شہاب نے اپنے ماں باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چاندنی! یہ تمہارے ساس اور سسر ہیں۔ اِن کے گھر کی تم ہی بہو ہو ـــــ سلمیٰ!"

چاندنی نے دونوں کے چرن چھوئے۔

ساس اور سسر سے ملاتے ہوئے شہاب نے کہا۔ "چاندنی! یہ تمہارے ماں اور پتا جی ہیں۔ اپنی بیٹی سلمیٰ کے غم سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اِن کے سینے سے لگ جاؤ اور بتا دو کہ سلمیٰ کا دل ویسے ہی دھڑک رہا ہے جیسے پہلے دھڑکتا تھا۔ سلمیٰ مری نہیں ہے۔"

چاندنی ماں کے سینے سے لگ گئی اور دونوں بلک بلک کر رونے لگے۔ پھر ڈاکٹر شہاب چمن لال سے مخاطب ہوئے اور کہا۔

"چمن لال! آج سے تم شہاب ہو اور میں چمن لال۔ تمہاری سلمیٰ زندہ ہے اور میری چاندنی مر گئی۔"

چاندنی نے ماں کے سینے سے الگ ہو کر پھر شہاب کے پاؤں پکڑ لئے اور روتے ہوئے کہا۔

"آپ دیوتا ہیں۔ دیوتا سب کے دل میں رہتے ہیں۔ آپ سدا میرے دل میں رہیں گے۔ میں ہر صبح آپ کے گلاب کے پھولوں کا انتظار کروں گی!"

ڈاکٹر شہاب دم بخود کھڑے تھے۔ سب ہی رو رہے تھے۔ لیکن صرف چاندنی کے سسکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی!!

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے احکام کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزلیں

پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خان منشاء ایم۔ اے

آپ پردہ نشین بن بیٹھے
چاند تارے حسین بن بیٹھے

دولتِ حسن جن کے ہاتھ آئی
فطرتاً نازنین بن بیٹھے

ہے ہمارا کمالِ حسنِ نظر
تم جو زہرہ جبین بن بیٹھے

عصمتِ گل سے کھیلنے والے
فصلِ گل کے امین بن بیٹھے

عقل ہے جن کی وہم پروردہ
وہ بھی اہلِ یقین بن بیٹھے

لوگ زعمِ خرد میں اے منشاؔ
ننگِ دنیا و دین بن بیٹھے

پروفیسر عبداللہ عرفان ایم۔ اے

لازم ہے احتیاطِ دلِ بے قرار اب اور
احباب تیرے حال پہ کرنے لگے ہیں غور

دل شیشۂ ہوس تو نہیں ہے کہ ٹوٹ جائے
وہ آزما کے دیکھ لیں آج اپنا سنگِ جور

اوروں کا ذکر کیا کہ نہ تھا خود پہ اعتبار
گذرا ہے زندگی میں اک ایسا بھی مجھ پہ دور

وہ بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ
جیسے مزاج وقت کا کل اور آج اور

بے نام سی خوشی کے لئے مر رہا تھا میں
سکھلا دیئے غموں نے مجھے زندگی کے طور

عرفاںؔ یوں تو جینے کو جی لیتے ہیں سبھی
ہوتی ہے لیکن اہلِ جنوں کی ادا ہی اور

افسانہ

کانٹے

جسونت سنگھ وردی ایم۔ اے، بی۔ ٹی

ایف ۱۷/۱، سُدرشن پارک، موتی نگر، نئی دہلی نمبر ۱۵

محترم بھائی! تسلیم

اپنی ایک تخلیق کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہا ہوں۔ میں نے یہ کہانی عام روش سے ہٹ کر لکھی ہے۔ یقین ہے آپ کو اور "بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین کو پسند آئے گی —— رسید اور اپنی رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں۔ . .

خلوص کار —— جسونت سنگھ وردی

میں نے ٹائپنگ کرتے ہوئے نظر اُٹھا کر دیکھا تو باس میرے سر پر کھڑا تھا اور میری میز پر پڑی ہوئی گھنٹی بجا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے ہاتھ گھنٹی بجا رہے ہوں اور اس کے ہاتھ ٹائپنگ کر رہے ہوں اور دوسرے لمحہ . . . دوسرے لمحہ میں اُس کی طرف متوجہ ہوا تو اُس نے چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں سے دیکھ کر فوراً کہا: "تو میرے ٹیبل سے گھنٹی کیوں اُٹھا لایا ہے؟"

"آپ سو رہے تھے اور میں نے سوچا جب آپ کو بلانا ہوگا گھنٹی بجا دوں گا۔"

"تو بہت گستاخ ہو گیا ہے۔"

"آپ کی ٹوٹی ہوئی کرسی پر جو بیٹھنے لگا ہوں۔" (اور میری اچھی کرسی آپ نے لے لی ہے)

"تیری سزا یہی ہے کہ سڑکوں پر چلتا پھرتا نظر آئے۔"

یہ دنیا کا سب سے مختصر نوٹس تھا جو کسی باس نے اپنے ماتحت کو دیا۔ اس کے بعد وہ خود میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی لمبی لمبی مونچھوں نے ٹائپنگ شروع کر دی . . . یہ واقعہ کوئی دو ڈھائی بجے کا ہوا ہوگا اور تین بجے میں سڑکوں پر چلتا پھرتا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویسے میں خوش تھا کہ نوکری کی قید سے چھٹکارا مل گیا۔ بس فکر اتنی ہی تھی کہ صبح بیوی نے وارننگ دی تھی کہ گھر آتے ہوئے راشن کے لئے پیسے ضرور لے آؤں۔

میں اُسے کئی بار سمجھا چکا تھا کہ اس جینے سے تو اچھا ہے کہ بندہ خودکشی کر لے۔ لیکن وہ جینے پر تُلی ہوئی تھی۔ اب دوسرے لمحہ میں اور بھی خوش ہوا کہ گھر جانے سے بھی بچے۔ اگلے ہی پل میں، میں قطب جانے والی بس میں بیٹھا تھا۔ ویسے خودکشی کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ بلکہ میں تو مسخرہ نظر آ رہا تھا۔ بے پروا۔ میری بے پروائی اور مسخرہ پن دیکھ کر ایک جھنجلاتے ہوئے سیٹھ جی اور بھی جھنجلا کر بولے۔ "برخوردار! کیا کام کرتے ہو؟"

"بیکار ہوں اور سویرے سے بھوکا بھی!"

"وہ تو نظر ہی آ رہا ہے۔ ہماری طرح آپ نے کوئی تعمیری کام تو نہیں کیا؟ ویسے کیا کیا کرتے تھے پہلے؟"

"ٹائپنگ!"

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"سوچ رہا ہوں۔"

"لوگوں کی جیبیں کاٹو!"

اُس نے بہت تلخی سے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے دیکھا۔ اگلے لمحہ اُس کی جیب میری پھرتیلی انگلیوں کے درمیان تھی!

اگلے اسٹاپ پر اُتر کر میں نے کمائی گنی۔ کل ملا کر سات روپے اور کچھ پیسے تھے۔ سر کے درد کے دو نسخے اور غالب کے چند شعر تہہ کئے ہوئے، سانس لینے کے لئے تڑپ تڑپ کر مر رہے تھے۔ مجھے جیب پر بہت ترس آیا اور فوراً "ڈیلی مارننگ" کے دفتر جا کر خبر دے دی کہ آج اچانک میں نے کسی کی جیب کاٹ لی ہے اور میں وہ سارا مال اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ جس کسی کی آج جیب کٹ گئی ہو، اپنے اپنے مال کی

[illegible] کے پاس بہت سامان ہے مال بیچا جائے گا؟

اگلے دن بہت سے لوگوں کو شکر گزار دیکھا۔ ہر آدمی ڈاکیا نے [illegible] کر [illegible] سامان کی فہرست لکھ رہا تھا۔ اُس دن ایک اسپیشل [illegible] میرے گھر تک [illegible] کے لئے دیا گیا۔ خط کچھ اِس طرح کے تھے ——

پہلا خط :-

میری جیب میں [illegible] لاکھ کے فارن ایکس چینج کے چیک تھے اور میں [illegible] امپورٹ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر آپ وہ چیک مجھے واپس کر دیں تو میں آپ کو کسی وزارتی محکمہ میں ہزار روپے کی ملازمت دلا سکتا ہوں۔ اور نہیں تو بچے روپے کے نوٹ چھاپنے والی مشین تو مجھے ضرور ہی واپس کر دیں۔ میرے روزگار کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

دوسرا خط :-

میری جیب میں سے سگریٹ کیس آپ نے نکال لیا ہے۔ اُس [illegible] کے سگریٹ کیس میں سونے کے سگریٹ تھے جو میں کوتوالی میں کوتوال صاحب کو پیش کرنے کے لئے لے جا رہا تھا۔ لیکن آپ کی قوتِ شامّہ بہت تیز نکلی۔ داد دیتا ہوں۔ براہِ مہربانی وہ سگریٹ کیس سگریٹ سمیت میرا نام لے کر کوتوال صاحب کو نذر کر دیں۔ شکریہ!

پانچواں خط :-

میری جیب میں پانچ لاکھ بلیڈ بنانے کا لائسنس تھا اور میں وہ لائسنس کسی کمپنی کے پاس بیچ کر بیس تیس ہزار کما لینا چاہتا تھا۔ یہ لائسنس میں بھی کسی کی جیب سے نکال کر لایا تھا۔ براہِ کرم یہ واپس بھیج دیں۔

چھٹا خط :-

میری جیب میں ایک رسٹ واچ تھی۔ میں اُس سے بہت پریشان تھا کیونکہ وہ ہر وقت مجھے ٹائم کی طرف متوجہ کرتی رہتی تھی اور میں اُسے ہر وقت جیب ہی میں رکھتا تھا۔ براہِ مہربانی وہ کسی عقل کے اندھے کو دے دیں۔ میرا مطلب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے!

ساتواں خط :-

میری جیب میں میری محبوبہ کے خطوط تھے اور میں انھیں تعویذ میں منڈھوا کر [illegible] رہا تھا۔ اگر آپ بھی عاشق مزاج بن رہے ہیں تو انھیں گلے میں پہن لیں تاکہ میری محبوبہ سے میرا چھٹکارا ہو جائے اور

وہ آپ کے گلے پڑ جائے!

ایک تار بھی تھا۔

سیٹھ نانی ... ارجنٹلی کئی لاکھ روپے [illegible] تو

تھینکس!

پھر ایک دوسرا تار تھا۔

میں نے اپنے منہ پر مصنوعی چہرہ لگا رکھا تھا اور میرا اصلی چہرہ میری جیب میں تھا۔ براہِ کرم مجھے جلدی سے میرا چہرہ واپس کر دیں۔ میری بیوی میری اصلی صورت دیکھنے کو ترس رہی ہے۔

یہ سب خطوط اور تار تعداد میں ایک سو انتیس تھے۔ میں نے سوچا ایک دن میں ایک سو انتیس افسران نے اپنے ماتحتوں کی نئی کرسیاں [illegible] تھیں۔

ساری رات میں خط پڑھتا رہا اور ہنستا رہا۔ [illegible] کے بعد میری بیوی جاگ اُٹھتی اور کہتی "گھر میں کھانے پینے کو تو کچھ ہے ہی نہیں۔ آپ نیند سے تو محروم نہ کریں!"

پگلی عورت! آج تک مجھے سمجھ ہی نہ سکی۔ خیر! معمولی بات تھی اور میں نے آدھی رات کو "ڈیلی مارننگ" کے دفتر جا کر سارے خط چھاپنے کے لئے دے دیے۔ انھوں نے دس صفحوں کا ایک "خطوط سپلیمینٹ" شائع کر دیا اور اُس کے ساتھ ہی میری تصویر بھی۔ تصویر جلدی میں کھینچی گئی تھی اور اُس سے بھی جلدی میں بلاک بنا تھا۔ شاید اسی لئے میں تصویر میں کافی سیٹھ قسم کا آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ سیٹھ جیب کترا کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور جیب کترا سیٹھ کیسے؟ میں کیمرے کے کمالِ فن پر حیران تھا۔

سویرے تڑکے جب لوگوں کے ہاتھوں میں "ڈیلی مارننگ" پہنچا ہوگا اُسی وقت سب کے سب خطوط لوگوں نے پڑھ لئے ہوں گے اور سورج نکلنے سے بھی پہلے ایک ایکسپریس خط آیا۔ یہ خط ایک کاروباری کمپنی کی طرف سے تھا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

پیارے جی!

ہم ہر وقت آپ جیسے قابل اور بے خوف شخص کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کئی بار ہم نے حسبِ منشا شخص حاصل کرنے کے لئے اخبارات میں اشتہار بھی دیا ہے۔ شاید وہ آپ کی نظروں سے نہ گزرا ہو۔

ہم اجتماعی طور پر لوگوں کی جیبیں کاٹنے کا دھندا کرتے ہیں اور ہمیں اِس دھندے میں آپ جیسے ماہر احباب کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ ہم واجبی کمیشن پر جیبیں کٹواتے ہیں۔

آپ کسی وقت بھی ہمارے اڈے پر تشریف لائیں اور ہمارے ساتھ سودا طے کریں۔

(نوٹ:۔ جیب کاٹنے کے فن کی کتاب آپ کو مفت ارسال کی جارہی ہے)

جیب کاٹی جانے کے بعد اخبار میں اس کی اطلاع دیکھ کر اب تک میں محسوس کر رہا تھا کہ میں تیزی سے گناہ کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہوں!

قسمت کا کرشمہ ناقابلِ ذکر اور کبھی بار ناقابلِ برداشت بھی ہوتا ہے۔ میں جو محسوس کر رہا تھا۔ اب جبکہ میں اپنے آپ کو گناہوں کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کر رہا تھا تو قسمت کے کرشمے میرے سامنے سنہرے حروف میں لکھا ہوا ایک دعوت نامہ پڑا ہوا تھا۔ جسے ابھی ابھی کوئی کھڑکی میں پھینک کر گیا تھا۔

یہ دعوت نامہ علاقے کے جیب تراشوں کی یونین کی طرف سے آیا تھا۔

شریمان جی!

کل شام کو ہم ایک غیر معمولی جیب کترے کی عزت افزائی کے لئے "پاکٹ کٹنگ" پارٹی کر رہے ہیں۔ براہِ مہربانی سارے علاقے کے جیب کترے اس محفل میں سرِ تسلیم خم کرنے چلے آئیں اور اپنی اپنی شمعِ محفل ساتھ لائیں۔

پردھان جیب کترا یونین

اس دعوت نامے کے اوپر ایک چٹ لگا کر مجھ سے آنے کی درخواست کی گئی تھی۔ ساتھ ہی جلسے کے پروگرام میں میری ایک تقریر بھی رکھی گئی تھی: "کہ خوبصورت طریقے سے جیب کیسے کاٹیں؟"

میں بہت پریشان ہوا۔

جوں جوں سورج کی روشنی بڑھتی جا رہی تھی میرے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے جا رہے تھے اور میری بیوی حیران تھی کہ میرا رنگ کیوں تبدیل ہوتا جا رہا ہے؟

میں خود حیران تھا کہ آج سورج کا رنگ کالا کیوں ہے؟ جو تھا دن آنے تک میرے گھر کے گرد بہت سے مشٹنڈے اور ٹھگ قسم کے لوگ دیکھے گئے۔ ان کے چہرے بھیانک، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور مونچھیں باہر کو بڑھی ہوئی تھیں۔

میں نے اپنا خالی کمرہ بالکل کھلا چھوڑ دیا تاکہ اگر وہ تاریکی میں اندر سے کچھ ڈھونڈنے آئیں تو میں بیوی بچوں سمیت شور مچا کر ان سے کچھ نہ کچھ ہتھیا لوں۔ لیکن وہ باہر سے سونگھ کر ہی لوٹ جاتے۔

جس وقت وہ بہت خوش نظر آتے تھے جیسے ان کا دشمن میرا باپ ابھی مرا ہو۔

لیکن ان کا لوٹنا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی ان کی ماں مر گئی ہو!

دوپہر ڈھلنے تک ہم کھانے پینے کے لئے کچھ ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ میرے کمرے کے گرد فلائنگ سکواڈ کے باوردی دستے نے گھیرا ڈال دیا اور میرے کمرے کی مٹی کھودنے لگے۔

میری بیوی اور بچے بھوک سے بلک رہے تھے لیکن انھوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا فرض بھوک دور کرنا نہیں "کرائم" کو ختم کرنا ہے۔

ہر ایک کی جیبیں دیکھی گئیں۔ پھر اٹھارویں صدی کے ٹرنک بھی۔ لیڈی پولیس ساتھ نہیں تھی پھر بھی انھوں نے میری بیوی کی جامہ تلاشی لی۔ ہم نے کمرے میں بہت سے چوہے پال رکھے تھے جو وقت بے وقت ہمیں لوگوں کے گھر سے سوکھی روٹیاں لا کر دیتے تھے۔ سپاہیوں نے وہ بھی چوہے اپنی میس کے لیے پکڑ لئے اور وین میں بٹھا لئے۔ پھر ایک مونچھوں والا حوالدار مجھے ایک طرف لے جا کر اور آنکھ مار کر کہنے لگا: "استاد جی! سب کچھ ففٹی ففٹی ہونا چاہئے۔"

"ابھی تک تو ہم سینٹ پرسینٹ ہضم کرتے جا رہے ہیں!"

"یہ بری بات ہے۔"

"پھر آپ بھی ہمارا ساتھ دیں۔"

"کس بات میں؟"

"بھوکے رہنے میں!"

"بکواس بند کرو۔۔۔ تیرے جیسے بگڑے پیر ہم نے بہت دیکھے ہیں۔"

"پھر؟"

"تھانے چل!"

"پہلے ہمیں کسی ہوٹل میں لے چلیں۔"

اب تک تھانے دار بھی قریب آگیا۔ حوالدار نے کہا: "یہ کتا نہیں بھونکتا!"

"یہ سالا جیل میں جا کر بھونکے گا۔۔۔ سردی آرہی ہے۔ مرنے دو سالے کو!"

"اسے جیل میں حلوا کھانا پڑے گا۔"

حلوے کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ جیل میں تو گرم کپڑے بھی ملتے ہیں اور ہمارے پاس سردیوں کے لئے کوئی کپڑا البتہ نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے چلیں۔ وہ بھی حلوے کا ذائقہ چکھ لیں گے اور سردیاں۔۔۔

لیکن میری بات کسی نے نہ سنی اور وہ مجھے پولیس وین میں لاد کر حوالات میں لے گئے اور اگلے دن مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ ساری رات حوالات میں میں گرم کمبل میں چھپا رہا اور پولیس اسٹیشن والوں کی روٹیاں کھا کر خوب پیٹ بھر گیا اور حلوے کے خواب دیکھتا رہا۔ خواب میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ مجھے حلوا کھلاتے ہوئے

[illegible] ہیں مجھے اُن پر بہت رحم آیا اور میں نے [illegible] کر لیا کہ [illegible] کے بجائے میں انھیں حلوا ہی پیش کیا کروں گا۔ [illegible] اپنے آپ پر [illegible] پیار آیا۔ اگر وہ میری کرسی نہ چھینتا اور میں اس کی [illegible] تو پھر وہ کہاں پہنچتے؟

مجھے بڑے خوبصورت خیال خود ہی سوجھتے تھے اور میں بہت ہی آزادی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ایک اور خواب دیکھا کہ جب میں جیل پہنچا تو ہر قیدی کے ہاتھ میں کل [illegible] اخبار تھا اور وہ مجھے بہت بڑا دادا سمجھتے تھے اور جیل میں انھوں نے مجھے اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ دعوت کھلائی اور سب سے بہترین کمبل اور لذیذ حلوا پیش کیا۔ [illegible] ایک بڑا خواب بھی دیکھا۔ لیکن اگلے دن جب پولیس والوں نے مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو اس نے [illegible] وہ انگلو پولیس افسر نے دیکھے ہیں۔

باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ [illegible] پرندے چہک رہے تھے۔ میں نے فوراً سوچا مجسٹریٹ نے مجھے شاید اس لیے چھوڑ دیا کہ میں جیل میں عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے بجائے اس بھری زندگی میں حالات کا [illegible] مقابلہ کروں۔۔ دشواریوں سے دو دو ہاتھ کروں!

پھر وہ میرے دماغ کا [illegible] لگ گئے!!

*بیسویں صدی کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا ہے۔ ۴۲ اور [illegible] صفحے کے وہ اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔

غزل

افسر آغا لکھنوی

جب کبھی چھیڑی ہے بات تمہیداً
آپ نے رُخ بدل دیا فوراً

ہم جو دیکھیں تو جرم ہے شرعاً
آپ دیکھیں تو کچھ نہیں! سہواً

تھی ہمیں ایک ہم سفر کی تلاش
راہ میں [illegible] گئے ضمناً

بہرِ ناموسِ عاشقی ہم نے
تم سے نظریں بچائی تھیں قصداً

کہہ رہے ہیں وہ مجھ کو سودائی
بات اُن تک گئی ہے اندازاً

غیر حساس کہہ رہے ہو مجھے
میری خاموشیاں تھیں مصلحتاً

دست سیمیں سے اب نہ وہ آنچل
پی لئے اشک ہم نے مجبوراً

جانتے ہیں کہ ہے وہی افسر
پھر بھی چند٭ ڈرا رہے ہیں تصدیقاً

٭ چند [illegible] کا ایک نام ہے۔

غزل

عیش ٹونکی

اب خشک لب، نہ دیدۂ تر چاہتا ہوں میں
احساسِ غم بہ نوعِ دگر چاہتا ہوں میں

تیرے رُخِ حسیں کی قسم، زلف کی قسم
لیے ہی اپنے شام و سحر چاہتا ہوں میں

پھیکا کبھی پڑے نہ ترے عارضوں کا رنگ
شادابیٔ بہشتِ نظر چاہتا ہوں میں

حدِّ تعینات سے گھبرا چکا ہے دل
دیوار چاہتا ہوں نہ در چاہتا ہوں میں

آوازِ صور ہی مجھے اب مطمئن کرے
یارانِ رفتگاں کی خبر چاہتا ہوں میں

تنگ آ چکا ہے راہبر و راہزن سے دل
سنسان ایک راہگزر چاہتا ہوں میں

کب تک کسی کی شام و سحر دیکھتا رہوں
اپنے ہی اب تو شام و سحر چاہتا ہوں میں

تیرِ نگاہِ ناز سے بسمل نہیں تو پھر
دل چاہتا ہوں میں نہ جگر چاہتا ہوں میں

دنیا میں مجھ کو عیشؔ محبت نہ ہو نصیب
اُن کے سوا کسی کو اگر چاہتا ہوں میں

عالمِ خیال میں ———

علامہ اقبال سے انٹرویو

نریش کمار شاد ———

۱۴۲۵ تیلیواڑہ - دہلی
یکم اگست ۱۹۶۸ء

قبلہ خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

"بیسویں صدی" کے لئے بیسویں صدی کے سب سے بڑے اُردو شاعر سے انٹرویو ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ موصوف کی شاعرانہ عظمت کا معترف و مدّاح ہونے کے باوجود اگرچہ میں نے اپنی ایک رُباعی میں یہ بھی کہا ہے سہ

ہر چاہرو سفاک سے بیزار ہوں میں   خوں خوار نہیں واقعی غم خوار ہوں میں
اقبالؔ کے خود پسند شاہیں کا نہیں   کمزور کبوتر کا طرفدار ہوں میں

یہ خط خاص طور پر اس مقصد کے لئے تحریر کر رہا ہوں کہ گاہے بگاہے لاہور سے پاکستانی "بیسویں صدی" کے جو شمارے موصول ہو رہے ہیں اُن کے نہ صرف ٹائیٹل بلکہ اکثر و بیشتر مضامینِ نظم و نثر بھی یہاں کے "بیسویں صدی" ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ تیر و نشتر صحت و زندگی اور سرگوشیاں وغیرہ عنوانات سے بھی مقامی تبدیلیوں کے ساتھ تقریباً آپ ہی کا لکھا ہوا میٹر ہوتا ہے۔ اگر آپ کی باقاعدہ اجازت سے اِس "بیسویں صدی" کا اجرا کیا گیا ہے تو وہ لوگ پرچے میں اِس امر کا اعلان کیوں نہیں کرتے اور کس مصلحت کی بنا پر اِس کے اوراق میں آپ کا ذکر شجرِ ممنوعہ خیال کرتے ہیں اور آپ کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ناکام اِس لئے کہ "بیسویں صدی" اور خوشتر گرامی لازم و ملزوم ہیں۔ کیا غضب ہے کہ آپ کے نام ادیبوں کے جو خطوط ہوتے ہیں اُنھیں بھی اِس ڈھنگ سے شائع کیا جاتا ہے جیسے اُن کے مخاطب آپ نہیں ہیں۔ جبکہ آپ کی ذاتِ گرامی ہند و پاک کے ادب دوستوں میں یکساں طور پر مقبول و محبوب ہے اور اگر لاہور کے اِس "بیسویں صدی" سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے تو آپ اپنے پرچے میں اِس کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ آپ کی اِس خاموشی سے قدرتی طور پر کئی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آپ کو اپنی پوزیشن صاف الفاظ میں واضح کرنی چاہیئے سہ

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

آپ کا ——— نریش کمار شادؔ

شادؔ: "حضرت علامہ! شعر تو آپ طالب علمی کے زمانے ہی میں کہنے لگے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے میرزا داغؔ دہلوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اُس زمانے کی اپنی کسی غزل کا کوئی شعر یاد ہو تو فرمائیے۔"

اقبالؔ: "نہ آتے ہمیں اِس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی"

شادؔ: خوب! یہ تو واقعی داغؔ کے رنگ کا شعر ہے۔ اِس کا مطلب ہے اُس

[illegible] تک میں شعر کہنا اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ملکہ ہے آپ اس سے [illegible] رہے ہوں گے؟

اقبال: "نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پہ نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا"

شاد: "اور اپنی شاعری کے اُسی ابتدائی دور میں جب آپ کی عمر ابھی اکیس بائیس سال کے قریب تھی۔ آپ نے لاہور کے ایک مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی اُس کا وہ شعر کون سا تھا جسے سن کر مرزا ارشد گورگانی تڑپ اُٹھے تھے اور اُنھوں نے متحیر ہو کر فرمایا تھا کہ میاں صاحبزادے! سبحان اللہ اس عمر میں یہ شعر؟"

اقبال: "موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے"

شاد: "بہت خوب! ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! یہ تو ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے علامہ کہ آپ اس صدی کے سب سے بڑے اُردو شاعر ہیں لیکن قبلہ دیکھا اپنی شاعری کے بارے میں اپنی زبانِ مبارک سے اظہارِ خیال فرمائیے:"

اقبال: "مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور"

شاد: "نہ صرف شاعری بلکہ بہت زرخیز اور عظیم شاعری کی سند ہے میرے محترم!"

اقبال: "ہوس میں آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے"

شاد: "یہ کیا فرما رہے ہیں جنابِ والا! غالب کو چھوڑ کر آپ کے سوا اُردو میں ایسا شاعر ہی کون ہے جس کی شاعری اعجاز کا حکم رکھتی ہو۔ بہرکیف یہ فرمائیے کہ آپ کی نظر میں سچے قلندر کا منصب کیا ہے؟"

اقبال: "مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر"

شاد: "جی ہاں یاد آیا یہ بھی تو آپ ہی نے فرمایا ہے ؎
"نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے"
یہ بتائیے کہ آپ کی نظر میں قلندری کے علم کا خلاصہ کیا ہے؟"

اقبال: "یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں"

شاد: "[illegible] ہے [illegible] بیسویں صدی کا [illegible] کہ زندگی اگر اپنے اصل سرچشمے سے الگ ہو گئی ہے [illegible] اُس کا رابطہ باقی ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ [illegible] ہے۔ بجز علامہ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ کے سوا اس [illegible] اور کون کہہ سکتا ہے۔ اچھا یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ کی نظر میں [illegible] کیا ہے؟"

اقبال: "افلاک سے ہے اُس کی حریفانہ کشاکش
ہے خاک مگر خاک سے آزاد ہے مومن"

شاد: "خاک سے آزاد کا کیا یہ مطلب ہے کہ اس جہانِ آب و گل سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے؟"

اقبال: "جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک"

شاد: "کافر اور مومن کی آپ کے نزدیک کیا پہچان ہے؟"

اقبال: "کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق"

شاد: "آپ بے شک حیاتِ انسانی کے بہت بڑے مبصر اور دانائے راز ہیں اور آپ کی نگاہِ تیز واقعی دلِ وجود کو چیرتی رہتی ہے۔ براہِ کرم مختصراً بتائیے کہ انسانی زندگی ہے کیا؟"

اقبال: "رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں"

شاد: "اور آپ اس زندگی میں عقل اور عشق کی اہمیت کے کس حد تک قائل ہیں؟"

اقبال: "خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ"

شاد: اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی تکلیف کیجئے کہ آپ نے اپنی زندگی میں کیا عقل اور عشق کے مقامات بعافیت اور بآسانی طے کر لئے؟

اقبال: مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ عشق میں کھویا گیا وہ فرزانہ"

شاد: "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کے فلسفے کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حقیقت رسی کا ذریعہ عقل نہیں عشق ہے۔ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کو بنیادی طور پر عقل اور عشق میں کیا فرق معلوم ہوتا ہے؟"

[illegible]

اقبال: "گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ

آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد"

شاد: "کیوں حضرت یہ کیسے؟"

اقبال: "آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی

رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار

انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ"

[illegible]

والتہ اِس رنگ میں شعر کہنا اور داغ کا شاگرد ہونا ہی آپ باعثِ فخر سمجھتے ہوں گے؟"

اقبال: "نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا

شاد: "اور اپنی شاعری کے اُسی ابتدائی دور میں جب آپ کی عمر ابھی اکیس بائیس سال کے قریب تھی۔ آپ نے لاہور کے ایک مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی اُس کا وہ شعر کتنا سچا تھا جسے سُن کر میرزا ارشد گورگانی تڑپ اُٹھے تھے اور اُنھوں نے متحیر ہو کر فرمایا تھا کہ میاں صاحبزادے! سبحان اللہ اس عمر میں یہ شعر؟"

اقبال: "موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے"

شاد: بہت خوب! ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! یہ تو ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ علامہ کہ آپ اِس صدی کے سب سے بڑے اُردو شاعر ہیں لیکن قبلہ و کعبہ! اپنی شاعری کے بارے میں اپنی زبانِ مُبارک سے اظہارِ خیال فرمایئے۔"

اقبال: "مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سُرور"

شاد: "نہ صرف شاعری بلکہ یہی تو حقیقی اور عظیم شاعری کی روح ہے میرے محترم!"

اقبال: "تو سمجھ آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے"

شاد: "یہ کیا فرما رہے ہیں جنابِ والا! غالب کو چھوڑ کر آپ کے سوا اُردو میں ایسا شاعر ہی کون ہے جس کی شاعری اعجاز کا حکم رکھتی ہو۔ بہر کیف یہ فرمایئے کہ آپ کی نظر میں سچے قلندر کا منصب کیا ہے؟"

اقبال: "مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایّام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر"

شاد: "جی ہاں یاد آیا یہ بھی تو آپ ہی نے فرمایا ہے ؎
"نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے"
یہ بتایئے کہ آپ کی نظر میں قلندری کے علم کا خلاصہ کیا ہے؟"

اقبال: "یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دُور نہیں"

شاد: "واہ کیا بات ہے! حیات سے کائنات کی زندگی اور کمان سے نورِ مطلق مراد ہے نا؟ جس سے زندگی کا ظہور ہوا ہے۔ یعنی آپ کا مقصود یہ ہے کہ زندگی اگرچہ اپنے اصل سرچشمے سے الگ ہو گئی ہے پھر بھی چشمے سے اُس کا ربط باقی ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے سرچشمے سے دُور چلی گئی ہے۔ بخدا علامہ یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ آپ کے سوا اس انداز سے یہ بات اور کون کہہ سکتا ہے۔ اچھا یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ کی نظر میں مومن کی خصوصیت کیا ہے؟"

اقبال: "افلاک سے ہے اُس کی حریفانہ کشاکش
ہے خاک مگر خاک سے آزاد ہے مومن"

شاد: "خاک سے آزاد کا کیا یہ مطلب ہے کہ اِس جہانِ آب و گِل سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے؟"

اقبال: "جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجّت ہے نکتۂ لولاک"

شاد: "کافر اور مومن کی آپ کے نزدیک کیا پہچان ہے؟"

اقبال: "کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اِس میں ہیں آفاق!"

شاد: "آپ بے شک حیاتِ انسانی کے بہت بڑے متبحر اور دانائے راز ہیں اور آپ کی نگاہِ تیز دائمی دلِ وجود کو چیرتی رہی ہے۔ براہِ کرم مختصراً یہ فرمایئے کہ انسانی زندگی ہے کیا؟"

اقبال: "رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں"

شاد: "اور آپ اِس زندگی میں عقل اور عشق کی اہمیت کے کس حد تک قائل ہیں؟"

اقبال: "خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

شاد: اِس کے ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی تکلیف کیجئے کہ آپ نے اپنی زندگی میں کیا عقل اور عشق کے مقامات بعافیت اور بآسانی طے کر لئے؟

اقبال: مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ عشق میں کھویا گیا وہ فرزانہ"

شاد: "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کے فلسفے کا بُنیادی نقطہ یہ ہے کہ حقیقت رسی کا ذریعہ عقل نہیں عشق ہے۔ لیکن یہ فرمایئے کہ آپ کو بُنیادی طور پہ عقل اور عشق میں کیا فرق معلوم ہوتا ہے؟"

[redacted]

اقبال: "پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی"

شاد: "تو اسی لئے آپ نے یہ بھی کہا ہے —
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
کیا مصلحت اندیشی ہی عقل کی واحد کمزوری ہے؟"

اقبال: "عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم"

شاد: "بہترین شعر کی آپ کے نزدیک کیا تعریف ہے؟"

اقبال: "میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخ اُمم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل"

شاد: "اور اگر میں یہ بھی جاننا چاہوں کہ تاریخ اُمم کیا ہے؟"

اقبال: "آ تجھ کو بتاؤں میں تاریخ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر"

شاد: "فن کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟"

اقبال: "مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا"

شاد: "کیا آپ شعر و ادب کو قدیم اور جدید کے خانوں میں تقسیم کرنے کے حامی ہیں؟"

اقبال: "زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم"

شاد: "مغربیت کی آپ نے بعض مقامات پہ خاصی مذمت بھی کی ہے۔
کیا رائے ہے آپ کی ہمیں مغربی رجحانات و ادب سے متاثر ہوتے ہوئے بھی
اپنے قدم مشرقیت ہی کی بنیاد پہ جمائے رکھنے چاہئیں؟"

اقبال: "مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر"

شاد: "اور آپ کے خیال میں فنکار کا اہم ترین فرض کیا ہے؟"

اقبال: "صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش"

شاد: "فنکار پیدا ہوتا ہے یا اپنی محنت اور ریاضت سے فنکار بنتا ہے؟"

اقبال: "ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد"

شاد: "مشہور جرمن فلسفی نطشے سے تو آپ ذہنی طور پر کافی متاثر ہوں گے۔
اس لئے کہ اس نے بھی انسان کی عملی قوتوں میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش
عمر بھر جاری رکھی۔ کیا آپ نطشے کے فلسفے سے پورے طور پر اتفاق کرتے
ہیں؟"

اقبال: "حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیے اسرارِ لا الٰہ کے لئے
خدنگِ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند
کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے
اگرچہ پاک ہے فطرت میں راہبی اس کی
ترس رہی ہے مگر حسرتِ گنہ کے لئے"

شاد: "واقعی [illegible] کا مضمون ہے۔ نطشے سے متعلق یہ بات کہنے
کا حق آپ ہی کو پہنچتا ہے۔ اب ادب اور فلسفے سے ہٹ کر ذرا سماج اور سیاست
کے مسائل پر آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ
آزادئ افکار کے کس حد تک قائل ہیں؟"

اقبال: "گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد"

شاد: "کیوں حضرت وہ کیسے؟"

اقبال: "آزادئ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ"

شاد: "حضرت علامہ! گستاخی معاف! یہ تو انتہا پسندانہ نظریہ ہے۔ اس سے
تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ جمہوریت کے بھی کچھ زیادہ قائل نہیں۔"

اقبال: "جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"

شادؔ: "کیا جمہوریت سے آپ کے دل برداشتہ ہونے کی صرف یہی وجہ ہے؟"

اقبالؔ: "تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!"

شادؔ: ۱۹۲۰ء میں آپ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے لئے لاہور کے حلقۂ انتخاب سے کھڑے بھی ہو گئے۔ کامیاب ہوئے اور اُس کامیابی کے بعد سرگرمی سے سیاست میں حصہ لینے لگے۔ اُسی سرگرمی کی بدولت دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر منتخب ہوئے۔ اُس کے بعد مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے دوسری گول میز کانفرنس میں بھی شریک ہوئے اور اُس کانفرنس میں شامل ہونے کے بعد فرانس وغیرہ بھی گئے اور وہاں کے اربابِ سیاست سے مل کر تبادلۂ خیالات کیا اور آخر اُن تمام سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ہندی وطنیت کو خیرباد کہہ کر محض اسلام کی تبلیغ کرنے لگے اور مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار دے کر آپ نے خود ہی اپنے اِس ارشاد سے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

انحراف کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ؎

نرالا سارے جہاں سے اِس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور اس طرح آپ کا دردِ بشر صرف دردِ مسلم یا دردِ مومن بن کر رہ گیا"

اقبالؔ: "اقبالؔ بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے"

شادؔ: "موجودہ نظامِ تعلیم و تربیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

اقبالؔ: "یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ"

شادؔ: اور ہندوستانی فن کاروں سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

اقبالؔ: "ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار"

شادؔ: لیکن عورت کی اہمیت سے تو آپ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ آپ ہی نے تو کہا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اِسی درج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اِسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

بہرحال ہندوستانی عورت کی بے بسی اور مجبوری کا احساس تو آپ کو بھی ہوگا۔ آپ کے نزدیک اِس بے چاری کی بیچارگی کا علاج کیا ہے؟"

اقبالؔ: "میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اِس عقدۂ مشکل کی کشود"

شادؔ: "تعلیمِ نسواں کی تو آپ حمایت کرتے ہیں نا؟"

اقبالؔ: "بیگانہ اگر دیں سے ہے مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت"

شادؔ: "چلئے دینی تعلیم ہی سہی، بہرکیف یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ پردہ اور تعلیم عورت کی نسوانیت کی حفاظت کے لئے بہت ضروری ہے؟"

اقبالؔ: "نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد"

شادؔ: "زمانۂ حاضر کا انسان جو چاند اور سورج کو بھی مسخر کر رہا ہے آپ اُس کی اِس جدوجہد کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟"

اقبالؔ: "ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا"

شادؔ: "تو کیا آپ انسان کی اِس جدوجہد کو مستحسن نہیں سمجھتے؟"

اقبالؔ: "مگر یہ سہل نہیں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی"

شادؔ: "لیکن اِس سے انسانی عقل کی حیرت انگیز ہمہ گیری کا ثبوت تو ملتا ہے"

اقبالؔ: "یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں"

شادؔ: "میرزا غالبؔ کی طرح مشاہدۂ حق کے لئے ہی نہیں آپ نے زندگی اور ملکی مسائل پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے بادہ و ساغر کا سہارا لیا ہے

سکا لیا ہے جیسے اپنے اس شعر سے ؎

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

آپ کو یہ کہنا مقصود ہے کہ مسلمانوں کے دل ایمان پر پختہ نہیں رہے اور وہ راہِ حق سے ڈگمگا رہے ہیں۔ اے ساقی! اس کا علاج وہی آبِ حیات ہے جسے حلق سے اُتارتے ہی دل اور دماغ پر خوشی طاری ہو جائے۔ ایمان کا یہی آبِ حیات دل کی کمزوری اور ناپختگی کو دُور کر سکتا ہے ——— لیکن میرا خیال ہے آپ کی مستی مجازی بادہ و ساغر کی محتاج تو کیا ہوگی۔"

اقبال: "شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اُس نے مجھ کو مستِ بے جام و سبو رہنا"

شاد: پھر کبھی اپنا کوئی خالص رندانہ شعر ارشاد فرمایئے ؎

اقبال: "حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا"

شاد: ۱۹۰۸ء میں جب آپ یورپ سے ہندوستان واپس آ گئے تھے تو اُنھیں دنوں لاہور میں انجمنِ حمایتِ اسلام کا سالانہ اجلاس ہوا تھا جس میں مولانا الطاف حسین حالؔی بھی شریک تھے۔ اُس وقت مولانا حالؔی کی عمر بہتر سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ خود اسٹیج پر اپنا کلام سُنانے کے قابل نہ تھے اس لئے اُنھوں نے اپنا کلام آپ سے پڑھوایا۔ مولانا کا کلام سُنانے سے پہلے آپ نے فی البدیہہ کون سی رُباعی کہہ کر سنائی تھی؟"

اقبال: "مشہور زمانے میں ہے نامِ حالؔی
معمورِ مئے حق سے ہے جامِ حالؔی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالؔی"

شاد: "دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی چار سال کی نظربندی کے بعد رہا ہوئے اور امرتسر میں کانگریس نے اُن کے اعزاز میں ایک تاریخی جلسہ منعقد کیا۔ جس میں آپ نے بھی شرکت فرمائی۔ تو لاہور سے امرتسر جاتے ہوئے آپ نے خاص اُس موقع کے لئے جو اشعار کہے تھے اور جلسے میں محمد علی اور شوکت علی کو مخاطب کرتے ہوئے پڑھے تھے وہ ارشاد فرمایئے۔"

اقبال: "ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مُشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

شاد: "اور آغا حشر کاشمیری جب پہلی بار لاہور تشریف لائے اور لاہور کی بزمِ ادب نے اُن کے استقبال میں ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ جس میں آپ بھی شامل ہوئے۔ جب حشر صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو مجمع اُن کے ریشمی کُرتے اور مشہدی تہبند کو دیکھتے ہی تالیاں بجا بجا کر شور مچانے لگا۔ مجبوراً حشر صاحب کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن مجمع کا یہ نازیبا برتاؤ دیکھ کر آپ بہت برہم ہو گئے۔ اُس وقت آپ نے فی البدیہہ کیا شعر کہہ کر جلسے میں سُنایا تھا؟"

اقبال: "شور ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے برات
آیئے لاہور کی یہ بزمِ ماتم دیکھئے!"

شاد: "ہاں اُسی زمانے میں جب ترکی سے ہلالِ احمر کا ایک وفد لاہور آیا اور ارکانِ وفد نے شاہی مسجد میں نماز ادا کی تو مسجد کے امام کو طویل سجدے کرتے دیکھ کر ترک متعجب ہوئے کیونکہ وہ اتنے طویل سجدوں کے عادی نہیں تھے۔ رئیسِ وفد نے اِس بارے میں آپ سے بھی دریافت کیا لیکن اُس وقت غالباً آپ اُس سوال کو ٹال گئے تھے لیکن بعد میں اُس کا جواب دیتے ہوئے کچھ اشعار کہے تھے۔ وہ اشعار مرحمت فرمائیے۔"

اقبال: "کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اِس قدر تمہارے امام؟
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اُسے کیا چیز ہے نمازِ غلام

ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں
اُنھیں کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مُرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدے اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام!"

شاد: ۱۹۱۰ء میں جب انگریزی حکومت کی طرف سے اہلِ پنجاب کو تلوار رکھنے کی اجازت مل گئی تھی تو آپ نے کیا ارشاد فرمایا تھا؟"

اقبال: "سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار

اس بیت کا یہ مصرعہ اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

ہے فکر مجھے مصرعہ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدِ جاں باز ہے یا حیدرِ کرّار

شاد: اُس زمانے میں آپ ایک شاعر کے نام سے کبھی کبھار مزاحیہ شعر بھی تو کہہ دیا کرتے تھے۔ انھیں دنوں جب مسجد شہید گنج لاہور کے جھگڑے کا آغاز ہوا اور انگریزی سرکار نے ایک صاحب مولا بخش کو جو شہید گنج مسجد کی تحریک میں مجلس عمل کے ڈکٹیٹر تھے نظر بند کر دیا۔ اُن کی گرفتاری پر ایک شاعر کے نام سے آپ نے کیا شعر کہا تھا؟"

اقبال: "ہوئیں آزاد جب لاہور میں سکھوں کی کرپانیں
مسلمانوں کے مولا بخش کو سرکار نے پکڑا"

شاد: ۱۱ اگست ۱۹۳۵ء کو جب مسولینی کی فوجوں نے ابی سینیا پر حملہ کیا تو آپ کو بہت ہی بے حد قلق ہوا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں اگرچہ مشرق و مغرب تہہ و بالا کر ڈالا تھا لیکن ابی سینیا کو ذرا سا بھی آزار نہیں پہنچایا تھا کیونکہ یہ ملک مسلمانوں کی سب سے پہلی پناہ گاہ بنا تھا اور اُس احسان کو مسلمان چودہ سو سال تک نہ بھولے تھے۔ لیکن اٹلی ابی سینیا کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہو گیا جبکہ نہ صرف وہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی بلکہ وہاں کا حکمراں بھی عیسائی تھا۔ اس قلق کو آپ نے اپنی کسی مختصر سی نظم میں بھی تو منتقل کیا تھا۔ کیا تھی وہ نظم؟"

اقبال: "یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مُردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسا! یہ حقیقت ہے دل خراش"

شاد: "معاف فرمائیے آپ کی بہت سمع خراشی کی لیکن آخر میں یہ اور بتا دیجیے کہ ہماری اس دنیا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس کی محفلوں سے آپ جیتے جی بسا اوقات اُکتاتے بھی رہے ہیں؟"

اقبال: مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لیے

افسانہ

سمندر جاگتا ہے

ایم۔ الیف پرویز ایم۔ اے

۸۴۳، رِوی وار پیٹھ۔ پونا نمبر ۲ (مہاراشٹر)

مکرمی خوشتر صاحب! تسلیم

برکھا رُت کی آمد آمد ہے۔ خوش گوار ہوائیں چل رہی ہیں۔ اِتنے حسین موسم میں کاموں کی زیادتی نے کچھ نہ لکھنے دیا۔ پھر بھی ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں جس نے پچھلے ماہ ایک ساحلی علاقے کے دَورے میں جنم لیا تھا۔ لیکن صفحات پر جلد نہ آسکی تھی۔ حسبِ عادت کہانی طویل ہوگئی ہے۔ شاید آپ قبول کرلیں۔ —— جون کا شمارہ بے حد حسین و دیدہ زیب تھا۔ میں اِس سے زیادہ حسین شمارے کا تصوّر نہیں کرسکتا —— اُردو والے آپ سے اور کیا چاہیں گے؟ . . .

آپ کا —— ایم۔ الیف پرویز

نیلی موجیں ساحل سے بہت دُور ہٹ گئی تھیں۔ سمندر کے چہرے پر اب صرف جُھریاں باقی رہ گئی تھیں، بے شمار جُھریاں، بوڑھے اور بیمار چہرے کے مانند! پانی کے ہٹ جانے سے قلعہ تک جانے کا راستہ صاف ہوگیا تھا اور آج مجھے بہرصورت قلعہ تک پہنچنا تھا۔

اِندرا نے کئی بار ٹال دیا۔ لیکن آج جبکہ سمندر کا پانی ایک بے بس آدمی کی طرح چپکے چپکے پیچھے ہٹ گیا تھا ہم قلعہ تک پہنچ سکتے تھے۔ قلعہ یوں تو پچھلی تین صدیوں سے سمندر میں کھڑا ہے اور دُور سے اُس کی قدیم اور بوسیدہ دیواریں دیکھتے ہی لوٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میں تو قلعہ کے اندر جاکر دیکھنا چاہتا تھا۔ میری متجسس طبیعت بہت سی چیزوں کی ظاہری شکل و شباہت دیکھنے سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ کیونکہ بہت سی چیزیں دراصل ویسی نہیں ہوتیں جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ جب کوئی آدمی بہت قیمتی کپڑے پہن کے ٹھاٹ باٹ دکھاتا اور بہت اکڑ اکڑ کر چلتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے اُس کے جسم سے سارے کپڑے نوچ کے دیکھ لوں کہ درحقیقت وہ ویسا ہی ہے جیسا نظر آرہا ہے یا محض ڈھول کا پول ہے۔ اِسی لئے میں سمندر میں بنے ہوئے اُس قلعہ کے ایک ایک پتھر کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

سرد ہوا چل رہی تھی۔ ساحل پر کھڑے ناریل کے اونچے اونچے پیڑ آہستہ آہستہ لہرا رہے تھے۔ جیسے ستار کے تاروں پر موسیقار کے ہاتھ لہراتے ہیں۔ موجیں بہت دُور چٹانوں سے ٹکرا کر شور مچا رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بادبان کنارے کنارے پڑے تھے اور اُن میں کوئی ملاح نہ تھا۔ جیسے انسان کی زندگی کی کشتی کا کوئی ملاح نہیں ہوتا۔ وہ خود ہی مسافر اور خود ہی کھویا ہوتا ہے۔ چکنی چکنی مُنہ سے جیسی بھیگی ہوئی ریت پر سمندری مکڑی نے اپنے پنجوں سے جالے سے بُن دئے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے گھونگے اور سیپیاں قدموں کو گدگدا رہی تھیں۔ سورج ابھی ابھی نکل کر پانی پر ایک سیمابی چادر تان چکا تھا۔ اِندرا میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اُس نے اپنی ساری کا آنچل سیپیوں سے بھر لیا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی بڑی بڑی سیپیوں کی طرح گہری اور حسین معلوم ہو رہی تھیں اور اِس وقت صبح کی تنہائی میں سمندر کے کنارے وہ اور میں دونوں ہی تھے۔ ایک دوسرے سے بے نیاز، سمندر کے حُسن میں کھوئے ہوئے۔

قلعہ تک جانے کے لئے ہم نے پانی میں ڈوبی ہوئی ریت پر قدم رکھے۔ ایک عجیب سی گدگدی سارے بدن میں ہونے لگی اور میرا جی چاہا بس میلوں تک ایسی ہی ٹھنڈی ریت میں چلتا چلا جاؤں۔

کہیں کہیں پانی بہت بڑھ جاتا تھا۔ اندرا بڑھتی ہوئی موجوں سے گھبرا جاتی تو میرا ہاتھ پکڑ لیتی۔ میں شرارت سے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیتا۔ وہ چیخ پڑتی۔

"ہائے ڈوبی ــــــ! بہت ڈر لگ رہا ہے ــــــ وہ دیکھو کتنی بڑی موج آئی ــــــ!"

لیکن میں ہنس پڑتا۔

"سمندر بہت وسیع ہے اِندرا! ــــــ اس کا دل ہے جو دھڑکتا ہے، اس کی رُوح ہے جو موجوں کی شکل میں مچلتی ہے۔ سمندر بہت حسین ہے۔ ہماری طرح تنگ دل اور خود غرض نہیں ہے بس بڑھتی چلی جاؤ ــــــ!" میں کہتا اور وہ رُک کر چاروں طرف پھیلی ہوئی موجوں کو گھبرا کر دیکھنے لگتی۔

مچھیروں کے دو ننھے ننھے بچے ہمارے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ وہ بمشکل دس سال کے ہوں گے۔ لیکن بہت نڈر اور بے باک تھے۔ وہ سمندر میں کود پڑے اور تیرنے لگے ــــــ تیرتے تیرتے نہ جانے کہاں کھو گئے۔ اب اُن کے سر بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ اِندرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُنھیں دیکھنے لگی۔

"بڑے بہادر بچے ہیں!" میں نے کہا۔

"اور اگر ڈوب گئے تو؟"

"موت سے نہ ڈرنا ہی زندگی ہے۔ نہ وہ ڈوبیں گے نہ اُنھیں موت آئے گی۔ وہ سمندر کے بیٹے ہیں وہ کیسے ڈوب سکتے ہیں؟"

اندرا خاموش ہو گئی۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔ بہت سی عورتوں کی طرح وہ بھی اکثر آنکھوں سے شکایت کرنے کی عادی تھی۔ نہ جانے آنکھوں کے اِس شکوے سے دل کیوں پسیج جاتا ہے۔ میں نے پیار سے اُسے دیکھا۔ اپنے قریب کرتے ہوئے اُس کی زلفوں کو چوم لیا اور اُس کی شکایت دُور ہو گئی۔ اب وہ مُسکرانے لگی۔

سورج کی شعاعوں میں پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ سفید سفید مرغابیوں کے غول اُڑتے اُڑتے آئے اور قلعے کی دیواروں کے گرد منڈلا کر پھر اُفق کی سمت چلے گئے۔ نامانوس دُنیا کی طرف، انجانے جزیروں میں۔ جہاں آسمان اجنبی تھا، سمندر کی موجیں اجنبی تھیں اور ہم دونوں بھی اجنبیوں کی طرح کچھ سوچتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ایک تنہائی کا دائرہ سا بن گیا تھا جو کبھی کبھی اِندرا کی چہک سے ٹوٹ جاتا تھا۔

"جی چاہتا ہے ایک کشتی لے کر رات دن سمندر میں پڑا رہوں۔" میں نے [illegible]

[illegible]

ہوئی زُلفوں کو دیکھتا رہا جن میں کیوڑے کی کلیاں جھول رہی تھیں اور اُن سے خوشبو اُڑ رہی تھی۔ مجھ پر اُس مہک کا عجیب و غریب اثر ہو رہا تھا۔ کیا عورت بھی ایسی ہی خوشبو ہے؟ ایک ٹھنڈی خوشبو؟ لیکن ذہن میں ایک آئرش ڈرامہ نویس کا یہ جملہ کوندنے لگا۔ "رات کے اندھیرے میں عورت ایک راحت ہے تو دن کے اُجالے میں ایک بھاری بوجھ!" میں دل ہی دل میں مُسکرا دیا اور اِندرا کی پنڈلیوں کو دیکھنے لگا جو پانی میں بھیگ کر مرمر کی طرح چمک رہی تھیں۔

اُس دن جب میں موٹر لانچ میں بمبئی سے آ رہا تھا۔ دوپہر سُنسان تھی اور میں سمندر کی نیلی موجوں میں کھویا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ لانچ میں بہت سے مچھیرے اور کوئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن سب کے جسم ننگے اور سیاہ تھے اور اُن سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور اُن کے جسم دھوپ میں یوں چمک رہے تھے جیسے شیشم کی لکڑی پر تیل چمکتا ہے۔ بدبو اور پسینے سے فضا گھٹی گھٹی محسوس ہو رہی تھی لیکن اُن سب سے بے نیاز ایک لڑکی کنول کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

یہ اِندرا تھی۔

وہ مجھے دیکھ رہی تھی لیکن نہیں دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ اُس کی نظریں مجھ سے گزرتی ہوئی سمندر کی لہروں پر جم جاتی تھیں اور جب نظریں لوٹتیں تو پھر مجھ پہ سے ہو کر اُس کی پلکوں میں بند ہو جاتیں۔

میں چند لمحوں میں اُس کے متعلق بہت کچھ سوچ گیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے مجھے معلوم نہیں۔ ہر حسین لڑکی کو دیکھ کر میں کہیں گُم ہو جاتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے دل ایک کشتی بن کر آرزوؤں کے سمندر میں ڈولنے لگا ہے۔ ایک کشتی جس کا کوئی کھیون ہار نہ تھا ــــــ پھر ایک لہر دوسری لہر سے ٹکراتی گئی۔ ایک رَو دوسری رَو کو پیغام دیتی چلی گئی۔ ایک لمحہ دوسرے لمحہ کو اجنبیت کے دھارے سے نکال کر مانوس کرتا چلا گیا اور جب ہم اُس ساحل پر اُترے تو ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے۔

میں نے اُس سے بہت سی باتیں کیں۔ ایسی باتیں جو ہر انسان پہلی ملاقات میں کرتے ہیں۔ اُس دن بھی اُس کی زُلفوں میں کیوڑے کے پھول تھے [illegible]

[illegible] کا ایک گھر تھا [illegible]

[illegible] اور اُس گھر میں وہ اپنی بوڑھی ماں اور دو چھوٹے [illegible]

[illegible] چھوٹے بھائی پڑھنے کے لیے بمبئی چلے گئے تھے۔ [illegible]

[illegible] اکیلی رہتی جیسے سُنسان راتوں میں کھویا ہوا [illegible]

[illegible] پھول! ــــــ اور میں بمبئی کی [illegible]

رہتا تھا۔ میرا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ میں سیٹھ عبدالستار گھاسلیٹ والے کے مکان میں رہتا تھا اور مُنہ مانگی رقم ہر ماہ کھانے اور سونے کی دیا کرتا تھا۔ ویسے کھانا تو میں کہیں اور بھی کھا سکتا تھا۔ اچھے اور صاف ستھرے ہوٹل میں۔ لیکن سونے کے لئے بمبئی میں کہیں جگہ نہیں تھی۔ اِس لئے میں گھاسلیٹ والا کو مُنہ مانگی رقم دے دیا کرتا تھا اور سوچتا تھا کسی دن میرا اپنا ایک گھر ہوگا، میری اپنی ایک بیوی ہوگی اور میرے اپنے بچے ہوں گے۔ سوچ کا یہ دائرہ کتنا محدود ہے اور کتنا اہم!

اور اِندرا جب ملی تو میں بھول گیا کہ میں کبھی تنہا تھا۔ کبھی اُداس اور بیکراں موجوں کی طرح بھٹکتا ہوا کسی ہمنوا کی آرزو کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ چیزوں کی آرزوئیں کتنی شدید ہوتی ہیں۔ کتنی تڑپ اور کتنی کسک ہوتی ہے اُن میں!

اب قلعہ قریب تھا۔ بہت دُور نیلے آسمان کی وسعت سے ایک پرندہ آیا اور پانی کو چھُوتا ہوا قلعے کی سب سے اونچی فصیل پر جا بیٹھا۔ دو لمحوں کے لئے ڈگمگاتا ہوا، سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا اور پھر بلندی کی طرف اُڑ گیا۔ جیسے اِس پانی کو چھُونا ہی اُس کا مقصدِ حیات ہو، عین آرزو ہو! ہم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کوئی دور آس پاس نہ تھا۔ ہم تھے اور موجوں کی آواز تھی۔ اِندرا اب گھبرانے لگی۔ قلعے کی اونچی اونچی سیاہ دیواریں بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔

"نہ جانے تمھیں ایسے خطرناک مقامات کیوں پسند ہیں؟" اِندرا نے بیزاری سے کہا۔

"تمھیں کیا پسند ہے اِندرا؟"

"کچھ نہیں پسند۔"

"کیا تمھیں جنگل میں گھومتی ہوئی چراگاہیں اور ڈوبتی ہوئی شام میں پھولوں پر بکھری سنہری کرنیں بھی نہیں پسند؟"

"مجھے تو بس شاندار ہوٹلوں میں بیٹھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے جوس پینا پسند ہیں۔"

"ہوں ــــ سراسر بیہودگی ــــ! مجھے تو آموں کے پیڑوں تلے بیٹھ کر کچے کچے آم توڑ توڑ کے کھانا پسند ہے۔ ساحل پر بیٹھ کے مچھلی بھون کر کھانا اچھا لگتا ہے اور میٹھی کی بجائے میں ہری مرچ مِلا کر کھانے میں تو خوب مزہ آتا ہے۔"

ایک چھوٹی سی کشتی قریب سے گزر گئی اور پانی کی سطح پر ایک گہری لکیر کھنچ گئی۔ ایک بے معنی سی لکیر۔ قسمت کی طرح۔ بن کر مِٹ جانے والی اور آدمی بھی تو لکیروں کے ایسے ہی بے ہنگم جالوں میں پھنسا ہوا ہے مُدت سے۔

"اِندرا دیکھو۔ ابھی ابھی اِس ریت پر تمھارے قدموں کے خوبصورت نقوش بنے تھے اور ابھی ایک موج نے اُن پر پانی پھیر دیا اِندرا! انسان بھی تو ایسا ہی ایک نقش ہے ــــ موت اِسی لہر کی طرح آتی ہے اور زندگی کے نقش پر پانی پھیر جاتی ہے۔ اندرا! ابھی تم میرے ساتھ ہو، ابھی کوئی خطرناک لہر آ جائے اور تمھیں مجھ سے جُدا کر دے تو ــــ؟"

یکایک بہت دلفریب ہوا چلی۔ اِندرا نے آنچل چھوڑ دیا ہواؤں کے رُخ پر اور موجوں کی طرح گنگنانے لگی۔

لیکن مجھے اُس وقت اندھیرے اور تاریک کمرے میں سر جھکا کر کام کرنے والا منگل داس یاد آ رہا تھا۔ وہ جس نے کبھی ہوا کی خنک لہر میں تازگی اور گُدگُدی محسوس نہیں کی۔ وہ جس نے سمندر کی موجوں کے رقص کا تصور بھی نہیں کیا۔ خواب میں بھی نہیں۔ وہ جو دو سو روپے کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک قیمتی پل اندھیرے اور بے روح کمروں میں خشک فائلوں کی نذر کر چکا ہے۔ وہ جس کے بدن میں خون کی چند بوندیں بھی نہیں ہیں۔

لیکن مست کر دینے والی لطیف ہوا نے تمام اعضاء میں ایک خمار سا پیدا کر دیا تھا اور میرا دل بھی گنگنانے لگا تھا۔ میں اِندرا اور اپنے وجود سے بے خبر گنگناتا رہا ــــ یکایک میں نے دیکھا ہم قلعے کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ چاروں طرف بڑی بڑی چٹانوں میں قلعہ یوں گھرا ہوا تھا جیسے اکیلا آدمی غم و الم میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ قلعے کے دروازے پر دو بہت بڑے لوہے کے لنگر پڑے ہوئے تھے ــــ جو زنگ آلود تھے۔ ہم آہستہ آہستہ سہمے ہوئے سے اندر داخل ہوئے جیسے شہزادے چور دروازوں سے قلعے میں داخل ہوا کرتے تھے۔

"اِندرا ــــ؟"

"ہوں؟"

اِندرا چلتے چلتے رُک گئی۔ میں بھی رُک گیا اور سمندر کو دیکھنے لگا جو چاروں طرف آسمان سے مِلا ہوا تھا۔ کتنا حسین ہے سمندر۔ کتنا گہرا، کتنا وشال! ــــ اے سمندر! اے صدیوں سے تڑپنے والے عظیم سمندر! کیا تو بھی محض ایک بے بس آدمی کی طرح اپنے حلقے میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، جس کا کوئی انجام نہیں؟ اے دھرتی کے خوبصورت خلاف! یہ تیری ٹھنڈی ریت کتنی پیاری ہے! اِندرا کے گالوں کی طرح ملائم! یہ تیری بے قرار موجیں کتنی جذباتی ہیں، میرے دل کے دھاروں کی طرح۔ اے سمندر! اے وشال سمندر!!

سمندر گانے لگا۔ اپنا ازلی نغمہ ــــ! اور میرا دل سمندر کے لئے عقیدت سے بھر گیا۔

"اِندرا ــــ نہ جانے لوگ سمندر سے دُور کیوں رہتے ہیں۔ گندی گلیوں میں۔ بدبودار چالیوں میں، گندی متعفن کوٹھریوں میں۔ جہاں کبھی کسی موج


مُسرت
دلآویز تحفے
للت چائے
کے ساتھ
۵۰۰ گرام کے ہر پیک کے ساتھ
آپ کو اب بڑھیا چمچ ملتا ہے۔
۲۵۰ گرام کے ہر پیک کے ساتھ
آپکو ایک نفیس بال پوائنٹ پین ملتا ہے۔
آج ہی ایک پیکٹ خریدیئے
یہ پیشکش صرف مال رہنے تک ہے۔
Lalit
Lalit
للت اُمنگ پیدا کرنے والی مزیدار پتی کی چائے ہے۔ یہ فرحت بخش چائے آپکے لئے تیار کی
گئی ہے۔ اسے سہرے اور پیلے ڈبوں میں ہمیشہ تازہ رکھنے کے لئے پیک کیا گیا ہے۔ آج
ہی ایک پیکٹ آزمایئے۔ آج ہی ایک پیکٹ خریدیئے۔
للت - چائے جو واقعی تسکین بخش ہے
ٹاٹا۔ فنلے چائے

کی تحپ کا دیدار نہیں ہوتا، سنکی ہوئی ہواؤں کی تازگی کا احساس نہیں ہوتا ــــ کیوں لوگ ایک کشتی لے کر سمندر پر نہیں چلے جاتے۔ کیوں لوگ بازاروں میں لاچار کھڑے ہاتھ پسارے بھیک مانگتے ہیں، جیب کاٹتے ہیں، ڈاکہ ڈالتے ہیں، مالکوں کے جھڑکے اور غلیظ گالیاں کھاتے ہیں۔ کیوں وہ سمندر پر نہیں چلے جاتے ــــ بے پناہ دولت سمیٹنے ــــ!"

لیکن اندرا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اور کسی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ انسان اچھی چیزوں کی طرف جلدی مائل نہیں ہوتا۔ بُرائی کی طرف مائل ہوجانا ہی انسانی سرشت ہے۔

ہم ایک شکستہ راہ سے قلعے میں داخل ہوگئے۔ کوئی اور نہ تھا۔

ٹوٹے پھوٹے مندر، شکستہ دیواریں اور گھاس پھوس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اندرا آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

کیسا بھیانک سناٹا ہے!

یکایک کہیں سے کھانسنے کی آواز آئی۔ ایک بوڑھا مچھیرا ایک مندر کے قریب بیٹھا کسی سوچ میں غرق تھا۔ اس کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں۔ لیکن اس کے جبڑے اب بھی مضبوط اور بازو گٹھے ہوئے تھے۔ اس کی عقابی آنکھیں کسی چیز کی متلاشی نظر آتی تھیں۔

بوڑھے نے اندرا کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس سنسان دوپہر میں کوئی حسین لڑکی اس طرح آ کے اس کے سامنے کھڑی ہوسکتی ہے۔ اپنی زندگی میں اس نے اتنی حسین لڑکی نہ دیکھی تھی جو ستارا یا سیپ کی طرح جھلملاتی دکھائی دے۔

"رام رام ــــ دیوجی!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

اندرا نے اس کا جواب سر کے اشارے سے دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس بوڑھے مچھیرے کے دیو پیکر وجود کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا اور ٹوٹی ہوئی فصیل سے سمندر کی ٹکراتی ہوئی موجوں کا نظارہ کرنے لگا۔ اندرا پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے مڑ کے دیکھا۔ مچھیرا اس سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ میرا دل خواہ مخواہ ہی دھڑکنے لگا۔ اِس سنسان قلعے میں اس وقت دوپہر کو جب کہ آس پاس کوئی نہیں صرف سمندر جاگ رہا ہے، کہیں وہ ہمیں لوٹ لے تو؟

"اندرا!" میں نے اندرا کو آواز دی۔ لیکن اندرا نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں اسے اکیلا چھوڑ کر قلعے کے پچھلے دروازے پر پہنچ گیا۔ جہاں ایک بہت بڑی چٹان کے سہارے ایک ٹوٹی ہوئی کشتی جھول رہی تھی۔ جیسے انسان آس اور مایوسی کے درمیان جھولتا رہتا ہے۔ چند منٹوں تک میں اس جھولتی ہوئی کشتی کو دیکھتا رہا۔ سورج سر پر آ رہا تھا اور پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں ــــ صرف لہروں کی آواز سنتا رہا۔

ایک نغمہ تھا جو روح میں گھلتا جا رہا تھا ــــ نہ جانے کون یہ نغمہ الاپ رہا تھا۔ کن لبوں سے اتنی سُریلی آواز نکل رہی تھی۔ کس گلے کے تار لرز رہے تھے!

بہت دیر بعد جب میں چونکتا ہوا تو اندرا کو نہ پاکے گھبرا گیا اور دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں اندرا اس بوڑھے کے ساتھ کھڑی تھی۔ لیکن اندرا وہاں نہیں تھی۔

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا ــــ "اندرا!" میں پوری طاقت سے چیخا۔ کھنڈروں سے میری آواز ٹکرائی۔

"اندرا ــــ!"

ایک اونچے مندر کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا، مچھیرا سر جھکائے کھڑا ہے اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے ہیں۔ پھر اس نے اندرا کی نازک کلائیوں کو مضبوطی سے پکڑ کر چوم لیا۔ متواتر چومتا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اندرا بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

"اندرا یہ سب کیا ہے؟" میں چیخنے ہی کو تھا لیکن نہ جانے کیوں گونگا ہوگیا۔

مچھیرے کی آنکھیں عقیدت سے اندرا کی کلائیوں پر جھکی ہوئی تھیں اور وہ رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کا سیاہ چمکتا ہوا چہرہ، موٹی موٹی سرخ آنکھیں اور موٹے موٹے میلے بال دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے رو رہا ہو اور خاک میں لوٹتا رہا ہو۔

"اندرا ــــ" میں نے آہستہ سے اندرا کو آواز دی "کیا بات ہے؟ یہ سب کیا ہے؟"

اب مچھیرا میری طرف متوجہ ہوا اور میرے قدموں میں گر کے رونے لگا۔

"ارے ــــ یہ کیا کرتے ہو؟" میں نے اسے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ بگلوں کے غول کے غول اُڑتے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔ دوپہر کی دھوپ میں لہریں قلعے کے پچھلے دروازے سے چاندی کی طرح چمکتی نظر آ رہی تھیں اور مچھیرا رو رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ اس خاموش آسمان کے نیچے پتھروں سے گھری ہوئی اس فصیل کے اندر جہاں کوئی کسی کی سُننے والا

دیتا ہے اس عظیم دنیا میں ——— جہاں ہر انسان اپنی انا کی دیوار میں بند ہے اور باہر پھیلے ہوئے وِشال سمندر کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ جاگتے ہوئے سمندر کی للکار سننے سے معذور ہے۔

وہ رو رہا تھا!

پھر وہ ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک ٹوٹے ہوئے مندر میں جاکر اُس نے زور زور سے گھنٹیاں بجائیں اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

"نہ جانے اُس نے مجھے کیا سمجھ لیا؟" اندرا بولی۔

"کہتا تھا، برسوں پہلے ایک دیوی اِسی طرح اِس مندر میں آئی تھی۔ اُسے درشن دینے، آشیرواد دینے! اور اُس نے پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ برسوں پہلے وہ اِس مندر میں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے ایک خوبصورت لڑکی کو ڈوبنے سے بچایا۔ نیم بیہوشی کے عالم میں اُسے اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ لڑکی دو دن تک نیم بیہوش رہی۔ تب مچھیرا جوان تھا۔ لیکن اُسے نہیں معلوم تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ اُس نے بیہوش لڑکی کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتایا۔ دو دن تک اُس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ آنکھیں بند کئے بھگوان کی پرارتھنا کرتے ہوئے۔ جل مائی کا جاپ کرتے ہوئے تین دن کے بعد لڑکی مر گئی۔ اُس کی نازک کلائیاں مچھیرے کے ہاتھ میں تھیں۔ اُسے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ لڑکی مر گئی ہے۔ وہ اُسے اُٹھا کر اِس مندر میں لے آیا جہاں وہ بیٹھا ہے۔ ساری رات وہ بھگوان کی منتیں کرتا رہا۔ صبح صبح اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو لڑکی غائب تھی۔

"کہاں چلی گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو اُس مچھیرے کو بھی نہیں معلوم۔ کہتا تھا، وہ تو دیوی تھی۔ اپنے درشن دینے آئی تھی اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ اِسی طرح مندر میں جل مائی کا جاپ کرتا رہے گا تو ایک دن وہی دیوی اُسے ضرور پھر درشن دے گی۔ بوڑھے کو اب تک اُس دیوی کا انتظار تھا۔"

"اچھا اب میں سمجھ گیا" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو اُس بوڑھے مچھیرے نے تمہیں کو دیوی سمجھ لیا اور اِسی لئے تمہیں دیکھ کے بے اختیار رو پڑا۔ عقیدت سے تمہاری کلائیاں بھی چوم لیں ——— بے چارہ!"

مندر کی گھنٹیاں بہت تیز ہو گئیں۔

قلعے میں گونجنے والی مندر کی گھنٹی میں سمندر کی موجوں کے شور نے گھل مل کے عجیب موسیقی پیدا کر دی تھی۔ میں سوچنے لگا۔

تپسیا کی آگ میں جل کے آدمی کبھی نراش نہیں ہو سکتا۔ برسوں کی تپسیا اور انتظار کے بعد اِس بوڑھے مچھیرے کو اپنی تپسیا کا پھل مِل گیا تھا۔ آج دیوی نے اِسے درشن دے دئے تھے۔ نہ جانے انسان صدیوں سے ایسے کتنے غلط تصورات میں مبتلا ہے۔ اپنے نصیب کو اور دُکھی روح کو تسکین دینے کے لئے کب تک وہ فریبوں میں گرفتار رہنا پسند کرتا رہے گا۔

یکایک میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔

میں جو اندرا کو دیوی کی طرح پوجتا ہوں، رات دن اُس کی پرستش کرتا ہوں، گھنٹوں اُس کے حسن کے گیت گاتا ہوں۔ کہیں میں بھی اِس بوڑھے مچھیرے کی طرح فریب میں تو مبتلا نہیں ہوں؟ کیا اندرا سچ مچ پرستش کے قابل ہے؟

"تم اپنے گریبان میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھتے؟" میری آواز نے مجھ سے کہا۔

"ہاں ——— جب تک اندرا تمہاری زندگی میں نہیں آئی تھی تم سُشیلا سے محبت کرتے تھے۔ تم نے کتنی گھڑیاں اُس کے ساتھ نہیں گزاریں۔ کتنی بار اُس کی محبت کا دم نہیں بھرا۔ اُس کی زُلفوں پہ تمہاری سانسوں کے کتنے سائے ہیں۔ اُس کی انگلیوں پر تمہاری انگلیوں کی بے شمار پرچھائیاں ہیں اور سُشیلا سے پہلے تم نے بملا سے پیار اور محبت کی کتنی باتیں نہ کی تھیں۔۔۔؟"

"تو کیا اب اندرا سے میری محبت بھی فریب اور جھوٹ ہے؟"

میں نے اندرا کی خوبصورت کلائیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "اندرا! کتنے خوبصورت ہیں یہ ہاتھ ——— یہ نازک کلائیاں!"

کوئی چپکے چپکے میرے کانوں میں کہہ رہا تھا: "کیا ایسے جنگل تم نے دیکھے ہیں جن میں کبھی کلہاڑی نہیں چلائی گئی؟ ایسے راستے دیکھے ہیں جن پر کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا؟ کیا ایسا کوئی دن دیکھا ہے جس دن کسی کی قبر نہیں کھودی گئی؟ ایسی رات کا تصور بھی کیا ہے جس میں کسی دُکھی دل کی آہ نہ نکلی ہو؟"

شاید کوئی سچ کہہ رہا تھا۔

اب اندرا مجھ سے اور بھی قریب ہو گئی۔ اُس کی زُلفوں کی مہک ——— سے میں مدہوش ہو گیا۔ اب وہ میرے سینے سے بہت قریب لگی کھڑی تھی اور بوڑھا مچھیرا مندر سے نکل کر دُور سمندر میں ایک بادبان پکڑے گنگنا رہا تھا۔۔۔ اور ہم خوبصورت پرندوں کی کلکاریوں کو سنتے ہوئے خوابوں میں کھو گئے تھے اور سمندر اُسی طرح جاگ رہا تھا جیسے برسوں سے جاگ رہا ہے ———!!

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیک کرنے کے بعد بیسویں صدی ہر ماہ باقاعدگی سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ صدر گنج۔ دہلی)

تجدیدِ انتظار

رحمٰن راؔہی کاٹھوی

میں نے جب بھی رُخِ جاناں کا اُجالا چاہا   میری جانب غمِ دوراں کے اندھیرے لپکے
غم سے گھبرا کے کبھی میں نے جو ہنسنا چاہا   اور بھی اشک مرے دیدۂ نم سے ٹپکے

یاد بس تُو ہی رہا اور تو کچھ یاد نہیں   کب کہاں کیسے ملاقات ہوئی تھی تجھ سے
گو مجھے آج وہ موضوعِ سخن یاد نہیں   ہاں مگر پھر بھی کوئی بات ہوئی تھی تجھ سے

وہ ملاقات وہ بات آج فسانہ ہے مگر   اِس فسانے سے ملے کتنے حقیقت کے پیام
چند ہی لمحے ترے ساتھ تو گزرے لیکن   دے گئے کتنے مجھے تیری محبت کے پیام

دل کو جب ہوگیا احساسِ محبت تیرا   تُو قریب آکے مرے دُور ہوا جاتا ہے
مل گیا دید کا جب میری نگاہوں کو شعور   میری نظروں سے تُو مستور ہوا جاتا ہے

ان اندھیروں میں لئے دیدۂ نم آلودہ   منتظر تھا میں کسی جلوے کی تابانی کا
ذوقِ دیدار و تماشا لئے پھر نظروں میں   خود اُڑانے کو مذاق اپنی ہی حیرانی کا

کس کو معلوم تھا تُو بھی ہے مسافر اے دوست   اور اِک روز تجھے لوٹ کے گھر جانا ہے
کیا خبر تھی کہ رہ و رسم بڑھا کر مجھ سے   اجنبی کی طرح تجھکو بھی گزر جانا ہے

پھر اندھیروں میں لئے دیدۂ نم آلودہ   منتظر ہوتا ہے مجھکو کسی تابانی کا
ذوقِ دیدار و تماشا لئے پھر نظروں میں   خود اُڑاتا ہے مذاق اپنی ہی حیرانی کا

ہار جیت

مہندر سنگھ جوشی ایم۔ اے

۳۴۔ مال روڈ۔ دِلّی

محترم خوشتر بھائی! تسلیم

"بیسویں صدی" کے افسانہ نمبر میں میرے افسانہ "بے وفا" کی اشاعت پر مُلک کے طول و عرض سے پسندیدگی کے اتنے خطوط آ رہے ہیں کہ میں ہر خط کا فرداً فرداً جواب دینے سے معذور ہوں۔ اس لئے "بیسویں صدی" کے ذریعے بلند ذوق قارئین کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بنگالی اور مرہٹی کے رسائل نے مجھ سے اُس افسانے کا ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی ہے۔ میں نے اُنھیں لکھ دیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے رجوع کریں۔۔۔ اِس خط کے ساتھ دوسرا افسانہ "ہار جیت" بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ اور بلند ذوق قارئین اسے بھی پسند فرمائیں گے . . .

خلوص کیش ۔۔۔۔۔ مہندر سنگھ جوشی

جسبیر نے دفتر سے لوٹ کر لیٹر بکس کھولا تو دو خط نکل آئے۔ جن کا وہ منتظر تھا۔ اُس نے آنگن میں چارپائی بچھا کر سادہ لفافہ کھولا۔ لکھا تھا ۔۔۔۔

جسبیر جی!

چِٹھی ملی ۔۔۔ یہ چِٹھی ایک تصویر تھی آپ کے عُریاں اور ننگے ضمیر کی جو نادانستہ طور پر آپ کے ہاتھ سے اُتر دائی گئی۔ کاش! یہ تصویر مجھے بروقت مل گئی ہوتی۔

کئی برس ہوئے پتا جی اور اُن کے ایک دوست باتیں کر رہے تھے: "آج کل کی محبت تو ملیر کوٹلہ کی شراب ہے۔ وہ پھُونس کی آگ کی طرح ایک لمحہ میں شعلوں کی طرح جل اُٹھتی ہے۔ دوسرے لمحہ میں وہ خاک کی مانند ہوتی ہے"؛ مجھے شراب اور محبت دونوں کا تجربہ نہیں تھا۔ اِس معمّہ کے معنی کیسے سمجھتی۔ اب سب کچھ جان گئی ہوں۔ لیکن اب کیا فائدہ؟

جب چھوٹی سی تھی میری بہنیں اور بھائی لکھتے پڑھتے تو میں اُن سے کسی طرح پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی کسی کی سلیٹ آنکھوں کے سامنے رکھ کر کچھ نہ کچھ بولتی تھی۔ جو بھی دیکھتا، یہی کہتا تھا: "پرکاش بچی ہے۔ بہت ہونہار ہے۔ یہ بات سُنتے سُنتے (میرے دماغ میں بیٹھ گئی اور) مجھے یہ وہم ہو گیا کہ میں ایک ہی نظر میں انسان کو پرکھ سکتی ہوں۔ کس میں پاکیزگی ہے، کس میں پاپ ہے؟ "دل دریا سمندر سے گہرا کون دل کی جانے"، معلوم نہیں کتنے لوگ اِس خیال کے ہوں گے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میں دل کی اندرونی باتیں بھی جانتی ہوں۔ جبھی آپ ملے تو میں نے فوراً اپنے آپ سے کہا "یہ بندہ سچّا ہے، پُرخلوص ہے۔ یہ اُس مٹّی کا بنا ہوا ہے جو آگ میں گِر کر بھی اپنا رُوپ نہیں گنواتی اور رنگ نہیں بدلتی۔ اگر یہ محبت کرے گا تو اُسے نبھائے گا بھی"۔

مہاراج کرنی سنگھ جیسے نشانچی کی گولی بھی کبھی کبھی نشانے سے چُوک جاتی ہے۔ میں بھی آپ کو پرکھنے میں چُوک گئی۔

نہ آپ چوری چھپے اشاروں سے میری طرف دیکھتے، نہ لمبی لمبی آہیں بھرتے، نہ کوٹ تلے ہاتھ لے جا کر بار بار دل کو ٹٹولتے اور نہ دانستہ طور پر دُور دُور کھڑے ہو کر کسی دوسرے کے ساتھ محبت جتا کر مجھے اپنے پیچھے پھرنے کے لئے اُکساتے۔ دوسرے لوگ میری خوبصورتی کے خواہش مند رہے تھے اور میں اُن کے دل کی بات جان کر اُن سے کنارہ کر لیتی تھی۔ لیکن آپ نے اپنی بات چیت اور برتاؤ میں ایسا سوانگ بھرا کہ میں بالکل بے وقوف بن کر رہ گئی اور دن کی سفید روشنی میں اُس سوانگ کو دیکھ نہ پائی۔

آئینہ

اپنی صورت آئینے میں تم نہ دیکھو ہر گھڑی
کر دیا دیکھو اِسی صورت نے دیوانہ مجھے ——— تیمور دہلوی

نہ دیکھنا کبھی آئینہ بھول کر دیکھو
تمھارے حُسن کا پیدا جواب کر دے گا ——— تجو دہلوی

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو ——— نظام رامپوری

آئینہ بن کر رہوں ہر وقت پیش رُوئے دوست
وہ مجھے دیکھا کرے، دیکھا کروں میں روئے دوست ——— نسیم دہلوی

دل کی بساط کیا تھی حریمِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں ——— سیماب اکبرآبادی

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہنکاری۔ ایم۔ اے۔ کلکتہ

آپ نے تاڑ لیا کہ پرندہ جال میں پھنس گیا ہے اور یوں مسکراتے رہے جیسے جال آپ نے نہیں بچھایا بلکہ آپ کو تو جال کے وجود کا بھی پتہ نہ تھا اور میں جیسے شکاری کی تکلیف بچانے کے لئے خود ہی اس کی ڈوریاں کستی رہی۔

اِس وقت بہت کچھ سُوجھ رہا ہے لیکن اِتنا کیسے لکھوں؟ یاد ہے جب میں نے پنڈل پارک کے ایک کونے میں ہیبسکیس کی جھاڑی کے پاس جھٹپٹے میں آپ کے کندھے کے ساتھ سر لگایا تھا تو آپ نے کہا تھا: "کیا کرتی ہو شمشا! کوئی دیکھ لے گا؟" میں نے کہا تھا: "دیکھ لے گا تو پھر کیا ہو گا۔ آپ کی قمیص بھی تو ساری دنیا کو آپ کی چھاتی کے ساتھ لگی ہوئی نظر آتی ہے۔"

سہیلیوں نے چھیڑا: "دیکھتی ہوں آجکل بہت خوش خوش نظر آتی ہے۔ کیس بات کی اُمنگ، کس بات کی ترنگ ہے؟ یہ کرشمہ محبت کے ہارمونوں کا تو نہیں؟" میں نے نہ شرم کی اور نہ کوئی جھجک ہی دکھائی اور جواب دیا: "میں واقعی بہت خوش ہوں۔ مجھے وہ سب کچھ مل گیا ہے جس کی تلاش میں میں نے جنم لیا تھا۔"

ایک دن پتاجی الگ لے جا کر کہنے لگے: "دیکھنا بیٹی! یہ کچی عمر ہے۔ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھانا جس سے تمھیں بھی مرتے دم تک پچھتانا پڑے اور میں بھی کسی کے ماتھے نہ لگ سکوں۔" میں نے کہا: "نہیں پتاجی! جو انتخاب آپ کی بیٹی نے کیا ہے اُس پر لوگ رشک کریں گے اور آپ فخر کریں گے!" اُن کے ہوش و حواس اُڑ گئے۔ اِتنا اہم فیصلہ اور اُن کے مشورے کے بغیر؟ اُن کی بیٹی اِتنی ڈھیٹ ہو گی! اُنھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

آپ کو معلوم ہے میرا ایک ہی بھائی تھا اور وہ میکینکل انجینئرنگ کی ڈگری لینے کے لئے امریکہ گیا تو پھر لوٹ کر نہ آیا۔ اِس حادثے سے پتاجی کی زندگی موت سے بدتر ہو گئی اور اُن کے کچلے ہوئے جذبات کا سارا بوجھ میرے شانوں پر آ پڑا تھا۔ میرے بغیر اُن کی ایک گھڑی نہیں گزرتی تھی اور مجھے ہر وقت سایہ بن کر اُن کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ اُنھیں مجھے بن بیاہی تو نہیں رکھنا تھا لیکن اپنی بے بسی دیکھ کر اُنھوں نے یہ ضرور فیصلہ کر لیا کہ میں شوہر کے ساتھ ہی اُن کے پاس رہوں گی۔

میں نے انتخاب کی بات کی تو اُنھوں نے دُکھ میں ڈوبی ہوئی نظر سے سوال کیا کہ میں نے میکے رہنے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے یا نہیں؟ لیکن میں نے جو پیار کیا تھا وہ پابندیوں سے آزاد تھا۔ میری خود سپردگی کی کوئی شرط نہیں تھی۔ میں پتاجی کو کیسے یقین دِلاتی۔ احسان فراموشی کی ندامت میں ڈوبی اُن کے کمرے سے نکل آئی۔

ایک طرف تو جھوٹی ہو گئی ہوں۔ میں نے سوچا، دوسری طرف بھی نہ جھوٹی ہو جاؤں۔ میں آپ کے پاس آئی اور ہیر پھیر ڈال کر جو بات کرنا چاہتی تھی چھیڑ دی۔ میں نے کہا: "میرے پتاجی بہت بڑے عہدے پر تھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز۔ لیکن اُن کے پاس مال و زر نہیں بلکہ وہ قرض دار ہیں۔ اگر بیاہ کے وقت کچھ دیا نہ جا سکے تو مایوس نہ ہونا۔" آپ بہت گرم ہوئے: "ہاں! ہاں!! تم نے لینے دینے کی کہانی شروع کر کے میری محبت کی توہین کیوں کی؟" آپ نے جی بھر کے جھڑکیاں دیں۔ میں نے آپ کے پاؤں پکڑے، معافی مانگی۔ آپ کچھ دیر چُپ چاپ سوچتے رہے اور آخر کار بولے۔

"ہماری طرف سے کوئی برات نہ آئے گی۔ آپ بھی رشتے داروں کو نہ بلائیں گی۔ پھیرے پر گوردوارہ کا گرنتھی ہو گا یا ہم۔ میرا روزگار چل ہی رہا ہے۔ تمھارے لئے کوئی کام بھی تلاش کر لیں گے۔ دن اور رات کی محنت مشقت اور پیسہ پیسہ بچا کر اُس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک تمھارے پتاجی قرض سے سبکدوش نہ ہو جائیں گے۔"

کِتنا چاؤ اور مسرت ہوئی تھی مجھے یہ میٹھی میٹھی باتیں سُن کر میری خوشیوں کی حد نہ رہی۔ میں نے پتاجی سے آپ کی بہت ہی تعریف کی تو اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اُن کی جھولی مسرتوں سے بھر گئی اور محسوس ہونے لگا جیسے اُن کا گمشدہ بیٹا پردیس سے لوٹ آیا ہو!

آپ کی چِٹھی آئی۔ میں نے آنکھوں سے لگایا اور اس کا احترام کیا۔ چِٹھی میں دو ہی لائنیں تھیں۔ آپ نے الفاظ کی کنجوسی کبھی نہ کی تھی۔ میں گھبرا گئی۔ جلدی سے خط کے درمیانی حصے پر نظر دوڑائی۔ آپ نے پانچ ہزار روپے بھیجنے کے لئے لکھا تھا۔ آپ کا کوئی دوست مصیبت میں تھا۔ آپ نے دل کی بات واضح طور پر نہیں لکھی تھی۔ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جو کچھ آپ نے کہنا چاہا تھا میں نے اچھی طرح

[illegible] پاس [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ہم [illegible] آپ کے [illegible] کی [illegible] اور [illegible] ختم ہو جائیں گے۔ [illegible] کر چند ہزار دینے والا کوئی آپ کی [illegible]۔ [illegible] کی [illegible] ہو گئے۔ دامن چھوڑنے پر آپ [illegible] تو آپ کو [illegible] تھا۔ لیکن [illegible] کا سامنا کرنا پڑتا۔ کچہری میں حاضر ہونا پڑتا!

ہاں [illegible] وقت یہ ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ عورت تو ایک ہی [illegible] کر لیا ہے۔ جب تک پتا جی زندہ ہیں اُن کا ساتھ ہے۔ وہ نہ رہیں گے۔ بھگوان تو کہیں نہیں چلا گیا۔ آپ خیر رہیں۔

وہ جسے آپ کبھی اپنی کہا کرتے تھے

ششما

رنگین لفافے میں سے نکلے خط میں یہ لکھا تھا۔

پیارے جسبیر!

تیرے ساتھ رشتے کی بات چلانے کے لئے میں نے پتا جی کو کئی بار اشارہ کیا۔ لیکن اُنھوں نے اپنی خاموشی نہیں توڑی۔ میرا خیال ہے اُنھیں یقین نہیں تھا تُو مان جائے گا۔ میرے رنگ سے جھجکتے ہوں گے یا چہرے مہرے سے یا قد سے۔ ماں باپ کو کبھی اپنے بچے میں کوئی خوبی نظر نہ آئی۔ لیکن مجھے تو معلوم تھا نا چاہیے کچھ بھی ہو میں اِتنی بدصورت نہیں کہ . . .

پھر جب کبھی تجھے چار پانچ سَو روپے کی ضرورت پڑتی تھی تو تُو میرے پاس آیا کرتا تھا۔ جہاں محبت ہوتی ہے بندہ وہیں ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اِس سے زیادہ مجھے تیرا دل اپنی طرف ہونے کی کیا گواہی چاہیئے تھی؟ "میں تجھے پیار کرتا ہوں۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا!" یہ باتیں تو ناولوں میں ہوتی ہیں کوئی حقیقت میں کسی کو اِس طرح نہیں کہتا۔

حالانکہ مجھے پُوری اُمید تھی کہ ہمارا ملاپ ضرور ہو جائے گا لیکن ایک دن [illegible] ہو کر میں برت رکھنے لگ گئی۔ یہ نہ بتاؤں گی کس کام کے لئے؟ آج گیارھواں دن تھا کہ تیری محبت بھری چٹھی آگئی۔ تو بھی جسبیر! بالکل دیوانہ ہی ہے۔ تُو مجھے چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن تجھے اِس طرح کھلی کھلی باتیں لکھتے ہوئے شرم نہ آئی؟ میں نے ماں کو تیری چٹھی پڑھوا دی۔ مجھے بہت شرم آئی۔ لیکن کیا کرتی۔ خود تو منہ سے کچھ کہا نہیں جاتا تھا۔ ایک دو دن میں میرے باپو جی تیرے [illegible] ملیں گے اور بھروسہ رکھ تیرے من کی مُراد پُوری ہو جائے گی!

نگاہ

اِک اجنبی نگاہ کے ملنے کی دیر تھی
دل کو متاعِ صبر و سکو چھوڑ کر چلی ——— [illegible]

میری پہونچ سے دور کہیں دور تر ہو تم
حالانکہ میرے دل میں ہو میری نگاہ میں ——— مظلوم

اُٹھے اگر نگاہ تو دل میں اُتر ہی جائے
ہم آپ چاہتے ہیں نشانہ خطا نہ ہو ——— اسرار امروہوی

عالم نرگسِ نگاہ نہ پوچھ
جیسے پہلی شعاعِ صبحِ ازل ——— فراق گورکھپوری

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں ——— داغ

مرسلہ: سید محمد سعید کانپور

ہاں! سچ!! تُو اِتنا ایبسینٹ مائینڈ کیوں رہتا ہے؟ محبت کی وجہ سے شاید؟ چٹھی شروع کرتے وقت مجھے "جمنا" کے بجائے "ششما" لکھ گیا۔

اچھا۔ ٹاٹا!

تیری موٹو

جسبیر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے ششما سے روپے مانگے تھے اور نہ موٹو سے محبت کی تھی۔ بے خیالی میں ایک کا خط دوسرے کے لفافے میں ڈال کر مصیبت میں پڑ گیا!!


det
whitens while it washes clean
ڈیٹ
صاف دھونے کے ساتھ ساتھ اُجلاپن پیدا کرتا ہے
صرف ڈیٹ ہی آپ کے سفید کپڑوں کو
اتنا چمکدار سفید اور رنگین کپڑوں کو
اس قدر صاف اور بیداغ دھوتا ہے۔
سواستک

غزل

ن۔ن۔ نجمی ایم۔اے

عمر بھر فکرِ غمِ دنیا کیا
اے فریبِ زیست! ہم نے کیا کیا

کیا غرض اس سے کہ تم نے کیا کیا
جو کیا۔ جو بھی کیا۔ اچھا کیا

دیدنی تھا میرا شوقِ دیدِ حسن
میں اُنھیں پردوں میں بھی دیکھا کیا

تھا مقدر بھی کچھ اُلٹا پھیر سے
کچھ دعاؤں نے اثر اُلٹا کیا

رہ زنی نکلی خرد کی رہبری
اس نے ہر رہ گیر سے دھوکا کیا

حادثاتِ زیست کیوں ہیں دم بخود
ہم نے کب حالات کا شکوا کیا

اہلِ دل، اہلِ وفا، اہلِ خلوص
ہائے! تم نے ذکر یہ کن کا کیا

تیرا جلوہ ہی نہ تھیں، پردا بھی تھیں
تو نے جن نظروں سے اب پردا کیا

چشم و دل ترکِ تمنا کر چکے
روح کا دامن مگر بھیگا کیا

بے خبر آغاز سے، انجام سے
میں جدھر دیکھا کیا، دیکھا کیا

بے رُخی؟ پھر یوں وفائے عشق سے؟
خیر، تم نے جو کیا۔ اچھا کیا

میں وہی، وہ بھی وہی، آفت وہی
ترکِ اُلفت نے اثر پھر کیا کیا

حالِ دردِ ہجر اے نجمی! نہ پوچھ
دل پہ جو گزرا کیا۔ گزرا کیا

غزل

سید حباب ترمذی

گل میسر نہیں تو خار سہی
نامرادی گلے کا ہار سہی

بے وفائی شعار ہے میرا
تم ہی اچھا وفا شعار سہی

دل میں پھوٹے گی روشنی کی کرن
اور کچھ روز انتظار سہی

اپنی ناکامیوں پہ ہوں مسرور
جیت اُن کی ہے میری ہار سہی

آدمی انجمن ہے اپنی جگہ
لاکھ اسے خلوتوں سے پیار سہی

دل کی تسکین غیر ممکن ہے
آپ پُرسانِ حالِ زار سہی

کج کُلاہوں سے دل نہیں ملتا
صاحبِ تخت و تاج دار سہی

حسن پردے میں ہے تو ہے بیکار
دستِ قدرت کا شاہکار سہی

زحمتِ التفات تو ہوگی
چشمِ لطف اور ایک بار سہی

گل بہرحال گل ہیں کم نظرو
لاکھ آغوشِ گل میں خار سہی

دلِ مہجور کے بہلنے کو
کچھ نہیں تو خیالِ یار سہی

ہم اسیروں کو کیا خوشی صیاد
آمدِ موسمِ بہار سہی

پھر بھی اُمیدوار ہوں میں حباب
نا اُمیدی بروئے کار سہی

کہے اَن کہے

نریش ایم۔ اے

نوجوت پبلیکیشنز۔ مالیر کوٹلہ (پنجاب)

بندہ نواز! تسلیم

. . . اب کی بار ایک نہایت دلچسپ مضمون "کہے اَن کہے" ارسال کر رہا ہوں۔ آپ جیسے ادب نواز اور اُردو دوست حضرات کی انتھک کوششوں کے باوجود مٹتی ہوئی اُردو کے اُن اشعار کا ذکر کیا ہے جن کو لوگوں نے ہر ڈھنگ سے اپنا لیا ہے . . .

نیاز مند ——— نریش

ہر زبان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عوام کے اجتماعی لاشعور میں گہری اتر جائے۔ اُردو زبان آنے والی نسلوں کے لئے عہدِ گزشتہ کی ایک دُھندلی سی یاد بنتی جا رہی ہے لیکن اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک زمانے میں یہی زبان عروسِ تہذیبِ ہند کا سنگار تھی، مانگ کا سیندور تھی۔ دَورِ حاضر میں محبانِ اُردو کی کمی نہیں ہے۔ ہم نے مشاعروں میں لوگوں کو جھومتے دیکھا ہے۔ اچھے شعر پر اُن کی آنکھوں سے بے اختیار نکل آنے والے آنسوؤں کو دیکھا ہے۔ ہندی کے علماء و ادباء کے خطوط میں بلا تکلف اُردو اشعار کا استعمال دیکھا ہے۔ اکثر اُردو کے مخالفین نے بھی اپنی تقریروں کو اُردو ہی کے اشعار کی چاشنی دے کر پُر اثر اور دلچسپ بنایا ہے۔ ادبی نشستوں کو اُردو اشعار نے کشتِ زعفران بنایا ہے۔ بیشتر اخبارات اب بھی عام طور پر اپنے اداریہ کا آغاز شعر ہی سے کرتے ہیں۔ محبت کے پرستاروں کے لئے تو گام گام اُردو اشعار نے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ کون سا ایسا جذبہ ہے جس کی ترجمانی اُردو شاعری نے نہ کی ہو۔

قلبِ انسانی میں ہزار طرح کے جذبات اُٹھتے ہیں، پروان چڑھتے ہیں اور وہ اُن کے اظہار کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ شاعری کی صلاحیت سے محروم انسان دل کی بات کہہ دینے میں ذرا دِقّت محسوس کرتا ہے تو وہ کسی شاعر کے تخیّل یا تجربے کا سہارا لیتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے اسی کے لئے یہ شعر کہا ہوگا۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ایک ہی مصرعے سے مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ دوسرا مصرع کیا ہے اِس کی پروا اُنھیں کب ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ مصرع یا یہ شعر کس غریب کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ بس شعر پر بھرپور ہاتھ ڈالتے ہیں اور اپنا مطلب حل کر لیتے ہیں۔ ایسے نہ معلوم کتنے مصرعے ہیں جو لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں لیکن وہ اُس شعر کے دوسرے مصرعے سے ناواقف ہیں۔ شاعر کے نام تک سے ناآشنا ہیں۔ آیئے ایسے ہی چند لاوارث مصرعوں پر غور کریں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر الہ آباد ریڈیو اسٹیشن سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُس وقت کے نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے بار بار یہ مصرع پڑھا ؎

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دُھوم سے نِکلے

آپ نے بھی کبھی بار اِس مصرعے کا استعمال کیا ہوگا۔ ہم نے ایک بار دلی میں ایک صاحب کو پِٹتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے غالباً کسی لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ پِٹائی ہو رہی تھی اور مجمع میں سے چند حضرات یہ تجویز پیش کر رہے تھے کہ آپ کو گدھے پر بٹھایا جائے اور آپ کا مُنہ کالا کر کے چاندنی چوک تک لے جایا جائے۔ اور اِس تجویز کی تائید میں یہی مصرع دُہرایا جا رہا تھا۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ یہ مصرع مرزا محمد علی فدوی کا ہے اور پُورا شعر یوں ہے ؎

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نِکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دُھوم سے نِکلے

ایک بھلے آدمی کسی دوشیزہ کی زُلفوں سے اُلجھ گئے۔ اکثر گُم سُم سے رہنے لگے۔ وجہ دریافت کی تو آپ نے زیبِ داستان کے لئے بہت کچھ مبالغہ آرائی فرمائی۔ احباب نے

سُنا اور بے ساختہ کہہ دیا ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

محبوبہ کو سامنے بٹھا کر اگر کسی عاشق نے حد سے زیادہ تعریف کی تو بڑی ادا کے ساتھ یہی مصرع محبوبہ نے بھی پڑھ دیا۔ لیکن عاشق اور محبوبہ کو کیا معلوم کہ یہ مصرع مرزا غالب نے اپنے اس شعر کے لئے موزوں کیا تھا ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

غالب اُردو کے اُن چند شعراء میں سے ہیں جن کے دم سے اُردو شاعری کی تاریخ قائم ہے اِس لئے اُن کے اکثر مصرعے لوگوں کو یاد ہوگئے ہیں۔ غالب کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں موجود ہیں اس لئے لوگوں نے اپنی اپنی پسند کے مصرعے اُڑا لئے ہیں۔ یہ مصرعے کس شعر کے ہیں یہ معلوم ہونا تو درکنار اُنھیں یہ بھی علم نہیں کہ یہ مصرعے مرزا غالب کے کہے ہوئے ہیں۔ جو چند اشعار میں پیش کر رہا ہوں ان میں ہر ایک کا مصرعِ ثانی ہی لوگوں کے استعمال میں آتا ہے ؎

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

زندگی اپنی جو اِس ڈھنگ سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گُزرنا ہے دوا ہو جانا

آپ نے کسی دوست کو بیمار دیکھا اور فوراً مشورہ دیا کہ بھائی اپنا علاج کرواؤ۔

"جان ہے تو جہان ہے پیارے!"

طلباء نے کسی طالب علم کو صحت کی کمزوری کے باوجود بہت زیادہ محنت کرتے دیکھا تو جھٹ کہہ دیا ــــ بھیا صحت کا بھی خیال کرو پڑھ کر کیا کروگے ــــ

"جان ہے تو جہان ہے پیارے!"

لیکن کہنے والے نے کبھی یہ نہ سوچا کہ جس مصرعے کو وہ ادا کر رہا ہے وہ مصرع میر تقی میرؔ کا ہے۔ اُنھوں نے اِس شعر کے لئے موزوں کیا تھا ؎

میرؔ قصداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

یا پھر کسی دوست کو آپ نے ہمت ہارتے ہوئے دیکھا تو جھٹ کہہ دیا۔ گھبراؤ مت پیارے "زندگی زندہ دِلی کا ہے نام" لیکن آپ کو معلوم تھا کہ یہ مصرع اِس شعر کا ہے ؎

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اور یہ شعر حضرتِ ناسخؔ کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔

آپ کسی دوست کے ہاں گئے اور تھکے ماندے آرام کرسی میں دھنس گئے۔

دوست نے چھت پر چل کر بیٹھنے کو کہا، آپ نے فرمایا بھئی ؎

حضرتِ داغؔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

آپ پکنک پر تشریف لے گئے اور لبِ دریا جم کر بیٹھ گئے۔ احباب نے کہا کہ آگے چلا جائے مگر آپ نے یہی مصرع فرما دیا۔ لیکن کسے خبر کہ یہ مصرع حضرتِ داغؔ نے کسی اور موقعے کے لئے ایک شعر میں یوں لگایا تھا ؎

حضرتِ داغؔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
اور ہوں گے تری محفل سے ابھرنے والے

لیجئے دوستوں نے آپ کی ضد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔ موضوعِ گفتگو آپ کے رومانس پر آ کر ٹکا تو آپ نے نہایت بے تکلفی سے فرما دیا۔ ہاں یار و تعارف تو ہو گیا ہے۔ خیر "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں"

ممکن ہے حضرتِ اثرؔ نے بھی یہ مصرع آپ ہی کی طرح احباب کو اپنے رومانس کی روداد سناتے ہوئے موزوں کیا ہو ؎

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

دوستوں نے آپ کی پہلی بات پر مذاق اڑایا اور کہا۔ بیٹا دیکھنا کہیں پٹائی نہ ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ آپ بھی رسوا ہو اور ہمیں بھی بدنام کرو۔ تو آپ نے فلمی اداکار کا سا پوز بنا کر کہہ دیا ؏

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

جی ہاں آپ سے یہی کہتے بنتا تھا اس وقت شیفتہؔ نے بھی تو یہی کہا تھا ؎

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

خیر آپ کے احباب آپ سے متفق نہ ہو سکے۔ آپ بھول پر بھول کرتے رہے۔ آپ کا عشق تماشا بن گیا اور (خدا کی پناہ) آپ کے ساتھ وہی ہوا جس کا احباب کو خطرہ تھا۔ اس کا سبب آپ ہی کے چند مہربان تھے جنھوں نے ذرا سی بات کا افسانہ بنا دیا۔ مایوس ہو کر آپ نے کواڑ بند کر لئے اور سگریٹ سلگا کر چارپائی پر گر پڑے۔ دفعتہً دروازہ کھلا اور آپ کا کوئی دوست داخل ہوا۔ آپ کے متعلق دریافت کیا تو آپ جل اٹھے۔ لیکن آپ نے ضبط کیا اور صرف اتنا ہی کہا کہ ؏

جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

اور کیا بعید ہے کہ حضرتِ ثاقبؔ کبھی آپ جیسے حالات میں گھر گئے ہوں اور انھوں نے فرمایا ہو ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

ثاقبؔ ہی کا ایک اور شعر آپ نے بارہا سنا ہوگا ؎

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

چلئے آپ نے دوستوں کا شکوہ کرنا چھوڑ دیا اور اگر کسی دوست نے کبھی بات چلائی تو آپ نے اسے ٹکا سا جواب دے کر لاجواب کر دیا۔ یہاں آپ کو ذوقؔ کے اس مصرعے نے بڑی مدد دی ؏

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جسے ذوقؔ نے مصرعِ اولیٰ کے ساتھ یوں دست و گریباں کیا تھا ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

دوست آپ سے کنّی کاٹنے لگے۔ آپ کے رویّے میں آئی ہوئی تبدیلی وہ برداشت نہ کر سکے۔ آپ کی محبت پرست طبیعت نے پھر کروٹ لی اور آپ نے کوئی اور محبوبہ منتخب کر لی۔ وہ بھی آپ کی طرف مائل ہوئی اور آپ کے لئے بناؤ سنگار کرنے لگی لیکن آپ سادہ دل، سادہ لوح انسان۔ آپ کو اس بناؤ سنگار سے چڑ ہوئی۔ آپ نے فوراً کہا ؏

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی

خیر محبوبہ کی بات چھوڑئیے۔ آپ نے کسی بڑے آدمی کو نہایت سادہ لباس میں دیکھا۔ تب تو آپ کو یہی کہتے بنتا ہے نا۔ شاہ نجم الدین آبروؔ نے بھی تو اسی لئے کہا تھا ؎

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ اُس کو بدنما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا

محترمہ بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھیں۔ آپ کی طرح وہ بھی لاوارث مصرعوں کا سہارا لیا کرتی تھیں۔ اُس نے گھٹنے ٹیک دئے اور کہا ؏

راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

اب اُسے کیا معلوم کہ ڈاکٹر اقبالؔ نے تو اسے معرفت کے رنگ میں یوں کہا تھا ؎

شکوہ نہ بیش و کم کا تقدیر کا گلہ کیا
راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

اور آپ لوگ اطمینان سے محوِ گفتگو ہوئے۔ آپ محترمہ کے لئے نو وارد کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے وہ آپ کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن آپ پیمانِ وفا باندھنے کو بیقرار تھے۔ عاجز آ کر آپ نے کہا "اوہ! اِس سوال و جواب نے مارا!"

یقیناً جگر مرادآبادی نے بھی اذب کر ہی کہا ہوگا ؎

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا

آیئے اب قصۂ حسن و عشق کو خیر باد کہیں اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف متوجہ ہوں۔ وہاں بھی تو یہ لاوارث مصرع آپ کو تعاون دیتے ہیں۔ آپ کے پڑوس میں کسی بچے کا انتقال ہوا۔ آپ کے دل پر چوٹ لگی اور آپ نے کہا ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کِھلے مرجھا گئے

آپ شاید نہ جانتے ہوں کہ یہ مصرع پنڈت برج نارائن چکبست کا ہے اور پورا شعر یوں ہے ؎

کِھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کِھلے مرجھا گئے

کوئی لیڈر صاحب چل بسے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ کسی رشتے دار کا انتقال ہوا تو آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے خدا کے آگے کس کا زور؟ آپ دعائے مغفرت یا تعزیت مرحوم کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ یہاں یہ مصرع آپ کا ساتھ دیتا ہے ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اگرچہ داغ نے محبوبہ کی ستم ظریفی سے تنگ آکر فرضی ہی موت کے تصور سے اس مصرعے کو یوں موزوں کیا تھا ؎

خبر سن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آپ کوئی ڈرامہ دیکھنے گئے۔ ڈرامہ ختم ہونے پر کسی مزاحیہ اداکار نے سامعین سے کہا۔ حضرات! ع

اب ہو چکی نماز مصلّے اُٹھایئے

لیکن حضرت آتش نے تو یہ مصرع نہ ہمارے لئے کہا تھا نہ اس اداکار کے لئے۔ انھوں نے شعر یوں فرمایا تھا ؎

فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب
اب ہو چکی نماز مصلّے اُٹھایئے

مشہور افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری مناسب حقِ محنت پر اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتابوں پر اصلاح لے کر مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجئے۔

پتہ: حضرت آسی رام نگری مغلسرائے۔ یو، پی

غزلیں

انورؔ اتوبی گنگوہی

جب کبھی آپ کے دیوانے سنبھل جاتے ہیں
حادثہ راہ سے کترا کے نکل جاتے ہیں

دیکھیں کیسے نہیں ہوتے ہیں وہ مائل بہ کرم
گرمیٔ عشق سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں

روز کھاتا ہوں قسم ترکِ محبت کی مگر
جب وہ یاد آتے ہیں ارمان مچل جاتے ہیں

فطرتِ عشق نہ بدلی ہے، نہ بدلے گی کبھی
حسن والوں ہی کے انداز بدل جاتے ہیں

جب کبھی ہوتا ہے مرا ذکر تری محفل میں
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

ہم تو ہیں آج بھی پیمانِ وفا پر قائم
قول سے آپ مگر اپنے بدل جاتے ہیں

کر کے ہم عزمِ جواں ہوتے ہیں جب گرمِ سفر
گردشِ وقت کے بھی طور بدل جاتے ہیں

ضبط کرتا ہوں بہت دل پہ مگر اے انورؔ
چوٹ پڑتی ہے تو آنسو بھی نکل جاتے ہیں

خزاں چند نسیمؔ

یا عوضِ راحت مجھے افسردگی ہونے لگی
ناخوشی بھی اب مرے حق میں خوشی ہونے لگی

ہوتے ہوتے اُن سے میری بات بھی ہو گئی
اے خوشا جو بات ہونے کی نہ تھی ہونے لگی

دل ہے اب بھی مائلِ پرواز لیکن کیا کروں
مائلِ پرواز بے بال و پری ہونے لگی

کیا کوئی آ کر سنے گا میرے غم کی داستاں
اب تو میری داستاں ناگفتنی ہونے لگی

راہ زن تو راہ زن، رہبر بھی جُل دینے لگے
رہبری کے نام پر اب رہزنی ہونے لگی

جو تمہارے حسن میں ہے بات وہ اُن میں کہاں
مہر و مہ سے کب تمہاری ہمسری ہونے لگی

کچھ تو کرنا ہی پڑے گا انتظار اے جذبِ دل
وہ چلے آئیں، کہاں یہ بات ابھی ہونے لگی

زندگی جن کی ہے وہ رہنے لگے ہیں سرگراں
بارِ خاطر اے نسیمؔ اب زندگی ہونے لگی

معراجؔ العارفی

وہ رشکِ ماہتاب جو مہماں ہے آجکل
ظلمت کدہ بھی دل کا فروزاں ہے آجکل

دشوار ہے کہ کشتیٔ دل پار لگ سکے
ہر سمت بحرِ زیست میں طوفاں ہے آجکل

جھونکے کچھ اتنے تیز ہیں بادِ سموم کے
ہر پھول گلستاں میں پریشاں ہے آجکل

ہر سمت خونفشانی ہے ہر سمت خلفشار
کس وادیٔ خیال میں انساں ہے آجکل

آنکھوں میں اشک، لب پہ فغاں، دل اداس اداس
شیرازۂ حیات پریشاں ہے آجکل

کر فکرِ آشیاں کی جگہ فکرِ گلستاں
برقِ ستم کی زد میں گلستاں ہے آجکل

تاریکیوں کا خوف نہیں راہِ زیست میں
سینے میں شمعِ عشق فروزاں ہے آجکل

اس کا تمہیں خیال رہے دشمنانِ ملک
معراجؔ بھی وطن کا نگہباں ہے آجکل

افسانہ

کافی کے دھبّے

ایس۔ایم۔حیات بی۔اے

مدراس پبلک سروس کمیشن، ماؤنٹ روڈ۔ مدراس نمبر۲

محترم بھائی! خلوص و احترام

"بیسویں صدی" کے سالنامے میں آئے ہوئے میرے افسانے" ویٹنگ رُوم" کے سلسلے میں مجھے اب تک تعریفی خطوط مل رہے ہیں۔ اپنے بلند ذوق قدر دانوں کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا میرے امکان کی بات نہیں، اس لئے "بیسویں صدی" کے ذریعے اُن کا شکریہ ادا کر رہا ہوں ——— "ویٹنگ رُوم" کے بعد افسانہ نمبر کے لئے تامل زبان کا ایک شاہکار "کافی کے دھبّے" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ یہ کہانی بھی قدرے طویل ہے لیکن طوالت ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں ہوتی ———

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

اپنی گرانقدر رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں . . آپ کا ——— ایس۔ ایم۔حیات

رات کے نو بج چکے تھے۔ لیکن رام لنگم ابھی تک خلافِ معمول گھر نہیں لوٹا تھا۔ کنّما کے میکے چلے جانے کے بعد سے اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ اُن میں سب سے نمایاں یہ تھی کہ اب وہ شام ہونے سے پہلے ہی دفتر سے سیدھا گھر لوٹ آتا تھا۔ میکے جاتے وقت کنّما نے اس کی غلط کاریوں کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے فہمائش کی تھی۔ اب وہ سختی سے اپنی زندگی کے نئے لائحہ عمل پر کاربند تھا۔ اب وہ رات گئے تک گھر سے باہر نہیں رہتا تھا۔

پہلے رام لنگم کی یہ کمزوری اکثر دونوں کی سنجیدہ بحث و گفتگو کا موضوع بن جاتی تھی۔ کبھی لبوں پر لطیف تبسّم بکھیرے، کبھی ماتھے پر شکنیں ڈالے، کبھی واضح رہی ہے اور کبھی آنکھوں میں آنسو بھر کر کنّما نے اس کی اس کمزوری کے متعلق توجّہ دلائی تھی۔ کیا تمھیں اس بدنصیب عورت سے کوئی سروکار نہیں جس کی قسمت تمھارے ہاتھ میں سونپ دی گئی ہے۔ جو دیدہ و دل فرشِ راہ کئے تمھارے آنے کی منتظر رہتی ہے؟" پُرنم آنکھوں سے وہ گِلہ کرتی۔ کبھی کبھی اُس کے دفتر سے گھر لوٹتے ہی اپنے کمرے میں جا گھستی اور اپنے پلنگ پر لیٹ جاتی تاکہ وہ چند لمحے باہر ہی دہلیز پر کھڑا دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹاتا رہے اور جب وہ محسوس کرتی کہ اُس کے شوہر کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھُوٹا چاہتا ہے تو آہستہ سے اُٹھتی، آنکھیں ملتی اور ایک مشّاق اداکارہ کی طرح اپنی آنکھوں میں نیند کی کیفیت پیدا کرتے ہوئے دروازہ کھولتی۔ رام لنگم پر اس رویّے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

دفتر شام کے ٹھیک پانچ بجے بند ہوتا۔ وہاں سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہوا، سیر و تفریح کرتا ہوا اور کچھ تاخیر سے گھر لوٹتا۔

میکے جانے سے پہلے کنّما نے رام لنگم کو سمجھایا۔ رات کو دیر سے گھر لوٹ کر شانتا کو بھی زیادہ دیر تک جگائے رکھنا مناسب نہیں۔ میری بات اور تھی۔ تمھیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تمھاری طرف سے اس لڑکی کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ دُنیا کے چھل فریب سے نا آشنا ہے۔ سادگی پسند ہے اور کبھی کسی بات کی شکایت نہ کرے گی۔ پھر بھی تمھیں چاہیئے کہ تم اپنے عادات و اطوار کو سنوارو اور اُس کے ساتھ نیک اور شریفانہ برتاؤ ——— ہاں!"

کنّما کی ہدایات کے ساتھ ہی اب رام لنگم کے دل میں خود اپنی زندگی میں ایک تنظیم پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ تندہی اور خلوص کے ساتھ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے لگا۔ اب اُس کے کمرے میں پُرانے کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے

پڑتے نہیں دکھائی دیتے۔ اب وہ اپنے معمولی سے معمولی کام کے لئے بھی دوسروں کو آواز نہ دیتا، خود ہی کر لیتا۔ پُرانے رسائل اور روزناموں کو سلیقے کے ساتھ کمرے کے ایک مخصوص کونے میں جمع کرتا۔ اب اُس کی میز پر ضروری اور غیر ضروری چیزوں کا ایک ذخیرہ نہیں ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے۔ لیکن —— آج کی شام اُس کی نئی زندگی میں پھر ایک لغزش سرزد ہوگئی۔ وہ دوستوں کے شدید اصرار پہ بادلِ ناخواستہ کوئی انگریزی فلم دیکھنے کے لئے نکل پڑا۔ اُس کے گھر لوٹنے تک رات کے دس بج چکے تھے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لئے رُک گیا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کُنڈی کھٹکھٹائی۔ کوئی جواب نہ پاکر قدرے توقف کے بعد اُس نے پھر کُنڈی کھٹکھٹائی۔ تھوڑے وقفے کے بعد اُس کے کانوں میں کسی کی آہٹ سُنائی دی۔ پھر کسی کے کراہنے اور رُک رُک کر سانس لینے کی آوازیں سُنائی دیں۔ لیکن

- خدا سے ڈرو۔ کیونکہ خدا باطن کو بھی اُسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ظاہر کو۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ)
- ثواب حاصل کرنے کی بہ نسبت گُناہ سے پرہیز کرنا زیادہ اچھا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- جو خود شکم سیر ہو کر کھائے اور اُس کا ہمسایہ بھوکا رہے اُس کا ایمان ناقص ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- عقلمندی یہ ہے کہ انسان اپنے تجربوں سے فائدہ اُٹھائے اور اُن کے مطابق کام کرے۔ جو شخص مال دینے میں سب سے زیادہ بخیل ہو وہ اپنی عزت دینے میں سب سے زیادہ سخی ہوتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

کسی کے قدموں کی چاپ نہیں سنائی دیتی تھی۔ کافی انتظار کے بعد اندر سے دروازے کی چٹخنی اُتاری گئی۔ دروازہ کھُلا۔ رام لنگم نے جونہی گھر کے اندر قدم رکھا اُس کی پریشان نگاہیں بخار کی شدّت میں تپتی سامنے کھڑی شانتا پر پڑیں۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ شانتا کا سارا جسم بخار میں جُھلسا جا رہا تھا۔ اُس میں کھڑے رہنے کی بھی سکت نہ تھی۔ ہانپتی کراہتی وہ پیچھے کی طرف مُڑی اور اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے ہال کے ایک کونے میں بچھی چٹائی تک لے جاکر اپنے آپ کو چٹائی پر گرا دیا اور اپنے سارے جسم کو شال میں لپیٹ لیا۔ شال کی دبیز تہہ کے نیچے بھی اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اُس کی تکلیف سے متاثر ہو کر رام لنگم اُس کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔

"یکایک تمھاری یہ کیا حالت ہوگئی شانتا؟ کل دوپہر کو تم بھلی چنگی تھیں!" اُس نے پوچھا۔

وہ رام لنگم کے سوال کا جواب نہ دے سکی۔ صرف معصوم نظروں سے اُسے تکتی رہ گئی۔ سانس لینا اُس کے لئے مشکل بن گیا تھا۔ بخار کی حدّت سے وہ کراہ اُٹھی۔ بولنے کی سکت نہ تھی۔

کل دوپہر کو وہ بالکل اچھی تھی۔ رات کا کھانا بھی اُسی نے پکایا تھا۔

اُس نے دیکھا شانتا کی گرم سانسوں میں ہر لمحہ گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس کا جسم بخار کی شدّت سے تپ رہا ہے۔ شانتا کی جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے بعد اُسے بخار کی شدّت کا صحیح اندازہ ہوا تھا۔ دوڑتا ہوا وہ اپنے کمرے میں گیا۔ اپنا اُونی شال اُٹھا لایا اور شانتا کے جسم پر ڈال دیا۔ پھر دروازے کے دونوں کواڑ بند کئے اور ڈاکٹر کو بُلا لانے کی غرض سے باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر آیا۔ معائنہ کیا۔ ایک انجکشن دیا۔ دوا اور خوراک کے متعلق ضروری ہدایات دے کر وہ چلا گیا۔

شانتا چٹائی پر لیٹی رہی۔ آج وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اِس حالت میں تنہا چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرے۔ وہ وہیں شانتا کے بستر سے تھوڑی ہی دُور پر ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ہال میں دیوار پر ٹنگی گھڑی نے آدھی رات کے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے بارہ گھنٹے بجائے۔ آواز کی لہریں فضا میں گونج رہی تھیں۔ رام لنگم کی نگاہیں شانتا کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ پسینے کی بُوندیں اُس کے لبوں اور ابروؤں پر گُلاب کے پھُول پر گری ہوئی شبنم کی طرح چمک رہی تھیں۔ شانتا کی گہری نیلی آنکھیں جن پر اب پلکوں کی چلمن پڑی ہوئی تھی اُسے اُن نرم و نازک کلیوں کی یاد دلانے لگیں جو سبز پتّیوں کے درمیان چھُپی رہتی ہیں۔ اُس کے گھنے ابروؤں کے نیچے پسینے کی ایک لکیر سی رواں تھی۔

شانتا نے کروٹ بدلی۔ اُس کی نیم وا آنکھیں رام لنگم کے چہرے پر پڑیں۔ شال کو اپنے جسم سے اُتار کر اُس نے پُوچھا "ارے! آپ اب تک یہیں بیٹھے ہیں؟ کیا آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے؟"

"کھانا کھا لوں گا لیکن اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟" رام لنگم نے پُوچھا۔

"اچھی ہے!" یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ سے اُٹھ بیٹھی۔ شاید انجکشن کا فوری اثر تھا بخار کی شدّت میں قدرے کمی ہوئی۔ جسم سے پسینہ بھی خارج ہونے لگا تھا۔

"اب دیر نہ کریں کھانا کھا لیں" ساری کے آنچل سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے وہ کہنے لگی "اب تک تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا!"

"تمھارے لئے کیا لاؤں؟ ڈاکٹر کہہ گیا ہے کہ تم سوپ پی سکتی ہو۔ آش پی سکتی ہو۔"

"جی نہیں، مجھے بھُوک نہیں ہے۔ آپ کھانا کھا لیں اور آرام کریں۔ رات کافی جا چکی ہے۔"

رام لنگم کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ پھر شانتا کے بہت اصرار پر وہ وہاں سے بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ دو چار لقمے مشکل سے حلق کے نیچے اُتارے اور ہاتھ دھوکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ نہ جانے وہ کب تک شانتا کے متعلق سوچتے ہوئے بستر پر جاگتا رہا۔

شانتا ــــــــ

دو سال پہلے ہی اُس نے شانتا کو دیکھا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے لئے ایک دن جب وہ دفتر سے گھر لوٹا تو رام لنگم نے دیکھا، ایک نوجوان لڑکی اُس کے گھر سے باہر نکل رہی ہے۔ دہلیز پر وہ چند لمحوں کے لئے رُک گیا تھا تاکہ لڑکی باہر نکل جائے۔ اوّل تو اُس نے اُس لڑکی پر نگاہِ غلط انداز پھینکی لیکن دوسرے لمحے وہ محسوس کرنے لگا، وہ اُس لڑکی کو عالمِ وارفتگی میں دیکھے جا رہا ہے۔ رام لنگم کے لئے یہ غیر معمولی بات تھی۔ اُسے اپنی طبیعت کی اُفتاد پر حیرت ہوئی۔ وہ اُن نوجوانوں میں سے نہ تھا جو راہ چلتی عورتوں کو تاکتے جھانکتے ہیں۔ لڑکی شرم و حجاب سے اپنا سر نیچا کئے تیزی سے آگے نکل گئی اور چند ہی لمحوں میں وہ اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ کافر جمال لڑکی بہت دیر تک اُس کے ذہن و احساس پر چھائی رہی۔

"یہ لڑکی جو ابھی گھر سے باہر نکل رہی تھی کون ہے؟" گھر میں داخل ہو کر اُس نے کنّما سے پُوچھا۔

"ہماری پڑوسن ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اِس کا شوہر کسی بینک میں کام کرتا ہے؟" کنّما نے جواب دیا۔

اِس کے بعد وہ نوجوان لڑکی اِس گھر میں اکثر آنے جانے لگی ـــــ اور پھر اجنبیت اور شرم و حجاب کے پردے اُٹھتے گئے۔ اب وہ رام لنگم کی موجودگی میں بھی آنے لگی تھی اور اُس سے باتیں بھی کرنے لگی تھی ـــــ وہ کبھی کبھی کسی خاص موضوع پر بلا تکلّف تبادلۂ خیالات بھی کر لیتے تھے۔ اب اُس نے شانتا کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ جس طرح نیلگوں جھیل کی سطح پر کھِلے کنول کو دیکھ کر ایک حُسن شناس کے دل میں گُدگُدی سی ہونے لگتی ہے اُسی طرح شانتا کے حُسن نے رام لنگم کے دل و دماغ میں بھی ایک ہلکی سی لہر پیدا کر دی تھی ـــــ یہ ایک فطری بات تھی۔

صبح و شام ہوتی رہی۔ دن گزرتے گئے۔ اُس کی بیوی کنّما اور شانتا ایک دوسرے کے اِتنا قریب آ گئیں کہ ایک پَل کے لئے بھی بچھڑنا اُنھیں شاق گزرنے لگا۔ شانتا کے شوہر شنکر اور رام لنگم بھی گہرے دوست بن چُکے تھے۔

شنکر ایک زندہ دل انسان تھا۔ وہ زندگی کو ہنسی خوشی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ چُھٹّیوں میں وہ اپنی بیوی کو ساتھ لئے گھر کے باہر نکل پڑتا۔ کبھی سینما گھر، کبھی مندر، کبھی پارک یا قُرب و جوار کے علاقوں میں رہنے والے دوستوں کے ہاں۔ چُھٹّیاں وہ گھر کے باہر ہی گزارا کرتے تھے۔ اُن کی زندگی میں ہم آہنگی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے مطمئن تھے۔

گہرے روابط کی بنا پر روزمرّہ کے اُمور میں دونوں کُنبوں کے افراد ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔ ایک دوسرے کے کاموں میں معاون ثابت ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ چاروں ایک ہی کُنبہ کے افراد ہوں یا اُن میں برسوں کی شناسائی ہو۔

"بیچاری شانتا!" کنّما نے ایک دن اپنے شوہر سے کہا" اُس کے شوہر کے سوا

- جو میرا اور صرف میرا سہارا لیتا ہے میں اُسے اپنی حفاظت میں رکھتا ہوں۔ (گیتا)
- ذرا سی حوصلہ افزائی جادو کا اثر رکھتی ہے۔ (ماتا ریحانہ)
- ہر حال میں ہمیشہ اپنے آپ کو بلند اخلاق، بلند خیال اور بلند معیار ثابت کرو۔ (سوامی ویویکانند)
- اخلاق سے درندوں اور قاتلوں کو بھی مطیع کر لیا جاتا ہے۔ (سوامی سارشدانند جی)
- جو بے مانگے تجھے اتنی نعمتیں دے رہا ہے وہ تجھے روزی سے مایوس نہ رکھے گا۔ (بھرتری ہری)

اُس کا اِس دنیا میں اور کوئی نہیں۔ نہ رشتے ناطے کا، نہ جان پہچان کا۔ یہی حالت شنکر کی بھی ہے۔ ایک گھر میں صرف دو انسان ہیں اور اُن کا اِتنی بڑی دُنیا میں کوئی اپنا سگا نہیں۔ کیا گزرتی ہے گی اُس کے دل پر!"

"جبھی تو وہ ہمارے ساتھ گُھل مِل گئے ہیں" رام لنگم نے کہا " انسان کو ایک ایسی ہستی کی تلاش ہوتی ہے جس پر وہ اپنی محبت اپنا پیار نچھاور کرے اور بدلے میں اُس کا پیار اور اُس کی محبت پائے۔ رشتے دار نہ سہی ایک مخلص دوست ہی سہی!"

"شانتا مجھے اپنی جان سے بھی پیاری سہیلی سمجھتی ہے!" کنّما نے فخر کے ساتھ کہا۔

ایک شام ـــــــ

شنکر جب دفتر سے گھر لوٹا تو اس کے چہرے پر گہری فکر اور تشویش کے آثار تھے۔

"میرا تبادلہ کلکتہ ہو چکا ہے اور مجھے آج ہی یہاں سے جانا پڑے گا" شنکر نے کمالِ افسردگی سے کہا۔ یہ سُن کر شانتا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

رام لنگم اور کمتا کے الطاف و عنایات کے تو شنکر اور شانتا ممنون تھے ہی۔ شنکر کے دل میں جاگزیں اِس کنبہ سے وابستہ اعتماد نے اُسے ایک اہم فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی۔

"کلکتہ پہنچنے کے فوراً بعد میں ایک اچھا سا گھر تلاش کر دوں گا اور گھر ملتے ہی شانتا کو بُلوا لوں گا۔ جب تک شانتا آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہے گی۔ اگر تین مہینے کے اندر مجھے کوئی اچھا سا گھر نہ ملا تو میں نتیجے کی پروا کئے بغیر واپس چلا آؤں گا۔ مجھے یقین ہے آپ لوگ شانتا کا ہر طرح خیال رکھیں گے۔"

شنکر اپنی بیوی شانتا کو رام لنگم کے ہاں چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا

انھیں دنوں کمتا کے گلشنِ حیات میں پہلی کلی چٹکنے والی تھی۔ شانتا نے گھر کا سارا کام کاج اپنے سر لے لیا۔ کمتا کو معمولی سے معمولی کام نہ کرنے دیتی۔ اُسے آرام کرنے کی ہدایت کرتی۔ کچھ دنوں کے بعد شانتا پر سارا گھر چھوڑ کر کمتا میکے چلی گئی۔

"اپنی گود بھرتے ہی مجھے خبر کرنا نہ بھولنا! اور ہاں زچگی کے دس دن بعد فوراً چلی آنا۔ تم نہ ہوگی تو میرا دل ایک پل نہ لگے گا۔"

شانتا کی آواز رُندھ گئی تھی۔

اُس کی آنکھوں کے پیالے چھلک پڑے تھے۔

کمتا کے چلے جانے کے بعد شانتا کی ذمّے داریاں اور بڑھ گئی تھیں گھر کی دیکھ بھال اور کام کاج کے ساتھ ساتھ رام لنگم کی دیکھ بھال بھی اب اُسی کو کرنی پڑتی تھی۔

اب ——!

شانتا رام لنگم ہی کے گھر میں رہنے لگی ہے اور اُس کے ساتھ اُس کے حُسن کی تجلّی بھی! —— گھر میں ایک تنہائی کا احساس بھی اُجاگر ہو چکا ہے۔ رام لنگم اب زیادہ تر گھر ہی پر رہنے لگا ہے —— شانتا اور رام لنگم —— شانتا کے محشر بداماں اور فتنہ ساماں حُسن نے رام لنگم کے دل میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ جس طرح مقناطیس لوہے کے ذرّات کو اپنی فطری کشش سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اُسی طرح شانتا اپنی کہربائی کشش سے رام لنگم کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔ شانتا کسی گہری ندی کی طرح خاموش اور پُرسکون تھی۔

کمتا کے میکے سے خبر آئی کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ رام لنگم فوراً سسرال پہنچا اور گھر لوٹ کر شانتا سے کہنے لگا "بچہ ہو بہو ماں کی تصویر ہے!" وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ شانتا کے چہرے پر بھی مسرّت کی کرنیں جگمگا اٹھیں۔

"ہاں شانتا! سبھی تمھیں پوچھنے لگے کمتا پوچھنے لگی میں تمھیں بھی اپنے ساتھ کیوں نہ لیتا آیا۔ تم گھر میں اکیلی کیسے رہ سکو گی اور وہ بچے! پریشان کر دیا ہوگا شیطانوں نے۔ سب کی زبان پر یہی ایک سوال —— شانتا کو بھی ساتھ کیوں نہ لیتے آئے؟" شانتا کے چہرے پر اُس نے اپنی نظریں جما دیں۔ شانتا میں وہ کون سی خوبی ہے جس سے وہ سب کے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ لوگوں کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لینا معجز نمائی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

اپنی تعریف کے چرچے سُن کر شانتا کا سینہ مسرّتوں سے پھولنے لگا۔ دوسرے لمحے اُس کے لبوں سے ایک دبی سی آہ نکل گئی "کیوں؟" اِس سوال کا جواب صرف شانتا کے پاس تھا۔

کیا اُسے اپنے قریبی رشتے داروں کی کمی کا خیال آنے لگا تھا؟ کیا اُس کے دل پر بہت دُور ملازمت کرتے ہوئے اپنے شوہر کا خیال کچو کے لگانے لگا تھا؟ کیا وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کب تک وہ اپنی زندگی کے دن اِس طرح تنہا گزارے گی؟

بخار کا اثر شانتا پر کئی دنوں تک رہا —— بخار چڑھتا اور اُترتا رہا۔ رام لنگم نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور وہ گھر ہی پر رہنے لگا تھا۔

"میں دو تین دن میں اچھی ہو جاؤں گی۔ آپ میری وجہ سے دفتر سے غیر حاضر نہ رہئے۔" شانتا نے کئی بار کہا۔ لیکن رام لنگم نے ایک نہ مانی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اُس نے کچن میں قدم رکھا اور شانتا کے لئے اپنے ہاتھوں سے کافی تیار کی۔ چولھا جلانے کے لئے اُس نے لکڑیوں پر بہت سا مٹی کا تیل اُنڈیل دیا تھا اور کئی دیا سلائیاں جلا دی تھیں۔ چولھے سے اُٹھتے دھوئیں سے اُس کی آنکھیں لال ہو جاتیں اور اُن سے پانی بہنے لگتا۔ کھانسی کا ایک دورہ بھی پڑ جاتا۔ رام لنگم کی اِن باتوں کا وہ دلچسپی سے مطالعہ کر رہی تھی۔ ان باتوں میں شانتا کو ایک ناتجربہ کار لیکن پُرخلوص انسان کا جذبۂ خدمت نظر آیا۔ اُس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم آگیا۔ ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ بستر پر لیٹی ہوئی وہ رام لنگم اور اُس کے خلوص کو دیکھتی اور بے حد متاثر ہوتی رہی۔

پانچ دن کے بعد شانتا کا بخار اُتر گیا۔ پھر بھی رام لنگم مُصر تھا کہ وہ کام کاج کرنے میں پوری احتیاط برتے۔ شانتا کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ گھر کے کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹاتا۔ شام کو دفتر سے سیدھا گھر چلا آتا۔

ایک صبح وہ اپنی میز پر رکھے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑا اپنے اُلجھے بالوں کی ایک سرکش لٹ کو سُلجھانے میں مصروف تھا۔ کئی کوششوں کے باوجود بال اُس کی مرضی کے مطابق جم نہیں پا رہے تھے۔ جھنجلا کر اُس نے کنگھا پٹک دیا۔ اِس کے ساتھ ہی بالوں کی ایک لٹ اُس کی پیشانی پر لہرانے لگی۔ جبھی جھاڑو لگانے کے لئے شانتا کمرے میں داخل ہوئی۔ شانتا کی آمد سے بے خبر رام لنگم بال سنوارنے میں منہمک تھا۔ شانتا نے میز کے قریب رام لنگم کی قمیص کا ایک بٹن گرا پایا۔ اُس نے بٹن اُٹھا لیا اور اُسے میز پر رکھتے وقت ایک ثانیے کے لئے اُس کی نگاہیں آئینے میں منعکس رام لنگم کے چہرے کے پُرکشش نقوش میں کھو گئیں۔ اُن نقوش میں شانتا کو ایک دلکشی اور جاذبیت محسوس ہونے لگی۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ آئینے کی شفاف سطح سے خود اُس کا سایہ بھی اُسی کو دیکھ رہا ہے۔ اپنی اِس غیر شعوری حرکت پر دونوں چونک پڑے۔ شانتا کے چہرے پر شفق کی رنگینی چھا گئی تھی۔ نگاہیں نیچی کئے وہ اُسی لمحے چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اور ـــــــ

رام لنگم آئینے کے اُس خالی حصّے کو دیکھنے لگا جہاں ایک لمحہ پہلے ایک حسین سایہ لہرایا تھا اور اب جہاں ایک خلا پیدا ہو چکا تھا۔ اُس کی نگاہیں آئینے پر جم گئیں۔ آئینے کی سطح پر اُس کے چہرے کے نقوش واضح طور پر نمایاں تھے۔ اُن نقوش کی خوبصورتی اور دلکشی کا احساس اُسے پہلی بار ہوا۔ وہ ابھی جوان ہے ایسا احساس اُس کے ذہن میں بیدار ہوا۔ وہ ابھی جوان ہے۔ جوان ہی نہیں خوبرو اور صحت مند بھی! اُس کے اس احساس کو جذبۂ خود بینی نے تقویت بخشی۔ آئینے نے غیر ارادی طور پر اُس کی توجہ اُس حقیقت کی طرف مبذول کی جسے وہ یکسر بُھلا چکا تھا۔

اُس دن دفتر کے کاموں میں اُس کا دل ذرا بھی نہ لگا۔ اُس کے دل و دماغ پر شانتا کے حسین چہرے کے دلکش نقوش چھائے ہوئے تھے۔ وہ نقوش جنھیں دیکھ کر آئینہ بھی مُسکرا اٹھا تھا۔ اُس کی خوبصورت کالی آنکھیں اُس کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ اُن آنکھوں کی گہرائی کا تصوّر کرتا تو ایک کپکپی سی اُس پر طاری ہو جاتی۔ خیالات کے اُمڈتے سیلاب کو وہ روک نہ سکا۔

شام کو دفتر سے گھر لوٹ کر وہ سیدھا اُس آئینے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ اُس نے نہ کپڑے تبدیل کئے اور نہ مُنہ ہاتھ ہی دھویا۔ پیشانی پر سے پسینے کی بُوندوں کو تولیے سے پونچھا اور وہیں ایک کرسی پر کوئی رسالہ ہاتھ میں لئے بیٹھ گیا اور سرسری طور پر ورق گردانی کرتا رہا۔ کسی کہانی کا درمیانی حصّہ پیشِ نظر تھا۔ کہانی کار نے کسی شاعر کی نظم کا ایک بند بھی کہانی میں شامل کر لیا تھا۔ وہ اُسے با آوازِ بلند پڑھنے لگا۔

تمھارے حُسن نے میرے ہوش و حواس گُم کر دیئے ہیں
اُس شرابِ کہنہ کی طرح جو دو آتشہ کا اثر رکھتی ہو!

نظم کے اِس بند کو وہ جوں جوں دُہراتا اُس پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ یہاں تک کہ اُسے اپنی آواز کی بازگشت اپنے دل کے نہاں خانے میں سُنائی دینے لگی۔

شانتا کمرے میں داخل ہوئی تو آہٹ سُن کر وہ پیچھے کی طرف مُڑا۔ اُس کے ہاتھ میں کافی کا گلاس تھا۔ وہ سر جُھکائے نظریں نیچی کئے اُس کے قریب پہنچی اور گلاس اُس نے آگے بڑھایا۔ نہ جانے کس کے ہاتھ میں یکا یک رعشہ سا پیدا ہو چلا تھا۔ المونیم کا گلاس ایک آواز کے ساتھ نیچے گر پڑا اور اُس کے ساتھ ہی کافی کے چند دھبّے دونوں کے کپڑوں پر پڑ گئے۔

کافی کے دھبّوں کو فوراً ہی پانی سے صاف کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ چھُٹتے نہیں۔ اِس خیال سے نیچے گرے ہوئے گلاس کو اُٹھا کر شانتا کمرے سے باہر جانے لگی۔

"شانتا!" رام لنگم غیر شعوری طور پر پُکار اُٹھا۔ اُس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"جی؟" شانتا نے ایک دلکش ادا کے ساتھ پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

رام لنگم کے پاس شانتا کے سوال کا کوئی تشفّی بخش جواب نہ تھا۔ اپنی اِس غیر ارادی حرکت پر اُسے ایک ہلکی سی پریشانی کا احساس ہوا لیکن بہت جلد اُس نے اپنی اضطراری حالت پر قابو پا لیا۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا" اُس نے آہستہ سے کہا "کہ میرے لئے دوبارہ کافی لانے

کی ضرورت نہیں۔ تمہارے حصے کی کافی میں پی لوں یہ مجھے پسند نہیں میں کسی ہوٹل میں پی لوں گا۔"

"ہوٹل میں کیوں — یہاں گھر میں ابھی کئی گلاس کافی ہے۔"

دوسرے لمحے وہ کافی کا دوسرا گلاس لے کر آگئی۔ غالباً وہی کافی جو اُس نے اپنے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ کافی کا ذائقہ بتا رہا تھا کہ اُس میں دودھ اور شکر کی مقدار میں نمایاں کمی ہے — آج ہی رام لنگم پر یہ راز آشکارا ہوا کہ اتنے دنوں سے شانتا اپنے لئے ایسی ہی کافی تیار کرتی ہے تاکہ دودھ اور شکر زیادہ خرچ نہ ہو جائے!

رات نے دن کے رُخ پر تاریکی میں دبیز چادر ڈال رکھی تھی — فہم اور ادراک پر نیند کی کیفیت طاری تھی — آسمان پر ماہتاب اپنی تمامتر تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ کائنات پر پُراسرار خیالات کا ایک سُنہرا جال بکھیرے، احساسات میں شدت اور کیف و مستی پیدا کرنے والی خاموش کرنوں کا جال!

رام لنگم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ان سے ہو کر کمرے میں آتی ہوئی زرتار چاندنی ٹھنڈک اور کیف و سرور سے تہی دامن تھی۔ آج چاندنی آگ برسانے لگی تھی۔ آج چاندنی میں سُورج کی تمازت سے بھی زیادہ حدّت اور حرارت تھی۔ ہوا تھم گئی تھی۔ کمرے میں پھیلے ہوئے گہرے سکوت نے اُس کے اندر ایک غیر واضح اور پریشان کُن شوق کو اُجاگر کر دیا تھا۔ وقت اپنی رفتار بھول کر رینگنے لگا تھا۔ رام لنگم اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ پُورے چاند کی روشنی میں اُس نے دیکھا گھڑی کی سوئیاں زبانِ بے زبانی سے آدھی رات گزر جانے کا اعلان کر رہی ہیں۔ اُس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اُس کی نظریں مقابل کے کمرے پر جم گئیں۔

کمرہ تاریک تھا۔ کمرے میں چاندنی نہیں آسکتی تھی۔ دیوار پر آویزاں ایک چھوٹے سے ٹمٹماتے لیمپ کی مدھم روشنی جگنو کی چمک کی طرح ایک محدود دائرے میں جگمگا رہی تھی۔ کمرے کی تاریکی دلہن بنی تھی۔ اس کمرے کے ایک کونے میں شانتا ایک کھردری چٹائی پر نیند سے ہمکنار تھی لیکن اُس کا حُسنِ فتنہ ساماں اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ بیدار تھا!

رام لنگم پلنگ سے نیچے اُترا۔ آہستہ سے خواب خرامی کے شکار کی طرح چلتا ہوا شانتا کے کمرے میں داخل ہوا۔ شانتا کے بستر کے قریب دیوار سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بڑی الماری کھڑی تھی۔ جوں جوں الماری کی طرف وہ آگے بڑھتا اُسے محسوس ہوتا، ایک غیر مرئی چھری اُس کے حلق کو تیزی سے چھیدے چلی جا رہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ الماری تک پہنچ ہی گیا۔ اب بستر الماری سے کچھ ہی دُوری پر تھا۔ رام لنگم نے محسوس کیا کہ اُس کے آگے کی طرف بڑھتے ہوئے پہلے قدم کے ساتھ ہی چھری اُس کے دل میں پیوست ہو جائے گی اور دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

ٹھن —!

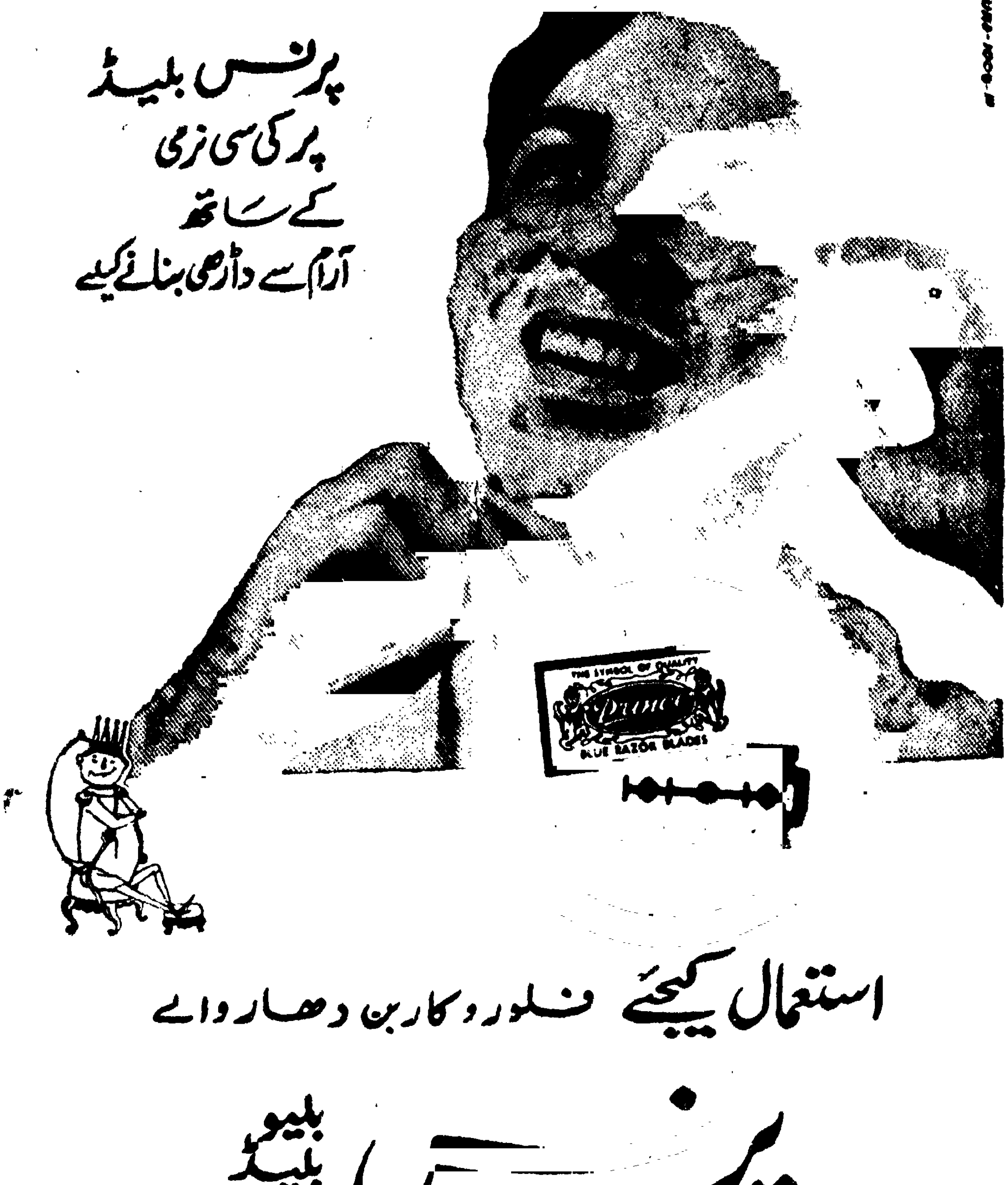
المونیم کا ایک گلاس جس میں تھوڑا پانی تھا اُس کے پیر کی ٹکر سے آواز کے ساتھ گر پڑا۔ بہتا ہوا پانی اُس کے قدموں کو چھونے لگا۔ وہ چونک پڑا اور دوڑ کر بڑی الماری کی آڑ میں چھپ گیا۔

شانتا نیند سے جاگ پڑی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ گلاس کے لڑھکنے کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی شانتا کے کانوں میں نہایت آہستگی کے ساتھ سنائی دی تھی۔ اُس نے گلاس کو غور سے دیکھا۔ جھک کر زمین پر گرے ہوئے پانی کو دیکھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور آہستہ آہستہ بستر پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی نگاہیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی کا پھر جائزہ لینے لگیں۔ اُسے الماری کی آڑ میں چھپے کھڑے رام لنگم کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ دہلیز پر رُک کر اُس نے رام لنگم کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اُس کے پلنگ پر نگاہیں ڈالیں۔ پلنگ خالی تھا۔ کمرے میں در آئی چاندنی اُس خلا کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

چند لمحوں کے لئے وہ دہلیز سے لگ کر مبہوت سی کھڑی رہی۔ اُس نے دیکھا باہر سے داخل ہوتی ہوئی چاندنی کی کرن میں ایک عجیب پیکر تشکیل پا چکا تھا۔ اُس کی نگاہیں پھر رام لنگم کے خالی پلنگ پر جم کے رہ گئیں — اتنی رات گئے وہ کہاں ہو سکتا ہے؟

رام لنگم اونچی الماری کی آڑ سے آگے نکل آیا اور شانتا کی طرف بڑھنے لگا۔ قدموں کی آہٹ پا کر وہ پلٹی۔ وہ اُس کے قریب پہنچ کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ملگجی سی چاندنی میں ایک لمحے کے لئے دونوں کی نظروں نے ایک دوسرے کی نگاہوں میں پناہیں ڈھونڈیں۔

دوسرے لمحے شانتا نے اپنی نظریں نیچی کر لیں — رات کی سُلگتی تنہائی میں دونوں اسی طرح چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے کے سامنے چُپ چاپ ایک دوسرے کا راستہ روکے کھڑے رہے۔ ماحول پر ایک سحر سا طاری ہو چکا تھا۔ یکایک چاند کی ایک شوخ کرن نے اُس کمرے میں پھیلی تاریکی کو چھیڑ دیا۔ چھت کے کسی روزن سے چاند کی ایک کرن کمرے میں اُتر آئی اور بجلی کی ایک لکیر کی طرح شانتا کے سینے پر تھرک اُٹھی۔ شانتا نے اپنے سینے پر نظریں ڈالیں اور شرما کر اپنے جسم کو چھوئی موئی کی طرح سکیڑنے لگی۔ رام لنگم کی نظروں نے بھی شرارت کی۔ دونوں کی رگ و پے میں ایک برقی رو سی دوڑنے لگی۔ دونوں کسی فطری جذبے کی حدت کے تحت اُبلنے لگے — شانتا پر


پرنس بلیڈ
پر کی سی نرمی
کے ساتھ
آرام سے داڑھی بنانے کیلئے
THE SYMBOL OF QUALITY
Prince
BLUE RAZOR BLADES
استعمال کیجئے فلورو کاربن دھار والے
پرنس
بلیو
بلیڈ

[illegible]

[illegible] ۔۔۔۔۔ اور ہم جانتی ہیں وہ [illegible]

[illegible] پاس کے قریب سے گزرتا ہوا سینما لپک کر پہنچ [illegible] سے [illegible] دیا۔

شانتا نے آہستہ سے کر اپنے کانپتے ہاتھوں سے اُٹھا کر نیاپی چھتی تصویر کو [illegible] آنکھوں سے لگایا اور بوجھل قدموں سے اپنے بستر تک پہنچ کر اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

صبح کا سورج طلوع ہوا۔ تاریکی چھٹ گئی۔ رام سنگھ پہلے جیسے اب بھی [illegible] باقی تھا۔ وہ بدحواس سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے برعکس شانتا مطمئن اور پرسکون تھی۔ جیسے اس کی زندگی میں کوئی حادثہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ حسب معمول وہ [illegible] کے لئے کالج نہ گئی۔

"کیا آج کالج نہیں جانے کا ارادہ ہے؟" شانتا نے پوچھا۔

جواب میں رام سنگھ نے آگے بڑھ کر کالج کا بیگ اٹھا لیا اور ایک گھونٹ پانی [illegible] تھا کہ اس کے کانوں میں اپنے مکان کے سامنے تانگہ رکنے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے لمحے [illegible] ہاتھوں میں ایک ننھا سا بچہ سنبھالے اندر داخل ہوئی۔ بچہ اس [illegible] کی طرح [illegible] تھا۔ شانتا دوڑی ہوئی گئی اور بچے کو [illegible] کے ہاتھوں سے لیا پیار سے اسے اُٹھائے اور چومنے لگی۔ پھر اس نے ایک [illegible] کے ساتھ بچے کو رام سنگھ کے قریب لے جا کر پُرمسرت لہجے میں کہا "پتا! دیکھنا [illegible] کیسا پیارا ہے! آپ کا پوتا ہے" [illegible] شانتا کی [illegible] سے [illegible] تھی۔ اس کی ادا سرخوشی کا سرچشمہ تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دوسرا تانگہ گھر کے سامنے رکا اور شنکر [illegible] [illegible] سنبھالے گھر میں داخل ہوا۔ بچے کو اپنے سینے سے لگائے شانتا اپنے شوہر [illegible]

[illegible]

[illegible] ۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ ہم [illegible]

گھر میں پھیلی ہوئی سورج کی روشنی نے دیکھا، گھر کے ایک گوشے میں [illegible] بیٹھے ہوئے بچے پر [illegible] شفقتیں نچھاور کر رہے تھے۔ اُن کی [illegible] [illegible] کہ جیسے وہ دونوں کی محبت کو گہرا بنا دیا [illegible] کے [illegible] شانتا شنکر کی [illegible] تھی [illegible] سے آنسو رواں تھے۔

[illegible] کے بعد شنکر اور شانتا کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے

اور ۔۔۔۔۔

کالی کے وہ دھبے جو رام سنگھ کی دھوتی اور شانتا کی ساڑھی پر [illegible] وقت کی رفتار کے ساتھ مٹ گئے!!

(اکملی کی [illegible] کہانی سے)

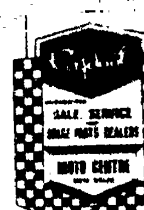


جہاں چاہیں جب بھی چاہیں

راجدوت پر جائیے

مصروف لوگوں کے لئے واحد موٹر سائیکل





سروس

دیش بھر میں ۲۸۰ شہروں میں زائد از ۱۰۰۰ فیکٹری ٹرینڈ مکینکس ہونے کی وجہ سے ٹپ ٹاپ سروس کی گارنٹی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ راجدوت کے ہر خریدار کو ۶ مہینے کی گارنٹی اور ۳ مفت سروس دی جاتی ہیں۔

کم خرچ

راجدوت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ایک میل جانے میں صرف ۴ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اس کم خرچی کے علاوہ ۹ بی ایچ پی، ۱۷۵ سی سی انجن کی وجہ سے یہ مزید تیز رفتار ہے۔

آرام

راجدوت کے شاک ابزرور بہت ہی آرام دہ ہوتے ہیں۔ سڑک کتنی خراب کیوں نہ ہو سفر مزے سے کٹتا ہے۔

تحفّظ

انوکھے سوئنگنگ آرم سس پینشن آگے اور پیچھے دونوں جانب و بڑے پہیوں کی وجہ سے گڑھوں و اونچی نیچی جگہوں پر بھی راجدوت آرام سے چلتا ہے۔

Rajdoot

تحفّظ اور آرام میں بے مثل

ایسکورٹس لمیٹڈ موٹر سائیکل ڈویژن، ۱۹/۶ متھرا روڈ۔ فرید آباد (ہریانہ)

غزلیں

آزاد گورداسپوری بی۔ اے

تسلی میں دے لو نگاہ ذوقِ نظر کو، نگاہیں ملانے کی کوشش نہ کرنا
زمانے کی تم پہ نگاہیں لگی ہیں یہاں تک تم آنے کی کوشش نہ کرنا

مسرت کے دامن میں ہے غم کی دنیا، ہے دھوکا ہی دھوکا خوشی کی تمنا
گلوں کا تو انجام معلوم ہوگا، کبھی مسکرانے کی کوشش نہ کرنا

بھرم ضبطِ غم کا ہے رکھنا ضروری یہی امتحانِ وفا کی ہے منزل
کریدے بھی کوئی اگر زخم دل کے تو آنسو بہانے کی کوشش نہ کرنا

خدا جانے کیا کیا کہے گا زمانہ خدا جانے رسوائیاں ہوں کہاں تک
ہمیں آزمانے کی حاجت نہیں ہے ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا

سنا ہے کہ آزاد یہ کہہ رہے تھے کسی سنگدل سے کسی بیوفا سے
مری آرزو سے مرے غم سے کھیلو مگر دل دکھانے کی کوشش نہ کرنا

سید شکیل دسنوی

بہاریں بھی رخصت ہوئیں تھک کے ہائے مگر تم نہ آئے مگر تم نہ آئے
مرے دل پہ چھائے خزاؤں کے سائے مگر تم نہ آئے مگر تم نہ آئے

تخیل کا ایواں، ہجومِ تمنا، مئے انتظار اور امیدوں کے ساغر
رہے منتظر رات محفل سجائے مگر تم نہ آئے مگر تم نہ آئے

یہ ٹھنڈی ہوائیں، گل و برگ رقصاں، روش در روش جشنِ فصلِ بہاراں
نظاروں نے کیا کیا ستم دل پہ ڈھائے مگر تم نہ آئے مگر تم نہ آئے

یہ شامِ جدائی، یہ بجھتا ہوا دل، امیدوں کی باقی نہیں اک کرن بھی
ہوئے کتنے گہرے مرے غم کے سائے مگر تم نہ آئے مگر تم نہ آئے

ستاروں کی آنکھیں بھی بوجھل ہوئیں اور فضاؤں کو بھی نیند آنے لگی ہے
شکیل اب بھی بیٹھا ہے آنکھیں بچھائے مگر تم نہ آئے مگر تم نہ آئے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

ہائے جنوں کے سخت مراحل — جتنے آساں اُتنے مشکل
وہ بھی کیا رودادِ محبت — جسمیں نہ تیرا ذکر ہو شامل
یا غمِ دوراں یا غمِ جاناں — اِسکے سوا کیا زیست کا حاصل
عالمِ عرفاں، اللہ اللہ — چشم بہ جلوہ، گام بہ منزل
اُن کو خبر کیا طوفانوں کی — جو ہیں ابھی آسودۂ ساحل
چاہے جدھر ہو رُخ اے جوہر
پاؤں اُٹھیں گے جانبِ منزل

طنزیہ

نئی مہابھارت

فکر تونسوی

اچانک میرے عشاق نے پکارا کہ اے سنجیدہ حال فکر تونسوی! تو نے جو یہ نئی مہابھارت لکھنا شروع کی ہے اسے صرف میدانِ جنگ تک کیوں محدود رکھتا ہے۔ اگر لکھنا ہے تو نئے مہابھارت کی کہانی شروع سے آخر تک لکھ! تاکہ کوروؤں کو عبرت اور پانڈوؤں کو کچھ بھی حاصل نہ ہو اور دھرم راج ان کے جسم اور فلسفے دونوں کو ہمالیہ کی برف میں جاکر دبا دے ——— عشاق کی آواز میں معقولیت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس لئے نئی مہابھارت کی کہانی کو میدانِ جنگ کے منظر سے پیچھے ہٹاکر آغاز پر لئے آتا ہوں۔ جہاں راجہ شانتنو . . .

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دہلی کے جنوب میں اوکھلا نہر کے پاس جہاں عاشق اور بے روزگار حضرات ڈوب مرنے کے لئے جایا کرتے تھے، ایک صاحب رہا کرتے تھے۔ جن کا اسمِ شریف راجہ شانتنو تھا۔ اُن کا پیدائشی نام دراصل شانتی رام تھا۔ لیکن جب بڑے ہوئے تو اوکھلا نہر سے مچھلیاں پکڑ پکڑ کر کھانے لگے تب سے ڈیل ڈول نکل آیا مست ہاتھی کی طرح جھوم جھوم کر چلا کرتے۔ بزدل ہمسایوں اور کمزور دوستوں اور خوشامدی ٹٹوؤں نے اُنھیں راجہ کا خطاب دے دیا۔ بلکہ اوکھلا کالج کے ہسٹری کے ایک پروفیسر نے (جسے شانتی رام آتے جاتے دھمکایا کرتا تھا) کئی تاریخی کتابوں کے مطالعے کے بعد اعلان کر دیا کہ شانتی رام نہ صرف راجہ ہے بلکہ اس کا اصلی نام راجہ شانتنو ہے کیونکہ اس کا سلسلۂ نسب چندر بنسی خاندان کے راجہ شانتنو سے ملتا ہے۔ ماتھے کا تیج (جو چاول، مچھلی، دودھ اور انڈے کھانے سے پیدا ہو گیا تھا) صاف بتا رہا ہے کہ اس تیج کے پیچھے ہستنا پور کا جغرافیہ پوشیدہ ہے۔

اس تاریخی انکشاف سے خوش ہو کر راجہ شانتنو نے ہسٹری کے اس پروفیسر کو نہ صرف ڈرانا دھمکانا بند کر دیا بلکہ اسے اپنے بیٹوں کی ٹیوشن پڑھانے پر بھی مامور کر دیا۔ ٹیوشن فیس دیتے وقت راجہ شانتنو انکم ٹیکس بچانے کی خاطر ایک گنا فیس دیتا اور پانچ گنا فیس پر دستخط کرا لیتا۔ یہ نکتہ راجہ شانتنو کو اُس کے کئی انکم ٹیکس افسر دوستوں نے بتایا تھا۔ اس طرح راجہ شانتنو بیک وقت چار قسم کے لوگوں کو دھوکا دیتا تھا۔ سرکار کو، ہسٹری کے پروفیسر کو، اپنے بیٹوں کو اور اپنے ضمیر کو ——— اُس کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ احباب نہ جانے مذاق سے یا سنجیدگی سے کہا کرتے تھے کہ راجہ شانتنو اپنے ضمیر کو دھوکا دے ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اُس کے پاس ضمیر ہی نہیں ہے۔

مگر اُس کے بولتے ہوئے مندر کے پجاری ہری ہرے ہرے رام کا بیان تھا کہ اگر راجہ شانتنو کے پاس ضمیر نہ ہوتا تو وہ ہر منگل وار کو مندر میں ماتھا ٹیکنے کے لئے نہ آتا۔ منگل وار شام کو راجہ شانتنو کے حلقے کے بہت سے لوگ اپنی چمکیلی کاروں پر سوار ہو کر شانتنو مندر ضرور جایا کرتے۔ منگل وار کو وہ کوئی ایسا کام نہ کرتے جس کی شاستروں میں ممانعت کی گئی ہو۔ مثلاً کلب میں جاکر جوا کھیلنا، ہسکی پینا، مانس کھانا، حتیٰ کہ پیاز تک نہیں کھاتے تھے ——— یہ سارے کام وہ ہفتے کے باقی دنوں میں کرتے تھے کیونکہ باقی دنوں کے متعلق شاستروں میں ان کاموں کی فراخ دلانہ اجازت دی گئی تھی۔

راجہ شانتنو چندر بنسی خاندان سے تھا یا نہیں: اس کو متنازعہ سوال بنانا فضول ہے، کیونکہ اُن دنوں جس کی لاٹھی اُس کا چندر بنسی خاندان ہو جاتا تھا۔ اسے چندر بنسی خاندان کی بدقسمتی سمجھئے یا خوش قسمتی کہ راجہ شانتنو نے اوکھلے کے اردگرد کے بہت سے بنجر علاقے پر ناجائز قبضہ کر لیا (بعد میں جھک مار کر حکام نے سرکاری کاغذوں میں اُسے جائز قبضہ قرار دے دیا) آدمی بے حد ذہین، طرار، چالاک، فتنہ ساز، ہوشیار بلکہ ناہنجار تھا۔ اس لئے شرفاء اُس سے تھر تھر کانپتے تھے۔ اُن شرفاء کے تھر تھر کانپنے کی ایک وجہ یہ بھی کہ شرفاء غلط فہمی سے اپنی بے عزتی کو عزت اور عزت کو بے عزتی سمجھا کرتے تھے۔ تھر تھر کانپ کر وہ اپنی عزت کی حفاظت کر لیا کرتے تھے۔

علاقے کے شرفاء کے اسی رویئے سے خوش و خرم ہو کر راجہ شانتنو نے جی بھر کر

ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ اُن دنوں جو آدمی ظلم ڈھاتا، لوگ کہتے یہ ترقی کر رہا ہے۔
چنانچہ اس نے جس بہت بڑے علاقے پر قبضہ کیا، اُسے تین حصّوں میں تقسیم کر دیا۔

۱۔ ایک حصّے پر کچھ چھوٹے سکیل کے اور کچھ بڑے سکیل کے کارخانے تعمیر کئے۔
۲۔ ایک حصّے پر مختلف پھلوں کے باغات لگوائے (ایک باغ میں مچھوا خانہ بھی کھلوایا)
۳۔ ایک حصّے پر ایک کالونی بنوائی جس کے مکان بھاری بھرکم کرائے پر چڑھا دیئے۔

اِس کالونی کے سب سے دلکش اور حسین حصّے پر اُس نے اپنے دو بنگلے تعمیر کئے۔
اِن بنگلوں کا رُخ جمنا ندی کی طرف تھا۔ اِس سے پہلے جمنا ندی کے کنارے پر یا تو شمشان گھاٹ بنا کرتے تھے اور یا غلیظ سادھوؤں کے ڈیرے اور کٹیائیں۔ چندر بنسی خاندان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جمنا ندی کے کنارے دو خوبصورت عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اِس سے جمنا کی پوترتا جو خطرے میں پڑ گئی تھی، کسی حد تک محفوظ ہو گئی۔ راجہ شانتنو اپنے دونوں بیٹوں بھیشم اور وچتر کے ساتھ ہر صبح جمنا ندی کے کنارے سے اُبھرتے ہوئے سورج دیوتا کی پوجا کیا کرتا۔ چندر دیوتا کی اولاد سورج دیوتا کی پوجا کرے، یہ بات شاستروں کے اصولوں کے خلاف تھی۔ لیکن اُن دنوں یہ رواج تھا کہ ہر آدمی چڑھتے سورج کی ہی پوجا کیا کرتا تھا۔ اِس کے علاوہ اُن دنوں چونکہ شاستروں کی پرنٹنگ گھٹیا چھاپے خانوں میں کرائی جاتی تھی جس سے وہ پڑھے نہیں جاتے تھے اور نہ پڑھے جانے کے باعث اُن کے اصولوں کا علم بھی کسی کو نہیں ہوتا تھا۔

یوں تو راجہ شانتنو کی پہلی بیوی بھی تھی۔ لیکن وہ صرف پرائمری پاس تھی۔ اُس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ غریب گھرانے کی بیٹی تھی اور دوسری یہ کہ اُن دنوں غریبوں میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ جن دنوں راجہ شانتنو کے ساتھ اُس کا بیاہ ہوا تھا۔ راجہ شانتنو خود بھی خدا کی اُس مخلوق سے تعلق رکھتا تھا جسے پچھلے جنم کی سزا کے طور پر غریب گھرانے میں پیدا کیا جاتا تھا۔ لیکن راجہ شانتنو بعد میں اپنی جودتِ طبع کے باعث کرنسی نوٹوں میں کھیلنے لگا تو اچانک اُسے خیال آیا کہ اُسے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔ میرے اِتنے بینک بیلنس کے ہوتے ہوئے میری بیوی پرائمری پاس ہے اور غریب گھرانے سے آئی ہے۔

چنانچہ ایک دن وہسکی کے نشے میں اُس نے غریب کی بیٹی کو چابک سے پیٹا۔
دوسرے دن اُس نے اُسے بیک وقت دو چابکوں سے پیٹا۔
تیسرے دن اُس کی پہلی بیوی ودھوا آشرم میں داخل کر دی گئی۔
اور چوتھے دن جب راجہ شانتنو کلب میں بیٹھا اپنے احباب کے ساتھ بیوی سے یومِ نجات کا جشن منا رہا تھا کہ پنچم اسٹیٹ کے وزیر شری گنڈیرا سنگھ جی نے (جس پر کرپشن کے تین مقدمے بنے ہوئے تھے۔ مگر پھر بھی وزیر بن کر عوام کے حقوق کی حفاظت کر رہا تھا) راجہ شانتنو کے ساتھ اپنا پیگ ٹکراتے ہوئے کہا: "راجہ شانتنو! میں نہیں چاہتا کہ تم لاولد مرو۔"

راجہ شانتنو نے کہا: "شٹ اپ! میں لاولد نہیں ہوں میرے ایک بیٹا بھیشم نامی موجود ہے۔"

"مگر وہ تو پہلی بیوی سے ہے اور رائل فیملی سے نہیں ہے۔ اِس لئے اُس سے تمہارا چندر بنسی کا خاندان نہیں چل سکتا۔ کیونکہ سوال یہ ہے کہ کیا وہ راجہ شانتنو کی اولاد کہلائے گا؟ معاف کرنا راجہ صاحب! اعلیٰ سوسائٹی کے نقطۂ نگاہ سے تم ابھی تک لاولد ہو بلکہ کنوارے ہو۔"

راجہ شانتنو نے اُداس ہو کر کہا: "تو بتاؤ، میں کیا کروں؟ یورپ دیش سے کوئی گوری گوری کنیا اغوا کر لاؤں یا خرید لاؤں یا سمگل کر لاؤں؟"

"چھی چھی چھی چھی!" پنچم دیش کے کُل مچھ وزیر گنڈیرا سنگھ نے کہا: "یہ دیش بھگتی کی سپرٹ کے خلاف ہے۔ اپنے دیش میں حسین سے حسین اور ذہین سے ذہین کنیائیں پڑی ہیں۔ تمہیں اُن سے بیاہ کرنا چاہیئے۔ لو، میں ابھی تمہارا تعارف ایک کافر ادا حسینہ سے کراتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وزیر گنڈیرا سنگھ نے بیرے کی مٹھی میں ایک روپے کا نوٹ دبا کر کہا: "اُس نیلے پردے والی کیبن کے اندر ایک لڑکی اور ایک لڑکا بیٹھے ہیں لڑکی کو ہمارا سلام بولو کہ گنڈیرا سنگھ یاد کرتا ہے۔"

یہ معلوم نہیں کہ اُس لڑکے نے بل ادا کرنے کے بعد کتنی ٹھنڈی آہیں بھریں۔ لیکن، دو منٹ بعد راجہ شانتنو کے سامنے ایک شعلۂ جوّالہ کھڑا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جیسے نغمے تیرتے تھے، اُس کے ہونٹوں سے سینک آتا تھا۔ ہاتھوں کو دیکھتے ہی بے اختیار چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔

راجہ شانتنو اُسے دیکھتے ہی موہت ہو گیا اور گنڈیرا سنگھ سے بولا: "اِس پگھلی ہوئی آگ کا نام؟"

"مس گنڈیری۔"

"یہ کس اسٹیٹ سے آئی ہے۔ کس کنبے سے تعلّق رکھتی ہے؟"

"کنبہ! ارے یہ میری سگی بہن ہے۔ یونیورسٹی میں تین بار فیل ہوئی۔ پاس ہوئے بغیر فرنگ دیش میں ہائر سٹڈی کے لئے چلی گئی۔ وہاں سے ککنگ کا فرسٹ کلاس ڈپلومہ لے کر آئی ہے۔ دیکھتے نہیں، کتنی سمارٹ ہے۔ انگریزی تو یوں فرفر بولتی ہے جیسے آپ ہندی فرفر بولتے ہیں۔ البتہ ہندی ذرا غلط بولتی ہے۔ بالکل ویسے جیسے آپ انگریزی ذرا غلط بولتے ہیں۔"

مس گنڈیری نے راجہ شانتنو کے وہسکی کے پیگ سے اپنا جوس کا گلاس ٹکرایا اور راجہ شانتنو نے لہرا کر کہا: "مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔"

"مگر مجھے منظور نہیں ہے" وزیر گنڈیرا سنگھ نے کہا۔

"شیم شیم!" راجہ شانتنو نے کہا۔ "آپ نے خود ہی یہ رشتہ تجویز کیا تھا۔"

"شیم شیم کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ مجھے یہ رشتہ اب بھی منظور ہے مگر ایک شرط پر کہ آپ کا ایک بیٹا ہے، جس کا نام بھیشم ہے۔"

"وہ تو ہے اور اُس کا نام بھی بھیشم ہے۔" راجہ شانتنو بولا۔ "وہ بڑا بہادر ہے اور قول کا پکا ہے اور ہمارے خاندان کو اُس پر ناز ہے۔"

گنڈیرا سنگھ دُکھی ہو کر بولا۔ "بس یہی ناز فخر تو ایک مصیبت ہے بھگوان نہ کرے کل آپ کی آنکھ بند ہو جائے۔"

"کون سی؟ بائیں یا دائیں" راجہ شانتنو نے مذاق کرنے کی کوشش کی تاکہ مِس گنڈیری کو متاثر کر سکے۔ چنانچہ مِس گنڈیری مُسکرا دی۔ راجہ شانتنو نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ اِس مُسکراہٹ پر اپنے کسی کارخانے کا نام ... کر دے گا۔

"دونوں آنکھیں"، پنچم دیش کا وزیر گنڈیرا سنگھ بولا۔ وہ بالکل نہیں مُسکرایا۔ کیونکہ وہ شاعر نہیں تھا، ریاضی داں تھا۔ "اور جب آپ کی دونوں آنکھیں بند ہو جائیں گی تو آپ کے اِس راج پاٹ، اِس مال و جائداد کا وارث کون بنے گا؟ کیا بھیشم؟ اور اگر بھیشم ہی بنے گا تو میری بہن مِس گنڈیری کی اولاد کا کیا بنے گا؟"

راجہ شانتنو اُس وقت تک مِس گنڈیری کی جلوہ طرازیوں سے اِس حد تک مدہوش ہو چکا تھا کہ شعلۂ حُسن کے سامنے اُس کی آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھیں۔ اُس نے فوراً ٹیلیفون اُٹھا کر بھیشم سے مِلایا اور اُسے صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔ بھیشم وِہسکی نہیں پیتا تھا۔ بلکہ بادام اور دودھ گھونٹ کر پیا کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے بادام اور دودھ کی مستی میں کہا۔

"پیارے ڈیڈی! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بھیشم اِتنا ہوس کار اور تنگ نظر ہے کہ اپنے ڈیڈی کی خاطر تھوڑی سی قُربانی کے لئے بھی تیار نہیں ہوگا۔ میں پرن کرتا ہوں کہ میں آپ کی جائداد کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔"

مسٹر بھیشم کے اِس اعلان پر گنڈیرا سنگھ اور مِس گنڈیری نے تالیاں بجا کر ہیپ ہیپ ہُرے کہا اور راجہ شانتنو نے اِس خوشی میں کلب کے منیجر سے کہا کہ ہمارے اکاؤنٹ میں کلب کے ہر ممبر کو سکاچ وِہسکی کا ایک ایک پیگ دیا جائے۔

جب پیگ تقسیم کئے جا چکے اور نوش کئے جا چکے اور کلب کے آرکسٹرا نے انقلابی ترانے گونجائے تو اچانک مِس گنڈیری کہنے لگی "ڈیل راجہ شانتنو! مسٹر بھیشم نے تو پرن کر لیا لیکن اگر اُس کی اولاد نے جائداد میں سے حصّہ بانٹنے کا مطالبہ کیا پھر تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

مِس گنڈیری کی دُور اندیشی پر گنڈیرا سنگھ بڑا خوش ہوا اور اُس نے بہن کی نیم عریاں پیٹھ پر تھپکی دی۔

راجہ شانتنو اپنی محبوبہ کی اِس سنگدلی پر قدرے اُداس ہو گیا۔ لیکن وِہسکی کے نشے کے سُرخ سُرخ ڈوروں میں دہکتی ہوئی مِس گنڈیری کے لئے وہ اِس وقت بڑے سے بڑا قدم اُٹھانے پر بھی تیار تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک بار پھر ٹیلیفون کیا اور اپنے بیٹے بھیشم کو اِس نئی صورتِ حالات سے آگاہ کیا —— بھیشم اب بور ہو گیا تھا جھلا کر بولا۔ "مائی ڈیئر ڈیڈی! آخر آپ اب چاہتے کیا ہیں؟ کیا آپ مِس گنڈیری سے شادی کے بغیر سچ مچ زندہ نہیں رہ سکتے؟"

"ہاں" راجہ شانتنو یاس اور اُمید کے ہچکولے کھاتے ہوئے بولا۔

"تو پھر گنڈیرا سنگھ جی سے کہہ دیجئے کہ میں عمر بھر شادی ہی نہیں کروں گا۔ نہ اولاد ہوگی، نہ جائداد میں حصّہ بٹائے گی اور بولو..."

کل یُگ میں ایسے مُجسّم قربانی بیٹے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ راجہ شانتنو کے لئے انوکھی بات تھی۔ گنڈیرا سنگھ اور مِس گنڈیری نے اعلان کیا کہ اِس نئی قُربانی کی خوشی میں اِس مرتبہ کلب کے ہر ممبر کو پنچم سٹیٹ کی طرف سے وِہسکی کا ایک ایک پیگ دیا جائے۔

آرکسٹرا نے دیش بھگتی کی ایک رسیلی دُھن بجائی اور کلب میں راجہ شانتنو اور مِس گنڈیری کی شادی کا اعلان کر دیا گیا۔

مِس گنڈیری کی نسل سے کس طرح مہابھارت کے دو اہم کردار دھرت راشٹر اور پانڈو پیدا ہوئے اور کِن جان جوکھوں سے پیدا ہوئے اِس کی بھی ایک الگ کتھا ہے۔ جو اگلے ادھیائے میں بیان کی جائے گی۔

غزلیں

اختر انصاری اکبرآبادی

ترس رہی ہوں میں اب جس طرح محبت کو
خدا کرے کبھی تو بھی پیار کو ترسے

جو پیار میں نے دیا ہے خدا کرے نہ ملے
تمام عمر محبت کو پیار کو ترسے

کسی کی بانہہ میں تجھ کو سکوں کبھی نہ ملے
تو بیقرار رہے اور قرار کو ترسے

میں منتظر نہ رہوں تیری اور تو بے چین رہوں
مرے جنوں کو، مرے انتظار کو ترسے

مری طرح نہ کوئی روئے تیری فرقت میں
تری نگہ، نگہِ سوگوار کو ترسے

عرش صہبائی

حشر سامانی ہے کیا کیا حشر سامانی کے بعد
اک پریشانی ہے پیدا ہر پریشانی کے بعد

اس طرح دل مطمئن ہے اشک افشانی کے بعد
اک سکوتِ بیکراں ہو جیسے طغیانی کے بعد

دشتِ غربت میں کسی جانِ تمنا کا خیال
جیسے آبادی نظر آتی ہے ویرانی کے بعد

رہبرِ کامل نہ تھا تو ہم بھٹکتے تھے مدام
زندگی نکھری ہے اب غم کی نگہبانی کے بعد

اہلِ دنیا کو تعجب ہے اگر تو اس پہ عرش
ہم ہیں کیوں زندہ مصائب کی فراوانی کے بعد

افضل منیر

راستے چپ ہیں اور گلی خاموش
پھر رہا ہے اک اجنبی خاموش

کون صحنِ چمن سے لوٹ گیا
پھول گم صم ہیں ہر کلی خاموش

موت نے اپنا وار کر ڈالا
زندگی دیکھتی رہی خاموش

بڑھتی جاتی ہے غم کی تاریکی
ہوتی جاتی ہے روشنی خاموش

ہے ترے انتظار میں کب سے
میرے آنگن میں چاندنی خاموش

ہو خبر یا نہ ہو اُسے عاجز
ہم تو کرتے ہیں بندگی خاموش

امین عالم راہیؔ ایم۔اے

سب کو دکھلایا نشانِ رہ گزر — خود ہے گُم کردۂ منزل مگر
جن کو سکھلایا مذاقِ زندگی — ہنس رہے ہیں وہ ہمارے حال پر
کس پہ ہوتیں یہ ستم آرائیاں — فرض کر لیجے نہ ہوتے ہم اگر
تم نظر آؤ گے اُتنے ہی حسیں — دیکھنے والا ہو جتنا خوش نظر
اپنے فن پر ناز راہیؔ کیوں نہ ہو
واہ رسے ہیں اور مری فکر و نظر

اندھیرا

ظفر اقبال سہسرامی

کرپا آف کیلاش پرشاد جیسوال، سرکار نیولہ، سہسرام

مکرمی! تسلیمات

"اندھیرا" اسی نوعیت کی ایک کہانی ہے جیسی اور کہانیاں آپ کو بھیجی گئی ہیں۔ اب تک کے خطوط سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ میرے قارئین کو اسی انداز کی کہانی پسند ہے۔ کاش! وہ خطوط میں آپ کو بھیج سکتا اور آپ بھی اندازہ لگا سکتے لیکن ان کی ... کرنا تو یہ ہے بس ہے اب بہ معلوم ہو رہا ہے۔ دوسری غیر ضروری چیزوں کے لئے اتنی سکت کہاں ہے! اور مسلسل بیماری نے میرے بہت سارے حوصلوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے اُن قدردانوں سے بھی معذرت خواہ ہوں، جن کے خطوط کا جواب نہ دے سکا۔ بیماری اور بیکاری نے بہت مجبور کر رکھا ہے ——— ایک بات اور، مجھے معلوم نہ تھا کہ میری کہانی "روح کا دامن بھیگا بھیگا" اتنی مقبول ہوگی۔ اس کہانی پر مجھے اب بھی خطوط مل رہے ہیں۔ "بیسویں صدی" ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر تخلیق کار کو اپنی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو جاتی ہے ——— آپ کی مصروفیت کا تو وہی عالم ہوگا بلکہ اور بڑھ گئی ہوں گی؟ آپ کی رائے اور خیریت کا منتظر۔

——— ظفر اقبال

پھر وہی بہاروں کی رُت تھی۔

اور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آرزوئیں۔ دل جو کبھی ویرانہ تھا، فصلِ بہار کی آمد نے سرسبز و شاداب بنا دیا تھا۔ وہاں شوخیاں تھیں، چلبلاہٹیں اور گنگناتی ہوئی اُمنگیں تھیں۔ کتنے دنوں کی جدائی کے بعد تو عاشی کا قرب ملا تھا۔ ایک عورت کا قرب! جو ٹوٹے ہوئے دل کو حوصلہ بخشتا ہے۔ درماندگی اور رنجیدگی میں اپنا سکون توڑ کے اُس کا ساتھ دیتا ہے۔ اُسی قرب کو پاکر وہ اپنے کتنے رنج و غم کو بھول گیا تھا۔

ایک رات وہ ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی میں میز پر جھکا نظم لکھ رہا تھا۔

"اکثر سوچتا ہوں میں ——— کہ
تیرے گیسوؤں کا سایہ
تیرے عارض کا گُلاب
ترے چہرے کی صباحت
تری آنکھوں کی شراب
بکھر نہ دیں میرے ہوش و حواس!"

"کیا ہو رہا ہے میرے سرکار؟"

عاشی ——— نیلے آکاش سے کہکشاں کی طرح ٹوٹ کر اس کے کمرے میں بکھر گئی۔ رنگ و نور پھیل گیا۔

"بھئی! شاعری کرتے وقت ٹوکا نہ کرو!"

"شاعرِ جمال! کس نظم کی آمد تھی؟"

"اب تو وہ اِک پیکرِ سیمیں میں ڈھل گئی!"

تنویر کے لہجے میں متانت اور آنکھوں میں شوخیوں کی چمک تھی۔ عاشی کچھ اس انداز میں ہنس پڑی کہ تنویر کو محسوس ہوا جیسے لطیف ہونٹوں سے رِستی ہوئی ہنسی نہ تھی، یاقوت کے سینے کو چیر کر ایک جھرنا پھوٹ پڑا تھا۔ اُس کی زندگی اِس جھرنے کے ترنم میں کھو گئی اور احساس کی کائنات شاداب ہو گئی۔

نظم کو دیکھتے ہوئے عاشی نے کہا۔

"یہ سب ٹکڑے مجھے ساحر کے سے لگتے ہیں؟"

"میں تو ساحر نہیں لگتا ہوں۔"

"میں نے دیکھا ہی نہیں۔"

"اور مجھے پہچانا ہی نہیں؟"

"آپ کو ؟" جوہی بہت ملی اور اس کے چہروں سے جھوم رہی تھی۔ "آپ

پہچاننے میں تو تو من مردانی دانی شدہ!"

"فارسی جانتی ہو؟"

"بلے! خوب می دانم!"

"بہت اچھی دانی!"

لفظ بہ لفظ پر عاشی ایک مسکراہٹ ریت کی تنویر نے تذبذب کا بہت سے دیکھتے

- اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ (قرآن پاک)
- اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ (قرآن پاک)
- مؤمن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پر بُری طرح اکڑی کرے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- علم بڑے بڑوں کو متواضع بناتا ہے اور رذیلوں کو متکبر۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)
- جو عقل سے محروم ہے وہ گویا دین سے بھی محروم ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

ہوئے کہا۔

"یہی وجہ تھی کہ آدم جنت میں بھی بے کیفی محسوس کرتے تھے!"

"گویا خدا کی سب سے زیادہ خوبصورت تخلیق عورت ہے؟"

عاشی نے آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھا۔ ناچتی ہوئی آنکھوں نے اس کے سامنے بت خانے کے رقصِ سبو کا منظر پیش کر دیا۔ اُس نے رندوں جیسی مستی میں جھومتے ہوئے کہا۔

"بے شک!"

"اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عاشی ہی ہو!"

کہتی ہوئی وہ کمرے سے نکل گئی اور دور دھیلے کنوارے بدن کی صندلیں مہک اس کے گرد پھیلی رہی

باہر رات ڈھلتی جا رہی تھی۔

ہر اک خیال کی تہہ سے عاشی کا شبیہ اُبھرتا آرہا تھا۔ سوچ کی موجیں جو سمٹ نہیں رہی تھیں، اُس سے زیادہ پھیل رہی تھیں۔ یہ موجیں لب ذہن سے ٹکرا کر "درد دوست" کو جگا رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ کمرے کے گھنے سکوت میں اس کے دل، دماغ اور احساس نے مل کر ایسی خاموشی اختیار کی جیسے رات کے پچھلے پہر میں عابدوں کی نماز ہو!

عاشی اُس کے لئے نئی نہ تھی۔

اور نہ زندگی کے کسی موڑ پر اُسے اجنبی کی طرح ملی تھی۔ عاشی تو اُس کی پڑوسن تھی۔ اُس کا عاشی کا ساتھ لڑکپن سے رہا۔ ایک ہی قوس میں دونوں کی حیات گھوم رہی تھی اور لڑکپن کے شوخ لمحے سالوں میں ڈھل رہے تھے۔ دل کا غیر محسوس گوشہ تمناؤں سے معمور ہو رہا تھا۔ عاشی اُنہیں تمناؤں کی تمہید اور اُن کی سرد راتوں کی خورشید ہو رہی تھی۔ تنویر کی آنکھوں میں ایک چاند اُتر کر خواب میں ڈھل رہا تھا۔ اس خواب کے زیر اثر اُسے لمحے جاوداں معلوم ہو رہے تھے۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا کہ خواب پگھل جائے گا۔ چاندنی ڈوب جائے گی اور رہی سہی ہنسی اپنی بہار کھو کر اس کی آنکھوں میں جھاڑی کی طرح سما جائے گی۔ یہ سب اُس وقت ہوا جب اُس نے میٹرکولیشن امتیازی نمبر سے پاس کیا اور اُس کے بھائی جان نے اُسے اپنی جائے ملازمت پر بلا کر وہیں ایک کالج میں داخلہ دلا دیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد تنویر نے پہلی بار ایک چوٹ محسوس کی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وقت کی رگ سے جو چشمہ رواں تھا، وہ رگ ہی مسدود ہو گئی۔ اب کوئی چشمہ نہیں۔ اب رہ گیا تھا۔ پہلے جس دل کی دھڑکنوں پر ایک آہٹ ملتی تھی اور سانسوں کی سرگوشیاں بڑھ جاتی تھیں، اب صرف دل دھڑک رہا تھا۔ کوئی آہٹ نہ تھی۔ سانس تھے سرگوشیاں نہ تھیں۔ خیالوں کی محراب بے نور ہو گئی تھی۔

ہر طرف ہانپتا کانپتا سناٹا!

ہر طرف بے کسی کا پہرہ۔

یاس کا عالم اور جدائی کے غم کا گہرا احساس!

اس احساس میں پڑا اکثر وہ سوچتا۔ عاشی کی وہ رفاقت نہ تھی ایک عذاب تھا۔ وہی عذاب مجبوری کے رنگ میں اب بکھر رہا تھا۔ اُسے انگریزی نظم کا وہ ٹکڑا ابھی یاد آتا جسے تنہائی میں وہ گنگنانے لگتا ——

میں ایک ایسی نورانی رات کے ساتھ رہ چکا ہوں

جس کے جان سیار اُجالے میں چہل قدمی کرتا تھا

وہ رات میں بہت پیچھے چھوڑ آیا۔ ——

اُجالے کا دل ڈوب چکا تھا ظلمت کی پرچھائیاں بڑھ گئی تھیں۔ بھائی جان

[redacted]

کی دلجوئی اور بھائی کی محبت اُس کے مجروح دل کا مداوا تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے وہ خاموش بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔

کتنی حسین چاندنی راتیں گزر گئیں اور کتنے بہاروں کے دن بیت گئے۔ عاشی دل میں جراحت کی طرح اُتری۔ یاد وفا کے نشتر ٹوٹے۔ خون ٹپکا لیکن اپنی [illegible] آزردہ حالیوں کو اُس نے [illegible] ان میں سمیٹے پہاڑ سی مدت کو گزار رہا تھا۔

اس دوران میں دو ایک بار شنو کو گھر جانے کا موقع ملا لیکن عاشی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اپنے ماموں کے پاس گئی ہوئی تھی۔ زندگی زمانے سے تڑپا گئے تھے اور آرزو کا لہو پیتے ہوگا اُسے معلوم نہ تھا بے رحم وقت کا یہ بھی ناز اُٹھانا پڑا۔ اُسے رہ رہ کر عاشی پر غصہ آتا کہ دو سطروں کا ایک خط بھی نہیں بھیج سکی۔ یہ غصہ تو اُس وقت دور ہوا جب ملنے کے لئے اُس کی اماں آئی تھیں اور انھوں نے بتایا تھا کہ عاشی کے ابا کا انتقال ہوگیا!

شنو جانے کا خدشہ دل [illegible] تڑپ اُٹھا اور بالکل بچوں جیسے انداز میں اُس نے پوچھا

"عاشی تو بہت روتی ہوگی اماں؟"

"کیوں نہیں۔ اب بے چاری کا سہارا ماموں ہی تو رہ گیا۔"

"تو اب وہ اپنے ماموں کے یہاں رہے گی؟"

"ابھی تو اُس کی ماں کا ارادہ اپنے ہی گھر رہنے کا ہے۔"

اس خبر پر اُسے کچھ اطمینان ہوا لیکن ہر سانس میں جب عاشی کا درد موجود ہو تو قرار کیسا اور اطمینان کہاں ——— درد زور پکڑنے لگا تو مغرب سے آنے والی ہوا کے جھونکوں میں رونے کی فریاد سنتی اور رات تو دل کی ہر دھڑکن میں عاشی کی ایک آواز ملی۔

"اتنی بڑی دوری کے کفن میں لپیٹ کر تم نے کس دل سے مجھے درد کے صحرا میں دفنا دیا!"

یہ آواز اُس کی روح کو پگھلا دیتی۔ اُس کی رگوں میں شرارے دوڑنے لگتے۔ لیکن وہ خاموش اپنی تعلیم میں لگا رہتا اور کتابوں کے اوراق اس طرح اُلٹ پلٹ کرنے لگتا جیسے کھوئی ہوئی زندگی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

امتحان ختم ہو چکا تھا۔

جو مدت اُس کے لئے وبالِ دوش بنی ہوئی تھی اور اُس کی بے خواب آنکھوں میں عاشی جلتے ہوئے جلووں کا سراب بنی دل میں ہلاکت و جراحت کا سامان پیدا کر رہی تھی۔ اُس مدت سے سبکدوش ہو کر اُس نے گہرے اطمینان کا سانس لیا اُسے اپنے امتحان کے نتیجے کی فکر نہ تھی، عاشی تک پہنچنے کی لگن تھی جو اُس کے خیالوں کی چمن آرائی کر رہی تھی۔ راتیں کبھی شبنم پوش ہو جاتیں اور دن گلابی گلابی۔ نفس نفس موجِ شراب میں ڈوبا ڈوبا اور ہر خیال موجِ شفق میں کھویا کھویا ہوگا۔ بہاروں کی رُت آتے ہی پت جھڑ سے درختوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ اُس کی روح کے ویرانے میں بھی پھول کھل اُٹھے تھے اور جیسے آنکھیں دلہن کی طرح سنوری سنوری دلہن کے دریچے سے جھانکنے لگی تھی۔ محو کیفیت کی [illegible] بار [illegible] سفر وہ اپنی [illegible] کی طرف آ رہا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی اور شام کے گہرے سرمئی سائے میں اُس نے اپنے خوابوں کو دیکھا۔ وہ خواب جو ابھی تک بدلتے موسموں اور زندگی کی شکستوں کے باوجود اپنی رعنائی کو سمیٹے ہوا تھا۔ کتنے دنوں کی چپ و خاموشی کو زبان ملی۔

"عاشی!"

- تم اگر چاہتے ہو تو دکھ کا خیال چھوڑ دو۔ دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو نفس کے متعلق سوچنا ترک کر دو (ڈاکٹر مارڈن)
- مسرت کسی کی جاگیر نہیں۔ کوئی اسے خرید نہیں سکتا۔ یہ تو ایسی شے ہے جس کی قیمت ادا کر کے کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے (ڈاکٹر مارڈن)
- حقیقی مسرت ایک ایسا پودا ہے جو ہر جگہ اُگتا ہے (... ڈوکالی)
- اگر آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو اپنے دوستوں پر بھروسہ رکھنے کی کوشش کیجئے۔ اگر آپ دوست چاہتے ہیں تو اپنے دشمنوں کو دوست بنا لیجئے (ڈیل کارنیگی)

عاشی کی تپتی ہوئی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ شبِ رنگ ملوت ماحول پر چھایا رہا۔ دھڑکنوں کی آہٹیں اور سانسوں کی سرگوشیاں جاگ اٹھیں روح کی خلوت خاموش میں جس عاشی کا قرب کسمسا رہا تھا۔ وہ حدِ فاصل توڑ بیٹھا تو شنو نے عاشی کو اپنی باہوں میں لے لیا۔ وہ سسک اٹھی۔ وہ بہکے بہکے جذبوں میں بولا۔

"تم اتنی ویران اور اداس ہو عاشی! اپنے سارے رنج و غم اور ساری پریشانی مجھے دے دو۔ تم شاداب ہو جاؤ عاشی!"

"اپنی زندگی میں آپ نے مجھے اس طرح بھلا دیا؟"

"نہیں عاشی! میں بھائی جان کی وجہ سے کچھ مجبور تھا اور اتفاق سے میں یہاں آیا تو تم نہیں تھیں۔ تم نے خط بھی تو نہیں لکھا۔"

"یہ سب ٹکڑے مجھے ساحر کے سے لگتے ہیں۔"

"میں تو ساحر نہیں لگتا؟"

"میں نے دیکھا ہی نہیں!"

"اور مجھے پہچانا ہی نہیں؟"

"آپ کو ہ بھری ہوئی فصل بادِ بہاراں کی چھیڑوں سے جھوم رہی تھی۔" آپ پہچاننے میں تو تن ہمہ داغ داغ شد!"

"فارسی جانتی ہو؟"

"بلے! خوب می دانم!"

"بہ ایں نمی دانم!"

لفظ "بہ" پر عاشی اپنی ہنسی روک نہ سکی۔ تنویر نے سنجیدہ نگاہوں سے دیکھتے

- اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ (قرآن پاک)
- اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ (قرآن پاک)
- مومن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پر بُری طرح افسری کرے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- علم شریفوں کو متواضع بناتا ہے اور رذیلوں کو متکبر۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)
- جو عقل سے محروم ہے وہ گویا دین سے بھی محروم ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

ہوئے کہا۔

"یہی وجہ تھی کہ آدم جنت میں بھی بے کیفی محسوس کر رہے تھے!"

"گویا خدا کی سب سے زیادہ خوبصورت تخلیق عورت ہے؟"

عاشی نے آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھا۔ ناچتی ہوئی آنکھوں نے اُس کے سامنے میخانے کے رقصِ سبو کا منظر پیش کر دیا۔ اُس نے رندوں جیسی مستی میں جھومتے ہوئے کہا۔

"بے شک!"

"اُس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عاشی ہی ہو!"

کہتی ہوئی وہ کمرے سے نکل گئی اور دو دسیلے کنوارے بدن کی صندلیں مہک اُس کے گرد پھیلی رہی

باہر رات ڈھلتی جا رہی تھی۔

ہر اِک خیال کی تہہ سے عاشی کا خیال اُبھرتا آ رہا تھا۔ سوچ کی موجیں جتنی سمٹ نہیں رہی تھیں، اُس سے زیادہ پھیل رہی تھیں۔ یہ موجیں لبِ ذہن سے ٹکرا کر "دردِ دوست" کو جگا رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ کمرے کے گھنے سکوت میں اُس کے دل، دماغ اور احساس نے معاً ایسی خاموشی اختیار کی جیسے رات کے پچھلے پہر میں عابدوں کی نماز ہو!

عاشی اُس کے لئے نئی نہ تھی۔

اور نہ زندگی کے کسی موڑ پر اُسے اجنبی کی طرح ملی تھی۔ عاشی تو اُس کی پڑوسی تھی۔ اُس کا عاشی کا ساتھ لڑکپن سے تھا۔ ایک ہی قوس میں دونوں کی حیات گھوم رہی تھی اور لڑکپن کے شوخ لمحے سالوں میں ڈھل رہے تھے۔ دل کا غیر محسوس گوشہ تمناؤں سے معمور ہو رہا تھا۔ عاشی اُنہی تمناؤں کی تمہید اور اُس کی سرد راتوں کی خورشید ہو رہی تھی۔ تنویر کی آنکھوں میں ایک چاند اُتر کر خواب میں ڈھل رہا تھا۔ اُس خواب کے زیرِ اثر اُسے لمحے جاوداں معلوم ہو رہے تھے۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا کہ خواب پگھل جائے گا۔ چاندنی ڈوب جائے گی اور ہری ہری رُت اپنی بہار کھو کر اُس کی آنکھوں میں جھاڑی کی طرح سما جائے گی۔ یہ سب اُس وقت ہوا جب اُس نے میٹرکولیشن امتیازی نمبر سے پاس کیا اور اُس کے بھائی جان نے اُسے اپنی جائے ملازمت پر بُلا کر وہیں ایک کالج میں داخلہ دلا دیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد تنویر نے پہلی بار ایک چوٹ محسوس کی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وقت کی رگ سے جو چشمہ رواں تھا، وہ رگ ہی مُردہ ہو گئی۔ اب کوئی چشمہ نہیں، سراب رہ گیا تھا۔ پہلے جس دل کی دھڑکنوں پر اِک آہٹ ملتی تھی اور سانسوں کی سرگوشیاں بڑھ جاتی تھیں، اب صرف دل دھڑک رہا تھا۔ کوئی آہٹ نہ تھی۔ سانس تھے سرگوشیاں نہ تھیں۔ خیالوں کی محراب سے نُور ری ہوتی تھی۔

ہر طرف ہانپتا کانپتا سناٹا۔

ہر طرف بے کسی کا پہرہ۔

یاس کا عالم اور جُدائی کے غم کا گہرا احساس!

اِس احساس میں پڑا اکثر وہ سوچتا۔ عاشی کی وہ رفاقت نہ تھی ایک عذاب تھا۔ وہی عذاب مجبوری کے رنگ میں اب بکھر رہا تھا۔ اُسے انگریزی نظم کا وہ ٹکڑا کبھی یاد آتا جب تنہائی میں وہ گنگنانے لگتا ______

میں ایک ایسی نُورانی رات کے ساتھ رہ چکا ہوں

جس کے جاں سپار اُجالے میں چہل قدمی کرتا تھا

وہ رات میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ______

اُجالے کا دل ڈوب چکا تھا۔ ظلمت کی پرچھائیاں بڑھ گئی تھیں۔ بھائی جان

کی دلجوئی اور بھابی کی محبت اُس کے مجروح دل کا مداوا تو نہیں کر سکتی تھی۔ اِس لئے وہ خاموش بُجھا بُجھا سا رہنے لگا تھا۔

اتنی حسین چاندنی راتیں گزر گئیں اور کتنے بہاروں کے دن چلے گئے۔ عاشی دل میں جراحت کی طرح اُتری۔ یادوں کے نشتر ٹوٹے۔ خون ٹپکاتیں اپنی ساری آزردہ حالیوں کو اُسی زخمی دل میں سمیٹے بہاڑ سی مدت کو گزار رہا تھا۔

اِس دوران میں دو ایک بار تنویر کو گھر جانے کا موقع ملا لیکن عاشی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اپنے ماموں کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ زندگی اس طرح تڑپ اُٹھے گی اور آرزو کا لہو ایسے ہوگا اُسے معلوم نہ تھا۔ بے رحم وقت کا یہ بھی ناز اُٹھانا پڑا۔ اُسے رہ رہ کر عاشی پر غصّہ آتا کہ دو سطروں کا ایک خط بھی نہیں بھیجتی! یہ غصّہ تو اُس وقت دُور ہوا جب ملنے کے لئے اُس کی اماں آئی تھیں اور انھوں نے بتایا تھا کہ عاشی کے ابّا کا انتقال ہو گیا!

اِس جانکاہ خبر سے وہ تڑپ اُٹھا اور بالکل بچّوں جیسے انداز میں اُس نے پُوچھا۔

"عاشی تو بہت روتی ہوگی امّاں؟"

"کیوں نہیں۔ اب بے چاری کا سہارا ماموں ہی تو رہ گیا۔"

"تو اب وہ اپنے ماموں کے ہاں رہے گی؟"

"ابھی تو اُس کی ماں کا ارادہ اپنے ہی گھر رہنے کا ہے۔"

اِس خبر پر اُسے کچھ اطمینان ہوا لیکن ہر سانس میں جب عاشی کا درد موجود ہو تو قرار کیسا اور اطمینان کہاں ——— درد زور تھوتے تو مغرب سے آنے والی ہوا کے جھونکوں میں اُسی کی فریاد سُنی اور راتیں تو دل کی ہر دھڑکن میں عاشی کی ایک آواز ملی۔

"اِتنی بڑی دُوری کے کفن میں لپیٹ کر تم نے کس دل سے مجھے درد کے صحرا میں دفنا دیا!"

یہ آواز اُس کی رُوح کو پگھلا دیتی۔ اُس کی رگوں میں شرارے دوڑنے لگتے۔ لیکن وہ خاموش اپنی تعلیم میں لگا رہتا اور کتابوں کے اوراق اِس طرح اُلٹ پلٹ کرنے لگتا جیسے کھوئی ہوئی زندگی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

امتحان ختم ہو چکا تھا۔

جو مدّت اُس کے لئے وبالِ دوش بنی ہوئی تھی اور اُس کی بے خواب آنکھوں میں عاشی جلتے ہوئے جلووں کا سراب بنی دل میں ہلاکت و جراحت کا سامان پیدا کر رہی تھی۔ اُس مدّت سے سُبکدوش ہو کر اُس نے گہرے اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے اپنے امتحان کے نتیجے کی فکر نہ تھی، عاشی تک پہنچنے کی لگن تھی جو اُس کے خیالوں کی چمن آرائی کر رہی تھی۔ راتیں کتنی سیم پوش ہو جائیں گی اور دن گُلابی گُلابی۔ ہر نفس موجِ شراب میں ڈوبا ڈوبا اور ہر خیال موجِ شفق میں کھویا کھویا ہوگا۔ بہاروں کی رُت آتے ہی پت جھڑ کے درختوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ اُس کی رُوح کے ویرانے میں بھی پھول کھل اُٹھے تھے اور بوہ جیسی اُمنگیں دلھن کی طرح سنوری دل کے دریچے سے جھانکنے لگی تھی۔ ممکن کیفیت کی لہلہاتی ہوئے بار میں سرگرمِ سفر وہ اپنی منزل کی طرف آ رہا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی اور شام کے گہرے سُرمئی سائے میں اُس نے اپنے خوابِ جمیل کو دیکھا۔ وہ خواب جو اپنی تمام تر لطافتوں اور نزاکتوں کے باوجود اپنی رعنائی کو کھوئے ہوا تھا۔ کتنے دنوں کی گہری خاموشی کو زبان ملی۔

"عاشی!"

- سُکھ چاہتے ہو تو دُکھ کا خیال چھوڑ دو۔ دولت حاصل کرنا چاہو تو افلاس کے متعلق سوچنا ترک کر دو۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- مسرّت کسی کی جاگیر نہیں۔ کوئی اسے اپنی کنیز بنا کر نہیں رکھ سکتا۔ یہ تو ایسی شے ہے جس کی قیمت ادا کر کے کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- حقیقی مسرّت ایک ایسا پودا ہے جو ہر جگہ اُگتا ہے۔ (سی۔ جی۔ ڈوکان)
- اگر آپ کو دشمن چاہئیں تو اپنے دوستوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کیجئے۔ اگر آپ دوست چاہتے ہیں تو اپنے دشمنوں کو سبقت لے جانے دیجئے۔ (ڈیل کارنیگی)

عاشی کی تپتی ہوئی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ خاموش رہی۔ شب رنگ سکوت ماحول پر چھایا رہا۔ دھڑکنوں کی آہٹیں اور سانسوں کی سرگوشیاں جاگ اُٹھیں روح کی مہوتِ خاموشی میں جس عاشی کا قُرب کسمسا رہا تھا۔ وہ حدِ فاصل توڑ بیٹھا۔ تنویر نے عاشی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ سسک اُٹھی۔ وہ بہکے بہکے جذبوں میں بولا۔

"تم اِتنی ویران اور اُداس ہو عاشی! اپنے سارے رنج و غم اور ساری پریشانی مجھے دے دو۔ تم شاداب ہو جاؤ عاشی!"

"اپنی زندگی میں آپ نے مجھے اِس طرح بھُلا دیا۔"

"نہیں عاشی! میں بھائی جان کی وجہ سے کچھ مجبور تھا اور اتّفاق سے میں یہاں آیا تو تم نہ تھیں۔ تم نے خط بھی تو نہیں لکھا۔"

"مجھے آپ کا دوسرا پتہ معلوم نہ تھا اور گھر کے پتے پر اس لئے نہیں بھیجا کہ یوں بھی کچھ اچھا نہیں سمجھتیں؟"

"قصور ہم دونوں کا ہے؟"

عاشی کے پژمردہ سے ہونٹوں پر تبسم اس طرح ابھرا جیسے ظلمتِ شب کو توڑتی سحر ابھری ہو۔ تنویر کی بھی چلبلی طبیعت شوخ ہونے لگی۔

"بھابی کو تم سے جلن کیوں ہے؟"

"صرف تمھاری وجہ سے!"

"تم سے چھیننا چاہتی ہیں؟"

"ان کا خیال تو یہی ہے!" اور ذرا مسکراتے ہوئے بولی "تمھارے نہ آنے سے وہ ہو کر یہی سمجھا کر تم ناراض سے ہو گئے"

"تمھارا خیال تو ٹھیک ہے!" اس نے سگریٹ سلگایا "ناراض تو نہیں، ایک جھجک ضرور ہو گئی ہیں!"

"پھر آئے کس لئے؟"

"اماں سے ملنے!"

اس نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ عاشی کی صورت پاسمین پر جذبات کی سلگتی اٹھی تھیں۔ اس نے چھیڑا۔

"تم بھی کسی کو چن لیتیں ——— کوئی جامِ جم تو نہیں ہے جامِ سفال ہے۔ رہتا ہے"

"تنویر!"

عاشی کے لہجے میں بے پناہ دکھ سمٹ آیا۔ اس کی نظریں جھک گئیں اور پلکوں نے گھنے ہو گئے۔ آنسوؤں کی بوندیں چھلک پڑیں۔ عاشی نے رندھی ہوئی آواز

بیتابیاں نصیب تھیں ورنہ ہم نشیں
یہ کیا ضرور تھا کہ تمھیں پر نظر پڑے

"اری! میں تمھیں چھیڑ رہا تھا نا!"

"میں بھی سمجھ رہی تھی!"

کہتی ہوئی وہ چلی تو اس نے قدرے بلا کر کہا۔

"چائے بھی لاؤ!"

اس عاشقانہ انداز پر وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔

ایک دن ——— عاشی کچھ پھول لئے ہوئے آئی اور تنویر کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کتنی اچھی مہک ہے ان پھولوں کی!"

"مجھے کیا معلوم!" تنویر نے بے پروائی سے کہا "ان پھولوں کی مہک کو میرا دل کیا جانے جو تمھارے انفاس کی خوشبو سے معطر ہے"

عاشی شرما گئی۔ اپنی شرم کو مٹانے کے لئے اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

"اچھا بمبئی رات میں کیسی لگتی ہے؟"

"بروم فیلڈ کی کتاب نائٹ ان بمبئی پڑھ ڈالو معلوم ہو جائے گا"

"آخر تم نے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا؟"

"خوبانِ پارس، حورانِ پیرس، نگارانِ مصر اور بتانِ یونان"

"خوش نصیبی نہیں جلوہ ہائے جمیل ہے!"

"یہ تو ضرور لیکن جانتی ہو" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تنویر نے کہا "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!"

ایک بار پھر کھلی ہوئی زلفوں کے سائے میں دہکتے ہوئے خورشید جیسے چہرے کی تمازت بڑھ گئی۔ عاشی چڑ گئی

"اب بہت زیادہ مجھے بنانے لگے"

"یہ تو تمھیں اپنے خدا سے پوچھنا چاہئے کہ اس نے اتنی فرصت میں تمھیں کیوں بنایا؟"

"اور تعریف کے لئے زبان تمھیں کیوں دی؟"

"نہیں! بلکہ یہ کہ جسم کی روح کیوں بنایا!"

کہہ کر اس نے چاہا کہ رسمسانے ہوئے بدن کی مانوس مہک کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے۔ عاشی نے غزالِ رمیدہ کی طرح ایک چوکڑی بھری اور رک کر کہا

"شوقِ بیتاب سے ضبط کی تاکید بھی ہو!"

اور گنگناتے ہوئے لمحات انہ رفتار عاشی کی رمخوردگی میں بھول گئے۔

زندگی ریشمی ڈھلوان سے پھسلتی رہی اور پھر پھسلتی گئی۔ اس ناز و نیاز میں وہ دونوں وقت کی تیز پروازی کو بھولے ہوئے تھے۔

ایک رات!

چاندنی سے نہائی ہوئی شفاف سی نورانی فضا میں دو ٹہلتے ہوئے اس جھوٹے سے باغ میں پہنچے، جسے تنویر نے اپنے کمرے کے سامنے بنوایا تھا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے تنویر تراشی ہوئی گھاس کے نرم اور مخملیں تختے پر بیٹھ گیا۔ اپنے پاس ہی عاشی کو بھی بٹھا لیا۔ وہ بے حد اداس تھی۔ اسے اپنا مستقبل بھی کبھی بہت تاریک نظر آتا۔ گرچہ تنویر اسے ہر طرح کی تسلی دے چکا تھا۔ لیکن عاشی کا ذہن کبھی وادیٔ ظلمات میں اس طرح بھٹک جاتا کہ

پُرسکین حباب کی طرح ہوتی۔ وہ بھی عاشی کی بے وجہ پریشانی سے کچھ بے چین سا تھا۔ کبھی سگریٹ کے دھوئیں سے کھیلتا، کبھی ترتیب سے لگے ہوئے پودوں کے اوپر اُن کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھتا جن پر بہتی ہوئی خنک چاندنی کا پرتو تھا۔ عاشی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

"تمھیں تو یہ عقبا پسند نہیں عاشی؟"

"پھر یہ اِدر کون ہے؟"

"میں تمھارا ہوتا تو تم میرے پاس رہ کر اُداس نہ رہتیں!"

"کبھی کبھی دل گھبرانے لگتا ہے۔"

"تنویر کے پاس رہ کر بھی؟"

اِس آواز پر دونوں چونک اُٹھے۔ تنویر نے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کی بھابی آرہی تھیں۔ اُن کے پاس بیٹھتی ہوئی وہ بولیں

"بڑے بے مروّت ہو تنویر! جب سے آئے ہو ایک خط بھی نہ لکھا۔"

"قصور تو ضرور ہے۔ خطا ہوئی سزا دے دیجئے۔"

"سزا تو تمھارے بھائی جان دیں گے۔"

کہہ تو رہی تھیں وہ تنویر سے۔ لیکن عاشی کو بہت تیکھی نظر سے دیکھ رہی تھیں جس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں نم تھیں۔ تنویر نے بھی بھابی کا انداز دیکھ لیا۔ اُس نے عاشی کا حوصلہ بڑھایا۔

"یہ مُجرموں کی طرح سر کیوں جھکائے ہو؟"

"بڑے بیباک ہو تنویر؟" بھابی کے لہجے میں درشتگی اور خشونت تھی۔

"صرف عاشی کے معاملے میں!" اُس کی آواز میں بھی کچھ سختی آگئی۔ "عاشی کو جو حقیر سمجھے گا میں اُسے حقیر ترین سمجھ کر منہ بھی نہ لگاؤں گا!"

بھابی تو پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں اور وہ عاشی کا ہاتھ تھامے گارڈن سے نکل گیا۔

صبح ناشتے کی میز پر اُس کا سامنا بھائی جان سے ہوا۔ بھائی جان نے تو پہلے خط نہ لکھنے کی شکایت کی۔ پھر بڑے شگفتہ انداز میں بھابی سے اُلجھنے کی وجہ پوچھی۔ اُس نے سر جھکائے ہوئے مودّبانہ انداز میں کہا۔

"انھیں بے وجہ عاشی سے نفرت ہے!"

"جلنا، نفرت کرنا تو عورت کی فطرت ہے۔ اِس کا تمھیں ایکشن نہ لینا چاہئے۔" پھر بہت شفقت سے کہا۔ "وہ تمھاری دشمن نہیں ہیں۔ اُنھوں نے اپنی بہن صبیحہ کو تمھارے لئے منتخب کر رکھا ہے۔"

اس پر وہ چونکا اور خود کو نہیں سنبھالتا تو اُس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر پڑتی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"صبیحہ تو مجھے بھی پسند ہے اور میں نے ابا کو لکھا تھا۔ اُنھوں نے بھی اپنی پسندیدگی ظاہر کی ہے۔ میں نے ساری باتیں طے کر لی ہیں۔ دو ہفتے کی چھٹی میں نے اِسی لئے لی ہے کہ امّاں کو لے جاکر اور رسمیں بھی پوری کر لی جائیں۔ آخر امّاں کو تنہا یہاں تکلیف ہوتی ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

اُس کے بھائی جان تو کہہ رہے تھے۔ لیکن اُس کے ذہن میں جس آندھی کا زور تھا اور اعصاب میں سنسناہٹ تھی، اُس کی خبر انھیں نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنا سوال پھر دُہرایا، تو وہ بمشکل تمام اِتنا کہہ سکا۔

"مجھے سوچنے دیجئے!"

"وقت کہاں ہے اور پھر ــــــ اِس کا مطلب ہے کہ تمھیں میری پسند سے اختلاف ہے؟"

"پھر مجھ سے کچھ مت پوچھئے۔ میں اِنکار بھی کب کر سکتا ہوں!"

کچھ اور سُننے کی بجائے وہ اُٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

اُس کے نازک دل کے لئے بھائی جان کا یہ فیصلہ بڑی چوٹ تھی اور رسوائی کا خیال آگ کی لہر کی طرح اُس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس طرح عاشی اُس سے چھوٹ جائے گی۔ وہ بے سہارا کن اُمیدوں پر اپنے دن گزارے گی۔ پھر عاشی اُس کی رُوح کی مانگ اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اُس کے ساتھ رہ کر اُس نے اپنے اندر توانائی محسوس کی ہے مستقبل کے لئے کتنے خوابوں کو اُس نے سنوارا ہے۔ یہ خواب ایک لمحے میں پگھل جائیں گے۔ توانائی ختم ہو جائے گی اور ایک اپاہج کی طرح وہ معذور و مجبور ہو جائے گا۔ اُس کے اِردگِرد بے پناہ تنہائی اور بھیانک سنّاٹا پھیلتا گیا۔ اُس کی نبضوں کا ترنّم ٹوٹتا گیا اور شبستانِ آرزو میں شفق کی جو سُرخی پھیلی ہوئی تھی، وہ ڈوب گئی۔ اندھیرا پھیلتا گیا۔ اُس پھیلے ہوئے اندھیرے میں دُور سے اُسے عاشی کی آواز ملتی گئی۔

"خدا کے لئے مجھے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپالو۔ دل کی گہرائی کے اُس مقدّس اندھیرے میں کھو بھی جاؤں تو مجھے غم نہ ہوگا! لیکن اِس وحشت ناک اندھیرے سے مجھے بچالو میرے محبوب!!"

اِس آواز پر وہ تڑپتا گیا۔ کاہشیں جاگتی گئیں اور سانسوں کا ہر پہلو سُلگتا گیا۔ لیکن مجبوری اُس کی راہ میں حائل تھی اور وہ عاشی سے ملتے ہوئے دامن بچا رہا تھا۔ عاشی کے سامنے کوئی مجبوری نہ تھی۔ وہ ایک دن ایسی ہی لُٹی لُٹی اور بجھی بجھی اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اُس نے چاہا عاشی اُسی پیار سے کہے جس پیار میں کل تک ایک موج تھی، لہک تھی اور تمنّاؤں کی بیقراری تھی۔ لیکن یہ آواز دل ہی تک پھیل کر رہ گئی۔ ہونٹوں تک نہ آسکی۔ لب تھرتھرا کر رہ گئے اور عاشی جس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے، بہت حسرت سے اُس کی طرف تک رہی تھی۔ پھر کچھ رحمانہ انداز

ـنے کہا۔

"جی چاہتا ہے ربطِ ناہید پہ چھیڑ دوں غزل !"

"ربط کے تار ٹوٹ چکے ہیں !"

"خلش دوست تو ہے۔ ساز خود بخود بج اٹھیں گے !"

"لیکن کوئی نغمہ پیدا نہ ہوگا عاشی !"

"اضطراب تو پیدا ہوگا۔ فریاد کی لے تو ملے گی !"

"وہ فریاد ہی کیا جس کا سننے والا کوئی نہ ہو !"

"تنہائی کے آنسو تو سنیں گے !"

"کب تک ؟"

"جب تک جیوں گی !"

عاشی کی آواز میں رقت تھی۔ ہلکی ہلکی سسکیاں ۔ ۔ ۔ ڈھلکتے آنسو۔ تنویر کا
ی پگھل کر آنکھوں کی راہ نکل پڑا تھا۔ پھر بھی وہ ساکت اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ عاشی نے
ی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھابی مجھ سے ملی تھیں تنویر ! انھوں نے ساری باتیں مجھے بتا دی ہیں۔ مجھے بھی
ہے تنویر ! تمھاری دلھن آجائے اور تمھاری زندگی شاداب رہے !"

"اور تم ؟"

"جس کے سامنے سب کچھ لُوٹ لیا گیا ہو، اس سے کیا پوچھتے ہو ؟"

کہتے ہوئے عاشی کی روح کا پھپھولا پھوٹ پڑا۔ تنویر کے دل میں سیکڑوں نشتر لگ گئے۔

"بس ایک چھوٹی سی التجا ہے ــــــ میری خاطر اپنی دنیا برباد نہ کرنا۔ ورنہ مجھے دکھ ہوگا ! ورنہ میرے ساتھ تمھاری یادوں کے اُجالے ہیں جو مجھے اندھیرے میں بھٹکنے نہ دیں گے !"

کچھ دیر عاشی چُپ چاپ کھڑی رہی۔ اُس کی سسکیاں کمرے کے سکوت کو توڑ رہی تھیں اور تنویر جیسے برف میں دھنسا بے جان ہو رہا تھا۔ پھر تنویر نے عاشی کو غیر متوازن قدموں سے جاتے دیکھا۔ لیکن وہ بہت بستہ خاموش ہی رہا۔ صرف اُس کی روح آواز دے رہی تھی۔

"نہ جاؤ عاشی ! نہ جاؤ ! تمھارے آگے اندھیرے کے سوا اُجالے کی رمق بھی نہیں۔ کھو جاؤ گی !"

اور پھر اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے دبیز اندھیرے میں عاشی کو کھویا ہوا پایا !!



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ ● الائچی ـــ جدید سائنس کی روشنی میں

الائچی کی کئی اقسام میں جن میں تین زیادہ مشہور اور مقبول ہیں اور عام روزمرّہ کے استعمال میں آتی ہیں۔ الائچی سرخ (کلاں)، الائچی سبز اور الائچی سفید۔ الائچی سرخ کھانے کے مصالحوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ بادی دُور کرتی ہے۔ سالن کو خوشبودار اور مفرّح بناتی ہے۔ یہ گرم مصالحوں کا جزوِ اعظم ہے۔ زیرہ سیاہ، دارچینی اور لونگ کے ساتھ پلاؤ، زردہ اور پکوان میں ڈالی جاتی ہے۔ سُرخ الائچی مفرّح بھی ہے۔ بادی اور ریاح کو بھی دُور کرتی ہے، بھوک بڑھاتی ہے، ڈکار لاتی ہے اس کے بھُونے ہوئے دانے دست بند کرتے ہیں ـــ دانت کے منجن میں اس کے چھلکے ڈالے جاتے ہیں۔ جب مسوڑھے سُوج جائیں اور متورّم ہوکر درد کریں تو سُرخ الائچی کو پانی میں اُبال کر نیم گرم پانی سے دن میں تین چار بار کلّیاں کرنے سے درد میں افاقہ ہوجاتا ہے۔

سُرخ الائچی، سبز اور سفید الائچی سے زیادہ گرم اور زیادہ قوی ہے۔ سونف کے سفوف میں اس کا سفوف مِلا کر کھانے سے ضعفِ ہاضمہ کی شکایت دُور ہوجاتی ہے۔

الائچی سفید زیادہ ہاضم، زیادہ خوشبودار اور مفرّح ہے۔ دل اور معدے کو طاقت بخشتی ہے۔ گردے اور مثانے کی پتھری کو زائل کرتی ہے۔ پتھری نکالنے والے نسخوں میں اس کا بہت استعمال ہے۔ باہ اور بواسیر کو مضر ہے۔ الائچی سبز کے خواص الائچی سفید سے ملتے جلتے ہیں مگر یہ زیادہ مفرّح اور طاقت بخش ہے۔ معدے اور قلب کو قوت دیتی ہے۔ دل و دماغ اور پھیپھڑے کو طاقت بخشتی ہے۔ قے، متلی، دمہ، ہچکی اور کھانسی میں بہت مفید ہے۔

سُرخ الائچی کے دانے باریک کرلیں اور سات ماشے کی مقدار میں سکنجبین ۲ تولہ کے ساتھ روزانہ سات دن تک استعمال کریں تو مرگی کے لئے بہت نافع ہے۔

سُرخ الائچی کے دانے باریک کرکے زبان پر چھڑکنا مُنہ آنے میں مفید ہے۔ اسی طرح اسے بطور منجن استعمال کرنا دانت اور مسوڑھے کو مضبوط کرتا ہے۔ اس کے چھلکے کا منجن بھی مسوڑھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ دانہ الائچی کو باریک کرکے ساڑھے تین ماشے کی مقدار میں سکنجبین ۲ تولہ کے ساتھ روزانہ استعمال کرنے سے دردِ جگر بارد اور سُدّہ جگر میں فائدہ ہوتا ہے۔

سُرخ الائچی کے دانے، ککڑی کے بیج، کھیرے کے بیج تینوں برابر وزن میں باریک کرکے رکھ لیں۔ اس سے سات ماشہ کی مقدار میں لے کر سکنجبین ۲ تولہ کے ساتھ روزانہ استعمال کریں۔ چند دنوں میں سنگِ گُردہ خارج ہوجائے گا۔

سُرخ الائچی آنتوں کے لئے مضر ہے۔ اس کا مصلح کتیرا ہے۔

چھوٹی الائچی لطافت میں سُرخ الائچی سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سُدّوں کو کھولتی ہے۔ قے کو روکتی ہے۔ معدے کے لئے سُرخ الائچی سے زیادہ نافع ہے۔ یہ معدے کو بلغمی اخلاط سے پاک کرتی ہے، اسہال کو بند کرتی ہے۔ مصطگی اور آبِ انار کے ساتھ استعمال کرنا قے، متلی اور تقویتِ معدہ میں مفید ہے۔ ہر قسم کے دردوں کے لئے نافع ہے خصوصاً دردِ دماغ میں بہت نافع ہے۔ اسے خوب باریک کرکے ناک میں اتنی مقدار میں ڈالنا کہ چھینک آئے، دردِ سر، ریحی اور مرگی میں فائدہ بخش ہوتا ہے۔

۲ ● مطالعہ کی عادت ڈالئے

لارڈ میکالے نے لکھا ہے ـــ میری زندگی کے سب سے مسرت آگیں

لمحات وہ تھے جو میں نے کتب بینی میں گزارے۔ اگر مجھے ساری دُنیا کا بادشاہ بنا دیا جائے اور میرے رہنے کے لئے خوبصورت محلات ہوں اور آرام و آسائش کے تمام سامان موجود ہوں لیکن یہ قید لگا دی جائے کہ میں مطالعہ نہ کروں تو میں اس شرط پر بادشاہ بننے سے انکار کر دوں گا۔"

ایک دوسرے دانشور نے لکھا ہے ——— "میں نے ہر جگہ سکون کو تلاش کیا لیکن کہیں نہ ملا۔ آخر میں نے اُسے ایک گوشے میں پایا، جہاں میں ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔"

ایک ضرب المثل ہے ——— "تین دن بغیر مطالعے کے گزارنے کے بعد چوتھے دن گفتگو میں پھیکا پن آجاتا ہے۔"

ملٹن نے کہا ہے ——— "ایک اچھی کتاب عظیم الفطرت انسان کے لئے [illegible] زندگی کا [illegible] سرمایہ ہے۔"

[illegible] اور مفکر لین یوتانگ نے لکھا ہے ——— [illegible] مطالعہ تو مہذب زندگی کی ایک [illegible] سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ [illegible] اس لطف سے [illegible] محروم رکھتے ہیں [illegible] انھیں [illegible] کبھار ہی نصیب ہوتی ہے [illegible] مطالعہ [illegible] والوں [illegible] کرتے ہیں۔ اگر ہم [illegible] والے لوگوں کی زندگی [illegible] تو اس کی وجہ صاف سمجھ میں آجاتی ہے [illegible] عادت [illegible] دنیا اور اردگرد کی گھٹی ہوئی فضا کا زندانی ہے۔ وہ [illegible] اور زمان [illegible] کی پابند ہوتی ہے۔ اُس کی [illegible] ہوتی ہے اور اُس [illegible] زیادہ سے زیادہ وہ کچھ دیکھ [illegible] گرد و پیش میں ہو رہا ہو۔ [illegible] قید خانے سے کہیں مفر نہیں لیکن [illegible]

[illegible]

ماحول اور اپنے جسم کے اندرونی ضرور رشک کریں گے۔ ماحول کی یہ تبدیلی نفسیاتی لحاظ سے انسان پر وہی خوشگوار اثر رکھتی ہے جو صرف سفر اور سیاحت سے ممکن ہے۔

۳● چھاچھ ——— کیلسیم کا خزانہ

قدیم ہی زمانے میں نہیں، اس نئی روشنی کے دور میں بھی چھاچھ بے حد مطبوع و مقبول ہے۔ ہندوستان ہی میں نہیں ممالک غیر خصوصاً روس میں بھی [illegible] چھاچھ استعمال کی جاتی ہے۔ ہر کھانے کے ساتھ بطور مشروب پی جاتی ہے۔ [illegible] چھاچھ کو اچھی طرح سے بلو کر مکھن نکال لیا جائے وہ [illegible] ہضم اور لاقوت بخش ہوتی ہے اور اس [illegible] کی مقدار زیادہ ہوتی ہے [illegible] ہضم اور زود ہضم ہوتی ہے اور [illegible] موٹا کرتی ہے۔

[illegible] کافی بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ اس ترشے [illegible] آنتوں کے [illegible] صحت [illegible] اور غذا کے ہضم میں مدد ملتی ہے۔

جس وقت [illegible] چھاچھ کا ہضم شروع ہوتا ہے [illegible] باہم ملتی ہے [illegible] عمل شروع ہو جاتا ہے [illegible] کے نتیجے میں دو قسم [illegible] ہوتی ہیں۔ ایک [illegible] غذائی مواد کو [illegible] ہے جس کی [illegible] قوت بڑھ جاتی ہے اور دوسری [illegible] آنتوں [illegible] کا عمل [illegible] کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غذا [illegible] آنتوں [illegible] اور اس کے اجزا میں مضر صحت [illegible] واقع [illegible]

[illegible]

لمحات وہ تھے جو میں نے کتب بینی میں گزارے۔ اگر مجھے ساری دُنیا کا بادشاہ بنا دیا جائے اور میرے رہنے کے لئے خوبصورت محلات ہوں اور آرام و آسائش کے تمام سامان موجود ہوں لیکن یہ قید لگا دی جائے کہ میں مطالعہ نہ کروں تو میں اِس شرط پر بادشاہ بننے سے اِنکار کر دوں گا۔"

ایک دوسرے دانشور نے لکھا ہے ——— "میں نے ہر جگہ سکون کو تلاش کیا لیکن کہیں نہ مِلا۔ آخر میں نے اُسے ایک گوشے میں پایا، جہاں میں ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔"

ایک ضرب المثل ہے ——— "تین دن بغیر مطالعے کے گزار دینے کے بعد چوتھے دن گفتگو میں پھیکا پن آجاتا ہے۔"

ملٹن نے کہا ہے ——— "ایک اچھی کتاب سلیم الفطرت انسان کے لئے زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔"

ایک مایۂ ناز فنکار اور مفکّر لین یُوتانگ نے لکھا ہے ——— کتابوں کے مطالعے کو مہذب زندگی کی ایک برکت، ایک دلکشی سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو اس لُطف سے اکثر محروم رکھتے ہیں یا مطالعے کی سعادت اُنھیں کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہے وہ ہمیشہ اسے عزّت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور مطالعہ کرنے والوں پر رشک کیا کرتے ہیں۔ اگر ہم مطالعہ کرنے والے اور مطالعہ نہ کرنے والے لوگوں کی زندگی کا مقابلہ کریں تو اس کی وجہ صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ جس شخص میں مطالعے کی عادت نہیں وہ اپنی محدود دُنیا اور اِرد گرد کی گھُٹی ہوئی فضا کا زندانی ہے۔ وہ مکان اور زمان دونوں کا قیدی ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی ایک بندھے ٹکے قاعدے کی پابند ہوتی ہے۔ اُس کی رسائی چند ملاقاتیوں چند دوستوں تک ہوتی ہے اور اُس کی آنکھیں زیادہ سے زیادہ وہ کچھ دیکھتی ہیں جو اُس کے قریبی گرد و پیش میں ہو رہا ہو۔ اُسے اِس قید خانے سے کہیں مفر نہیں لیکن جونہی یہ شخص کتاب اُٹھاتا ہے وہ ایک دوسری دُنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر کتاب اچھی ہو تو سمجھ لیجئے وہ دُنیا کے ایک بہترین صاحبِ گفتار کے حضور میں آگیا۔

دُنیا کے دو عظیم تاریخ دانوں مین سی آس اور سیما چی ان نے کہا ہے "مطالعے میں مصروف ہو کر حال کی مکروہات کے بارہ گھنٹوں میں سے صرف دو گھنٹے ایک دوسری دُنیا میں سانس لے سکنا اور حال کو بھول سکنا ایسی نعمت ہے جس پر اپنے ماحول اور اپنے جسم کے زندانی ضرور رشک کریں گے۔ ماحول کی یہ تبدیلی نفسیاتی لحاظ سے انسان پر وہی خوشگوار اثر رکھتی ہے جو صرف سفر اور سیاحت سے ممکن ہے۔

۳● چھاچھ ——— کیلسیم کا خزانہ

قدیم ہی زمانے میں نہیں، اِس نئی روشنی کے دور میں بھی چھاچھ بے حد مطبوع و مقبول ہے۔ ہندوستان ہی میں نہیں ممالکِ غیر خصوصاً روس میں بھی کثرت سے چھاچھ استعمال کی جاتی ہے۔ ہر کھانے کے ساتھ بطور مشروب پی جاتی ہے۔

اِس کی تاثیر سرد تر ہے۔ جس چھاچھ کو اچھی طرح سے بلو کر مکھن نکال لیا جائے وہ ہلکی زود ہضم اور طاقت بخش ہوتی ہے اور اُس میں کیلسیم کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ جس چھاچھ سے مکھن نہ نکالا جائے وہ دیر ہضم اور ثقیل ہوتی ہے اور بدن کو موٹا کرتی ہے۔

دہی یا چھاچھ میں دودھ کا ترشہ بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ اِس ترشے سے آنتوں کے مضرِ صحت جراثیم فنا ہو جاتے ہیں اور غذا کے ہضم میں مدد ملتی ہے۔

جس وقت معدے میں چھاچھ کا ہضم شروع ہوتا ہے اور اُس کی حرارت اور جسم کی حرارت باہم ملتی ہے تو جراثیمی عمل شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں دو قسم کی گیسیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک گیس سے غذائی مواد کو ایسی ہوا بہم پہنچتی ہے جس کی مدد سے معدے کی رطوبات میں جذب و نفوذ کی قوت بڑھ جاتی ہے اور دوسری گیس سے آنتوں میں اُسی طرح کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غذا آنتوں میں خشک نہیں ہونے پاتی اور اُس کے اجزاء میں مضرِ صحت تبدیلیاں واقع نہیں ہوتیں۔

ایک مشہور ماہرِ غذا کہتا ہے ——— "چھاچھ بیماروں کے لئے بھی اچھی غذا ہے۔ کیونکہ دودھ کے موادِ لحمیہ دہی جلنے کے دوران ہی میں دہی کے جراثیم کے عمل سے ایک حد تک ہضم کے منازل طے کر لیتے ہیں اور دودھ کا کیلسیم چھاچھ کے ترشے میں حل ہو جاتا ہے۔ یہ عمل چھاچھ یا دہی کو زود ہضم بنا دیتا ہے۔ چھاچھ دراصل کیلسیم کا خزانہ ہے۔

بے قاعدہ طور پر بار بار کئی چیزیں کھانے سے وہ اچھی طرح ہضم نہیں ہوتیں۔

یہ دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ یہ ہمیشہ خوش خوش اور چاق چوبند دکھائی دیتی ہیں۔ کڑی محنت اور اچھے کام کی بدولت آپ ٹائپسٹ سے ترقی کر کے اِس عہدے پر پہونچی ہیں۔ ان کا کہنا ہے: "میں اپنا کام خوب دل لگا کر کرتی ہوں۔ اِس لئے کہ مجھے گھر بار یا بچوں کی طرف سے کوئی فکر یا اُلجھن پریشان نہیں کرتی۔ میری اور میرے خاوند کی آمدنی سے ہمارے چھوٹے سے کُنبے کی سبھی ضرورتیں بخوبی پوری ہو جاتی ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ تینوں اچھی تعلیم پا رہے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی معقول سہولتیں حاصل ہیں۔ ہمارا تیسرا بچہ چھ برس



پہلے ہوا تھا۔ اُسی وقت ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اب ہمارے یہاں اور بچہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں، میں سچ مچ بڑی خوش ہوں۔"

یہ خوش ہیں —

اور آپ ؟



davp 68/215

اور اُن کا غیر منہضم حصّہ آنتوں میں سڑنے لگتا ہے۔ لیکن چھاچھ پینے سے آنتوں میں خون کا دَورہ بہت تیزی سے ہونے لگتا ہے اور وہ سارے غلیظ اور مُضر مادّوں سے صاف ہو جاتی ہیں۔

چھاچھ کے استعمال سے قوتِ ہاضمہ بڑھ جاتی ہے اور اِس کے استعمال سے بدن قوی ہو جاتا ہے۔

دہی کے جراثیم غذائی نالی میں بڑی مقدار میں وٹامن بی پیدا کرتے ہیں اور یہاں سے یہ وٹامن بہت تیزی اور آسانی سے سارے جسم میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ چھاچھ کا روزانہ استعمال وٹامن بی کی کمی، بعض قلبی امراض، عصبی خرابیوں اور قبض کو دُور کر دیتا ہے۔

فرانس کے ڈاکٹر مچینکو نے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ "چھاچھ کے استعمال سے بڑھاپا جلد نہیں آتا۔ جسم کی پرورش کرنے کے لئے چھاچھ اعلیٰ درجے کی غذا ہے۔ تازہ اور میٹھی چھاچھ پینے سے آنتوں میں زہر پیدا کرنے والے جراثیم فوراً ہلاک ہو جاتے ہیں اور قوتِ ہاضمہ میں اضافہ ہوتا ہے۔"

ایک اور سائنسداں کی رائے میں دودھ کا ترشہ دماغ کو چلانے میں ایندھن کا کام کرتا ہے اور سمیّت زدہ اعصاب کو سمیّت سے نجات دلاتا ہے۔ اِس اعتبار سے چھاچھ یا دہی کو مقوّیٔ اعصاب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس سے اشتہا کو بڑھانے، غذا کو ہضم کرنے اور تغذیہ میں مدد ملتی ہے۔

بچّوں کو روزانہ چھاچھ دی جائے تو اُن کے دانت نکلنے میں آسانی ہوتی ہے اور بچّے دانتوں کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتے۔ چھاچھ بچّوں کے لئے بہت سے امراض کا شافی علاج ہے۔

جن لوگوں کو اکثر زکام کی شکایت رہتی ہو، کمر یا جوڑوں میں درد ہو، نیند زیادہ آتی ہو یا کبھی کبھی بخار آجاتا ہو اُنھیں چھاچھ نہ پینا چاہئے۔ بلغمی طبیعت والے چھاچھ میں سونٹھ اور سیاہ مرچ مِلا کر پیئیں۔

زیادہ تُرش چھاچھ سے اکثر نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ اِس لئے ہمیشہ تازہ پینی چاہئے۔ جو زیادہ تُرش نہ ہو۔

۴ • اپنے آپ کو پہچانئے

دُنیا میں جن لوگوں نے قابلِ رشک کارنامے انجام دئے ہیں اُن پر یقیناً آپ کو بھی رشک آتا ہو گا۔ حیرت بھی ہوتی ہو گی۔ لیکن اُس سے بھی زیادہ حیرت آپ کو ہماری اِس بات پر ہو گی جب ہم کہیں گے کہ آپ بھی اُنھیں کی طرح قابلِ رشک کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

پروفیسر ولیم نے لکھا ہے ——— "ہر انسان ایک غیر معمولی طاقت کا مالک ہے جس کا ہم تصوّر بھی نہیں کرتے۔"

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "جو کچھ آپ اب کر رہے ہیں اِس سے سَو گُنا کام کرنے کی طاقت آپ میں ہے۔ دراصل اہمیت اِس کی نہیں، جو کچھ آپ کر رہے ہیں بلکہ اہمیت اِس کی ہے جو آپ آگے چل کر کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ جس کی زبردست خواہش آپ کو اُس کی عظمت کی طرف کھینچتی ہے۔ اب تک شاید آپ کی صلاحیتوں کا مکمل ارتقا نہیں ہو پایا ہے۔ لیکن اندر چھپی ہوئی اُس عظیم شخصیت کی تکمیل آپ کو کرنی ہے۔ آپ کے سمندر جیسے دل میں شاید صلاحیتوں کی ایسی کانیں چھپی ہوں جن سے آپ ناواقف نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کے اندر ایک عظیم انسان بننے کی اہلیت پوشیدہ نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے اوصاف آپ کی شخصیت میں چھپے پڑے ہوں گے ——— شاید آپ اِس پر یقین نہ کریں گے لیکن سچ یہی ہے کہ آپ خود اُن سے ناواقف ہیں۔ دُنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو اپنی عظیم صلاحیتوں سے اُسی طرح بیگانہ رہتے ہیں جیسے کولمبس سے پہلے دُنیا امریکہ سے ناآشنا تھی۔

۵ • آڑو ——— ایک مفید پھل

آڑو مشہور پھل ہے۔ اِسے شفتالو بھی کہتے ہیں۔ آڑو سرد تر ہے یعنی مزاج کے اعتبار سے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اِن میں غذائی اجزاء بہت پائے جاتے ہیں۔ اِن میں پروٹینز کے علاوہ شکر و نشاستہ وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ نیز وٹامن بی بھی پائے جاتے ہیں۔ اِس لئے یہ گرم خشک مزاج والوں کے لئے بہت مفید ہیں۔ بدن کو غذائیت دیتے اور طبیعت کو فرحت بخشتے ہیں۔ مفرّح اور قبض کُشا ہیں۔ صفرا اور خون میں گرمی کے غلبہ کو کم کرتے ہیں۔ پیاس کو تسکین دیتے ہیں۔ صفرا کی زیادتی سے بھوک نہ لگتی ہو تو شفتالو کھانے سے کھُل کر بھوک لگنے لگتی ہے۔ میٹھا شفتالو ملیّن تاثیر رکھتا ہے۔ اجابت بافراغت لاتا ہے۔ تُرش شفتالو قبض پیدا کرتے ہیں۔ موٹے اور بادی مزاج والوں کے لئے مفید نہیں ہیں۔

بعض اطبا کی رائے میں شفتالو سے جو خون پیدا ہوتا ہے اُس میں جلد متعفّن ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، اِس لئے اِس نقص کو دُور کرنے کے لئے شفتالو کو نمک لگا کر کھائیں اور اُسے کھانے کے بعد پانی ہرگز نہ پیئیں۔ کھانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے کھائیں۔ نزلہ زکام اور کھانسی دمہ کے مریض کو شفتالو نہ کھانے چاہئیں۔ جریان میں مفید ہے۔ قوتِ باہ میں قدرے اضافہ کرتے ہیں۔ مرض سکروی (گوشت خورہ) میں اِس کا استعمال بے حد فائدہ بخش ہے۔ فربہ اور بادی مزاج والے آڑو کھانے کے بعد شہد اور ادرک کا استعمال ضرور کریں۔

سنلائٹ سے ہر بار

آپ کے کپڑے زیادہ چمکدار دُھلتے ہیں



سنلائٹ صابن استعمال کیجئے اور اپنی آنکھوں دیکھئے ... آپ کے کپڑے سچ مچ چمکدار دُھلتے ہیں۔ درحقیقت ہر دُھلائی کے بعد آپ کے کپڑے زیادہ چمکدار نکلتے ہیں! تھوڑا سا سنلائٹ

ملئے اور دیکھئے ــــ جھاگ ہی جھاگ، جس میں کپڑے زیادہ صاف دُھلتے ہیں، زیادہ چمکدار۔ اپنے سبھی کپڑے سنلائٹ سے دھوئیے۔

اپنے روز پہننے کے کپڑے سنلائٹ سے دھوئیے

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو، زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

قدیر احمد خاں - پربھنی

س۔ آپ لیڈروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہیں؟

ج۔ ہم تو اُنھیں کے کردار و گفتار کا آئینہ اپنی صورت دیکھنے کے لئے اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

س۔ سُنا ہے لیڈر بن جانے پر پانچوں اُنگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوتا ہے۔ آپ لیڈر بن جائیں تو کیسا رہے؟

ج۔ اُنگلیوں کے لئے گھی، سر کے لئے کڑھائی لیڈروں ہی کو مبارک ہو!

لعل محمد شمشیر - کریم نگر

س۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ کامیاب لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے جدّوجہد کرنی چاہئے۔

س۔ انسان کی زندگی میں مایوسی کے لمحے کب آتے ہیں؟

ج۔ جب انسان حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

شاد علی - لکھنؤ

س۔ دُنیا میں ترقی کرنے کا کوئی آسان طریقہ بتلایئے۔

ج۔ ترقی کی محبوبہ آسانی اور تن آسانی سے نہیں رام ہوتی۔ وہ تو مُسکراتے ہوئے مشکلات کا مقابلہ کرنے والوں کو پیار کرتی ہے۔

س۔ دوستوں کو سیدھے راستہ پر لانے کے لئے کیا کروں؟

ج۔ سیدھی راہ پر چل کر اُن کے لئے اپنے نقشِ قدم چھوڑئیے۔

آنسہ رحمان - رامپور

س۔ لوگ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہئے لیکن میں جو سوچتی ہوں وہ کام نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ کسی مقصد کی تکمیل کے لئے صرف سوچنا کافی نہیں ہوتا۔ سوچنے سے زیادہ عمل ضروری ہوتا ہے۔

س۔ اگر انسان کی ساری خواہشیں پوری ہو جایا کرتیں؟

ج۔ تب انسان کا دل ایک ویران، سُنسان صحرا ہوتا۔ پھر اُس دل میں کیا رہتا، خواہشوں اور آرزوؤں کے ہجوم ہی سے دل کی ساری رونق ہے۔

س۔ اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ پھر اسے دیس نکالا کیوں؟

ج۔ کاش! اُردو کو دیس نکالا دینے والے ایک بار اس کے لئے یہ سوچتے!

...باالقسو - گلبرگہ شریف

س۔ انسان کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟

ج۔ یہی کہ اُس کی ہر خواہش پوری ہو جائے!

س۔ کیا دولت ہے تو سب کچھ ہے؟

ج۔ اِس دَور میں تو دولت ہی سب کچھ ہے۔

۱۵ اگست

میری پرتگیہ کا دن ہے

میری بھرپور محنت کے بدلے اِس سال علاقہ پنجاب ۲۰ لاکھ ٹن کے قومی اناج کے گودام میں ۱۵ لاکھ ٹن اناج دینے کی اُمید رکھتا ہے اور اب تک ۸ لاکھ ٹن اناج دے چکا ہے۔ اگر مرکز پنجاب کو ۱۰۰ کروڑ روپے اور دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں قومی سطح تک اناج کی کمی کو بالکل ختم کر دوں گا۔

پنجاب کے کسان

پنجاب سرکار کی طرف سے دی جا رہی سہولیات

سال ۶۹-۱۹۶۸ء کے دَوران زیادہ پیداوار دینے والی فصلوں کے پروگرام کے تحت ۱۰ لاکھ ہیکٹر زمین میں میکسیکن سے زیادہ پیداوار والی قسمیں ۶۸ ہزار ایکڑ میں دوگلی مکی، ۸۰ ہزار ہیکٹر میں دوگلہ باجرہ، ۲۰ ہزار ہیکٹر میں ٹی این چھونا بیجنے کا نشانہ پُورا کیا جائے گا۔

اس پروگرام کے تحت ایک لاکھ کوئنٹل بڑھیا قسم کی گندم کا بیج ۹ ہزار ۴ سو کوئنٹل مکی کا، ۲۰۰۰ کوئنٹل باجرے کا اور ۴۰۰۰ کوئنٹل چھونے کا بیج کھیتی باڑی کی طرف سے واجب نرخوں پر بانٹا جائے گا اور بیجائی کرنے سے پہلے بیج مفت ٹیسٹ کروانے کی سہولیات ملتی رہیں گی۔

اِس سال ۴۰۰۰۰ ٹن رسائینک کھادوں کے استعمال کرنے کا نشانہ کھے روڑی کھاد تیار کرنے والی پنچایتوں، انسپکٹروں اور گرام سیوکوں کو انعام دئے جائیں گے۔

چھوٹے اور بڑے ٹریکٹر خریدنے کے لئے کاشتکاروں کو تو قرضہ جات دئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے ۲۱ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

چھوٹی سینچائی کی سکیموں کے تحت ٹیوب ویل لگانے کے لئے ۸ ہزار روپے، کنویں کے لئے ۲۰۰۰ ہزار روپے تک اور پرانے کنویں کی مرمت کے لئے ایک ہزار روپے تک سرکاری امداد قرضے کی شکل میں دی جائے گی۔ کنویں لگانے کے لئے ۱۶ لاکھ روپے اور ٹیوب ویل کے لئے ۲ ۱ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔

بجلی اور ڈیزل کے ساتھ چلنے والے پمپنگ سیٹ لگانے والوں کو بالترتیب ۲۵۰۰ اور ۴۰۰۰ روپے قرضے کی شکل میں دئے جائیں گے۔

کھیتی باڑی کی مشینری خریدنے کے لئے قرضے دئے جائیں گے۔ اِس سال ۱۰ ہزار سیڈ کم فرٹیلائیزر ڈرل تقسیم کئے جانے کی تجویز ہے۔ فصلوں کی بیماری اگر وبا کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو ادویات مفت دی جائیں گی۔

پَودوں کے تحفظ کے لئے ساز و سامان محکمہ کھیتی باڑی کی طرف سے کرائے پر دیا جا سکتا ہے۔ فیروزپور اور بھٹنڈہ کے اضلاع میں کپاس اور مونگ پھلی کی فصلوں کو بیماری سے بچانے کے لئے جہازوں کے ذریعے ادویات چھڑکی جائیں گی۔ صرف ادویات کی قیمت کسانوں سے لی جائے گی۔

زمین پر پانی کے تحفظ کی سکیموں پر ۴۴ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جائے گی اور اِن سکیموں کے تحت ۲۷ ہزار ایکڑ رقبہ لایا جائے گا۔

تعلقاتِ عامّہ، پنجاب

8393 DPR

ایم۔ اے۔ نصر۔ کلکتہ

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے؟

ج۔ جی ہاں! اور اُن مسلمانوں کے نام ہیں — پنڈت آنند نرائن مُلّا، برج موہن کیفی دتاتریہ دہلوی، پنڈت لبھورام جوش ملسیانی، پنڈت بال مکند عرش ملسیانی، پنڈت امرت ناتھ ساحر، پنڈت ہری چند اختر، کرشن چندر، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مہندر ناتھ، رنبیر ایڈیٹر "ملاپ"، جنا داس اختر سابق ایڈیٹر "سویرا"، دھرم پال گپتا وفا ایڈیٹر "تیج"، ریندر ایڈیٹر "پرتاپ"، دیوان برندر ناتھ ظفر پیامی، پریم ناتھ در، دیویندر ستیارتھی، دیویندر اسر، کرتار سنگھ دُگل، م۔ م۔ راجندر، کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر ستیہ پرکاش سنگر، ڈاکٹر گیول دھیر، ڈاکٹر امرت لال عشرت، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، پرنسپل کنہیا لال کپور، پرنسپل جوگندر پال، پرکاش ناتھ پرویز، پُشکر ناتھ، مالک رام، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، پُرشوتم لال ضیاء، کرشن موہن، نریش کمار شاد، پریم ناتھ پردیسی، منوہن تلخ —— ایسے ہی اور بے شمار مسلمان ہیں، اُردو جن کی زبان ہے!

محمد محمود احمد علیگ۔ علی گڑھ

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ زندگی ہے غم و مسرت کا
مختصر اور طویل افسانہ

س۔ کون بہتر رہنمائی کرتا ہے۔ دل یا دماغ؟

ج۔ دماغ۔

س۔ کوئی ایسا شعر سُنائیے جس سے انسانیت بیدار ہوتی ہو۔

ج۔ اپنے لہو سے جو بھرتے ہیں اوروں کی تصویروں میں رنگ
اہلِ زمانہ نام ہمارا اُن ہی میں ارقام کریں

علاؤالدین زیدی۔ آسنسول

س۔ پھول جب شاخ پر ہوتے ہیں تو بے حد دلکش معلوم ہوتے ہیں اور جب توڑ لئے جاتے ہیں تو اُن کی وہ دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ مرجانے کے بعد ہر شے دلکشی و دلآویزی سے محروم ہو جاتی ہے۔

س۔ انسان کی زندگی میں مسرتیں اکثر ٹوٹ کیوں جاتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ جس اشتیاق سے وہ اُن کی آرزو کرتا ہے، جس تپاک سے اُن کا خیر مقدم کرتا ہے، اسی طرح وہ انہیں سنبھال نہیں سکتا۔

محمد قمرالدین پینٹر۔ آسنسول

س۔ جوش ملیح آبادی کو شاعرِ اعظم کا خطاب کس نے عطا کیا؟

ج۔ اُن کی عظیم شخصیت کے پرستار دیدہ دروں نے۔

س۔ کولرج (نقاد) آپ کی نظر میں؟

ج۔ نکتہ چیں زیادہ ہوتے ہیں نکتہ بیں کم۔

محمد یونس تمنا۔ بنگلور سٹی

س۔ ہندوستان میں یہ زبان کا مسئلہ کب تک جاری رہے گا۔ حکومت اتنی مآل نااندیش کیوں ہو گئی ہے؟

ج۔ حکومت مآل نااندیش نہیں ہے، مصلحت اندیش ہے۔ لیکن اس کی یہ مصلحت اندیشی اسے لے ڈوبے گی۔

س۔ آج کے ہر انسان کا اوّلین فرض کیا ہے؟

ج۔ ہر دور کے انسان کا اوّلین فرض انسانیت کو سربلند کرنا ہے۔

س۔ ہندوستان کا مستقبل ...؟

ج۔ ہندوستان کا تابناک حال اُس کے درخشاں مستقبل کا آئینہ ہے۔

محمد ذاکر خاں بشیر گنج۔ بیسٹر

س۔ دُنیا میں سب سے بڑا مجرم کون ہے؟

ج۔ انسانیت دشمن!

س۔ اگر میں کہوں دُنیا میں جتنے مذہب ہیں اُن میں صرف ایک اچھا ہے؟

ج۔ یہ صحیح نہ ہوگا۔ سارے مذاہب اچھے ہیں۔

ماہتاب عالم شاداب وپادی۔ کلکتہ

س۔ بھائی جان! انسان اور شیطان میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شیطان شیطان کو جان سے نہیں مارتا۔ انسان انسان کو جان سے مارنے سے دریغ نہیں کرتا!

س۔ ہندوستان میں ظلم و ستم کا بازار کب تک گرم رہے گا؟

ج۔ جب تک تنگ نظر متعصب لوگ انسانوں کے خون کو پانی سے بھی ارزاں سمجھتے رہیں گے!

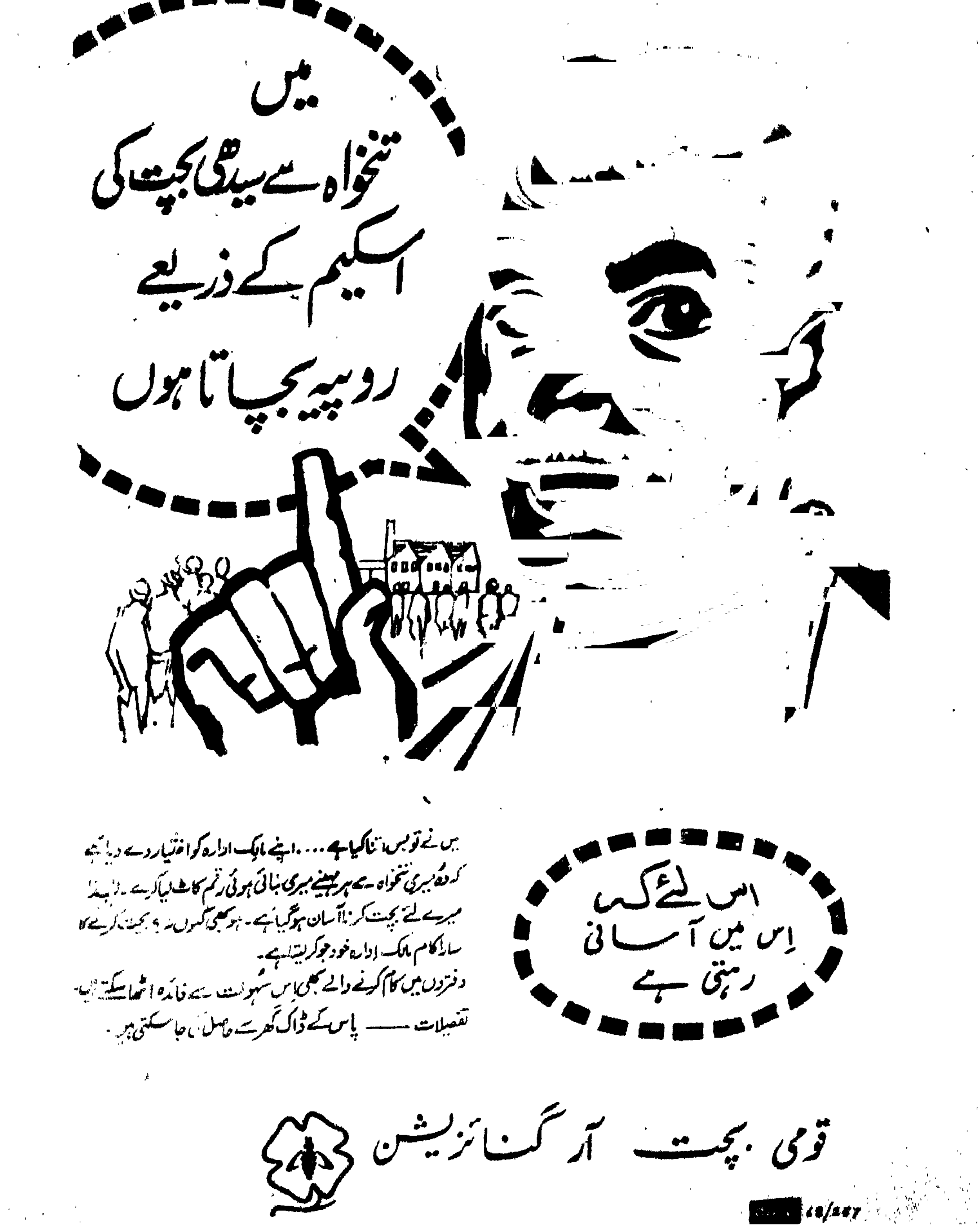
ایس۔ ایم حمزہ۔ کانس بہاں۔ مندر

س۔ بھائی جان! شادی شدہ عورت کی پہچان اُس کی مانگ کا سیندور ہے اور شادی شدہ مرد کی پہچان؟

ج۔ شادی شدہ مرد کے چہرے پر مسرت و طمانیت کی جھلک ہوتی ہے۔

س۔ سگریٹ کا آخری کش اور زندگی کی آخری سانس۔ دونوں میں قیمتی کون ہے؟

ج۔ ان دونوں سے زیادہ قیمتی آپ کا یہ معلومات آفریں سوال ہے!


میں
تنخواہ سے سیدھی بچت کی
اسکیم کے ذریعے
روپیہ بچاتا ہوں
میں نے تو بس اتنا کیا ہے.... اپنے مالک ادارہ کو اختیار دے دیا ہے
کہ وہ میری تنخواہ سے ہر مہینے میری بتائی ہوئی رقم کاٹ لیا کرے۔ اب یہ
میرے لئے بچت کرنا آسان ہو گیا ہے۔ ہوں کبھی بھولوں نہ۔ بچت کرنے کا
سارا کام مالک ادارہ خود ہی کر لیتا ہے۔
دفتروں میں کام کرنے والے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
تفصیلات —— پاس کے ڈاک گھر سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔
اس لئے کہ
اس میں آسانی
رہتی ہے
قومی بچت آرگنائزیشن
18/227

سید سراج الدین، کردوواڑی۔ مہاراشٹر

س۔ ہماری حکومت ہر ریاست میں سرکاری زبان اُسی ریاستی زبان کو قرار دے رہی ہے جو اُس علاقہ میں رائج ہے اور اب اِس تجویز کو سختی سے عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ۱۷ ریاستیں ہیں اور ۱۴ زبانیں سرکاری مانی گئی ہیں، جن میں اُردو بھی شامل ہے۔ لیکن جو خطہ واری زبانیں رائج ہوئیں اُن میں اُردو کسی بھی خطے کی زبان قرار نہیں دی گئی۔ ایسا کیوں؟ کیا اِس کا جواب ممبران پارلیمنٹ دے سکتے ہیں؟

ج۔ کاش! حکومت کے اربابِ بست و کشاد کے پاس آپ کے اِس سوال کا کوئی جواب ہوتا!

س۔ اُردو زبان کا مستقبل؟

ج۔ اُردو کے بدخواہوں کے خیال میں تاریک ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ اُردو کی ہمہ گیری اُردو کی بقا کی ضامن ہے۔

معین الدین، کشن گنج

س۔ ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل؟

ج۔ ہندوستان میں جمہوریت کا حال مستقبل کا آئینہ ہے۔

کوثر جبیں۔ پورنیہ

س۔ خوشتر بھائی! میری موجودگی میں میرے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میرے پانچ بچے ہیں اور مجھے چھوڑ رکھا ہے۔ مجھے بُلانے کے لئے اُن کے خطوط بھی برابر آرہے ہیں۔ برائے مہربانی بتلایئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ آپ کا معاملہ بہت نازک ہے ــــ سوکن کا جلاپا عورت کے لئے تکلیف دہ آگ ہے پھر بھی آپ کے لئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اپنے دل پر پتھر رکھ کر آپ کو اپنے شوہر کے پاس جانا چاہئے۔ بچے نہ ہوتے تو قطع تعلق کر لینا اچھا ہوتا۔

محمد ثقلین لاری، تنکیا۔ آسام

س۔ انسان انسان سے ناجائز فائدہ کیوں اُٹھاتا ہے؟

ج۔ سارے انسان ایسا نہیں کرتے۔

س۔ حقیقی دوست کن کن زاویوں سے پہچانا جا سکتا ہے؟

ج۔ صرف ایک زاویہ سے ــــ حقیقی دوست بُرے وقتوں میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

س۔ آج کل کی فیشن پرست عورتیں اپنوں سے پردہ کرتی ہیں اور غیروں کے سامنے اپنی نمائش! ایسا کیوں؟

ج۔ عورتوں نے یہ ادا مردوں سے سیکھی ہے جو اپنی بیویوں کے سامنے بہت معصوم رہتے ہیں، دوسروں کے سامنے کُھل کھیلتے ہیں۔

اے۔ رشید، شری پور

س۔ علم بدصورتوں کے لئے خوبصورتی کیوں ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ علم بدصورتی کی کمی پوری کر دیتا ہے۔

س۔ کوئی غم آگیں شعر سُنایئے۔

ج۔ مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا!

ضیاء بگھاوی، بگھا۔ چمپارن

س۔ اسلام مذہب ہے یا دین؟

ج۔ دونوں ــــ ایک ہی حقیقت کے یہ دو نام ہیں۔

س۔ سیاست اور مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں؟

ج۔ جی نہیں۔ سیاست کو مذہب سے کیا نسبت؟ سیاست کا کوئی مذہب، کوئی دھرم نہیں ہوتا۔

سید حسن جعفری۔ الہ آباد

س۔ انسان ہوش میں کب آتا ہے؟

ج۔ جب ٹھوکر کھاتا ہے۔

س۔ کُل ہندوستان کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ ۹۲ء میں ۴۴ کروڑ ۹۰ لاکھ تھی۔

الیاس احمد قریشی۔ الہ آباد

س۔ غالب کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ خواجہ اسداللہ۔ گھر پر مرزا نوشہ کے نام سے پُکارے جاتے تھے۔

خالدہ ادیبی۔ بانسی

س۔ حد سے زیادہ حساس ہونا اپنے لئے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے یا دوسروں کے لئے؟

ج۔ اپنے لئے۔

س۔ فراق گورکھپوری کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ حیاتِ نابیداری مسلسل ممات اِک خواب جو نہ ٹوٹے
نشاط کی غفلتوں سے بہتر وہ غم جو انسان کو جگائے

مس نوشابہ علیگ

س۔ بھائی جان! ایک خوبصورت شعر سُنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎
اشکِ شبنم بھی سمجھ پائے نہ یہ رازِ حیات
پھول کیوں ایک تبسم کے گنہگار رہے

قاضی سمیع اللہ چھپرہ۔ سارن

س۔ کیا آپ کا مقصد خاص کر نوجوانوں کے شعور اور ذوق کی تربیت ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ اس وقت ادبی دائرے میں بے ادبی کی جو لہر چل رہی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

ج۔ اس لئے کہ بہت سے ادب نا آشنا بھی خود کو ادیب سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

س۔ کیا "بیسویں صدی" ایک ادبی پرچہ ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" آپ کے سامنے ہے۔ خود ستائی کبھی ہمارا شیوہ نہیں رہا۔

نثار عالم۔ کانپور

س۔ ہندوستان میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر؟

ج۔ کلکتہ، بمبئی۔

س۔ خوشتر بھیا! رشوت لینا منع ہے یا دینا؟

ج۔ رشوت لینا دینا دونوں برا ہے۔

س۔ اسلامی ممالک میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک؟

ج۔ پاکستان و انڈونیشیا۔

ضیاء الحق اعظمی۔ مئو

س۔ عورت کا سب سے قیمتی جوہر کیا ہے؟

ج۔ عفت و عصمت۔

حیدر حسینی ورنگل (اے پی)

س۔ اردو کا رسم الخط بدلنا عقل مندی ہے، بے وقوفی؟

ج۔ ہرگز عقلمندی نہیں۔ رسم الخط بدل دینے کے بعد اردو اردو نہ رہ جائے گی۔

س۔ عملی زندگی میں کامیابی علم سے حاصل ہوتی ہے یا تجربوں سے؟

ج۔ دونوں سے۔

محمد فضل عظیم سیہوہ۔ میرٹھ

س۔ سالنامے میں پڑھا کہ دنیا کی ۳۲ ہزار زبانوں میں اردو کا تیسرا درجہ ہے۔ یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ وضاحت سے بتائیے۔

ج۔ مجلس اقوام متحدہ نے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔ ان کے مطابق دنیا کی ۳۲ ہزار زبانوں میں اردو کا تیسرا درجہ ہے۔

وصی احمد جینگڑو۔ نیپال

س۔ روزہ طبی اور ڈاکٹری اصول سے؟

ج۔ بے حد مفید ہے۔ بلکہ ضروری ہے۔

س۔ کیا مہذب اور متمدن بننے کے لئے شراب، رمی، ڈانس اور انگلش لباس اپنانا ضروری ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔

ثروت حسین۔ مراد آباد

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان میں کتنے ہندو ہیں؟

ج۔ تقریباً اسّی بیاسی لاکھ۔

عبدالعزیز۔ جے پور

س۔ کیا وہ زندگی موت سے بدتر نہیں جس میں خوشی کے پھول مرجھا گئے ہوں؟

ج۔ ایسی زندگی بھی موت سے اچھی ہوتی ہے۔

س۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے

ج۔ خود کو ساری عورتوں سے خوبصورت سمجھنا

س۔ ایک مسلم گریجویٹ لڑکے کی شادی کیسی لڑکی سے ہونی چاہئے؟

ج۔ اچھی تربیت کے ساتھ اچھی تعلیم سے آراستہ لڑکی!

علیم اللہ خاں۔ دیوریا

س۔ آنسو پینے کے لئے ہیں یا بہانے کے لئے؟

ج۔ کبھی بہانے کے لئے ہوتے تھے اب پینے کے لئے ہیں۔

س۔ زندگی کی ہزار تلخیوں کے باوجود لوگ کیوں چاہتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ زندگی ہزار تلخیوں کے باوجود شیریں، بہت پیاری ہے۔

شہناز جمیل۔ مراد آباد

س۔ بھائی جان! تاج محل کی طرح اردو بھی کیا ہندوستان کا مایۂ ناز سرمایہ نہیں؟

ج۔ یقیناً ہے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ، دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر۔ برائٹ پریس صدر بازار دہلی

Registered with the ...

BISWIN SADI

32 nd. YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office 271637 Residence 619927

بیسویں صدی دہلی

نومبر



Rs.1-25

BiswinSadi

DELHI



دیکھو تو چشمِ یار کی جادو بیانیاں
ہر اِک کو ہے گُماں کہ مخاطب ہمیں رہے ——— حسرت موہانی

فوٹو:۔ رمیش کمار سرنا۔ نئی دلّی



شعلوں کے بھنور مچل رہے ہوں جیسے — انوارِ شفق پگھل رہے ہوں جیسے
یوں جوت جگاتا ہے اُن آنکھوں میں شباب — مندر میں چراغ جل رہے ہوں جیسے

نریش کمار شاد —————— فوٹو: سورج این. شرما۔ جے پور



دہلی کے ایک مشاعرے میں اُردو کے نامور، مقبول شاعر
جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اپنے مخصوص صحت مند لب ولہجہ
میں رجائیت اور غنائیت کا جادو جگاتے ہوئے غزل سرا ہیں۔

غمِ سود و زیاں سے بے نیازانہ نکلتا ہے
بڑی فرزانگی سے تیرا دیوانہ نکلتا ہے

سنائیں حالِ دل کس کو کریں کس پر بھروسا ہم
جسے اپنا سمجھتے ہیں وہ بیگانہ نکلتا ہے

طوافِ شمع سے جُز مرگ کچھ حاصل نہیں پھر بھی
نہ جانے کیا اُمیدیں لے کے پروانہ نکلتا ہے

ہماری بزمِ مے نوشاں میں رات آتی نہیں واعظ
کہ چھپ جاتا ہے جب سورج تو پیمانہ نکلتا ہے

ہمیں سمجھانے والے خود ذرا دل چیر کر دیکھیں
درِ کعبہ اگر وا ہو تو بُت خانہ نکلتا ہے

جلو میں اُس کے ہوتا ہے ہجومِ حسرت و ارماں
نکلتا ہے ترا عاشق تو شاہانہ نکلتا ہے

سحرؔ سے مت اُلجھ اے گردشِ دوراں کہ وہ اکثر
تری زد میں کبھی آئے تو حریفانہ نکلتا ہے



ایک مشاعرے میں اُردو کے مقبول مزاحیہ شاعر جناب
فرقت کاکوروی مزاح کے پردے میں زندگی کے بعض حقائق
کی طرف نہایت بلیغ اشارے کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

آزاد ہے اب دیش تو ہر شے ہے میسّر
رشوت بھی، گرانی بھی، تعصب بھی، غبن بھی

انگریز کفن چھوڑ کے بھاگا تھا وطن سے
آزاد ہے اب دیش تو غائب ہے کفن بھی

سب لگ گئے سر روزی سے جب ہوئے وہ منسٹر
بابا بھی، چچاجان بھی، بھائی بھی، بہن بھی

منصوبوں کے ہمراہ یہ تحقیق ہے جاری
جنتا جسے کہتے ہیں وہ رکھتی ہے دہن بھی

وہ وقت نہیں دُور کہ جب زہر بٹے گا
جنتا کو دیا جائیگا راشن میں کفن بھی

جن لوگوں نے آزاد کرایا تھا وطن کو
آزادی سے بیزار ہیں وہ اہل وطن بھی

آزادی کے نغمات جو گاتے تھے وطن کے
معتوب ہیں مقہور ہیں وہ اہل سخن بھی



جناب ایم۔ اے حبیب کی اَن تھک کوششوں اور اُردو زبان وادب سے والہانہ لگاؤ کی وجہ سے پچھلے دنوں لندن میں اُردو لائبریری کی پہلی سالگرہ نہایت شان وشوکت سے منائی گئی۔ اِس تقریب میں ایک شاندار مشاعرہ بھی ہوا۔ مشاعرے کی صدارت سیّد نذیر حسین صاحب نے فرمائی۔ جس میں لندن میں مقیم شعرائے کرام نے حصّہ لیا۔ لندن میں بچوں کو اُردو پڑھانے کے لئے ایک اسکول بھی کھولا گیا ہے۔ اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے جناب ایم۔ اے حبیب اور جناب بشیر احمد ریاض مدیر "ایشیا" لندن جو کچھ کر رہے ہیں ہر اُردو دوست اُن کا معترف ہے ؎



ہز ایکسلنسی انڈین ہائی کمشنر لندن کے نمائندۂ خصوصی جناب سیّد نذیر حسین اجلاس سے مخاطب ہیں اور انڈین ہائی کمشنر لندن کا یہ پیغام پڑھ کر سنا رہے ہیں کہ "اُردو کا شمار ہندوستان کی اہم زبانوں میں ہوتا ہے اور ہندوستان کے دستورِ اساسی نے بھی یہ تسلیم کیا ہے۔ دنیا میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ایک بھاری اکثریت کی مادری زبان اُردو ہے۔ اُردو ایک طاقتور زبان ہے اور اس کی قوتِ بیانیہ دنیا کی دوسری اہم زبانوں کے ہم پلّہ ہے" ؎

بیسویں صدی

ٹیلیفون دفتر ــــــــ [illegible]

ٹیلیفون رہائش ــــــــ [illegible]

نومبر ۱۹۶۸ء

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

[illegible]

[illegible] چودہ روپے [illegible]

مستقل خریداروں کو چودہ روپے سالانہ قیمت میں سال بھر کے عام نمبروں کے علاوہ عظیم الشان خصوصی خاص نمبر کی دئے جاتے ہیں جن کی قیمت دو روپے فی پرچہ ہوتی ہے۔

نیر و نشتر

"پنجاب کے بعد ہریانہ اور راجستھان سرکار نے بھی لاٹری شروع کر دی"
ـ خبر ـــــ ایک دن پورا ملک کا سوال بن جائے گا اور ہم سب بازی پر
ا دیئے جائیں گے۔

"شری چوہان مستعفی ہو جائیں۔ ورنہ . . ." ایک عنوان ـــــــ
رنہ کیا؟ . . . ورنہ پھر کام کرتے رہیں۔

"لکھنؤ میں گیہوں مہنگا ہو گیا" ایک خبر ـــــ پھر وہاں کے لوگ ـــ
یب اور انگور کھائیں۔

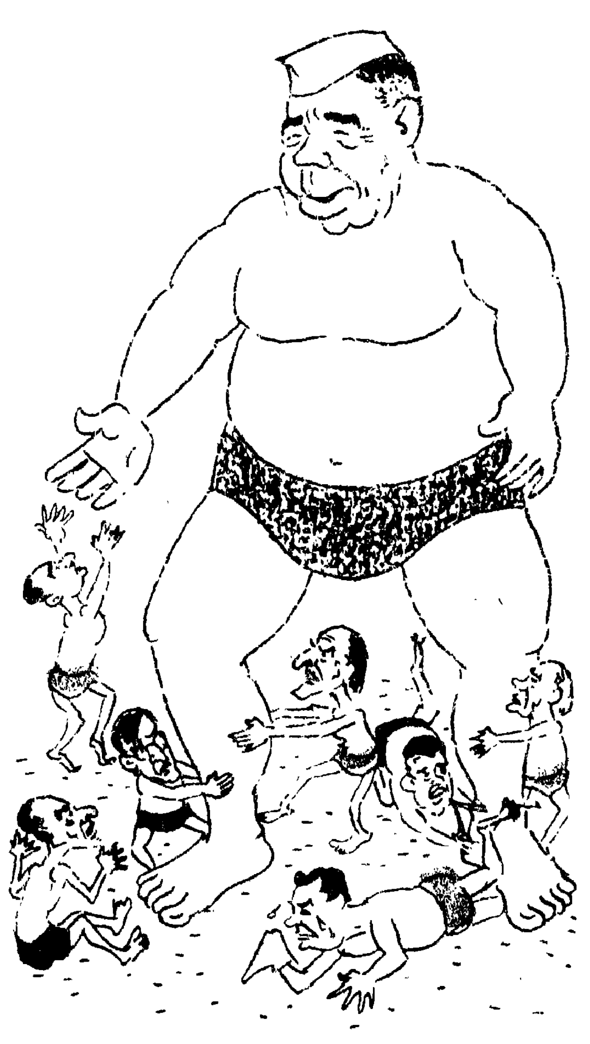
"دلّی میں عورتوں پر لاٹھی چارج" ایک خبر ـــــ عورت وزیر اعظم
ے ہوتے ہوئے۔

"انکم ٹیکس میں رعایت" ایک عنوان ـــــ یہ نہ کرو ورنہ شری
ار جی ڈیسائی کو صدمہ ہوگا۔

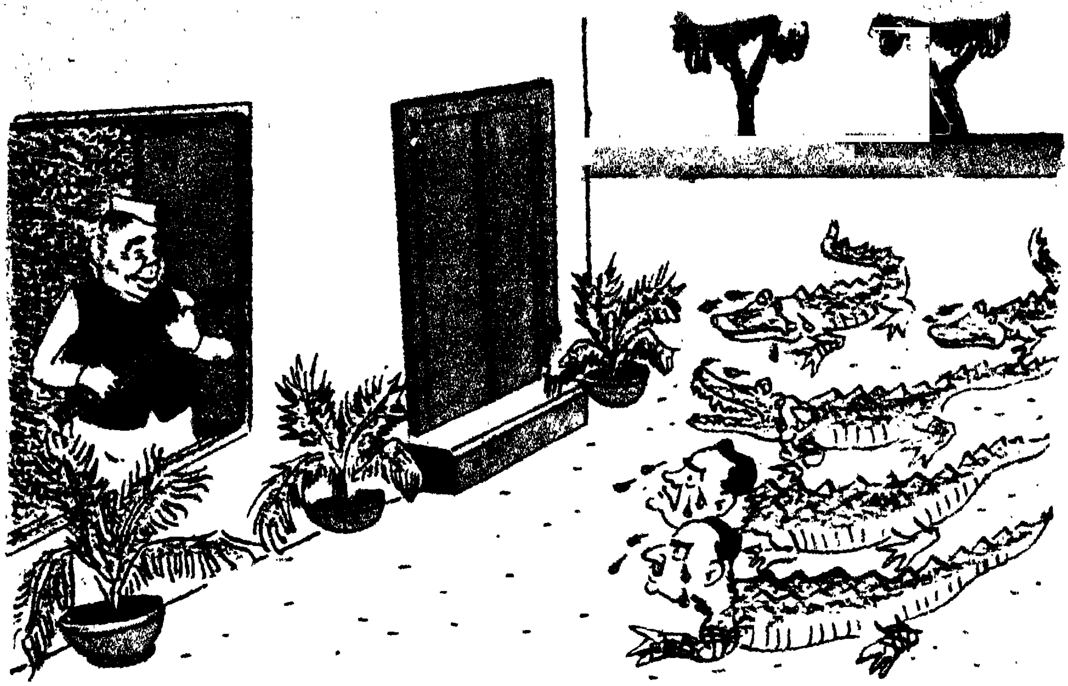
"ناک کا بیمہ کرا لو" ایک عنوان ـــــ فائدہ ہی فائدہ ہے کیونکہ
ج کل سیاست میں دن رات ناک کٹتی ہے۔

"بنسی لال (ہریانہ) کی مخالفت نہ کرو۔ کانگریسیوں کو صدر کانگریس
، ہدایت" ایک عنوان ـــــ وزارت دینے کی گارنٹی بھی تو دیجئے۔

"مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ گورنمنٹ خاموش ہے" ایک عنوان
ـــــ تو کیا گورنمنٹ مظاہرہ کرے، جلوس نکالے، جلسہ کرے ـــــ
رنمنٹ اپنا کام کر رہی ہے۔ جنتا اپنا کام کرے۔ شور مچائے، پوسٹر نکالے، مظاہرہ
ے، بھاشن دے۔



"چوہان کو شنٹ کرنے کے لئے منظم ایجی ٹیشن چلائی جائے گی" جن سنگھی لیڈروں کا اعلان



"دلی میں پولیس کی زیادتیوں کے خلاف وزیرِ داخلہ کی کوٹھی کے باہر جن سنگھیوں کا دھرنا" ـــــ ایسا ہی ہے جیسے مگرمچھ کے آنسو۔

"کانگرس راج میں کشمیر سمگلروں، بلیک مارکٹیوں اور رشوت خوروں کی جنت ہے" ایک جن سنگھی لیڈر ـــــ جن سنگھیوں کا راج ہوتا تو اب تک پورا کشمیر ہی سمگل کر دیا ہوتا۔

"سارا ہریانہ سوکھے کی لپیٹ میں" ایک خبر ـــــ اور ہریانہ کے وزیرِ اعلیٰ چودھری بنسی لال جنگِ زرگری کی زد میں۔

"آگرے کے ہسپتال میں ایک عورت کے ایک ساتھ چار بچوں کی پیدائش" ایک خبر ـــــ "دو یا تین بچے اور بس" ـــــ کا ریکارڈ ایک ہی دفعہ میں توڑ ڈالا۔

"جن سنگھ اور ایس۔ ایس۔ پی نے کچھ ستیہ گرہ شروع کرنے کا اعلان کر دیا" ایک خبر ـــــ ع

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

"آلو کھانے سے انسان موٹا نہیں ہوتا" ایک عنوان ـــــ یوں کہیئے نا، آلو جیسا نہیں ہوتا۔

"ہڑتالوں اور کام بند کرنے سے ملک کی ترقی رک جائے گی" وزیرِ اعظم کی تقریر ـــــ صرف تنخواہ کے لئے نوٹ بنانے والی ٹکسال بند نہیں ہونی چاہیئے۔

"بدیشی امداد نہ ملی تو پانچ سالہ پلان پر اثر پڑے گا" مرارجی ڈیسائی ـــــ تو کیا ہوا۔ آپ کو ٹیکس لگانے تو آتے ہیں ع

ٹیکس پر ٹیکس لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے

"میں نے شری بھگوت دیال کو ہریانہ کانگرس کا پردھان چننے کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا" چودھری بنسی لال ـــــ صرف گورو بنایا تھا اور وہ بھی نام کے لئے، کام کے لئے نہیں۔

چند عنوان :-

۱۔ شری چوہان کی کوٹھی کے باہر برت۔
۲۔ اندرپرست بھون کے باہر ۴۸ گھنٹے کے برت کا الٹی میٹم۔
۳۔ پونہ میں ڈاک و تار کے ملازم برت رکھیں گے۔
۴۔ پٹھانکوٹ میں ریلوے ملازمین کی بھوک ہڑتال۔

اور ان سب کے بعد ایک عنوان ہے :-

"دلّی میں وزراء خوراک کی کانفرنس میں غذا کی صورتِ حال پر غور" ـــــــ بالکل بیکار اور تضیعِ اوقات ہے۔ ایسے ہی برت شروع کرنے کا سامان کیا جائے تو ہم ایک ہی سال میں خوراک میں خود کفیل ہو جائیں۔

"سست کام کرنا قانوناً جرم" ایک عنوان ـــــــ اور اس جرم کی بازپرس میں سستی کرنا قومی جرم۔

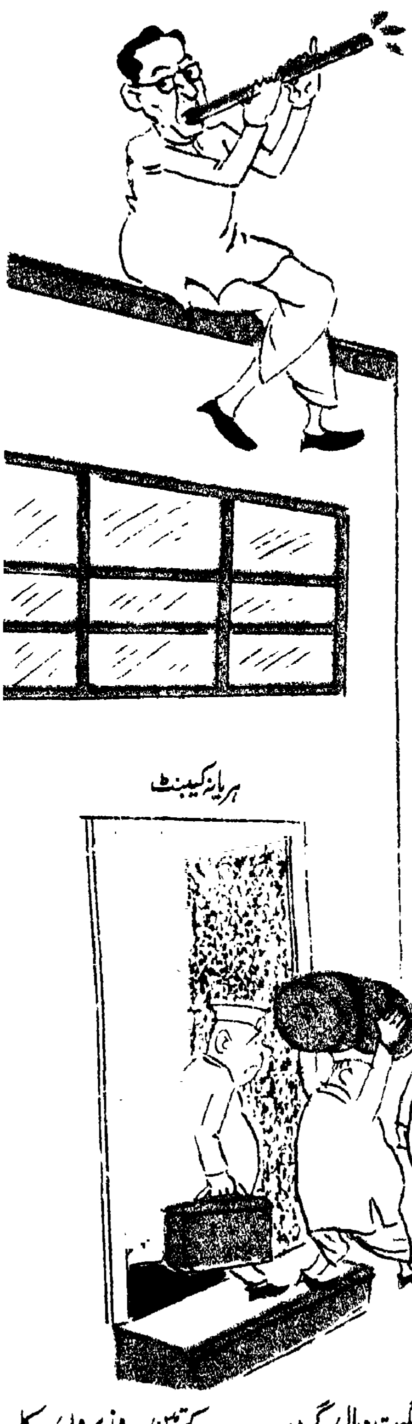
"مرکزی احکام کی خلاف ورزی کرنے پر نمبو دری پاد حکومت کو برطرف کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا" وزیرِ قانون کا بیان ـــــــ ایسے بیانات پڑھنے کے شری نمبودری پاد عادی ہو چکے ہیں۔ اُن کا یہ عقیدہ ہے "سیّاں بھے چو۔ این۔ لائی اب ڈر کاہے کا!"

"چاول کی نقل و حرکت پر پابندی" ایک خبر ـــــــ احتیاطی نظر بندی قانون کے تحت۔

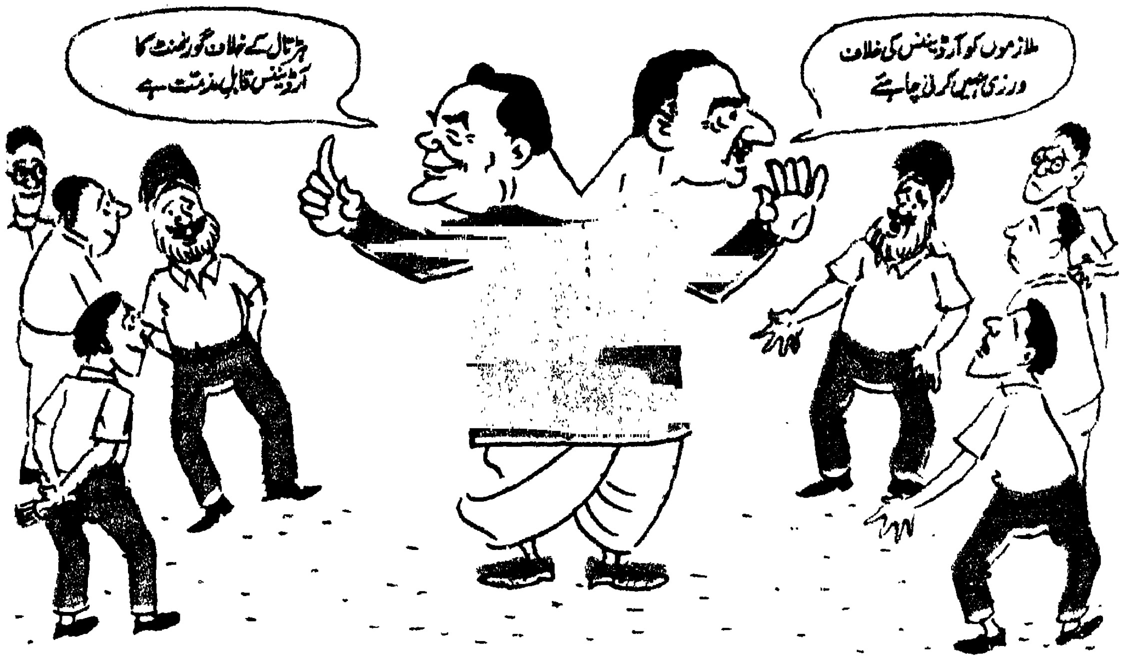
"یکم نومبر سے چلتی پھرتی عدالتیں ختم" ایک خبر ـــــــ چلتے پھرتے "جرائم کنندگان" کو خوشخبری۔

"بستی میں ماؤنواز لٹریچر برآمد" ایک عنوان ـــــــ عنوان یوں ہو تو زیادہ موزوں ہے "ماؤ نوازبستی"۔

"یورپ میں جنگ کے بادل" ایک خبر ـــــــ برسے تو گولے، راکٹ اور بم برسیں گے۔



"ہریانہ کیبنٹ سے بھگوت دیال گروپ کے تین وزیروں کا استعفیٰ" ایک خبر ـــــــ چودھری بنسی لال چین کی بنسی بجائیں۔



جن سنگھ کی دورُخی۔ باجپئی ہڑتال کے حق میں تھے اور مدھوک ہڑتال کے خلاف۔

"شوگر پالیسی پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا" ایک خبر ــــ اس لئے بلیک مارکٹیوں کو چھوٹ ہے کہ وہ ذخیرہ اندوزی اور بلیک زور شور سے جاری رکھیں۔

"آٹھ کروڑ کے نئے ٹیکس" ایک خبر ــــ جو ہم بغیر چیخے چلاّئے ادا کریں گے۔

"ہریانہ میں ہنی مون ختم" ایک عنوان ــــ چیلے نے گورو پر ہی ہاتھ صاف کر دیا۔

"امریکی پالیسیوں پر نکتہ چینی نہ کرو" پاکستانی اخبارات کو گورنمنٹ کی ہدایت ــــ شیشۂ دل نازک ہے ٹوٹ جائے گا۔

"چائے کی پیالی نے جان بچادی" ایک خبر ــــ چائے کمپنیاں خبر کو اشتہار بنا کر چھاپیں۔

"راجستھان اسمبلی میں اپوزیشن کا دھرنا۔ تاش، شطرنج اور کیرم چلتی رہی" ایک خبر ــــ قانون سازی کا نیا ریکارڈ۔ امریکہ، فرانس، روس اور برطانیہ والے سبق سیکھیں۔

"کچھ ستیہ گرہ پھر شروع کیا جائے گا" ایک خبر ــــ اس لئے کہ بیکار مباش ــــ کچھ کیا کر۔

"ہماچل میں سرکاری ٹیچروں کی ہڑتال" ایک خبر ــــ بچوں کو چھٹیاں مل گئیں۔

"گنگا نگر میں دو عورتیں گرفتار۔ لڑکی سے زبردستی کرانے کا الزام" ایک خبر ــــ رام رام گنگا مائی کے نام کی لاج بھی نہ رکھی کمبختوں نے۔

"پتنی نے پتی کو چاقو مارا" ایک خبر ــــ بیسویں صدی کی پتی ورتا پتنی۔

"پنجاب میں وزیرے مراَنض نویس" ایک خبر ——— ع
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

"گئووں کے لئے راشن کارڈ پر چارہ" ایک خبر ——— کلجگ اسے ہی کہتے ہیں۔ قربِ قیامت کی یہی تو علامت ہے۔

"خاوند، بیوی اور لڑکے کو سزا" ایک خبر ——— یعنی آوا کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

"پنجاب کی عدالتوں میں سمجھوتا چار" ایک عنوان ——— پنجاب اسمبلی توڑنے اور صدر راج کے بعد۔

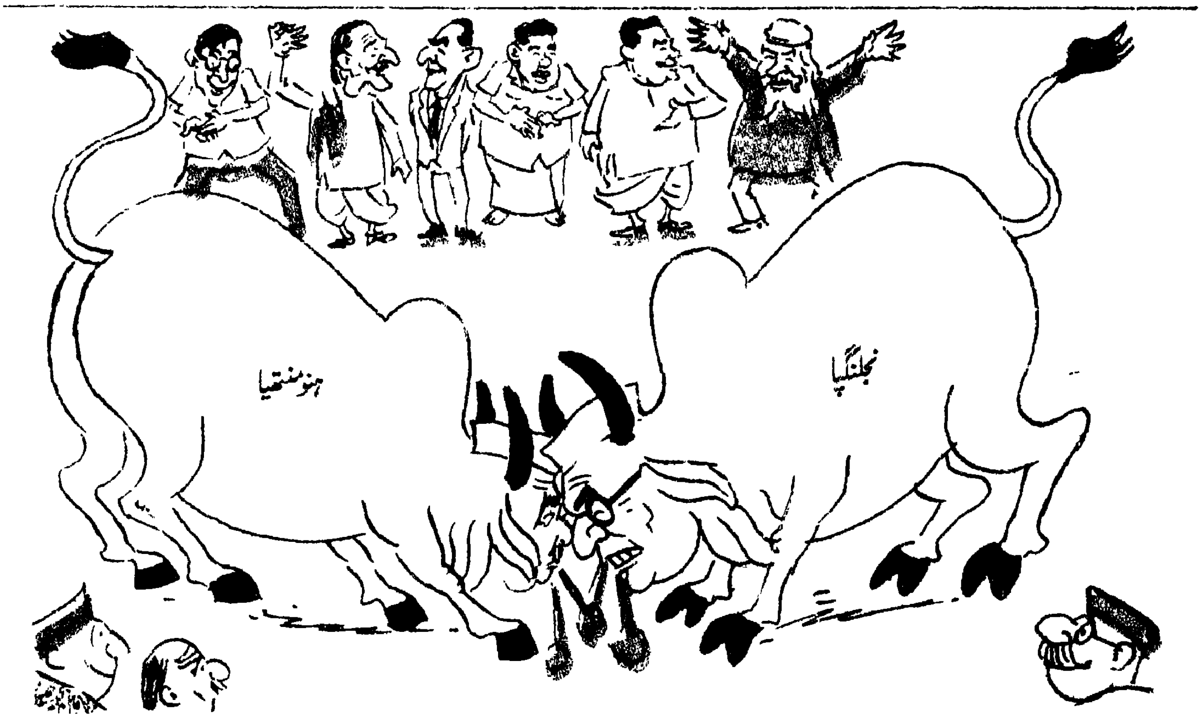
"دِلّی میٹرو پالیٹن کونسل میں ہنگامہ" ایک خبر ——— اور وہاں کام کیا ہے ع۔
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

"چیکوسلواکیہ کے بعد بلغاریہ کی باری" ایک خبر ——— ۵
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

"مجرم افسران کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ وزیرِ داخلہ کی یقین دہانی" ایک خبر ——— چچا غالب کی زبان میں عرض ہے ۵
ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

"ہڑتال توڑ آرڈیننس سے انگریزوں کے زمانے کی یاد تازہ ہوگئی" ایک عنوان ——— ملکہ ایلزبیتھ اس یادآوری پر شکریہ ادا کرتی ہیں۔

"مغویہ لڑکی تھانے پہنچ گئی" ایک خبر ——— اور اغوا کنندگان فرار ہوگئے۔



میسور کے دو سابق چیف منسٹروں کے ایک دوسرے پر الزامات

نمبودری پاد ـــــــــــــ

خوشترگرامی

بُوٹاسا قد، گول چہرہ، کلین شیو، آنکھوں پر چشمہ۔ جس کے اندر مکّاری کا خـــزانہ دفن ہے۔ لمبی ناک جو اُن کے نزدیک لگی ہوتی ہے۔ لیکن ہم وطنوں کے نزدیک "ماؤ نوازی" میں کٹ چکی ہے ـــــ دھوتی کرتہ عام طور سے لباس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی بُش شرٹ بھی پہن لیتے ہیں۔ یہ ہیں کیرالا کے وزیرِ اعلیٰ ـــــــ



جو کھائیں پیئیں ہندوستان کا اور گائیں بجائیں ماؤسی تنگ کا۔ اقتدار حاصل کرنے کے لئے جمہوریت کی دُہائی دیں اور جب اقتدار مل جائے تو آنکھیں دِکھائیں۔ جس ہنڈیا میں کھائیں اُسی میں چھید کریں ـــــــ

چاول مانگنا ہو تو دَوڑے دَوڑے دِلّی آئیں۔ امن و انتظام کے لئے دِلّی سے ہدایت جائے تو ردّی کی ٹوکری بڑھائیں۔ منکرِ خدا ہیں۔ لیکن بھوک سے بلبلائے تو وزراء خوراک کی کانفرنس میں خدا یاد آیا ـــــــ

ہر قدم فتنہ، ہر گام فتنہ، رفتار میں فتنہ، گفتار میں فتنہ۔ چاہیں تو فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

افسانہ

تِکون

—— بلونت سنگھ بی۔ اے

۵۱۷۔ نیتانگر، نئی بستی، کیدگنج۔ الٰہ آباد

محترم و مشفق خوشتر صاحب

پچھلا افسانہ "شرط" بقول آپ کے بہت گرم تھا۔ لکھتے وقت تو مجھے گرمی کا احساس نہیں ہوا لیکن بعد میں قارئین کے خطوط کا تانتا بندھ گیا تو گرمی کے احساس کے ساتھ آپ کا قول تازہ ہو گیا اور محسوس ہوا کہ جائے اُستاد خالی ست! واہ! کیا مقام ہے، کیا اُستاد ہے —— آج تک میں نے قارئین کے تعریفی خطوط کا ذکر نہیں کیا لیکن اب کرنا ہی پڑا۔ لندن سے ایک نہایت معقول حضرت لکھتے ہیں کہ وہ "شرط" پڑھ کر بے اختیار رقص کرنے لگے۔ آخر میں وہ سب آپ کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ آپ کا ہمارا یہی فرق ہے کہ ہم سب صرف لکھتے ہیں، آپ خود بھی لکھتے ہیں اور ہم سے بھی لکھواتے ہیں . . .

بلونت سنگھ

میرے مالک کی بیوی سردارنی جی گھوڑی پر سوار تھیں اور میں لگام کو گھوڑی کے جبڑوں کے نزدیک سے تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ سردارنی جی گھوڑی کی سواری کرنا اچھی طرح جانتی تھیں۔ لیکن میں پیدل تھا اِس لئے اُنھوں نے گھوڑی کو دوڑانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں اُن کی حفاظت ہی کے لئے تو اُن کے ساتھ تھا۔

میں ؟ —— میں مسلمان ہوں . . . اور اُس وقت بھی مسلمان تھا۔ یہ واقعہ مُلک کی تقسیم سے پہلے کا ہے، جبکہ میری عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ سردارنی جی کی عمر تیس بتیس برس کی تھی۔ میں اُن کے باپ کے برابر تھا۔ اُن کے شوہر کا میں خاندانی نوکر تھا۔ بارہ سال پہلے جب سردارنی جی دُلہن بن کر آئیں تو میں اُسی وقت سے اُنھیں بیٹی کہنے لگا۔ اُنھوں نے بھی خاندانی نوکر کے بیٹی کہنے پر بُرا نہیں مانا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں اُن کے محترم شوہر کو گود میں کھلا چکا ہوں اور میں نوکر نہیں، خاندان کا ایک فرد ہی سمجھا جاتا ہوں۔

ایک دن صبح کے وقت میرے مالک نے بُلا کر مجھ سے کہا کہ میں سردارنی جی کو اُن کے میکے سے لے آؤں۔ جس طرح میرے مالک بڑے مانے ہوئے زمیندار تھے اُسی طرح میری مالکن نے بھی کافی جائداد ورثے میں پائی تھی۔ دونوں گاؤں میں گیارہ میل کا فاصلہ تھا۔ میں اپنے مالک کی گھوڑی پر سوار ہو کر دوپہر کے کھانے کے وقت سے پہلے ہی سردارنی جی کے گاؤں میں جا پہنچا۔ کھانا کھایا، کچھ آرام کیا اور پھر تیسرے پہر سردارنی جی گھوڑی پر سوار ہو گئیں اور میں اُن کے ساتھ ساتھ چل دیا۔

غروب آفتاب سے پہلے ہی دُھندلا سا چاند آسمان میں دکھائی دینے لگا۔ چاند کی اِس بدتمیزی پر سورج دیوتا اُسے لال لال آنکھیں دکھاتے ہوئے ڈوبنے لگے۔ چاند محض مُسکرا دیا۔

چاند کا نکلنا کہ سے پہلے ایک اور گاؤں کپّی والا تھا۔ اُن دونوں میں ایک ڈیڑھ کوس کا فاصلہ تھا۔ دُور ہی سے مجھے کپّی والا کا دارا (چوپال) دکھائی دینے لگا جہاں چند آدمی ایک حُقّے کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے۔ اُس وقت مجھے حُقّے کی سخت طلب ہو رہی تھی۔ سارا دن حقّہ پینے کو نہیں ملا تھا۔ میرے سکھ مالک تمباکو کو چھوتے بھی نہ تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ میں حُقّہ پیتا ہوں۔ اُنھوں نے اِس پر کبھی اعتراض بھی نہ کیا۔ میں نے احتیاطاً اور کچھ اُن کے احترام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کے سامنے کبھی تمباکو نہیں پیا۔

میرے قدم قدرے سُست پڑ گئے۔ ہمّت سے کام لے کر کہا —— "بیٹی! اچھا تھک گیا ہوں۔ اجازت ہو تو دارے میں رُک کر پانی وانی پی لوں۔"

سردارنی جی کی اونچی ناک کے نیچے بھرپور صحت مند ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ

پیدا ہوئی۔ غالباً وہ میرا مُدعا سمجھ گئی تھیں۔ وہ چُپ رہیں لیکن دارے کے سامنے پہنچ کر انھوں نے گھوڑی روک دی۔

اب سردارنی جی نیچے اُتریں۔ دارے میں ایک جگہ کچھ چارپائیاں ایک دوسرے کے متوازی کھڑی تھیں۔ میں نے ایک چارپائی گھسیٹی اور انھیں چارپائیوں کی اوٹ میں بچھادی اور اُس پر چارخانے کا کھیس گھوڑی کی پیٹھ سے اُتار کر پھیلا دیا۔ میں نے یہ سب اس لئے کیا تاکہ چارپائیوں کی دوسری جانب بیٹھے آدمیوں کی نظر سردارنی جی پر نہ پڑے۔

اِس طرح سردارنی جی کو آرام سے بٹھا کر میں حُقّے والے گروہ میں شامل ہو گیا۔ اُن میں سے زیادہ تر میری طرح راہ گیر تھے۔ انھوں نے اپنے حلقے میں میرے لئے بھی جگہ بنا دی۔ حُقّے کی نَے دھیرے دھیرے گھوم رہی تھی۔ اپنی باری آنے سے پہلے میں نے قریب رکھے مٹکے میں سے پانی پیا اور پھر جب نَے دانتوں میں دبا کر تین چار گہرے کش لئے تو میری غنودگی سے معمور آنکھیں کُھل گئیں۔ دماغ میں تازگی کا احساس ہوا۔ کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ تب اُس موضوع کی طرف متوجہ ہوا جس پر وہ باتیں کر رہے تھے۔ اُن کا موضوع دلچسپ بھی تھا اور سنسنی خیز بھی ——— یعنی قتل!

اُن میں ایک آدمی نے جو چار پانچ درجے پڑھا ہوا معلوم ہوتا تھا، کہا۔
"بعض قاتل بہت ہی بدقسمت ہوتے ہیں۔"

میرے وہاں پہنچنے سے پہلے اِس موضوع پر نہ جانے کیا کیا۔ تیں ہو چکی تھیں اور کیسی کیسی کہانیاں سنائی جا چکی تھیں۔ میرے دل میں کچھ تجسّس تو پیدا ہوا لیکن پھر میں نے دل سے کہا کہ میاں! تجھے آگے پیچھے سے کیا لینا۔ کچھ دیر آرام کرکے پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہونا ہوگا، اس لئے کیوں نہ چُپ چاپ اِس بہاؤ میں بہہ لیا جائے۔

جتنی دیر تک میرا دماغ اِن خیالات میں اُلجھا رہا، اتنی دیر میں کچھ اور سوال و جواب ہو گئے۔ یہاں تک کہ اُس آدمی نے ایک واقعہ یوں بیان کیا۔

"آج سے ۱۲ برس پہلے کی بات ہے، ہمارے گاؤں کے قریب والے قصبے میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اُس کا اصلی نام ظاہر کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن سہولت کے لئے اُسے کرپال سنگھ سمجھ لیجئے۔ اُس نے پہلی لام (جنگِ عظیم) میں ٹھیکیداری کا کام کیا اور کافی روپیہ کما لیا۔ لام ختم ہو گئی۔ اُس کی آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ کرپال سنگھ چاہتا تو اُسی دولت کے بَل بُوتے پر نہ صرف خود آرام کے دن گزارتا، بلکہ بال بچّوں کا مستقبل بھی سنوار سکتا تھا۔ لیکن شیر آدم خور بن چُکا تھا۔ کرپال سنگھ قناعت نہ کر سکا۔ وہ اِس فکر میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنی دولت دوگنی تین گُنی کر لے۔

کہتے ہیں پاجی کو پاجی دس کوس کا چکّر لگا کر بھی جا ملتا ہے۔ کرپال سنگھ کو چرن سنگھ مل گیا۔ چرن سنگھ نے سبز باغ دکھائے اور کرپال کا سارا روپیہ اپنے کاروبار میں لگا کر اپنی جیبیں بھر لیں۔ اِس طرح دو ڈھائی برسوں میں اُس نے کرپال سنگھ کی ساری دولت کا صفایا کر دیا۔

اِس پر کرپال سنگھ نے چرن سنگھ پر مقدمہ دائر کر دیا۔ وہ مقدمہ جیت گیا۔ عدالت نے فیصلہ کیا کہ چرن سنگھ کرپال سنگھ کو پچاس ہزار روپیہ نقد دے اور مقدمہ کے کُل اخراجات بھی بھرے۔

کرپال سنگھ نے اِس فیصلے کا خوب ڈھنڈورہ پیٹا۔ لیکن جلد ہی اُسے اِس بات کا احساس ہو گیا کہ مقدمہ جیتنا اور بات ہے، لیکن روپیہ وصول کرنا اور بات ہے۔ چرن سنگھ دیوالیہ بن بیٹھا۔ اُس سے کسی قسم کی وصولی کرنا ممکن نہ تھا۔ دیوالیہ ہو جانے کے بعد بھی اُس کے ٹھاٹھ باٹھ میں فرق نہ آیا۔ اُس کے سر پر کلف لگی طُرّہ دار پگڑی، بوسکی کی قمیص، اُس پر کوٹ، نیچے شلوار اور پاؤں میں پشاوری چپل۔ یہ شان تھی اُس کی!

چرن سنگھ ویسے بھی کھانے پینے والا شخص تھا۔ شراب صبح سے شام تک چلتی۔ جوئے کے علاوہ اور بھی کئی مشاغل تھے اُس کے۔ جب وہ اپنی بانکی گھوڑی پر سوار ہو کر کرپال سنگھ کے قریب سے گزرتا تو مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اُس کی خیر خیریت ضرور پوچھتا تھا۔ اِس پر کرپال سنگھ کی داڑھی اور مونچھوں کے بال کانٹوں کی طرح کھڑے ہو جاتے۔ اُس کے جی میں آتی کہ وہ چرن سنگھ کے پیٹ میں کرپان گھونپ دے لیکن خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ چرن سنگھ کے مر جانے سے اُسے اپنا روپیہ تو نہیں مل سکتا تھا۔

اپنی ساری جائداد اور روپیہ چرن سنگھ نے بیوی کے نام کر رکھا تھا۔ اِس لئے نہیں کہ اُسے بیوی سے عشق تھا، بلکہ محض اپنی چمڑی بچانے کے لئے۔ اپنی رفیقۂ حیات کو وہ اکثر نعل جڑے جوتوں سے مارا کرتا تھا۔

دن رات کی سوچ بچار کے بعد کرپال سنگھ کو ایک ترکیب سُوجھی۔ اُس نے نہایت احتیاط سے چرن سنگھ کی بیوی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب [illegible] اور روپے کا مالک چرن سنگھ کے سوا اور کوئی نہ رہ گیا تھا۔ [illegible] نے بیوی کے قتل کے الزام میں چرن سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ دُنیا جانتی تھی [illegible] کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ اکثر بیوی کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں [illegible] پولیس نے سارا کیس اِس چابکدستی سے تیار کیا کہ چرن سنگھ پھانسی پا گیا۔

کرپال سنگھ نا مُرادی کے بحرِ بے پایاں میں غوطے کھانے لگا۔ [illegible] کو جان گنوانی پڑی اور اُس کے ہاتھ بھی کچھ نہ لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ مہینے کے [illegible] کرپال سنگھ بھی سورگ یا نرک کو سدھار گیا۔"

یہ واقعہ سُنا کر جب اُس آدمی نے کرپال سنگھ کی بدنصیبی پر [illegible]

شروع کی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ تازہ دَم ہو جانے کے بعد میں اپنی مالکن کو اور زیادہ دیر تک منتظر نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

مالکن پھر گھوڑی پر سوار ہو گئیں اور میں لگام تھام کر آگے آگے چلنے لگا۔

اب پھیکی سی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، لیکن فضا خاموش تھی۔ میری مالکن کا چہرہ بھی کچھ اُترا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ یہ باتیں عورتوں کے سننے کے لائق نہیں تھیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا "آپ کو خواہ مخواہ ایسی بھیانک باتیں سننی پڑیں۔ شاید اسی لئے آپ اُداس ہو گئی ہیں"۔

مالکن نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "چرن سنگھ کی بیوی میری سگی بھُوا تھی۔ ویسے کرپال سنگھ سے بھی ہمارے گھرانے کے گہرے تعلقات تھے۔ اس نے صرف مجھے یہ بتا دیا تھا کہ حقیقت میں اُسی نے چرن سنگھ کی بیوی کو قتل کیا، تاکہ جب چرن سنگھ ساری جائداد اور روپے کا مالک . . ."

معاً میرے قدم رُک گئے۔ دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ میں بولا "اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ چاہتیں تو اصلی قاتل کو پکڑوا سکتی تھیں"۔

یہ سُن کر مالکن نے لگام کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ وہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ گھوڑی نے سہم کر اگلے پاؤں اوپر اُٹھا دئے اور پھر بہ یک جست آگے کو بڑھی تو مالکن نے میری طرف اپنی چمک دار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "لیکن اپنی بھُوا کی ساری جائداد اور روپے کی اکلوتی وارث میں ہی تھی . . ."

گھوڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی اور میں گھسٹتے ہوئے قدموں سے پیچھے پیچھے چلنے لگا !!

"بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اس میں ۲۲ اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔

غزل

منظر صدیقی اکبرآبادی

نکہتِ گُل بھی، شعلۂ غم بھی — عشق آتش بھی، عشق شبنم بھی
اعتبارِ وفا ہی ختم ہوا — آؤ ترکِ وفا کریں، ہم بھی
یادِ ماضی ہنوز باقی ہے — ہائے کیا شے ہے، اضطرابِ غم بھی
زندگی سے ہے آدمی نالاں — رنگ لایا گناہِ آدم بھی
اُف ترستا ہے جب کوئی مجبور — کانپ جاتا ہے عرشِ اعظم بھی
بھیجئے کچھ کوئی نیا پیغام — ہمہ تن انتظار ہیں ہم بھی
اللہ اللہ یہ حُسن کے نیرنگ — گُل نورس بھی، نشترِ غم بھی
بچ کے رہئے فریبِ دُنیا سے — کہ یہ جنّت بھی ہے، جہنّم بھی

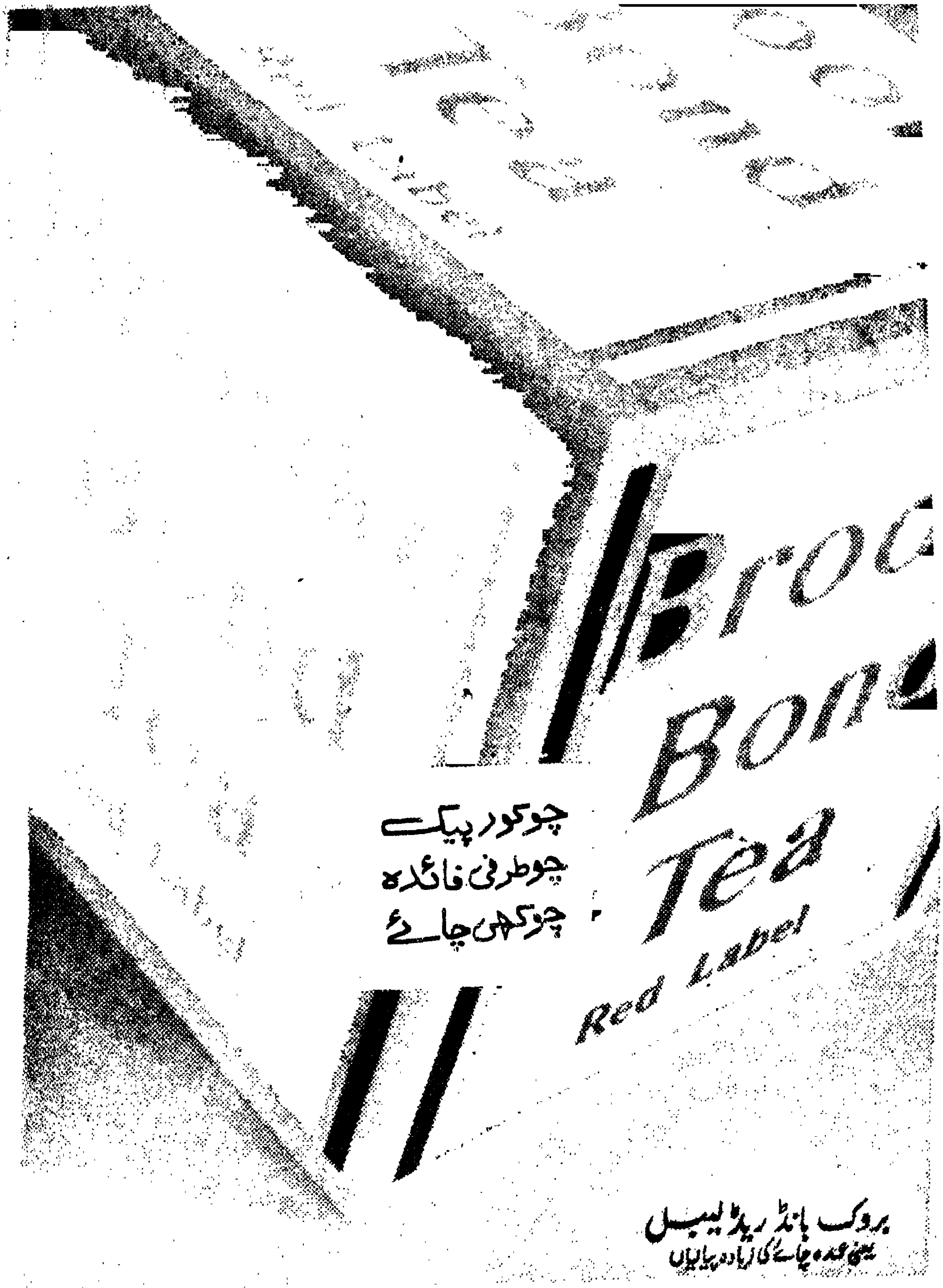
اپنا گلشن ہی لُٹ گیا منظر
ورنہ جانِ بہار تھے ہم بھی

غزل

شہریار پرواز میرٹھی

اک نہیں، سب ہی شہیدِ تلخیٔ گفتارِ دوست — سارا عالم ہے قتیلِ دشنۂ کردارِ دوست
جلوہ فرما دہ ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے عمر بھر — کم ہوتی ہے اور نہ ہو گی حسرتِ دیدارِ دوست
عکسِ رخ سے میکدے کا میکدہ گلنار ہے — صبح ہوتی ہے کہ نکہت گلگونیٔ رخسارِ دوست
طور کے مانند جلنے کو کلیجہ چاہیئے — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
غنچے اُس کے لبِ گفتار سے بنتے ہیں پھول — گُل کھلاتی ہے چمن میں شوخیٔ رفتارِ دوست
کل اگر موسیٰ نہ اُس کی تابِ جلوہ لا سکے — آج بھی کس کو ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
ساری تاریخِ کرم اُسکی جفاؤں پر نثار — کوئی میرے دل سے پوچھے لذّتِ آزارِ دوست

ہاں یونہی چھلکا کرے پرواز صبحِ حشر تک
رات کی خاموشیوں میں چشمۂ گفتارِ دوست


چوکور پیک
چوطرفی فائدہ
چوکھی چائے
Tea
Red Label
بروک بانڈ ریڈ لیبل
یعنی عمدہ چائے کی زیادہ پیالیاں

مِس جوزیفائن

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم۔ اے

معرفت رائزنگ اسٹار پریس، ۱۳۱ مین اسٹریٹ۔ مہو (مدھیہ پردیش)

برادرِ محترم! آداب و تسلیمات

نیا پتہ دیکھ کر چونکئے نہیں۔ سرکاری ملازمت میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب کہاں کے لئے احکام موصول ہو جائیں۔ خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیشہ رختِ سفر تیار رکھنا چاہئے اور یہی میرے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ مدھیہ پردیش کے نہ جانے کتنے شہروں میں رہ کر اب مہو آ پہنچا ہوں اور اللہ ہی جانیں کہ کب تک یہاں رہنا ہوگا۔ جاورہ کی زندگی میں ایک سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہو چلا تھا اور لکھنے پڑھنے کو طبیعت چاہنے لگی تھی کہ پھر عازمِ سفر ہونا پڑا خیر!

ارض و سما کے دَور میں ذکرِ قیام کیا؟

مہو خوبصورت جگہ ہے۔ "مدراس" کا ایک حصّہ کہا جاسکتا ہے۔ فوجی چھاؤنی ہونے کے باعث ہر آسانی مہیّا ہو سکتی ہے۔ کبھی یہاں انگلستان کے وزیرِ اعظم چرچل کا قیام بھی رہ چکا ہے ــــ افسانہ نمبر موصول ہوا تعریف احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی! اس لئے خاموشی بہترین ذریعۂ اظہار ہے ــــ لیجئے اب مِس جوزیفائن سے ملاقات کیجئے۔ یقین ہے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔۔۔

آپ کا بھائی ــــ ظفر احمد نظامی

آج دفتر میں سب ہی کلرک ٹھیک وقت پر پہنچ گئے تھے۔ سب میں کوئی نہ کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ بڑے بابو کافی عمر رسیدہ تھے۔ روزانہ ایسے کپڑے پہن کر آتے تھے جیسے وہ انھیں کسی مٹکے میں سے نکال کر لائے ہوں۔ لیکن آج اُن کے لباس پر ایک بھی شکن نہ تھی۔ کوٹ کے اوپر کی جیب میں فونٹن پین لگا ہوا تھا۔ رومال کا کچھ حصّہ جھانک کر اپنے نیلے پن کی غمّازی کر رہا تھا۔ اکاؤنٹنٹ ہفتوں شیو تک نہیں کراتا تھا مگر آج باقاعدہ مُنہ پر اُسترے کے سیدھے اور اُلٹے ہاتھ پھروا کر آیا تھا۔ کیشیئر کی عینک نے دھاگے کی جگہ نئی کمانی نے لے لی تھی، جس کا مظاہرہ وہ بار بار آنکھوں سے چشمہ ہٹا کر اُسے صاف کرنے کے بہانے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عملے کے بابو نے پاؤں میں جوتوں کے ساتھ موزوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ اِن ورڈ کلرک کی قمیص کے سارے بٹن ثابت تھے اور ڈسپیچ کلرک نے اپنے کوٹ میں گُلاب کی ایک ننھی سی کلی ٹانک کر پھولوں سے اپنی محبت جتانے کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ دفتر کا پُورا اسٹاف اپنی اپنی میز کرسیوں پر ڈٹا ہوا تھا۔ بظاہر اُن کے پاس کوئی خاص کام نہ تھا لیکن انھوں نے اپنی میزوں پر غیر ضروری فائلوں کا ڈھیر لگا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ انھیں سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ سب نے ایک دوسرے میں اِس نمایاں تبدیلی کو محسوس کیا لیکن زبان سے کوئی کچھ نہ بولا۔ سب چُپ چاپ اپنے کام میں مصروف ہونے کا بہانہ کر رہے تھے۔ اُن کی نظریں بار بار دفتر کے صدر دروازہ سے آنے والے راستے کی طرف اُٹھ رہی تھیں جیسے انھیں کسی کی آمد کا انتظار ہو۔ عموماً ایسی تبدیلیاں کسی بڑے افسر کے معائنے کے وقت رُونما ہوا کرتی ہیں اور دفتر والے چاق و چوبند رہ کر اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن آج نہ تو کسی بڑے افسر کا معائنہ تھا نہ کوئی دوسری ہی تقریب تھی۔ آج تو اُن کا بڑا صاحب بھی چھٹی پر تھا اور وہ آرام سے موج اُڑا سکتے تھے۔ پھر بھی وہ بہت زیادہ مستعد نظر آرہے تھے۔ بات یہ تھی کہ دفتر میں مِس جوزیفائن ٹائپسٹ کی جگہ آرہی تھی۔

"یار! اب تک نہیں آئی؟" اِن ورڈ کلرک نے سرگوشی کی۔

"آتی ہی ہوگی۔" ڈسپیچ کلرک نے دھیمی آواز میں کہا۔

"وقت تو ہوچکا!"

"بارہ بجے تک فورنون رہتاہے!"

"ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے، مجھے غلط فہمی ہوئی۔"

"کیسی غلط فہمی؟" ڈسپیچ کلرک نے مشکوک نگاہوں سے چونک کر پوچھا۔

"میں سمجھا اُسے ٹھیک وقت پر آناہے۔ اِس لئے دس بجتے ہی یہاں پہنچ گیا۔"

اور جواب میں دوسرا کلرک ہنس دیا۔ حالانکہ وہ خود اسی خیال کے تحت وقت سے کچھ پہلے دفتر آگیا تھا۔

دوسری میز پر سرگوشی ہوئی۔ اکاؤنٹنٹ کیشیر سے کہہ رہا تھا۔

"یہ تو اُس کے جوائن کرنے کا دن ہے؟"

"ہاں اُسے اپنے دفتر سے ریلیو ہوئے آج ایک ہفتہ ہورہا ہے۔"

"تو اُسے آج بہرحال جوائن کرنا ہوگا؟"

"بالکل!"

"اگر نہ آئی تو؟" تشویش کا اظہار ہوا۔

"سروس پر اُس کا اثر پڑسکتا ہے۔"

"بے چاری کا نقصان ہوجائے گا!"

"اُسے آج جوائن کرہی لینا چاہیئے۔"

"ہاں اُس کے حق میں یہی مناسب ہے۔"

اگلی میز پر بھی دو کلرک آپس میں باتیں کررہے تھے اور اِدھر اُدھر دیکھتے بھی جارہے تھے کہ کہیں کوئی اُن کی گفتگو سُن نہ رہا ہو۔

"یار کہیں اُس نے اپنا تبادلہ منسوخ تو نہیں کرالیا۔"

"اگر ایسا ہوتا تو دوسرے آرڈر آجاتے اب تک!"

"ہوسکتا ہے اب آجائیں۔"

"لیکن، یہ ہو نہیں سکتا۔"

"کیوں؟"

"وہ ایک اچھے دفتر میں آرہی ہے اور یہاں آنے کے لئے دوسرے کتنے ہی لوگ کوشاں ہوں گے۔"

"اُنھیں میں سے تو کسی نے اپنا تبادلہ کرانے کے لئے اِس کا آرڈر منسوخ نہیں کروادیا؟"

"پھر وہ دوسرا تو اِس کی جگہ آچکا ہوتا اب تک!"

"نہ جانے کیا بات ہے؟" اُس نے تشویش ظاہر کی۔

"خدا کرے جوائن کرہی لے۔"

"ہاں یہی اچھا ہے۔"

"وہ اپنا پورا جوائننگ ٹائم لے کر آئے گی۔"

"ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ویسے کوئی دوسرا کلرک ہوتا تو کبھی کا جوائن کرچکا ہوتا۔"

"کیوں؟"

"آج کل سفارشوں کا زمانہ جو ہے۔ ہوسکتا ہے اِسی دَوران میں کوئی دوسرا اپنی کوشش میں کامیاب ہوجائے۔"

"دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

اسی طرح ہر میز پر سرگوشی جنم لے کر دوسری میزوں تک پہنچتی رہی۔ کوئی اپنی نشست سے نہ اُٹھا تھا۔ ہر ایک کو اندیشہ تھا کہ کہیں اسی دَوران وہ آنہ جائے!

یہ ایک بڑا دفتر تھا جو کافی اہم سمجھا جاتا تھا لیکن اِس کے اسٹاف میں کوئی بھی لڑکی نہ تھی۔ اِسی لئے کلرک اُسے ایک ریگستان سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ جب وہ دوسرے دفتروں کی میزوں پر جھکی ہوئی لیڈی کلرکوں کو دیکھتے تو اُنھیں محسوس ہوتا جیسے کام کرنے کا صحیح لُطف اُنھیں دفتروں میں ہے۔ وہ اپنے دفتر کو ایک بھدّی سی گالی دے کر کسی ایسے آفس میں تبادلے کی خواہش کرنے لگتے جہاں لیڈی کلرکوں کی تعداد کافی ہو۔ جب اُن کے دوست کلرک اپنے اپنے دفتروں کے بارے میں اُن سے کہتے۔

"یار، اِن دنوں مِس مکرجی اور ماتھر کا رومان زوروں پہ ہے!"

"وہ کیسے؟"

دونوں لنچ پر ساتھ ہی باہر جاتے ہیں اور ذرا تنہائی پسند ہوگئے ہیں۔"

"بھئی آج تو حد ہی ہوگئی۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"دوست مِس شیلا نے چائے آفر کرتے ہوئے مجھے گھر پر بُلایا ہے۔"

"خوش نصیب ہو پیارے!"

"دوست! کیا کہوں مِس مادھوی کے ٹفن میں کریلے کتنے اچھے تھے!"

تو یہ باتیں سُن سُن کر وہ دل مسوس کر رہ جاتے ـــــ کیونکہ نہ اُن کے دفتر میں کوئی مِس شیلا تھی جو اِن کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی نہ کوئی مِس نگم جو اُنھیں لنچ پر مدعو کرتی۔ یا اُن سے رُومان لڑاتی۔ وہ تو ایک ریگستانی دفتر کے کلرک تھے جہاں بڑے بابو سے لے کر جھینگر چپراسی تک بابا آدم کا نمائندہ تھا۔ حوّا کی کسی بیٹی نے اب تک وہاں پہنچ کر اپنے ریشمیں بالوں کے سائے نہیں لہرائے تھے۔ وہ کسی لڑکی کو اپنے قریب کی میز پر نہیں دیکھ

سکے تھے جن کے جسم اور لباس سے سنو، پاؤڈر، کریم اور لونڈر کی خوشبوئیں اُڑتی ہوں۔ جن کی نازک کلائیوں میں چوڑیوں کی مدھم کھنک جلترنگ بجاسکتی ہو یا جس کے نرم قہقہے نغموں کی دُھن سے تعبیر کیے جاسکتے ہوں۔ انھیں تو صاحب کی ڈانٹ، بڑے بابو کی کرخت آواز اور بیڑیوں یا سستی سی چار مینار سگریٹ کے کثیف دھوئیں ہی سے سابقہ پڑا تھا اور انھیں کو وہ اپنی تقدیر سمجھ کر خاموش ہو رہتے تھے۔

کچھ دن پہلے مس جوزیفائن کے تبادلے کے احکام اُن کے دفتر میں موصول ہوئے تو انھیں اپنے وجود پر شک ہونے لگا۔ اُن کی حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ کسی دوسرے شہر سے تبدیل ہو کر آرہی تھی۔ انھیں محسوس ہوا جیسے اُن کا ریگستان گلستان میں تبدیل ہونے والا ہو! جس میں پھولوں کی مہک ہوگی، چوڑیوں کے ساز بجیں گے، ایجل عیس پاؤڈر اور ایوننگ اِن پیرس کی خوشبوؤں کی لپک دماغوں کو تر و تازہ کر دے گی اور اُس کی دُزدیدہ نگاہیں، حیا کو اُجاگر کر کے اُسے اور حسین بنا دیں گی۔ اب وہ بھی فخر کریں گے کہ وہ مس جوزیفائن کے ساتھ لنچ میں شریک ہوتے ہیں۔ انھیں بھی وہ چلتے آفر کرتے ہوئے گھر پر مدعو کرتی ہے۔ لنچ پر اُس کے ٹفن میں اُن کا حصہ بھی ہوتا ہے اور وہ بےتکلفی سے کمپاؤنڈ میں پھیلی ہوئی دُوب پر بیٹھ کر ایک دوسرے کی باتوں میں محو رہتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا جیسے دوسرے دفتروں میں اُن کے دوست کلرکوں کو میزوں پر جھکی ہوئی مس شیلا، مس نگم، مس مادھوی اور مس مکرجی کو اُن کے آگے شکستِ فاش ہوگئی ہو اور وہ اُن سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہ رہ گئی ہوں۔ انھوں نے دل ہی دل میں نہ جانے کتنے ارادوں اور خیالوں کو جنم دے کر اپنی تسکین کر لی۔

دفتر کے کلرک اپنے ساتھیوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پرکھنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ نئی نویلی مس جوزیفائن سے پینگیں بڑھانے کے جوہر کس میں ہیں۔ سب ایک دوسرے کو رقابت کی نگاہوں سے دیکھ کر اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ رہے تھے۔ نوجوان کلرک خود کو خوش نصیبی کی سند عطا کرتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ ضرور انھیں کو مس جوزیفائن کی قربت اور دوستی حاصل ہوگی۔ وہ خود کو اُس کی رفاقت کا حقدار تصور کر کے خوش ہو رہے تھے۔ جذبات اُن کی جوانی کا سرمایہ تھے۔ وہ اُس سرمایہ کی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے نئی ساتھی سے قربت کے احساس میں مجسم تصویر بنے رہنا چاہتے تھے۔

بڑی عمر کے لوگ نوجوان کلرکوں کو اپنا رقیب تو سمجھ رہے تھے لیکن اُن کا خیال تھا کہ اُن کی تجربہ کارانہ صلاحیتوں سے مس جوزیفائن ضرور مرعوب ہوگی اور انھیں کو اپنا صلاح کار اور مشیرِ خاص بنانے کا شرف حاصل کرے گی۔ وہ تجربہ کو جذبات پر ترجیح دے رہے تھے۔ اُن کی دُور اندیشی جوانی کی اُمنگوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مطمئن تھے اور انھیں اپنی تجربہ کارانہ ذہنیت پر پُورا اعتماد تھا کیونکہ نوجوان اور منچلے کلرکوں نے تو اپنے ہفتہ بھر کے لنچ کے لئے لائے جانے والی چیزوں کی فہرست تک مرتب کر لی تھی۔ بعض نے اپنے اپنے محلّے میں اُس کے لئے کرائے کے مکان دیکھ رکھے تھے کسی کسی نے اپنے کوارٹر کی صفائی تک کروا رکھی تھی۔ کیونکہ شہر میں اجنبی ہونے کے باعث مس جوزیفائن کا مکان نہ ملنے تک اُن کے ساتھ قیام کا امکان تھا۔

بڑے بابو بھی بار بار کمرے سے نکل کر کسی نہ کسی بہانے ایک آدھ چکر دوسرے کلرکوں کی میزوں تک لگا لیتے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی خوش تھے کہ اُن کے ماتحت اب ایک لڑکی بھی آرہی ہے جو خوش قسمتی سے اچھوتی کلی ہے۔ جسے اُن کے احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔ انھیں یقین تھا کہ وہ ضرور انھیں کے اشاروں پر چلنا پسند کرے گی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ٹائپنگ کا کام وہ اسی سے کرایا کریں گے اور پھر اُس کے کام میں غلطیاں تلاش کر کے اُسے تنبیہ کرنے کی عزت حاصل کرتے ہوئے مرعوب کر سکیں گے۔ وہ خوش تھے کہ جو جگہ عرصے سے خالی چلی آرہی تھی افسرانِ بالا نے ایک اچھی کارکن سے پُر کیا ہے۔

سرگوشیاں ہوتی رہیں اور وقت گزرتا رہا۔ نظریں اُٹھتی رہیں اور دھڑکنیں بڑھتی رہیں۔ لیکن وہ نہ آئی۔ لنچ کا وقت ہوگیا اور سب مایوس ہو کر کینٹین کی طرف اپنے اپنے ٹفن لے کر روانہ ہوگئے۔ وہ آج بہت سی چیزیں لے کر آئے تھے کہ جوزیفائن کو اپنے لنچ میں شریک کر کے اُسے اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیں گے۔ لیکن یہ لنچ شاید اُس کی قسمت ہی میں نہ تھا۔ آج کا موضوع صرف مس جوزیفائن تھی۔ اُن کے خیالوں میں اُس کی کافر جوانی تھی۔ اُس کا راہد فریب حُسن تھا۔ گلاب کی سُرخی کو شرمانے والے اُس کے رخسار تھے۔ اُس کے نرم و نازک ہونٹوں کی مسکراہٹ تھی جو کلیوں کے معصوم تبسّم کو ماند کر رہی ہو۔ اُن کے تصوّر میں اُس کی جواں سالی اور الھڑپن کی شوخی تھی۔

لنچ کے بعد وہ اُس کی شب تاب زلفوں کے خیالوں میں اپنی اپنی نشست پر آبیٹھے۔ اسی وقت صاحب کے کمرے کے پردے کو جنبش ہوئی اور ایک خاتون جس کا چہرہ جھرّیوں کا آئینہ دار تھا، پتلی اور سُوکھی کلائیاں چوڑیوں کی چمک سے بے نیاز تھیں، بالوں پر سَن کی رسیوں کا گمان ہوتا تھا اور جو کافی عمر رسیدہ معلوم ہوتی تھی گھٹنوں سے نیچا اسکرٹ پہنے، خشک ہونٹوں پر لپ اسٹک کی بدنُما تہیں جمائے ہاتھ میں وینٹی بیگ لئے پھیکی اور بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ برآمد ہوئی۔ اُس نے آتے ہی انگریزی میں کہا۔

"آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ناچیز کو مس جوزیفائن کہتے ہیں۔"
اور سب کے چہرے اِس طرح لٹک گئے جیسے اُس نے انھیں کوئی گالی دے دی ہو !!

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر منی آرڈر پر صاف و تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔ منیجر

...ی بھی ہوگی" ڈسپیچ کلرک نے دھیمی آواز میں کہا۔

"وقت تو ہو چکا!"

"یار وہ ٹھیک ٹھیک وقت پر تو ہوتا ہی رہتا ہے!"

"ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے، مجھے غلط فہمی ہوئی"

"کیسی غلط فہمی؟" ڈسپیچ کلرک نے مشکوک نگاہوں سے چونک کر پوچھا۔

"میں سمجھا اُسے ٹھیک وقت پر آنا ہے۔ اس لئے دس بجتے ہی یہاں پہنچ گیا"

اور جواب میں دوسرا کلرک ہنس دیا۔ حالانکہ وہ تو اسی خیال کے تحت وقت سے کچھ پہلے دفتر آگیا تھا۔

دوسری میز پر سرگوشی ہوئی۔ اکاؤنٹنٹ اسٹینو سے کہہ رہا تھا۔

"یہ تو اُس کے جوائن کرنے کا دن ہے؟"

"ہاں اُسے اپنے دفتر سے ریلیو ہوئے آج ایک ہفتہ ہو رہا ہے"

"تو اُسے آج بہر حال جوائن کرنا ہوگا؟"

"بالکل!"

"اگر نہ آئی تو؟" تشویش کا اظہار ہوا۔

"سروس پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے"

"تنخواہ کا نقصان ہو جائے گا!"

"اُسے آج جوائن کر ہی لینا چاہیئے"

"ہاں اُس کے حق میں یہی مناسب ہے"

اگلی میز پر بھی دو کلرک آپس میں باتیں کر رہے تھے اور اِدھر اُدھر دیکھتے بھی جارہے تھے کہ کہیں کوئی اُن کی گفتگو سُن نہ رہا ہو۔

"یار کہیں اُس نے اپنا تبادلہ منسوخ تو نہیں کرالیا؟"

"اگر ایسا ہوتا تو دوسرے آرڈر آجاتے اب تک!"

"ہوسکتا ہے اب آجائیں"

"لیکن یہ ہو نہیں سکتا"

"کیوں؟"

"وہ ایک اچھے دفتر میں آرہی ہے اور یہاں آنے کے لئے دوسرے کتنے ہی لوگ کوشاں ہوں گے"

"انھیں میں سے تو کسی نے اپنا تبادلہ کرانے کے لئے اِس کا آرڈر منسوخ نہیں کروا دیا؟"

"پھر وہ دوسرا تو اِس کی جگہ آچکا ہوتا اب تک!"

"نہ جانے کیا بات ہے؟" اُس نے تشویش ظاہر کی۔

"خدا کرے جوائن کر ہی لے"

"ہاں یہی اچھا ہے"

"وہ اپنا پورا جوائننگ ٹائم لے کر آئے گی"

"ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ویسے کوئی دوسرا کلرک ہوتا تو کبھی کا جوائن کر چکا ہوتا"

"کیوں؟"

"آج کل سفارشوں کا زمانہ جو ہے۔ ہوسکتا ہے اسی دوران میں کوئی دوسرا اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائے"

"دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

اسی طرح ہر میز پر سرگوشی جنم لے کر دوسری میزوں تک پہنچتی رہی۔ کوئی اپنی نشست سے نہ اُٹھا تھا۔ ہر ایک کو اندیشہ تھا کہ کہیں اسی دوران وہ آنہ جائے!

یہ ایک بڑا دفتر تھا جو کافی اہم سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے اسٹاف میں کوئی بھی لڑکی نہ تھی۔ اسی لئے کلرک اُسے ایک ریگستان سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ جب وہ دوسرے دفتروں کی میزوں پر جھکی ہوئی لیڈی کلرکوں کو دیکھتے تو انھیں محسوس ہوتا جیسے کام کرنے کا صحیح لطف انھیں دفتروں میں ہے۔ وہ اپنے دفتر کو ایک بھدّی سی گالی دے کر کسی ایسے آفس میں تبادلے کی خواہش کرنے لگتے جہاں لیڈی کلرکوں کی تعداد کافی ہو۔ جب اُن کے دوست کلرک اپنے اپنے دفتروں کے بارے میں اُن سے کہتے۔

"یار، ان دنوں مس مکرجی اور ماتھر کا رومان زوروں پر ہے!"

"وہ کیسے؟"

دونوں لنچ پر ساتھ ہی باہر جاتے ہیں اور ذرا تنہائی پسند ہوگئے ہیں"

"بھئی آج تو حد ہی ہوگئی"

"آخر ہوا کیا؟"

"دوست اِس شیلا نے چائے آفر کرتے ہوئے مجھے گھر پر بلایا ہے"

"خوش نصیب ہو بھیا!"

"دوست! کیا کہوں مس مادھوی کے ٹفن میں کریلے کتنے اچھے تھے!"

تو یہ باتیں سُن سُن کر وہ دل مسوس کر رہ جاتے ــــ کیونکہ نہ اُن کے دفتر میں کوئی مس شیلا تھی جو اِن کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی نہ کوئی مس نگم جو انھیں لنچ پر مدعو کرتی۔ یا اُن سے رومان لڑاتی۔ وہ تو ایک ریگستانی دفتر کے کلرک تھے جہاں بڑے بابو سے لے کر جھینگر چپراسی تک بابا آدم کا نمائندہ تھا۔ حوّا کی کسی بیٹی نے اب تک وہاں پہنچ کر اپنے ریشمیں بالوں کے سائے نہیں لہرائے تھے۔ وہ کسی لڑکی کو اپنے قریب کی میز پر نہیں دیکھ

سکے تھے جن کے جسم اور لباس سے سنو، پاؤڈر، کریم اور لونڈر کی خوشبوئیں اُڑتی ہوں. جن کی نازک کلائیوں میں چوڑیوں کی مدّھم کھنک جلترنگ بجا سکتی ہو یا جس کے نرم قہقہے نغموں کی دھن سے تعبیر کیے جا سکتے ہوں۔ اُنھیں تو صاحب کی ڈانٹ، بڑے بابو کی کرخت آواز اور بیڑیوں یا سستی سی چارمینار سگریٹ کے کثیف دھوئیں ہی سے سابقہ پڑا تھا اور انھیں کو وہ اپنی تقدیر سمجھ کر خاموش ہو رہتے تھے۔

کچھ دن پہلے مس جوزیفائن کے تبادلے کے احکام اُن کے دفتر میں موصول ہوئے تو اُنھیں اپنے وجود پر رشک ہونے لگا۔ اُن کی حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ کسی دوسرے شہر سے تبدیل ہوکر آ رہی تھی۔ اُنھیں محسوس ہوا جیسے اُن کا ریگستان گلستان میں تبدیل ہونے والا ہو! جس میں پھولوں کی مہک ہوگی، چوڑیوں کے ساز بجیں گے، ایجل فیس پاؤڈر اور ایوننگ اِن پیرس کی خوشبوؤں کی لپک دماغوں کو تر و تازہ کر دے گی اور اُس کی شرم دیدہ نگاہیں، حیا کو اُجاگر کر کے اُسے اور حسین بنا دیں گی۔ اب وہ بھی فخر کریں گے کہ وہ مس جوزیفائن کے ساتھ لنچ میں شریک ہوتے ہیں۔ اُنھیں کبھی وہ چلتے آفر کرتے ہوئے گھر پر مدعو کرتی ہے۔ لنچ پر اس کے ٹفن میں اُن کا حصّہ بھی ہوتا ہے اور وہ بے تکلفی سے کینٹین کے کمپاؤنڈ میں پھیلی ہوئی دُوب پر بیٹھ کر ایک دوسرے کی باتوں میں محو رہتے ہیں۔ اُنھوں نے محسوس کیا جیسے دوسرے دفتروں میں اُن کے دوست کلرکوں کو میزوں پر جھکی ہوئی مس شیلا، مس نگم، مس مادھوی اور مس مکرجی کو اُن کے آگے شکستِ فاش ہوگئی ہو اور وہ اُن سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہ رہ گئی ہوں۔ اُنھوں نے دل ہی دل میں نہ جانے کتنے ارادوں اور خیالوں کو جنم دے کر اپنی تسکین کر لی۔

دفتر کے کلرک اپنے ساتھیوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پرکھنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ نئی نویلی مس جوزیفائن سے پینگیں بڑھانے کے جوہر کس میں ہیں۔ سب ایک دوسرے کو رقابت کی نگاہوں سے دیکھ کر اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ رہے تھے۔ نوجوان کلرک خود کو خوش نصیبی کی سند عطا کرتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ ضرور اُنھیں کو مس جوزیفائن کی قربت اور دوستی حاصل ہوگی۔ وہ خود کو اُس کی رفاقت کا حقدار تصوّر کر کے خوش ہو رہے تھے۔ جذبات اُن کی جوانی کا سرمایہ تھے۔ وہ اُس سرمایہ کی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے نئی ساتھی سے قربت کے احساس میں مجسّم تصویر بنے رہنا چاہتے تھے۔

بڑی عمر کے لوگ نوجوان کلرکوں کو اپنا رقیب تو سمجھ رہے تھے لیکن اُن کا خیال تھا کہ اُن کی تجربہ کارانہ صلاحیتوں سے مس جوزیفائن ضرور مرعوب ہوگی اور اُنھیں کو اپنا مصلاحِ کار اور مشیرِ خاص بنانے کا شرف حاصل کرے گی۔ وہ تجربہ کو جذبات پر ترجیح دے رہے تھے۔ اُن کی دُور اندیشی جوانی کی اُمنگوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ مطمئن تھے اور اُنھیں اپنی تجربہ کارانہ ذہنیت پر پُورا اعتماد تھا۔ کئی نوجوان اور منچلے کلرکوں نے تو اپنے ہفتہ بھر کے لنچ کے لئے لائے جانے والی چیزوں کی فہرست تک مرتّب کر لی تھی۔ بعض نے اپنے اپنے محلّے میں اُس کے لئے کرائے کے مکان دیکھ رکھے تھے۔ کسی کسی نے اپنے کوارٹر کی صفائی تک کروا رکھی تھی۔ کیونکہ شہر میں اجنبی ہونے کے باعث مس جوزیفائن کا مکان نہ ملنے تک اُن کے ساتھ قیام کا امکان تھا۔

بڑے بابو بھی بار بار کمرے سے نکل کر کسی نہ کسی بہانے ایک آدھ چکر دوسرے کلرکوں کی میزوں تک لگا لیتے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی خوش تھے کہ اُن کے ماتحت اب ایک لڑکی بھی آ رہی ہے جو خوش قسمتی سے اچھوتی کلی ہے۔ جسے اُن کے احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔ اُنھیں یقین تھا کہ وہ ضرور اُنھیں کے اشاروں پر چلنا پسند کرے گی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ٹائپنگ کا کام وہ اُسی سے کرایا کریں گے اور پھر اُس کے کام میں غلطیاں تلاش کر کے اُسے تنبیہہ کرنے کی عزّت حاصل کرتے ہوئے مرعوب کر سکیں گے۔ وہ خوش تھے کہ جو جگہ عرصے سے خالی چلی آ رہی تھی افسرانِ بالا نے ایک اچھی کارکن سے پُر کیا ہے۔

سرگوشیاں ہوتی رہیں اور وقت گزرتا رہا۔ نظریں اُٹھتی رہیں اور دھڑکنیں بڑھتی رہیں۔ لیکن وہ نہ آئی۔ لنچ کا وقت ہوگیا اور سب مایوس ہوکر کینٹین کی طرف اپنے اپنے ٹفن لے کر روانہ ہوگئے۔ وہ آج بہت سی چیزیں لے کر آئے تھے کہ جوزیفائن کو اپنے لنچ میں شریک کر کے اُسے اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیں گے۔ لیکن یہ لنچ شاید اُس کی قسمت ہی میں نہ تھا۔ آج کا موضوع صرف مس جوزیفائن تھی۔ اُن کے خیالوں میں اُس کی کافر جوانی تھی۔ اُس کا زاہد فریب حُسن تھا۔ گلاب کی سُرخی کو شرمانے والے اُس کے رُخسار تھے۔ اُس کے نرم و نازک ہونٹوں کی مُسکراہٹ تھی جو کلیوں کے معصوم تبسّم کو ماند کر رہی ہو۔ اُن کے تصوّر میں اُس کی جواں سالی اور الھڑپن کی شوخی تھی۔

لنچ کے بعد وہ اُس کی شب تاب زُلفوں کے خیالوں میں اپنی اپنی نشست پر آ بیٹھے۔ اُسی وقت صاحب کے کمرے کے پردے کو جنبش ہوئی اور ایک خاتون جس کا چہرہ جھرّیوں کا آئینہ دار تھا، پتلی اور سوکھی کلائیاں چوڑیوں کی چمک سے بے نیاز تھیں، بالوں پر سن کی رسّیوں کا گمان ہوتا تھا اور جو کافی عمر رسیدہ معلوم ہوتی تھی گھٹنوں سے نیچا اسکرٹ پہنے، خشک ہونٹوں پر لپ اسٹک کی بدنُما تہیں جمائے ہاتھ میں وینٹی بیگ لئے پھیکی اور بناوٹی مُسکراہٹ کے ساتھ برآمد ہوئی۔ اُس نے آتے ہی انگریزی میں کہا۔

"آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ناچیز کو مس جوزیفائن کہتے ہیں ——"

اور سب کے چہرے اس طرح لٹک گئے جیسے اُس نے اُنھیں کوئی گالی دے دی ہو !!

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر آرڈر پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔ منیجر

غزل

نذیر بنارسی

زمیں پر جب وہ جلوہ فرما فلک پہ ہے چاند چودھویں کا
بہار کی نقرئی فضا میں مقابلہ ہے حسیں حسیں کا

بہار اپنے شباب پر ہے نظارہ کر حسن آفریں کا
چمن میں ہر گل کھلا ہے ایسے ہو جیسے مکھڑا کسی حسیں کا

تمہیں کبھی رونا دلِ حزیں کا مجھے بھی رونا دلِ حزیں کا
یہ زندگی کوئی زندگی ہے نہ تم کہیں کے نہ میں کہیں کا

اسی میں آنسو کی آبرو ہے کہ ہو کے رہ جائے اب زمیں کا
نہ اُن کے دامن کا ہو سکا جب تو ہوگا کیا میری آستیں کا

کسی کی اب تک خبر نہ آئی عجب کرشمہ ہے اُس زمیں کا
یہاں پہ جاتا ہے جو مسافر وہ ہو کے رہ جاتا ہے وہیں کا

ملے گی کیا داد روزِ محشر ہیں اُنکی آنکھیں تو وہ فسوں گر
وہ دیکھ لیں گے جو سوئے داور تو وہ بھی ہو جائے گا انہیں کا

پھری نظر پھر گیا مقدر خفا ہوئے تم جو بندہ پرور
بدل گئے آسماں کے تیور مزاج ملتا نہیں زمیں کا

اُسی طرف رخ ہو فصلِ گل کا وہ جس طرف پھیر دیں رخ اپنا
وہ جس زمیں پر ہوں جلوہ فرما نصیب کھل جائے اُس زمیں کا

کچھ ایسا طوفاں نے سر اُٹھایا وفا کا ایماں بھی ڈگمگایا
چلا وہ وہم و گماں کا جھونکا چراغ بجھنے لگا یقیں کا

نہ پوچھئے شدتِ محبت انھیں ہوئی ہے اگر ندامت
مری جبیں سے ٹپک پڑا ہے پسینہ اُن کی حسیں جبیں کا

نذیر کہتا ہے یہ قیافہ ہر ایک غنچہ ہے اک لفافہ
ہے ہر لفافے میں ایک نامہ بہارِ فطرت کی نازنیں کا

غزل

صغیر احمد صوفی بی اے، ایل ایل بی

چراغِ لطف جلاؤ کہ ہم غزل کہہ لیں
شبِ فراق ہے آؤ، کہ ہم غزل کہہ لیں

نظر، نظر سے ملاؤ کہ ہم غزل کہہ لیں
مئے نشاط پلاؤ کہ ہم غزل کہہ لیں

وہ سانحے جو اُمنگوں کی رہ میں حائل ہیں
اُنھیں نہ یاد دلاؤ، کہ ہم غزل کہہ لیں

تمہارے حسن کا چرچا ہے آسمانوں پر
کبھی زمین پہ آؤ کہ ہم غزل کہہ لیں

کچھ اور ڈوبتی جاتی ہے آج نبضِ گماں
یقیں کی شمع جلاؤ، کہ ہم غزل کہہ لیں

دیارِ دل میں محبت کے گیت رقصاں ہیں
مچل کے ساز اُٹھاؤ، کہ ہم غزل کہہ لیں

برس رہے ہیں فضاؤں میں نور کے نغمے
ہمارے چاند کو لاؤ، کہ ہم غزل کہہ لیں

ہنسو، کہ موجِ تبسم سے دل پہ [illegible]
کلی کو پھول بناؤ کہ ہم غزل کہہ لیں

نہ جانے کتنے تکلف کے بعد آئے ہو
ابھی یہاں سے نہ جاؤ، کہ ہم غزل کہہ لیں

تمہاری باتوں سے [illegible]
خدا کے واسطے جاؤ کہ ہم [illegible]

کچھ اہلِ ذوق تھے جو کہہ رہے تھے صوفی سے
غزل کے شعر سناؤ کہ ہم غزل کہہ لیں

افسانہ

دو کنواریاں

م۔ک۔ مہتاب ایم۔ اے

ڈبلیو زیڈ۔ ۱۴۴۴ شیو نگر۔ نئی دہلی نمبر ۱۸

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

بہت دنوں کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ سوچا تھا اس دوران میں کسی دن خود ہی نیاز حاصل کرنے چلوں گا لیکن کچھ دفتر کے بے ہنگم اوقات، کچھ ناسازیٔ طبع اور کچھ ناموافق موسم کے سبب نہ آ سکا۔ "بیسویں صدی" کی وساطت سے آپ کے درشن ہوتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی ترغیب ملتی رہتی ہے۔ ــــــ ایک کہانی ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ اور قارئین شرفِ قبولیت عطا کریں گے۔ ۔ ۔

مخلص ــــــــ م۔ک۔ مہتاب

وہ دونوں شاہ بلوط کے درخت کے نیچے بیٹھی گیلی لکڑی کی طرح سُلگ رہی تھیں جیسے آگ لگا کر کارواں روانہ ہو گیا ہو۔

نندہ اور اُروشی!

دونوں سرجری کا پریکٹیکل ختم ہونے کے بعد ہوسٹل نہیں گئی تھیں۔ دوپہر کو ایک انگریزی فلم دیکھی۔ اس کے بعد کافی ہاؤس میں بیٹھی رہیں اور اب اس پارک میں آ بیٹھی تھیں، جہاں چاروں طرف سبزے کا پردہ تنا ہوا تھا اور بیچ میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ساون کی کالی گھٹائیں آسمان پر گھری تھیں اور کبھی کبھی بارش کا سُر آتا جیسے کسی مست ہاتھی نے سونڈ اُٹھا کر زور سے پانی کی پھوار ماری ہو اور راہگیروں کو بھگو ڈالا ہو۔

"ایسے موسم میں کمرے کی گھٹن میں جا بیٹھنے کو کب جی چاہتا ہے؟" نندہ جو اپنی گول گول سُرخ اُنگلی منہ میں دابے کچھ سوچ رہی تھی، اُروشی کو کندھا مارتے ہوئے بولی۔

"تم بھی بادل کی طرح مست ہو رہی ہو یا ابھی فلم کے رومان کا اثر باقی ہے؟" اُروشی بولی۔

"تمہیں تو ہر وقت رومان ہی کی سوجھتی ہے۔ دیکھتی نہیں کیا پُر لطف موسم ہے۔ جی چاہتا ہے اُڑ کر ان بادلوں میں گھل مل جاؤں اور۔ ۔"

"اور۔ ۔ ۔ اور اپنے پریتم کی چھت پر برس پڑے!" اُروشی نے نندہ کی بات پوری کر دی اور دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

نندہ نے اپنا سفید کوٹ اور کتابیں بنچ پر رکھ دیں۔ دوپٹے کو گھٹنوں اور کمر کے گرد باندھ لیا۔ اُروشی کی پیٹھ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور انگریزی فلم کے ایک گیت کی دُھن گنگنانے لگی۔

"آج بڑی جذباتی ہو رہی ہو نندہ!" اُروشی اُسے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔

"فلم کی ہیروئن کی کامیابی کا خیال آ رہا ہے۔ فلم ختم ہوتے ہوتے وہ ہیرو سے کیسے گھُل مل گئی تھی جیسے وہ ایک ہی جسم کے دو حصے ہوں کتنا سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہوگا اس حالت میں جیسے اس کے بعد دنیا میں کسی اور چیز کی طلب باقی نہ رہی ہو۔"

اُروشی نندہ کی بات سن کر چپ ہنسنے لگی اور بولی "نندہ تمہیں دوسروں کی کامیابیوں سے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اُس وقت تمہیں اپنی ناکامیوں کا خیال کیوں نہیں آتا۔ میں بھی بے شک اُسی کشتی کی سوار ہوں مگر مجھے تو تمہاری ناکامیوں کا خیال آتے ہی کئی بار غصہ آنے لگتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں تم خود بے وقوف ہو۔ ہر کسی کو یوں چاہنے لگتی ہو جیسے وہ بس تمہارا ہی ہو۔"

"مجھ سے جھوٹ کہا نہیں جاتا اُروشی! جس سے پیار کرتی ہوں اُس کے اور اپنے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں رکھ سکتی اور جسے پسند نہیں کرتی اُس سے صاف

کہہ دیتی ہوں تجھے تم سے نفرت ہے!" نندہ نے سرد آہ بھری اور اُروشی کی پیٹھ پر بے دم سی ہو کر گر گئی۔

"اوہ ہو! کیا کرتی ہو نندہ! یہ جسم کسی چاہنے والے کے لئے بے شک پھول کی پتی ہوگا لیکن مجھ غریب کی کمر کیوں توڑتی ہو؟"

"تو کیا تمھیں مجھ سے پیار نہیں؟" نندہ نے اُروشی کی چوٹی کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہوگا۔ لیکن میں تو اِس وقت اُن لوگوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں جو تم سے پیار کرتے ہیں یا جنھیں تم پیار کرتی ہو۔ مجھے تو ڈاکٹر مینن یاد آرہا ہے۔ وہ پروفیسر بن کر آیا تھا یا دل پھینک! دو برس میں کلاس کی پانچ لڑکیوں سے رومان لڑا گیا۔ لیکن قصور تمھارا بھی تو ہے۔ پیار کرنے سے پہلے کچھ آگے پیچھے دیکھ تو لیا کرو بجینے جیسا جسم۔ یہ موٹی موٹی عینک مجھے تو اُسے دیکھتے ہی گھن آنے لگی تھی۔ نہ جانے تمھیں اُس کالے آدمی سے کیسے پیار ہوگیا؟"

"کرشن بھی تو کالا تھا" نندہ مُسکرائی۔

"لیکن وہ من کا تو اُجلا تھا جس میں سارا سنسار اپنا مُنہ دیکھتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر تو اندر باہر سے کالا تھا۔ تم باتوں میں آجاتی ہو۔ ڈاکٹر مینن باتیں ضرور لچھے دار کرتا تھا۔ تم اُن لچھوں میں اُلجھ گئیں اور یہ بھی نہ دیکھا کہ اُس کی باتوں کے جال میں اور کتنی لڑکیاں اُلجھی ہوئی ہیں۔ اب جب وہ چلا گیا ہے تو تمھیں معلوم ہوا ہے کہ تم کہاں بھٹک رہی ہو اور اِس جال میں اور کون کون سِسک رہا ہے۔

میں نہیں سمجھتی کہ تم نے فورتھ ائر کے کمل بھاج پر کیسے اعتبار کر لیا کہ وہ تمھیں واقعی چاہتا ہے۔ تم اُس کے ساتھ دو بار گھومنے اور تین بار شاپنگ کے لئے گئیں اور سمجھ بیٹھیں کہ وہ تم پر مرتا ہے۔ اری پگلی! یہ نوجوان تو اپنے دوستوں کو دکھانا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے کون کون سی چڑیاں پھانس رکھی ہیں یا اپنی فرصت کی گھڑیاں رنگین بنانا چاہتے ہیں۔ تم اُس کی تعریف کے پُل باندھتی رہیں اور جب اُس کا کورس ختم ہوا تو امرتسر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں کہتی ہوں تمھارے دماغ کے پیچ کچھ ڈھیلے ہیں۔ جو تمھیں چاہتا ہے اُسے تو تم دھکّے مار کر دروازے سے باہر کر دیتی ہو اور جو نہیں چاہتا اُس کے غم میں شمع کی صورت پگھل پگھل کر موم ہوتی جاتی ہو۔ میں کہتی ہوں کرشن موہن کو تم سے پیار تھا۔ مگر تم کہتی ہو وہ خود غرض اور لالچی ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو پیار کرنے کا حق اُسی کو ہے جس کے پاس سینما کے باکس بُک کرانے کے لئے موٹی رقم ہو، جو تمھیں ریس پر لے جا سکے، جو ہوٹلوں کی چکا چوند میں تمھارے ساتھ ناچ سکے، تمھیں شاپنگ کے لئے لے جائے تو پیکٹ اُٹھانے کے لئے تمھارے بازوؤں پر جگہ نہ رہے۔ اِس کا مطلب تو یہ ہے کہ جو تاج محل نہیں بنوا سکتا وہ پیار ہی نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حقیقت یہی ہے میری رانی کہ سچّا پیار وہی کرتے ہیں جن کے جیب میں رقم نہیں دل میں خون اُبلتا رہتا ہے اور جو خون کے آنسو روتے ہیں۔ باقی تو ظاہر دار ہیں۔ جہاں کہیں پھول دیکھتے ہیں نوچ کر اپنے کالر میں لگائے پھرتے ہیں اور اِس طرح اپنی امارت اور خوش نصیبی کی نمائش کرتے ہیں۔ اُس دن تم نے بہت بُرا کیا نندہ! کرشن موہن میری موجودگی میں بھی کئی بار تمھارے پاس آیا ہے۔ میں تو اُسے ایسا نہیں سمجھتی کہ اُس سے نفرت کی جائے لیکن تم نے تو اُسے خارش زدہ کتے کی طرح دھتکار دیا۔ ہر انسان کا اپنا اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔ اگر بھاج کے پاس موٹا بینک بیلنس ہے تو کرشن کے پاس خوبصورت جسم، قابلیت اور آرٹ ہے جس طرح ہر انسان اپنے سرمائے کی نمائش کرنا چاہتا ہے اُسی طرح کرشن بھی اُس دن یہی التجا لے کر آیا تھا کہ تم اُس کا میچ دیکھنے آنا۔ وہ سوچتا ہوگا کہ تمھارے وہاں آ بیٹھنے سے اُس کی حوصلہ افزائی ہوگی، اُسے تم سے وجدان حاصل ہوگا اور وہ اپنے کمال کا بخوبی مظاہرہ کر سکے گا لیکن تم نے اُسے یوں ذلیل کر کے لوٹا یا کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ اُس روز میچ کھیلنے بھی گیا ہو اور میں سچ کہتی ہوں نندہ کہ اگر اُس کی بجائے میں ہوتی اور میری محبت اِس طرح رُسوا ہوتی تو میں ضرور گھر لوٹ کر خودکشی کر لیتی۔"

"اچھا ہی ہوتا!" نندہ اُروشی کو کہنی مار کر بولی۔

"پروانہ تو جل جاتا ہے نندہ جی! لیکن صبح کے وقت شمع کی حالت بھی قابلِ دید ہوتی ہے۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک کہتی ہو اُروشی! لیکن اپنے گریبان میں کوئی جھانک کر نہیں دیکھتا نا۔ تم کیوں اڑیل ٹٹو بنی ہوئی ہو۔ جو تمھیں جتنا آگے کو کھینچتا ہے تم اتنا ہی پیچھے کو ہٹتی ہو۔ تم جو اِتنے لوگوں کو اُلّو بنایا کرتی ہو کسی سے شادی کیوں نہیں کر لیتی——

ریڈیو اسٹیشن کے اُس آرٹسٹ میں کون سے کیڑے پڑے ہیں جو تمھاری تفریحِ طبع کے لئے دو دو گھنٹے وائلن بجاتا رہتا ہے اور وہ ڈی اے وی کالج کا پروفیسر کالیہ جسے تمھارے پیار نے کالیداس بنا دیا ہے۔ میں نے تمھارے نام اُس کا ایک خط پڑھا تھا۔ اُس نے تمھاری غزالی آنکھوں، بپھرے دریا کی لہروں جیسے گیسوؤں، کہکشاں سے بازوؤں اور اُنگلیوں کی شمعوں کی تعریف میں جو نادر تشبیہات استعمال کی تھیں اگر اُنھیں یکجا کر دیا جائے تو کالیداس کی شکنتلا سے کسی طرح کم نہ ہو!

میں کہتی ہوں اگر تمھیں کسی سے محبت نہیں ہے تو کافی ہاؤس کے منیجر کھنّہ کو کیوں اُلّو بنا رہی ہو۔ آہیں بھرتے بھرتے اُس غریب کا گلاب کا سا رنگ کافی جیسا ہوگیا ہے۔ جب بھی ہم کافی ہاؤس جاتے ہیں، وہ پاگلوں کی طرح ہماری خدمت کے لئے آگے پیچھے بھاگا پھرتا ہے۔ بِل تک وہ اپنی گرہ سے ادا کر دیتا ہے اور تم ہو کہ بس مُسکرا کر اُسے تڑپتا چھوڑ آتی ہو۔

سیٹھ لال چند کے لڑکے اِندر میں کیا عیب تھا۔ وہ خوبصورت ہے، عقلمند ہے، مالدار ہے، دل کا بادشاہ ہے۔ جب بھی تم نے اشارہ کیا وہ کار لے کر

ہوسٹل پہنچ گیا۔ وہ دو دو گھنٹے سڑک پر دھوپ میں کھڑا رہا اور تم کولڈ کریم لگائے آئینے کے سامنے بیٹھی میک اپ کرتی رہیں۔ تم نے جو چاہا اُس نے کیا لیکن تم نے اُسے کبھی دامنِ اُمّید نہیں پکڑایا۔ وہ مجھے ایک دن ملا تھا، کہتا تھا: "اگر اُروشی وعدہ کرے کہ تعلیم ختم ہونے پر یا کہیں تقرّری ہو جانے پر تم اُسے اپنا ہاتھ دے دوگی تو وہ ایک دو برس اور انتظار کر سکتا ہے" لیکن تم نے اپنی سرد مہری سے اُس کے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔ وہ تمھارے ہی نہیں میرے بارے میں بھی اُلٹی سیدھی سوچنے لگا۔ کہتا تھا "لڑکیاں ہوتی ہی بے وفا ہیں" حالانکہ اُس کی اتنی حیثیت ہے کہ اگر تم چاہو تو وہ تمھیں کسی اچھے شہر میں کلینک کھول کر دے سکتا ہے۔ مگر تم نے تو سونے کا انڈا دینے والی یہ مُرغی ہی ذبح کر ڈالی۔ اُس روز وہ بہت اُداس بلکہ مایوس تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جاتا تھا۔ دل کا معاملہ ہے نا اُروشی! کاش تم اُس کی جگہ ہوتیں۔"

"ات ہے" اُروشی سرد آہ بھر کر بولی۔ "نندہ! تمھیں کیسے علم ہے کہ میں اُسے پیار نہیں کرتی۔"

"میں کہتی ہوں تم کسی سے پیار نہیں کرتیں۔ تمھیں اسٹیمنت کے بالوں اور اُس کی وائلن سے پیار ہے۔ تمھیں پروفیسر کالیہ کی باتیں اور تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ تمھیں آنند کی لمبی کار پسند ہے۔ تمھیں کھنہ کے کافی ہاؤس کا ماحول پسند ہے، مشروبات مرغوب ہیں۔ لیکن پیار تمھیں کسی سے نہیں ہے۔ تمھیں کسی سے پیار ہوتا تو تم کسی نہ کسی کی ضرور ہو گئی ہوتیں۔ چلو اٹھو ہوسٹل چلیں۔ دیر ہو گئی تو مشکل ہوگی۔" نندہ نے کوٹ اور کتابیں اٹھالیں۔

"نہیں نندہ بیٹھو!" اُروشی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اِن سب سے پیار ہے نندہ! میں نے کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ سوال یہ ہے کہ میں کِس کِس سے شادی کر سکتی ہوں۔ ہر عورت چاہتی ہے کہ لوگ اُس کے حُسن کی تعریف کریں، اُس کے فن کے قدر دان ہوں۔ میں بھی تو عورت ہوں۔ جب کوئی میری تعریف کرتا یا میرے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا چاہتا ہے تو مجھے بھی تو خوشی ہوتی ہے۔ لیکن اِس کا مطلب یہ تو نہیں کہ جو بھی میری تعریف کرے میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں۔ اِسی طرح مجھے بھی اِن لوگوں کی کئی خوبیاں بہت اچھی لگتی ہیں اور مجھے اُن سے پیار ہو جاتا ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کی کوئی خوبی مجھے اچھی لگے میں اُس سے شادی کر لوں۔ بالفرض میں کسی سے شادی کر بھی لوں تو اُس کے بعد بھی تو مجھے لوگ ملیں گے۔ پھر اگر کوئی مجھے چاہنے لگے یا مجھے کسی کی کوئی ادا پسند ہو تو میں شادی کے بعد شادی کرتی جاؤں۔ اگر پھر کبھی تمھیں اِندر ملے تو اُسے میرا عقیدہ بتا دینا اور کہنا کہ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ جب چاہے مجھے ساتھ لے جا سکتا ہے۔"

"اُروشی! جب تمھاری شادی ہو جائے گی تمھارے بچے ہو جائیں گے تو کیا پھر بھی دوسرے مَردوں کے لئے تمھارا رویّہ یہی رہے گا؟" نندہ نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

نندہ کی بات پر اُروشی ہنسنے لگی جیسے آسمان پر گھِرے بادلوں کے آنچل میں بجلی مسکرا رہی ہو۔

"کیا بات ہے ہنسنے لگی ہو؟"

"یونہی۔ نندہ! نہ جانے کیوں مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ پچھلے ہفتے ہسپتال میں ہم نے اُس لڑکی عائشہ کا اپریشن کیا تھا نا۔ وہ لڑکی بے ہوش تھی لیکن بچہ نہ ہونے سے درد و کرب کی جن لہروں میں وہ غوطے کھا رہی تھی وہ بے ہوشی میں بھی اُس کے چہرے سے عیاں تھیں۔ ڈاکٹر اُس لڑکی کا پیٹ چاک کر رہا تھا اور میں نہ جانے کہاں پرواز کر رہی تھی۔ مجھے اِس درد میں بہت ہی لُطف آ رہا تھا۔ میرا ذہن بچہ بننے کے تمام مراحل سے گُزر رہا تھا اور جب ڈاکٹر نے بچہ نکالا تو سچ کہتی ہوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ میرا ہی بچہ ہو اور میں نے ہی درد کے یہ تمام مراحل طے کئے ہوں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ گوشت کے اُس گلابی گلابی نرم نرم ٹکڑے کو اپنے سینے سے لگا لوں۔"

"توبہ۔ توبہ۔ توبہ!" نندہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "میں نے تو اپریشن کے دوران شاید دس بار آنکھیں بند کی ہوں گی۔ میں تو کھڑے کھڑے پسینے میں نہا گئی۔ کیا بچہ اِس طرح وجود میں آتا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں اُروشی! میں تو وہاں کھڑی یہی تصوّر کرتی رہی کہ میں دُلہن بن گئی۔ کوئی آیا، میرا گھونگھٹ اُٹھا اور میرے وجود میں سما گیا۔ پھر میرا جسم پھولنے لگا۔ پھر میرا پیٹ چاک کرنے کے لئے مجھے میز پر ڈال دیا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں چکرا کر گر جاؤں گی اور یہ مراحل دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کبھی شادی ہی نہ کروں۔" کہتے کہتے نندہ نے ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ لیا۔

"تم غلط سوچتی ہو نندہ! تم نے صرف تکلیف کا تصوّر کیا ہے۔ اُس راحت کو محسوس نہیں کیا جو ایک گُلگُلا سا مُنا چھاتیوں سے لگا کر حاصل ہوتی ہے اور جب تک یہ راحت حاصل نہیں ہوتی عورت کی رُوح بھٹکتی ہی رہتی ہے۔"

نندہ کوئی جواب دینے کی بجائے ہنسنے لگی۔ اُروشی بھی اُسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔ جیسے دونوں کوئی بات کہے بغیر سمجھ گئی ہوں۔

"کِس بات پر ہنسی ہو نندہ؟"

"یونہی۔"

"اُوں ہوں۔"

"پھر تم ہی بتاؤ!"

"اِس بات پر ہنسی ہو نا کہ یہ سب کچھ کرنے اور سب کچھ سوچنے کے بعد بھی ہم کنواری ہی ہیں!"

"ہاں۔" نندہ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔ "اُروشی کیا شادی صرف اِس رسم ہی کا نام ہے؟"

"رسم ہے یا نہیں لیکن میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ذہنی طور پر اِن تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہمیں اس لفظ سے بدکنا نہیں چاہئیے۔ جب تک ہم کسی پتھر پر پاؤں نہیں رکھ لیتیں۔ یہ من آوارہ بھولوں کی طرح بھٹکتا ہی رہے گا۔"

"تو کیا کیا جائے؟"

"میں بتاؤں تم کرشن موہن کی ہو جاؤ اور پھر دیکھو تمھیں کتنا سکون ملتا ہے۔"

"لیکن تم تو کہتی تھیں اس نے خودکشی کر لی ہوگی!" نندہ ہنسی۔

"کسی کو چاہنے والے اتنی جلدی کب مرتے ہیں!"

"لیکن تمھاری نجات کا ایک راستہ ہے۔ میں بتاؤں اگر تمھیں اندر پسند ہے اور وہ تمھیں چاہتا ہے تو اس سے وعدہ کیوں نہیں کرتیں؟"

"اچھا اچھا چھوڑو" نندہ کی بات پر اُروشی کے گال سرخ ہو گئے جیسے کسی نے آکر اس کا گھونگھٹ اُلٹ دیا ہو۔

وہ دونوں اپنے اپنے کمرے میں جا کر اپنے فیصلوں پر مسکرا رہی تھیں۔ اُروشی کی میز پر ایک ویڈنگ کارڈ رکھا تھا۔ ڈیزائن بہت خوبصورت تھی۔ اس نے سوچا وہ بھی اپنی شادی پر ایسا ہی کارڈ چھپوائے گی۔ لیکن کارڈ پڑھ کر اس کی زبان تلخ سی ہونے لگی۔ اکّار کو اِندر کی کسی لڑکی سے شادی تھی! سہرا بندی پر شرکت کی دعوت تھی۔ پسینے میں ڈوبی ہوئی اُروشی باہر برآمدے میں آکر دوپٹے سے ہوا کرنے لگی۔ نندہ کے کمرے میں بتی نہیں تھی۔ چوکیدار برآمدے میں سے گزر رہا تھا۔

"کہاں سے آرہے ہو گورکھا؟"

"میم صاحب! نندہ کو سندیش دینے گیا تھا۔ ایک کرشن بابو دو گھنٹے بیٹھ کر چلا گیا۔ کہتا تھا پھر وہ نہیں آئے گا۔"

اُروشی نے ہاتھ بڑھا کر اپنے کمرے کی بتی گُل کر دی!!

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

غزلیں

سراج الحسن سراج ادیب ایم اے

دل پر اِک اضطراب طاری ہے | دیدنی میری بے قراری ہے

پھر وہی انتظارِ جاں فرسا | پھر وہی عزم جاں سپاری ہے

پھر وہی آہ و نالۂ جاں سوز | پھر قیامت کی اشکباری ہے

سر بسر اِک مرقعِ حسرت | آج پھر زندگی ہماری ہے

آرزو کی شکستِ پیہم سے | دل پر افسردگی سی طاری ہے

شدتِ رنج، شامِ تنہائی! | خونِ دل چشمِ نم سے جاری ہے

واقعی اے سراج اُلفت میں
بے خودی عینِ ہوشیاری ہے

حفیظ بنارسی۔ ایم۔ اے

کس جگہ حُسن کا نشاں نہ ملا | ہم نے ڈھونڈا تو وہ کہاں نہ ملا

اُن کی بزمِ حسیں بھی دیکھ آئے | زندگی کا کہیں نشاں نہ ملا

داستانِ حیات کیا کہئے | کوئی عنوانِ داستاں نہ ملا

ہم بھی جلوؤں سے بے نیاز ہوئے | جب نگاہوں کا قدرداں نہ ملا

اِک نہ اِک غم ہر اِک کے ساتھ رہا | غم سے خالی کوئی یہاں نہ ملا

ہم نے دیکھا تھا جس کا خواب حسیں | آرزوؤں کا وہ جہاں نہ ملا

اِک زمانے سے ہم ملے، لیکن | کوئی اپنا مزاج داں نہ ملا

کیا جھکاتے سرِ نیاز حفیظ
جب کوئی سنگِ آستاں نہ ملا

مشرقی عورت

مہندر ناتھ بی۔ اے

چمپر بلڈنگ۔ مادھوداس پاستہ روڈ۔ دادر بمبئی نمبر ۱۴

محترم خوشتر صاحب! تسلیمات

ایک ہلکی پھلکی تخلیق "مشرقی عورت" بھیج رہا ہوں۔ پڑھنے والے اسے مشرقی عورت کی توہین نہ سمجھیں۔ اسے لائٹ انداز میں لکھا گیا ہے اور قارئین بھی اسے لائٹ موڈ میں پڑھیں تو انھیں لطف آئے گا — بمبئی میں ابھی خاصی بارش ہو رہی ہے۔ ایک زمانے سے آپ نے بمبئی میں قدم نہیں رکھا! آپ کے ادبی و سیاسی لطیفے سُننے کو بہت جی چاہتا ہے . . .

آپ کا — مہندر ناتھ

میرے والدِ محترم کافی دولت مند تھے اور بہت بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اسی لئے انھوں نے مجھے بچپن ہی میں ولایت بھیج دیا۔ تاکہ وہیں جاکر تعلیم حاصل کروں اور اگر ہو سکے تو نام بھی روشن کروں۔ ولایت کی آب و ہوا اور یہاں کا رہن سہن مجھے ایسا راس آیا کہ میں نے ہندوستان جانے کا نام نہ لیا۔

جب میں جوان ہوا تو والد صاحب نے بھی بُلانے کی زحمت گوارا نہ کی کیونکہ انھوں نے میری امّی جان کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لی تھی۔ شادی کے متعلق انھوں نے مجھے ایک خط لکھا۔ خط پڑھ کر مجھے زیادہ افسوس نہ ہوا۔ امّی جان سے ملے ہوئے ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اپنی پیاری امّی جان کی صورت تک بھول چکا تھا۔ ابّا جان کی صورت اس لئے یاد تھی کہ منی آرڈر ہمارے ابّا جان ہی بھجواتے تھے اور اپنے محسنوں کو کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ ایک ابّا جان اور سب پر رئیسِ اعظم! یعنی سونے پر سہاگہ!

ایک بار ابّا جان ولایت تشریف لائے۔ ہم دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر شراب پی۔ جب دو چار پیگ انھوں نے پی لئے تو فرمایا "صاحبزادے! تیری امّی جان نے اپنے پہلے خاوند سے طلاق لے کر تیرے ابّا جان سے شادی کر لی تھی۔ اب اگر تیرے ابّا جان نے تیری پیاری امّی جان کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لی تو اس میں کیا بُرائی ہے؟"

"جیسے کو تیسا ابّا جان! یعنی حساب بے باق!" میں نے چہک کر کہا۔

اس جواب سے وہ بے حد خوش ہوئے۔ پھر تھپکی دے کر کہا "تم واقعی میرے حقیقی فرزندِ ارجمند ہو! تم میرے نقشِ قدم پر چلوگے! شاباش بیٹے!!"

آج کل کے زمانے میں امیر والدین کے چکر میں پھنسنا بہت بڑی بیوقوفی ہے۔ امّی جان کے ابّا جان کافی امیر تھے۔ لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ اگر ابّا جان نے امّی جان کو طلاق دے دی تو امّی جان گھر سے بے گھر نہیں ہو سکتیں اور انھیں فاقے بھی نہ کرنے ہوں گے اور اگر اُن کی مرضی ہو تو وہ تیسری شادی بھی کر سکتی ہیں۔ اس لئے مجھے ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے تاکہ اپنا کاروبار بہت شاندار طریقے سے چلتا رہے۔ امّی جان کو تو ابّا جان نے طلاق دے دی ہے۔ اس موقعے پر ابّا جان کو ناراض کرنا دانشمندی نہ تھی۔

سوچا، لگے ہاتھ ابّا جان کو مبارکباد کا ایک تار دے دوں تاکہ اپنے وظیفے میں کمی نہ ہو۔

میں نے اپنی دانش مندی پر پورا بھروسہ کر کے تار دے دیا۔ نتیجہ بہت شاندار نکلا۔ یعنی میرے پیارے ابّا جان نے میرے وظیفے میں تین سو روپوں کا اضافہ کر دیا۔ لیجئے صاحب۔ اگر میں جذباتی ہو جاتا اور اصول، اخلاق، دیا، دھرم، پتی پتنی اور دوسری مجہول باتوں کا سہارا لے کر ابّا جان کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیتا تو صاف ظاہر ہے کہ اضافے کی بجائے وظیفے سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اگر میں ابّا جان کی دوسری شادی پر خاموشی اختیار کر لیتا اور مبارکباد کا تار نہ دیتا اور اس طرح سے کھلّم کھلّا اپنی رضامندی کی مہر ثبت نہ کرتا تو یقیناً گھاٹے میں رہتا۔ اب تو ہر روز یہی دعا کرتا ہوں کہ میرے ابّا جان جلد ہی تیسری شادی کرلیں اور میں پھر انھیں مبارکباد کا تار دوں، تاکہ میرے وظیفے میں اور اضافہ

ہو جاتے! صاف ظاہر ہے اگر میرے اباجان کو نئی نویلی دلہنوں سے پیار ہے تو مجھے نئے سِکّوں سے! گھاٹے میں والدِ محترم رہیں گے اور نہ ہی اُن کا صاحب زادہ!!

لندن میں پڑھنے کے علاوہ ہوٹلوں میں پلیٹیں دھوتا تھا۔ انگریزوں کو پلیٹیں دھونے اور صاف کرنے میں شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ اس قوم نے ہمیشہ حکومت کی ہے اور دوسروں کو غلام بنایا اور ہم نے غلامی کی ہے۔ اس لئے پلیٹیں دھونا ہمارا قومی پیشہ ہے۔ ہم ہندوستانی صفائی اور بلا وجہ کی ہنگامہ آرائی کے بڑے شیدائی ہیں۔ اپنے گھروں کو بالکل صاف نہیں رکھتے۔ دوسروں کے گھروں کو آئینے کی طرح چمکاتے ہیں۔ لندن میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی مثل بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ وہاں گھٹیا کام کا بہت بڑھیا معاوضہ ملتا ہے۔

میں نے فرصت کے اوقات میں پلیٹیں دھونے کا کام شروع کیا۔ اس طرح میری آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ والدِ محترم کو میرے بارے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بیٹا پڑھتا ہے تو پڑھے۔ نہیں پڑھتا تو نہ پڑھے۔ مجھے کام ملتا ہے تو ملے نہیں ملتا تو نہ ملے۔ اب جب کہ گھر میں ایک جوان امّی جان تشریف فرما ہیں۔ انھیں فرصت بھی کب ملتی ہوگی کہ وہ اپنے لختِ جگر کے بارے میں سوچیں۔ میں نے خود اس امر پر زیادہ سوچنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے ڈیڈی کے بنک بیلنس، اُن کی فراخدلی اور وسیع القلبی کا جائز اور ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا اور اپنے تمام گھٹیا، سستے، عامیانہ، جاہلانہ جذبات کو پاؤں تلے روند ڈالا اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اپنی ساری ذہانت صرف کر دی۔

پلیٹیں صاف کرنے کے علاوہ میں پڑھتا رہا۔ لگے ہاتھوں دو چار ڈگریاں بھی سمیٹ لیں۔ خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے والد صاحب روپے بھیج دیتے تھے۔ اس لئے مجھے کسی قسم کی فکر نہ تھی۔

جب انسان پیٹ کے چکّر سے آزاد ہوتا ہے تو عشق کے چکّر کا آغاز ہوتا ہے۔ ولایت میں وقت کاٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مغربی حسیناؤں سے عشق فرمایا جائے۔ ولایت میں عورتوں کی تعداد مَردوں سے زیادہ ہے۔ یہاں ہر ہندوستانی اور پاکستانی کو بہت آسانی سے ایک پڑھی لکھی انگریز عورت مل جاتی ہے۔ بس نگاہ سے نگاہ ملی ——— اور جیسے دل بھی مل گئے! ——— ایک زمانہ تھا کہ انگریز ہندوستان پر حکومت کرتا تھا۔ آج یہ حالت ہے کہ ہر ہندوستانی اور پاکستانی انگریز عورتوں پر حکومت کرتا ہے۔ [illegible] حکومت زیادہ دیرپا اور پائیدار ثابت ہوگی اور اس سلطنت کو کبھی

لندن میں رہ کر مغربی عورتوں سے پالا پڑا۔ جنابِ عالی! سچ بولنے سے گریز نہ کرنا چاہیئے۔ مغربی عورت بے حد بے باک اور کاروباری قسم کی ہوتی ہے۔ وہ پیار اور پریم کے چکّر میں نہیں پھنستی۔ ایک آزاد رنگین زندگی گزارنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ نگاہیں ملتے ہی پیار کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد ملنے کی جگہ اور تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اپنے تجربوں کی بِنا پر کہہ سکتا ہوں مغربی عورتیں وقت کی بے حد پابند ہوتی ہیں۔ ناز، نخروں، عشوہ طرازیوں سے بے نیاز نظر آتی ہیں۔ شرم و حیا، لاج وغیرہ کو قریب نہیں پھٹکنے دیتیں۔ جذباتیت سے کوسوں دُور بھاگتی ہیں۔ بے حد بزنس لائیک پیار کرتی ہیں۔ رونا، پیٹنا، آہیں بھرنا، گلے شکوے کرنا، شعر سُننا، سُنانا، انتظار کرنا، کرانا، رُوٹھنا، منانا! یہ تمام الفاظ اُن کی محبت کی ڈکشنری میں نہیں ملتے۔ آپ اگر شادی کے لئے آمادہ ہیں تو بخوشی چرچ یا رجسٹرار کے پاس جا کر شادی کیجئے۔ نہ برات نکلے گی، نہ بینڈ بجے گا۔ سیدھی سادی شادی اور اس کے بعد ایک خوش باش ازدواجی زندگی گزارئیے۔

ایک بار تو ایک ایسی لڑکی سے ملاقات ہو گئی جس نے چھوٹتے ہی یہ کہا "اگر تم بُرا نہ مانو تو میں یہ بتا دوں کہ میرا ایک بوائے فرینڈ بھی ہے۔"

"تو آپ کیوں پیار کرنے کی زحمت کر رہی ہیں؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"میں آپ سے پیار نہیں کرتی۔"

"تو کیا کرنا چاہتی ہیں؟"

"شادی!"

"جس لڑکے سے آپ پیار کر رہی ہیں اُس سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

"وہ پیار کرنے کے لئے ٹھیک ہے۔"

"اور میں ———؟"

"شادی کے لئے ———"

"واہ! کیا بات کہی ہے آپ نے محترمہ ——— آپ پیار کسی اور سے کریں اور شادی مجھ سے۔ اتنا چغد نہیں ہوں میں۔"

دو ٹوک جواب سُن کر وہ مجھ سے ناراض ہو گئی۔ پھر چند گالیوں سے نواز کر آگے بڑھ گئی۔

یہاں پر پیار اور شادی کے سلسلے میں کوئی روڑے نہیں اٹکاتا۔ ان دونوں چیزوں کی اِس مُلک میں زیادہ اہمیت نہیں۔ والدین تو خوش ہوتے ہیں۔ جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی صاحبزادی اپنے ساتھ بوائے فرینڈ لائی ہے۔ اپنے ہاں [illegible] پیٹ اور قتل تک کی نوبت آجاتی ہے۔ ولایت میں تو اِس خبر سے والدین کے چہرے [illegible]

سے چھکنے لگتے ہیں یعنی اب لڑکی تمکانے لگی اور اُس کا گھر آباد ہوا۔ وہ خود بھی کام کرے گی اور اپنے خاوند سے بھی کام کرائے گی۔ جب تک ازدواجی زندگی کی گاڑی اچھی طرح چلتی ہے، وہ آپ کا ساتھ دے گی۔ جب کبھی جھگڑا ہوا یا آپ نے بیزاری کا اظہار کیا، تو وہ خود ہی آپ کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ کسی اور سے راہ و رسم بڑھا لے گی۔

لندن میں طلاق بہت آسانی سے ملتی ہے۔ فریقین لڑتے جھگڑتے نہیں، آہ و زاری نہیں کرتے، الگ ہونے سے پہلے صفِ ماتم نہیں بچھ جاتی۔ بڑی سنجیدگی اور شرافت سے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ میرے دوست اکثر کہتے ہیں کہ میاں! تم خوش قسمت ہو کہ ابھی تک کسی مشرقی عورت سے آنکھ نہیں لڑی، ورنہ ساری ہیکڑی ختم ہو جاتی اور زندگی جہنم بن جاتی۔

ہم نے اسی لئے مشرق سے بھاگ کر مغرب میں پناہ لی ہے۔ خدا بچائے اِس مشرقی عورت سے!!

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں بچپن میں ولایت چلا آیا تھا اور اپنی حقیقی امی جان کو صرف ایک بار ہی دیکھا تھا۔ جب سے جوانی میں قدم رکھا چار پانچ لڑکیوں سے پیار کر چکا ہوں۔ یہ سب لڑکیاں مغربی تہذیب و تمدّن کی پروردہ تھیں۔ یوں کبھی کبھی دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی کہ یہ مشرقی عورت کیا بلا ہے جس کی مدح و ستائش میں شاعروں نے دیوان کے دیوان لکھ ڈالے ــــــ ہر شخص مشرقی عورت کی تعریف کرتا ہے۔ اگر اُس سے مُڈبھیڑ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ یوں لندن میں یہ مال ایکسپورٹ ہوتا ہے۔ لیکن بندۂ ناچیز اِس مال سے فیض یاب نہ ہو سکا۔

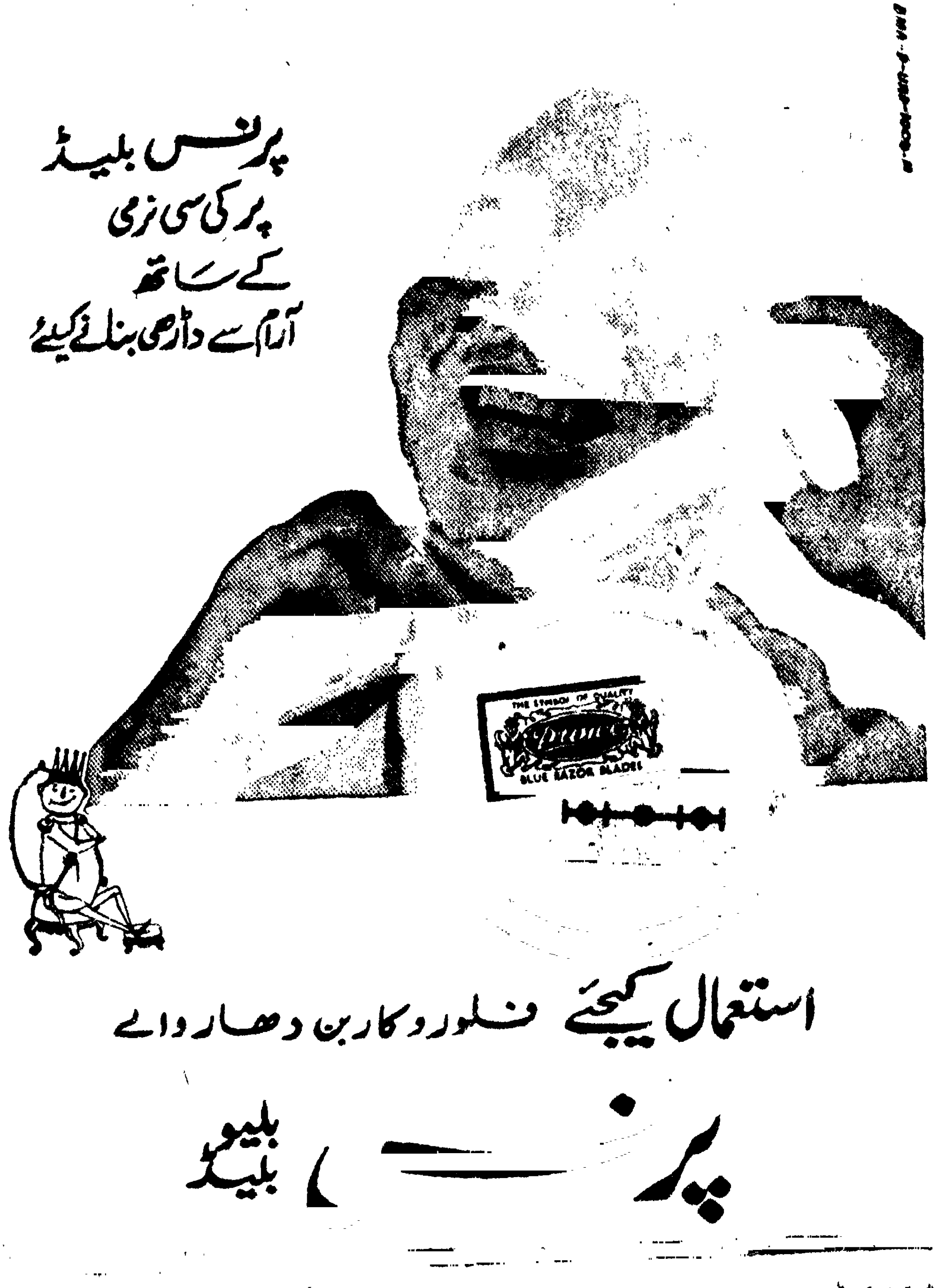
یعنی مغربی عورتوں سے پیار کرتے کرتے میں مشرقی عورت کا پرستار ہو گیا۔ مشرقی عورت کی مدح سرائی سُنتے سُنتے میرے کان بھر گئے۔ شرم و حیا کی دیوی، گھر کی رانی، سُگھڑ، شریف، خلوص اور ایثار کی پیکر۔ خاوند اور بچّوں پر مر مٹنے والی، مہمان نوازی کے فن میں یکتا۔ ساس اور سُسر کی خدمت کرنے والی۔ فرشتہ سیرت۔ نہ جانے کیسے کیسے خوبصورت لفظوں سے مشرقی عورت کو نوازا جاتا ہے کہ دل ہی دل میں اِس مشرقی عورت کو اپنانے کے لئے میں بے قرار ہو اُٹھا۔ میں اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر سیدھا لکھنؤ پہنچا۔ جہاں میرے والدِ محترم نے سرکاری نوکری سے چھٹکارا حاصل کر کے جوتوں کا بیوپار شروع کر دیا تھا۔ ہندوستانی جُوتے دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اِس تجارت میں ہماری قوم نے کافی نام پیدا کیا ہے۔ جُوتے مارنے اور کھانے میں ہماری قوم کا جواب نہیں! ــــ یوں ہندوستان کی آبادی کا زیادہ حصّہ ننگے پاؤں، ننگے سر اور ننگے دھڑ گھومتا ہے۔ خیر! یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔ پھر بھی ہمارے جوتے جرمنی، جاپان اور روس میں بے حد مقبول اور مشہور ہیں۔

میرے والدِ محترم نے میری بڑی خاطر کی۔ دوسری امی جان تو جان چھڑکنے لگیں۔ میری اِتنی خاطر مدارات کی کہ میں اپنی پہلی امی جان کو بھول گیا۔ اِدھر والد صاحب کا کاروبار خوب چمکا تھا۔ روپیوں کی ریل پیل تھی۔ حالات بے حد سازگار تھے اور میں اپنی پہلی امی جان کی جُدائی میں گھُل کر اپنی جدّی جائداد اور اُس کاروبار کے منافع سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے پُوری کوشش کی کہ دوسری امی جان کو ناراض ہونے کا موقع نہ ملے۔ میرے رویّے سے یہ لوگ اتنے خوش ہوئے کہ والد صاحب نے فوراً وصیت نامے میں میرے لئے اچھی خاصی رقم لکھ دی۔ اب تو انھیں یہ فکر لاحق تھی کہ اپنے ہونہار بیٹے کی شادی کی جائے۔

ابّا جان اِس دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے تھے کہ انھیں کسی اچھے گھرانے کی سُگھڑ اور شریف لڑکی مل جائے تو بیٹے کا گھر آباد ہو جائے۔ اِدھر میں مشرقی عورت کے حُسن و جمال سے اپنے ذوقِ جمال کو آسودہ کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ یہ کہیے کہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا کہ کب یہ نایاب شے میرے ہاتھ آئے اور میری زندگی میں بہار آ جائے۔

خدا خدا کر کے ایک جگہ معاملہ طے ہوا۔ لڑکی والوں نے مجھے دیکھ لیا۔ والدِ محترم کے جُوتوں کی دھاک چاروں طرف جمی ہوئی تھی۔ اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ۔ ولایت پاس لڑکا، روپیہ بے حساب۔ بے داغ لڑکا! مشرقی عورت کو اور کیا چاہیے۔ منگنی ہو گئی۔ لڑکی والے تو مجھے دیکھ چکے تھے۔ ہم اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ ایک بار اُس مشرقی عورت سے ملاقات ہو جائے تو دل کی کلی کھِل اُٹھے۔ کم سے کم شادی سے پہلے اُس چاند سے مکھڑے کو دیکھ لیں، معلوم تو ہو وہ کیا شے ہے! اُس کی زبان سے کیسے پھُول جھڑتے ہیں! شرم و حیا سے پلکیں کیسے جھُک جاتی ہیں۔ یہ خلوص اور ایثار کی پیکر، شرم و حیا کی دیوی۔ پہلی ملاقات میں ہمارا کیسے استقبال کرے گی۔ ہم نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ شادی سے پہلے اُن کے دیدار ہو جائیں۔ لیکن لڑکی کے والدین نہ مانے۔ ہمارے ہونے والے سُسر پُرانی تہذیب و تمدّن کے آخری ستون تھے۔ اُنھوں نے ہماری درخواست ٹھُکرا دی۔ والد صاحب تو مجھ پر برس پڑے۔ "ہماجزادے! تمھیں علم نہیں۔ لڑکی ایک بہت بڑے گھرانے کی ہے۔ زبان و بیان، تہذیب و تمدّن، رکھ رکھاؤ اور دوسری پُرانی قدروں کے چشمے اُس گھرانے سے پھُوٹتے ہیں۔ تمھاری ہونے والی بیوی۔ اصلی مشرقی عورت کا بہترین نمونہ ہے۔ دیکھنے سے کیا ہوگا۔ اُسے پا کر میرے انتخاب کی داد دیجیئے گا!"

والدِ محترم کا جواب سُن کر ہم اور بے تاب ہو گئے۔ ہم بھی جیمز بانڈ سے کم نہ تھے۔ شروع ہی سے جاسوسی اور سُراغ رسانی سے اچھا خاصہ شغف تھا۔ جاسوسی پنجہ پڑھ کر ہم اچھے خاصے جاسوس بن گئے تھے۔ ہم نے چند دنوں کے اندر ہی اپنی ہونے


پرنس بلیڈ
پر کی سی نرمی
کے ساتھ
آرام سے داڑھی بنانے کیلئے
THE SYMBOL OF QUALITY
Prince
BLUE RAZOR BLADES
استعمال کیجئے فلورو کاربن دھار والے
پرنس
بلیو بلیڈ

الی بیوی کے چھوٹے بھائی سے دوستی گانٹھ لی اور اُس کی منت سماجت کرکے ایک باغ میں اپنی ہونے والی بیوی سے ایک ملاقات ٹھہرائی۔

ہم تو وقتِ مقررہ سے پہلے ہی باغ میں پہنچ گئے۔ ہماری نظر بار بار گیٹ کی طرف جاتی۔ اتنے میں ایک بار کیا دیکھا کہ ایک برقعہ پوش عورت باغ میں داخل ہو رہی تھی۔ اُس عورت کے ساتھ آصف تھا۔ میری منگیتر کے سوا اور کون ہو سکتی ہے۔ آصف نے آتے ہی آداب کیا۔ میں نے آصف کو آنکھ ماری۔ اشارہ پاتے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"تشریف رکھیے" اُس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

وہ ایک بینچ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"برقعہ تو اُتار دیجیے اور اس چاند سے مُکھڑے کو ــــــ"

"جی؟" اُنھوں نے روکھے انداز میں کہا۔

"گستاخی معاف اب تو برقعہ اُتار دیجیے۔ میں کوئی غیر نہیں۔ اپنا نورانی چہرہ تو دکھائیے۔"

میری درخواست قبول کر لی گئی۔ اُنھوں نے شرماتے ہوئے رُخِ روشن سے چق اُٹھا دی۔

"سبحان اللہ! بے حد حسین اور قیامت برپا کرنے والا چہرہ تھا! دیکھ کر میں اور بے چین ہو گیا۔

میں ذرا قریب سرکا۔

"دُور رہیے!" اُنھوں نے مجھ سے دُور ہوتے ہوئے کہا اور شرم اور لاج کے مارے وہ دوہری ہو گئیں۔

واقعی ہماری ہونے والی بیوی خالص مشرقی لڑکی تھی۔

"اب تو قریب آنے دو! بس دو چار دنوں کی بات ہے۔ اپنوں سے شرم کس بات کی۔ تھوڑی سی کورٹ شپ ہو جائے تو کیا حرج ہے۔" میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کورٹ شپ کیا ہوتی ہے؟" یہ کہتے ہوئے مشرقی لڑکی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"بس یہی ذرا ملنا ملانا۔ ایک دوسرے سے بات کرنا۔ ایک دوسرے کو پہچاننا۔ تاکہ فریقین ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو جائیں۔ لندن میں آپ ہوتیں تو آپ بھی مجھ سے ہاتھ ملاتیں اور کہتیں "شادی میں کتنی دیر ہے ڈارلنگ؟""

"میں اتنی بے شرم نہیں۔ لندن کی باتیں لندن میں ہوں گی۔ ہم لوگ اتنے بے حیا نہیں! سُنا آپ نے؟"

"خیر غصہ تھوک دیجیے۔ ذرا اور قریب آئیے۔"

"ذرا اور قریب ــــ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"اس وقت تو میں آپ کو اپنی محبوبہ سمجھتا ہوں۔ شادی کے بعد بیوی سمجھوں گا۔" میں خود ہی ذرا اور قریب ہو گیا۔

"کچھ خیال کیجیے! دیتی ہوں! نزدیک آنے کی ضرورت نہیں۔" میری منگیتر نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟"

"کیا کہے گا؟" میں نے بے تکلف ہو کر کہا۔

"ابھی امی جان اور بھائی جان کو معلوم ہو گیا تو مجھے زندہ قبر میں گاڑ دیں گے۔ آصف کہاں ہے؟"

"وہ تو کدھر چلا گیا"

"مجھے یہاں چھوڑ کر؟ ہائے اللہ! اب کیا کروں؟"

"تو کیوں ایسا سمجھتی ہیں؟ میں آپ کے پاس ہوں! آپ کا ہونے والا خاوند۔ آپ کا دیرینہ آپ کی عزت اور حفاظت کا رکھوالا۔"

"ہائے اللہ! اندھیرا ہو رہا ہے۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا! لالٹین تک نہیں!"

"حضور آپ کا چہرہ ہی لالٹین بنا ہوا ہے! دیکھیے نا کتنا پیارا موسم ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بادِ نسیم چل رہی ہے!" میں نے اور قریب سرکتے ہوئے کہا۔

"میری جان نکلی جا رہی ہے اور آپ بادِ نسیم کی بات کر رہے ہیں! حضور! یہ لندن نہیں، لکھنؤ ہے۔ یہاں تو قیامت کی گرمی پڑتی ہے۔ اے ہاں! آپ نے میرا ہاتھ کیوں پکڑ لیا ــــ؟"

"میں نے تو اس وقت صرف آپ کا ہاتھ پکڑا ہے۔ یوں تو ہاتھ کے علاوہ بھی سب کچھ میرا ہے!"

"ابھی نہیں، شادی کے بعد۔ چھوڑیے میرا ہاتھ!" اُس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ آپ اس قسم کی غیر شریفانہ حرکتیں کریں گے تو میں یہاں کبھی نہ آتی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ تہذیب کے دائرے میں رہ کر بات کریں گے۔ آپ تو نرے لوفر ــــ"

"جناب! میں آپ کا منگیتر ہوں۔ لوفر نہیں! دو چار میٹھے بول بول لیے۔ اگر شادی سے پہلے میں نے آپ کے نرم اور ملائم ہاتھوں کو چھُو لیا تو کون سی قیامت آ گئی۔ اگر اس وقت میں آپ کے رخساروں کو چھُو لوں تو کون سی بجلی گر پڑے گی! اگر ان سیاہ اور ریشمی زلفوں کو ــــ"

"شٹ اپ یُو راسکل!" میری منگیتر نے بھڑک کر کہا۔

"بہت خوب! انگلش بھی آتی ہے آپ کو؟ بہت مسرت ہوئی انگلش کی

گالیاں سنوں کر؟"

"سو دو چار اور سناؤں؟"

"پانچ دس گنائیے۔ دو چار سے کیا ہوگا؟"

"آپ بڑے بے شرم ہیں!"

"ہمارے دل گردے کی داد دیجئے کہ گالیاں کھا کر بھی خفا نہیں ہوتے۔"

"گالیاں دینے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ لیکن آپ حد سے آگے بڑھ رہے ہیں۔"

"مان لی ہم نے اپنی غلطی۔ ذرا اپنا ہاتھ ــــــ"

"پھر وہی بات؟ اگر بڑے بھائی جان کو معلوم ہو گیا تو ــــــ"

"چھوٹے بھائی جان کو معلوم ہے۔ بڑے بھائی جان کو پتہ لگ گیا تو کیا ہوگا؟"

"میری بوٹی بوٹی کر دیں گے!"

"کیا انھیں قانون کا کوئی ڈر نہیں۔ پھانسی پر چڑھنے کے لئے تیار ہیں وہ؟"

"اپنی عزت اور آبرو کے لئے وہ جان پر بھی کھیل جائیں گے!"

"اور آپ؟"

"میں بھی اپنے شریف باپ کی بیٹی ہوں۔ میری رگوں میں وہی خون گردش کرتا ہے۔"

"چھوڑئیے ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ لائیے اپنا ہاتھ۔"

"پھر وہی بات؟ حضور! آپ مجھے چھو نہیں سکتے!"

"اچھا۔ گولی ماریئے اپنے ہاتھ کو! پھر دیکھنے چلیں گی ہمارے ساتھ؟"

"لاحول ولاقوۃ ــــــ شادی سے پہلے ناممکن!"

"کیوں؟"

"ابا جان کیا کہیں گے؟"

"میں آپ کے ابا جان کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میں نہیں جاؤں گی!"

"میرے دوست کے گھر چلیں گی؟"

"اوئی اللہ!"

"سیر کرنے چلیں گی میرے ساتھ ٹیکسی میں؟"

"کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے؟"

"ایک شریف، باوقار، سگھڑ لڑکی! ــــــ لیکن آپ تو مجھے لوفر سمجھتی ہیں۔"

"جی نہیں۔ بات یوں ہے کہ امی جان ناراض ہوں گی۔"

"کوئی بات اپنی بھی کہئے۔ ہر بات میں امی جان، ابا جان، بھائی جان! ــــــ ادھر دیجئے، اپنا ہاتھ ــــــ" آخر میں نے اپنی منگیتر کا ہاتھ پکڑ ہی لیا۔

"چھوڑئیے میرا ہاتھ! ورنہ ایک ایسا چانٹا دوں گی کہ چاروں طبق روشن ہو جائیں گے! مشرقی عورت اپنی عزت بچانے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتی ہے۔"

"چاہے قسمت تباہ ہو جائے؟" میں نے چمک کر کہا۔

"قسمت تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے، لیکن شادی سے پہلے عزت تباہ نہ ہونی چاہئے۔ میں اپنے والدین کو کیا جواب دوں گی؟"

"والدین ــــــ؟" میں نے چیخ کر کہا "سنئے۔ میں آپ کے گھر والوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کے والد محترم میرے والد محترم کے ساتھ شراب پی چکے ہیں اور آپ کے بڑے بھائی جان، جن کی شرافت کے چرچے آپ کرتی ہیں وہ میرے ساتھ ایک بالاخانے پر جا کر ایک ماہ جبیں کا گانا سن چکے ہیں۔ صرف میں آپ کی امی جان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ اُن کے بارے میں جاننے کی تمنا ہی رکھتا ہوں!"

"جناب! تہذیب کے دائرے میں رہ کر بات کیجئے۔ میں اپنے ابا جان، امی جان اور بھائی جان کے بارے میں اس طرح کے جملے سننا پسند نہیں کرتی اور جب تک آپ کے ساتھ میرا نکاح نہیں ہو جاتا میں آپ کو اپنے والدین کے خلاف کچھ کہنے کی اجازت نہ دوں گی۔ میں خالص مشرقی عورت ہوں!"

"یہ خالص مشرقی عورت کیا ہوتی ہے؟"

"آپ کے سامنے بیٹھی ہے!"

"آپ مجھے خالص بیوقوف نظر آتی ہیں!"

"مجھے اس بیوقوفی پر ناز ہے! اور میں آج ہی اپنے ابا جان سے کہہ دوں گی کہ مجھے ایسا بے حیا، بدتمیز دولھا نہیں چاہئے!"

"بڑا احسان ہوگا آپ کا! صرف مجھ پر ہی نہیں، میری سات پشتوں پر! دیکھئے نا۔ ایک ہی ملاقات میں چودہ طبق روشن ہو گئے! اگر یہ ملاقات نہ ہوتی تو شادی کے بعد ہم دونوں کی زندگیاں اجیرن ہو جاتیں!"

"اچھا خدا حافظ!" میری منگیتر غصے سے بل کھاتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے سوچا، اس خالص مشرقی عورت سے دُور ہی رہنا چاہئے ورنہ زندگی جہنم بن جائے گی!!

غزل

غزالہ شفاق شاہجہانپوری

فکرِ فردا ہمیں اے گردشِ ایام نہیں
ہم سے دیوانوں کو اندیشۂ انجام نہیں

لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کیساتھ
تو سلامت رہے میں شہر میں گمنام نہیں

اب تو ہر ایک گریزاں ہے کسے اپناؤں
تیرا غم بھی تو رفیقِ دلِ ناکام نہیں

زندگی کیا ہے بس اک سایۂ تاریکی ہے
دُور تک جس میں اُجالے کا کہیں نام نہیں

وائے حالات کہ تجھکو بھی بھُلا بیٹھی ہوں
اب تو مدت سے مرے لب پہ ترا نام نہیں

سیلِ غم میں بھی کبھی آنکھ سے آنسو نہ گرا
جوش میں آکے چھلک جائے یہ وہ جام نہیں

اس طرح دیکھتے ہیں میری طرف وہ جیسے
اُن کی آنکھوں میں غزالہ کوئی پیغام نہیں

غزل

منوراج بھٹ

جبینِ حسن پہ بل آ رہا ہے
دلِ کون و مکاں تھرا رہا ہے

ذرا، اے گردشِ دوراں! ٹھہرنا
کوئی مجھ پر کرم فرما رہا ہے

رُخِ پُر نور سے زُلفیں ہٹا لو!
فضاؤں پر اندھیرا چھا رہا ہے

یہ کون اُٹھ کر گیا ہے انجمن سے!
دلِ بے تاب بیٹھا جا رہا ہے

بدلتے جا رہے ہیں آشنا، سب
زمانہ اب سمجھ میں آ رہا ہے

مرے نقشِ قدم پہ کوئی چل کر
نہ جانے کیوں مری سمت آ رہا ہے

بہار! اُن سے بچھڑا ہی جب بِلی تھیں
وہ لمحہ آج تک یاد آ رہا ہے

غزل

ساغر محمدی

افسردہ و ملول و پریشاں رہے ہیں ہم
پھر بھی ہر انجمن میں غزلخواں رہے ہیں ہم

ہر ہر قدم پہ ہم نے لُٹایا ہے خونِ دل
کیسے کہیں کہ بے سروساماں رہے ہیں ہم

یہ شہرِ آرزو یہ اُمیدوں کی سرزمیں
اس شہر میں بھی چاک گریباں رہے ہیں ہم

اے دوستو عجیب ہے یہ رسمِ عاشقی
اُن سے خطا ہوئی تو پشیماں رہے ہیں ہم

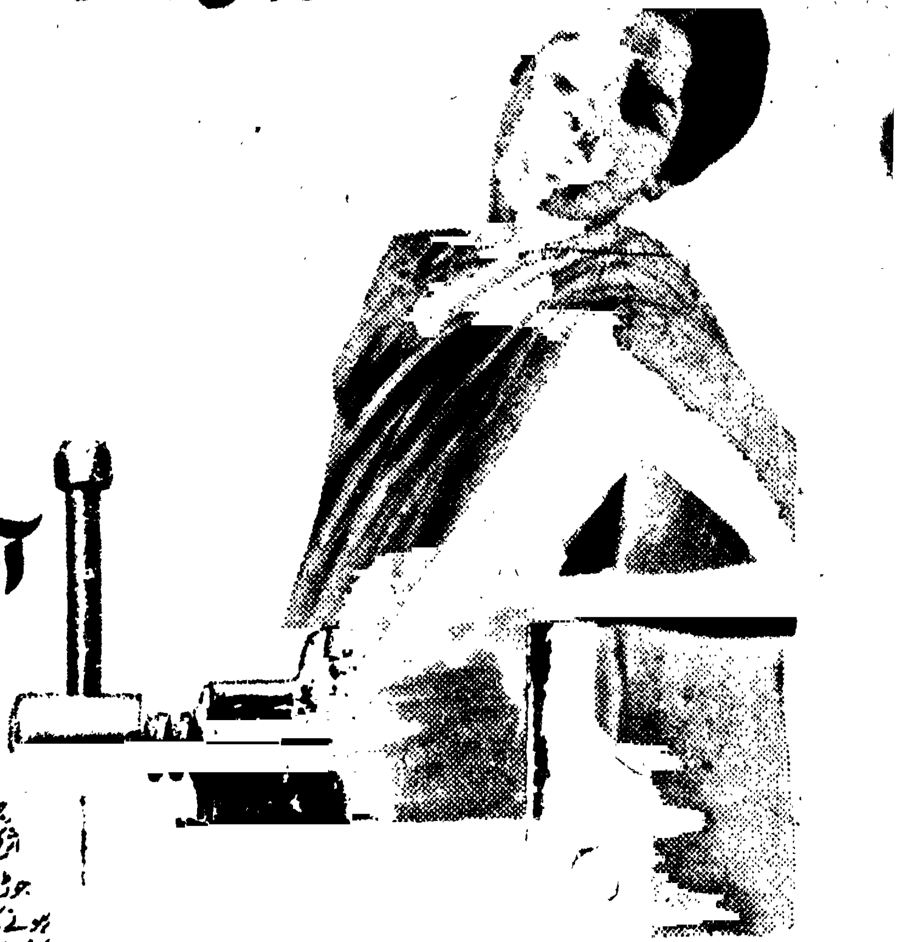
ہر دور جانتا ہے ہمارا وقارِ عزم
ہر عہد میں مقابلِ طوفاں رہے ہیں ہم

اے سیلِ غم کچھ اور بڑھا غم کی وسعتیں
اُن کو یقیں نہیں کہ پریشاں رہے ہیں ہم

ساغر اسی کا نام ہے معراجِ زندگی
ناکامیوں کے بعد بھی کوشاں رہے ہیں ہم

درد کی جکڑ سے چھٹکارا پائیے

جوڑوں کی اکڑن
سوجن اور جلن
موچ
پٹھوں کے درد
کے لئے



میتھل سیلی سیلیٹ والی

آئیوڈیکس*

استعمال کیجئے

آئیوڈیکس انتہائی ملائمت سے
جلد کے اندر سرایت کر کے پٹھوں اور رگوں پر
اثر کرتی ہے اور درد کو تیزی سے دور کرتی ہے۔
جوڑوں کی اکڑن یا سوجن اور جلن سے پریشان
ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس آئیوڈیکس ملئے۔
آئیوڈیکس میں شامل خاص اجزاء کی وجہ سے
درد جلد دور ہو جاتا ہے اور بڑا سکون ملتا ہے۔
کچے زخم اور گھاؤ کے لئے آئیوڈیکس بلیلین
استعمال کیجئے۔ آئیوڈیکس سے داغ دھبے نہیں پڑتے۔

ہو درد اور ٹیس جہاں
ملئے آئیوڈیکس وہاں



SKF-6922(u)

اسمتھ کلائن اینڈ فرینچ کی تیار کردہ

* رجسٹرڈ ٹریڈ مارک

عالمِ خیال میں ——

یاس یگانہ سے انٹرویو

نریش کمار شاد ——

۱۹۲۵ تیمار پور۔ دہلی

۲۰ اگست ۱۹۶۸ء   مجتبیٰ و محترمی خوشتر صاحب!

اقبال کے بعد اُن کے بدترین حریف یاس یگانہ سے انٹرویو ملاحظہ فرمائیے جن کا تنقیدی شعور اُنہیں لے ڈوبا لیکن باایں ہمہ جن کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کا —— نریش کمار شاد

شاد: "میرزا صاحب! آپ کی زندگی اور شاعری سے متعلق کچھ جاننے کے لئے براہِ راست آپ ہی سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ میرا یہ انتخاب صحیح ہے نا؟"

یاس: "یگانہ تُو ہی جانے اپنی حقیقت
تجھے کون تیرے سوا جانتا ہے"

شاد: تو سب سے پہلے اپنے ایسے چند اشعار سنانے کی زحمت فرمائیے جو واضح طور پر آپ کے فلسفۂ حیات کے ترجمان ہوں۔"

یاس: "خاک کا پتلا بگولہ دشت کا ہو جائے گا
مِٹ کے بھی اِک پیکرِ نشو و نما ہو جائے گا"

جو خاک کا پُتلا، وہی صحرا کا بگولہ
مٹنے پہ بھی اِک ہستی برباد رہے گی

کارگاہِ عالم کی نیستی بھی ہستی ہے
اِک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا مجال
طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

شاد: "اس کا مطلب ہے کہ آپ زندگی کو رواں، دواں اور جاوداں سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنی زندگی میں ایسی بیگانہ روی کیوں اختیار کی جس کے بارے میں آپ خود بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

یاس: "بزمِ دنیا میں یگانہ ایسی بیگانہ روی
میں نے مانا عیب ہے لیکن ہنر میرے لئے"

شاد: "کمال ہے! آپ اسے ہنر سمجھتے ہیں۔"

یاس: "خدا ڈر ہی گانہ خدا کا ڈر اسے عیب جانئے یا ہنر
وہی بات آئی زبان پہ جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی"

شاد: "اس کے تو یہ معنی ہیں کہ جب آپ اپنی بات پہ اڑ جاتے ہیں تو کسی صورت میں کبھی ہار ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔"

یاس: "جیت بھی اپنی ہے ہٹ بھی اپنی ہے
میں کہاں ہار ماننے والا"

شاد: "ممکن ش اکبر آبادی نے آپ کے بارے میں واقعی ٹھیک ہی کہا ہے کہ آپ اُس اصیل مرغ کی طرح تھے جو گردن ٹوٹنے پر بھی ہار نہیں مانتا۔ خیر سنا ہے منوہر لال شعلہ کا یہ شعر آپ کو بہت پسند تھا

اعجازِ سخن جب ہے پڑے جان سخن میں
قالب کو بدل دینا کرامات نہیں ہے

اور اس پسندیدگی کا عملی ثبوت دیتے ہوئے آپ نے ایسا شعر بھی کہہ ہو
کما طور پر جان سخن ہیں۔ ناگوارِ خاطر نہ ہو تو اپنے ایسے چند اشعار سنانے کی
زحمت فرمائیے جن سے میری اس بات کی تصدیق ہوتی ہو۔

یاسؔ: پھیلا پھیر ہے کاتبِ اعمال ہوشیار
آمادۂ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

حیرت سے رنگ نامۂ اعمال اُڑ نہ جائے
کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھ کر

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دعا ہو جائے گا

فلک نے بھول بھلیوں میں ڈال رکھا تھا
ہم اُن کو ڈھونڈتے یا اپنی جستجو کرتے

شادؔ: "کیا بات ہے میرزا صاحب! مجنوں گورکھپوری آپ کے بارے میں سچ کہتے ہیں کہ آپ زندگی کی نامرادیوں کا ماتم کرنے والے نہیں، بلکہ ولولہ اور ہمت کے شاعر ہیں۔ زندگی کا جو کس بل آپ کے اشعار سے محسوس ہوتا ہے وہ دورِ جدید کے کسی دوسرے غزل گو شاعر کے کلام میں محسوس نہیں ہوتا اور تفکر کا یہ انداز۔ الفاظ کی یہ دست کاری اور استعاروں کا یہ اقلیدسی بندوبست اُردو شاعری کی اِس نسل میں جو غدر کے بعد وجود میں آئی کسی کے ہاں شاید ہی کہیں مل سکے۔ کائنات اور انسان کی فطرت کے اندرونی اور بنیادی تضاد اور تصادم کا ایسا شعور آپ کے ہم عصر اُردو شاعروں کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد زندگی کی جدلیت کا ایسا ادراک اس حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کے ساتھ آپ کے سوا کسی دوسرے اُردو شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ اگر کہیں ملتا ہے تو اُس میں نہ تو وہ تہہ گیری ہے اور نہ ایسی ولولہ آفرینی ——— لیکن آپ تو اقبال اور غالبؔ کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کیا رائے تھی آپ کی اقبال کے بارے میں؟"

یاسؔ: اِک آرزو ہے خام ہے یا فکرِ محال
ستلج سے نیل تک حکومت کا خیال
اب تک زندہ ہے سشیخ چلی یعنی
پنجاب کا تکیہ ہی بُلھڑ اکبال

شادؔ، توبہ توبہ کوئی حد ہے اِس دریدہ دہنی کی اِسی حال یہ بات غالباً آپ نے
اقبالؔ کے اِس شعر کے پیشِ نظر کہی ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

اور اقبالؔ کے فلسفۂ خودی سے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟

یاسؔ: "پہنچا ہے کہاں اُڑ کے خودی کا پُتلا
تقدیر کی بھی کچھ نہ چلی وہ مارا!
کیا لاڈلا بیٹا ہے خدا بندے خیال
پوچھے ہے خدا تیری رضا کیا ہے بتا؟"

شادؔ: "میرزا صاحب! اگر آپ اقبال کے اِس شعر سے ؎

خودی کو کر بلند اِتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اتفاق نہیں کرتے جب بھی آپ کا یہ گستاخانہ لب و لہجہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ اقبالؔ ایک عظیم شاعر ہے؟"

یاسؔ: "اسٹیج کا شاعر ہے نہ چھوڑا ہے کا
لیتا ہے قلم سے کام چروا ہے کا
میں بھی وہی کہتا ہوں جو تم کہتے ہو
اکبالؔ، اکبالؔ ہے مگر کا ہے کا؟"

شادؔ: "استغفراللہ! جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں آپ ایسے دیدہ ور اور حیات و کائنات کے مبصر شاعر کی شان کے شایاں نہیں اور میرزا غالبؔ کے لئے آپ کا ارشاد کیا ہے؟"

یاسؔ: "اِک شاعرِ کہنہ سال کہہ سکتے ہو
پیسے کا شریکِ حال کہہ سکتے ہو
جو چاہو کہو یارو مگر یہ تو کہو
غالبؔ کو نمک حلال کہہ سکتے ہو؟"

شادؔ: "کیوں صاحب! غالبؔ نے آپ کے خیال میں کیا نمک حرامی کی ہے؟"

یاسؔ: "تلوار سے مطلب ہے نہ کھانڈے سے غرض
مومن سے سروکار نہ ٹانڈے سے غرض
رنگون میں دم توڑتا ہے شاہِ ظفر
غالبؔ کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض"

شادؔ: "یہ تو ٹھیک ہے حضرت! لیکن پھر بھی غالبؔ کو وطن دشمن تو نہیں قرار دیا جاسکتا۔"

یاسؔ: "شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے
مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ
غالبؔ کو وطن پرست کہنے والے"

شادؔ: "آپ کی اس انتہا پسندی سے تو یہ بھی میرزا صاحب! غالبؔ کی ذات سے قطعِ نظر اُس کی شاعری آپ کی نظر میں کیسی ہے؟"

یاسؔ: "دیوانوں کے یہ زور نہ دیکھے نہ سنے
نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھاتے ہیں مگر
غالبؔ سے چچا چور نہ دیکھے نہ سنے!"

شادؔ: "غالبؔ اور چور! لاحول ولا۔ کیا غضب ڈھا رہے ہیں آپ میرزا صاحب! بے شک غالبؔ نے بعض شاعروں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ایسا استفادہ کس شاعر نے نہیں کیا۔ سو فیصدی طبع زاد تو کوئی شاعر نہیں ہوتا۔ کیا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ محض سارق تھا اور شاعر نہ تھا؟"

یاسؔ: دونوں دیوانے ہیں علیؓ کے طالب
جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں قالب
مذہب میں، شاعری میں، قومیت میں
غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالبؔ!

شادؔ: "چلئے غریب غالبؔ کو آپ نے کم از کم اپنا ہم مرتبہ قرار دینے کی نوازش تو فرمائی اور میر تقی میرؔ کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

یاسؔ: "میرؔ کے آگے زور کچھ نہ چلا
تھے بڑے میرزا یگانہ دبنگ"

شادؔ: "آتشؔ لکھنوی کے کلام کا لنگین بھی تو آپ کو بہت مرغوب تھا۔ آتش کے رنگ میں اپنا کوئی شعر سنا دیجئے۔"

یاسؔ: "کب چل سکے گی بادِ مخالف مزار میں
جلتا ہے دل جلوں کا چراغ اُس دیار میں"

شادؔ: "میرؔ اور آتشؔ کے علاوہ آپ بیدلؔ سے بھی تو بہت متاثر تھے۔ اپنا کوئی شعر اُس کے رنگ میں بھی ارشاد فرمائیے۔"

یاسؔ: "تارِ نظر سے باندھ لیا ہے بہار کو
نیرنگیِٔ تصورِ بے اعتبار کو"

شادؔ: "اپنے ہم عصر عزیزؔ لکھنوی کو تو آپ پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اُن کی مقبولیت کے پیش نظر آپ نے کیا شعر کہا تھا؟"

یاسؔ: "یاسؔ اب ذلیل ہی کو سمجھتے ہیں سب عزیز
کانٹے چمن کے تکتے ہیں پھولوں کے ہار میں"

شادؔ: "اور جگرؔ مرادآبادی کے اس طرح کے شعروں کو ------
بال بکھرائے کوئی دیوانہ وار آ ہی گیا
تم کو پیار آئے نہ آئے ہم کو پیار آ ہی گیا

گوری گوری کلائیاں توبہ
ہائے یہ کج ادائیاں توبہ

آپ نے جاپانی شاعری قرار دیتے ہوئے کیا شعر چست کیا تھا؟"

یاسؔ: "دوروزہ نوجوانی، حسنِ نسوانی کے کیا کہنے
جگر کی شاعری یا مالِ جاپانی کے کیا کہنے!"

شادؔ: "آپ کا مستقل اور محبوب موضوع فلسفۂ حیات و کائنات ہی سہی لیکن عشق کی اہمیت سے بالکل منحرف تو آپ بھی نہ ہوں گے؟"

یاسؔ: "عشق ہی عینِ زندگی تو نہیں
ہاں مگر زندگی کا آزار"

شادؔ: "پھر بھی حسنِ نسوانی کا جادو تو آپ کے سر چڑھ کر بھی بولا ہوگا؟"

یاسؔ: "سونگھ کر چھوڑ دو حسینوں کو
نہ بنانا کبھی گلے کا ہار"

شادؔ: "گلے کا ہار نہیں بنایا لیکن آپ نے حسینوں کو سونگھا تو ہے، اس لئے کبھی کبھار حسن و عشق کے موضوع پر بھی کچھ اشعار ضرور کہے ہوں گے۔ اُن میں سے کچھ شعر عطا فرمائیے۔"

یاسؔ: "نگاہِ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے
ستم رسیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی"

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

د: "سبحان اللہ! آپ کے ایسے اشعار سے بھی متکبرانہ شان ٹپکتی ہے لیکن آپ کی طبعی اُفتاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ طنز سے آپ کو فطری مناسبت تھی کیا ہی اچھا ہو اگر اس مقام پر اپنے کچھ طنزیہ اشعار بھی ارشاد فرمائیں"

ں: خدا کے سامنے دامن پسارنے والے
وہ ہاتھ تھک گئے کیا مال مارنے والے

ہاتھ آئے کوئی چاند ستارہ تو جانئے
ہے عرش پر دماغِ فلاطوں ہوا کرے

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کا دخل ہو
دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

سلامت آپ کا یہ حسنِ لازوال مگر
ہم آج ہی کے ہیں کل کے اُمیدوار نہیں

د: میرزا صاحب! صاف گوئی معاف آپ کے مزاج کا کڑوا اور چڑچڑا پن تنقید کے لئے تو قطعاً نامناسب۔ البتہ طنزیہ شاعری کی تخلیق میں واقعی آپ کا معاون ثابت ہوا اور آپ کے ایسے اشعار بے شک اُردو کی طنزیہ شاعری میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ غالباً آپ کے یہاں طنز کا شرار بھی خود پرستی کے شعلے ہی سے پھوٹا ہے۔ آپ کی خود پرستی اہلِ دنیا کے لئے تو خاصی تکلیف دہ رہی ہے تاہم یہ فرمایئے کہ اپنی خود پرستی کے بارے میں آپ کی اپنی کیا رائے ہے؟"

س: "زہے معراجِ انسانی کہ بندہ ہوں تو اپنا ہوں
چڑھا یا خود پرستی نے نگاہِ دوست و دشمن پر"

ادؔ: "تو کیا محض دوستوں اور دشمنوں کی نگاہ پر چڑھنے ہی کے لئے آپ نے خود پرستی اختیار کی تھی؟"

یاسؔ: "خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاسؔ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے"

شادؔ: "اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود پرست، حق پرست نہیں ہوتا"

یاسؔ: "کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرتِ خدا ہوں میں
میری خود پرستی بھی عینِ حق پرستی ہے"

شادؔ: "لیکن یاسؔ عظیم آبادی سے یگانہؔ چنگیزی بن کر جب آپ کی خود پرستی چنگیزیت کی حد تک پہنچ گئی تو اُس وقت آپ نے بہت سے لوگوں کی دل آزاری بھی کی، کیا آپ کو اِس حقیقت کا احساس ہے؟"

یاسؔ: "ادب کے واسطے کتنوں کے دل دُکھائے ہیں
یگانہؔ حد سے گزرنا نہ تھا مگر گزرے"

شادؔ: "اِس حقیقت کو محسوس کرنے کے بعد بھی کیا آپ اپنے سے بدگمان نہیں ہوئے؟"

یاسؔ: "زمانہ لاکھ گُم ہو جائے خود اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو"

شادؔ: "لیکن ایک طرف تو تنہا آپ کی ذات اور دوسری طرف پُوری دنیا کی مخالفت کا طوفان بیدلی کا کچھ نہ کچھ شکار تو آپ ضرور ہوئے ہوں گے"

یاسؔ: "دلِ طوفاں شکن تنہا جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ چکے ٹکرا کے ساحل سے"

شادؔ: پھر تو واقعی اپنے دل پر آپ کو بڑا اختیار حاصل تھا؛

یاسؔ: "زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے
دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے"

شادؔ: "اپنا زور تو آپ نے دنیا کو خوب دکھایا۔ اگرچہ ایسا کرنے کی قیمت بھی آپ کو بہت ادا کرنا پڑی۔ آپ کی سخت جانی کی داد تو دیتے ہی بنتی ہے۔ کوئی شعر آپ نے اپنی سخت جانی کے بارے میں نہیں کہا؟"

یاسؔ: "کیا سمجھتے تھے کہ دل سا شیشۂ نازک مزاج
چوٹ کھاتے کھاتے اِتنا سخت جاں ہو جائے گا"

شادؔ: "اپنا وطن چھوڑ کر جب آپ نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تو اہلِ لکھنؤ نے آپ کے اِس شعر کی سے

لکھنؤ کے فیض سے دو دو ہیں سہرے میرے سر
اک تو اُستادِ یگانہؔ دوسرے داماد ہوں!

جُزوی تردید کرتے ہوئے آپ کو داماد تو مان لیا لیکن اُستادِ یگانہؔ تسلیم نہ کیا

بلکہ وہاں کے ادبی حلقوں نے آپ کو معتوب ٹھہرایا اور وہاں کے شاعروں نے تو آپ کا اِس حد تک بائیکاٹ کر دیا کہ جس مشاعرے میں آپ جاتے تھے اُس میں بالعموم وہ شامل نہیں ہوتے تھے، اُس وقت آپ کیا محسوس کرتے تھے؟"

یاسؔ: "وطن کو چھوڑ کر جس سرزمیں سے دل لگایا تھا
وہی کاسب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر"

شادؔ: "اور اُس ماحول سے مجبور ہو کر حاسدوں کے تئیں آپ نے کیا رویّہ اختیار کیا؟"

یاسؔ: "علاجِ اہلِ حسد زہر خندۂ مردانہ
ہنسی ہنسی میں تُو اُن رحمتوں کو ڈستا جا"

شادؔ: "لیکن حاسدوں کی اتنی بڑی اکثریت جب آپ کے حال پر خندہ زن ہوتی ہوگی تو آپ کیا کہہ کر اپنی انا کو تسکین دیتے ہوں گے؟"

یاسؔ: "خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے"

شادؔ: "اور اُسی زمانے میں جب باہر کے لوگ لکھنؤ آ کر آپ سے ملنا چاہتے اور لکھنؤ کے شاعروں سے آپ کا پتہ دریافت کرتے تو وہ حاسد شاعر عام طور پہ کہہ دیتے کہ یاسؔ تو لکھنؤ چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے یا اُن میں سے کوئی اِس طرح کی بات کہتا کہ چھوڑیئے حضرت! آپ بھی کس سڑی سودائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھلا یاسؔ بھی آدمیوں میں کوئی آدمی ہے۔ حاسدوں کی ایسی حرکتوں کے پیشِ نظر بھی آپ نے کچھ نہ کچھ تو کہا ہوگا"

یاسؔ: "یاسؔ منزل ہے مری منزلِ عنقا سے کمال
لکھنؤ میں کوئی کیوں ڈھونڈنے آتا ہے مجھے"

شادؔ: "اور بالآخر جب آپ لکھنؤ چھوڑنے کے لئے بھی مجبور ہو گئے اور تلاشِ معاش کے لئے آپ کو کئی شہروں میں کئی دل گداز مراحل طے کرنے پڑے اُس وقت تو غریب الوطنی کا احساس اور بھی شدید ہو گیا ہوگا۔ اپنے کچھ ایسے اشعار سُنایئے جو اُس شدّتِ احساس کے آئینہ دار ہوں۔"

یاسؔ: "لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اِک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

شامِ غربت بھی ہے روشن واہ ری یادِ وطن
یاد کیا ہے اِک اندھیرے کا اُجالا دل میں ہے

زمانہ اِس کے سوا اور کب وفا کرتا
چمن اُجڑ گیا کانٹے گلے کا ہار رہے

شادؔ: "اچھا جناب! اپنے مذہبی نقطۂ نظر کے بارے میں بھی کچھ فرمایئے"

یاسؔ: "کرشن کا ہوں پجاری، علیؑ کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا"

شادؔ: "اِس کا مطلب ہے آپ کٹر مُسلمان نہیں تھے؟"

یاسؔ: "سہوِ کاتب سے ہے نام اپنا مسلمانوں میں
رنگ لائے گا کسی دن یہ مسلمان ہونا"

شادؔ: "رنگ تو واقعی خوب لایا جبکہ اسی وجہ سے آپ کو اپنی زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ آپ کو ایک قیدی کی طرح رکشا میں گھمایا جا رہا ہے۔ منہ پہ کالک اور گلے میں جوتیوں کا ہار ہے اور ایک جمِ غفیر آپ کو گالیاں دے رہا ہے اور آپ کے مُنہ پر تھوک رہا ہے۔ بہرکیف یہ فرمایئے کہ کٹر مذہبی آدمیوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

یاسؔ: "سب ترے سوا کافر آخر اِس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انسان کا ایسا خبطِ مذہب کیا"

شادؔ: "نئی تہذیب سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

یاسؔ: "حسن چمک گیا تو کیا بُوئے وفا تو اُڑ گئی
اِس نئی روشنی نے آہ دل کا کنول بجھا دیا"

شادؔ: "اور نئے ادب کے بارے میں؟"

یاسؔ: "قدریں ہی بدل گئیں تو غیرت کیسی
پھر کیوں نہ گدھوں سے ہو حماقت ایسی
سر تو نیچے ہے اور ٹانگیں اوپر
ہت تیرے نئے ادب کی ایسی تیسی!"

شادؔ: "انسان سے متعلق آپ کی رائے کا خلاصہ کیا ہے؟"

یاسؔ: "شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی"

شادؔ: "جب موت آئی تو آپ نے کیا محسوس کیا؟"

یاسؔ: "شاید ہلا کے موت نے چونکا دیا مجھے
محوِ طلسمِ بندگی اسرار دیکھ کر"

شادؔ: "اور اب تہِ خاک کیا محسوس کرتے ہیں؟"

یاسؔ: "آرام سے سونے کی جگہ ہے تو لحد ہے
دنیا میں تو راحت کا کوئی گھر نہیں ملتا"

شاد: "ہاں صاحب! آپ تو یہی کہیں گے، کیونکہ جب تک اِس دنیا میں رہے دل تنگ ہی رہے، لیکن اِس کے باوجود آپ نے اپنی زندگی میں یہ بھی تو کہا تھا ؂

دنیا سے پاس جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ کیا کشش ہے اِس اُجڑے دیار میں

کیا اب پھر اِس اُجڑے دیار میں آنے کو آپ کا جی نہیں چاہتا؟"

یاس: "پلٹ کے گُل میں نہ آئے گی بُوئے مستانہ
نکل کے روحِ رواں مُنہ نہیں دکھانے کی"

شاد: "اپنے تجربے کی بنا پر ہم اہلِ دنیا کے لئے کوئی نصیحت فرمایئے"

یاس: "بیگانہ وار ایک ہی رُخ سے نہ دیکھئے
دنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو"

شاد: "بہت خوب! گویا اب آپ خود بیگانہ روی کی مذمت کر رہے ہیں اور اپنے اِس شعر ؂

زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا
ہم اپنی دُھن میں زمانے سے بے خبر گزرے

کے خلاف مشورہ دے رہے ہیں۔ بہرکیف یہ فرمایئے کہ یہاں مزار میں تو آپ اپنے مخالفوں کی ہرزہ سرائیوں سے محفوظ ہیں نا؟"

یاس: کیا چل سکے گی بادِ مخالف مزار میں
جلتا ہے دل جلوں کا چراغ اس دیار میں

تخلیق وتحقیق صاحبِ طرز اور جواں فکر ادیب نریش کمار شاد کے مضامین کا نیا مجموعہ۔ جسے حکومتِ پنجاب کے محکمہ السنہ نے اردو کی بہترین ادبی تصنیف قرار دے کر امسال مصنّف کو ایک ہزار روپے کا پہلا ادبی انعام دیا ہے۔ قیمت ۳/۲۵

تین کہانیاں تین طویل کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ۔ یہ کہانیاں ذاکر صاحب کی نمائندہ کہانیاں ہیں جو افسانوی ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قیمت فی جلد صرف ایک روپیہ پچاس پیسے۔

میرے قطعات کا یہ مجموعہ اُس مسافر کی اِک کہانی ہے
جس نے پھولوں کی آرزو لے کر ہر بیاباں کی خاک چھانی ہے

قاشیں صاحبِ طرز شاعر نریش کمار شاد کے قطعات کا حسین وجمیل انتخاب۔ ترمیم و اضافہ کے بعد ——— تازہ ترین ایڈیشن ——— قیمت چار روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶





افسانہ

گریجویٹ ٹیم

اختر ملیح آبادی بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی

۲۷۔ چھتوا پور روڈ۔ لکھنؤ

میرے بھائی خوشتر! سلام مسنون

افسانہ نمبر کی "ٹائپسٹ گرل" کو کافی سراہا گیا۔ پڑھنے والوں کے بہت سے خطوط آئے ہیں ——— میرا اندازہ ہے کہ مغموم دنیا میں ہلکے پھلکے افسانے مقبول ہوتے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہوں؟ ہماری زندگی ہمیں [illegible] پھیر کر دیتی کیا ہے؟ پاکستان میں رسمی نظریئے کے تحت پبلشروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ "ناول ٹریجڈی نہ ہونا چاہیئے!" بات ماحول کی مطابقت کرتی تھی اور یقیناً اب بھی کرتی ہے ——— "گریجویٹ ٹیم" بھی زندہ دلی کے ایک رخ کی جھلک ہے۔ محض خیالی نہیں ہے، حقیقت ہے۔ میرے بڑے بھائی کا نام مونس ہے۔ جو "گریجویٹ ٹیم" کی تھیوری کے خالق ہیں۔ یونیورسٹی میں زندہ دلی اور ایکٹی وٹی کے روحِ رواں رہ چکے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے تو بڑی حد تک بے نیاز ہی رہے لیکن یونیورسٹی کی فضاؤں کو زندگی ضرور بخشتے رہے۔ ٹکے بیٹھنا جانتے ہی نہ تھے۔ حاضری دی، کلاس سے کام ختم۔ شرارتیں شروع! ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری! اور لطف یہ کہ کوئی شرارت غیر معقول نہ ہوتی تھی۔ معاشرت و تمدن سے بھرپور ہوتی تھی۔ سبق کا کوئی سوال نہیں لیڈیز روم ان کی شرارتوں کا مرکز ہوتا تھا لیکن کم ظرفی کا گلہ کبھی کسی لڑکی کو نہ ہوا۔ بس ہنسو ہنساؤ اور مسکراؤ اصول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسٹاف تک میں اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے پہچانے اور مانے جاتے تھے۔ یہ افسانہ ان کی زندہ دلی کا ثبوت اور عکس ہے ——— یونیورسٹی چھوٹ گئی۔ زندگی نے بھاری بوجھ ان پر رکھ دیا کہ اپنی زندہ دلی کم کر دیں لیکن انھوں نے قسمت کو شکست دے دی۔ زندہ دلی پھر بھی نہ چھوٹنا تھی نہ چھوٹی! ——— کراچی میں کچھ مہینے بیکار رہے۔ لیکن تین ماہ میں آٹھ پاؤنڈ وزن پھر بھی زندہ دلی کے ہاتھوں بڑھا لیا! ان کا کہنا تھا اور آج بھی ہے کہ

زندگی زندہ دلی کا ہے نام مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں؟

مجھ سے اکثر ناراض رہتے ہیں تو میری سنجیدگی اور شدتِ احساس کی وجہ سے۔ ہزار بار [illegible] ٹوک چکے کہ اداس، پریشان اور مغموم نہ رہا کرو۔ کیونکہ غم ان کے نزدیک قسمت کی ایکٹی وٹی ([illegible]) ہوتے ہیں۔ اس کا جواب اسی انداز سے یعنی ایکٹی وٹی ہی سے دینا چاہیئے۔ بقول ان کے جس نے ایسا کیا اس نے زندگی کو مغلوب کر لیا۔ زندگی کو داؤں دینے کا حربہ بے نیازی اور زندہ دلی! اپنی مثال ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ KLM (ڈچ فضائی کمپنی) سے الگ ہوئے تو خاک غم نہیں کیا اور تین ماہ میں آٹھ پاؤنڈ اور وزن بڑھا لیا! وہ عقل کو نہیں دل کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں جو دل کے کہنے پر چلے گا وہ تندرست، بشاش

لوگ کامیاب رہے گا۔ اسی لئے تنخواہ سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ مہینہ تاریخ کے بعد دوستوں سے قرض لینے کی نوبت آجاتی ہے لیکن بے فکر رہتے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کو برکت عطا کرتا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے، کل کو مدِ نظر رکھتے ہیں اُن کا رزق کم ہو جاتا ہے۔ اُن کی تھیوری اپنانے ڈر لگتا ہے لیکن اُنھیں کامیاب و کامران دیکھا ہے میں نے ——— اب وہ باپ ہیں لیکن میں خورد ہونے کے باوجود اُن کا بڑا بھائی نظر آتا ہوں اور وہ ماشاء اللہ اب تک تندرست اور خورد نظر آتے ہیں محض اپنی زندہ دلی کے باعث! میرا اندازہ ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن زندہ دلی ترک نہیں کر سکتے اور نہ جو کردار لکھنؤ یونیورسٹی میں اُبھرا تھا وہ اُن کا ساتھ چھوڑنے کو تیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھر میں، بس میں، ریل میں، دعوت میں، شادی میں یا کسی غمی میں سب جاتے ہیں تو ایکیٹ وٹی اور مزاح سے باز نہیں رہتے ——— کوئی یقین نہ کرے گا کہ انھوں نے پاکستان کے سابق گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین سے لاہور ہوائی اڈّے پر اُس وقت مذاق کیا جب وہ اپنے بھتیجے کی شادی میں شرکت کے لئے کراچی سے لاہور پہنچے۔ مونس بھائی لڑکے والوں کی طرف سے مدعو تھے۔ ہوائی اڈّے پر استقبال کے لئے پہنچے۔ ہاتھ ملاتے وقت برجستہ بولے "خواجہ صاحب! آج کل آپ جھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کیا مُرغیاں نہیں کھا رہے ہیں!؟" جبکہ خواجہ ناظم الدین کے موٹاپے کا یہ عالم تھا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ اوروں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اِس لئے کہ اب خواجہ ناظم الدین بنگال کے مسلم لیگی لیڈر نہیں جن سے اُن کی ملاقات شناسائی تھی۔ لیکن اب وہ گورنر جنرل تھے لیکن زندہ دل انسان کو دُنیاوی عہدوں مرتبوں سے کیا مطلب؟ جب میں لاہور پہنچا تب اُن کی زندہ دلی کے شاہکار واقعات کا عِلم ہوا۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھا۔ لڑکے والوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ "اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ آپ کے برادرِ معظّم وہاں بھی نہ چُوکیں گے تو ہم اُنھیں ساتھ لے ہی نہ جاتے، اِس لئے کہ ہم سب کے ہوش اُڑا دئے تھے!" ——— غرضیکہ وہ آج بھی خود کو یونیورسٹی کا طالب علم ہی سمجھتے ہیں اور اُسی ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ وہی خو بُو ہے، وہی زندہ دلی ہے اور وہی ایکیٹ وٹی آج بھی جاری ہے اور زندگی کے آخری سانس تک جاری رہے گی۔ اُن کا کہنا ہے اور سچ ہے کہ ہمارے بعد یونیورسٹی سے ایکیٹ وٹی کی رُوح ختم ہوگئی ——— اِس میں کوئی شک نہیں کہ آج یونیورسٹی میں ایکیٹ وٹی کی بجائے غنڈہ گردی ہوتی ہے، بدتمیزی ہوتی ہے۔ لوگ جانتے ہی نہیں کہ ایکیٹ وٹی کے آداب کیا ہیں اور ایکیٹ وٹی کہتے کسے ہیں؟ ——— یہ افسانہ حاضر ہے۔ اُمید ہے کہ صرف پڑھنے والے ہی نہیں، وہ لوگ بھی پسند کریں گے جو زندگی کو ایکیٹ وٹی سے مزیّن کرنا چاہتے ہیں اور یونیورسٹی میں زندہ دلی کے دلدادہ ہیں۔ یہ افسانہ برادرِ معظّم محمد مونس خاں صاحب ایم۔ اے کی زندہ دلی کے نام معنون ہے۔

احقر ——— اختر ملیح آبادی

"ڈارلنگ ——— !"

اور سب اِس طرح چونک پڑے کہ ڈارلنگ کسی بم کا نام ہو! مونس نے فوراً پُوچھا "کہاں؟" شاکر نے اپنے باہر نکلے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سانس کنٹرول کرتے ہوئے کہا "فرسٹ کلاس میں ——— " "لیکن شہید نے اپنی لمبی ناک مروڑتے ہوئے کہا "چند منٹ پہلے ہی تو میں راؤنڈ کر آیا ہوں۔ سارا اسٹیشن صاف پڑا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آج ڈارلنگوں نے گھر سے نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی ہے . . . !؟"

"مونس یہی کہہ رہا تھا کہ" موصوف نے سوکھا ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "ٹرین میں کوئی ڈارلنگ نہ ہوئی تب سفر منسوخ کر دیا جائے گا . . ."

"یقیناً!" مونس نے سُرخ و سپید افغانی چہرے پر زبردستی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا "اگر ہم اِتنے بدقسمت ہیں کہ ہمارے حصّے میں ایک ڈارلنگ بھی نہ آئی تو سفر سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"مرثیہ نہ پڑھو۔ نظارہ کرو!" شاکر نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا

پھر تینوں دوست پیچھے ہولئے تاکہ "معائنہ" کرلیا جائے۔ جائے وقوع پہ نہیں، جائے ڈارلنگ پر جاکر۔ کیونکہ شاکر کا کسی کو اعتبار نہ تھا۔ پہلے درجے کی بے پر کی اڑانے والا تھا۔ باہر پلیٹ فارم پر آتے ہی کہا "کاش! لائٹ سگرٹس!" حکم کی دیر تھی کہ پتلونوں کی جیبوں سے کیپسٹن سگریٹ کی نیلی ڈبیاں نکل ہونٹوں سے سگریٹ جا لگے اور جل گئے۔ اس لئے کہ جب کبھی ڈارلنگ دیکھنے کے لئے مونس جاتا تب سگریٹ ہونٹوں سے ضرور لگا ہوتا تھا۔ گویا نظارۂ محبوب کے لئے سگریٹ پینا ضروری تھا۔

"لو دیکھ لو!" شاکر نے ہنستے ہوئے اشارہ کیا اور کہا "ڈارلنگ ہے یا نہیں؟" واقعی ڈارلنگ موجود تھی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں! کھڑکی کے پاس آڑی ٹیک لگائے بیٹھی محوِ مطالعہ تھی۔ ایک مرمریں ہاتھ سے کتاب تھامے تھی، دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے زلفِ شبگوں سے کھیل رہی تھی۔ دوپٹہ ہوا سے اِدھر اُدھر ہو گیا تھا اور چاروں محوِ نظارہ تھے۔ خود کو بھلا کر اور یہ بھول کر کہ وہ یونیورسٹی میں نہیں بلکہ چارباغ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر ہیں!

"بھئی شاکر نے واقعی کمال کر دیا اس کا ذوق سُتھر گیا ہے" مونس نے حُسنِ دلنواز سے محظوظ ہو کر کہا۔ موصوف نے مُنہ بنا کر فوراً کہا۔

"ارے یار! یہ ہماری صحبت کا اثر ہے ورنہ..." موصوف ہنسنے لگا کچھ کہا نہیں۔

"ورنہ شاکر تو موٹے بھدّے خد و خال کا آرٹسٹ تھا۔ یہ نزاکت ہماری دی ہوئی ہے جناب!" شہید نے لمبی ناک کی اوٹ میں مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔ پھر قہقہہ گونج گیا۔

سگریٹ جل کر راکھ ہو گئے۔ محویتِ نظارہ کی وجہ سے۔
دوسرے سگریٹ جل گئے۔
نظارہ اور لطیف ہو گیا۔

زلزلہ آگیا ـــــــ!

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" ایک بدذوق ٹی ٹی نے "نظارہ ٹیم" کو گرفت کرتے ہوئے دیکھا اور بڑے رعب سے پوچھا۔ سب گھبرا گئے ٹی ٹی کے سوال پر۔ مونس نے نہایت مودبانہ انداز میں لجا کر کہا۔

"قبلہ! ہم ڈارلنگ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے کام میں مزاحم نہیں ہیں..."

"کیا مطلب؟" ٹی ٹی نے مونس کو گھورا اور قدرے چونک کر پوچھا۔

"قبلہ! اُدھر اِک نگاہ ڈالیں۔ گستاخی معاف ہو..." ٹی ٹی نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پلٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسرے ٹی ٹی نے ہاتھ پکڑا اور کہا "چلو! یونیورسٹی کے لڑکوں سے کہاں اُلجھنے لگے!"

"اِسٹوپڈ" (stupid) شہید بولا۔

"فُلش" (Foolish) شاکر نے کہا۔

"ایڈیٹ" (Idiot) موصوف کی زبان سے نکلا لیکن مونس جو بدتمیزی پر سب سے پہلے برہم ہو جایا کرتا تھا، ٹی ٹی کی حماقت پر خاموش رہا۔ خلافِ توقع اور ٹکٹکی باندھے ڈارلنگ کو دیکھ رہا تھا جو اب کتاب پڑھنے کے بجائے "نظارہ ٹیم" کی طرف دیکھ رہی تھی اور مونس کیا سوچ رہا تھا یہ کون بتا سکتا تھا ـــــ کہ سب دہل گئے کیونکہ گاڑی رینگ رہی تھی اور پلیٹ فارم سے ڈارلنگ کو لے کر اُڑنا چاہتی تھی۔ سب دوڑ پڑے اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف ـــــ آنچل کھڑکی سے پرچم کی طرح لہرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو: جلدی کرو۔ جلدی کرو!"

مونس اور اس کے دوست یونیورسٹی میں زندہ دلی کے لئے مشہور تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کو اپنی نت نئی شرارتوں سے زعفران زار بنا دیا تھا۔ ان کی شرارتوں میں جہاں زندہ دلی ہوتی تھی وہیں پستی اور کم ظرفی کا نام و نشان نہ ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کی شرارتوں کو یونیورسٹی کے ہر گوشے میں سراہا جاتا تھا اور سب ہی محظوظ ہوتے تھے۔

آج وہ ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ زندہ دلی کو گھر رکھ آتا اور ایکٹی وٹی (Activity) سے چوک جاتا۔ کیونکہ بقول اس کے "مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں!؟" اس اصول کا ماننے والا گندم کا بے جان بورا بن کر سفر کیسے کر سکتا تھا۔ لہٰذا سوچ رہا تھا کہ کوئی ایکٹی وٹی بس شروع کر دی جاتے ـــــ اور دوسرے لمحے اس کی ایکٹی وٹی (Activity) شروع ہو گئی!

"بھائیو!" مونس الٹا ہیٹ کاسۂ گدائی کی طرح لئے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا: "ہم گریجوٹ یتیم ہیں! اگرچہ ہم چاروں کے ماں باپ زندہ ہیں اس کے باوجود ہم یتیم بھی ہیں اور لسیر بھی..." تیسرے درجے میں سب ہی ہنس دئے کیونکہ آج تک انھوں نے نہ ایسے یتیم دیکھے تھے اور نہ لسیر کہ سب کے ماں باپ زندہ بھی ہوں پھر بھی یتیم و لسیر ہوں! پورا درجہ صرف ہنس ہی نہیں رہا تھا، متوجہ بھی تھا۔ تب مونس نے کہا: "ہم گریجوٹ یتیم خانے کی مدد کے لئے نکلے ہیں۔ ہمارے یتیم خانے میں گریجوٹ یتیم پلتے ہیں۔ جن کے پاس نہ بینک بیلنس ہوتا ہے نہ جائداد۔ صرف ڈگریاں ہوتی ہیں۔ ہمارے یتیم خانے میں گریجوٹ یتیم کو صبح کے ناشتے میں ڈبل روٹی، انڈا، جام، جیلی اور مکھن وغیرہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح لنچ اور ڈنر بھی اعلیٰ پیمانے کا

وعدہ

نہ آتے نہیں اس پہ تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی ——— ڈاکٹر اقبال

نہ آیا ہے نہ آئیگا کبھی وہ اپنے وعدے پہ
نہ جانے کس توقع پر ہیں محوِ انتظار آنکھیں ——— قوش صہبائی

ہیں اور وعدہ وصل کا فسانہ نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ کس کی زباں کے ہیں ——— امتیم

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے ——— غالب

[illegible] انتظار [illegible] کو خوشگوار کر
وعدہ وفا ہو یا نہ ہو وعدے کا اعتبار کر ——— قمر مرادآبادی

[illegible] خان۔ مرادآباد

یتیم خانے سے متعارف کرایا۔ اس کا پس منظر بتایا، اس کی غایت و ضرورت واضح کی اور آخر میں مدد کی اپیل کی اور اُلٹا ہیٹ آگے بڑھا دیا۔ اس وقت ڈارلنگ ہنسی روک نہ سکی اور افشائے تبسم کے خوف سے جھٹ سے کتاب منہ پر رکھ لی۔ مونس نے آگے بڑھ کر اُلٹا ہیٹ اس کی طرف بڑھایا اور کہا: "میڈم! آپ پہل کیجئے۔ آپ کی پہل ہمارے یتیم خانے کو بہت راس آئے گی۔ ۔ ۔"

ڈارلنگ کے چہرے کا رنگ ارغوانی ہوگیا۔ جلدی سے سوٹیڈ بوٹیڈ معمر آدمی کی طرف دیکھا جو شاید اس کا ڈیڈی تھا اور جو سنجیدگی اور وقار کے باوجود گریجویٹ یتیم کی شرارت پر مسکرا رہا تھا۔ آخر اس نے کہا: "گریجویٹ یتیم خانہ ہے کہاں اور اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟"

"ہمارا یتیم خانہ لکھنؤ میں ہے جناب!" مونس نے کہا: "ابھی مقامی ہے لیکن جلد ہی آل انڈیا پیمانے پر ہو جائے گا۔"

فرسٹ کلاس ایک متین قہقہے سے گونج گیا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ گریجویٹ یتیم ملک کی تعمیر و ترقی میں ہاتھ بٹائیں بجائے اس کے کہ انڈا، مکھن اور ڈبل روٹی کھائیں اور سگریٹ پھونکیں؟"

"ایسا ناممکن ہے۔" جواب ملا۔ اور جب وجہ دریافت کی گئی تب مونس نے کہا: "تعمیر، ترقی، اصلاح، تبدیلی موجودہ دور کی بدعتیں ہیں اور آج کی دنیا کی بیماریاں! ——— کیونکہ جس ہلاکت خیز انداز سے ان بدعتوں پر عمل ہو رہا ہے اس سے دنیا غار میں گری جا رہی ہے۔ جبکہ ہم گریجویٹ یتیم دنیا کے روحانی و مادی علاج کے لئے کوشاں ہیں اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ان بدعتوں کو چھوڑ دیں۔"

"اچھا فلسفہ ہے!"

"سوجھ بوجھ دور کی!"

"قابلِ مبارکباد ہیں گریجویٹ یتیم!" مختلف تبصرے ہوئے اور [illegible] اس کے ساتھی ان آراء کے احترام میں سر جھکاتے رہے۔ آخرکار ڈارلنگ [illegible] پوچھا: "آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"مدد، تعاون، ہمدردی [illegible] [illegible]

اس کے باپ نے پرس نکالا اور اُلٹے ہیٹ کے کاسۂ گدائی [illegible]
کمپارٹمنٹ کے مختلف گوشوں کی طرف ہیٹ کے پیالے بڑھتے [illegible]
ڈارلنگ مسکراتی رہی۔ گاڑی دوڑتی رہی۔

کانپور ریلوے اسٹیشن پر جب گاڑی [illegible]
تو مونس نے کہا: "چندہ کم ملا ہے۔" اور جب چندہ [illegible]

حلقا ہے۔ اعلیٰ سگریٹ اور سوٹ بوٹ۔ ہم ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔ اعلیٰ غذا کھاتے ہیں اور قیمتی لباس پہنتے ہیں لیکن کوئی کام نہیں کرتے۔ اس لئے آپ لوگ گریجویٹ یتیم خانے کی مدد کیجئے۔ جس طرح آئے دن آپ لوگ دوسرے یتیم خانوں کی مدد کیا کرتے ہیں اور ثواب حاصل کرتے ہیں۔ ۔ ۔!

تھوڑا [illegible] ۔ ۔ ۔ ہاتھ جیبوں میں تھے اور چاروں ہیٹوں کے کاسۂ گدائی جیبوں سے بھر رہے تھے۔ جب چندہ جمع ہو گیا اور گنتی ہوئی تو چالیس روپے کی ریزگاری [illegible] مالک [illegible] ایک کمپارٹمنٹ سے جبکہ میل گاڑی میں بہت سے کمپارٹمنٹ تھے۔ مونس اور اس کے ساتھیوں نے دن بڑھا لیے تھے۔

جھانسی میل اٹاوہ اسٹیشن پر رکا تو مونس نے کہا: "چلو ڈارلنگ کمپارٹمنٹ [illegible]

[illegible]

"منٹ پہلے ہی تو میں راؤنڈ کر آیا ہوں [illegible] اسی وقت [illegible] کی اور گریجویٹ آج ڈارلنگوں نے گھر سے نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ ۔ ۔!"

سیمیں [illegible] دہلی

گیارہ آنے کا نوٹس آیا! چاروں کے چہرے کھلے ہوئے تھے اور سب سوچ رہے تھے کہ ہندوستان واقعی سونے کی چڑیا ہے۔ اُڑتی چڑیا کے پیروں سے موتی گرتے ہیں۔ کاسۂ گدائی ہی نہیں بھر جاتے، پیٹ تک بھر جاتے ہیں! اگر انھیں ملازمت نہ بھی ملی تب بھی سکنڈ کلاس گزیٹیڈ آفیسروں جیسی زندگی گزاری جاسکتی ہے!

"چلو!" مونس نے اٹھتے ہوئے کہا "اب پریزنٹ خرید لیا جائے ـــــ" اور سب ریلوے گیٹ کی طرف ہولئے۔ باہر نکلنے لگے تو ٹکٹ نہ ہونے کی بنا پر چاروں روک لئے گئے۔ کیونکہ ریلوے ایکٹ میں گریجوٹ یتیموں کے لئے کوئی رعایتی دفعہ نہ تھی۔ چاروں کھڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اور ٹی ٹی کی ذہانت پر افسوس کر رہے تھے کہ موصوف نے چونک کر چپکے سے کہا "ڈارلنگ از کمنگ!" (Darling is Coming) سب نے چونک کر دیکھا۔ وہ گلابی ساڑی میں آرہی تھی۔ یقیناً وہ پہلے ویٹنگ روم گئی وہاں لباس تبدیل کیا۔ ورنہ اس کے جسم پر سفید ساڑی تھی۔ جوں ہی وہ قریب پہنچی مونس نے آگے بڑھ کر اپنی پریشانی اور ٹی ٹی کی بدتہذیبی کا شکوہ کیا اور کہا "آپ سفارش کر دیجئے۔" ڈارلنگ نے مسکرا کر باپ کی طرف دیکھا، کچھ کہا۔ جس پر اس کے باپ نے بڑھ کر ٹی ٹی سے سفارش کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ گریجوٹ یتیم ہیں ان کا خیال کیجئے۔" ٹی ٹی نے گھبرا کر ڈارلنگ کے باپ کو دیکھا۔ ڈارلنگ پر نظر پڑتے ہی مسکرایا اور کہا "آپ کی سفارش پر گریجوٹ یتیم جاسکتے ہیں!"

برات کے گھر میں ہنگامہ برپا ہوگیا!

ایک لمحہ میں یہ دلچسپ خبر گھر کے آخری کونے تک گونج گئی کہ دولھا کے چار دوست لکھنؤ سے آئے ہیں اور تحفے میں بندر، بکری، مرغا مرغی اور ڈنڈا لائے ہیں ـــ! اس خبر نے اتنی سنسنی پھیلائی کہ شادی کے گھر میں جو ہنگامہ بپا تھا وہ تو موقوف ہوگیا اور لڑکیاں، عورتیں اور بچے تک گھر سے امڈ پڑے ـــــ بندر کے گلے میں لال فیتے سے کارڈ منسلک تھا جس میں لکھا تھا (With Best Wishes From: Munis) اور اسی طرح شاکر کا ڈنڈا، موصوف کی بکری اور شہید کا مرغا مرغی رنگین فیتوں، خوبصورت کارڈوں اور حسین خواہشات اور دعاؤں سے مزین تھی اور ساری محفل قہقہہ بنی ہوئی تھی۔

سب سے پہلے مونس کا سگریٹ ہونٹوں سے جا گرا۔ شاکر جھک کر جوتے کا تسمہ باندھنے لگا۔ موصوف نے رومال نکال کر چہرہ صاف کرنے میں بچت سمجھی اور شہید نے پیٹ کے درد کی آڑ لے کر گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر پناہ ڈھونڈی۔ لیکن وہ آہی گئی۔ کئی خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ ڈارلنگ گلاب کے پھولوں کی طرح ہنستی ہوئی سر پر آہی پہنچی اور آتے ہی پوچھا "گریجوٹ یتیم کیا دنیا داری بھی نبھاتے ہیں؟ دنیا کی رسموں میں

ترک

ترکِ اُلفت بجا سہی ناصح
اور اُن تک اگر یہ بات گئی ـــــ جگر مراد آبادی

ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہیئے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا ـــــ فنا کانپوری

میں ترکِ عشق پہ نازاں تھا لیکن واقعہ ہے
کہ آج اُن کا خیال آیا تو اپنی یاد بھی آئی ـــــ شاہد صدیقی مرحوم

مجھے بھی کر گئے مجبور وہ ترکِ تبسم پر
اُنھیں بھی دیکھنے والے بہت دلگیر دیکھے ہیں ـــــ احسان دانش

سخت مشکل ہے سنبھل کر چلنا
جادۂ ترکِ محبت ہی سہی ـــــ روشن صدیقی

مُرسلہ: سید قدیر گولکنڈہ حیدرآباد

جھگڑے ہوتے ہیں۔۔۔؟"

اسی وقت شہید آڑے آیا اور طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ مونس نے چلا کر کہا "ڈاکٹر بلاؤ۔ کہیں آنت تو نہیں اتر رہی ہے۔" اس اعلان نے ماحول ہی بدل دیا۔ دولھا کے باپ گھبرا کر دوڑ پڑے اور لڑکیوں، عورتوں اور بچوں کو ڈانٹ کر گھر میں جانے کا حکم دیا گیا۔ کیونکہ شادی میں شریک ہونے والا مہمان بری طرح بیمار ہوگیا تھا۔ باہر سب واقعی گھبرا گئے تھے لیکن لڑکیاں سب اسی طرح ہنس رہی تھیں۔ کیونکہ ڈارلنگ جس کا نام صنوبر تھا اس نے گریجوٹ یتیموں کا سارا کچا چٹھا سنا دیا تھا۔ اسی لئے لڑکیاں شرط لگانے پر تیار تھیں کہ بیماری نہیں یہ بھی شرارت ہے!

تنہائی ہوتے ہی مونس نے شہید سے پوچھا "یہ [illegible] حرکت تھی؟" شہید مسکراتے ہوئے اور سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا "ایکٹنگ (Acting)" [illegible] ہنس دیئے تو شہید نے کہا "لڑکیوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے یہ ایکٹنگ [illegible] لیکن تھوڑی سی کمی رہ گئی۔۔۔"

"وہ کیا؟" موصوف نے پوچھا۔

"میں چاہتا تھا کہ ڈارلنگ مجھ سے پوچھے ـــــ [illegible]

"اگر وہ [illegible]

جلیس الدین صدیقی دہلی

سر کے دو ٹکڑے ہی کر دیتا!"

قہقہہ اُبل پڑا۔ جس کا جواب لڑکیوں نے قہقہوں سے دیا۔ تب سب کو علم ہوا کہ لڑکیوں کا غول اُن کے کمرے کے پاس ہی ہے۔ شہید نے ذرا بلند آواز میں کہا "جب ہی تو میں کہوں کہ ہوا میں مہک کیسی ہے؟"

دروازے کا ایک پٹ کھلا اور ایک لڑکی نے کہا "بولئے نہیں کہیں آفت نہ اُتر آئے۔۔۔!؟" لڑکیوں کے قہقہے جلترنگ کی طرح گونج گئے۔ شہید نے فوراً کہا "اب آفت نہیں اُترے گی۔"

"کیوں؟" شوخ سوال ہوا۔ شہید نے کہا "اس لئے کہ آپ مسیحا جو آگئے!"

قہقہوں کے شور میں لڑکی شرما کر ہٹ گئی۔ ایک دوسری شوخ لڑکی نے آگے بڑھ کر بڑے طنطنے سے کہا "آج کی لڑکیاں مسیحائی نہیں کرتیں، رُوح قبض کر لیتی ہیں! سمجھے جناب؟"

"بجا ارشاد!" مونس نے برجستہ کہا "اسی لئے جب بھی شادی کا ذکر ہو ایم سینی ٹوریم پہنچا دیئے گئے۔" قہقہے تو سنائی دیئے لیکن لڑکیوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اب وار کرنے کی جرأت نہیں کر رہی تھی۔ لڑکیاں ایک دوسرے کو ہمت دلا رہی تھیں لیکن کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آخر ڈارلنگ صنوبر کے درخت کی طرح نمودار ہوئی اور پوچھا "آپ کے پراسپکٹس میں گریجوٹ یتیموں کی شادی کا حل کیا دیا گیا ہے؟"

"یہ تو آپ کی چشم کرم پر منحصر ہے!" مونس نے التجائی انداز میں کہا "ہم گریجوٹ یتیم اسی آس پر زندہ رہیں گے۔۔" ڈارلنگ صنوبر کے مسکرا کر پیچھے ہٹ جانے کے بعد پھر کوئی لڑکی نمودار نہ ہوئی ــــــ مقابلہ ختم ہو گیا۔

یونیورسٹی لیڈیز رُوم میں قہقہوں کے سوا کچھ سُنائی نہ دیتا تھا جب گریجوٹ یتیموں کے قصّے شادی میں شریک ہونے والی لڑکی نے بیان کئے۔ یہ چرچے لیڈیز رُوم سے بالآخر باہر یونیورسٹی کی فضا میں گونج گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن مونس اور اُس کے ساتھی گریجوٹ یتیموں کی طلبی وائس چانسلر کے ہاں ہوئی۔ وائس چانسلر کی میز پر ایک خط پڑا تھا جسے وہ بار بار دیکھتا اور خشمگیں نگاہوں سے گریجوٹ یتیموں کو دیکھتا اور پوچھتا "یونیورسٹی کو بدنام کیا تم نے؟" مونس اور اُس کے ساتھی سر جھکائے یتیم بنے کھڑے تھے۔ زبان گنگ تھی۔ آخر وائس چانسلر نے کہا "گریجوٹ یتیموں سے ہم یونیورسٹی پاک کر دیں گے۔ فیصلے کا انتظار کرو۔" اس دھمکی نے مونس اور اُس کے ساتھی گریجوٹ یتیموں کو ہراساں کر دیا تھا۔ وہ بار بار پوچھتے "اب کیا ہوگا؟" آخر مونس نے سگریٹ جلایا، کش لیا اور بڑے اطمینان سے کہا "گریجوٹ یتیم سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن بزدل نہیں ہو سکتا ــــــ ہمارے بغیر یونیورسٹی ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی!"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ اِس لئے کہ گریجوٹ یتیم کی زندہ دِلی، ایکٹی وٹی اور رنت نئی شرارتوں نے یونیورسٹی کو زندگی، خوش مزاجی اور معیار بخشا تھا۔ اگر گریجوٹ یتیم نہ رہا تو یونیورسٹی میں زندگی نہ رہ جائے گی ــــــ لیڈیز رُوم سے پراکٹر آفس تک اس حقیقت کو محسوس ہی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اعتراف بھی ہوتا تھا۔

گریجوٹ یتیم یونیورسٹی سے خارج نہیں کئے جا سکے۔ البتہ قسمت نے انھیں خود الگ کر دیا۔ ایم۔اے کرنے کے بعد یونیورسٹی سے اُن کا رول ختم ہو گیا اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ گریجوٹ یتیموں کے بعد یونیورسٹی کی فضائیں بوجھل اور پھیکی ہو جائیں گی۔ اُن کے بعد زندگی اور زندہ دِلی کا فقدان ہو جائے گا۔ مُسکراہٹیں فنا ہو جائیں گی اور یونیورسٹی ایک بے جان کارخانہ بن کر رہ جائے گی۔ جہاں شگفتگی، مزاح اور زندہ دِلی نہ ہوگی اور باقی سب کچھ ہوگا۔ خود مونس نے الوداعی تقریر میں کہا تھا "آج یونیورسٹی سے گریجوٹ یتیم جُدا ہو رہا ہے۔ اسے یونیورسٹی سے جانے کا غم ہے اور اس سے زیادہ غم یہ ہے کہ ہمارے بعد گریجوٹ یتیم نہ آئیں گے۔ نہ خود زندگی حاصل کریں گے نہ دوسروں کو زندگی دے سکیں گے۔ نہ خود ہنسیں گے، نہ دوسروں کو ہنسنے دیں گے۔ نہ شگفتگی سے

آشنا ہوسکیں گے، نہ دوسروں کو آشنا ہونے دیں گے۔ نہ زندگی، زندہ دِلی اور تہذیب کا معیار اور بھرم قائم رکھ سکیں گے اور نہ دوسروں کو سبق دے سکیں گے — یہی غم ہے جو میری یتیمی پر نوحہ خواں ہے اور رہے گا . . . !"

گریجوایٹ یتیم جُدا ہوگئے اور یونیورسٹی سُونی ہوگئی۔ لیکن اُن کے قصّے چرچے اب بھی فضاؤں کو متبسّم کرتے رہتے تھے اور اُن کی شرارتوں کی یادیں اب بھی یونیورسٹی کی فضا کو گُدگُدا دیتی تھیں۔

قسمت نے گریجوایٹ یتیموں کو یونیورسٹی سے چھینا تو دُور دُور پھینک دیا۔ شہید اب اپنی لمبی ناک سے بین الاقوامی زہر کو سُونگھنے لگا جو دُنیا کی فضاؤں پر تیزی سے مہلک اثر کرتا جاتا تھا۔ اِس لئے کہ قسمت نے زندہ دِلی چھین کر ذمّہ داری کا بوجھ سر پر لاد دیا تھا کیونکہ وہ اقوامِ متحدہ میں ایک ذمّے دار جگہ پر تھا — اِس سے بُرا سلوک قسمت نے موصوف کے ساتھ یہ کیا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے کو وزنی بے جان آہنی توپ کھینچنے کو دے دی اور وہ ارٹیلری کا کیپٹن ہوگیا — بھاری پیٹ والے شاکر پر قسمت نے ترس کھایا۔ کوئی بھاری سزا نہیں دی بلکہ حق بہ حقدار رسید کے تحت گریجوایٹ یتیم خانے سے ہٹا کر سیاسی یتیم خانے میں پہنچا دیا اور ایم ایل سی بنا دیا کہ قوم کے غم میں گُھلتا رہے اور اپنا وزن کم کرتا رہے — رہ گیا مونس تو وہ اب تک کچھ نہ ہوسکا تھا۔ وہ ابھی تک گریجوایٹ یتیم تھا اور قہقہے لگاتا اور نِت نئی شرارتوں کی "ایجاد" ہی کیا کرتا تھا!

جب چاروں یتیم اِکٹھے ہوتے تو مونس پر سب ہی ترس کھاتے تھے کیونکہ وہ ہنوز یونیورسٹی کا سابق یتیم ہی تھا اور بس! لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مونس کو شمّہ برابر نہ کوفت تھی نہ ملال تھا اور نہ رنج!

اِس لئے کہ وہ صحیح معنوں میں گریجوایٹ یتیم تھا اور بقول اُس کے اور سب "پیدائشی میخوار نہ تھے"۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے ساتھیوں کو ضرور رنج ہوتا تھا کہ گریجوایٹ یتیم کی تھیوری کا خالق اب تک خالی ہاتھ تھا، جب کہ اور سب کے پاس خوبصورت بیویاں، اعلیٰ عہدے اور حسین بنگلے تھے۔ جن سے زندگی کو سراب دیا جاتا ہے۔ لیکن مونس کو زندگی اب تک دھوکا نہ دے سکی تھی اور نہ وہ دھوکا کھانے کے لئے تیار تھا۔

قِسمت نے اپنی ہار دیکھی تو مونس کو اپنے دام میں پھانسنے کے لئے رنگین دھوکا دیا۔ وہ دھوکا جس کے چُنگل سے عابد زاہد عارف اللہ والے بھی بہ مشکل ہی دامن بچا سکتے ہیں — قسمت کا وہ وار عورت کے رُوپ میں نمودار ہوتا ہے — !

مونس کو بھی قسمت نے وہی آئینہ دکھایا۔

جب وہ بر دکھاوے کے لئے الٰہ آباد کی ایک حسین کوٹھی کے برآمدے میں پہنچا تو ایک لڑکی نے اُسے دیکھتے ہی چیخ کر کہا: "ارے اگریجوایٹ یتیم!؟" — مونس زیرِ لب مُسکرا دیا اور پھر وہ مُسکراہٹ زندگی سے سمجھوتہ کر بیٹھی اور اُس کا دامن کسی کے دامن سے باندھ دیا گیا!

شادی ہوگئی اور جب اُس نے لائف پارٹنر کو دیکھا تو گھونگھٹ سے "ڈارلنگ" کا حسین و جمیل چہرہ بے نقاب ہوگیا — اُسے وہ سفر یاد آگیا جب اُس نے گریجوایٹ یتیم کی تھیوری کو جنم دیا تھا۔ ڈارلنگ سے قریب ہونے کے لئے اُس نے گریجوایٹ یتیم خانے کے لئے ہیٹ کو کاسۂ گدائی بنا کر چندہ جمع کیا تھا اور کہا تھا: "ہم گریجوایٹ یتیم ہیں۔ حُسن ہم خرید نہیں سکتے، بھیک میں مل جائے تو یہ ہماری قسمت ہے!" اور قسمت نے وہی کر بھی دکھایا تھا!

شاکر، موصوف اور شہید نے ڈارلنگ سے جو اب اُن کی بھابی تھی، پُوچھا۔ "بھابی! آپ گریجوایٹ یتیم کی ڈارلنگ کیسے بن گئیں؟" مونس سگریٹ پی رہا تھا اور مُسکرا رہا تھا۔ اُس کی ڈارلنگ نے اُسے دیکھا، مُسکرائی اور کہا: "میرے لئے ہی گریجوایٹ یتیم کی تھیوری بنی تھی، اُسی کا مجھے شُکریہ ادا کرنا تھا!"

جب دوسرے ساتھی گریجوایٹ یتیم ہنس ہنس کر شِکوہ کرتے کہ اُن کی قِسمت نے وفا نہیں کی تو مونس اُنھیں جواب دیتا اور کہتا: "اِنھوں نے بے صبری قبول کی۔ زندگی سے گھبرا کر سمجھوتہ کر لیا۔ ظاہر ہے قِسمت انھیں تحفہ کیسے دیتی۔ لیکن اُس نے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اپنی گریجوایٹ یتیمی سے مایوس نہ ہوا۔ تب زندگی نے تحفے میں اُسے ڈارلنگ دے دی!"

مونس جب زندگی کے عروج پر پہنچا تو اُس کے ساتھی کہنے لگے یہ گریجوایٹ یتیم کی کوششوں، قابلیت اور صلاحیتوں کا انعام نہیں، ڈارلنگ کا اعجاز ہے۔ جس نے گریجوایٹ یتیم کو گریجوایٹ تو بنائے رکھا۔ لیکن آج اُس کی یتیمی دُور کر دی! — اور مونس سگریٹ کا کش لگا کر مُسکرانے لگتا تھا!!

غزلیں

محمد احسن رضوی ایم۔ایس۔سی

شبِ غم یاد اُنکی آرہی ہے
اندھیرے میں بھی کچھ کچھ روشنی ہے

نہ جانے مجھ سے کیا کیا کہہ گئی ہے
نگاہِ شوخ جب مِل کر جھکی ہے

نگاہوں سے پلا کر جانے والے
ابھی ہونٹوں پہ میرے تشنگی ہے

مِرا ہے نہ تم اِس کو لٹانا
متاعِ دل بہت ہی قیمتی ہے

تمہارے غم کو کیسے بھول جاؤں
یہی تو اِک متاعِ زندگی ہے

رہیں کبتک حواس و ہوش قائم
بالآخر میکشی پھر میکشی ہے

کوئی کہدے یہ جاکر دوستوں سے
ابھی احسن بقیدِ زندگی ہے

ضیا افغانی

یہی تھا کارواں پہلے یہی تھی رہگذر پہلے
مگر رہزن نہ تھا کوئی بشکلِ راہبر پہلے

یہ دل جاتا ہے سینے سے کہ جاتا ہے جگر پہلے
یہی اب دیکھنا ہے دیکھتے ہیں وہ کدھر پہلے

رخِ پُرنور پہ بکھری ہوئی زُلفیں یہ کہتی ہیں
اُجالوں کے تمنائی اندھیروں سے گزر پہلے

ستم ہے آج اُس کا اجنبی بن کر گزر جانا
ازل کے دن ملی تھی جس ستمگر سے نظر پہلے

ہمارے دل کی ہر دھڑکن اُڑا دیتی تھی نیند اُنکی
دھڑکتا تھا کچھ اِس انداز سے یہ دل مگر پہلے

مٹانے کیلئے گلشن کے ہر گوشے سے تاریکی
نشیمن بعد کی شے ہے جلا دے بال و پر پہلے

جہاں تک ہو سکے بچنا ضیا اُنکی نگاہوں سے
کہ دشمن دل کے کر لیتے ہیں پیدا دل میں گھر پہلے

رزمی عابدی شاہجہانپوری

مسلسل امتحاں ہے اور میں ہوں
جفائے آسماں ہے اور میں ہوں

وہی ناکامیٔ پیہم وہی غم
وہی آہ و فغاں ہے اور میں ہوں

نظر ہے آجتک محرومِ جلوہ
حجابِ درمیاں ہے اور میں ہوں

چھٹا ہے ساتھ جب سے کارواں کا
خیالِ کارواں ہے اور میں ہوں

جبینِ شوق ہے مصروفِ سجدہ
تمہارا آستاں اور میں ہوں

نشیمن ہے نہ وہ دلکش فضائیں
جفائے باغباں ہے اور میں ہوں

چھٹا ہے آشیاں جس دن سے رزمی
تلاشِ آشیاں ہے اور میں ہوں

طنزیہ

غالب کا استعمال

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔ اے

۵۔۱۷۰۵ پہاڑی بھوجلہ۔ دلّی

خوشتر گرامی!

جس طرح کوئی کنواری اپنے منگیتر کا نام لیتے شرماتی ہے۔ اسی طرح ہماری کانگریس اُردو کا نام لیتے ڈرتی ہے۔ تم نے سہ لسانی منصوبہ تو پڑھا ہی ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ بیٹا! ہندی لے لو، تیلگو لے لو، تامل لے لو، غرض جو زبان چاہے لے لو۔ مگر اُردو کا کہیں ذکر نہیں کہ اسے بھی لے لو۔ ڈر یہ ہے کہ اگر اس کا نام زبان پر آ گیا تو نکاح باطل ہو جائے گا اور کانگریس کے حسب نسب میں فرق آ جائے گا اور پھر اسی بدنصیب زبان کے شاعر غالب کی صد سالہ برسی منا کر دُنیا کو چکمہ دیتے چلے ہیں کہ وہ بھارت کا عظیم ترین شاعر تھا۔ ذرا کوئی ان سے پُوچھے کہ یہ الفاظ کن مخارج سے صادر ہو رہے ہیں ؂

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد!

ذرا دیکھو تو اس ڈھٹائی کو۔ شیطان بھی اُردو کے جسم میں کس کس طرح حلول کر رہا ہے۔ چندہ جمع کر کے کھانے اور ملائم کندھوں پر بندوق رکھ کر چھوڑنے کا گُن کوئی ان سے سیکھے ——— غالب کی برسی اسی لئے منانے بیٹھے ہیں کہ اس کی تہہ میں ڈونیشن ہیں اور چندہ ہے۔ بڑے سے بڑا کائیاں ابھی برسوں ان کے آگے پانی بھرے۔ کبھی تم نے ان لوگوں کو تھری ناٹ تھری لگاتے اور کھدر بھنڈار بنے سڑکوں پر کُولھے مٹکاتے یا تھرک تھرک کر موٹروں سے اُترتے دیکھا ہے؟ یزید نے حُسینیت کو ختم کرنے میں کون سا تسمہ لگا رکھا مگر حق و صداقت کا چراغ بُجھائے نہ بُجھا ؏

قتلِ حُسین اصل میں مرگِ یزید ہے

تم اُردو زبان میں بھی حُسینیت کی جھلک پاؤ گے۔ مجھے یقین ہے کہ "بیسویں صدی" کے خوشتر گرامی، لکھنؤ کے آنند نرائن مُلاّ اور الٰہ آباد کے پنڈت سُندر لال جب تک زندہ ہیں اُردو کے قاتلوں کا اُردو دشمنی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ تم دیکھنا یہ اُردو کے دشمنِ جانی اُردو کو مٹانے کی حسرت میں خود ہی مٹ جائیں گے۔ تم نے Minister Without Portfolio تو سُنا تھا Language Without Region کاہے کو سُنا ہوگا۔ یہ کانگریس کی دین ہے۔ یہ ہے غالب کی صد سالہ برسی منانے والوں کا کردار ؏

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

آرزو لکھنوی میرے محترم اُستادِ مرحوم کا شعر سُنو ؎

یہی حد نہ تھی جفا کی کہ قضا پہ ختم کر دی　　ابھی اور کیا نہ کرتے اگر اختیار ہوتا

کہو! غالبؔ کی چندے بازی میں تمھارا کے بوتل خون شامل ہے ؟ اچھا ایک شعر سنو ؎

ٹھمک ٹھمک کے جو چوسیں لہو وہ لیڈر ہیں
سِسک سِسک کے جو چھلکے جو خوں وہ جنتا ہے

تمھیں میں نے افسانہ نمبر کے لئے مضمون بھیجا تھا اُسے تم نے اگست کے شمارے میں چھاپا!

کجا می نمائی کجا می زنی

چلو، چھاپا تو سہی۔ نکتے جتنے بُہے حوالوں ہم اِس منزل میں تو آئے۔ اٹھارہ برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اب ۱۹۶۸ء میں چالیس سال ہو جائیں گے۔ اِس لئے اب نہ شہرت کی ہَوس ہے اور نہ کسی مضمون کی اشاعت یا عدمِ اشاعت کا گِلہ! ــــــ یار! ایک بات کہوں بشرطیکہ بُرا نہ مانو۔ تمھارا پچھلا سالنامہ یوں تو بڑا جوان جہان تھا اور تمھاری جوانی کی یاد تازہ کرتا ہے لیکن اِس میں ایک افسانہ ایسا چھپا ہے جو نہ نر ہے نہ مادہ! کسی تیسری جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اب کانگریسی وزیروں جیسی سفارشیں قبول کر کے اگر افسانے چھاپو گے تو پرچہ سیکولر اسٹیٹ ہو کر رہ جائے گا ــــــ میں گزشتہ دو ماہ سے دمہ کو نفسِ ناطقہ بنائے ہوں۔ تمھارے دفتر کی سیڑھیاں طے کرنا میرے لئے ہفت خواں سے کم نہیں۔ پھر ملاقات کیسے ہو؟ ؎

نہ جانے کتنے دنوں بعد تم کو دیکھا تھا — نہ جانے کتنے دنوں بعد تم کو دیکھیں گے

مخلص ــــــ غلام احمد فرقت کاکوروی

فرقہ پرستی اور اردو کُشی کا ٹھیکہ لینے کے بعد جب دیس آزاد ہوا اور ملک کی قومی زبان پر اردو زبان کا بلا اصدقے کر کے اُس کا گوشت چیل کوؤں کو دیا جا چکا تاکہ قومی زبان نظرِ بد سے بچی رہے تو کچھ ستم ظریفوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ حضور! اِس کی ہڈیوں کو دیکھ لیا جائے کہ کوئی ایسی بوٹی تو لگی نہیں رہ گئی ہے جس میں جان باقی ہو اور چھپکلی کی دُم کی طرح جسم سے علیٰحدہ ہونے کے بعد بھی وہ زمین پر رقصاں رہے۔ اِس پر ایک اُردو کُش اور ماہرِ لوٹ کھسوٹ بولا۔ کہ بھائیو! اب مزید فکر و تردّد کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اِس زبان کی جو ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں اُن کی کھپت کا بھی ہماری کانگریس نے پُورے طور پر انتظام کر لیا ہے اور اُس کی ہڈی کی شکر بنانے والوں سے ٹنڈر طلب کر لئے گئے ہیں اور اب اُس کی شیرینی اور لطافت کے مزے اِس شکر کی گرانی میں چار روپے سیر شکر کھانے والے لُوٹیں گے۔ اِس کے بعد یہ طے پایا کہ اِس زبان کے شعراء کے پنڈوں کو ٹٹول کر دیکھا جائے کہ اِن شعراء میں کس کے کاندھے اِتنے مضبوط ہیں جن پر رکھ کر سیاسی بندوق چلائی جاسکتی ہے اِس لئے اُردو کے تمام شعراء کے کاندھے ٹٹولتے ٹٹولتے جب ہماری کانگریس کا ہاتھ مرزا غالبؔ کے کاندھے پر پڑا تو قاتلانِ اُردو کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ صرف مرزا صاحب کے کاندھے اِتنے مضبوط ہیں جن پر سیاست کی بھاری بندوق رکھ کر چلائی جاسکتی ہے ــــــ اور اُردو داں طبقے کا تھوڑا بہت خون جو بچ رہا ہے اُسے بھی چُوسا جا سکتا ہے۔ اتفاق سے مرزا صاحب مر بھی ایسے موقعے سے تھے کہ اب سال ڈیڑھ سال بعد اُنھیں مرے پُورے سَو سال ہو جائیں گے۔ اِس لئے متفقہ طور پر طے پایا کہ مرزا صاحب کے کاندھے تمام شعراء میں زیادہ جاندار اور مضبوط ہیں اُنھیں کو استعمال کیا جائے۔ اِس پر مرکزی کانگریس نے کہا بھائیو! ہم پر اور ہمارے ساتھیوں پر براہِ راست اُردو کُشی کا الزام ہے اور ہم نے اسے شجرِ ممنوعہ قرار دیا ہے اِس لئے از راہِ ہمدردی سب سے پہلے ہمیں مرزا صاحب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھُڑانے کی اجازت دی جائے۔ اِس پر قاتلانِ اُردو کی طرف سے لبیک لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں اور مرکزی کانگریس کی طرف سے ایک سنٹرل غالبؔ کمیٹی کی تشکیل عمل میں آگئی اور قاتلانِ اُردو کے چودھری کی طرف سے ایسے عہدے دار اِس کمیٹی میں مقرر کئے گئے جن میں بیشتر حضرات وہ تھے جنھیں اِس کی بھی اطلاع نہ تھی کہ مرزا غالبؔ ابھی حیات ہیں یا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اِس کمیٹی کے سکریٹری نے عہدہ قبول کرنے سے پہلے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرات! عام کانگریسیوں کی طرح یوں تو ہر عہدہ مجھے جان و دل سے قبول ہے مگر میں کیا عرض کروں تمام مشاعروں میں اگرچہ میں پابندی سے شریک ہوتا رہتا ہوں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ مشاعروں میں ہر بڑے سے بڑا شاعر تو مجھے دکھائی پڑا مگر مرزا صاحب آج تک کسی مشاعرے میں نظر نہ آئے۔ اِس پر اُس کمیٹی کے ایک دوسرے عہدیدار نے کہا کہ میاں! وہ لوگ بڑے آدمی ہیں

اور اب اُن کی عمر سَو سال کی ہونے کو آئی اِس لئے وہ زیادہ تر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ اِس پر ایک تیسرے عہدیدار نے کہا۔ جناب اِس جشن کی تیاریاں تو بڑے زور شور سے ہو رہی ہیں لیکن کسی نے مرزا صاحب سے بھی اُن کی برسی منانے کی اجازت حاصل کر لی ہے؟ اِس لئے میری تجویز یہ ہے کہ سب سے پہلے کیوں نہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھ لیا جائے کہ وہ اپنی برسی منانے کو تیار بھی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب چندہ وندہ جمع ہو جائے تو عین موقعے پر مرزا صاحب اور اُن کی بیوی جھاڑو پنجہ لے کر کھڑی ہو جائیں اور آدھو آدھ کا مطالبہ کریں اور بیگم صاحبہ حقِ زوجیت کے لئے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو جائیں۔

دُکھ سہیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں

اِس پر ایک نیتا نے گرم ہو کر کہا۔ اگر یہ صورت ہوئی تو چندہ جمع کرنے والوں کا محنتانہ نکال کر سارا چندہ ہندی پرچارک سبھا کو دے دیا جائے گا۔ ایک صاحب بولے۔ کیوں نہ مرزا صاحب کے لڑکوں سے جا کر منظوری حاصل کر لی جائے۔ اِس پر سکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ صرف بڑے صاحب زادے کی منظوری حاصل کر لی جائے اور اُن سے کہا جائے کہ وہ اپنے باپ کے کانوں تک یہ بات پہنچا دیں کہ اُنھوں نے صد سالہ برسی کی منظوری دے دی ہے بلکہ اگر ممکن ہو اور مرزا صاحب دستخط کر سکیں تو اُن سے دستخط بھی لے لئے جائیں ورنہ اُن کی بیوی شُعلہ ہے اِتنی بکٹ ہیں کہ مصلّے پر کوس کوس کر سارے چندہ جمع کرنے والوں کو کھا جائیں گی! دوسرے صاحب بولے۔ اِسی لئے تو مرزا صاحب کی گھر میں قدم رکھتے جان نکلتی ہے۔ اِدھر ڈیوڑھی سے گھر میں اُنھوں نے قدم رکھا اُدھر وہ جھاڑو پنجہ لے کر دوڑی۔ اِس پر سکریٹری صاحب سے لکھنؤ کے ایک صاحب نے آنکھ مار کر کہا کہ حضرت! اگر جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔ ہر طرف سے ضرور، ضرور! کی آوازیں بلند ہوئیں فرمایا قبلہ گستاخی معاف! قسم آپ کے سرِ اقدس کی، ایک دن تو جب میں مرزا صاحب سے ملنے گیا ہوں تو میں نے خود مرزا صاحب کی شان میں بیوی کو ناپسندیدہ الفاظ استعمال کرتے سُنا ہے قسم قرآن پاک کی! کیا زبان کی مار دے رہی ہے یہ جلے تن عورت اِتنے بڑے شاعر کو۔ اُس پر اُن کے ایک ساتھی نے اپنے دوست سے آنکھ مار کر کہا۔ مگر قسم جناب امیر کی! مرزا صاحب نے بھی تو بیوی کو تپانے میں کوئی تسمہ باقی نہیں رکھا اور ایک ٹکھی ڈومنی نے عشق کر کے گھر والی کے سینے پر پُوری زندگی مونگ دلی ہے۔ اِس پر ایک نیتا نے کہا۔ مگر مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں۔ پھر اگر اُنھوں نے ایک ڈومنی ڈال لی تو کون سا بڑا گناہ کیا؟ اِس پر لکھنؤ والے صاحب بولے۔ حضرت وہ شیعہ مذہب تھے اِس لئے اُنھوں نے ڈومنی کو حلال کرنے کے لئے مُتعہ ضرور کیا ہوگا! اور اگر نہ ڈالتے تو کیا کرتے۔ ترکی النّسل تھے۔ کب تک سوالیہ جملے کا نشان بنے بنے پھرتے۔ پھر جب گھر والی رُخ ہی نہ ملائے تو شوہر کیا کرے۔ اِس پر نیتا جی نے کہا اِس سے تو اچھا تھا کہ نس بندی کرا لیتے تاکہ چیں پیں سے تو نجات ملتی۔ اِس پر سکریٹری صاحب بولے۔ جناب! ہنسی مذاق برطرف۔ پہلے اِس کی تحقیق تو کر لی جائے کہ اُن کے لڑکوں میں کتنے پاکستان میں ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ اُنھوں نے وہاں کی شہریت اختیار کر لی ہو کیونکہ اُس صورت میں جو لڑکے پاکستانی شہریت اختیار کئے ہوں گے وہ بھارت دشمنی میں کسی قیمت پر یہ تقریب منانے کی منظوری نہ دیں گے اور اگر یہاں باپ کی تقریب منائی گئی تو وہاں پاکستانی حکومت اُنھیں دھر لے گی۔ ایک صاحب بولے۔ یہ سیاسی گلی ڈنڈے کی بھی خوب رہی!

نشانہ تاکنا دل پر جگر کے پار ہو جانا

بھلا اِس سیاسی بھینگے پن کا بھی کوئی علاج ہے۔ وہاں باپ چوری کرے اور یہاں بیٹا پکڑا جائے۔ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا! اِس پر یو۔ پی کی غالب کمیٹی کے ایک رُکن بولے۔ صاحب! اِن سب سیاسی جھگڑوں سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ اُن کی صد سالہ برسی ہندی میں منائی جائے کیونکہ ہندی کی جدید تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جتنے اُردو کے بڑے بڑے شاعر گزرے ہیں وہ دراصل ہندی کے شاعر تھے اور جتنی تاریخی عمارتیں مسلمان بادشاہوں کے نام سے منسوب ہیں وہ سب ہندوؤں کی بنوائی ہوئی ہیں۔ اوک صاحب کے کوئی دُور کے رشتے دار جو ہندی شعراء پر تحقیق کر رہے ہیں اوک صاحب کی طرح اُن کی ذاتی تحقیق یہ ہے کہ اُن کی ساری کویتائیں ہندی میں تھیں لیکن کسی میاں بھائی نے اُن سب کا اُردو میں ترجمہ کر کے اُنھیں اُردو کا شاعر مشہور کر دیا۔ بلکہ ایک ہندی کے محقق نے تو یہاں تک دریافت کر لیا ہے کہ اُن کا اصلی نام پرشوتم داس لِپ لِپ تھا۔ اور اُنھوں نے چار کتابیں ہندی میں لکھی تھیں اوّل "عودِ ہندی" دوسرے "بھگوان کھاتے" تیسرے "شبد بین" اور چوتھے "کہاں تھے بھگوان" اُردو والوں نے عودِ ہندی کو بجائے الف کے "عین" سے بدل دیا۔ بقیہ نام "برہانِ قاطع" "سبد چیں" اور قاطعِ برہان رکھ کر ساری کتابوں کو اپنا لیا۔ اُن کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خالص برہمن تھے۔ چنانچہ اُن کا یہ شعر تو براہِ راست اِس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ برہمن تھے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اِس پر اِتی سُندر! اِتی سُندر! کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا۔ اِن حالات میں ہماری یہ تقریب قومی یکجہتی کی ایک جیتی جاگتی مثال بن جائے گی اور ہم بہت آسانی سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے

لیے لیے چندے اور ڈونیشن لے سکیں گے۔ ایک صاحب جو ابھی تک خاموشی سے اِن تمام باتوں کو سُن رہے تھے، بولے۔ بھائیو! میں نے مرزا غالب کو جتنا پڑھا ہے اُتنا آپ حضرات میں سے شاید ہی کسی نے پڑھا ہوگا۔ مگر مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے جیسے مرزا غالب مر چکے ہیں۔ اِس پر ایک لکھنؤ والے نے اپنا سینہ پیٹ کر کہا ہے ہے!

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اے بچ بچ بتلیئے یہ منحوس خبر آپ نے کس اخبار میں پڑھی۔ ابھی پرسوں تو وہ اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھے شوربہ میں روٹی بھگو کر کھا رہے تھے۔ وہ تو کہئے قسمت میں آخری دیدار لکھا تھا جو ہو گیا ورنہ میں بالکل خالی الذّہن اُن کے دروازے کے پاس سے چلا جا رہا تھا کہ ایک دم کسی کے کھانے کی آواز کانوں میں پڑی، مُڑ کر دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب بیٹھے شوربہ پھُلکا کھا رہے تھے۔ بوڑھے آدمی دانت جوانی ہی میں گر چکے تھے۔ اِسی لئے روٹی شوربہ میں بھگو کر کھاتے تھے۔ ایک تیسرے صاحب نے کہا کہ صاحب جہاں تک اس منحوس خبر کا تعلق ہے مجھے بھی اِس میں کچھ صداقت معلوم ہوتی ہے کیونکہ سویرے ایک صاحب کہتے جا رہے تھے کہ

حیف غالب مُرد!

کوئی فارسی داں معلوم ہوتے تھے اِس پر کانسٹی ٹیوشن کلب کے ایک رُکن جو غالب سنٹرل کمیٹی میں اِس وجہ سے شامل کر لئے گئے تھے کہ وہ ذرا پیسے والے تھے اور اُن سے ڈٹ کر چندہ وصول ہوا تھا، بولے۔ ابھی گزشتہ ہفتے نہ جانے کہاں مشاعرہ تھا جس کی انھوں نے صدارت فرمائی تھی۔ اِس پر ایک صاحب نے اُن کے بیان کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ جناب! وہ مرزا صاحب نہیں، جوش ملسیانی صاحب تھے جن کی شکل کثرتِ استعمال سے اب غالب جیسی ہو گئی ہے اور وہ ماشاء اللہ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ اِتنے میں ایک محترمہ جو ابھی ابھی آئی تھیں غصّے میں نتھنے پھُلا کر بولیں۔ آپ حضرات یہ کیا جہالت کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں مرزا صاحب کی پرنواسی ہوں۔ انھیں مرے ننانوے سال ہو چکے ہیں! اِس پر ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں تو پھر عورتوں کی جو کمیٹی زنانخانوں سے چندہ وصول کرنے کے لئے بنی ہے اُس کا صدر آپ کو بنا دیا جائے۔ آپ کی موجودگی میں چندہ بھی اچھا وصول ہوگا اور مرزا صاحب کی عظمت کا رعب بھی عورتوں پر اچھا پڑے گا۔

جب غالب کی صد سالہ برسی کی خبریں دُنیا کے گوشے گوشے میں ہندوستان کی گرانی، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی اور قرض خواہی کی طرح پھیل گئیں تو ہندوستان کی عورتوں اور مَردوں نے اپنی اپنی ولدیت بدل بدل کر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ اُن کا سلسلۂ نسب غالب تک گیا ہوا ہے اور عوام نے مرزا صاحب کے کندھے پر اپنی اپنی بندوقیں رکھ رکھ کر چھُڑانا شروع کر دیا۔ بازاروں میں غالب بیڑی، غالب سگریٹ، غالب کھلونے، غالب قلفیوں کی آوازیں لگنے لگیں۔ ریڈی میڈ کپڑے والوں نے غالب لنگوٹ، غالب جمپر، غالب شلوار، غالب قمیز، غالب پتلون، غالب انگوچھا، غالب نیکریں سی سی کر دوکانوں پر لٹکا لیں۔ کچھ لوگوں نے غالب ریستوران اور غالب ہوٹل کھول کر وزیروں سے اُن کا افتتاح کروانا شروع کر دیا۔ جب نواب اغّن صاحب کو عالمِ نزع میں معلوم ہوا کہ مُلک میں غالب کا طوطی بول رہا ہے تو انھوں نے اپنی لڑکی اور لڑکے کو جنھوں نے ہندی میں بورڈ سے ہائی اسکول اور انٹر تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا اپنے پاس بُلا کر وصیت کی کہ بیٹا! میں تو دُنیا سے جا ہی رہا ہوں لیکن تم دونوں کو وصیت کرتا ہوں کہ تم دونوں غالب کی زندگی کے کسی پہلو کو لے کر اُس پر تھیسس ضرور لکھنا ورنہ قبر میں میری پیٹھ نہ لگے گی اور میں میدانِ حشر میں تم دونوں کا دامن گیر ہوں گا۔ اِس پر جو لوگ نواب اغّن کی عیادت کو آئے تھے اُن میں بحث شروع ہو گئی۔ اغّن صاحب کے چچازاد بھائی مِیرن صاحب کہنے لگے کہ حضرت! غالب پر تھیسس لکھنا سر دست زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے کم نہیں! اِس لئے انھوں نے الہ آباد سے آئی ہوئی ایک خبر کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں صرف غالب پر ریسرچ کئے ہوئے طلباء کی تعداد اِس وقت تک دو ہزار سے اوپر پہنچ چکی ہے! اور اِس سلسلے میں بتایا کہ ابھی حال میں الہ آباد یونیورسٹی میں مرزا غالب پر تحقیق اور تدقیق کا جو شعبہ قائم ہوا ہے اُس میں ایک ریسرچ اسکالر کی جگہ خالی ہوئی تھی جن میں تقریباً پانچ سو طلباء کو جو غالب پر پی۔ ایچ۔ ڈی کئے ہوئے تھے۔ پروفیسر احتشام حسین صدر شعبۂ اُردو نے اِنٹرویو کے لئے طلب کر لیا۔ انٹرویو والے دن اُمّید واروں کو جب کیو میں کھڑا کیا گیا تو یونیورسٹی کی سڑک پر ٹریفک جام ہو گئی۔ اِس پر پولیس نے اعتراض کیا اور اُمّید واروں کو پہلے تو وارننگ دے کر ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب وہ کسی طرح ہٹنے کو تیار نہ ہوئے تو پولیس کو اُن پر اشک آور گیس چھوڑنا پڑی۔ اِس کے بعد بھی جب وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تو پولیس نے اُن پر لاٹھی چارج کر دیا۔ چھوٹے بڑے تین پی۔ ایچ۔ ڈی زخموں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِس پر ایک صاحب سینہ پیٹ کر بولے۔ ہائے ہائے! کیسے کیسے جوان کام آئے ہوں گے! قبلہ! میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ الہ آباد میں جو حالیہ فساد ہوا ہے وہ اِسی کا شاخسانہ تھا۔ ایک تیسرے صاحب بولے۔ جناب! میں تو اب جب کسی کالج کے سامنے طلباء پر لاٹھی چارج کی خبر سُنتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ ہو نہ ہو وہاں کوئی اُردو کی جگہ خالی ہوئی ہوگی اور زخمی ہونے والوں میں کچھ نہیں تو پی۔ ایچ۔ ڈی تو ضرور ہی ہوں گے۔

خیر اِس قسم کی چہ میگوئیاں تو ہر مرنے والے پر ہوتی رہیں گی۔ لیکن

ایک دن جب میں مرزا صاحب کی صد سالہ برسی پر ایک مضمون لکھ رہا تھا اور ان کا اور ان کے ہم عصر ذوق کا دیوان دیکھ رہا تھا کہ مجھے اُن کے بعض اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ جس وقت مرزا کا انتقال ہوا ہے اُس وقت کچھ اِس پھرتی سے اُن کی روح جسم سے پرواز کر گئی کہ اُنھیں معلوم ہی نہ ہوا کہ جاں کندنی کسے کہتے ہیں؟ اور عالمِ سکرات میں کن کن اذیتوں سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ اب تک قبر میں لیٹے اِس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ اُنھیں احاطہ کالے خاں سے نظام الدین اولیاؒ محض تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ لیٹے لیٹے اپنے موجودہ استعمال پر بدحواس ہو ہو کر یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ کہیں اِس صد سالہ برسی کے موقع پر اُنھیں قبر سے نکلوا کر حکومت کے سپرد نہ کر دیا جائے اور اُن کا ڈھانچہ جگہ جگہ جلسوں اور سرکاری تقریبوں میں اِس طرح استعمال ہونا شروع ہو جائے جس طرح کسی لاوارث کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے میڈیکل کالج کے طلباء کو دے دی جاتی ہے!!

غزلیں

اُودے سنگھ شائق ایڈوکیٹ

اُنہیں اپنی جفاؤں پر پشیماں کون دیکھے گا
نظامِ بزمِ ہستی کو پریشاں کون دیکھے گا

یہ مانا ہم نشیں حُسنِ بہاراں تو یہی ہوگا
مگر اگلے برس حُسنِ بہاراں کون دیکھے گا

مری آہیں نظامِ دہر برہم کر تو سکتی ہیں
مشیت کو مگر سر در گریباں کون دیکھے گا

لہو رو کر وطن کی یاد میں ہر گام پر میں نے
کھلائے ہیں جو غربت میں گلستاں کون دیکھے گا

نہ ہوگی چشمِ شاعر ہی اگر موجود عالم میں
جمالِ شاہدِ فطرت کو عُریاں کون دیکھے گا

مری مشکل کبھی آساں تو ہو جائے گی اُلفت میں
مگر مشکل تو یہ ہے اس کو آساں کون دیکھے گا

بہاریں یوں تو غربت میں بھی آئیں گی مگر شائق
وطن کے باغ کی صبحِ بہاراں کون دیکھے گا

شاہد احسن مراد آبادی

اے مری چشمِ منتظر صبر ہی کام آئے گا
آج نہیں تو کل ضرور اُن کا پیام آئے گا

بزم میں جب وہ ساقیٔ مست خرام آئے گا
وجد میں رند آئیں گے رقص میں جام آئے گا

صاف بتا رہی ہیں یہ پردۂ در کی جنبشیں
آج حریمِ ناز سے اُن کا سلام آئے گا

چھیڑا تو ہے حضور نے اہلِ وفا کا تذکرہ
شرم سے ڈوب جائیں گے جب مرا نام آئے گا

ہوگا حسین انقلاب ذرّے بنیں گے آفتاب
جب کوئی ہو کے بے نقاب بر سرِ بام آئے گا

رُوٹھ کے جائیے مگر اِتنا بھی سوچ لیجئے
میرا خیال آپ کو گام بہ گام آئے گا

بیٹھا ہوں بزمِ ناز میں دیر سے تشنہ کامِ شوق
میرے بھی ہاتھ میں کبھی کوئی تو جام آئے گا

نریش ایم۔اے

اُس کافر کی یاد کا لہرا
مدت سے ہے دل میں ٹھہرا

خواب کوئی آئے تو کیسے
نیند کے انگنا درد کا پہرا

ہائے گفت و شنید کی خواہش
میں گونگا اور جگ ہے بہرا

دل کا سفینہ نازک نازک
پیار کا ساگر گہرا گہرا

نبضِ زمانہ تھم جائے گی
جو میں چلتے چلتے ٹھہرا

تم آئے تو دُور اُفق تک
پھیل گیا ہے رنگ سنہرا

اہلِ غم کی نریش جہاں میں
کیا دیوالی اور دسہرا


یہ ہے
میجک
سفید ترین دھلائی کا ذریعہ
TATA's Wonder Washing Powder
دھلائی کتنی سفید
کپڑے کتنے شگفتہ
جی ہاں! یہی تو میجک کی خوبی ہے۔ اس میں دھل کر آپ کے سفید کپڑے جگمگانے لگتے ہیں اور اس کی خوشبو سے آپ کے سبھی کپڑے کھل اٹھتے ہیں۔ میجک کا بھرپور جھاگ کپڑے کے ریشوں میں گھس کر میل کو کھینچ لیتا ہے اور آپ کے کپڑے صاف شفاف نکلتے ہیں۔ اور مزا یہ ہے کہ اس سے گھر میں کپڑوں کی دھلائی کافی کم خرچ اور آسان ثابت ہوتی ہے۔ اپنے سبھی کپڑے، سوتی ہوں یا ریشمی، نائیلان، ٹیرین اور اونی، سفید ترین دھلائی کے پاؤڈر میجک سے دھوئیے۔ اور پھر دیکھئے اس کا حیرت انگیز کرشمہ! جیسا نام... ویسا کام!
میجک سفید، میجک اُجلے، میجک شگفتہ!
BLUE
Magic
WITH ULTRA WHITENING POWER
ٹاٹا کا تیار کردہ
CMTTM-10-203 UR

افسانہ

قُربانی

جسونت سنگھ وِردی ایم۔اے

ایف ۱۱۱ ۔ سُدرشن پارک، موتی نگر، نئی دہلی نمبر ۱۵

محترم خوشتر بھائی! تسلیم

• بیسویں صدی کے لئے ایک اور کہانی بھیج رہا ہوں ـــــ عورت کے ایثار و قُربانی کی یہ کہانی آپ کے اور دوسرے پڑھنے والوں کے دلوں کو چھوئے بغیر نہ رہے گی۔ اسے لکھتے ہوئے میں خود تاثّر میں ڈوب گیا تھا ـــــ رسید اور اپنی رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں . . .

آپ کا ـــــ جسونت سنگھ وِردی

برآمدے کے کھمبے سے لگ کر سِمرِد کھڑی ہوگئی اور دیئے کی مدّھم روشنی میں اُس کا پیکر خشک پتے کی طرح جلتا معلوم ہوا۔ اندھیرے ماحول میں اُس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر پھیرے تو اُسے اپنی آنکھیں سُوجی ہوئی معلوم ہوئیں۔ جیسے کوئی گھنٹوں روتا رہا ہو۔ یہ سچ تھا کہ اُس کے دل کے جذبات آنکھوں سے ظاہر ہو رہے تھے، پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اُس کے دل کا چور پکڑ لے۔ بہت دیر تک وہ آنچل کے چھور سے اپنی آنکھیں پونچھتی رہی، دل کے جذبات چُھپاتی رہی۔

کل اُس کی چھوٹی بہن پاشو کی برات آئے گی۔ اندر کے دالان میں جوان لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں ـــــ

پتّاں دے اوہلے لاڈو کیوں کھڑی؟
چنن دے اوہلے لاڈو کیوں کھڑی؟
(میری لاڈو سُوکھے پتّوں کی اوٹ میں کیوں کھڑی ہے؟)
(میری لاڈو چندن کی اوٹ میں کیوں کھڑی ہے؟)

لڑکیوں کی آوازیں ہم آہنگ نہیں تھیں، پھر بھی دل کے جذبات کی گرمی نے گیت میں عجیب تاثّر پیدا کر دیا تھا۔ ساتھ ہی نمّو کی آواز میں تو بلا کا سوز تھا اور یہ سوز اِس اندھیرے ماحول میں، دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا۔ نمّو کی آواز نے تو سِمرِد کو اور بھی اُداس بنا دیا اور وہ اُسی طرح برآمدے کے کھمبے سے لگ کر کھڑی رہنا چاہتی تھی۔ بس اِسی طرح سُوجی آنکھوں اور اُداس چہرے کے ساتھ۔ لیکن جب نمّو نے اُسے برآمدے میں کھڑا دیکھا تو ڈھولک بجانا چھوڑ کر اُس کے پاس آئی اور بولی "ہائے ری ہائے! تیری بہن کا بیاہ ہو رہا ہے اور تُو یہاں کھڑی ہے! چل اندر! چل بھی!"

اب جب سِمرِد بھی اُن لڑکیوں میں جا بیٹھی تو لڑکیاں پھر گیت گانے لگیں۔

پتّاں دے اوہلے لاڈو کیوں کھڑی؟
چنن دے . . . .
کھڑی ساں بابلا جی دے باغ
کڈیا کوار، کنھیّا ور تو لئے

(میری لاڈو سُوکھے پتّوں کی اوٹ میں کیوں کھڑی ہے؟ . . . میں اپنے پِتا کے باغ میں کھڑی یہ کہہ رہی تھی کہ لڑکی جوان ہوگئی ہے، اِس کے لئے کنھیّا جیسا بَر ڈھونڈو)

اِس بول پر سِمرِد کا گلا بھر آیا اور اُس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ اب گیت میں پہلے جیسی ہم آہنگی بھی نہ رہی اور سب لڑکیاں حیرت سے سِمرِد کی طرف دیکھنے لگیں۔

"کیا بات ہے بہن! تجھے کیا ہوا ہے؟" نمّو نے سِمرِد کا کندھا جھنجھوڑا اور سب لڑکیوں نے اُس کی ہاں میں ہاں مِلائی۔ سِمرِد جیسے کچھ نہ چُھپانا چاہتی ہو، لیکن سب کچھ چُھپا رہی ہو۔ بولی ـــــ

"کچھ نہیں، میری طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔ تم گاؤ! گاؤ نا بہنو!"

[illegible] جلدی سے اُٹھ کر پھر برآمدے میں آگئی۔ اُس کی آنکھیں چھلکی پڑ رہی تھیں۔ لیکن اندھیرے میں کوئی دیکھ نہ سکا۔ شادی کی اُمنگ میں نکھری ہوئی پاشو میلے کپڑوں میں لپٹی اُس کے پاس سے گزر گئی اور ایک دو اور بوڑھی عورتیں بھی اِدھر سے اُدھر گئیں۔ باہر گلی میں، بوڑھیوں میں اور چھت پر اچھا خاصہ ہنگامہ برپا تھا۔ لیکن سمرو سب سے بے خبر برآمدے کی دیوار سے ٹیک لگائے دیئے کی لو کو جلتے ہوئے دیکھتی رہی۔

سمرو کے اِس طرح اضطراب سے اُٹھ جانے پر سہاگ گاتی ہوئی لڑکیوں کی لَے پھر جم نہ سکی۔ وہ کبھی ایک بول گا لیتیں اور پھر دو باتیں کر لیتیں۔ ایک بول پھر گا لیتیں اور یکایک رُک جاتیں، جیسے اُن کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہو جیسے اُن کا شعور کسی راز کو پالینا چاہتا ہو۔ نمو اپنے آپ ہی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی ——

•••~~~~~•••~~~~~•••~~~~~•••

- جب زبان کی اصلاح ہو جاتی ہے تو قلب بھی صالح ہو جاتا ہے۔
(حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ)
- سخاوت پھل ہے مال کا، عمل پھل ہے علم کا، رضائے الٰہی پھل ہے اخلاق کا۔ (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ)
- ایمان کی علامت یہ ہے کہ جہاں سچ بولنے سے ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہو وہاں بھی سچ بولے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- بلا کا نزول ہلاکت ہی کے لئے نہیں، اِمتحان کے لئے بھی ہوتا ہے۔ (حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہٗ)
- ہمارا دین سراپا ادب ہے۔ (حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہٗ)

•••~~~~~•••~~~~~•••~~~~~•••

"لیکن میں سوچتی ہوں خوشی کے اِس موقعے پر سمرو اُداس کیوں ہے؟"

نمو کالج میں پڑھتی تھی۔ شاید اسی لئے اُسے یہ سوال کرنے کا حق تھا یا شاید اُسے سمرو سے ہمدردی ہو۔

جب اُس کی بات کا کسی نے بھی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی بولی: "دراصل اُسے دُکھ ہے کہ پاشو کا بیاہ اُس سے پہلے کیوں ہو رہا ہے، حالانکہ وہ پاشو سے پانچ سال بڑی ہے۔"

"لیکن شادی سے تو اُس نے خود ہی انکار کیا تھا!" ایک اور نے بات بڑھائی —— "سُنا ہے پہلے سمرو ہی کی اُس سے سگائی ہوئی تھی، جس سے کل پاشو بیاہی جائے گی!"

"ایسا کیوں ہوا؟"

"جگوان جانے!"

پلک جھپکتے ہی سمرو کی ماں دالان میں آگئی تو لڑکیاں پھر گیت گانے لگیں۔

جیوں تاریاں وِچوں چندلے!
چنداں وِچوں نند کنھیا برٹولے
پتّاں نے اوہلے لاڈو کیوں کھڑی؟

(وہ بَر ایسا ہو جیسے تاروں میں چاند اور چاند میں کنھیا کی طرح نند)

لڑکیوں کی آواز دھیمی ہوتی ہوئی اور بھی دھیمی ہو گئی اور پھر بالکل بند ہو گئی۔ اِس وقت سمرو اور اُس کی ماں زیور اور دوسرے قیمتی سامان کو سنبھال رہی تھیں۔ سمرو کا باپ بہت پہلے چل بسا تھا، اِس لئے سمرو ہی ماں کا ہاتھ بٹا کر باپ کا فرض پورا کر رہی تھی۔ چھبّیس برس کی سمرو ہی گھر کی ساری ذمّے داریاں سنبھالے ہوئے تھی اور اِس ذمّے داری نے اُسے بے حد سنجیدہ بنا دیا تھا۔

چار سال ہوئے جب وہ بیسک کرنے کے بعد پاس ہی کے گاؤں کے اسکول میں بچّوں کو پڑھانے لگی۔ جب بھی اُس کی شوخی اور چنچلتا پہ سنجیدگی کا سایہ نہ پڑا تھا۔ اُس کے دل میں کتنی اُمیدیں اور اُمنگیں تھیں۔ اُس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ لیکن باپ کی موت نے اُس کی اُمیدوں اور اُمنگوں پر اوس [illegible] وہ دِن بدن سرد ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑی جو تھی۔

اُس کا باپ خود اُس کے لئے وَر تلاش کر گیا تھا، لیکن اپنے ہاتھوں اُس کی شادی نہ کر سکا، اُسے ڈولی میں نہ بٹھا سکا، اُسے رُخصت نہ کر سکا۔ کچھ دِن پہلے جب اُس کی سسرال والوں نے شادی کرنے کی بات چلائی تو گھر میں بے چینی [illegible] اُس کی شادی کے بعد ماں بہن اور بھائی کا کیا ہوگا؟ گھر کا خرچ کون چلائے گا؟ [illegible] تک تو اُس کی تنخواہ ہی سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ پھر چھوٹے [illegible] اور پاشو کی ڈولی کون رُخصت کرے گا؟ شادی کے نام پر اُس کے دل میں گدگدی [illegible] ہوتی اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ایک رنگین [illegible] دُنیا کی تصویر اُبھر آتی اور چہرہ شرم سے گلابی ہو جاتا۔ اُسے محسوس ہوتا [illegible] کومل اُنگلیوں سے اُس کے سارے جسم کو چھو رہا ہو اور ایک مدھر [illegible] آس پاس بکھر جاتی۔ لیکن وہ بہت دیر تک اُس خوشبو سے مدہوش [illegible] اپنی ماں سے مشورہ کر کے اپنی ہونے والی ساس کو بُلایا اور اُس کی [illegible] بنائی ہوئی اسکیم اُس کی ساس کے سامنے رکھ دی۔ [illegible] اب سمرو [illegible] شادی اُس لڑکے سے کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی ساس نے [illegible] چھریرے سرو قامت جسم، کتابی چہرے، گہری آنکھوں [illegible] اُس کے حُسن و خوبصورتی کے کیف و [illegible] کو محسوس کیا اور پھر [illegible]

میں تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ اس کی گہری آنکھیں، گورا چہرہ اور صحت مند متناسب جسم ساس کو لبھائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی ساس خوشی سے مان گئی اور اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا ——— "اس میں کون سی بات ہے۔ سیتا نہیں تو ساوتری ہی سہی!"

اور کل شام کو پاشو کی برات آنے والی تھی۔ گھر میں اتنا کام تھا کہ کسی کو سانس لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ لیکن جوں جوں برات آنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا تمرو کی حالت عجیب ہوتی جا رہی تھی، جیسے وہ سب کچھ کرتی ہوئی بھی کچھ نہ کر رہی ہو، یا کچھ نہ کرتی ہوئی سب کچھ کر رہی ہو۔

جب سب لڑکیاں ڈھولک کے گرد سے اٹھ کر چلی گئیں اور مہمان بھی چلے گئے جب بھی تمرو جاگ رہی تھی اور اندھیرے میں نہ جانے کیا تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پو پھٹنے سے پہلے ہی جب تاریکی آہستہ آہستہ اُجالے میں تبدیل ہو رہی تھی، گھر میں پھر چہل پہل شروع ہو گئی۔ یہ مسرت آگیں ماحول، یہ ہنسی اور یہ مسکانیں اور چہل بھی تمرو کے جسم میں حرکت نہ پیدا کر سکی۔ وہ بالکل بے جان سی اس ماحول میں گھٹن محسوس کرتی ہوئی اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھی۔ گھر میں نیا آنے والا مہمان گھر کے سب لوگوں سے ملنے کے بعد اس کے پاس آکر رک جاتا اور پھر دل ہی دل میں اس کے اُداس چہرے کو پڑھے بغیر ہی اس سے دوسری باتیں کرنے لگتا۔

دوپہر سے پہلے ہی موسی پور سے اس کے ننھیال کے لوگ بھی آ پہنچے اور گھر میں اور چہل پہل ہو گئی۔ شادی میں ننھیال کے لوگوں کے بغیر رونق کیسی؟ ننھیال کی جوان بہوئیں ٹیڑھی مانگیں نکالے، گالوں پر سُرخی، آنکھوں میں کاجل لگائے اپنے نازک پیروں کی پائلوں کی جھنکار سے آنگن میں مدھر موسیقی بکھیر رہی تھیں۔ ان کی مسکانوں کی چنگاریاں دلوں کو جلا دیتیں اور پھر ان کی پھوار دلوں کو ٹھنڈک بخش دیتی۔ ان کے جوان جسموں کی تھرکن میں سنگیت تھی اور چال میں عجیب لوچ تھا۔ وہ گھنوں سے لدی ہوئی موتی جیسے دانتوں کی جھلک دکھا کر دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ ان کے گیت دلوں کی گہرائی میں اتر جاتے اور گھر کے آنگن میں جیسے بھینی بھینی خوشبو بس گئی ہو۔ ان کے آنے سے آنگن کا نقشہ ہی بدل گیا اور گلیاں بھی جیسے چمک اٹھیں۔

لیکن تمرو؟ ——— تمرو ویسی کی ویسی ہی تھی۔ اس کی ممانیاں اسے پیار سے گود میں لے لیتیں، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ وہ مسکرا دیتی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں اداسی ہوتی اور بیگانہ پن ہوتا۔ جیسے اداسی مسکرا رہی ہو۔ ممانیوں کے اس پیار کو دیکھ کر تمرو کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے لیکن نہ تو انھوں نے کچھ پوچھا اور نہ اسی نے کچھ بتایا۔ جیسے کچھ بھی کہنا سننا منع ہو۔

پرچھائیاں ڈھلتے ہی "سینت" کی تیاری ہونے لگی۔ ممانیوں نے پاشو کو نہلا [illegible]

پاشو کا رنگ روپ پہلے ہی سے نکھر آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی کسی کی نظر لگ جائے گی۔ جب وہ ہنستی تو اس کے نازک گالوں میں گڑھے پڑ جاتے اور وہ اور خوبصورت ہو جاتی۔ "سینت" کے وقت ممانیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اڑوس پڑوس کی لڑکیاں بھی آ گئیں۔ بڑے ماما نے جب پاشو کی دودھ جیسی کلائی پکڑ کر اسے سرخ جوڑا پہنا دیا تو اس کا روپ اور بھی نکھر آیا۔ اس وقت پاشو کی کلائیوں میں چوڑا دیکھ کر تمرو اپنی سونی کلائیوں کو جیسے کاٹ کھانا چاہتی ہو اور رعشہ کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے نمو کے کاندھے کا سہارا لے کر اپنے آپ کو سنبھالا اور سب طرف سے خیال ہٹا کر جلدی سے دالان میں چلی گئی اور جاتے ہی پلنگ پر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو چھلک پڑے۔

- اُٹھو جاگو، جب تک منزل نہ ملے چین سے نہ بیٹھو۔
  (سوامی وویکانند)
- ماضی کی یاد میں یا مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے حال کو تعمیر کرو۔ (سوامی وویکانند)
- بدی کے خلاف لڑنا انسان کا سب سے بہتر عمل ہے۔
  (گورو نانک دیو جی)
- نرم دل خالقِ کائنات کی سب سے خوبصورت تخلیق ہے۔
  (مہاتما گوتم بدھ)
- مُسکراہٹ زندگی کی علامت ہے۔ (ٹیگور)

شام ڈھلتے ہی جب ڈھول سارے گاؤں میں اڑنے لگی تو معلوم ہوا برات گاؤں کی سرحد پر پہنچ گئی ہے اور باجے والے طرح طرح کی آوازیں نکال کر اپنے آنے کی خبر دے رہے ہیں۔ گھر کے ماحول میں بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ اسی وقت تمرو کو یکایک خیال آیا، ملنی کی تیاری تو کسی نے کی ہی نہیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور باہر آکر نیم مدہوشی کے عالم میں اپنی ماں کے کندھے کو جھنجھوڑ کر بولی "ماں! تجھے پتہ نہیں ملنی کی تیاری بھی کرنی ہے؟"

اسی وقت اس کا چچا سامنے آ گیا اور بولا "فکر نہ کر بیٹی!"

[illegible] تمرو واس کا جواب سن کر مطمئن ہو گئی اور اسے محسوس ہوا اب اس کی زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ سارے کام اپنے آپ ہو جائیں گے۔


سنلائٹ
سے ہر بار
آپ کے کپڑے
زیادہ چمکدار ڈھلتے ہیں
SUNLIGHT
سنلائٹ صابن استعمال کیجئے اور اپنی آنکھوں دیکھئے
... آپ کے کپڑے سچ مچ چمکدار ڈھلتے ہیں۔
درحقیقت ہر دھلائی کے بعد آپ کے کپڑے
زیادہ چمکدار نکلتے ہیں! تھوڑا سا سنلائٹ
ملئے اور دیکھئے ـــــ جھاگ ہی جھاگ
جس میں کپڑے زیادہ صاف ڈھلتے ہیں
زیادہ چمکدار۔ اپنے
سنلائٹ سے دھوئیے
اپنے روز پہننے کے کپڑے
سنلائٹ سے
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

جیون ساتھی کے بارے میں تصوّر کرتی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ لیکن اُس کے لئے اب کچھ نہ رہا تھا۔ اِس وقت اُس نے تصوّر میں اُس دُولہا کے ساتھ اپنی بہن پاشو کی مُورتی کھڑی کی۔ اُسے وہ جوڑی بہت پیاری معلوم ہوئی، بہت ہی پیاری! لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کا دل رشک سے بھر گیا اور وہ پاشو کی جگہ اپنے آپ کو اُس بانکے جوان کے ساتھ کھڑی کر کے دیکھنے لگی۔ اُسے خیال آیا جیسے پاشو نہیں، وہ خود بیاہی جا رہی ہے اور وہ بانکا سجیلا سردار جو پانچ سال تک اُس کا منگیتر رہا تھا، اب اُس کے ساتھ کھڑا پیار بھری نظر سے اُسے دیکھ رہا ہے اور دو دل ایک دوسرے سے

اُڑتی ہوئی دھول میں برات گاؤں میں داخل ہوئی اور ثمرو کے گھر سے دُور راستے کے چوک میں رکتی ہوئی۔ ملنی کی طرف تو اُس وقت صرف بڑی بوڑھیوں کا دھیان تھا۔ سب لڑکیاں تو پاشو کے دُولہا کو دیکھ رہی تھیں، ہر طرح سے پرکھ رہی تھیں، جانچ تول رہی تھیں۔ سڈول صحت مند جسم، گورے رنگ اور اونچے قد و قامت کا نوجوان چوڑا سینہ اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک بانکا اُن کے سامنے تھا۔ اُس کی آنکھوں میں مستی اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن وہ شرما رہا تھا اور اُس کی اداتے لڑکیوں کے دل لُوٹے لئے تھے۔ وہ ایک دوسری کو چٹکیاں بھرتی ہوئی ہونٹوں میں مُسکراتی پاشو کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ ثمرو کی بھٹکتی ہوئی نظر ہر چہرے کو گھورتی ہوئی پاشو کے دُولہا پر آکر رُک جاتی اور پھر ایکدم ہی واپس لوٹ جاتی۔ پاشو کا دُولہا جو کچھ دن پہلے تک اُس کا تھا، لیکن آج اُس کا نہیں رہا تھا۔ اب اُس کے سامنے تھا اونچے لانبے اور گورے چٹے اُس نوجوان کو دیکھ کر ثمرو کی نظریں کانپ جاتیں اور اُس کے دل کی دھڑکن جیسے اُس کے قابو میں نہ رہتی۔ اسی طرح دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے دھوئیں کے بادل چھا گئے اور وہ نیم بدحواسی کے عالم میں نمّو کے سہارے کھڑی کھڑی زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ جیسے اپنے آپ میں نہ رہی تھی۔ نمّو جب اُسے سہارا دے کر کمرے تک لے گئی اور بٹھا دیا جب بھی وہ کانپ رہی تھی۔ نمّو نے اپنے آنچل کے چھور سے اُس کے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور آہستہ سے پُوچھا "کیا بات ہے بہن ثمرو! بات کیا ہے میری چاند؟"

ثمرو نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، اُس کی آواز کا درد محسوس کیا اور اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "کچھ نہیں نمّو! کچھ نہیں۔ لیکن نہ جانے اِس دل کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ بہت سوچتی ہوں کہ جو میرا اپنا نہیں ہے، اُس کے لئے کیوں تڑپوں؟ اُس کے بارے میں سوچنے سے کیا فائدہ؟ بھلا بیت جانے والے اُس پل کو میں واپس لا سکتی ہوں؟ لیکن اِس دل کو نہ جانے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے؟"

نمّو نے کوئی جواب نہ دیا اور اُس کے کومل گالوں سے اُس کی آنکھوں کے آنسو پونچھتی رہی۔

ثمرو کے گھر کی چھت کافی وسیع تھی اور برات کو کھانا کھلانے کا انتظام اُسی چھت پر کیا گیا تھا۔ چاندنی کے سائے میں کرسیوں کی ترتیب کچھ اس انداز سے کی [illegible] براتیوں کے چہرے چھت کی طرف رہیں اور عورتیں انھیں [illegible] طرح دیکھ سکیں [illegible] دولہا [illegible] جاتے میں کبھی [illegible] معلوم [illegible] تھا اور براتیوں سے جب ہنس [illegible] وخال، چہرے کے نقوش اور [illegible] ثمرو اپنے ہونے والے

گیت

قتیل شفائی

رسیلی چاندنی جب حسرتوں کو گدگدائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

بکھر جائے گی جب گھلی ہوئی چاندنی فضاؤں میں
تو کچھ بے چینیاں سی تیر جائیں گی ہواؤں میں
یہ کیفیت ہر اک سوئی تمنا کو جگائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

وہ دیکھو چاندنی پربت کے دامن سے نکل آیا
بہت پچھتاؤ گے اپنے میں گر ہاتھ سے یہ پل آیا
الگ رہنے سے دونوں کو یہ تنہائی ستائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

ذرا تم جھانک کر دیکھو کہ باہر [illegible] کیا ہے
جہاں بھی کوئی منظر ہے وہاں اک حشر [illegible] ہے
ذرا سی دیر میں جب یہ گھڑی بھی لوٹ جائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

ملنے کے لئے بیقرار ہو رہے ہیں۔ کب وہ مُبارک گھڑی آئے جب دو دلوں کا ملن ہو، دونوں کی سانسوں کی خوشبو ہمکنار ہو۔ یہ دُنیا کتنی پیاری تھی! لیکن سمرو بہت دیر تک اِس دُنیا میں نہ رہ سکی۔ یہ بات صرف خیال میں آنے سے ہی اُس کا دل کانپ اُٹھا اور ہاتھ پاؤں سُن ہونے لگے۔ بھلا آج یہ کیسے ممکن تھا؟

اُسی وقت عورتیں دُولہا کو طعنے دے رہی تھیں ——

گڈی تاں ساڈی تلے دی تار وے

ڈھنڈاں ماں جاپے نیرا گھمیار وے

ایہہ گل بندی نہیں۔ . . . . .

ایہہ گل بندی نہیں ہیلیو

تے شہانوں نہیں۔ . . . . .

(ہماری لڑکی تلے کے تار جیسی نازک ہے۔ لیکن لڑکا تو کمہار سا لگتا ہے۔ یہ جوڑی کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ تم لوگوں کو شرم آنی چاہیئے)

عورتوں کی آواز میں تیکھا طنز تھا اور وہ ہونٹوں میں ہنس رہی تھیں۔ ایک پل کے لئے سمرو کا جی چاہا وہ بھی عورتوں کی آواز سے آواز مِلا کر کوئی طعنہ دے تو کتنا مزہ آئے۔ اور نہیں تو وہ ایک طنز ہی سے اُس بانکے نوجوان کے ساتھ کچھ تعلق جوڑ لے۔ لیکن وہ اُن کی آواز سے آواز مِلا سکی اور نہ کوئی طنز ہی کر سکی۔ وہ تو وہاں کھڑی بھی نہ رہ سکی اور نیچے آ کر یوں ہی کھانا لگانے والوں کو ہدایتیں دینے لگی کہ وہ پوریاں جلدی جلدی کیوں نہیں لے جاتے اور دال سبزی کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے؟

بہت رات تک عورتوں کی آوازیں ماحول میں دھڑکتی رہیں اور براتی اُن کے مترنم بول سُن سُن کر کیف و سرور میں کھوتے رہے۔ بات کا یہ کھانا اُس کے چاچا کی طرف سے تھا، اِس لئے وہ براتیوں کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

سویرے پھر پھیروں کی تیاری ہونے لگی اور گھر کے بے خواب ماحول میں یکایک رونق کی خوشبو سی پھیل گئی۔

صبح سمرو کی ماں نے اُسے جگایا، اُس کی آنکھوں میں کسی سوال کی جھلک تھی۔

سمرو جلدی سے بولی: "کیا بات ہے ماں؟"

ماں بولی: "میں سوچتی ہوں کوئی لال رنگ کا خوبصورت سُوٹ تو نہیں ہے۔ پاشو کو کون سے کپڑے پہنائے جائیں، پھیروں کے وقت؟"

سمرو نے پل بھر سوچا اور بولی: "تو ماں کیا باتیں کرتی ہے۔ ایک سُوٹ پڑا ہوا تو ہے!"

"لیکن وہ تو تیرے لئے بنوا رکھا تھا تیرے باپ نے ——"

"تو کیا ہوا؟ میرے اور پاشو میں کیا فرق ہے؟ وہی سُوٹ پاشو پہنے گی!"

سمرو کی بات سُن کر اُس کی ماں مطمئن ہو گئی اور سمرو دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

'ماں کتنی بھولی ہے! بھلا سب کچھ دے کر اب میں صرف سُوٹ کے لئے انکار کر دوں گی۔ کیا کہا تھا میں نے؟ پاشو اور مجھ میں کیا فرق ہے؟ ہاں سچ، میرے اور پاشو میں کیا فرق ہے؟ کیا فرق ہے؟'

سمرو نے بہت شوق سے پاشو کو سجا کر سُرخ عروسی لباس پہنا کر دُلہن بنایا اور پھر اپنی گود میں لے کر اُسے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے بٹھا دیا اور پھر جب اُس کا بانکا سردار اُس کے ساتھ آ بیٹھا تو نہ جانے اُس کے دل کو کیا ہونے لگا۔ اُس وقت جب سُرخ عروسی لباس میں بجی سنوری پاشو اُس بانکے سجیلے نوجوان کے ساتھ، سمرو کے سپنوں کے سردار کے ساتھ پھیرے لے رہی تھی تو سمرو کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی متاعِ عزیز کو، اُس کی سنبھال کر رکھی ہوئی متاعِ عزیز کو اُس کی بہن نے زبردستی چھین لیا ہو۔ جیسے اُس کے سامنے ہی اُس کے سُندر سپنوں کی دُنیا لُوٹی جا رہی ہو اور اُسے بولنے، فریاد کرنے کی بھی اجازت نہ ہو۔

اُسی وقت پہلے پھیرے سے لے کر چوتھے پھیرے کے بعد جب پاشو نے اپنے پتی کے ساتھ ماتھا ٹیکا تو سمرو یہ منظر نہ دیکھ سکی۔ وہ تو پہلے ہی نمو کی گود میں بیہوش ہو گئی تھی۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے سمرو کو دو بار دورہ پڑا اور اُس کے ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے۔ دوپہر کا کھانا اُس کے ماما کو دینا تھا، اِس لئے سمرو کے ننہال کے لوگ سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق کر رہے تھے، لیکن سمرو کی حالت دیکھ کر بڑا ماما "جلدی کرو! جلدی کرو!" کا نعرہ لگاتا اور سمرو کو اپنی گود میں بٹھا لیتا اور اُس کے سر کو سہلا کر کہتا "کیا بات ہے سمرو!

میری بیٹی! کیا بات ہے؟ تو ہی تو آج باپ کی جگہ سنبھال کر اپنی بہن کی شادی کر رہی ہے اور تو ہی ـــــــ اگر تو ہی ہوش میں نہ رہے گی تو کیا ہوگا؟ سارے کام کیسے ہوں گے؟"

ثمرو سنتی، اُس کی ہاں میں ہاں ملاتی اور اُس کے بعد جیسے یکایک اُس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے۔ جیسے اُس کی حالت اُس کے بس میں نہ ہو۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جلدی ہی جہیز سجا دیا گیا۔ براتیوں سے پہلے جب رشتے کی بہو بیٹیاں جہیز دیکھ رہی تھیں اور ننھیال کے جہیز کی تعریف کر رہی تھیں تو ثمرو کے بڑے ماما نے بڑے فخر و غرور سے کہا: "ہم نے ثمرو کے لئے سب کچھ بنایا تھا لیکن خیر! اپنی اپنی قسمت ہے نا۔ کون جانے ثمرو کو اس سے زیادہ ملے۔"

اُس وقت جب سب لڑکیوں نے چور نظروں سے ثمرو کو دیکھا تو ثمرو زرد پتی کی طرح مرجھائی ہوئی لڑکھڑا رہی تھی۔

برات کو دُور جانا تھا، اِس لئے جلدی ہی ڈولی کی تیاری ہونے لگی اور پاشو کے چلے جانے کے خیال سے ہر چہرے پر اُداسی کی زردی پھیلنے لگی۔

ثمرو نے اپنی تنخواہ سے پیسے بچا کر جو زیور بنوائے تھے، وہ تو کچھ بھی نہ تھے۔ ننھیال کے چار گہنوں نے جہیز کی شان بڑھا دی تھی اور اب رخصت ہوتی ہوئی بہن کو دیکھ کر جیسے انگ انگ درد سے بھر گیا ہو۔ اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو گود میں کھلایا، کس بار ناز اٹھایا اور پچکارا تھا اور باپ کی موت کے بعد پاشو اور رِسندر کے لئے خود اُن کا باپ بننے کی کوشش کی تھی۔ اپنے اِس فرض کو نبھانے میں کیا وہ کامیاب ہوئی تھی؟

براتیوں کی سامان سے لدی ہوئی موٹر ثمرو کے گھر کے پاس آکھڑی ہوئی اور دُولہا کا پلّو پکڑ کر روتی ہوئی پاشو اپنے باپ کو یاد کرتی ہوئی موٹر میں جا بیٹھی۔ اُس وقت خاندان کے سب لوگ رو رہے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے بھیگ نہ گئی ہو۔ براتی اُنھیں ظالم قصاب معلوم ہو رہے تھے، جو اُن کے کلیجے کے ٹکڑے کو اُن سے دُور لے جانے کے لئے جلدی کر رہے ہوں۔ پاشو نے اپنی ماں، بہن، سکھی سہیلیوں اور ماما ممانیوں کے گلے سے لپٹ کر آج کی رات اور رکھ لینے کے لئے منّت کی تھی، لیکن کون اُسے اِس وقت اپنی ڈیوڑھی میں جگہ دے سکتا تھا؟

گھر کے آنگن میں انار کا ایک پیڑ تھا اور آج کل اُس کے پھل پکنے پر آئے ہوئے تھے۔ لیکن پاشو کو رخصت ہوتے دیکھ کر جیسے وہ بھی اُداس ہو۔ بھلا اُسے کس کا دُکھ تھا؟

پاشو کچھ کہہ نہیں رہی تھی، لیکن اُس کا رونا اُس کے دل کے جذبات کو ظاہر کر رہا تھا اور لڑکیاں جیسے اُس کی زبان بن کر بول رہی ہوں ـــــــ

"بابلا دھرم کریندیاں میںوں رکھ لے اج دی رات"

اور پھر وہ اپنے آپ ہی بابل کا فرض نبھا رہی تھیں

کینکر رکھاں نی ڈھیے میرئیے؟

بھلیاں سجنا دے نال قرار

ڈھیے گھر جا آنپڑے . . . . . .

اِس وقت ثمرو نے اپنے دل کا درد بھول کر پاشو کے دُولہا سے نہایت درد بھری آواز میں کہا ـــــــ "پھولوں کی طرح پالی پروان چڑھی میری بھولی بہن انجان ہے، دیکھنا کہیں اِس کا من ڈول نہ جائے۔"

پاشو کا دُولہا اِس وقت کیا کہہ سکتا تھا۔ پاشو اپنے بیگانوں کی لاج چھوڑ کر ثمرو کے گلے سے لپٹ گئی جیسے وہی اُس کا بابل ہو۔

دھول اُڑاتی ہوئی موٹر چلی گئی تو آنسو بہاتی لڑکیوں کے بول ابھی تک فضا میں گونج رہے تھے ـــــــ

تیرا سکھن دتے پرواز بابلا

میں پردیسن ہوئی!"

لوگ برات کو گاؤں کی سرحد تک چھوڑنے گئے تھے اور لوٹتے ہوئے گھر پہنچتے کافی اندھیرا پھیل گیا۔ ثمرو، اُس کی ماں اور رِسندر سب سے پہلے گھر پہنچے۔ رِسندر ابھی تک رو رہا تھا۔ اُسے روتے دیکھ کر ثمرو نے اپنی چھاتی سے لگا لیا اور بولی ـــــــ "تو کیوں روتا ہے بھیا؟ میں تیرا ابھی بیاہ کروں گی۔ چاند جیسی بہو آئے گی، ایسے ہی کِسی بھائی کی بہن!"

اور وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ دیئے کی روشنی میں اُس کی ماں نے اُسے گلے سے لگا لیا اور بولی "تو کیوں روتی ہے بیٹی؟ میں تیرا ابھی بیاہ کروں گی! ابھی تیرے دل کی چاہ تو پوری ہی نہیں ہوئی۔ کرشن کنھیا جیسا ور ڈھونڈوں گی تیرے لئے! ہاں، تو نے بڑی قربانی کی ہے بیٹی!"

ماں خود بھی رو رہی تھی۔ رُندھی ہوئی آواز اور بھرے ہوئے دل سے ثمرو صرف اِتنا ہی کہہ سکی ـــــــ "میں کیا کر سکی ہوں ماں! میں نے کیا ہی کیا ہے ماں!؟"


White
def
whitens
while it washes
clean
ڈیٹ
صاف دھونے کے ساتھ ساتھ اُجلاپن پیدا کرتا ہے
صرف ڈیٹ ہی آپ کے سفید کپڑوں کو
اتنا چمکدار سفید اور رنگین کپڑوں کو
اس قدر صاف اور بیداغ دھوتا ہے۔
سواستک آئل ملس لمیٹڈ، دہلی

نئی مہابھارت

فکر تونسوی

میں نے نئی مہابھارت کے پہلے ادھیائے میں ایک جاہلانہ فقرہ لکھا تھا کہ بھیشم پتامہ سیٹھ شانتنو کا چھوٹا بھائی تھا۔ حالانکہ عقل مندی اس میں تھی کہ میں اسے سیٹھ شانتنو کا بڑا لڑکا لکھتا۔ ذاتی طور پر میں عقل پر یقین نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ چھوٹے بھائی اور بڑے لڑکے میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ تاریخ عقل میں بھی یقین رکھتی ہے۔ تاریخ کرداروں کی غلط حرکتیں تو برداشت کر لیتی ہے لیکن تاریخی حقائق کی غلطی برداشت نہیں کر سکتی ——— ماڈرن زمانے کے مورخ فکر تونسوی، مورخین کے اس اصول کے سامنے سر جھکاتا ہے اور نئی مہابھارت کا دوسرا ادھیائے شروع کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ادھیائے میں کچھ افسوس اور کچھ خوشی کے ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے کہ شانتنو سیٹھ کی دوسری شادی پنچال دیش کے منسٹر کی لڑکی مہیشوری سے طے پا گئی۔ یہ منسٹر پہلے ماہی گیر تھا۔ ستلج اور بیاس ندی سے مچھلیاں پکڑ پکڑ کر کچھ مارکیٹ میں اور کچھ وزیروں اور اُن کے سکریٹریوں کے گھر بھیجا کرتا تھا۔ ایسے ہی ڈیموکریٹک طریقہ اختیار کرکے ایک دن وہ دولت مند ہو گیا اور اپنا بینک بیلنس مزید بڑھانے کے لئے وزیر بن گیا۔ سکریٹریٹ میں یہ ماہی گیر منسٹر کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کی بڑی لڑکی مہیشوری پر جب شباب آیا تو بڑے بڑے زاہدوں کی تسبیحیں اُلٹی پھرنے لگیں۔ جدھر اُس کی نظر اُٹھتی کٹاری کی طرح اندر کلیجے میں دھنستی چلی جاتی۔ کالج میں داخل ہوئی تو ہر کسی سے فلرٹ کرنے لگی۔ نسل کی ماہی گیر تھی اس لئے بدن سے ہر وقت مچھلی کی خوشبو اٹھتی رہتی تھی۔ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ اُس قاتل کٹاری کا نام مچھلی بانو رکھ دیا جائے اور اُسے کسی فلم کمپنی میں بطور ہیروئن بھرتی کر دیا جائے۔

مچھلی بانو تو فلم کمپنی میں جانے کے لئے تیار ہو گئی لیکن اُس کے ماہی گیر باپ نے کہا کہ میں اب منسٹر بن گیا ہوں، عزت دار بن گیا ہوں اس لئے میری بیٹی اب فلم ایکٹریس نہیں بن سکتی۔ بلکہ سوسائٹی کے اعلیٰ حلقوں میں اپنا مقام حاصل کرے گی ——— جن لوگوں نے یہ ریزولیوشن پاس کیا ہے میں اُن کے خلاف حکومتی سطح پر کارروائی کروں گا۔

جس رات کلب میں شانتنو سیٹھ اور مچھلی بانو کی شادی کا اعلان کیا گیا اُسی رات سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پریذیڈنٹ اور سکریٹری کو افیون سمگل کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اُن دنوں یہ رواج تھا کہ جو لوگ شراب نہیں پیتے تھے، اُن کے گھر ناجائز شراب کی بوتلیں رکھوا کر اُنہیں گرفتار کر لیا جاتا تھا اور جو لوگ ناجائز شراب کا دھندا کرتے تھے، اُنھیں جنم اشٹمی اور رام لیلا کمیٹی کا پردھان بنا دیا جاتا تھا جس سے اُن کے منہ سے آتی ہوئی ناجائز شراب کی بھبک کافور ہو جاتی تھی۔

قصہ کوتاہ اُس ماہی گیر منسٹر کی فلرٹ لڑکی پر شانتنو سیٹھ کی نظر پڑ گئی۔ لڑکی طرار تھی، شانتنو سیٹھ ہوس کار تھا اور لڑکی کا ماہی گیر باپ شاہی خاندان میں داخل ہو کر اپنے پہلے کئے ہوئے اور آئندہ کئے جانے والے فراڈوں پر شاہی پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ ماہی گیر منسٹر اور مچھلی بانو کی نگاہ شانتنو سیٹھ کی دن بدن بڑھتی ہوئی اندھی دولت پر تھی اور شانتنو سیٹھ کی نگاہ ماہی گیر کی چھوکری کے لب و رخسار پر تھی۔ تینوں کو یہ رشتہ سوٹ کر گیا۔ تاریخ میں اس معاہدے کو "معاہدہ تگڑم" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

جب مچھلی بانو شانتی رام عرف راجہ شانتنو عرف شانتنو سیٹھ کے حرم میں داخل ہوئی۔ اُن دنوں ایک شاعر ہر روز شام کو شانتنو سیٹھ کی کوٹھی میں آکر مفت شراب پیا کرتا تھا اور مفت غزلیں سنایا کرتا تھا اور عالمِ میگساری میں کہا کرتا تھا کہ شانتنو سیٹھ دورِ حاضر کا عظیم ترین ادب دوست اور صاحبِ ذوق انسان ہے۔ اُس شاعر نے شانتنو سیٹھ کو مشورہ دیا کہ ایک تو اپنی نئی بیوی کا نام کچھ شاعرانہ سا رکھے مچھلی بانو تو کوئی طوائفانہ نام معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا نام نینا کماری یا مستانہ کوری یا ستیہ وتی رکھے۔ اور دوسرے اُسے سمجھائے کہ اب وہ مہارانی بن چکی ہے۔ اس لئے شاہی آداب سے کام لیا کرے اور

ماہی گیروں کا تمدن جو اُن کے خون میں رس بس چکا ہے اُسے ترک کر دے۔ اِس سلسلے میں شاعر بندگو رہنے ... شانتنو سیٹھ کے گوش گزار کیا کہ پرسوں مہارانی اپنی کار سے اُتر کر ایک فروٹ والے سے بڑا جھگڑ رہی تھی، کہ اُس نے انگور تولتے وقت ڈنڈی ماری ہے اور میں ترازو کی یہ ڈنڈی اُس کے سر پر مار دوں گی ــــــ اِس طرح بازار میں کھڑے ہو کر لڑنا جھگڑنا ماہی گیروں کا کام ہے۔ شرفاء میں ایسے بُرا فعل سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ شرفاء تو ڈنڈی مارنے کو ترجیح دیتے ہیں، سر پر نہیں، رُوح پر۔

شانتنو سیٹھ نے شاعر کی ایک بات تو مان لی یعنی نئی مہارانی کا نام مچھلی بانو کی بجائے ستیہ وتی رکھ دیا لیکن دوسری بات مہارانی ستیہ وتی نے نہ مانی کیونکہ شاہی آداب اور تکلف کی زنجیروں میں قید رہنا اُس کی آزاد فطرت کے خلاف تھا۔ وہ کالج کی کھلی فضاؤں میں پروان چڑھی تھی اور شوخ چشمی اور عشوہ طرازی اُس کا شیوۂ رندانہ بن چکی تھی۔ اِس لئے اُس نے شانتنو سیٹھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ کی بیوی ضرور ہوں، لیکن غلام نہیں ہوں اگر آپ کو دولت کا گھمنڈ ہے تو مجھے شباب کا غرور ہے۔ اس لئے ایک میان میں دو نور، گھمنڈ نہیں سما سکتے۔ میرا شباب آپ کی دولت نے پیدا نہیں کیا۔ یہ خداداد نعمت ہے۔ ایک خود رو نہال ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میرا شباب بھی صابن کی ایک ٹکیہ ہے، جسے آپ اپنی سوپ فیکٹری میں بنا ڈالیں گے۔

راجہ شانتنو سوپ فیکٹری اور مہارانی ستیہ وتی دونوں کے شباب میں اندھے ہو چکے تھے۔ اِس لئے مہارانی کا یہ لب و لہجہ اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ مہارانی ستیہ وتی کے ساتھ ہنی مون کے چند ہفتے عیش و عشرت سے گزارے۔ اُس کے بعد ماہی گیر کی یہ رعنا بیٹی مچھلی کی طرح راجہ شانتنو کے ہاتھ سے پھسل کر یوں نکل گئی کہ وہ ہر روز شام کو بال رُوم ڈانس کے لئے کلب میں چلی جاتی۔ وہاں جا کر اپنے فرینڈز کے ساتھ رمی کھیلتی، وہسکی نوش فرماتی اور ناچ رنگ کے ماحول میں ڈوب جاتی۔ وہ فرینڈز نہ صرف راجہ شانتنو کے خوشامدی مصاحب تھے بلکہ مہارانی ستیہ وتی کے اِرد گرد بھی تعریف و تحسین کی ایک شیشے کی حسین و جمیل دیوار کھڑی کر چکے تھے۔ وہ شانتنو سیٹھ سے آکر کہتے، مہارانی ستیہ وتی تو اجنتا اور ایلورا کی دیوی ہے، اِندر لوک کی اپسرا ہے اور سنسار بھر میں اگر آرٹ اور کلچر کا مقابلہ کیا جائے تو مہارانی ستیہ وتی کو چیمپئن شپ کا مرتبہ مِل سکتا ہے۔ رقص کی دیوی اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے، سنگیت کلا اُس کے گلے میں براجتی ہے۔

شانتنو سیٹھ یہ باتیں سُنتے تو اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا سُن رہے ہیں کیونکہ وہ عمر کی اُس منزل پر پہنچ چکے تھے جب فہم و ذکا ہاتھوں کے طوطے بن کر اُڑ جاتے ہیں اور صرف ہڈی کا پنجرہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اُنھیں صرف اِتنا اطمینان کافی تھا کہ مہارانی ستیہ وتی اُن کی آغوش کی زینت ہے، جس کا شباب چاند اور سُورج کو شرماتا ہے۔ یہ بتانا خلافِ تہذیب ہے کہ شانتنو سیٹھ کی آغوش مہینے میں کتنے دن خالی رہتی تھی۔ انسان چاہے لاکھ دولت مند ہو پھر بھی انسان ہے۔ اُس پر بڑھاپے کا احساس جو ٹانک کھانے کے باوجود شانتنو سیٹھ کے دل و دماغ پر طاری رہتا تھا ــــــ خالی آغوش کو دیکھ کر اکثر اُنھیں اپنی توہین کا احساس ہوتا۔ کلب میں ٹیلیفون کرتے تو وہاں سے جواب آتا مہارانی ڈانس کر رہی ہیں اور اُن کا حکم ہے کہ ڈانس کے دَوران اُنھیں ٹیلیفون پر بُلا کر ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

آہستہ آہستہ اُداسی کے چمگادڑ راجہ شانتنو کے اِرد گرد متواتر رقص کرنے کے عادی ہو گئے۔ اُس کی اُداسی کے تین بڑے کارن تھے:۔

۱۔ "لوما" ہیئر آئل کے مسلسل استعمال کے باوجود سفید بال سر پر بدستور قائم تھے، سر سے جاتے ہی نہ تھے۔

۲۔ وہ مہارانی ستیہ وتی کا دل اتنے بینک بیلنس کے باوجود نہ جیت سکے۔ کیونکہ ستیہ وتی پر شباب کا نشہ تھا اور شانتنو سیٹھ پر بڑھاپا سوار تھا۔ شباب اور بڑھاپا دو متوازی لکیروں کی طرح چل رہے تھے اور اِن لکیروں کا مِلنا ناممکن ہو گیا تھا۔

۳۔ ستیہ وتی گستاخ اور مُنہ پھٹ ہو گئی تھی۔ جب اُسے چیک پر دستخط لینے کی ضرورت ہوتی تھی، صرف اُسی وقت اپنی نرم و نازک اُنگلیاں راجہ شانتنو کے سفید بالوں میں پھیر کر کہا کرتی تھی "ڈارلنگ! آئی لو یُو!" اُس نے ہیرا پھیری سے غیر ممالک کے بینکوں

ہی اپنا حساب کھول لیا تھا۔ اِدھر شانتنو اسٹیٹ اور اُس کی فیکٹریوں کی حالت ناگفتہ بہ کیونکہ بھیشم چند کی فرمانبردارانہ یاددہانیوں کے باوجود راجہ شانتنو اپنے بزنس کی طرف نہیں کرتا تھا۔ کارخانوں میں ہڑتالیں شروع ہوگئی تھیں۔ راجہ شانتنو اور مہارانی ستیہ وتی مُردہ باد!۔۔۔۔ کے نعرے اُس نے اپنے کانوں سے سُنے تھے۔

اِن اُداسیوں نے راجہ شانتنو کی حالت دِگرگوں کردی۔ ستیہ وتی کے عشق کے بعد اور زیادہ تیزی سے اُس پر بڑھاپا چھاگیا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے دھوپ ڈھلتے دیر لگتی ہے، سائے ڈھلتے دیر نہیں لگتی۔ اُسے سب سے زیادہ رنج اپنی اِس حماقت پر تھا کہ اُس نے ماہی گیر منشی کے ساتھ یہ معاہدہ کیوں کرلیا کہ ستیہ وتی کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوگی وہی جائداد کی وارث ہوگی۔ اُس نے بھیشم چند کے سامنے بھی اپنی اِس حماقت کا رونا رویا۔ لیکن بھیشم چند نے کہا "ڈیڈی! میں تو صرف فرماں برداری کے لئے خاموش رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ایک بھی احتجاجی لفظ مُنہ سے نکالا تو آپ جھٹ مجھ پر الزام لگا دیں گے کہ جائداد کے لالچ میں بیٹا اپنے باپ کی ایک خواہش بھی پوری نہیں کرنا چاہتا۔ تریتا یُگ میں یہ کلجُگی بیٹا کہاں سے پیدا ہوگیا؟"

مہارانی ستیہ وتی کے لچھن دیکھ دیکھ کر شانتنو سیٹھ کی صحت گرتی چلی گئی تھی۔ اِس بیچ میں اچانک ایک میٹرنٹی ہسپتال کی انچارج لیڈی ڈاکٹر کی طرف سے شانتنو سیٹھ کو ٹیلیفون آیا کہ مہارانی کے بطن سے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے جو بظاہر تو بڑے تندرست اور پیارے دکھائی دیتے ہیں (اندر کی بھگوان جانے) آپ خود ہسپتال تشریف لاکر ملاحظہ فرمالیجئے۔

راجہ شانتنو اِس ٹیلیفون کے پُورے ایک ہفتے بعد بادلِ ناخواستہ ہسپتال میں گیا۔ بھیشم چند بھی ہمراہ تھا۔ راجہ شانتنو کو غصّہ اِس بات پر تھا کہ یہ کمبخت میری جائداد کے وارث کیوں پیدا ہوگئے۔ وہ چاہتا تھا کہ رانی ستیہ وتی ہمیشہ لاولد ہی رہے لیکن نصیب کے لکھے اور جائداد کے وارث کو کون ٹال سکتا ہے۔ جونہی راجہ شانتنو نے اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھا، دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

بھیشم چند نے پُوچھا "مہاراج! روتے کیوں ہو؟"

وہ بولا "یہ میرے بیٹے نہیں ہیں۔ یہ تو کسی مچھیرے کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔"

رانی ستیہ وتی بولی "مہاراج! اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگریمنٹ کی رُو سے یہی دونوں آپ کی جائداد کے وارث ہوں گے۔"

"لیکن۔۔" راجہ شانتنو نے سرد آہ بھر کر کہا "یہ دونوں تو کافی بے وقوف معلوم ہوتے ہیں۔ یہ میری جائداد کو کیسے سنبھالیں گے؟"

رانی ستیہ وتی بولی "میں تو بے وقوف نہیں ہوں۔ میں اِن بچوں کی گارڈین بن کر راج کاج کروں گی۔"

راجہ شانتنو اور بھیشم چند نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بھیشم چند نے خاموش لیکن پُروقار نگاہوں سے جواب دیا "ڈیڈی! یہ ٹھیک کہتی ہیں۔ یہ لڑکی تو اپنے باپ سے بھی زیادہ چالاک نکلی۔ تقدیر کے نوشتے نے ماہی گیر کی ایک لڑکی کو چند ہی برس میں اِتنی بڑی جائداد کا مالک بنا دیا اور میں جو صحیح معنوں میں جائداد کا مالک تھا، اپنے لئے چپراسی رکھنا ہو تو بھی اِس ماہی گیر کی لڑکی سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ لیکن ڈیڈی! آپ گھبرائیں نہیں۔ میں اپنے قول پر قائم رہوں گا اور آپ کی جائداد میں سے ایک پیسہ بھی حاصل کرنے کی کوشش نہ کروں گا، بلکہ اُلٹے یہ کوشش کروں گا کہ آپ کی نئی مہارانی ستیہ وتی کے دونوں بے وقوف بیٹے ہی جائداد سنبھالیں اور میری نگرانی میں جائداد اور خاندان کا وقار تباہ ہونے سے بچ جائے۔"

اِتنا سُنتے ہی راجہ شانتنو نے اپنے ذہین اور فرمانبردار بیٹے بھیشم چند کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا "میں اِس خوشی میں چائے کا ایک کپ پینا چاہتا ہوں۔"

اور جب نوکر چائے کا کپ لے کر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ شانتنو سیٹھ کا سر کُرسی کے ایک طرف لٹکا ہوا ہے اور اُس کی آتما کھڑکی کے راستے کہیں باہر نکل گئی ہے!!

افسانہ

اِک شمع بجھی بجھی سی

دنیش چترکار بی۔ اے

"اندو ولا" ایف۔ اے/۷۲۔ اندرپوری۔ نئی دہلی نمبر ۱۲

محترمی خوشتر صاحب تسلیم و نیاز

ایک طویل عرصے کے بعد ایک کہانی پیشِ خدمت ہے۔ جب سے راجندر نگر سے اندرپوری منتقل ہوئی "بیسویں صدی" سے جیسے قطع تعلق سا ہوگیا۔ اسی سلسلہ کو دوبارہ جاری کر رہا ہوں تاکہ قارئینِ "بیسویں صدی" اِس ناچیز کو بالکل ہی فراموش نہ کردیں۔ اِس دوران کی خاموشی کی وجہ میں ہی بہتر جانتا ہوں . . .

خلوص کار ——— دنیش چترکار

ریلوے اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل کر سُنیل کی موٹر کار اب تارکول کی پاٹ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

سُنیل اور اُس کی بیوی سُنیتا، مسٹر کپور آئی۔ اے۔ ایس کا خیر مقدم کرنے ریلوے اسٹیشن گئے تھے۔ کپور، مسٹر سُنیل کا دیرینہ دوست تھا۔ مدّت کے بعد دوست سے مِل کر سُنیل کو بے حد مسرّت ہوئی تھی۔ پھر بھی اُسے اِس بات کا دکھ تھا کہ اصرار کرنے کے باوجود کپور اُس کے ہاں نہ ٹھہرا اور نہ جانے کیوں اُس نے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

کپور کو گیسٹ ہاؤس پہنچا کر سُنیل اور سُنیتا گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ دوست سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ سُنیل کا یہ احساس چُھپا نہ تھا کہ کپور گیسٹ ہاؤس میں کیوں ٹھہرا ہے؟

آخر اِس احساس پر قابو پاکر سُنیل سُنیتا سے بولا۔

"بڑا دوست آدمی ہے کپور، شاندار شخصیت ہے، کیوں؟"

"میں سمجھی نہیں۔"

"اِس میں سمجھنے کی بھی کوئی بات ہے؟" سُنیل کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "میرا مطلب کپور کی شخصیت سے ہے۔ ظالم کو قدرت نے وجاہت عطا کی ہے۔ ہر کوئی اِس سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ دیکھا تھا نا، چہرے پہ کیا رعب اور کتنا نور ٹپکتا ہے! اور پھر، جیسا ظاہر ہے ویسا ہی باطن بھی ہے۔ کردار بھی اُس کا بہت بلند ہے اور سنجیدہ ہے۔ غیر شادی شدہ لوگوں میں ایسی سنجیدگی کہاں ملتی ہے؟"

"تو کیا آپ کے کپور صاحب نے شادی نہیں کی؟" سُنیتا نے اپنے شوہر کی طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! اور شادی نہ کرنے کی بھی ایک خاص وجہ ہے، جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

"سوائے آپ کے ———؟" سُنیتا نے شریر نگاہوں سے سُنیل پر طنز کیا اور پھر مُسکراتی ہوئی بولی "بھلا ہم بھی تو سُنیں؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ سُنو گی تو حیران رہ جاؤ گی ——— جانتی ہو جن دنوں کپور ہماری فرم میں کام کرتا تھا تو اُس نے ایک دن باتوں باتوں میں بڑے رازدارانہ انداز سے شادی نہ کرنے کی وجہ بتائی تھی۔ لیکن بھئی، مجھے تو اِس طرح کے جذباتی انسانوں کی عقل پر غصّہ آتا ہے۔ میرا مشاہدہ تو یہ کہتا ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر ایسے لوگ جنھیں گھر گرہستی کی ذمّے داریاں سنبھالنی چاہئیں، زندگی کی پُربہار منزل کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور پھر جب وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو خود کو ایسے حالات میں پاتے ہیں کہ لاکھ چاہنے پر بھی اپنی زندگی کی حقیقی مسرّتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو پاتے . . . خیر، چھوڑو اِس بات کو۔ کپور کو میں بخوبی جانتا ہوں۔ وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں ہے . . ."

"یہ بھلا آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" سُنیتا نے بات کو کُریدتے ہوئے پُوچھا۔

"اِس لئے کہ ساری زندگی شادی نہ کرنے کی جو اصل وجہ مجھے کپور نے بتائی تھی اُس کی سچّائی پر مجھے بالکل شک نہیں۔ میں اُس کے کردار کا بہت قریب سے مطالعہ کر چکا ہوں۔ مجھے اُس کے قول و فعل میں اُسی ایک حقیقت کا عکس نظر آتا ہے جس کا عکس یہ سُورج، چاند اور ستارے ہیں۔ ۔ "

"واہ، بھئی واہ! کیا شاعری ہے آپ کی یہ صفت تو مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اگر کوئی شاعر آپ کی اِس بات کو شعر کا رُوپ دے دے تو بہت بلند شعر بن جائے۔ ۔" سُنیتا نے ایک بار پھر کار کی فضا میں موتی بکھیر دئے۔

"بہت خوب۔ ۔ ۔!"

اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس دئے۔

"اور سچ بات تو یہ ہے سُنیتا!" سُنیل نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "کپور نے ساری زندگی شادی نہ کرنے کا جو عہد کر رکھا ہے، اُس کی تہہ میں بھی ایک جذبہ کار فرما ہے۔ مجھے خوب یاد ہے، ہماری فرم میں کپور اُن دنوں ملازم ہوا تھا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ اُس کی پُر وقار شخصیت میں میرے لئے کافی کشش تھی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ غیر معمولی طور پر کھِنچا کھِنچا رہتا ہے۔ دفتر میں وہ لوگوں سے کوئی سروکار نہ رکھتا۔ جس کسی نے اُس سے ربط و ضبط بڑھانا چاہا، اُس نے کپور کو ایسا پایا جیسے برف کی سِل ہو۔ ۔ ۔ لیکن۔ ۔ لیکن نہ جانے کیوں دفتر میں اُسے کسی سے اُنسیت تھی تو صرف مجھ سے!"

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا، سوالیہ کیفیت کی تصویر بن کر سُنیتا کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہیں تو اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "آخر ایک دن جب میں نے اُس کی بے کیفی، خاموشی اور ہر ایک سے کشیدگی کا سبب مُصر ہو کر پُوچھا تو بولا: کیا بتاؤں سُنیل صاحب! آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ قدرت نے میرے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ ۔ ؛ اور جب میں نے اُس سے پُوچھا کہ وہ بڑا ظلم کیا ہے؟ تو اُس نے کہا: میں نے آج تک صرف ایک لڑکی سے سچّی محبت کی ہے اور مجھے اِس بات پر ناز بھی ہے کہ اُس گُلاب کی کلی کی مانند نازک اور اچھوتی حسینہ کو بھی میری محبت کا پُورا احترام تھا۔ لیکن۔ ۔ ۔ لیکن کیسے بتاؤں سُنیل صاحب! ایک گُلچیں کا ہاتھ اُس گُلاب کی کلی پر پڑا اور اُس نے اُسے توڑ لیا۔ اُس ظلم کو ہم دیکھتے ہی رہ گئے! ہاں، میری محبوبہ نے اِتنی عقل سے ضرور کام لیا کہ زندگی کے تاریک گوشے میں بھی اُس نے روشنی کی کرن ڈھونڈ نکالی۔ پُر اُمید انسان کی طرح حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود میں اپنے دل کو نہ سمجھا سکا۔ مجھے اُس غریب پر کوئی غصّہ نہیں، لیکن کیا کروں، میری زخمی لیکن باغی رُوح حالات سے سمجھوتہ کرنے میں یکسر ناکام رہی۔ ۔ "

سُنیل نے اچانک کار روک دی۔ سامنے لیول کراسنگ کا گیٹ بند تھا۔

"اُس کے بعد کیا ہوا؟" سُنیتا نے پُوچھا۔

"اِس کے بعد میں نے کپور کو بہت سمجھایا، لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔

آخر ایک دن اُس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ پھر مجھے اِس موضوع پر کچھ کہنے کی جراُت نہ ہوئی اور وہ بات یہ تھی ——— سُنیل صاحب! میرے لئے محبت کا مفہوم کچھ اور ہی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ سچّی محبت روحوں کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوتی ہے اور ایسا زندگی میں ایک ہی بار ہوتا ہے اور ایک ہی وجود کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں نے اِس محبت میں ذہنی ربط و ہم آہنگی کو بھی شریک کر لیا ہے۔ اِس محبت کے سِوا ہر محبت غلط ہے۔ وہ محبت نہیں ہَوس ہوتی ہے۔ اِسی لئے میں نے عہد کیا ہے کہ ساری زندگی اِس عقیدے پر قائم رہوں گا۔ ۔ ؛ اور سچ مچ سُنیتا! کپور نے ایسا ہی کر دکھایا"

اب ریل کا پھاٹک کھُل گیا تھا۔ سُنیل کا بنگلہ زیادہ دُور نہ تھا۔ اِس لئے بنگلے تک پہنچنے میں اِس موضوع پر اور گفتگو نہ ہو سکی۔

اُس نے سُنیتا کو بنگلے پر چھوڑا اور یہ ہدایت دی کہ کپور شام کو چائے پر آ رہا ہے اور پھر سُنیل دفتر روانہ ہو گیا۔

شام کو دونوں ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے مہمان کا انتظار کر رہے تھے۔ سُنیل کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا اور سُنیتا کی انگلیاں سوئیٹر بُننے میں مشغول تھیں۔

"کیا ٹائم دے رکھا ہے کپور صاحب نے آنے کا؟" سُنیتا نے جیسے تنگ آ کر سُنیل سے پُوچھا۔

اور سُنیل کی نگاہیں سامنے دیوار پر لگے کلاک کی طرف اُٹھ گئیں سوا تین بج

ٹپکتے تھے۔ بولا: "چائے کا وقت تو چار ہی بجے کا ہے۔ لیکن میرا اصرار تھا کہ ساڑھے تین بجے چلا آئے۔ خیال تھا کہ پہلے آجائے گا تو کچھ دیر خوش گپیاں ہو سکیں گی۔"

اور کلاک کی سوئیاں جب سرک کر تین بج کر تیس پر آپہنچیں تو انتظار میں کچھ بیقراری بھی بڑھ گئی۔

مہمان کا انتظار کرتے کرتے جب کچھ منٹ اور گزر گئے تو سُنیل جھلا اٹھا۔

"نہ جانے کیا بات ہے! یہ لوگ وقت کے تو پورے پابند ہوتے ہیں . . ؟"

"لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کپور صاحب نہ آسکیں گے۔" سویٹر بُنتے ہوئے سُنیتا دھیمی آواز سے بولی۔

"نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور آئے گا۔"

ڈرائنگ رُوم چند لمحوں کے لئے سکوت میں ڈوب گیا۔

جبھی اچانک "کال بیل" بج اٹھی۔

"لو، وہ آگیا!" کہتا ہوا سُنیل مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لئے دروازے کی طرف لپکا۔ سُنیتا اپنی جگہ پر بیٹھی سویٹر بُنتی رہی۔

اور جب سُنیل کمرے میں واپس آیا تو کلاک ٹھیک چار بجا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک رُقعہ تھا۔

"کون تھا ——— کپور صاحب نہیں آئے کیا؟" سُنیتا نے پوچھا۔

"نہیں ——— کپور نہیں آیا۔ اسی کا بھیجا ہوا ایک چپراسی تھا۔ یہ رُقعہ دے گیا ہے۔"

سُنیتا نے اٹھ کر سُنیل کے ہاتھوں سے کاغذ کا پُرزہ لے لیا۔ لکھا تھا ———

ڈیر سُنیل!

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں حسبِ وعدہ چائے پر حاضر نہ ہو سکوں گا۔ بمبئی سے ابھی ابھی تار آیا ہے۔ مجھے فوراً واپس بُلایا گیا ہے۔ اس لئے ساڑھے چار بجے کی گاڑی سے جا رہا ہوں۔ اُمید ہے میری مجبوری کا احساس کرتے ہوئے تم بُرا نہ مانو گے۔

تمہارا ——— کپور

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کپور نہ آسکیں گے۔" خط پڑھ کر سُنیتا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن تمہیں یہ کیسے پتہ چل گیا؟"

"اس لئے کہ آپ کا دوست سچے معنوں میں ایک عظیم کردار کا انسان ہے . . ."

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کی گلاب کی کلی پر ڈاکہ ڈالنے والا گلچیں کوئی دوسرا نہیں۔"

غزل

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

مجھکو سو بار جہنم میں جلایا ہوتا
میرے سینے میں مگر دل نہ بنایا ہوتا

کوئی صدمہ نہ کوئی رنج اُٹھایا ہوتا
بھُولنے والے اگر تجھکو بھُلایا ہوتا

حالِ دل اُن کو سُنانے کی تمنا تھی بہت
اب یہ کہتا ہوں کہ اُن کو نہ سُنایا ہوتا

خود نہ آتے وہ مگر اُن کے تغافل کی قسم
کوئی نامہ کوئی پیغام تو آیا ہوتا

حرم و دیر سے باطن ہیں تڑپانے والے
کوئی جلوہ تو کہیں اور دکھایا ہوتا

اپنی نظروں میں سرافراز ہوا جاتا ہوں
مجھکو اتنا نہ نگاہوں سے گرایا ہوتا

جب پریشاں تھا کہ اُس بزم میں جاؤں کیونکر
اب پشیماں ہوں کہ اے کاش نہ آیا ہوتا

حرم و دیر و کلیسا سے کبھی کچھ پا لیتے
تیرے قدموں پہ اگر سر کو جھکایا ہوتا

داد پانے کی تمنا تھی اگر دل میں سحرؔ
کچھ ترنم سے سرِ بزم سُنایا ہوتا

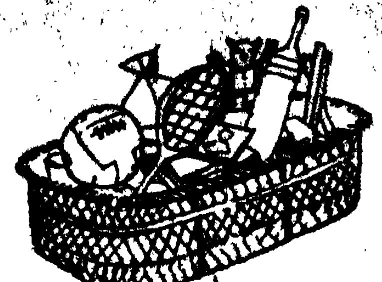
اس سے آگے سُنیتا کچھ نہ کہہ سکی اور بے اختیار اس کی نگاہیں اپنے شوہر کی طرف اُٹھ گئیں۔

"سُنیتا ———!"

"جی ———!"

اور سُنیتا چُپ چاپ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

کئی دنوں تک سُنیتا کی عجیب حالت رہی۔ جیسے ایک شمع ہو بُجھی بُجھی سی!!



پالنے کی چُھٹی

راموتین برس کا ہے اور اُس کا پالنا . . . .
اُس سے بس ایک دِن چھوٹا ہے۔

دونوں کا ساتھ رات دِن کا تھا۔ وہ ایک پَل کو ایک دُوسرے سے الگ نہ ہوتے تھے۔

پھر دھیرے دھیرے راموکو محسوس ہونے لگا: وہ بڑا ہوگیا ہے . . . . اِتنا بڑا کہ اَب سونے کے لئے اُسے جھُلائے جانے کی ضرورت نہیں۔

اُس نے پالنا چھوڑ دیا۔

———— اور پالنے کو چھٹی مِل گئی۔

———— لیکن ———— آخر ساتھی ہی تو تھا۔

رامو نے پالنے سے اور ہی کام لینا شروع کر دیا۔ پالنے میں وہ اپنی رنگ برنگ تصویروں والی کتابیں، بلّے، گڑیاں وغیرہ رکھنے لگا۔

راموکی ماں بولی: "دیکھو ہمارے لاڈلے کے پاس کتنی ساری چیزیں ہیں اور یہ کتنا خُوش خُوش ہے۔"

راموکے والد بولے: "ہو بھی کیوں نا۔ پالنے کو خوب لمبی چھُٹی جو دی ہے۔ ہم نے ٹھیک کیا نا۔"

جی ہاں۔ اُنہوں نے ٹھیک ہی کیا۔!

———— سمجھدار ماں باپ ہمیشہ فیملی پلاننگ کرتے ہیں۔

فیملی پلاننگ کے معنی یہی نہیں کہ بچّے کم ہوں بلکہ یہ بھی ہیں کہ بچّے تبھی ہوں جب ماں باپ اُن کی ضرورت محسوس کریں اور یہ کہ اُن کی پرورش کے لئے ہر طرح سے تیار بھی ہوں۔

بچّے کا جنم اب اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ ایسا فیملی پلاننگ کی بدولت ہُوا ہے۔

مُفت مشورے کے لئے قریبی فیملی پلاننگ سینٹر میں تشریف لائیں۔



صحت و زندگی

محمد اقبال سلمان ـــــــــــــ

۳۶۔ پرنس روڈ۔ کوئٹہ (پاکستان)

مخدومی و محترمی جناب گرامی! آداب و نیاز

اب کے افسانہ نمبر نہ ملا۔ میرے لڑکے ندیم نے اصرار کیا کہ میں آپ کی خدمت میں خط لکھوں اور آپ سے پرچہ بھیجنے کی درخواست کروں۔ میں نے سوچا کہ خالی خولی درخواست کس منہ سے کروں، جب کہ میں نے کئی سال سے "بیسویں صدی" کے لئے کچھ نہیں لکھا۔ میں تو اب مضمون کے ساتھ ہی خط لکھوں گا ـــــ اور مضمون ندیم کے اصرار کے باوجود جلد نہ لکھا جا سکا۔ اب اس عریضے کے ساتھ "صحت و زندگی" کے عنوان سے مضمون ارسال خدمت ہے۔ افسانہ نمبر بھجوا کر ممنون فرمائیں۔ تاکہ جس نے اصرار کرکے مضمون لکھوایا ہے، پہلے وہ اُسے پڑھے اور پھر میں ـــــ میں آپ کا دلی شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس کا معاوضہ بھجوانے کی تکلیف نہ کریں گے۔ "بیسویں صدی" کے ساتھ میرا ایک ربع صدی کا قلبی تعلق ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس کی خدمت اپنا ہی پرچہ سمجھ کر کروں ـــــ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ـــــ جناب فکر تونسوی کے بارے میں پڑھا تھا کہ اُن کو فالج نے آدبوچا ہے۔ خدا کرے اب وہ روبہ صحت ہوں۔ ازراہ کرم میری طرف سے اُن کی مزاج پرسی کیجئے ۔۔۔

آپ کا مخلص ـــــــ محمد اقبال سلمان

۱ ● پروٹین ـــــ بچوں کے لئے

پروٹین (لحمیہ) انسانی غذا کا ایک نہایت اہم عنصر ہے۔ ہمارے جسم کے عضلات دل، دماغ، جگر، گردے اور ہڈیاں زیادہ تر پروٹین ہی سے بنتی ہیں۔ بچپن انسانی جسم کے نشو و نما کا زمانہ ہے، اِس لئے بچوں کی خوراک میں پروٹین کا ہونا اور بھی ضروری ہے تاکہ وہ شروع ہی سے اچھی بنیاد پر پرورش پا سکیں۔

بچوں کی خوراک میں پروٹین کو اِس لئے بھی اہمیت حاصل ہے کہ وہ عام طور کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں اور اِس طرح اُن کا جسم "خرچ" ہوتا رہتا ہے۔ اِس کی تلافی پروٹین ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگر انھیں پروٹین نہ ملے تو وہ جسمانی طور پر پسماندہ رہ جاتے ہیں۔

گوشت، مچھلی، انڈے اور دودھ میں وافر مقدار میں پروٹین پائی جاتی ہے۔ سبزیوں میں بے شک پروٹین ہوتی ہے، لیکن دوسرے درجے کی۔ اِس لئے حیوانی غذاؤں کو ترجیح حاصل ہے۔ جن گھروں میں کسی وجہ سے گوشت نہ کھایا جاتا ہو، وہاں انڈے گوشت کا نعم البدل ہو سکتے ہیں۔ انڈوں میں پروٹین کے علاوہ فاسفورس، فولاد اور وٹامن اے اور ڈی بھی کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچے کو ایک انڈا روزانہ کھلایا جا سکتا ہے۔ تین ماہ کے بچے کو نیم برشت انڈے کی صرف زردی کھلائی جائے۔ اگلے چند مہینے کے بعد اُسے سفیدی بھی کھلائی جا سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ اُسے روزانہ آدھ سیر سے تین پاؤ تک دودھ بھی ضرور پلانا چاہئے، تاکہ اُسے مناسب مقدار میں پروٹین حاصل ہوتی رہے۔

۲ ● تذبذب کیوں؟

فیصلہ نہ کر سکنے کی حالت کو تذبذب کہتے [illegible] ذہنی کیفیت

نہیں۔ اکثر حالتوں میں یہ دماغی تھکن کا باعث ہوتی ہے اور دماغی تھکن کا نتیجہ جسمانی تھکن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جسم کے دوسرے اعضاء کی طرح جب دماغ تھک جاتا ہے تو اس کے کام کرنے کی صلاحیت شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔

بعض ایسے لوگ بھی جو جسمانی اور عصبی لحاظ سے تندرست نظر آتے ہیں، تذبذب کے دیرینہ مرض کے شکار ہوتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں منصوبے تو بہت بنتے ہیں، لیکن کسے ترک کریں اور کسے اختیار کریں؛ یہ فیصلہ وہ نہیں کر سکتے اور اگر وہ کسی ایک منصوبے پر صاد بھی کر دیں تو اُسے عملی جامہ پہناتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ۔ ایسے حالات میں تو کام چلا سکتے ہیں جب انھیں دوسروں کی تیار کی ہوئی سکیموں پر عمل درآمد کرنا پڑے، لیکن کسی ایسی تنظیم میں جہاں انھیں اپنے طور پر فیصلے کرنے پڑیں وہ بالکل بودے ثابت ہوتے ہیں اور ناکام بھی۔

بہرحال یہ کوئی بیماری نہیں بلکہ محض ایک عادت ہے۔ جو شخص ایسی عادت میں مبتلا ہو، اُس کے بچپن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، اُس میں اُسے اپنے طور پر فیصلے کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اُسے ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی عملی تربیت نہیں مل سکی۔ والدین، بڑے بہن بھائی یا نوکر چاکر اُس کی ذمّے داریاں اپنے سر لیتے رہے اور اُس کی قوتِ فیصلہ کو نشوونما پانے کا موقع نہ مل سکا۔ جب عملی زندگی کا مرحلہ آیا تو تذبذب سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اِس ذہنی کیفیت کا ایک ہی علاج ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایسی صورتِ حال سے دوچار کرے کہ اُسے فیصلہ کرتے ہی بنے۔ دو ہی چار تجربوں کے بعد اُس میں اپنی ذات پر اِتنا اعتماد پیدا ہو جائے گا کہ وہ اِس نقصان دہ عادت سے چھٹکارا پا سکے گا۔ اِس کے بارے میں سوچنا اور باتیں کرتے رہنا بالکل بیکار ہے۔ اگر تذبذب پر قابو پانا ہے تو عملی قدم اُٹھا دیجئے۔

۳ • انجیر —— غذائیت سے بھرپور پھل

پھلوں میں انجیر شاید پہلا پھل ہے، جس کی انسان نے کاشت کی۔ مذہبی روایات کو دیکھا جائے تو بھی اِسے قدیم ترین پھل قرار دینا پڑے گا۔ آدم اور حوّا نے، جیسا کہ بائبل میں آیا ہے، اِسی درخت کے پتّوں سے اپنا ستر ڈھانکا تھا۔

یوں تو انجیر دُنیا کے مختلف حصّوں میں سینکڑوں اقسام کے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اِس کی بڑی قسمیں دو ہی ہیں۔ ایک جنگلی یعنی خودرو اور دوسری بُستانی یعنی کاشت شُدہ۔ بُستانی انجیر ذائقے، جسامت اور خواص کے لحاظ سے جنگلی انجیر کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتا ہے۔ بُستانی انجیر سبز ہو یا اُودا، تازہ ہو یا خُشک۔ ہر لحاظ سے ایک عمدہ غذا تسلیم کیا گیا ہے، تاہم خُشک انجیر میں زیادہ غذائیت پائی جاتی ہے۔ اِس کے مقابلے میں جنگلی انجیر نہ رسیلا ہوتا ہے نہ خوش ذائقہ۔ جسامت میں بھی بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

بُستانی انجیر میں عام طور پر ۹۳ فی صد شکر پائی جاتی ہے۔ اِس میں حیاتین الف اور ب بھی وافر مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ خشک انجیر تازہ انجیر کی بہ نسبت زود ہضم ہوتا ہے۔

غذا کے علاوہ انجیر کو ایک ملیّن (قبض کُشا) دوا کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جُلّاب کے متعلق معلوم ہے کہ اگر اُس سے فائدہ پہنچتا ہے تو ضرر کا بھی احتمال ہے۔ لیکن انجیر قبض کا ایک نہایت بے ضرر علاج ہے۔ جب بھی قبض محسوس ہو چند انجیر کھا لینا چاہئیں۔ شکایت رفع ہو جائے گی۔ بہت چھوٹے بچّے جو انجیر نہیں کھا سکتے انھیں انجیر کا شربت استعمال کرایا جا سکتا ہے۔ یہ شربت خوش ذائقہ ہوتا ہے، اِس لئے بچّے بڑی رغبت سے پی لیتے ہیں۔

۴ • فکر و غم کا علاج

انسانی زندگی میں خوشی اور غم کے یکساں امکانات پائے جاتے ہیں۔ تاہم خوشی سے عہدہ برآ ہونا کوئی مسئلہ نہیں، نہ ایسی حالت میں انسان کو کسی مشورے یا رہنمائی کی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے، لیکن جب کوئی مشکل آ پڑے، وہ پریشان ہو، غمگین و فکرمند ہو تو یہ البتہ ایک مسئلہ ہے۔ اگر وہ حل نہ ہو سکے تو انسان کی عملی صلاحیتوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور اُس کے تندرست اور خوش و خرّم رہنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ غم، فکر، پریشانی اور ذہنی تناؤ کو دُور کرنے کے لئے بسیار خوری، شراب، تمباکو، افیون اور دوسری نشہ آور چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں، لیکن یہ کوئی علاج نہیں۔ نہ ایسی چیزوں سے جذبات کو معمول پر لایا جا سکتا ہے۔ اِس طرح روپیہ برباد ہوتا ہے اور صحت کو گھن لگ جاتا ہے۔

فکرمندی اور پریشانی سے نمٹنے کا صحیح طریقہ یہ ہے (اور ماہرینِ نفسیات بھی اِسی کی سفارش کرتے ہیں) کہ روزمرّہ کی زندگی میں پیدا ہونے والی مشکلات کو دماغ کے اندر محبوس کرنے کے بجائے مناسب موقعوں پر خارج کرتے رہنا چاہیے۔ کسی قابلِ اعتماد اور دردمند دوست کو اپنے دُکھ درد میں شریک کر لیا جائے۔ اپنی پریشانیاں اُس کے سامنے کھول کے رکھ دی جائیں۔ اُن پر بحث کی جائے اور اُن کے متعلق مشورے حاصل کئے جائیں۔

ظرافت، خوش طبعی اور تفریح کو بھی فکر و تشویش کا ایک موثر علاج قرار دیا گیا ہے۔ جو لوگ خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں، زندہ دلی اور خوش مزاجی پر یقین رکھتے ہیں اور مشکلات میں محصور ہونے کے بعد قہقہے لگا سکتے ہیں، فکر و غم کو اُن کے ہاں ٹھکانا میسّر نہیں آ سکتا۔

۵ • نیکی اور بھلائی کے امکانات

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خلقِ خدا کی خدمت اُسی صورت میں ممکن ہے، جب انسان کے پاس دولت ہو۔ کسی حد تک یہ خیال صحیح بھی ہے۔ لیکن اِس حقیقت کو نظرانداز

کرنا چاہئے کہ خدمت کے لئے دولت شرط نہیں، جذبہ شرط ہے۔ اپنی اپنی قابلیت، استعداد اور استطاعت کے مطابق ہر شخص دوسروں کے ساتھ بھلائی کرسکتا ہے۔ ایک بڑی خدمت تو خوش خلقی ہے جو اس دور میں قریب قریب عنقا ہے اور جس کے لئے لوگ ترس کر رہ گئے ہیں۔ اپنے ماتحتوں سے، ساتھیوں سے، رشتوں سے، ہمسایوں سے، بیوی بچوں سے شائستگی، خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا خدمت ہی نہیں نیکی اور عبادت بھی ہے!

کیا ہوا اگر آپ کے پاس دولت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہے نا کہ آپ کسی کی مالی مدد نہیں کرسکتے، لیکن چھوٹی چھوٹی نیکیاں اور بھلائیاں تو آپ ہر روز کرسکتے ہیں۔ آپ راستے میں گرے پڑے کنکر پتھر ہٹا سکتے ہیں، کسی نابینا آدمی کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کرا سکتے ہیں، کسی ناخواندہ آدمی کو اُس کا خط پڑھ کر سنا سکتے ہیں یا اُس کا خط لکھ سکتے ہیں، ریل یا بس میں کسی معمر، دریا مریض کو بیٹھنے کے لئے جگہ بنا سکتے ہیں، مسافر یا اجنبی کی رہنمائی کرسکتے ہیں یا کسی مصیبت زدہ کو تسلی، تشفی دے سکتے ہیں۔

آپ اپنے امکانات کا جائزہ لیں، نیکی اور خدمت کی کوئی نہ کوئی گنجائش ضرور نکلے گی۔

۶• دانتوں کی حفاظت

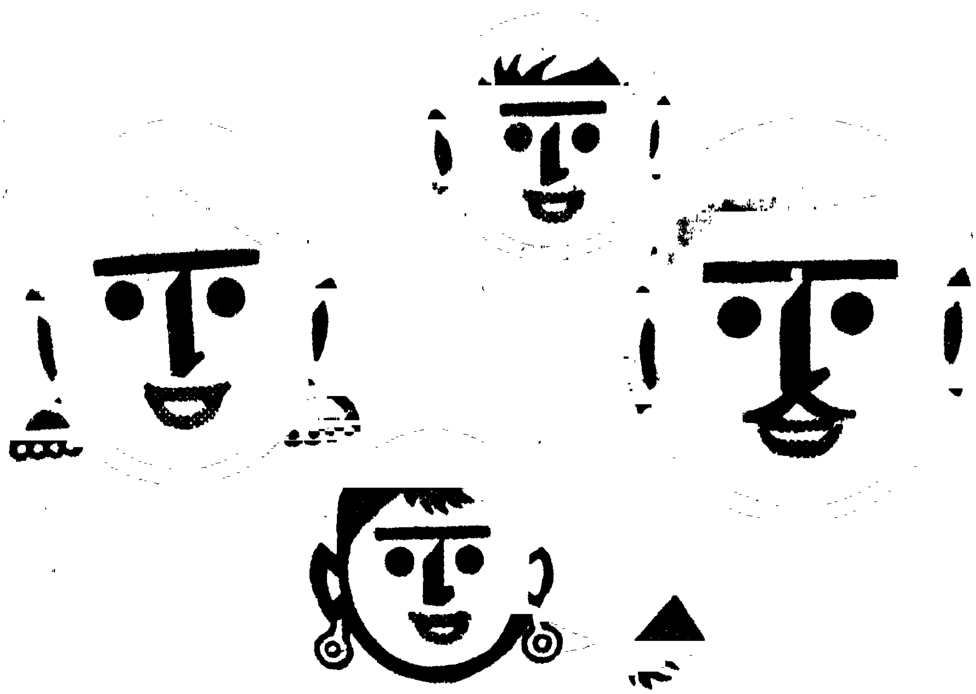
دانتوں کو فرسودگی سے بچانے اور اُن کی عمر بڑھانے کے لئے طبی سائنسدانوں نے اب تک جو تحقیق کی ہے، اُس کا لُبِّ لباب یہ ہے ——

جہاں تک ممکن ہو دانتوں کو صاف رکھا جائے۔ عام طور پر دانت صبح کے وقت صاف کئے جاتے ہیں، لیکن ہونا یہ چاہئے کہ رات کو سونے سے پہلے بھی صاف کئے جائیں۔ ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے بعد بھی برش استعمال کر لیا جائے تو یہ اور بھی اچھا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو سادہ پانی سے اچھی طرح کُلّی کر لی جائے، تاکہ غذا کے ریزے دانتوں میں رہ کر سڑن پیدا نہ کریں۔

صرف صفائی کافی نہیں۔ مناسب خوراک کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے۔ اگر خوراک میں حیاتین ج موجود نہیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دانت بھی محفوظ نہیں۔ ترش پھلوں مثلاً مالٹے، سنگترے، چکوترے اور لیموں وغیرہ میں وافر مقدار میں حیاتین ج پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض سبزیوں سے بھی حیاتین ج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

شکر، جسم انسانی کی ایک اہم ضرورت تو ہے اور اسے استعمال کئے بغیر چارہ بھی نہیں، لیکن دانتوں کو شکر بہرحال نقصان پہنچاتی ہے۔ اگر کوئی میٹھی چیز کھائی جائے تو منہ میں اُس کا اثر دیر تک باقی رہتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ میٹھی چیز کھانے کے بعد نمکین پانی سے کُلّیاں کی جائیں، تاکہ شکر کو تیزابیت پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

دو یا تین بچّے
بس....



فیملی پلاننگ سینٹر کی پہچان : لال تکون

davp 67/337

افسانہ

چٹان

مسز ہرپال اروڑہ ایم۔ اے

۴۴۰۳۔ شدرشن پارک۔ موتی نگر نئی دلّی

قابلِ احترام بھائی جان! احترام و خلوص

"بیسویں صدی" بے شمار بلند ذوق قارئین کی طرح میرا بھی محبوب صحیفہ ہے۔ اس کے تازہ شمارے میں "افسانہ نمبر" کا اعلان دیکھ کر مسرت ہوئی۔ یوں تو "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے لیکن اس کے خاص نمبر اردو کے افسانوی ادب میں ناقابلِ فراموش اضافہ ہوتے ہیں۔ ——— افسانہ نمبر کے لئے ایک آسٹریلوی شاہکار "چٹان" بھیج رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا انوکھا پلاٹ آپ کو پسند آئے گا ——— اپنی گرانقدر رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں . . .

آپ کی بہن ——— مسز ہرپال اروڑہ

جس دن دادی نے مجھے رحیم دادا کی داستان سنائی تھی۔ اُس دن مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ دادی جان کی چوڑی کھاٹ پر میں گچھا مچھا ہو کر بیٹھی تھی۔ دیوار کے ساتھ نمک سے بھری کھالیں لٹک رہی تھیں۔ باہر شیشم کے درختوں کو جھنجھوڑتی ہوئی ہوا چل رہی تھی اور اندر گھر کی چھت میں پڑے ہوئے لوہے کے شہتیر کانپ رہے تھے۔

تکیہ پر سر رکھ کر لیٹی ہوئی میری دادی جان کھاٹ پر بنی ہوئی ایک تصویر کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ نازک سا چہرہ اور بہت تیکھے خد و خال۔ میری دادی جان کا چہرہ نازک سا تھا لیکن جسم لوہے جیسا تھا۔ مضبوط اور لچک بھرا بھی۔ دادی جان کی رضائی میں گھسنا مجھے ہمیشہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ دادی جان کے بدن سے مجھے ہمیشہ ہی ایک میٹھی سی خوشبو آتی تھی۔

دادی جان کے کمرے کو ہم دادی جان کا "ریسٹ ہاؤس" کہتے تھے۔ یوں یہ ایک ٹوٹی ہوئی چٹان کے قریب بیکار پڑی زمین پر بنا ہوا معمولی سا کمرہ تھا۔ اردگرد ہمارے باقی مکان تھے جو ہر سال پھیلتے جا رہے تھے۔ کمرے بڑھ رہے تھے، برآمدے اور لمبے ہوتے جا رہے تھے اور دادی جان کا کھنڈر جیسا کمرہ انھیں شرمندہ کرتا رہتا تھا۔

"بتا کیا پوچھتی ہے؟" اُس دن مجھ سے دادی جان نے کہا اور پھر خود ہی کہا۔ "تو چھوٹی سی تھی جب سے تو مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا تجھے بتانے کا۔ اب تو جوان ہو گئی ہے۔ وقت آگیا ہے۔ یوں بھی اپنے بڑے بوڑھوں کے بارے میں جاننا چاہیئے۔"

میں بچّی تھی جبھی سے چٹان پر کھدے ہوئے ایک نام کو دیکھ کر یہ پوچھنے لگی تھی کہ یہ کس کا نام ہے؟ لیکن دادی نے یا کسی نے مجھے کبھی کچھ نہ بتایا تھا۔ کبھی پڑوسیوں سے پوچھتی تھی تو وہ ہنستے اور پھر منہ پھیر لیتے تھے۔

"اس چٹان کے نیچے تیرا دادا سویا ہوا ہے . . ." دادی جان نے اُس دن کہا لیکن یوں جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میرا دادا جان یہاں ہمارے پاس نہیں رہتا تھا۔ لیکن ہر ماہ چاندی کے فیتے والی گھڑی باندھ کر ہماری خیریت پوچھنے آیا کرتا تھا۔ پھر یہ دوسرا دادا جان . . .

اب یہ داستان میں دادی جان کی زبانی نہیں اپنی زبانی آپ کو سُناتی ہوں ———

دادی جان کا نام حمیدہ تھا۔ وہ مالابار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی اور گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی۔ وہ تیکھے ناک نقشے اور دراز گیسوؤں والی دیوانی لڑکی تھی۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو گئی تھی لیکن جو آدمی اُس پر دل و جان سے عاشق ہوا تھا وہ بڑا سیلانی تھا۔ اٹھارہ برس کی لڑکی کا دل جیتنا بہت مشکل تھا لیکن اُس نے آخرکار اُس کا دل جیت لیا۔ زمیندار کو یہ نوجوان پسند نہ تھا کیونکہ وہ اُس کی طرح اونچی

ذات کا نہ تھا۔ اِس لئے دونوں موقع دیکھ کر اُس گاؤں سے بھاگ گئے اور مدراس کے ایک قصبے میں آباد ہوگئے۔

مضبوط بدن اور نیلی آنکھوں والے میرے دادا جان نے چار ہزار ایکڑ زمین خریدی۔ لوہے لکڑی کا ایک چھوٹا سا مکان بنایا اور دس بارہ برس میں سات کالے کلوٹے بچے پیدا کئے۔ قصبے کے قریب ہی ایک ندی بہتی تھی جو گرمیوں میں اتنی خشک ہو جاتی کہ زمین میں دراڑیں پڑ جاتیں اور سردیوں میں یوں اُچھل اُچھل پڑتی کہ اُس کے کنارے ٹوٹ ٹوٹ جاتے۔ اِن برسوں میں میرا دادا پچھتاتا رہا۔ "شروع سالوں میں میری سیلانی طبیعت نے میرا کچھ نہیں بننے دیا تھا اور پھر مجھ سے ایک مالاباری عورت کے ساتھ شادی کرنے کی غلطی ہوگئی اور اب یہ زمین کا سیلاب اور سوکھا اطمینان کی سانس نہیں لینے دیتا۔۔" اور پھر ایک دن میرا دادا گھر گھاٹ

- بے شرمی کی باتیں کھلی ہوں یا چھپی اُن کے پاس تک نہ پھٹکو۔
(قرآن پاک)
- جو لوگ بُرے کام کر رہے ہیں اُن کی وجہ سے خشکی اور تری میں (روئے زمین پر) خرابی پھیل گئی ہے۔ (قرآن پاک)
- بخدا حق ہمسایہ اُسی سے ادا ہوتا ہے جس پر خدا کی رحمت ہوتی ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- یہ شقاوت اور بدبختی کی نشانی ہے کہ انسان گناہ کرے اور پھر اُمید رکھے کہ بخش دیا جاؤں گا۔

(حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ)

چھوڑ کر افریقہ چلا گیا جہاں سونے کی کھدائی ہو رہی تھی۔ دادا جان نے بہت رومانٹک کہانیاں سُنی تھیں کہ جن لوگوں نے سونے کی کھدائی کی ہے، وہ نوٹوں میں تمباکو رکھ کر پیتے ہیں۔

دادی جان کی زندگی بہت مشکل ہوگئی۔ بڑا لڑکا محمود بارہ برس کا تھا۔ اُسی لڑکے کے سہارے دادی جان نے کھیت سنبھال لئے۔ دادی جان کی زبان میٹھی اور ہاتھ سخی تھے۔ اِس لئے ندی کے کنارے ڈیرہ ڈالنے والے خانہ بدوش دادی کے کام میں ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ لیکن یہ خانہ بدوش گرمیوں کے دنوں میں آتے تھے اور سردیوں میں وہ کہیں دوسری جگہ چلے جاتے تھے۔

ایک سال سردیاں ابھی ختم ہوئی تھیں کہ دادی نے رات کو ایک چٹان کے قریب آگ جلتی ہوئی دیکھی۔ پھر یوں آواز آئی جیسے کوئی ہولے ہولے گا رہا ہو۔ سردیوں کی رات تھی۔ لیکن آگ کی تپش کے ساتھ آواز بھی پگھل کر آ رہی تھی۔ دادی نے بچوں کو سُلایا اور ہاتھ میں بھری بندوق اور اپنے گلے کو پیار سے لے کر اُس چٹان کی طرف چل دی۔ راستے میں سیبوں کا باغ آتا تھا۔ ہوا میں کچے سیبوں کی مہک بکھری ہوئی تھی۔ دھیمے قدموں سے جا کر دادی نے دیکھا، ٹوٹی ہوئی چٹان کے دونوں ٹکڑوں کے درمیان آگ جلا کر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ بیچے بلکے تراشے ہوئے نقش اور لال داڑھی آگ کی روشنی میں عجیب طرح سے چمک رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سُن کر وہ چونکا۔

"کیا صد خوش مارنے آئے ہو؟" دادی نے پوچھا اور کہا: "آگ جلتی ہوئی دیکھی تو دیکھنے آ گئی کہ کون ہے؟" اور دادی نے اپنے ہاتھوں کے گٹھے ہوئے گتے کو پیار سے تھام لیا۔

"میں مالابار سے آیا ہوں۔"

"میں بھی وہیں کی ہوں۔ اب تو وہ سب دوسری دُنیا معلوم ہوتی ہے۔"

وہ اور دادی کتنی دیر تک وہاں کی باتیں کرتے رہے، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ پلی پروان چڑھی تھی۔ لیکن اب وہ دُنیا اُس کے لئے دوسری دُنیا ہو گئی تھی۔ پھر وہ اور دادی کھیتوں کی باتیں کرتے رہے۔ وہ ملاّح تھا اُس نے کئی گھاٹ دیکھے ہوئے تھے لیکن کسی گھاٹ پر اُس نے ایسی بھولی بھالی اور خوبصورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ اُس نے لرز کر پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

"حمیدہ!" دادی نے اپنا نام بتایا۔ اُس کے بال سیاہ بادلوں کی طرح شانوں پہ بکھرے ہوتے تھے۔

"میرا نام رحیم ہے" اُس نے دادی کی آنکھوں میں ڈوب کر کہا اور پھر ڈوب تیر کر دادی کے بادلوں جیسے گیسوؤں کو دیکھنے لگا۔ پانی ہی کو نہیں سیدھا بادلوں کو ایک گھونٹ میں پینے کے لئے اُس کے لب تڑپ اُٹھے۔

ٹوٹی چٹان کے دو ٹکڑوں کے درمیان آگ جلتی رہی اور پھر آگ کی تپش کی طرح دو جسم بھی جلنے لگے۔

رحیم پھر کہیں نہیں گیا۔ کئی برس گزر گئے۔ وہ جان توڑ محنت کرتا اور دادی کے کھیت سنبھالتا۔ گرمیوں میں خانہ بدوش آتے۔ انہیں رحیم بہت بہادر اور عقلمند معلوم ہوتا تھا۔ آج بھی اگر کوئی خانہ بدوشوں کے گیت سُنے تو اُن گیتوں میں لال داڑھی والے کا ذکر آتا ہے۔ یہ گیت اُسی وقت سے چل گئے تھے۔

کھیتوں سے لے کر گھر کے چولھوں تک ! اور جس ہوا کے ساتھ یہ گیت پھیلتے تھے، میری دادی اور رحیم دادا اسی ہوا کی طرح بے مل بھی تھے اور بے پروا بھی۔ انھوں نے کبھی نہ سوچا کہ اب ان کا کیا بنے گا؟ گرمیوں کی چلچلاتی دوپہروں میں وہ دونوں کھیتوں میں ہل چلاتے، سردیوں کی سرد راتوں میں چولھے کے پاس بیٹھتے اور کہانیاں سنتے سناتے۔ وہ شاید زندگی کی پہیلی بھی ایک دوسرے کو بتاتے اور ان کا حل پوچھتے تھے۔

دادی ایک طوفان میں سے صرف گزری ہی نہیں تھیں، ایک طوفان کو انھوں نے اپنے اندر بھی دبا رکھا تھا! اور پھر جو طوفان آیا وہ تیسرا طوفان تھا۔ کھیتوں کو اجاڑنے والا، مکانوں کی چھتوں کو اڑانے والا اور جانوروں کو بہا کر لے جانے والا۔ سارا گھر پتے کی طرح کانپ رہا تھا جس وقت دادی کو زچگی کے درد شروع ہوگئے۔ اس رات جس بچے نے جنم لیا، اس کے بال لال سرخ تھے۔ صبح سویرے لال بالوں والے بچے کا منہ چوم کر رحیم نے بہتے ہوئے جانوروں کو بچانے کے لئے ندی کی راہ پکڑی۔ بس یہ آخری دن تھا جب دادی نے رحیم دادا کو دیکھا۔ اس رات پڑوسی اس کی لاش ہی گھر لائے تھے۔ ٹوٹی چٹان کے نیچے رحیم دادا کو دفنایا گیا تھا۔ پتھر پر جب اس کا نام کھودا جا رہا تھا تو دادی اپنے لال بالوں والے بیٹے کو چھاتی سے لگا کر وہاں بیٹھی ہوئی تھی اور اس نام کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

زندگی کے اتفاقات بہت عجیب ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے تھے میرا دادا سونے کی کانوں میں کہیں مر گیا تھا اور پھر لوگوں نے کہا کہ وہ اچھا بھلا جیتا جاگتا برسوں کے بعد اب گھر لوٹ آیا تھا۔

وہ گھر واپس لوٹا۔ بہت کچھ گزر چکا تھا۔ لڑائیاں جھگڑے میں بھی قیاس کر سکتی تھی، آپ بھی۔ لیکن دادی اپنے ساتوں بچوں کی طرح اس لال بالوں والے بچے کو بھی پالتی رہی، پروان چڑھاتی رہی۔

وہ لال بالوں والا بچہ جب جوان ہوا تب جنگ ہو رہی تھی۔ وہ بھرتی ہو کر میدانِ جنگ میں چلا گیا۔ وہاں نارمنڈی میں اس نے ایک کسان لڑکی کے ساتھ بیاہ کر لیا۔ لیکن کچھ برس بعد وہ جنگ میں مارا گیا۔ دادی نے اس کسان بہو کو کرایہ بھیجا اور اپنے گھر بلوا لیا۔ وہ جب آئی تو پورے دنوں پر تھی۔ اس نے ایک لڑکی کو جنم دیا اور پھر زندہ نہ رہ سکی۔

گھر میں مجھے سب نے کھلایا تھا۔ دادا نے گھٹنوں پر بٹھا کر اور بڑے چچا نے تیر کمان کے کھیل سکھلا کر۔ اب میں اپنے لال بالوں میں جب کنگھی کرتی ہوں تو سب کچھ یاد آ جاتا ہے۔

دادی جان کی موت اپنے خاوند کی موت سے کئی برس بعد ہوئی ہے۔ آج دادی کو دفنا کر آئے ہیں۔ قصبے سے باہر دادا جان کی قبر کے پاس۔ روایت کے مطابق کیا گیا تھا۔ سوچ رہی ہوں، بھوت اگر واقعی ہوتے ہیں تو دادی رات کو اس قبر میں سے نکل کر چودہ میل دور ٹوٹی چٹان کی طرف ضرور آئے گی۔ وہاں جہاں رحیم دادا کی قبر ہے۔

- تجربات اور معلومات بڑھانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہو تاکہ تمھاری کشتیٔ حیات ساحلِ مراد سے ہمکنار رہو۔ (ہربرٹ اسپنسر)
- جب کسی کام کا ارادہ کرو تو یہ سمجھو کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ (سیاپہین)
- آنکھیں خوش ہوتی ہیں اور خوش سیرت عورت کو دیکھنے سے دل مسرور ہوتا ہے۔ (سموئیل)
- جو محنت و مشقت کا عادی ہے وہ کبھی فاقہ کشی میں مبتلا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ محنت و مشقت کرنے والے کے گھر میں فاقہ کشی باہر سے جھانکتی ہے، اندر نہیں آسکتی۔ (والیٹر)

دادی مر گئی ہیں لیکن کہانی چٹان بن کر زندہ ہے۔ گاؤں کے لوگ جب کسی کو راہ بتاتے ہیں تو کہتے ہیں ——— رحیم کی چٹان سے جنوب کی طرف مڑ جائیں۔ ———!!

(آسٹریلوی کہانی کا آزاد ترجمہ)

غزلیں

دیپک چودھری ایم۔ اے

آل کا اپنا جان کر یہ زندگی سونپی تو ہے
کیا وہ فرمائیں علاجِ دردِ ہستی دیکھئے

اپنے خالق اور اپنی عاقبت کو بھول کر
بہ سنگِ دنیا بنا، انساں کی پستی دیکھئے

مانتا ہوں میں غرورِ حسن بھی ہے ایک چیز
میری آنکھیں بھی تو ہیں کب سے ترستی دیکھئے

دیکھی ہیں آباد ہوتی بستیاں اُجڑی ہوئی
کیسے بستی ہے دلِ ویراں کی بستی دیکھئے

زندگی کی تلخیوں کو نذرِ جام کریں
ہے اگر پینا تو پھر مہنگی نہ سستی دیکھئے

زندگی کو کھیل سمجھا آپ نے دیپک مگر
زندگی کیسے شکنجے میں ہے کستی دیکھئے

آزاد گورداسپوری بی۔ اے

جو لگاتے رہتے ہیں الزام ہنستے بولتے
اُن سے کیوں ہم اے دلِ ناکام ہنستے بولتے

جو چمن کے واسطے قربان کر دیں زندگی
وہ بسر کرلیں گے زیرِ دام ہنستے بولتے

کثرتِ رنج والم نے تلخ کر دی زندگی
ورنہ ہم بھی اے دلِ ناکام ہنستے بولتے

کون تھا رنج والم میں غمگسارِ زندگی
کس سے تیرے عاشقِ ناکام ہنستے بولتے

احترامِ ساقیٔ محفل ہمیں منظور ہے
ہم اُٹھا لیتے ہیں خالی جام ہنستے بولتے

دل نہ ہوتا مبتلائے غم تو پھر اُن کی طرح
ہم بھی اے آزاد صبح و شام ہنستے بولتے

اختر واصفی

اُٹھے نہ اس اُمید پہ ہم اپنے ہی در سے
بھولے ہی سے شاید کبھی گذریں وہ اِدھر سے

بے پردہ نہ جانا کہیں اب لوگ بھی تم کو
اے جانِ جہاں! دیکھتے ہیں میری نظر سے

شعلے کی طرح دل میں بھڑکتا ہے شب و روز
وہ اشک جو ٹپکا نہ کبھی دیدۂ تر سے

پہنائے گا اک روز اُنہیں تاج زمانہ
جو لوگ نظر آتے ہیں اب خاک بسر سے

جب عیب و ہنر ہی میں نہیں کوئی تفاوت
پھر فائدہ اے دوست! یہاں عرضِ ہنر سے

ٹھکرائے زمانہ اُسے اِس کی نہیں پروا
ہاں تم نہ گرانا کہیں اختر کو نظر سے

اخلاق سہسوانی

کوششِ ضبط بھی ناکام ہوئی جاتی ہے — خامشی بھی مری بدنام ہوئی جاتی ہے
روئے انور پہ یہ بکھری ہوئی زلفیں، توبہ — جیسے ہنگامِ سحر شام ہوئی جاتی ہے
آؤ اب حسن کے معیار کو اُونچا کرلیں — نعمتِ عشق بہت عام ہوئی جاتی ہے

ہے خطا کس کی کسی کو نہیں معلوم اخلاق
صرف الفت مری بدنام ہوئی جاتی ہے

—— گووند راجن سکریٹری، وزارت صحت، خاندانی منصوبہ بندی و شہری ترقی

خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کی اہمیت

بھارت کی آبادی کا مسئلہ دیگر تمام مسئلوں کا محور ہے اور یہ ایک ایسا سنگین مسئلہ ہے جو کسی وقت بھی مُلک کے لئے تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ ہماری وزیرِ اعظم کا کہنا ہے کہ آبادی میں اضافے کا مطلب ہے کم ترقی اور زیادہ مسائل۔ اگر ہم اس مسئلے کو حل کر لیتے ہیں تو ہماری منصوبہ بندی بھی کامیاب ہوگی اور ہمارے مُلک کا مستقبل یقینی طور پر مستحکم ہو جائے گا۔

ہماری آبادی دن دُونی رات چوگنی بڑھ رہی ہے لیکن مُلک کے وسائل میں اِسی رفتار سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے اور اس کے سبب سے ہر شخص کو حاصل ہونے والی سہولیاتِ زندگی کی فراہمی میں کمی ہوتی جائے گی، لیکن بھارت کے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام پر صرف وسائل کے زاویۂ نگاہ ہی سے نہیں بلکہ مُلک کی سماجی، ثقافتی، انتظامی صورتِ حالات اور مواصلاتی ذرائع کی فراہمی کو بھی دھیان میں رکھ کر غور کیا جانا چاہیئے۔

مُلک کی سماجی اور ثقافتی صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کی اہمیت یہ ہے کہ یہ عوام کے رجحان اور رویے میں لازمی طور پر تبدیلی لائے گا۔ اِس لئے سماج میں ایسی تبدیلی آنی چاہیئے کہ لوگ چھوٹے کُنبے کو ہی پسند کریں اور خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر فطری انداز میں عمل کرنے لگیں۔ اِس طرح تاریخ میں پہلی بار ہمارے مُلک میں فرد کے ذاتی عمل اور رویے پر کُھلے عام غور و خوض اور بحث کی جا رہی ہے اور لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ انفرادی رویّہ کا سماج پر کیا اثر پڑتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ صحت اور سماجی بہبود کا وسیع پروگرام نہ صرف ضروری ہے بلکہ ممکن اور قابلِ عمل بھی ہے۔

اِس کا پتہ اِس بات سے بھی چلتا ہے کہ پہلے مریض کو طبّی سہولیات کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا تھا لیکن موجودہ طبّی خدمات اور صحت سے متعلق چلتے پھرتے اور عوامی پروجیکٹوں کا نصب العین یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مریض ہو، اُس کا علاج کیا جائے اور اُسے تندرست رکھا جائے اور یہ ادارے اِسے سماجی ضرورت اور اپنی ذمّے داری سمجھتے ہیں۔ دُور دراز کے علاقوں میں بہتر طبّی سہولیات فراہم کر کے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اِس طرح طبّی اور صحت عامہ کی خدمات کے طریقۂ کار اور پالیسی میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔

تعلیم اور ترغیب دہی

خاندانی منصوبہ بندی کا ایک دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ پروگرام عوام کے جذبات کو دھیان میں رکھ کر چلایا جانا چاہیئے۔ لہٰذا اِس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے عوام کو تیار کرنا ضروری ہے اور اِس طرح عوامی تعلیم اور عام ترغیب دہی کو اِس تمام پروگرام کا اہم جزو ہونا چاہیئے۔

جِس پروگرام کا تعلق عوامی جذبات سے ہو اُسے چلانے کے لئے مختلف زمروں کے کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک طرف تو اِس پروگرام کو چلانے کے لئے مناسب تعداد میں ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور نرسیں چاہئیں اور دوسری طرف سماجی سائنسدانوں کی ضرورت ہے، جس سے متعلقہ پروگرام کو عوام کے جذبات اور اُن کی قدروں کو دھیان میں رکھ کر چلایا جا سکے۔ پروگرام میں ڈاکٹر اور سماجی سائنسدانوں کو آپس میں مل کر اور ایک دوسرے کے تعاون سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اِس طرح خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام باہمی تعاون سے کام کرنے والے کارکنوں کی ایک ٹیم تیار کرنے میں کامیاب ہوا ہے، جو بھارت کی عوامی زندگی میں ایک نئی چیز ہے۔

عوامی رابطے کے نئے وسیلے

سب جانتے ہیں کہ عوامی رابطے کے جدید وسائل کے ذریعے سے صرف ۲۰ فیصد لوگوں تک ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ مُلک کے مختلف حصّوں میں اب بھی ریل اور سڑکوں سے متعلق نقل و حمل کے ذرائع کا معقول بندوبست نہیں ہے، لیکن خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے تحت ایسا بندوبست کیا جا رہا ہے، جس سے مُلک کے چھ لاکھ گاؤں اور تین ہزار شہروں کے کونے کونے میں رہنے والے لوگوں سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔

خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام مُلک کے کونے کونے میں پہنچانے

کے لئے لوک کلا اور لوک سنگیت کے مختلف وسیلوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ اِس کے پیچھے یہ مقصد ہے کہ ملک بھر میں سنگیت، کٹھ پتلی کے کھیل اور ناٹکوں کی قدیم روایت بہت عام رہی ہے۔ ہم انہیں وسیلوں کا سہارا لیتے ہیں جن کے تئیں لوگوں میں عام دلچسپی پائی جاتی ہے۔

اِس طرح خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے ذریعے سے لوک کلاؤں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی ہے جو ملک کی ثقافت اور کلا کے فروغ میں کافی معاون ثابت ہوگا۔

اقتصادی فائدہ

یہ دُکھ کی بات ہے کہ صحت اور سماجی بہبود کے پروگرام سے ہونے والے اقتصادی فائدوں کے اعداد منتظمین اور منصوبہ بندی کے ذمّے داروں کو نہیں بھیجے جاسکے۔ لیکن خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے تحت ایسی کوشش کی جارہی ہے کہ اِس کے نشانے مقرّرہ مدّت کے اندر پُورے ہوں اور متعلّقہ پروگرام کے ذریعے سے کارکنوں، ماہرین و صنعتی اداروں کو ہونے والے فائدوں کو واضح کرنے کے لئے مطالعے کئے جائیں۔ اگر ہم ایسا کرسکے تو یہ ایک تاریخی واقعہ ہوگا۔

خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام ملک کا انتہائی حوصلہ مندانہ پروگرام ہے، کیونکہ اِس سے عوام کی خوشحال زندگی کی اُمید وابستہ ہے۔ اگرچہ متعلّقہ پروگرام کا نشانہ وسیلوں کی مساوی تقسیم کرکے ملک کے صنعتی اور زرعی پیداوار کی رفتار کو تیز کرنا ہے، لیکن ہم اِس نشانے کو فی الفور نہیں حاصل کرسکتے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ دھیان میں رکھنی چاہئے کہ عوام کے جذبات سے وابستہ پروگراموں کو جادو کی طرح نہیں چلایا جاسکتا۔ ان میں دلچسپی لینے کے لئے عوام کو ترغیب دینے میں کئی برس لگ جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ تمام وسیلوں کے استعمال کے باوجود ہم شرحِ پیدائش کو نصف کردینے کے نشانے کو دس برس سے قبل پُورا نہ کرسکیں گے۔ لیکن ہمیں اعداد اشاریہ ضرور تیار کرنا چاہئے جس کی بنیاد پر ہم وقتاً فوقتاً متعلّقہ پروگرام کی کامیابی کا جائزہ لے سکیں۔

ایک چیلنج

خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام ہمارے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کی کامیابی پر ہی ہم ایک خوش حال اور ترقّی پذیر ملک کی تعمیر کرسکیں گے اور متعلّقہ پروگرام کے ناکام ہونے پر ہم مسلسل دُشواریوں کا سامنا کریں گے۔ مجھے اِس پروگرام سے وابستہ کارکنوں اور عوام پر پُورا اعتماد ہے جن کی انتھک محنت اور مفید تعاون کے سہارے پر ہم اِس پروگرام کو کامیاب بناسکیں گے۔

مدیرِ بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہوسکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

ناردرن ریلوے

نوٹس

یکم اکتوبر 1969ء سے ٹائم ٹیبل پر تمام نظرِ ثانی کی جائے گی۔ چند اہم خصوصیات ذیل میں درج ہیں:۔

(1) گاڑیاں جو جاری کی گئیں

فازی آباد اور نئی دہلی کے درمیان ایک نئی گاڑی مندرجہ ذیل اوقات پر چلا کرے گی:۔

(اے)	8.45 بجے	روانگی	غازی آباد	آمد	11.5 بجے
	9.37 بجے	آمد	دہلی	(براستہ گال)	
	9.40 بجے	روانگی			
	9.50 بجے	آمد	نئی دہلی	روانگی	9.52 بجے

ایک اور گاڑی سادل پور اور ہنومان گڑھ کے درمیان مندرجہ ذیل اوقات پر چلا کرے گی:۔

(بی)	17.20 بجے	روانگی	سادل پور	آمد	6.50 بجے
	22.00 بجے	آمد	ہنومان گڑھ	روانگی	1.15 بجے

(2) گاڑیاں جن کی رفتار بڑھا دی گئی

28 گاڑیوں کی رفتار تیز کر دی گئی ہے جو 5 منٹوں سے 60 منٹوں تک ہے۔

(3) نئے سٹاپیج جو مہیا کئے گئے

گاڑی نمبرز	نام سٹیشن جہاں سٹاپیج مہیا کئے گئے
(i) 3 اے ایف / 4 اے ایف	رام گنج
(ii) 353 اَپ	سورانسی
(iii) 2 ڈی جے پی	گاندھرا
(iv) 1 بی ڈی ایف / 4 بی ڈی ایف	بسی دھن کوٹ
(v) 1 بی ڈی ایس	جتولا جوڑی ساہپکا
(vi) 98 ڈاؤن	اَترالیح
(vii) 1 بی ڈی ایف	شاہ آباد محمد پور
(viii) 2 ایل سی	اموسی
(ix) 1 آر سی	رامچندرا پور
(x) 3 ایم ڈی	سہیاباد

(4) سٹاپیج جو کینسل کیے گئے

گاڑی نمبر	نام سٹیشن جہاں سٹاپیج کینسل کر دیے گئے
(i) 51 اپ / 52 ڈاؤن	ظفرآباد
(ii) 4 اے کے / 5 اے کے۔ 7 اے کے / 10 اے کے	دکھنوارن
(iii) 1 اے اے / 3 اے اے۔ 6 اے اے / 8 اے اے	گورو سرسٹلانی
(iv) 2 اے ایف / 5 اے ایف	رام گنج
(v) 344 ڈاؤن	گاندھرا

(5) نئی گاڑیوں کے اوقات

(اے) براڈ گیج

1 آر سی	3.45 بجے	روانگی	رائے بریلی	2 آر سی	آمد	23.40 بجے
	10. بجے	آمد	کانپور		روانگی	17.05 بجے
1 سی سی ایم	2.45 بجے	روانگی	چوپان	2 سی سی ایم	آمد	21.45 بجے
	8.10 بجے	آمد	مرزاپور		روانگی	18.40 بجے
1 سی سی جی	11.45 بجے	آمد	چونار	2 سی سی جی	روانگی	14.35 بجے
2 ٹی ایف	5.30 بجے	روانگی	ٹونڈلا			
	10.45 بجے	آمد	فرخ آباد			
331 اپ	5.45 بجے	روانگی	نئی دہلی			
13 اپ	11.15 بجے	آمد	دہلی			

(بی) میٹر گیج

207 اپ	21.50 بجے	روانگی	پھلیرا	208 ڈاؤن	آمد	6.35 بجے
	6.30 بجے	آمد	جودھپور			
96 ڈاؤن	4.00 بجے	روانگی	میرٹا روڈ			
	8.20 بجے	آمد	بیکانیر			
95 اپ	8.00 بجے	روانگی	جودھپور			
	10.45 بجے	آمد	مارواڑ			
209 اپ	10.00 بجے	روانگی	پھلیرا	210 ڈاؤن	آمد	17.15 بجے
	19.55 بجے	آمد	جودھپور		روانگی	8.10 بجے
	20.55 بجے	روانگی	جودھپور		آمد	7.20 بجے
	0.35 بجے	آمد	مارواڑ		روانگی	3.45 بجے
1 جے ڈی پی	5.50 بجے	روانگی	پھلیرا	2 جے ڈی پی	آمد	22.30 بجے

			ڈیگانہ		روانگی	13.00 بجے
1 جے جے بی	8.40 بجے	روانگی	جودھپور	2 جے جے بی	آمد	12.35 بجے
	15.45 بجے	آمد	باڑمیر		روانگی	6.10 بجے
2 جے ایس بی	3.05 بجے	روانگی	بھیلڑی			
	9.50 بجے	آمد	سمداری			
1 جے جے ایم	10.20 بجے	روانگی	جودھپور			
	13.45 بجے	آمد	مارواڑ			
1 جے آر ایم	17.45 بجے	روانگی	رتن گڑھ	2 جے آر ایم	آمد	10.00 بجے
	0.15 بجے	آمد	میڑتا روڈ		روانگی	3.30 بجے
1 جے پی جے	18.20 بجے	روانگی	جیسلمیر	2 جے پی جے	آمد	10.50 بجے
	22.35 بجے	آمد	پوکران		روانگی	6.40 بجے
4 جے ایم ایم	10.00 بجے	روانگی	میڑتا روڈ	3 جے ایم ایم	آمد	11.37 بجے
	10.32 بجے	آمد	میڑتا سٹی		روانگی	11.05 بجے
2 جے پی بی	4.45 بجے	روانگی	پیپر روڈ	3 جے پی بی	آمد	9.20 بجے
	6.45 بجے	آمد	بیلارا		روانگی	7.25 بجے
4 جے بی پی	13.10 بجے	روانگی	بلوترا	3 جے بی پی	آمد	19.00 بجے
	15.30 بجے	آمد	پچ پادرا سالٹ ڈپو		روانگی	17.30 بجے

(6) ایئر کنڈیشنڈ اکموڈیشن

(اے) 41 اپ/42 ڈاؤن مسوری ایکسپریس گاڑیاں ایکس دہلی سے مورخہ 16/10/68 سے اور ایکس ڈیرہ دون سے مورخہ 17/10/68 سے ایئر کنڈیشنڈ اکموڈیشن واپس لے لی جائیں گی۔

(بی) 93 اپ/94 ڈاؤن جودھپور میلز میں ایکس دہلی بروز سوموار اور شکروار اور ایکس جودھپور بروز اتوار اور ویروار ایئر کنڈیشنڈ اکموڈیشن ہفتہ میں دو بار (بجائے ہفتہ میں تین بار) مہیا کی جائیں گی۔

(7) تھرو/سیکشنل کیریجز کی رننگ

دلّی اور کالکا کے درمیان ایک فرسٹ کلاس کوچ 1 اپ/2 ڈاؤن میل کی بجائے تھرڈ کلاس کوچ لگایا جائے گا۔

بالتفصیل اطلاعات متعلقہ گاڑیوں کے اوقات رائج کرنا اور تھرو/سیکشنل کیریجز کی منسوخی اور گاڑیوں میں اکموڈیشن کی کلاسیفیکیشن کی ایڈجسٹمنٹ وغیرہ کے لئے اکتوبر 1968ء کا ٹائم ٹیبل ملاحظہ فرمائیں جو بڑے بڑے سٹیشنوں پر ریلوے بکنگ/ریزرویشن/انکوائری آفسز اور بک سٹالوں پر قیمتاً دستیاب ہے۔

چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ

E.O.30

بچّوں کی پیدائش میں وقفہ

موجودہ دور خلائی تلاش کا ہے۔ انسان کو کسی روز چاند تک پہنچ جانے کی امید ہے۔ زمین پر زیادہ آبادی کا بوجھ ہے دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی انسانی کوشش کی اصل وجہ نہ ہو لیکن اگلی صدی کے آغاز کے ساتھ انسانوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جانے کے خطرے کے پیشِ نظر یہ عین ممکن ہے کہ اسی سبب سے انسان اپنے موجودہ سیارے کو چھوڑنے کی خواہش کرنے لگے۔

آبادی میں اضافہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ لیکن ترقّی پذیر مُلکوں کے لئے وہ زیادہ سنگین ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۱ء میں بھارت کی آبادی ۳۶ کروڑ تھی۔ لیکن پندرہ برس کے عرصے کے اندر ۱۹۶۶ء میں وہ ۵۰ کروڑ سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ اِس وقت بھارت کی آبادی اندازاً ۵۲ کروڑ ہے اور ۲۰۰۰ء تک اُس کے ایک سو کروڑ تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔ دیگر الفاظ میں پچاس برس کے اندر آبادی لگ بھگ تین گُنا بڑھ جائے گی۔

تعداد میں اِس بے تماشہ اضافے کو جو پچھلے کئی برسوں کی ترقّیاتی کوششوں کے تمام نتائج کو زائل کرتا جا رہا ہے۔ روکنے کی غرض سے بھارت سرکار نے خاندانی منصوبہ بندی کے ہر قسم کے سائینٹیفک طریقے اختیار کر کے شرحِ پیدائش کو کم کرنے کا کام شروع کیا ہے۔

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر بھارت میں تمام شادی شُدہ لوگ تین یا اس سے زیادہ بچّے پیدا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیں تو موجودہ شرحِ پیدائش فی ہزار ۴۱ سے کم ہو کر ۲۵ رہ جائے گی۔ یہ اندازہ اِس سیدھے سے حساب پر مبنی ہے کہ اِن ۴۱ میں سے پہلے درجے کی پیدائش نو ہوتی ہیں۔ دوسرے اور تیسرے درجے کی آٹھ اور چوتھے درجے اور اس سے زیادہ درجے کی پیدائشیں ۱۶ ہوتی ہیں۔ لہٰذا اگر تمام جوڑوں کے یہاں صرف ایک بچّہ ہو تو شرحِ پیدائش ۹ ہوگی۔ اگر اُن کے دو بچّے ہوں تو شرحِ پیدائش ۱۷ ہوگی اور اُن کے تین بچّے ہونے کی صورت میں یہ شرح ۲۵ ہو جائے گی۔

بھارت کے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کا مقصد ۷۶-۱۹۷۵ء تک شرحِ پیدائش کو ۲۵ تک اور ۱۹۷۸ء تک ۲۳ تک لانا ہے۔ اِس نشانے کو اُس صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے اگر لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کریں ــــــ یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ اگر لڑکیوں کی بیس برس اور لڑکوں کی پچیس برس کی عمر کے بعد شادی ہو تو اگلے دس برسوں میں شرحِ پیدائش کم ہو کر ۱۵ تک رہ جائے گی۔ اِس سے یہ فائدہ ہوگا کہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی تعلیم پوری کر لیں گے اور والدین کے فرائض انجام دینے کے لئے جسمانی اور نفسیاتی طور پر زیادہ بہتر حالت میں ہوں گے۔ ایسی دماغی اور جسمانی پختگی تعلیم کے ساتھ مل کر بذاتِ خود چھوٹے کنبوں کا موجب ثابت ہوگی۔ جائزوں سے پتہ چلا ہے کہ تعلیم یافتہ عورتوں کے کنبوں کے افراد کی تعداد کم ہے۔ لیکن شرحِ آبادی کو کم کر کے آبادی میں اضافے کا مسئلہ محض تین یا اس سے زیادہ بچّے پیدا نہ کرنے سے حل نہیں ہو سکتا۔ اِس بات کا دھیان بھی رکھا جانا چاہیے کہ بچّوں کی عمر کے درمیان مناسب وقفہ ہو تاکہ ماں کو اپنی صحت بحال کرنے کے لئے کافی وقت مل جائے اور بچّے کو اپنی نشو و نما کے لئے درکار ضروری محبت، شفقت اور غذا میسّر ہو سکے۔ غذائی معاملوں کے ماہرین کا خیال ہے کہ اگر پہلے چند برسوں میں بچّے کی صحیح نشو و نما نہیں ہوتی تو اِس سے اُس کی دماغی اور جسمانی ترقّی پر بُرا اثر پڑے گا۔

جائزوں سے پتہ چلا ہے کہ لوگ عام طور پر تین ہی بچّے چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کے بچّوں کی تعداد اِس سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اِس بات کی وجہ کہ اُن کے بچّے اُن کی خواہش سے زیادہ کیوں ہو جاتے ہیں، یہ ہے کہ انھیں اِس بات کا علم نہیں کہ وہ محض اتفاق سے نہیں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق بچّے پیدا کر سکتے ہیں اور کہ اِس مقصد کے لئے انھیں سہولیات دستیاب ہیں۔

مثال کے طور پر نیا شادی شُدہ خاوند "نرودھ" کو استعمال کر کے پہلے بچّے کی آمد کو کچھ عرصے کے لئے روک سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ بچّہ پیدا ہو جانے کے بعد ماں لُوپ کا استعمال کر سکتی ہے جو اُسے اگلے بچّے کی آمد کچھ عرصے کے لئے روکنے میں مدد دیتا ہے۔ دو یا تین بچّوں کے بعد خاوند یا بیوی نس بندی کا آپریشن کروا سکتا ہے۔ یہ بہت آسان اور محفوظ آپریشن ہے اور یہ مفت کیا جاتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی سہولیات اب سارے مُلک میں دستیاب ہیں اور اِن سہولیات کی حصول کے مقاموں کا نیچے کی طرف جھکی ہوئی لال تکون سے بآسانی پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ اِن سہولیات کا فائدہ اُٹھانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جیسا کہ بھاری تعداد میں لوگ اِس وقت کر رہے ہیں اور اپنے بچّوں کی تعداد تین تک محدود رکھتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے درمیان تین برس کا وقفہ ہو تو وہ مُلک کی شرحِ پیدائش کم کرنے اور قوم کو اقتصادی ترقّی کی راہ پر لے جانے میں صحیح معنوں میں مدد دے سکتے ہیں۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، سماجی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں جن کا تعلق تہذیب سے گرا ہوتا ہے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

اقبال الیاسی اقبال ٹوکی۔ ٹونک

س۔ گلاب کا پھول اتنا خوبصورت کیوں سمجھا جاتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ سارے پھولوں سے خوبصورت ہوتا ہے۔ اسی لئے خوبصورت ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

س۔ شراب اور شباب؟

ج۔ اگر قابو نہ رکھا جائے تو دونوں کا نشہ تباہ کن ہوتا ہے۔

س۔ سب سے اچھا جیون ساتھی؟

ج۔ جو زندگی کے ہر موڑ پر، زندگی کی ہر منزل میں ہنستے مسکراتے ہوئے ساتھ دے۔

محمد حسین فائق جیاگوڑہ حیدر آباد دکن

س۔ صبر کا پیمانہ کب لبریز ہوتا ہے؟

ج۔ جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

س۔ دوست کا احسان کب وبالِ جان ہوتا ہے؟

ج۔ جب وہ احسان کر کے احسان جتاتا ہے یا کوئی چھوٹا سا احسان کر کے بڑا طعنہ دیتا ہے یا اس سے بہت بڑا بدلہ چاہتا ہے۔

ریاض احمد قادری۔ رامپور

س۔ بھائی جان! کچھ اچھی باتیں بتایئے۔

ج۔ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے۔ 'میانہ روی میں آدھی روزی اور حسنِ خلق میں آدھا ایمان ہے' حضرت غوثِ پاکؒ کا ایک اور ارشاد ہے: 'بدتر دشمن تمھارے برے ہمنشیں ہیں' بقراط نے کہا ہے: 'بدن کا معالجہ ممکن ہے لیکن دل پر جو میل جم جاتا ہے اس کا زائل ہونا دشوار ہے۔'

ناظمہ خاتون۔ آڑھا گیا

س۔ بیوی اور شوہر کے فرائض کیا ہیں؟

ج۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں۔ کبھی ایک دوسرے کے جذبات کو مجروح نہ کریں۔

س۔ اگر شوہر بیوی کی طرف سے غفلت برتے تو بیوی کا کیا فرض ہونا چاہیئے۔

ج۔ ضبط و تحمل سے شوہر کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

س۔ اگر شوہر اپنی شریکِ حیات پر شک کرے تو بیوی کو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ خلوص و محبت سے اس کا شک دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

محمد یٰسین عباسی مراد آباد

س۔ بھارت امن پسند ملک ہے پھر بھی پنجاب اور بنگال میں اتنے بڑے پیمانے پر فسادات کیوں؟

ج۔ اچھوں میں برے بھی ہوتے ہیں۔

س۔ انسان انسان کو کب پہچانتا ہے؟

ج۔ جب ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ جب دل کی آنکھیں کھلتی ہیں۔

محمد شعیب۔ دربھنگہ

س۔ زندگی کیا ہے سزا یا انعام؟

ج۔ یہ انسان کے علم و عمل پر موقوف ہے۔ اپنی زندگی کو سزا بنا لے یا انعام؟

بیسویں صدی دہلی

نصیر احمد قریشی۔ احمد آباد

س۔ عورت پر کب تک بھروسہ کیا جاتا ہے؟

ج۔ جب تک عقل ساتھ نہیں چھوڑتی!

س۔ انسان کی ترقی میں روڑا اٹکانے والی کون سی چیز ہے؟

ج۔ احساس کمتری!

محمد فاروق دامدا۔ بھٹکل

س۔ کیا اس طوائف سے شادی کرنا جرم و گناہ ہے جو اپنا مستقبل سنوارنا چاہتی ہو؟

ج۔ یہ مستحسن اقدام ہوگا۔ ہاں اخلاص اور سچائی شرط ہے۔

س۔ کیا ایک اونچے گھرانے کے لڑکے کا کسی غریب لڑکی سے دوستی کرنا برا ہے؟ اگر نہیں، تو لوگ طعنہ کیوں دیتے ہیں؟

ج۔ ایسے لوگ تنگ دل اور تنگ خیال ہوتے ہیں۔

محمد عمر پہلوان رمضانی۔ عادل آباد

س۔ آپ کو کیا پسند ہے۔ تلخ زندگی، تلخ غم، تلخ جام ——؟

ج۔ تلخ جام کے سوا ہمیں ہر تلخی پسند ہے۔ اس لئے کہ ہم تلخ کو شیریں بنا لینے کا راز جانتے ہیں۔

س۔ کیا زندگی ایک جلتا ہوا چراغ ہے؟

ج۔ زندگی بہت کچھ ہے۔ کسی نے کہا ہے ——

زندگی موج رواں، نکہت گل، رقص شرر

س۔ انسان کو سب سے زیادہ محبت کس سے ہوتی ہے —— اولاد، دولت، عورت، عزت سے؟

ج۔ اولاد سے۔

محمد ظہیر الدین احمد۔ ساری پیٹ (آندھرا)

س۔ کیا عورت کی مٹی شک، غصہ اور آنسو سے گوندھی گئی ہے؟

ج۔ کسی احمق کا یہ خیال ہے —— ٹینی سن نے کہا ہے: "عورت ایک گلاب کی کلی ہے جس میں خود آرائی کا ایک چھوٹا سا کانٹا لگا ہوا ہے۔" ایک دوسرے مفکر موریج نے کہا ہے۔ "عورت عقل کی طرح تیز اور انصاف کی طرح عزیز ہے۔"

س۔ ابھی تک شاعری ٹیکس سے کیوں محفوظ ہے؟

ج۔ یہ ارباب حکومت کی ناقابل معافی فروگزاشت ہے۔

ہدایت علی ساحل۔ جھجری تلیا

س۔ جدید عورت؟

ج۔ جدید مرد سے کہیں زیادہ وفا پرست اور شریف ہوتی ہے۔

س۔ دنیا میں نیک نامی اور شہرت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

ج۔ نیک نامی نیک کام کرکے، نیکی کی راہ پر چل کر حاصل ہو سکتی ہے۔ شہرت برائی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی نے کہا ہے ——

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!

سرور عالم۔ بہار شریف

س۔ آپ نئے افسانہ نگاروں کے افسانے چھاپنے کے لئے کسی بڑے افسانہ نگار کا سفارشی خط کیوں چاہتے ہیں؟

ج۔ یہ آپ سے کس نے کہا۔ اچھی تخلیق اپنی سفارش آپ ہوتی ہے۔ ہم فن پہلے دیکھتے ہیں، فنکار کو بعد میں۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ افسانہ خواب ہے، جو حقیقت کی شکل میں ظاہر کیا جاتا ہے؟

ج۔ آج کا افسانہ خواب نہیں، حقیقت کی تصویر ہوتا ہے۔

س۔ "بیسویں صدی" میں افسانہ بھیجنے کے لئے اسے کس سانچے میں ڈھالا جائے۔ اپنی رائے سے نوازئے۔

ج۔ جیسے افسانے آپ "بیسویں صدی" میں دیکھتے ہیں۔

ششی کلا سنہا۔ علیگڑھ

س۔ انسان چاند پر پہنچنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں زمین سے چاند کتنی دور ہے؟

ج۔ ۲۴۰۰۰۰ میل۔

سید اختر ادیب۔ گیا

س۔ دونوں میں کون زیادہ وطن کی خدمت کرتا ہے، ادیب یا لیڈر؟

ج۔ لیڈر کے مقابلے میں ادیب کس شمار و قطار میں ہے، جو کبھی وزیر بنتا ہے نہ منسٹر!

س۔ انسان جنگ کے ہولناک نتائج جاننے کے باوجود برسرِ پیکار کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ دانستہ فریب کھاتا ہے!

س۔ ترقی کی راہیں کب مسدود ہو جاتی ہیں؟

ج۔ جب انسان کی نظر محدود ہو جاتی ہے، جب اُس کا خیال محدود ہو جاتا ہے۔

احمد حسین گوہر۔ گریڈیہہ۔ بہار

س۔ محبانِ اُردو کب تک خاموش رہیں گے؟

ج۔ جب تک اُن میں حسین و خوش آئند فریب کھانے کا حوصلہ باقی رہے گا!

س۔ کیا ہر تاریکی کے بعد روشنی لازمی ہے؟

ج۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔

س۔ زندگی میں اگر سوز نہ ہو تو؟

ج۔ زندگی میں سوز نہ ہو تو زندگی بےکیف ہوتی ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

فراغِ سازِ مسرت کے ڈھونڈنے والے
شبوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا

محمد رفیق پٹھان۔ بمبئی

س۔ زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرنے والا بہادر کہلائے گا یا بزدل؟

ج۔ بزدل!

س۔ آدمی کے دل کی بات معلوم کرنے کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟

ج۔ کہتے ہیں چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ لیکن چہرے کے آئینے میں انسان کا دل دیکھنے کے لئے دیدۂ بینا شرط ہے۔

عبدالرؤف بجلی۔ کٹانور

س۔ اُردو کے ساتھ ہندوستان میں سوتیلی بیٹی کا سا سلوک کیوں ہو رہا ہے؟

ج۔ یہ حُسنِ سلوک کیا کم ہے کہ اُردو بولنا جُرم و گناہ نہیں قرار دے دیا جاتا!

س۔ ظفر کا کوئی پُر درد شعر سُنایئے۔

ج۔ ہجومِ یاس سے گھبرا گیا ہوں
مجھے اے زندگی دیوانہ کر دے

ایس۔ ایس علی۔ نظام آباد (آندھرا)

س۔ دروغ گو انسان کا انجام؟

ج۔ عبرت ناک ہوتا ہے۔

س۔ اگر طلباء اپنے مقصد یعنی حصولِ تعلیم سے غافل ہو کر نام نہاد لیڈروں کے آلۂ کار بن جائیں تو اُن کے مستقبل کا کیا ہوگا؟

ج۔ تاریک!

س۔ فیشن پرستی کی انتہا بے حیائی ہے تو فرقہ پرستی کی انتہا کیا ہے؟

ج۔ مُلک کی تباہی!

گوپال سنگھ۔ کلکتہ

س۔ نظم میں حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی میں کس کا مرتبہ بلند ہے؟

ج۔ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے!

ناز مصطفےٰ آبادی۔ رامپور

س۔ محبت کیا ہے، عبادت یا گناہ؟

ج۔ اچھائیوں سے محبت کرنا عبادت ہے۔ بُرائیوں سے محبت کرنا گناہ ہے۔

س۔ تکمیلِ آرزو؟

ج۔ جو لوگ صرف آرزو کرتے ہیں لیکن اُس کی تکمیل کے لئے جد و جہد نہیں کرتے وہ کبھی تکمیلِ آرزو کے خواب کی تعبیر نہیں دیکھتے۔

محمد مصطفےٰ خلیفہ۔ ویلور

س۔ میں شاعر بننا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا تخلص بتایئے جو کسی کا نہ ہو۔

ج۔ تخلص فرسودہ رسم ہے۔ آپ کو انفرادیت کا شوق ہے تو ایسے اشعار کہیے، جیسے کسی نے نہ کہے ہوں۔

س۔ دل...؟

ج۔ اگر تو پھر کبھی دُنیا بنائے
تو اے اللہ دل پیدا نہ کرنا

س۔ اگر اس جہان میں غم نہ ہوتا...؟

ج۔ ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں

نکہت آرا۔ لکھنؤ

س۔ کوئی خوبصورت قطعہ سُنایئے۔

ج۔ سُنیے ؎

ایک معصوم سی اُداس کلی
اِس طرح دیکھتی ہے پھولوں کو
کھوکھلے قہقہوں کے جھرمٹ میں
جیسے اِک پُر خلوص آنسو ہو

رفیعہ شبنم زیدی۔ حیدرآباد دکن

س۔ بھائی جان! "قوسِ قزح" صحیح ہے یا "قوسِ قزح"؟

ج۔ قوسِ قزح صحیح ہے۔

انیس آفاق جبین منزل نزد عادل آباد

س۔ زندگی کیا ہے ـــــ موت کیا ہے؟

ج۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

س۔ کسی کی ناکامی پر ہنسنا؟

ج۔ اپنی ناکامی پر دوسروں کو ہنسنے کی دعوت دینا ہے۔

انیس واعظ احمد۔ علی گڑھ

س۔ ایک کامیاب زندگی کا دار و مدار اگر ختم ہو جائے تو؟

ج۔ جب بھی مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہئے ـــ اُمید وقت کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

س۔ کوئی زندگی اور جدّ و جہد دونوں سے تنگ آجائے تو؟

ج۔ اُن لوگوں سے زندگی کا سبق سیکھے جو زندگی کی آخری دھڑکنوں تک زندگی اور جدّ و جہد سے تنگ نہیں آتے۔

س۔ اختر شیرانی کا کوئی رنگین شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

یوں تو ہر در پہ لپکتے نظر آئے دامن
کھینچتے ناز سے جس کو وہی داماں نہ ملا

ایم سلیم بزمی۔ آسنسول

س۔ اگر انسان دُور بینی کو نظر انداز کر دے تو کیا وہ عیش جاوداں حاصل کر سکتا ہے؟

ج۔ ایں خیال است و محال است و جنوں!

عثمان خاں۔ کلکتہ

س۔ وہ کون سی زبان ہے جسے دُنیا میں دوسرا درجہ حاصل ہے؟ اور ہندی کا درجہ کیا ہے؟

ج۔ ساری دُنیا میں بولی جانے والی ۳۲ ہزار زبانوں میں دوسرا درجہ چینی زبان کا اور تیسرا درجہ اُردو کا ہے۔ ہندی کا درجہ اِن کے بعد کوئی درجہ ہوگا۔

س۔ وقت کے ہاتھوں انسان کب مجبور ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب حوصلے کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

وہاب سعیدی۔ بمبئی کاپر آتینس

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ سنہرا لمحہ ہے، ہر موقع سنہرا موقع ہے۔

ج۔ جی ہاں۔

س۔ انسان ہر دن، ہر لمحہ نئی سے نئی چیزیں دیکھنے کا متمنی کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ انسان جدّت پسند ہے۔

خواجہ عظیم الدین چشتی۔ بھونگیر

س۔ عقلمند کبھی بے وقوفوں کی سی باتیں کرے تو؟

ج۔ تو اُسے بے وقوفوں کا سردار بنا دینا چاہئے۔

عبدالمجید خاں۔ برہانپور

س۔ خوشتر بھیا! سیاست سچائی سے دُور کیوں ہوتی جا رہی ہے؟

ج۔ ہر دَور میں سیاست سچائی سے بہت کم قریب رہی ہے۔ لیکن اِس دَور میں تو بہت دُور ہو گئی ہے۔

س۔ خوشتر بھیا! سیاست کے فوائد!

ج۔ اہلِ سیاست کے لئے سیاست کے بے شمار فوائد ہیں، لیکن دوسروں کے [illegible] تکلیف دہ دردِ سر ہے۔

س۔ ساغر نظامی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ یہ میکدہ ہے، ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

سید محمد تمیز الدین۔ گیا

س۔ آپ کو خوشتر گرامی کا لقب کب اور کیسے ملا؟

ج۔ اُستادِ گرامی حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی نے خوشتر کو خوشتر گرامی بنا دیا جب کہ وہ ساتویں درجے میں پڑھتے تھے۔

س۔ انسانیت کب ختم ہو جاتی ہے؟

ج۔ انسانیت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ انسانیت ہمیشہ زندہ رہی ہے، ہمیشہ زندہ رہے گی۔

س۔ بہادر شاہ ظفر کا کوئی درد بھرا شعر سنائیے۔

ج۔ ہجومِ یاس سے گھبرا گیا ہوں
مجھے اے زندگی! دیوانہ کر دے

سید آفتاب حسن انجم۔ پترانو

س۔ آج کل کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کا سبب؟

ج۔ ذخیرہ اندوزوں اور نفع خوروں کی مُلک دشمنی ـــــ اربابِ حکومت کی خویش پروری و فرض ناشناسی!

س۔ ہمارے مُلک کے لوگ زراعت و تجارت کرنے سے زیادہ نوکری کرنا کیوں پسند کرتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ ایک سو سال سے بھی زیادہ دنوں تک انگریزوں کی غلامی میں رہ کر اُن کی ذہنیت غلامانہ بن گئی ہے۔

[illegible] ہماری عمروں کی باتیں

[illegible] زیادہ ہوتا ہے یا عورتوں میں؟

ج۔ عورتوں میں۔ مگر عورت کے ایثار سے مرد کے ایثار کا کیا مقابلہ؟

شکیلہ بانو۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! روپے کی قیمت کم ہوتے ہی چیزوں کی قیمت آسمان کو چھونے لگی۔ بھلا آپ بتا سکتے ہیں آج سے بیس سال پہلے چیزوں کی قیمت کیا تھی؟

ج۔ ۱۹۳۹ء میں چاول ایک روپے میں ۱۲ سیر اور گیہوں ۱۵ سیر ملتا تھا۔ چنا ایک روپے میں ۲۰ سیر ملتا تھا۔ گھی ایک روپے کا تین پاؤ تھا۔

مجاہد حسین۔ مراد آباد

س۔ بھائی جان! کوئی ولولہ انگیز شعر سنائیے۔

ج۔ ایک نہیں دو شعر سنئے ؎

اے قلم اب آگ برسا اے قلم شعلے اگل
راکھ کر دینا ہے ظلم و بربریت کا محل
اے مری شعلہ نوائی جوش میں آ جوش میں
قوتِ یزداں ہے تیری آتشِ خاموش میں

حمید اللہ خاں جمیل۔ حیدر آباد دکن

س۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسان میں ضبط کا حوصلہ پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی بھی خواہش، کوئی آرزو اسے تڑپا نہیں سکتی؟

ج۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے — ترکِ آرزو ہی تونگری ہے۔

س۔ خواب کا نفسیاتی فلسفہ کیا ہے؟

ج۔ ان گوشوں میں یہ بتانا ممکن نہیں۔ یہ بہت تفصیل طلب موضوع ہے پھر بھی کچھ مفکرین کے خیالات پیش کئے جا رہے ہیں۔ شوپنہار نے لکھا ہے: "انسان کی طینت اور اس کی طبیعت کا اندازہ اس کے خوابوں سے ہو سکتا ہے۔" ایک دوسرے مفکر ہلڈر برنیٹ نے لکھا ہے: "انسان کی اپنی زندگی جتنی صاف اور پاکیزہ ہوگی، اس کے خواب بھی اتنے ہی زیادہ صاف اور پاکیزہ ہوں گے اور اگر اس کا کردار گھناؤنا اور برا ہوگا تو اس کے خواب اتنے ہی گھناؤنے اور برے ہوں گے۔" ایک مشہور فرانسیسی ماہرِ نفسیات کا بیان ہے۔ "خواب محض یادداشتوں کے ٹکڑے ہیں جو خلط ملط ہو کر سوتے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ بچھڑے اور بھٹکے ہوئے ٹکڑے خواب کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

نور العین لاری بھیرہوا (نیپال)

س۔ بھیا! فیملی پلاننگ —؟

ج۔ طوفان میں تنکے کا پل باندھنا ہے!

س۔ جبکہ وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے رفیع احمد قدوائی مرحوم کی غذائی پالیسیوں کو سراہا تو اپنی وزارت میں اس پر عمل کیوں نہیں کرتیں؟

ج۔ رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!

عبد القیوم صدیقی دربھنگوی چمپارن

س۔ جب ظلم حد سے گزر جائے تو جہاد کرنا چاہئے۔ پھر علمائے دین [illegible] کرتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ علمائے دین [illegible] ملک و قوم کی برائیوں کے خلاف جہاد نہیں کر سکتے، انھیں جہاد کا فتویٰ [illegible]

س۔ میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے اور [illegible] والدین شادی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ آپ اپنا مشورہ دیجئے۔

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے شادی کرنا [illegible]

داؤد علی خاں۔ بادنا پیٹھ۔ حیدر آباد دکن

س۔ خوشتر بھائی! کیا آپ نے کبھی شہر حیدر آباد دیکھا ہے۔ اگر دیکھا ہو تو بتائیے دلی اور حیدر آباد میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا ہے؟

ج۔ یہ روداد بہت طویل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ حیدر آباد حیدر آباد ہے، دلی دلی!

س۔ ہندوستان کے موجودہ ہنگاموں اور خطرناک غذائی بحران کا کیا انجام ہوگا؟

ج۔ عبرت ناک و تباہ کن!

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: ولی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر: برائٹ پریس صدر بازار دہلی —— پتہ: دفتر بیسویں صدی [illegible]

[illegible] تصاری عشق ہی نا ہیں
[illegible] عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے یا
[illegible] عورتوں میں ؟

ج۔ عورتوں میں۔ عورت کے ایثار سے مرد کے ایثار کا کیا مقابلہ ؟

شکیلہ بانو۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! روپے کی قیمت کم ہوتے ہی چیزوں کی قیمت آسمان کو چھونے لگی۔ بھلا آپ بتا سکتے ہیں آج سے بیس سال پہلے چیزوں کی قیمت کیا تھی ؟

ج۔ ۱۹۳۹ء میں چاول ایک روپے میں ۱۲ سیر اور گیہوں ۱۵ سیر ملتا تھا۔ چنا ایک روپے میں ۲۰ سیر ملتا تھا۔ گھی ایک روپے کا تین پاؤ تھا۔

مجاہد حسین۔ مراد آباد

س۔ بھائی جان! کوئی ولولہ انگیز شعر سنائیے۔

ج۔ ایک نہیں دو شعر سنئے۔

اے قلم اب آگ برسا اے قلم شعلے اگل
راکھ کر دیتا ہے ظلم و بربریت کا محل
اے مری شعلہ نوائی جوش میں آ جوش میں
تو نہ جانے ہے تیری آتش خاموش میں

حمید اللہ خاں جمیل۔ حیدر آباد دکن

س۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسان میں ضبط کا حوصلہ پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی بھی خواہش، کوئی آرزو اسے تڑپا نہیں سکتی ؟

ج۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے ۔۔۔ ترکِ آرزو

[illegible] ہی نوکری ہے۔

س۔ خواب کا نفسیاتی فلسفہ کیا ہے ؟

ج۔ سرگوشیوں میں یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔ بہت تفصیل طلب موضوع ہے پھر بھی مختصر طور پر خیالات پیش کئے جا رہے ہیں۔ شوپنہار نے لکھا ہے: انسان کی طبیعت اور اس کی طبیعت کا اندازہ اس کے خوابوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے مفکر ہلڈربرینیٹ نے لکھا ہے: انسان کی ذہنی زندگی جتنی صاف اور پاکیزہ ہو گی، اس کے خواب بھی اتنے ہی زیادہ صاف اور پاکیزہ ہوں گے اور اگر اس کا کردار گھناؤنا اور برا ہو گا تو اس کے خواب اتنے ہی گھناؤنے اور برے ہوں گے۔ ایک مشہور فرانسیسی ماہرِ نفسیات کا بیان ہے۔ "خواب محض یادداشتوں کے ٹکڑے ہیں جو غلط ملط ہو کر سوتے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ بیچھڑے اور بھٹکے ہوئے ٹکڑے خواب کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

نور العین لاری بھیرہوا (نیپال)

س۔ بھیا! فیملی پلاننگ ۔۔۔۔ ؟

ج۔ طوفان میں تنکے کا پل باندھنا ہے!

س۔ جبکہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے رفیع احمد قدوائی مرحوم کی غذائی پالیسیوں کو سراہا تو اپنی وزارت میں اس پر عمل کیوں نہیں کرتیں ؟

ج۔ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند!

عبد القیوم صدیقی دربھنگوی چمپارن

س۔ جب ظلم حد سے گزر جائے تو جہاد کرنا چاہیئے۔

پڑھاتے ہیں [illegible]
[illegible] ہیں ؟

ج۔ اس لئے کہ طلبہ [illegible] ملک و قوم کی [illegible] کے خلاف [illegible] کر سکتے، انھیں [illegible]

س۔ میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے اور میرے والی شادی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ آپ اپنا مشورہ دیجئے۔

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے شادی کر لینا [illegible]

داؤد علی خاں۔ بانا پیٹھ۔ حیدر آباد دکن

س۔ خوشتر بھائی! کیا آپ نے کبھی شہر حیدر آباد دیکھا ہے۔ اگر دیکھا ہو تو بتائیے دلی اور حیدر آباد میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا ہے ؟

ج۔ یہ روداد بہت طویل ہے۔ مختصر یہ سمجھئے کہ حیدر آباد حیدر آباد ہے، دلی دلی ہے!

س۔ ہندوستان کے موجودہ ہنگاموں اور خطرناک غذائی بحران کا کیا انجام ہو گا ؟

ج۔ عبرت ناک و تباہ کن!

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، خوشتر گرامی ۔۔۔۔ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر برائٹ پریس صدر بازار دہلی ۔۔۔۔ پتہ دفتر بیسویں صدی [illegible]